اتمامِ سفر

ارضِ سبز و سیہ، ابیض و سُرخ سے
میں گزرتا ہوا جاؤں گا، کوئی ہے؟
کوئی ہے ہم سفر میرا، کوئی نہیں
اس مسافت میں رہ رہ کے لپٹی تھی جو
میں نے وہ خاک بھی پاؤں سے جھاڑ دی
جو تمہارا تھا میں نے تمہیں دے دیا
اور جو جس کا ہو مجھ سے لے لے ابھی
کل نہ کہنا مری بات میں کھوٹ تھا
کل نہ کہنا مری ذات آلودہ تھی

اخترالایمان

پیدائش : ۱۲ر نومبر ۱۹۱۵ء
وفات : ۹ر مارچ ۱۹۹۶ء

مدیر

محمود ایاز

معاون مدیران

خلیل مامون

عزیز اللہ بیگ

پتہ:

۸۴، تھرڈ مین، ڈیفنس کالونی، اندرا نگر

بنگلور - ۵۶۰۰۳۸

فون: ـــــــــ ۵۲۸۱۹۸۶

مارچ ۱۹۹۶ء

قیمت: فی شمارہ ایک سو ۱۰۰ روپے

بیرونی ممالک سے [امریکہ، کناڈا، انگلینڈ، سعودی، پاکستان]

(بذریعہ ہوائی ڈاک) بارہ ۱۲ ڈالر (امریکی) سولہ ۱۶ ڈالر (کنیڈین) دس ۱۰ پاؤنڈ (یو-کے)

کتابت:

حافظ لیاقت احمد قاسمی - بنگلور ۶

کمپوزنگ: شارپ کمپیوٹرز - حیدرآباد (فون: ۴۵۷۳۴۱۱۷)

طباعت: ماڈرن پبلشنگ ہاؤس ۹ گولہ مارکیٹ، دریا گنج - دہلی ۲

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر: محمود ایاز

فہرست

قندِ مکرّر

گم شدہ تحریریں — مرتّب: نیّر مسعود

غزلیں

نظمیں

خصوصی مطالعہ

ناولٹ

افسانے

کالی رات

بازگشت

نقشِ اوّل

سیّد محمد اشرف کوئی بیس۲۰ سال سے افسانہ نگاری کر رہے ہیں مگر جز وقتی۔ سال میں ایک افسانے کا اوسط بیٹھتا ہے۔ ابھی ایک ناولٹ لکھا ہے جو اس شمارے میں شامل ہے۔ لکھے ہوئے افسانوں کی تعداد ممکن ہے کچھ اور زیادہ ہو لیکن مجموعے میں انھوں نے اتنے ہی افسانے رکھے ہیں۔ آدمی کا نام تواتر کے ساتھ آنکھوں کے سامنے نہ آتا رہے تو لوگوں کے حافظے میں بھی نہیں بیٹھتا۔ اسی لیے "سمجھدار" لکھنے والے مستقلاً نظروں میں رہنے کی سَو۱۰۰ ترکیبیں استعمال کرتے رہتے ہیں۔ لیکن اشرف نے افسانوں کے درمیان حائل وقفوں کے باوجود سنجیدہ پڑھنے والوں کی ایک مخصوص تعداد کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ ان کا افسانہ "ڈار سے بچھڑے" جو اُن کے مجموعے کا نام بھی ہے، کافی مشہور ہوا۔ اس افسانے کی جذباتی اپیل اسے لے اڑی اور اُسی جذباتیت نے اسے فنّی اعتبار سے کمزور بھی ٹھہرایا۔ یہ کمزوری ابھی ان کے ہاں کم و بیش موجود ہے۔ ایک۱ دو۲ اور کمزوریاں بھی ہیں، یا کم از کم مجھے نظر آتی ہیں، آگے چل کر اُن کا بھی ذکر کروں گا لیکن پہلے یہ بتا دوں کہ اس شمارے میں ان کا خصوصی مطالعہ کیوں دیا جا رہا ہے۔ تخلیقی کام کُل وقتی کام ہے اور جان کا آزار ہے۔ یہ سنڈے پینٹرس کے بس کا روگ نہیں۔ لیکن اپنی کوتاہ قلمی کے باوجود اشرف کا شمار اُن لوگوں میں نہیں ہوگا جو لکھنے کو بطور تفریح، شوقیہ شغل کے طور پر اختیار کرتے ہیں۔ لکھنا اُن کی ایک داخلی ضرورت معلوم ہوتا ہے۔ اور اس وجہ سے بھی مجھے ان سے بڑی امیّد بندھتی ہے۔ اور پھر میری رائے میں یہ افسانہ نگار، اپنی صلاحیتوں کی بنا پر، ایک بہت اچّھا افسانہ نگار بننے کے بڑے امکانات اپنے اندر رکھتا ہے۔ دو۲ ایک۱ اچھے افسانے کئی ایک نے لکھ رکھے ہیں۔ اس سے کچھ نہیں ہوتا۔ ہر فن کے کچھ بنیادی مطالبات ہوتے ہیں۔ ان کے شعور اور ان کو پورا کرنے کی اہلیت کے بغیر (جو زیادہ تر اکتسابی اور ریاضت طلب ہوتی ہے، آسمان سے اترا ہوا تحفہ نہیں!) فن کا حق ادا نہیں ہوتا۔ اشرف کے ہاں دونوں باتیں ملتی ہیں۔ قمر احسن کے افسانے اور اپنے افسانے کے تجزیے پر انھوں نے جو تبصرے لکھے وہ اس فن پر اُن کی تنقیدی نظر کا ثبوت بہم پہنچاتے ہیں۔ لیکن بنفسہٖ یہ بھی کوئی بڑی بات نہیں کیونکہ، ہم سب جانتے ہیں، اچھے اور بُرے افسانے کا فرق بتانے اور افسانے کے فن پر بقراطیت جھاڑنے والے بھی جب خود افسانہ لکھنے بیٹھتے ہیں تو اکثر گھاس کاٹتے ہیں۔ ممتاز شیریں کی مثال سامنے ہے۔ یہ بات تو افسانوں سے ظاہر ہونی چاہیے کہ لکھنے والا اس فن کے اسرار و رموز کا آشنا اور محرم ہے کہ نہیں۔ اشرف کے افسانے اس بات کا پتہ دیتے ہیں کہ

افسانہ نگار اس کوچے کی راہ و رسم سے اچھی طرح واقف ہے۔ کئی لکھنے والے راستے کے خم و پیچ سے تو واقف ہوتے ہیں لیکن زادِ سفر نہیں رکھتے۔ اشرف کے ہاں یہ زادِ سفر بھی تونگروں کا ہے۔ زبان نہ صرف یہ کہ ان کے لئے کوئی مسئلہ نہیں ہے بلکہ اس کی تہذیبی روایت ان کے رگ و پے میں رچی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اظہار و بیان پر قدرت حاصل ہے۔ مکالمہ لکھنا جانتے ہیں۔ کردار کی نفسیات، ماحول اور موقعہ و محل کی مناسبت سے فطری، جاندار مکالمہ، جو اَب نئے لکھنے والوں کے ہاں عنقا کا درجہ رکھتا ہے، وہ آپ کو اشرف کے افسانوں میں ملے گا۔ بیشتر، ہمیشہ نہیں۔ کرداروں کی زندگی کے اندرونی، ذہنی اور جذباتی دائروں سے نکل کر باہر کی دنیا کا روپ بھی وہ دیکھ اور دکھا سکتے ہیں۔ موسم کے بدلتے رنگ، زمین و آسمان کے نِت نئے منظر، جنگل، جانور، پرندے، سب سے ان کا معاملہ ہے۔ فضا آفرینی کا ہنر خوب آتا ہے۔ دہشت، خوف اور اسرار کا ماحول جب چاہیں پیدا کر سکتے ہیں۔ یہ ایسی خوبیاں ہیں جو تھوک کے بھاؤ نہیں ملتیں۔ ایک اور بات، جو ممکن ہے افسانہ نگاری کے فن سے تعلق رکھتی ہوئی نہ دکھائی دے لیکن مجھے اہم اور گراں مایہ معلوم ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ افسانہ نگار اپنی تہذیب، روایات اور ورثے کا گہرا شعور بھی رکھتا ہے اور ان سے جذبے کی سطح پر مضبوطی سے جڑا ہوا بھی ہے۔ اپنے عہد کے سیاق و سباق میں یہ تہذیبی وجود جس بحران کا شکار ہے اُس کا ایک کرب ناک احساس اشرف کے افسانوں میں موجود ہے۔

ایسا ساز و سامان رکھنے والا افسانہ نگار اپنے امکانات کو "اگر" بروئے کار لائے تو اردو افسانے کو بہت کچھ دے سکتا ہے۔ جی ہاں، زبان و قلم کا یہ بدنصیب لفظ "اگر" بھی تو ساتھ لگا رہتا ہے۔

میں نے اوپر کی سطروں میں اشرف کے افسانوں کی دو ایک کمزوریوں کا ذکر کیا ہے، تو وہ بھی بیان کرتا چلوں۔ ان کے ہاں افسانہ نگار، پڑھنے والے کو آخری نتیجہ تک پہنچنے میں بیش از بیش مدد دینے کی غیر ضروری کوشش کرتا رہتا ہے یعنی اپنے قاری پر بھروسہ کم ہے۔ اس سے افسانہ کمزور ہوتا ہے اور یہ رویہ افسانے کی معنویت کو یک جہتی بنا دیتا ہے۔ وہی جہت جو افسانہ نگار نے معیّن کر لی ہے۔ ظاہر ہے یہ کسی بھی اچھے افسانے کی خوبی نہیں ہے، خصوصاً اس وقت جب افسانے کے اندر ذو جہتی ہونے کا پورا امکان بھی موجود ہو۔ اس کی بہت نمایاں مثال "کعبے کا ہرن" میں نظر آتی ہے۔

"کعبے کا ہرن" اشرف کے اچھے افسانوں میں شامل ہے۔ اس میں افسانہ نگار نے فسادات کے تعلق سے ایک صورتِ حال بالکل نئے زاویے سے پیش کی ہے۔ لڑکے کا قتل مسلمانوں کے گھروں کے پاس ہوا ہے لیکن محلّے میں اکثریت ہندوؤں کی ہے۔ مقتول کے ہاتھ میں کڑا ہے لہٰذا قیاس غالب ہے کہ وہ لازماً ہندو ہوگا۔ امیر میاں، افسانے کے مرکزی کردار، ہندوؤں کے متوقع انتقامی حملے اور فسادات کی آگ بھڑکنے کے ڈر سے بے حال ہو رہے ہیں۔ انھوں نے محلّے میں دوسرے مسلمانوں کے سامنے اپنا جو خادمِ قوم اور مجاہدِ ملّت کا امیج بنا رکھا ہے اس کا ان کی اصلی، بزدل، ریاکار اور موقعہ پرست شخصیت

سے کوئی تعلق نہیں۔ اس تضاد یا دوغلے پن کو کامیابی سے پیش کیا گیا ہے۔ ساری رات خوف اور سراسیمگی کے عالم میں دریچے دروازے بند کرکے، جاگتے گزرتی ہے۔ صبح محلے کے ایک فرد ماجد میاں آکے دستک دیتے ہیں۔ امیر میاں ڈرتے ڈرتے دروازہ کھول کر جھانکتے ہیں۔ ماجد میاں بتاتے ہیں لاش کی شناخت ہو چکی ہے "لڑکا مسلمان ہے، کچھ رقابت وغیرہ کا چکر تھا" اور پھر پوچھتے ہیں "مگر یہ دروازہ کیوں بند کر رکھا ہے؟" امیر میاں کہتے ہیں: "کیا بھئی! سچ کہئے گا، واللہ کسی مسلمان کی لاش تھی؟ یعنی ہندو کی نہیں تھی۔ واہ واہ! خوب سنائی آپ نے اگر... ارے وہ دروازے کی بھی خوب کہی آپ نے۔ بات یہ ہوئی کہ آج ہم لوگ بُری طرح سوئے، ابھی ابھی جاگے ہیں۔ بس جب آپ آئے۔ بس یقین کیجئے، آپ آئے جبھی جاگے۔"

"ارے بھئی! بیگم آج چائے کے ساتھ ذرا حلوہ بھی بھیج دینا۔ بھئی ماجد میاں آئے ہیں"۔ یہ سب امیر میاں نماز کے دوران یاد کر رہے ہیں۔ وہ نماز جس میں وہ سُبحَانَکَ اللّٰھُمَّ.... سے بڑھ کر وَلَاۤ اِلٰہَ غَیۡرُکَ تک نہیں پہونچ پا رہے ہیں —!

"آپ آئے جبھی جاگے" کے بعد صرف یہ تین سطریں کافی تھیں: "امیر میاں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ اب امام سورۂ فاتحہ شروع کر چکا تھا۔ امیر میاں نے بہت بے بسی کے ساتھ سُبحَانَکَ اللّٰھُمَّ یاد کرنے کی کوشش کی لیکن دماغ نے پھر راستہ بدل دیا۔ انھیں بہت شدّت کے ساتھ یاد آیا کہ ابھی اِس نماز کے بعد وہ نماز بھی پڑھنا ہے، خدا کا شکر ادا کرنا ہے کہ لاش مسلمان کی نکلی۔!" افسانہ یہاں اپنے نقطۂ عروج کو پہونچ جاتا ہے۔ لیکن افسانہ نگار کو یقین نہیں کہ بات پوری ہو گئی اور افسانہ پھر آگے چلتا ہے اور ان سطروں پر ختم ہوتا ہے۔ "نیچے نظر گئی تو ریشم کا کمر بند ویسا کا ویسا ہی پنڈلیوں کو چھوتا ہوا جھول رہا تھا۔ انھیں اپنے چہرے پر پھر بڑے بڑے بال اگتے ہوئے محسوس ہوئے انھیں ایسا لگا جیسے وہ مسجد میں ننگے کھڑے ہیں۔ بالکل ننگے —" یہ سطریں بالکل غیر ضروری تھیں اور یہ دو سطریں بھی: "اور اس دن وہ اپنے باہر کے کمرے میں، جسے انھوں نے دیوان خانہ کا نام دے رکھا تھا، بیٹھے اپنے دوستوں سے کہہ رہے تھے، آج اپنی قوم کا ایک فرد اور کم ہو گیا۔ ہم لوگ تعزیتی جلسہ کریں گے اور مرحوم کے لئے دعائے مغفرت کریں گے۔" دراصل افسانہ نگار کو خود اندازہ نہیں ہے کہ ماجد میاں کی آمد پر امیر میاں کے ردّ عمل میں کتنی خوبصورتی اور کتنی کامیابی کے ساتھ اس نے اپنا مقصد حاصل کر لیا ہے اور یہ فالتو سطریں افسانے کے تاثر کی شدت کو ہلکا کر دیتی ہیں اور ان کی وجہ سے افسانہ اپنی سطح سے گر جاتا ہے۔ افسانہ نگار نے ایک ریاکار، موقعہ پرست کردار کو کامیابی سے پیش کیا ہے اور اس کردار کے خود اپنی نظروں میں ذلیل ٹھہرنے کے احساسات کی موثر عکاسی کی ہے۔ اس کے ساتھ

ساتھ یہ افسانہ ایک صورتِ حال کے جبر کی ستم ظریفانہ کہانی بھی بیان کر رہا ہے لیکن افسانہ نگار اس معنوی جہت کو ابھرنے نہیں دیتا۔ خسارہ افسانہ نگار کا بھی ہے اور قاری کا بھی۔

"لکڑ بگھا ہنسا" میں بھی افسانہ نگار کو بے تابی ہے کہ قاری کو اچھی طرح بتا دیا جائے کہ لکڑ بگھا سے اس کا روئے سخن دو پایہ لکڑ بگھوں کی طرف ہے۔ افسانہ بڑی فنکاری سے لکھا گیا ہے، فضا باندھی ہے لیکن افسانہ نگار کو خود اپنی فنکاری پر پورا اعتماد نہیں ہے۔ ایک سے زیادہ بار اس وضاحت کی ضرورت نہیں تھی کہ لکڑ بگھا "وفادار کتے" کی طرح پیچھے پیچھے آتا ہے اور دھوکے میں حملہ کر دیتا ہے۔ بھائی جان کے دوست اختر بھائی اور پاپا کے دوست خواجہ صاحب کے پیروں سے چٹ چٹ کی آواز قاری کو یہ بتانے کے لئے کافی ہے کہ ان سب کا کردار لکڑ بگھے کا ہے۔ خواجہ صاحب نے مُڑ کر پاپا سے کیا کہا اور بھائی جان نے اختر بھائی سے کیا کہا۔ یہ پھر وہی قاری کی سمجھ پر بھروسہ نہ کرنے والی بات ہے۔ لکڑ بگھا لاٹھی کی ضرب کھا کر بھیگی بھیگی آنکھوں سے سب گھر والوں کو باری باری دیکھتا ہے اور بہت زور سے کھلکھلا کر ہنستا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے۔ اس منظر میں اور بعد کی اختتامی سطروں میں وہ سب آ گیا ہے جو اشرف قاری کو بتانا چاہتے ہیں۔ اور بہت موثر طور پر۔

یہ کمزوریاں تھوڑی توجہ سے دور ہو سکتی ہیں۔ یہ نہیں کہ اشرف اپنی تحریروں پر محنت نہیں کرتے۔ نیر مسعود نے ان کے بارے میں صحیح لکھا تھا کہ "وہ لکھ مارنے والے افسانہ نگار نہیں ہیں" (سوغات، شمارہ ۷۔ بازگشت) "نمبردار کا نیلا" کوئی دو برس پہلے لکھا گیا۔ مجھے اس کا مسودہ ملا تو اُن کی خواہش پر میں نے ایک قاری کی حیثیت سے کچھ باتیں لکھ بھیجیں۔ انھوں نے مسودہ واپس منگوا لیا اور اس پر ڈیڑھ برس تک غور و خوض کرتے رہے۔ اب یہ ناولٹ بغیر کسی تبصرے کے شائع ہو رہا ہے۔ اصل تبصرہ نگار تو پڑھنے والے ہیں۔ اُن کی رائے کا انتظار رہے گا۔

○

مجید امجد ایک منفرد طرزِ اظہار رکھنے والے اچھے شاعر تھے۔ اختر الایمان کی شاعری کی طرح ان کی شاعری کی طرف بھی توجہ دیر سے ہوئی۔ ان کا نام "سوغات" کے ابتدائی دنوں میں (۱۹۵۹-۶۰ء) زبان و قلم پر آنے لگا تھا۔ وہ بہت پہلے سے لکھ رہے تھے لیکن ان کا پہلا مجموعۂ کلام ۱۹۵۸-۵۹ء میں شائع ہوا۔ اب ٹھیک سے یاد نہیں کہ مجید امجد پر پہلا مضمون وزیر آغا کے "ادبی دنیا" میں شائع ہوا تھا یا "سوغات" میں، بہرحال اسی زمانے میں ان مضامین کی آگے پیچھے اشاعت ہوئی تھی۔ مجید امجد "سوغات" کے جدید نظم نمبر میں بھی شامل تھے۔ انھوں نے شفیق فاطمہ شعریٰ کی نظموں پر تبصرہ بھی کیا جو شاعرہ کا نام مخفی رکھ کر کرایا گیا تھا۔ انھیں دنوں "سوغات" کے لئے ضیا جالندھری اور حمید نسیم کے درمیان ایک گفتگو ہوئی۔ بات چیت انھیں دونوں کی تھی، میں بس موجود تھا۔ مجید امجد کو میں ایک اہم جدید شاعر سمجھتا تھا اور چاہتا تھا کہ اُن پر اس گفتگو میں اظہارِ خیال ہو لیکن بات آگے نہ بڑھ سکی۔ کئی سال بعد مجید امجد دردناک حالات میں انتقال کر گئے اور اس کے بعد ایک طرح سے اُن کی بازیافت کا دور شروع ہوا۔ مجید امجد یقیناً ایک اہم جدید شاعر تھے اور ان کی قدر شناسی اور جدید شاعری

میں ان کے مقام اور مرتبہ کا تعین ضروری تھا، لیکن قدر شناسی کی ان کوششوں کا ایک افسوس ناک پہلو بھی تھا۔ انتہا پسندی شاید ہمارے مزاج کا خاصّہ ہے۔ لکھنے والے اپنا احساسِ توازن برقرار نہیں رکھ سکے اور مجید امجد کی تعریف و توصیف میں مبالغہ کا عنصر بعض اوقات مضحکہ خیز حد کو پہنچ گیا۔ اس طرح کے مضامین پڑھ کر مجھ جیسے مجید امجد کے قدیم مدّاحوں کو بھی شرمندگی محسوس ہوتی تھی۔ سلیم احمد نے بھی اس کا اظہار ایک انٹرویو میں کیا تھا (طاہر مسعود کے ساتھ) "لاہور میں، مجید امجد کے مرنے کے بعد، نعرہ بازی کی شکل میں پروپیگنڈہ شروع کیا گیا، جس میں انھیں کبھی میر اور غالب کے بعد اردو کا سب سے بڑا شاعر اور کبھی تین سو سال کا سب سے بڑا شعری ذہن قرار دیا گیا۔ جب ایسی ننگی پبلسٹی کی جاتی ہے تو میری روح اس سے انکار کر دیتی ہے۔"

حمید نسیم کے مضمون میں میرے خط کا حوالہ اسی پس منظر میں ہے۔

○

"سوغات" کا یہ شمارہ پریس کو جا چکا تھا۔ صرف ابتدائی سولہ صفحات (فہرست، نقشِ اوّل وغیرہ کے) میرے پاس تھے اور وہ بھی ایک آدھ دن میں چھپنے کے لیے دلی جا رہے تھے کہ بمبئی سے اخترالایمان کے انتقال کی خبر آگئی۔ نقشِ اوّل لکھا جا چکا تھا، اس کے چند صفحات نکال دیے اور ان کی جگہ یہ سطریں اور اخترالایمان کی کچھ نظمیں دی جا رہی ہیں۔

بھری پُری بمبئی میں، باقر کے بعد، میرے دو ہی ملنے والے تھے۔ بیدی اور اخترالایمان۔ بیدی جلد گئے، اور اب اخترالایمان بھی رخصت ہو گئے۔ اخترالایمان سیدھے سادے آدمی تھے۔ عملی زندگی کی سوجھ بوجھ رکھتے تھے۔ مطالعہ کی وسعت اور علم کی گہرائی و گیرائی کے لیے ان کے پاس نہ وقت تھا اور نہ ان باتوں کا وہ مزاج رکھتے تھے لیکن وہ جو اقبال نے خونِ جگر سے لکھے جانے والے فلسفے کی بات کہی ہے، اس کی بصیرت ان کو حاصل تھی۔ انھیں زندگی اور اس کے مظاہر کو نظریات و افکار کے ذریعہ دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ وہ ان سب سے، جینے کے عمل کے ذریعہ بہت اچھی طرح متعارف اور درد شناس تھے۔ ان کی شاعری کا جوہر اور طاقت بھی اسی میں تھی۔ سرور صاحب نے ایک بار مجھ سے پوچھا تھا کہ "اخترالایمان اپنی خودنوشت میں اپنی علمی مصروفیات، ذہنی سرگرمیوں اور کتابوں کا کوئی ذکر کیوں نہیں کرتے؟" جن چیزوں کا ان کی زندگی میں زیادہ عمل دخل تھا ہی نہیں ان کا ذکر وہ کیسے کرتے۔ اس سلسلے میں باقر ان سے بہت الجھتے رہتے تھے (اور باقر کس سے، کس سلسلے میں نہیں الجھتے؟) اخترالایمان اس ساری خون غان کا جواب ایک دلآویز مشفقانہ مسکراہٹ سے دے دیتے۔ ایک بار شاید بہت تنگ کیا باقر نے تو اخترالایمان نے باقر سے نثر میں بات چیت کو فضول سمجھ کر ایک نظم "کرم کتابی" لکھ کر سنا دی۔!

خود نوشت کے سلسلے میں ان سے بہت جھگڑا رہا۔ ابتدائی ایک باب پیدائش وغیرہ کے بارے میں لکھ کر بیٹھ گئے

تھے اور وہ ایک باب بار بار ادھر اُدھر چھپتا رہا۔ جو پوچھتا اس سے یہی کہتے کہ ہاں وہ میں لکھ رہا ہوں۔ میں پیچھے پڑ گئی تو آب رکاوٹوں کی داستان شروع ہوئی۔ "ابھی تو کئی لوگ زندہ ہیں، ان سب کو کیسے گھسیٹوں؟" میں نے کہا اس کے کئی طریقے ہیں۔ پھر لکھا "اس عمر میں، بھرے بازار میں ننگا ہو کر تو کھڑا نہیں ہو سکتا۔" میں نے کہا تھوڑی بہت لیپا پوتی سب کرتے ہیں اور پھر یہ دیکھئے کہ ہم اور آپ کب تک رہیں گے؟ کتاب رہ جائے گی۔ کہنے لگے ہاں یہ بات تو تم ٹھیک کہتے ہو۔ لیکن وہ "رائے عامہ" سے کھلا انحراف کرنے والے آدمی نہیں تھے۔ خود نوشت میں اعتراف بھی کیا ہے کہ وہ عملی طور پر بہت "لبرل" آدمی نہیں ہیں۔ بہرحال بہت قیل و قال کے بعد لکھنے لگے اور جب ایک بار شروع ہو گئے تو پھر بیماری اور وڈ یالیسز کے زمانے میں بھی باقاعدگی سے لکھتے رہے۔ میں اپنی بُری عادت سے مجبور، مسوّدے میں میں میخ نکالتا تو لکھتے تم درست کر لو۔ اس سے آگے کی بات ہوتی تو کہتے مسوّدہ بھجوا دو، دوبارہ دیکھوں گا اور ٹھیک کر دوں گا۔ اس شمارے میں شامل قسط کے بارے میں لکھا "آباد خرابے میں" کی آخری قسط بھیج رہا ہوں میں اس سے بہت زیادہ مطمئن نہیں ہوں مگر اس پر نظر ثانی کی اب مجھ میں ہمت نہیں ہے۔ تمہیں اس باب میں کچھ ٹھیک نہ لگے تو حذف کر دینا مگر مجھے ضرور لکھ دینا کہ تم نے کیا نکالا ہے۔" "اب مجھ میں ہمت نہیں ہے" کے الفاظ سے آنکھیں نم ہو گئیں۔ مگر اس قسط پر خاتمہ اس کتاب کو بہت کمزور بنا دیتا۔ دل کڑا کر کے لکھا کہ آپ چاہتے ہیں تو اعلان کر دوں گا کہ یہ آخری قسط ہے مگر میں اس خاتمے سے بہت غیر مطمئن ہوں۔ آپ کی صحت کی خرابی اور کمزوری کا مجھے علم ہے مگر آپ آرام سے لکھئے، آہستہ آہستہ لکھئے لیکن اس طرح کہ بات بنے۔ قلم آپ کا ذریعۂ معاش رہا ہے۔ زندگی تقریباً ساری اسی میدان میں گذری تو ظاہر ہے خود نوشت کا بڑا حصّہ اس کے ذکر پر مشتمل ہو گا لیکن آدمی کسی بھی شعبے میں کام کرے، اس کا اپنے دور اور عہد سے بھی تعلق رہتا ہے، اس کے اپنے ردِّ عمل، تاثرات ہوتے ہیں، ایک اپنی اندرونی زندگی بھی ہوتی ہے، رشتے قائم ہونے اور ٹوٹنے کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے، خود اپنے اندر بھی تبدیلیاں وقوع پذیر ہوتی ہیں، آپ نے یہ سب گول کر دیا اور کتابی شکل میں اشاعت کی جلدی خود نوشت کو برباد کر رہی ہے۔ ایک جملہ ذرا سخت کچھ اس طرح کا بھی لکھ دیا کہ آپ کی ہر کتاب کا آپ کے زیر اہتمام شائع ہونا ضروری نہیں۔ کچھ کام بعد والوں کے لئے بھی چھوڑ جائیے۔ اس جملے کا اب افسوس ہوتا ہے۔ بہرحال اس کے جواب میں انھوں نے لکھا کہ "میرا خود بھی کچھ مزید لکھنے کا خیال تھا۔ کیا؟ وہ ذہن میں صاف نہیں تھا۔ تمہارے اس خط کے بعد جو تم چاہتے ہو وہ لکھ دیتا ہوں پھر مزید اضافہ .... (یہ الفاظ پڑھے نہیں جاتے) بعد میں سوچوں گا۔" یہ خط ۲۷ ستمبر ۱۹۹۵ء کا ہے۔ اس طرح سے یہ تو طے ہو گیا تھا کہ جو قسط اب شائع ہو رہی ہے وہ آخری نہیں ہے۔ ایک بار انھیں دنوں یہ بھی لکھا کہ "اڑتی اڑتی ملاقاتیں" کے عنوان سے بھی ایک باب "اس آباد خرابے میں" میں شامل رکھنا چاہتا ہوں۔" اس کے بعد انھوں نے کیا کیا لکھ رکھا ہے اس کی کوئی خبر نہیں لیکن یقین ہے کہ لکھا ضرور ہو گا۔ ممکن ہے مسوّدے صاف نہ ہوئے ہوں۔ وہ یوں ہی بیٹھے رہنے

والے آدمی نہیں تھے۔ سلطانہ بھابی کچھ سنبھل جائیں تو اُن سے اِن باتوں کا پتہ چلے گا۔

○

وقت اور جگہ کی کمی کی وجہ سے اخترالایمان کی بہت کم نظمیں دی جارہی ہیں۔ ان نظموں کے انتخاب کو ذاتی پسند ہی سمجھئے۔ ویسے میری ناقص رائے میں یہ چند نظمیں بھی اخترالایمان کی شاعری کی بنیادی خصوصیات اور خوبیوں کی آئینہ دار ہیں۔ ان نظموں میں جو شاعری ہوتی ہے وہ "ایک لڑکا" کی خطیبانہ بلند آہنگی سے آگے کی چیز ہے۔ "ذمستان سرد مہری کا" اخترالایمان کی شاید آخری نظم ہے، جو رسالہ "شب خون" کے شکریے کے ساتھ یہاں شائع ہو رہی ہے۔ اس خوبصورت اور اداس نظم میں آپ دیکھیں گے کہ یادوں کا باب کھلتا ہے تو زندگی کی آخری سانسوں میں بھی لکھنے والے کے بنیادی سروکار اور حوالے وہی ہیں جو پچاس سال پہلے تھے۔ اخترالایمان کی اصل شاعری ایک دائرے کے اندر ہے۔ وہ اس دائرے میں مقید نہیں تھے۔ باہر بھی بہت نکلتے تھے لیکن ان کی ارفع تر، دلوں کو چھونے والی سچی اور زندہ شاعری اس دائرے کے اندر ہی ملے گی اور اسی سے اُن کا نام اردو کے ناقابلِ فراموش شاعروں میں ہوگا۔ اس بات سے شاید نقاد حضرات کو اتفاق نہیں ہوگا۔ اخترالایمان کو بھی نہیں تھا۔ لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

اخترالایمان کی موت سے جدید شاعری کے قبیلے کا آخری سردار اُٹھ گیا۔

محمود ایاز۔ بنگلور

۱۱ر مارچ ۱۹۹۶ء

محبّتؐ

رات میں دیر تک اڑتے بادل کھلے چاند کی کشمکش
ٹکٹکی باندھ کر ایسے دیکھا کیا جیسے یہ ماجرا
میری ہی داستاں کا کوئی پارہ ہے، کون آوارہ ہے
تو کہ میں ؟ ایک چھوٹا سا طائر فضا میں تھا نغمہ سرا
دور نزدیک پھر دُور ہر سمت اک تان کی گونج تھی
رات آہستہ آہستہ تھم تھم کے رُک رُک کے ایسے گزرتی رہی
جیسے میں اور تو وقت کی وادیوں سے گزرتے ہوئے
شہر کی سونی، سنسان، خاموش گلیوں میں گم ہو گئے!
رات کی کالی دھاری سے دن کی سفیدی الگ ہو گئی
دونوں اک دوسرے سے الگ ہو گئے، ہاں وہ طائر مگر
یونہی گاتا رہا، اڑتے بادل، کھلی چاندنی کا سماں
وقت کے ساتھ ساتھ آپ تبدیل تحلیل ہوتا رہا
میں تجھے تو مجھے ڈھونڈتی رہ گئی، وقت اُڑتا گیا
اُن خنک ساونی بھیگی راتوں کی پُرشوق تنہائیاں
صرف اک داغِ غم تاب کی شکل میں منجمد ہو گئیں
پر وہ نغمہ، وہ حسنِ زمین و زماں، روشنی
اس پرندے کی وہ دھیمی آواز، وہ میٹھی کلکاریاں
بنتِ آغاز و انجام کے باکرہ بطن میں رہ گئیں!

اور اک نسل سے دوسری نسل تک عکسِ رُوحِ ازل
عکسِ رُوحِ ابد ایسے نشو و نما پائے گا خون میں
جیسے بنجر زمیں قطرۂ ابر سے سبز و شاداب ہو!
اڑتے بادل کھلی چاندنی کا سماں، میٹھی تنہائیاں
سب کی سب بن کے مٹتی ہوئی پیاری تصویریں ہیں
صرف تبدیل ہوتی ہوئی روشنی کی جھلک زندہ ہے
صرف حسنِ ازل اور حسنِ ابد کی مہک زندہ ہے
صرف اس طائرِ خوش ادا خوش نوا کی لہک زندہ ہے
ایک دن آئے گا تو بھی مر جائے گی میں بھی مر جاؤں گا

آخرِ شب

ڈھلی رات تارے جھپکنے لگے آنکھ شبنم کے ناشُگفتہ موتی
سرِ شاخِ گُل اپنے انجام سے کانپ اٹھے خواب پورے ادھورے
اُڈے جیسے اُودے، روپہلی، سنہرے، سیہ ملگجے، بھورے بادل
تہِ آسماں روئی کے نرم گالوں کی مانند ہر سمت اُڑتے
بھریں، اور ندّاف کی ضرب کو بھول کر پل گزرتے گزرتے
سرِ بالشِ خاک سب ضدّی بچّوں کی مانند روتے مچلتے
چڑھی نیند سے چور ہو کر وہیں سو رہیں، یاد کی سبز پریاں
گھنے جنگلوں، لالہ زاروں بھری وادیوں سے گزرتی ہیں
کہیں قافِ ماضی کے نمناک غاروں میں روپوش ہونے لگی ہیں

مبارک ہو میں نے سنا ہے کہ تم بھول سی جان کی ماں بنی ہو
مبارک سُنا ہے تمہارا ہر اک زخم اب مندمل ہو گیا ہے!

اندوختہ

گہرا نیلا، بسیط و بلند آسماں
اتنا خاموش، ٹھہرا ہوا، پُرسکوں
اس طرح دیکھتا ہے مجھے جیسے میں
اپنے گلّے سے بچھڑی ہوئی بھیڑ ہوں
تم کہاں ہو مری رُوح کی روشنی
تم تو کہتی تھیں یہ درد پائندہ ہے
تم کہاں ہو بہشتِ نگہ، اہرمن؟
تم سے اب تک مری داستاں زندہ ہے
تم کہاں ہو، مرے راستوں کے دیئے
بجھ گئے، پھر بھی ہر چیز تابندہ ہے
میں ملوں کارخانوں کے بوجھل دھوئیں
قحبہ خانوں کی مغموم تابندگی
کاہنوں کی محبّت کا فضلہ جسے
ربِّ موجود و معدوم نے بخش دی،
دائمی زندگی۔ میں تمہارے لئے
عہدِ قاروں کی گیرا و رَدار سے
اپنی زخمی محبّت بچا لایا ہوں!

بند کمرہ

کبھی جو کھولتا ہوں قفل، دھول میں لپیٹ
ادھورے خواب، جواں مرگ خواہشیں، جذبے
شکست خوردۂ غم، نارسائی کے مارے۔
جوانیوں کی کھلی چاندنی کے افسانے،
سکوں نواز ہنسی کے ہزارہا فتنے،
بغاوتوں کے علم، کرم خوردہ ہنگامے،
ہزار شورشیں، عزمِ جہاد ساتھ لئے،
کھنکتے قہقہے کم سن، شریر بچّوں کے،
خوشی، ملال کے غم دیدہ، غم ربا قصّے،
خموشیوں کی ردا اوڑھے، دیکھتے ہیں مجھے۔
انہیں میں مہر بلب، تیری خیرباد بھی ہے
انہیں میں تیرا کرم، بست اور کشاد بھی ہے

زمستان سرد مہری کا

کہیں اک گھاؤ باقی رہ گیا ہے
جسے میں دیکھ سکتا ہوں، فقط میں
کسے آواز دو گے؟ رنگ پیراہن تصور میں
بہت جلوہ گری کرتا ہے لیکن وہ قد و قامت
تکلم کا کرشمہ سا تو اوجھل ہے نگاہوں سے
کہیں اک گھاؤ باقی رہ گیا جس کا مداوا ہی نہیں کوئی
بجز اس کے اٹھالائیں وہ جنت سی تخیل میں
چمن سازی کریں
لفظوں کے گل بوٹے کھلائیں، اس کے دامن کو
کچھ اس انداز سے کھینچیں وہ ٹھٹھا مار کر ہنس دے
خفا بھی ہو
کہیں اک گھاؤ باقی رہ گیا جس کا مداوا ہی نہیں کوئی
گذرتی رات کی چاندی پگھلنے دیں
یہ گھاؤ صرف میں ہی دیکھ سکتا ہوں
بہت اڑتے ہوئے رنگوں کی جھلنی جھلنی چادر سے
مرے ہونٹوں سے لپٹی نا طلب بوسوں کی شیرینی
وہ سب آئینہ خانوں میں سجے تصویر سے چہرے
محرک فلم کے پردے، یہ بزم عیش کا ساماں

وہ سارے ہم نوالہ ہم پیالہ یوسف ثانی
دل درد آشنا کے کر جو اس دنیا میں آئے تھے
میری یادوں کے البم میں ہیں ان کی دھندلی تصویریں
شکست و کامیابی کے مناظر، خندہ پیشانی
شہابی گالوں پر موتی کی لڑیاں ٹوٹتی بنتیں
وفا کی داستاں، رسوائی کے قصے
یہ کس کس کی ہنسی، سرگوشیاں، باتیں ہیں سب پہچانتا ہوں میں
میں کیسی آشنائی سے پکڑتا ہوں کلائی کو
وہ کیسی دلربائی سے چھڑا لیتی ہے ہاتھ اپنا
وہ منہ کا ذائقہ باتوں کی گرمی، رات کا جادو
بہے جاتی ہے میری کشتی، عمر رواں کیسے
حواس خمسہ سحر سامری میں دقت کی گم ہیں
فسانہ تھا جہاں جیسے، حقیقت تھی گماں جیسے
کہیں اک گھاؤ باقی رہ گیا ہے
جسے میں دیکھ سکتا ہوں فقط میں
بہے جاتی ہے میری کشتی، عمر رواں آہستہ آہستہ
خیال و خواب ہوتا جا رہا ہے یہ جہاں آہستہ آہستہ

حمید نسیم

مجید امجد............ایک اہم جدید شاعر

ایک گفتگو ۱۹۶۱ء میں عزیز مکرم محمود ایاز مدیر "سوغات" بنگلور (بھارت) کی تجویز پر براڈ کاسٹنگ ہاؤس ریڈیو پاکستان کراچی کے اسٹوڈیو میں ریکارڈ کی گئی تھی۔ محمود ایاز صاحب نے اسے Transcribe کرایا اور پھر اسے اپنے موقر ادبی مجلے "سوغات" میں شائع کیا۔ یہ گفتگو جدید اردو شاعری کا ایک عمومی جائزہ تھی۔ چند اہم جدید شعرا پر اظہار رائے ذرا زیادہ تفصیل سے ہوا۔ میراجی تو ۱۹۴۹ء میں وفات پا گئے تھے مگر ان کا پورا کلام دستیاب نہ تھا سو جو کلام نظر سے گزرا تھا بات اسی کی بنیاد پر کی گئی تھی۔ اب میراجی کی کلیات جمیل جالبی صاحب نے بڑی محنت سے مرتب کر کے شائع کر دی ہے اور اردو ادب کے قاری اس تازہ کار شاعر کے فکر و فن کا معتبر سطح پر احاطہ کر سکتے ہیں۔

۱۹۶۲ء تک ن۔م۔ راشد کے صرف دو مجموعے شائع ہوئے تھے "ماورا" اور "ایران میں اجنبی"۔ محمود ایاز صاحب نے ضیا جالندھری سے اور مجھ سے ن۔م۔ راشد کی سطح کلام کے بارے میں جو سوالات کیے ان پر بات ان ہی دو شعری مجموعوں کے حوالے سے کی گئی تھی۔ اس کے بعد ن م۔ راشد (مرحوم) نے اپنے شعری سفر میں فکر و اسلوب ہر دو سطح پر بہت تیز روی سے منزلیں طے کیں۔ حسن کوزہ گر (چار کینٹو) "مرگ اسرافیل"، "اے مرے صحرانورد پیردل"، "صباو یراں" اور اسی سطح کی متعدد اور عظیم نظمیں تخلیق کیں۔ ۱۹۶۲ء تک کے کلام میں ڈرافٹنگ کئی جگہ صاف نمایاں تھی چناں چہ اس نقص کی نشان دہی کرنا ادبی دیانت کا تقاضا تھا۔ پھر ن۔م۔ راشد کا فن نکھرا تو ڈرافٹنگ کی غمازی کرنے والے مصرعے ایک آدھ جگہ کے سوا کہیں نظر نہیں آئے۔ اس کے برعکس کلام میں روانی اور کمال زیبائی سے ترشے ہوئے روشن و تاباں مصرعے صفحہ بہ صفحہ نظموں کو جگمگانے لگے۔ راشد اپنی پوری شاعری کے بل پر اردو کا چوتھا بڑا شاعر اور جدید اردو شاعری کے دور اول کا سب سے اہم شاعر خود کو منوا چکا ہے۔ میراجی بے موت مر گیا، ۳۷ برس کی عمر میں اگر وہ راشد اور فیض کی طرح طبعی عمر پاتا تو اپنی نسل کا سب سے بڑا ہی نہیں عالمی سطح کا عظیم شاعر ہوتا۔ اب بھی وہ راشد صاحب سے صرف بال برابر قامت میں کم ہے۔ میراجی کی نظم "سمندر کا بلاوا" ایک نہایت عمیق روحانی تجربہ کا سطح عظمت پر بیان ہے۔ اور اس میں جو حزن

جو درماندگی جو کرب پنہاں ہے اس کی نظیر ہماری ساری روحانی شاعری میں کم ہی کہیں ملے گی۔ ن م۔ راشد اور میراجی اس سطح سے جو مجھے اور ضیا کو اب سے تیس برس پہلے نظر آئی تھی آج کتنے بلند ہیں اس امر کا احاطہ میں نے اپنی کتاب "پانچ جدید شاعر" ہی میں صراحت کیا ہے۔

۱۹۶۲ء میں مجید امجد مرحوم کا صرف ایک شعری مجموعہ "شب رفتہ" ہمارے پیش نظر تھا مجید امجد صاحب کا پورا کلام از اول تا آخر ایک بار پھر پڑھنے کی ضرورت مجھے عزیز مکرم محمود ایاز کے ایک خط سے محسوس ہوئی جو اب سے چند ہفتے پہلے مجھے ملا تھا۔ اس خط میں اردو ادب کے اس ذہین اسکالر نے اور باتوں کے علاوہ یہ بھی لکھا تھا کہ مجید امجد اچھے شاعر تھے۔ مگر کچھ پاکستانی ادیبوں شاعروں نے مجید امجد کی تعریف میں اتنا غلو کر دیا کہ کئی لوگوں کے لیے مجید امجد کی شاعری ہی مشتبہ ہو گئی۔ میں متاسفانہ گزشتہ تین عشروں میں عصری اردو شعروادب سے بے تعلق ہو گیا تھا سو مجھے معلوم نہیں کہ کون ادب دوست نادانستہ مجید امجد سے نادان دوستی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ لیکن محمود ایاز صاحب کے خط سے مجھے یہ محسوس ہوا کہ مجھ پر مجید امجد کا حق ہے کہ میں ان کی شاعری کو اس کی کلیت میں دیکھوں۔ مجید امجد سے مجھے ایک تعلق خاطر خالصتاً ذاتی سطح پر ہے۔

۱۹۴۳ء کے اوائل میں مجید امجد مرحوم نے جھنگ میں ایک بڑے مشاعرے کا اہتمام کیا اور اس میں شرکت کے لیے لاہور سے جن شعرا کو دعوت دی ان میں میں بھی شامل تھا۔

میں اپنے بزرگ دوست عبدالمجید بھٹی مرحوم اور یوسف ظفر مرحوم کے ساتھ جھنگ گیا۔ اور وہاں دو دن ہمہ وقت مجید امجد صاحب کا ساتھ رہا۔ مجید امجد صاحب کی منکسر المزاجی، کم گوئی، خوئے تواضع اور عظمت قلب و نگاہ سے میں بہت متاثر ہوا تھا۔ پھر مجید امجد ساہی وال آ گئے جہاں میرے والد عزیز بٹالوی کا سارا خاندان قیام پاکستان کے بعد آباد ہو گیا تھا۔ مجید امجد صاحب کے میرے دونوں بڑے بھائیوں اور بھتیجوں سے برادرانہ اور بزرگانہ تعلقات محکم سے محکم تر ہوتے چلے گئے۔ متاسفانہ میں مجید امجد صاحب سے ساہی وال میں کبھی نہ مل سکا کہ چالیس برس میں صرف دو تین بار وہاں جانا ہوا اور کوئی قیام ایک دو دن سے زیادہ نہ تھا۔ البتہ میرے بڑے بھائی نے ایک بار مجھ سے کہا تھا کہ مجید امجد صاحب نے کبھی کھل کر شکایت تو نہیں کی مگر وہ میرے کسی ناقدانہ جائزے سے آزردہ سے ہیں۔ اک گونہ ملال جو اس اطلاع سے میرے اندر اتنے برس موجود رہا تھا وہ بھی مجید امجد صاحب کی کلیات کا مطالعہ کرنے کا محرک ہوا۔ یہاں ایک ذرا سی بات اور کہنا لازم آتا ہے۔ میں نے اپنی نجی زندگی میں ذاتی تعلقات کو ہمیشہ اساسی اہمیت دی ہے اور تالیف قلوب اور پاس خاطر احباب میرے مسلک کا تقاضا ہے۔ مگر یہ پاس داری اور شعروادب میں دیانت دو بالکل الگ الگ چیزیں ہیں اور میں نے انھیں کبھی گڈمڈ نہیں ہونے دیا۔

میں نے کلام امجد کے ساتھ اب بھرپور دو ہفتے گزارے ہیں۔ یہ دن رات کا ساتھ تھا۔

اور میں نے تمام کلام کا ادب اور محبت سے مطالعہ کیا ہے۔ کلیات کے پہلے دو سو صفحات میں شاید "شب رفتہ" ہی کی نظمیں اور غزلیں ہیں۔ انھیں پڑھ کر میں بڑے ادب اور بڑی دیانت سے یہ کہتا ہوں کہ جو رائے ضیائے اور میں نے مجید امجد صاحب کے اس کلام کے بارے میں ۱۹۶۲ء میں دی تھی وہ اب بھی درست اور صائب نظر آئی۔ یہ کلام بڑی محنت سے اور عرق ریزی سے لکھا گیا۔ شاعری میں شعری جوہر تو ہے۔ لیکن ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ فطری شاعر کے جوہر کو ایک فی صد کا تناسب دیتا ہے۔ سطح کمال پر پہنچنے کے لیے ننانوے فیصد حصہ محنت کا ہوتا ہے۔ مجید امجد صاحب کا شعری جوہر کلیات کے مطالعے سے مجھے ۲ / ۱ فیصد نظر آیا۔ محنت ۲ / ۱ ۹۹ فی صد بھی صاف نظر آئی ورنہ اتنی ضخیم کلیات کیسے بہم پہنچتی۔ جو جدید شاعری میں صرف کلیات میراجی سے کچھ کم ہے۔ اور باقی سب شاعروں سے کہیں زیادہ ہی ہے۔ ہاں منیر نیازی صاحب شاید کلام کی ضخامت میں مجید امجد صاحب کی کلیات ہی تک پہنچ گئے ہوں کہ وہ بہت زود گو اور بسیار گو ہیں۔ جو جی میں آئے اسے نظما دینا ان کا جبر ہے۔ "شب رفتہ" کے بعد کا بیش تر کلام بھی بہت ناہموار ہے۔ لفظیات میں اردو زبان کے مزاج اور محاورے سے بے اعتنائی بھی جگہ جگہ نظر آئی ہے۔ مثلاً صفحہ ۷۶ پر مصرع :

نظر آتا ہے کومل سا مسکراتا ہوا مشک بار پھول

اب ذرا رک کر جمالیاتی سطح پر سوچو تو کومل کے بعد مشکبار کا لفظ معنوی شہر گریہ ہے۔ اسی صفحہ پر ایک اور مصرع ہے

"اے دوست ایک لمحے کی مہلت ہے زندگی" اس مصرع میں جوش کے ابتدائی کلام کی گونج ہے۔ صفحہ ۸۰ پر ایک شعر ہے۔

یہ کپاس کی کھیتیوں کی بہاریں
یہ ڈوڈوں کو چنتی ہوئی گل عذاریں

یہاں مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، کپاس، اداس کا ہم وزن لفظ ہے۔ آماس۔ مقیاس۔ وقاس کا ہم وزن نہیں۔ پنجابی کسان اسے کپاہ کہتے ہیں میں نے آج تک کسی ان پڑھ پنجابی کو بھی کپاس تشدید کے ساتھ بولتے ہوئے نہیں سنا۔ ڈوڈے چنتی ہوئی گل عذاریں، فصیح بیان ہے۔ ڈوڈوں کو چنتی ہوئی ضرورت شعری کے تحت کہا ہے۔ کوئی فکری عمق تو یہاں نہیں ہے۔ محض بیانیہ شعر ہے۔ اس میں ایسے عجز بیان کی گنجائش نہ تھی۔ اس سے پہلے کی نظموں میں بھی یہ عجز بیان مسلسل نظر آتا رہا ہے۔ نظم "حسن" کا دوسرا مصرع یہ ہے "بہارِ خلد مری اک نگاہِ فردوسیں" یہ "بہار خلد" کے بعد "نگاہ فردوسی" سراسر آورد۔ نری بھرتی بھی ہے۔ اور "فردوسیں" لفظ یعنی اختراع کرنے کی کوشش بے احتیاطی کی مخبری کرتی ہے۔ پانچ بہت کمزور شعروں کے بعد مصرع آتا ہے :

"یہ عشق تو ہے اک احساس بے خودانہ مرا۔" ایک تو یہاں احساس اور بے خودی کو بہم کرنا مناسب نہیں کہ احساس حس سے ہے۔ اس کا مجرد مادہ حس ہے۔ حواس کی اطلاع کو الحاسہ کہا جاتا ہے اور احسست کے معنی ہیں کسی چیز کو محسوس کرنا۔ بے خودی حواس کے دبانے کے لیے نشہ آور چیزوں کے استعمال سے یا روحانی عالم سکر میں ہوتی ہے۔ یہاں شاعر لسانی سطح پر بے نیاز ہو گیا ہے یا ناواقف ہے۔ ان الفاظ کے اساسی تلازمات سے صفحہ ۵۶ پر غالب کی زمین میں غزل، بہت ہی عامیانہ ہے۔ "روح کی مدہوش بیداری کا ساماں ہو گئیں۔" یہ مصرع ذوق سلیم پر گراں گزرتا ہے کہ مدہوش بیداری مہمل ترکیب ہے۔ سطح تک بندی سے آگے نہیں گئی۔

ماجرائے شوق کی بے باکیاں ان پر نثار
ہائے وہ آنکھیں جو ضبطِ غم میں گریاں ہو گئیں

شاعر جو کہنا چاہتا ہے اور جو اس نے کہا ہے۔ اس میں بہت فاصلہ ہے۔

صفحہ ۹۷ پر نظم ہے "خدا" یہاں شاعر ایک اچھوت ماں کا خدا کا تصور پیش کرتا ہے۔ ماں بچے کو سمجھاتی ہے کہ خدا کیا ہے کون ہے۔ اس نظم کے لیے مجھے اردو میں کوئی مناسب لفظ نظر نہیں آیا۔ پوچ سخت لفظ ہے۔ جو میں مرحوم شاعر کے کلام کے سلسلے میں استعمال نہیں کر سکتا۔ ندرت کی تلاش میں ایک تا حال نا معتبر فکر و وجدان رکھنے والا شاعر بہک گیا ہے۔ یہ اشعار دیکھیے ماں بچے سے کہتی ہے۔

نہیں دیکھا سویرے جوں ہی مندر میں گجر باجا
پہن کر نور کی پوشاک وہ من موہنا راجا
لیے سونے کا چھابا جب ادھر پورب سے آتا ہے
تو ان تاروں کی پگڈنڈی پہ جھاڑو دے کے جاتا ہے

دو مصرعے آگے چل کر شاعر کہتا ہے کہ پرمیشور (خدا) اونچی ذات والا ہے۔ دیکھو بات کیسی بے ربط ہو گئی۔ اونچی ذات والے تو چھابا اور جھاڑو لے کر نہیں نکلتے وہ نور ہی کے کیوں نہ ہوں۔ اور ایک لسانی سطح کی بات پائیلیا موری باجے تک تو بات ٹھیک ہے۔ خوب صورت بھی ہے۔ لیکن "باجا" میں نے آج تک اردو میں کبھی ان معنوں میں نہیں دیکھا۔ کہ باجا ساز کو کہتے ہیں۔ "پربتوں میں درد سے یوں راگ سے جیسے باجا۔" اور یہ لفظ آتے ہی دھیان موسیقی کے ایک خاص ساز کی طرف جاتا ہے۔ جس قاری کو اس معروضے کی صحت پر شبہ ہو فرہنگ آصفیہ، نور اللغات یا کوئی اور مستند اردو لغات اٹھا کر اس لفظ کے معنی دیکھ سکتا ہے۔ ان چند جملوں میں میں نے مجید امجد کے "شب رفتہ" میں شامل کلام کی عام سطح قاری کے سامنے رکھ دی ہے۔ اب میں ان کے اس کلام سے چند مثالیں پیش کروں گا جو انھوں نے اپنے تخلیقی جوہر کو حتی الامکاں سنوار نکھار کر، ایک عمر کی شبانہ روز مشق کے بعد کہا تھا۔ لیکن اس سے پہلے میں اک اور بات مجملاً

کہنا ضروری سمجھتا ہوں ۔ مجید امجد کے کلام میں Exclamatory لفظوں کا استعمال بہت فراواں ہے ۔ ارے ۔ آہ ۔ ہائے ۔ ری ری ری ۔ ارے رے وغیرہ ۔ نوجوان قاری کو یہاں ایک خطرے سے آگاہ کرنا ضروری ہے جب جہاں ایسی استعجابیہ ندا یا پکار سنو سمجھ لو کہ شاعر عجزِ بیان سے عالم اضطرار میں ہے ۔ یہ الفاظ شاعری کو ہلاک کر دیتے ہیں ۔ ایسی کریہہ اصوات تو رجز اور خطابیہ شاعری میں بھی نہیں آسکتیں ۔ نومشق شاعر کو ان آوازوں سے یوں اجتناب کرنا چاہیے جس طرح عام انسان چرس گانجے سے کرتے ہیں بلکہ یوں کہو زہر ہلاہل سے ۔

نظم "پنواڑی" میں شاعر لسانی سطح پر "میراجی" کے ہندی آمیز شعری لہجے سے متاثر نظر آتا ہے ۔ اس نظم میں جذبے کا خلوص بھی ہے ۔ بیان ہموار بھی ہے اور سچا بھی ۔ غریب لوگ نسل بعد نسل ایک ہی کام کرتے زندگی گزار دیتے ہیں ۔ اس نظم میں کئی اور نظموں کی طرح ترقی پسند تحریک کے آدرش کی گونج بھی ہے ۔ یہ بات کہ شاعر ابھی تک اپنے اسلوب اور لفظوں کے استعمال میں چوکس نہیں "واماندہ" میں صراحت سے سامنے آتی ہے ۔ پہلے شعر کا دوسرا مصرع ہے ۔

میری واماندگی پہ ہنس گزرے

میں یہاں ہنس گزرے کے بارے میں ذرا مشکل میں ہوں ۔ کہ ہنس گزرنا ، رو گزرنا کسی معتبر کلاسیک شاعر کے کلام میں میری نظر سے نہیں گزرا ۔ "ایک نظم" خیال اور اظہار دونوں سطوح پر مجید امجد کی عام سطح کلام سے بہتر نظم ہے ۔ کہ خطاب اور مبالغے سے پاک ہے آخری بند موثر ہے

کیا عجب ہے میرے سینے کا شرر
اک تمنائے بغل گیری کے سات
وقت کے مرگھٹ پہ باہیں کھول دے
اک نرالی صبح بن جائے یہ رات

لیکن یہ سطح تو یوسف ظفر اور قیوم نظر کی عام سطح سے کم تر ہے ۔ نظم "بن کی چڑیا" میں بھی میراجی کی گونج ہے ۔ یہ مصرع دیکھیے ۔ ایک بات کہہ کر پھر اسے سوال کی صورت میں دہرانا میراجی کے اسلوب کی ایک مخصوص لے ہے:

کون سنے ہاں کون سنے راگ اس کے البیلے
سب کے سب بہرے ہیں میداں ، وادی ، دریا ، ٹیلے

"بارش کے بعد" کے جو "بن کی چڑیا" کے بعد آتی ہے ۔ دو ایک مصرعوں میں ن ۔ م ۔ راشد کا لہجہ آگیا ہے:

چہرہ ۔ شہر پہ دو شوخ لٹوں کا جادو
جس کے دو رویہ پرآشوب مکیں گاہوں میں
جسم اور دل کے لذائذ کی صف استادہ

آگے چل کر یہ بند آتا ہے:

جھیل کے تٹ پہ گھنی چھاؤں میں جو گونجالی
ناچتی مکھیوں کی بجتی ہوئی پایل کی وہ تان
سینۂ وقت سے پھوٹی ہوئی موجِ الہام
موت کی نیند ہے گیتوں کی کتابوں میں پڑی

گونجالی کا لفظ میرے لیے نیا تھا۔ مجھے کبھی یہ گمان نہیں ہوا کہ میں اردو زبان کے تمام الفاظ سے واقف ہوں۔ سو میں نے مختلف فرہنگیں دیکھیں۔ یہ لفظ کہیں نہ ملا۔ پنجابی میری مادری زبان ہے اور میں اصلی پنجابی پر جو کھیتوں میں ترنجنوں میں چوپالوں میں بولی جاتی ہے، کامل دسترس رکھتا ہوں۔ میں نے گونجالی کا لفظ آج تک پنجابی میں بھی سنا تھا نہ پڑھا تھا۔ اس نظم کے آخری بند میں شاعر نے صوتی تصاویر بنانے کی کوشش کی ہے:

کنٹلیوں میں یہ شپاشپ یہ تووں پر تڑتڑ
اور وہ اک تال میں کچھ پر جلی چاپیں باقی
یہ لٹکتے ہوئے لقمے، یہ پھڑکتے ہوئے گھونٹ
"مے کی ہر بوند۔ متاعِ دو جہاں ہے ساقی"

چھابے۔ہڈیاں۔ کٹھلیاں۔ ہنڈیا۔ چولھا۔ توا، گھریلو استعمال کی چیزیں اور "پس خوردہ مجید امجد کے کلام میں بار بار آتے ہیں۔ شاعر یہ بتانے پر تلا نظر آتا ہے کہ وہ لوئر مڈل طبقے کا آدمی ہے۔ یہ ترقی پسند ادب کے لیے ایک خوبی کی بات ہے اور شاعروں کو اعلیٰ شاعر بنا دیتی ہے۔ مجھے کلیات کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوا کہ مجید امجد فطری طور پر فقیر منش ہیں سو استحصال کے خلاف ہونا ان کے لیے ایک فطری تقاضا ہے۔ صرف ایک فیشن ایبل تحریک سے وابستگی کا اظہار نہیں۔ میرے اس اندازے کی اگلی چند نظموں میں تصدیق ہو گئی۔ نظم "میں ایک پر نشاط جلوس کے ساتھ ایک معصوم انسان کا بازار حسن کی زیارت کے لیے جانے کا بیان ہے۔ اس زمانے میں قوم کی ان بد نصیب بیٹیوں کے لیے، ہمدردی ترقی پسند ادیبوں کا ایک اساسی موضوع تھی۔ شاید کوئی شریف لڑکی اس بازار کے نواحی علاقے میں رہتی تھی۔ یا شاید وہیں کی رہنے والی تھی جسے کبھی سرِ راہ دیکھ لیا تھا اور اس کے پیچھے چلتے چلتے اسے یہاں آتے دیکھ لیا تھا۔ شاید بسنت کا جلوس ہے۔ یا شاید کسی اور پر مسرت دن کا۔ اور نظم یہ بتاتی ہے کہ شاعر ایسے ہی کسی اور جلوس میں اب سے پہلے بھی ادھر آ چکا ہے۔ اور وقت رات کا ہے کیوں کہ:

نیچے خلعت پوش بازاروں میں سیلابِ سرور
ناچتے پاؤں۔ تھرکتی بانہیں۔ محو نغمہ ہونٹ

شاعر اپنے مقصود نظر کی شخصیت کا تعین اس بند میں کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن

اس کے باوصف یہ آخر تک نہیں کھلتا کہ وہ بازار حسن ہی کی کوئی گل عذار ہے یا کسی شریف گھرانے کی نوخیز لڑکی ہے۔

شاید اب کے پھر بھی ۔ شوقِ دید کے احساس سے
تو بھی آنکلے سرِ بام --- آہ یہ سودائے خام

ظاہر ہے وہ نہیں آئے گی کہ وہ تو پہلے بھی محض اتفاق سے نظر آگئی تھی ۔ سو وہ شریف زادی ہے ۔ ذرا رکیے ۔ ایک بات اور عجز بیان کی! شاید اب کے پھر بھی ۔ کیا معنی ہوئے؟ شاید اب کے بھی ۔ یا شاید اب کے پھر! اب کے پھر بھی تو نحوی لحاظ سے نہایت بھونڈا اور غلط جملہ ہے شاعر کہتا ہے ۔ اپنے بارے میں آ ۔ جارہا ہوں زر فشاں پوشاک میں لپٹا ہوا ۔

زر فشاں پوشاک کے نیچے دلِ حسرت نصیب
اک شرر پیراہنِ خاشاک میں لپٹا ہوا

شاعر زر فشاں لباس میں کیوں ملبوس ہے؟ اب تک تو یہ گماں سا تھا کہ وہ اس پر نشاط جلوس میں اس لیے شامل ہے کہ شاید راہ میں سرِ بام جلوہ مطلوب کی ایک جھلک نظر آجائے ۔ مگر اب وہ بتارہا ہے کہ وہ زر فشاں لباس پہنے ہوئے ہے ۔ کیا وہ گھر سے نکلا تھا اس لباس فاخرہ میں تو ارادہ نماز عید میں شریک ہونے تھا؟ کہ عید گاہ بازار حسن کے قریب ہی تھی اور اس تک اس بازار حسن سے گزر کر ہی پہنچا جاسکتا تھا ۔ اگر یہ جلوس نمازیوں کا نہیں تو پھر کون سا نشاط ہنگام ہے اور شاعر اس میں " زر فشاں لباس میں ملبوس " ہو کر کیوں شامل ہوا ہے ۔ اس ابہام سے نظم جو ویسے بھی بے ہنری کی مثال تھی غارت ہو کر رہ گئی ۔ آخری بند بیانیہ ہے ۔ Evocative اور یہ مصرعے اچھے ہیں:

کس کا چہرہ ہے؟ کہیں ان گھونگھٹوں کے درمیاں
چوڑیوں والی کلائی؟ جھومروں والی جبیں
مٹھیوں پر سے پھسلتا ہی نہیں کنکر کوئی
کون ہے موجود؟ جو موجود بھی شاید نہیں

یہاں نظم کو نفسیاتی پرتیں دینے کی کوشش آخری مصرعے میں صاف نمایاں ہے لیکن یہ محبوبہ کون ہے ۔ جو گھونگھٹوں کے درمیان ہوتی ہے ۔ اس کی کلائی میں چوڑیاں ہیں ۔ جبیں جھومروں والی ہے؟ اب آپ اندازہ لگائیے کہ شاعر کس رنگ ڈھنگ کس طبقے کی ۔ عورت کی دید کا طالب ہے ۔ میں تو باوجود کوشش کے سمجھ نہیں پایا ۔ ہو سکتا ہے کہ یہ میری پریشاں نظری ہو ۔ لیکن کیا یہ امکان نہیں کہ شاعر خود Confusion کا شکار ہے ۔ اور اس سے نظم نہیں بن پائی اب اللہ اللہ کر کے دو غزلیں آتی ہیں ۔ اور پہلی غزل میں روایتی خیال روایتی بیان میں سامنے آتے ہیں:

کوئی نہیں جہاں میں ۔ کوئی نہیں کسی کا

ندرت کی کوشش اس سطح تک پہنچی ہے:

میری سیہ شبی نے اک عمر آرزو کی
لرزے کبھی افق پر تاگا سا روشنی کا

غزل کے لیے ضروری ہے کہ دو مصرعوں میں کوئی غیر ضروری لفظ نہ ہو ۔ یہاں " تاگا پر غور کرو تو اس کا کوئی مبہم رشتہ اور کسی لفظ یا خیال سے نہیں "لرزے کبھی افق پر تاگا سا روشنی کا" یہ تاگا سا کی جگہ اک خط سا" لکھ دیتے تو کیا فرق پڑتا ۔ فرق یہ پڑتا کہ شاعر لوہار یا درزی ہونے کے بجائے مصور نظر آتا ہے ۔ ذرا آگے بڑھیے ، یہ شعر عجز بیان اور Confused thinking کی ایسی مثال ہے جو مجید امجد کے ہر دور کے کلام میں جا بجا نظر آتی ہے:

اس التفات پر ہوں لاکھ التفات قرباں
مجھ سے کبھی نہ پھیرا رخ تو نے بے رخی کا

" کبھی نہ پھیرا رخ تو نے بے رخی کا" یہ لفظوں کی صناعی نہیں لفظوں پر ناروا ظلم کی گواہی ہے ۔ اگلی غزل کا مطلع ہی Doggerel ہے:

آغازِ گلستاں کو بہ مضرابِ خار چھیڑ
مطرب کوئی ترانہ بہ یادِ بہار چھیڑ

بے ضرورت مفرس بیان اس لیے آیا کہ "بہ" کے بغیر شاعر خار کا قافیہ باندھنے کی توفیق نہیں رکھتا تھا ۔ دوسرا شعر اور بھی غریب ہے ۔ بیان کی سطح پر:

سوئے ہوئے سکوتِ چمن کو ذرا جگا
کچھ تو نواطراز غمِ روزگار چھیڑ

یہاں شعر میں دو مقامات متناقض ہیں ۔ سکوت کو جگانا اور سکوت کا سویا پڑا ہونا کیا معنی رکھتے ہیں ناصر کاظمی نے تو اچھی اور تازہ بات کی تھی جب یہ کہا تھا:

ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناصر
اداسی بال کھولے سو رہی ہے

سکوت سویا ہوا ہو تو وہ پطرس والی بات یاد آتی ہے ۔ "ایک تو کتا اور پھر بہت ہی کتا" ۔ سویا ہوا سکوت کسی زبان کے ادب میں میری نگاہ سے آج تک نہیں گزرا ۔ یہ بے معنی بیان ہے اور پھر دوسرے مصرعے میں شاعر کیا درخواست کر رہا ہے " نواطراز غم روزگار کچھ تو چھیڑو ۔" یہاں نواطراز کہہ کر یہ سمجھ لینا کہ کچھ تو چھیڑنے کا مطلب کوئی نغمہ کیسا ہی ہو چھیڑنے کی درخواست ہے قطعاً بے جواز ہے ۔ اب صرف ایک اور مصرعے پر قاری کو دعوت فکر دوں گا:

"ہر خس ہے ایک ساز نوا در کنار چھیڑ"

لیا دانتوں میں جو تنکا ہوا ریشہ نیستاں کا۔ شاعر یوں بات کرتا ہے! ساز ہے تو اس لفظ میں خود مضمر ہے۔ نوادر کنار "زواید" کی ایک واضح مثال ہے۔ آخری شعر میں معنی کو مشورہ دیتے ہیں:

پژمردہ شاخسار پہ جھک کر ستار چھیڑ

شاخسار اور شاخ کے معنی میں فرق ہے۔ شاخسار درختوں کے جھنڈ کو کہتے ہیں۔ اردو کی سب فرہنگوں میں یہی معنی ہیں اردو انگریزی کی مستند ڈکشنری Platts میں بھی اس کے معنی ہیں A place abonding in trees ۔ غالب نے اپنی ایک غزل میں یہ لفظ دو اشعار میں استعمال کیا ہے یوں:

بجنگ باج ستانان شاخساری را
تہی سبد ز درِ گلستاں بگردانیم
بہ صلح بال فشانانِ صبح گاہی را
زشاخسار سوئے آشیاں بگردانیم

ہر دو جگہ معنی درختوں کے جھنڈ کے ہیں۔ جنگ ہے تو ہم درختوں کے جھنڈ سے خراج کی خواہش لے کر آنے والوں کو خالی ہاتھ گلستان سے لوٹا دیں گے۔ صلح ہو تو صبح گاہاں اڑنے کے لیے پروں کو پھڑپھڑاتے پرندوں کو شاخسار سے ان کے آشیانوں میں بھیج دیں گے کہ جاؤ آرام کرو۔ تمھارا رزق تمھیں وہیں مل جائے گا۔ یہ بات میں نے صراحت سے اس لیے کی ہے کہ فارسی زبان کا علم ہمارے بیش تر معاصر ادیبوں میں بالخصوص پچاس برس کی عمر تک کے تخلیق کاروں میں نہ ہونے کے برابر ہے سو وہ فارسی الفاظ کے تلازمات جانے بغیر انھیں استعمال کرتے ہیں۔ ایک شاعرہ نے دل کا غبار اترنے کو اس معنی میں استعمال کیا ہے کہ جب میری نظر کے سامنے جو گرد جو دھند چھائی تھی چھٹ گئی۔ حالاں کہ دل کا غبار کے معنی کینہ اور ایسے ہی ناخوش گوار جذبات و احساسات ہیں۔ شاعری لفظوں کے جمال کو نکھارنے کا عمل ہے اور اس عمل کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ شاعر ان لفظوں کے تمام معانی، تمام تلازمات سے واقف ہو۔ بے علم شاعر اچھا تو کیا صحیح شعر بھی کم ہی کہہ سکتا ہے۔

اب پھر مصرع دیکھیے "پژمردہ شاخسار پہ جھک کر ستار چھیڑ" سارا باغ درختوں کا سارا جھنڈ مرجھا گیا ہے۔ تو کیا مغنی بازی گر ہے کہ ان پر جھک کر ستار بجائے اور ستار بجانے کے لیے جھکنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں نے گذشتہ پچاس برسوں میں برصغیر کے سارے عظیم ستار نوازوں اور سرود نوازوں کو اپنا ساز بجاتے دیکھا اور سنا ہے۔ استاد ولایت خاں اور اب ہمارے ہاں کا عظیم استاد رئیس خان ستار بجانے لگتے ہیں تو ستار ان کے پہلوؤں میں ہوتا ہے۔ اور وہ کمر سیدھی کر کے بیٹھتے ہیں۔ یوں نہ بیٹھیں تو مندر استھان کے سر ساز سے نہیں نکال سکیں گے کہ مضراب

والے ہاتھ پڑے ہوں تو مضراب ستار کے اوپر کے حصے تک پہنچ گا ہی نہیں - یہ تو محض مشاہدے کی بات تھی - شاید مجید امجد صاحب نے کسی اچھے ستار نواز کو ستار بجاتے نہیں دیکھا تھا - ستار بجاتے ہوئے تھوڑا سا جھکاؤ ستار نواز کے بدن میں اسی وقت آتا ہے جب وہ انتہائی تیز یعنی درت لے میں گت بجاتا ہے اور گت کا نکھار مدھ اور تار استھانوں کے سروں میں ابھرتا ہو - اس لے میں بھی جب مندر استھان کے سر آئیں گے تو کمر سیدھی ہو جائے گی - مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے ۱۹۶۲ء میں بھی مجید امجد صاحب کے بارے میں کہا تھا کہ ان کا مشاہدہ معتبر نہیں -

اب ایک اچھی فکر انگیز نظم سامنے آگئی ہے - عام سطح آخر تک ویسی ہی ہے جو میں ان چند معروضات میں اب تک مثالیں دے کر دکھا چکا ہوں - لیکن "امروز" مجید کی اعلیٰ شاعری میں شامل ہے - اور یہ مثالیں استثنائی حیثیت رکھتی ہیں - جیسے لق و دق ، بے برگ و گیاہ ریگستان میں یکایک چشمۂ آب صافی کے کنارے نخلستان نظر آجائے - اور لہجے میں مٹھاس بھی ہے بانک پن بھی - موضوع وقت میں انسان کا مقدر یا غم و طرب میں اس کا حصہ ہے:

ابد کے سمندر کی اک موج جس پر مری زندگی کا کنول تیرتا ہے
کسی ان سنی دائمی راگنی کی کوئی تان - آزردہ - آوارہ - برباد

برباد یہاں ان معنوں میں ہے جن معنوں میں حافظ نے اس مصرع میں استعمال کیا ہے

"بیار بادہ کہ بنیادِ دہر برباد است"

یعنی ہوا کی موج پر:

جو دم بھر کو آکر مری الجھی الجھی سی سانسوں کے سنگیت میں مل گئی ہے
زمانے کی پھیلی ہوئی بے کراں وسعتوں میں یہ دو چار لمحوں کی معیاد

یہاں پھر مشاہدہ غلط ہے سانسیں الجھی سی ہوں تو گلوکار کے اندر سے نوا نہیں پھوٹتی کہ سنگیت کے لیے ضروری ہے کہ سانس پر پوری قدرت اور سانس کا آنا جانا ہم رفتار ہو - الجھی سانس کے زیادہ الجھنے پر وہ حالت ہوتی ہے جسے اہل زبان لوگ کہتے ہیں کہ نرخرہ بجنے لگا -

آگے کے چار مصرعے سوائے لفظ رومان کے بہت اچھے ہیں Romance کا ترجمہ رومان ہے - رومان صحیح بغیر نون کے اعلان کے روماں غلط - یہ بات فکر کی سطح پر محکم ہے -

یہ جو کچھ کہ میرے زمانے میں ہے اور یہ جو کچھ کہ اس کے زمانے میں میں ہوں -
یہی میرا حصہ - ازل سے ابد کے خزانوں سے ہے بس یہی میرا حصہ

ازل سے ابد کے کی جگہ "ازل سے ابد تک کے" ہونا چاہیے تھا - مگر بحر نے وہ گنجائش فراہم نہ کی - اسے ذرا سا بدل کر مصرع کو بیان کی حد تک درست کیا جا سکتا تھا - یہی میرا حصہ ازل تا ابد کے خزانوں میں ہے - یا یہی میرا حصہ ازل کے ابد کے خزانوں سے ہے -

دوسرے بند کے پہلے چار مصرعے بھی لفظوں کی صناعی کی اچھی سطح پر ہیں -

مجھے کیا خبر۔ وقت کے دیوتا کی حسیں رتھ کے پہیوں تلے پس چکے ہیں
مقدر کے کتنے کھلونے! زمانوں کے ہنگامے صدیوں کے صدہا ہیولے
مجھے کیا تعلق ۔ مری آخری سانس کے بعد بھی دوش گیتی پہ مچلے
مہہ و سال کے لازوال آبشار رواں کا وہ آنچل جو تاروں کو چھو لے

"لازوال آبشار رواں " میں اے کاش یہ "لازوال " نہ ہوتا یا رواں حذف کیا جاسکتا ۔ کہ آبشار لازوال ہے تو معنی ہوئے کہ جاری وساری ہے ۔ اور آبشار رواں ہو تو مہہ و سال کے تعلق سے وہ ایک ابدی روانی ہے ۔ ایسے غیر ضروری الفاظ شعر کا سچا ذوق اور بیدار ذوق جمال رکھنے والے پر گراں گزرتے ہیں ۔ دوسرے بند کے آخری چار مصرعوں کا بیان "آہ" سے شروع ہوتا ہے جو یہاں قطعاً غیر ضروری ہے ۔ مگر آہ یہ لمحہ ۔ مختصر ۔ عمر کا مختصر ہونا مقام فریاد تو نہیں کہ "نہ ہو مرنا تو جینے کا مزہ کیا ۔ " اور ہمارا شاعر مجید امجد بھی اس لبالب پیالے کے اپنی ہتھیلی پہ ہونے اور بس میں ہونے کا ذکر کر رہا ہے تو پھر آہ کیوں ۔ یہ تو سرخوشی کا لمحہ ہے ۔ آخری مصرع میں پھر ایک لفظی لغزش نظر آتی ہے ۔

یہ اک مہلتِ کاوش دردِ ہستی
یہ اک فرصتِ کوشش آہ و نالہ

کاوش کے رائج مفاہیم میں انسان کی سعی کا ہونا لازمی ہے ۔ دردِ ہستی تو امرِ اضطراری ہے کاوش کا ہم وزن لفظ کاہش جو کہ بہتر متبادل تو نہیں مگر کاوش سے بہتر ہے ۔

آخری بند میں دیکھیے یہ صہبائے امروز ۔ جو صبح کی شاہزادی کی مست انکھڑیوں سے ٹپک کر بدورِ حیات آگئی ہے ۔ میں معافی چاہتا ہوں میرا دل اب مجید امجد سے ہمدردی اور شراکت عجز سے تڑپنے لگا ہے ۔ مگر مجبور ہوں ۔ یہ "یہ بدورِ حیات آگیا ہے " تاب سے کہیں زیادہ بوجھل ہے ۔ آخری دو مصرعے بہت اچھے ہیں اور بیدار سماعت کے لیے بھی خوش صوت ہیں ۔

یہ اشکوں سے شاداب دو چار صبحیں ، یہ آہوں سے معمور دو چار شامیں
ان ہی چلمنوں سے مجھے دیکھنا ہے ، وہ جو کچھ کہ نظروں کی زد میں نہیں ہے

یہ نظم ان خامیوں سے منزہ ہوتی جن کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے تو عصری ادب کی اچھی تخلیقات میں شمار ہوتی ۔ اب بھی مجید امجد کے کلام کی اوسط سطح سے بلند تر ہے ۔

" راتوں کو " یہ اب تک کے مطالعے میں مجید امجد کی سب سے بہتر نظم ہے ۔ اسلوبی سطح پر اس میں جمال بھی زیادہ ہے ۔ اور بے ساختگی اور Spontanity بھی وافر ہے ۔ تجربے کے بیان میں ڈرامائی عنصر بھی توجہ طلب ہے ۔

احساس کی لہریں ان تاریک جزیروں سے ٹکراتی ہیں
جہاں ننھے پنکھ سنوارتے ہیں

سنگین فصیلوں کے گنبد سے بہرے دار پکارتے ہیں
"کیا کرتا ہے؟"
دل ڈرتا ہے دل ڈرتا ہے ان کالی اکیلی راتوں سے دل ڈرتا ہے۔

یہ بات قابل غور ہے کہ اس نظم میں Rhetoric کا نام و نشان نہیں۔ لفظوں کی بہتات نہیں۔ آخری مصرع بالکل سادگی سے کہہ دیا گیا۔ لفظ سجانے کی کوئی محسوس کاوش نہیں۔ سو تنہائی کی کالی طویل رات کا ہول انگیز منظر نگاہوں کے سامنے ایک مصرع میں کھچ گیا۔ جو اثر مجید امجد اب تک لفظوں کی بھرمار سے کبھی مرتب نہ کر سکے تھے۔ یہاں اس سادہ بیان سے انھوں نے قاری کا دامن تھام لیا ہے۔

شاعر تنہائی میں زندگی کے حزن ملال کو اس کے خوف و ہراس کے مناظر کو محسوس کرتا ہے، چشم تصور سے دیکھتا ہے اور یہ بیانیہ کم سے کم لفظوں میں مکمل ہو جاتا ہے۔

ان سونی تنہا راتوں میں
دل ڈوب کے گذری باتوں میں
جب سوچتا ہے۔ کیا دیکھتا ہے؟
ہر سمت دھوئیں کا بادل ہے
وادی و بیاباں جل تھل ہے
ذخار سمندر سوکھے ہیں۔ پر ہول چٹانیں پگھلی ہیں
دھرتی نے ٹوٹتے تاروں کی جلتی ہوئی لاشیں نگلی ہیں

آخری بند نسبتاً خاصا طویل ہے ۱۴ مصرعوں پر مشتمل۔

ساکت وقت کی بے انت وسعت میں وقت گذراں کی ایک موج انگڑائی لیتی ہے۔ اس طرف اس عناصر کی دنیا میں زمین پر دور کہیں اک چاپ ابھرتی ہے۔ آفاق کی ڈھلوانوں میں اوپر آسمانوں سے سطح زمین تک آتی ہوئی ہر حرکت میں آتی ہے۔ یہاں شاعر نے لفظ استعمال کیا ہے "تحرکن" یہ لفظ کسی لغت میں موجود نہیں۔ لیکن تحرکن سے شاعر نے تحرکنے کے عمل کے ایک خاص انگ کو ساکت کر دیا ہے اس کے لیے اردو میں کوئی لفظ نہیں تھا سو شاعر نے تخلیقی حق استعمال کرتے ہوئے "تحرکن" کا لفظ وضع کیا۔ اور میں سمجھتا ہوں حق صحیح طور پر استعمال ہوا ہے۔ اس لیے ہماری فرہنگ میں اضافہ ہوا ہے۔ وہ تحرکنے کی Movement اس کے ساتھ وقت کے دل کی دھڑکن کی لے میں تغیر ایک تان بن جاتا ہے۔ ایک راگنی Develop ہوتی ہے۔ اور پھر یہ راگنی مسلسل پھیلتی اور وسیع تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ ان راگنیوں کے بھنور میں صدیاں گھوم گئیں:

اس قرن آلود مسافت میں لاکھ آبلے پھوٹے۔ دیپ بجھے

اور آج کے معلوم ضمیر ہستی کا آہنگ تپاں
کس دور کے دیس کے کہروں میں لرزاں لرزاں رقصاں رقصاں
اس سانس کی رو تک پہنچا ہے

شاعر تک روح زماں و مکاں ۔ دوام ۔ Eternity ایک تھر کن میں آپہنچی ہے ۔ اس کی سانس کی رو تک ۔

اس میرے میز پہ جلتی ہوئی قندیل کی لو تک آپہنچی ہے ۔

شاعر کا دل، اس کے چراغ تخلیق کی ضو دوام تک، مطلق تک نہیں پہنچی ۔ دوام خود اس کی ایک شب کی قندیل تک آگیا ہے ۔ یہ شاعر کا لمحۂ انکشاف تھا ۔ کشف کی ساعت ۔ پھر وہ آپ میں لوٹ آیا اور اس کی بے کراں روح اس کے تن میں سمٹ گئی ۔ اب وہ شعور و حواس کی سطح پر پوچھتا ہے:

کون آیا ہے؟ کون آتا ہے؟ کون آئے گا؟
ان جانے من کی مور کھتا کو کیا کیا دھیان گزرتا ہے
دل ڈرتا ہے
دل ڈرتا ہے ۔ ان کالی اکیلی راتوں سے دل ڈرتا ہے ۔

میں نے نقائص کی نشان دہی میں اغماض سے مروت سے کام نہیں لیا تھا ۔ اب مقام تحسین و ستائش ہے تو میں بخل سے کام نہیں لوں گا ۔ وہ مصرع جس میں تین سوال کیے گیے ہیں لمحۂ کشف کی حقیقت کے بارے میں سوال کیے گئے ہیں ۔ لمحۂ کشف سے لے کر فانی دنیا کی تنہائی کو چند لمحوں کے لیے دور کرنے والے مہمان کے تعین کے بارے میں سوال تک:

کون آیا ہے ۔ کون آتا ہے ۔ کون آئے گا؟

میرا دل گواہی دیتا ہے کہ یہ مصرع اس نو الفاظ کی سطر میں وقت گزراں سے لے کر دوام تک کی تمام تر وسعت کا احاطہ کرتا ہے ۔ یہ مصرع ہماری زبان کے عظیم تر مصرعوں میں سے ایک ہے ۔

کون آیا ہے؟ یہ سوال اس کشف کی "دید" کے بارے میں ہے جس کا بیان اس سے پہلے آنے والے تین مصرعوں میں کیا گیا ہے ۔ کہ وہ آنے والا (The known and the unknowable) ہے ۔ سو اس کا جواب تو کچھ نہیں ملا ۔ کہ اس کمشلہ شیئاً عالم محسوس میں اس کا جواب کیوں کر دیا جا سکتا ہے ۔ دوسرا سوال عمومی نوعیت کا ہے کہ ہم ازلی سطح پر تنہا فقیروں کے ہاں کون آتا ہے؟ سوائے روز و شب و ماہ و سال کے اور کوئی نہیں! کون آئے گا؟ اس سوال کا دامن ابد تک کشادہ ہے کون آئے گا ۔ ہم تنہا لوگوں کے ہاں ۔ اور ہر انسان دراصل تنہا ہے ۔ ہمیشہ تنہا رہتا ہے ۔ عالم وصال میں بھی تنہا ہوتا ہے ۔ یہاں آخری سوال یہ ہے کہ بشر جب

تک بشر ہے اس کے کنجِ تنہائی میں کون آئے گا۔ کوئی نہیں۔ کوئی آیا بھی تو وہ بجز تصویر خیالی کے اور کچھ نہ ہوگا۔ اب آگے دیکھیے۔ آخر کے تین مصرعے کس نرمی سے دل کو اپنی گرفت میں لینے والی طلسمی کیفیت سے معمور ہیں۔

آدمی شب کی تنہائی میں کشف دروں سے واپس آتا ہے۔ تو یہ سوال اس کے دل میں ابھرتے ہیں اور پھر وہ کیسے کیسے منظر دیکھتا ہے۔ ایسے مناظر جن کی وسعت اور کیفیت سے دل ڈرتا ہے۔ شاعر کی زندگی اس کے گوشۂ تنہائی میں گزری ہے۔ اور وہ تنہائی کی کالی ختم نہ ہونے والی راتوں کے دامن میں پنہاں امکانات سے ڈرتا ہے۔ یہ نظم بہت نازک ہے ایک بہت عمیق روحانی تجربے پر مبنی ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ نظم جمالیاتی سطح پر اور روحانی سطح پر اپنے اندر زندہ و پائندہ تخلیق کی توانائی رکھتی ہے۔ اور ایسی ہی چند نظمیں ہیں جو اس ضخیم کلیات کے بنجر بیابان میں تازہ بہار کی مہک سے قاری کی تھکن کو تازگی اور فرحت میں بدل دیتی ہیں۔

"روداد زمانہ" ترقی پسند ادب کی ایک اچھی مثال ہے۔

جابجا وقت کے گنبد ہی نظر آتے ہیں
یہی عفریت۔ خدایانِ جہاں کے اب و جد
زیب اور نگ کہیں، زینتِ محراب کہیں!!
ان کی شعلہ سی زباں ہے کہ ازل سے اب تک
چاٹتی آئی ہے ان کانپتی روحوں کا لہو
جن کے ہونٹوں کی ڈلک، جن کی نگاہوں کی چمک
زہر میں ڈوب کے بھی بجھ نہ سکی، بجھ نہ سکی

اس نظم کے مصرعوں میں دو ایک جگہ فیض کی لفظیات کی گونج ہے اور کہیں کہیں ن۔م راشد کے لہجے کی جیسے:

بارہا جنبشِ یک موج کے ہلکورے میں
بہہ گئے غول بیاباں کے گراں ڈیل اجسام

لیکن یہاں مجید امجد اپنے نکھرے ہوئے اسلوب کے ساتھ بھی موجود ہے:

بارہا تند ہوائیں چلیں ، طوفاں آئے
لیکن اک پھول سے چمٹی ہوئی تتلی نہ گری

ناحق کی مرگ آشام آندھیاں حق کی بظاہر ناتواں بے حقیقت شمع کو بجھا نہیں سکتیں۔ حق کی خیر کے پھول سے چمٹی ہوئی تتلی بھی آخری تجربے میں ناحق کے طوفان سے زیادہ توانا ہے۔

یہ نظم بھی اس ناہموار کلیات کی زندہ رہنے والی نظموں میں سے ایک ہے۔ آخری دو مصرعے بھی اچھے ہیں۔ مگر میرا مفروضہ یہ ہے کہ نظم اپنے نقطۂ عروج Climax تک اس سے

وسیلے بیت میں پہنچ گئی تھی۔ اور اسے وہیں ختم ہو جانا چاہیے تھا۔ ادب دوست قاری کو چاہیے کہ وہ اس نظم کے دو آخری مصرعوں کو نظر انداز کر کے اس نظم کی اندرونی جمالیات سے حظ اندوز ہو۔

"اور آج سوچتا ہوں" ایک روایتی مفہوم کی حامل رومانی نظم ہے۔ میں اس کا ذکر یہاں نہ کرتا۔ لیکن اس میں چار تازگی کی لہک اور مہک سے بھرپور مصرعے مجید امجد کی عام سطح خیال سے ہٹ کر ہیں۔

آج اس تمام کاہش جاں سوز کا مآل
دکھتی سی اک خراش جبین خیال پر.........
بھولی سی ایک یاد جو اب بھی کبھی کبھی
پر تولتی ہے کنگرۂ ماہ و سال پر

بہت سلجھے ہوئے، منجھے ہوئے، مصرعے ہیں۔ یہاں سطح ایک اچھے شاعر کی ہے۔ جس کی فکر Mature ہے اور جو اپنے اسلوب اور لفظیات کو سنوار نکھار چکا ہے۔

دو ایک باتیں اور توجہ طلب ہیں سو باقی دو بند بھی یہاں درج کر دینا مناسب محسوس ہوا۔

دنیا تو اک طلوع مسلسل کا نام ہے
لیکن ہماری زیست کی مچلی ہوئی کرن
جب بجھ گئی تو تیرگی لازوال ہے
تو شمع انجمن ہے نہ میں شمع انجمن

پہلا مصرع بذاتہ بہت تیکھا اور فکر انگیز ہے۔ یہ مصرع زندہ رہنے کی توانائی رکھتا ہے کہ اس کا پیغام زندگی کی مسلسل ضیا تابی ہے۔ دنیا یہاں نوعِ حیات کے لیے سمبل ہے۔ زندگی ہمیشہ رفعت پذیر رہے گی کہ اس کا خمیر طلوع مسلسل سے ہے The ever rising sun لیکن افراد فانی ہیں۔ اور من و تو کا معاملہ کائنات کے Grand Design میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اہم چیز وہ ہے جسے اقبال نے یوں بیان کیا۔

گل اس شاخ سے ٹوٹتے بھی رہے	اسی شاخ سے پھوٹتے بھی رہے
سمجھتے ہیں ناداں اسے بے ثبات	ابھرتا ہے مٹ مٹ کے نقش حیات
سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی	فقط ذوق پرواز ہے زندگی
کرن چاند میں ہے شرر سنگ میں	یہ بے رنگ ہے ڈوب کر رنگ میں

آخری بند میں شاعر Romantic کا چولا اتار کر یکایک Realist ہو جاتا ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ یہی Sensibility مجید امجد کی اصل شناخت ہے۔ وہ زندگی کے حقائق سے کسی وقتی سرشاری کے عالم میں بھی بے خبر نہیں ہوتا:

یہ غم نہیں کہ قصۂ لیل و نہار میں
ہم اک حسین باب نہ ایزاد کر سکے
افسوس یہ ہے جی تو رہا ہوں ترے بغیر
لیکن یہ سوچ تیرے لیے کون مر سکے!

یہاں مجید امجد صاحب نے معشوق دل نواز کو بھی بتادیا کہ میری جان تو شمع نہیں کہ پروانے صف در صف تجھ پر آکر نثار ہوتے چلے جائیں۔ تو شمع نہیں عام عورت ہے۔ اور متاسفانہ حقیقت یہ امر ہے کہ تیرے لیے کسی نے جان دی ہے نہ کوئی جان دے گا۔ تیری زندگی بس حوا کی عام بیٹیوں کی سی ہوگی۔ میں بھی ایک عام ابن آدم ہوں کہ ہمہ عمر محنت شاقہ کروں گا اور پھر مرجاؤں گا۔

"مشرق و مغرب" ترقی پسند شاعری کی عام سطح سے برتر سطح کی نظم ہے۔ اور اس میں اسلوب بھی نکھا ہوا ہے۔

"نژاد نو" مجید امجد کی برتر سطح کی نظموں میں وقیع مقام رکھتی ہے۔ اور اس میں وجدان اور فکر دونوں کی سطح معتبر اور موقر ہے۔ نظم کا اساسی موضوع غلام پس ماندہ اقوام کی زبوں حالی ہے۔ پس ماندہ غلام اقوام کے افراد روحانی، معاشی، معاشرتی ہر سطح پر Subhuman زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔ وہ اپنی نئی نسل کو انفرادی وجود کی نمود اور تکمیل اور اس کی مضمر صلاحیتوں کو نکھارنے کے مواقع فراہم نہیں کر سکتے۔ یہ سسکتی زندگی نادر دوراں کارنامے سرانجام نہیں دے سکتی۔ یہ بچے اگر ماحول سازگار ملے تو کائنات کو مسخر کر سکتے ہیں، جہاں بان و جہاں کشا ہو سکتے ہیں مگر نہیں ہو سکیں گے۔

پہلے بند میں الیفرو ایشیا کے چوتھے اور پانچویں عشرے کی جہل و عشرت میں مبتلا اقوام کی نژاد نو کی، کمسن بچوں کی زندگی کی تصویر کشی بہت زیبائی سے کی گئی ہے۔

برہنہ سر ہیں، برہنہ تن ہیں، برہنہ پا ہیں
شریر روحیں
ضمیرِ ہستی کی آبروئیں۔
چٹکتی کلیاں کہ جن سے بوڑھی اداس گلیاں
مہک رہی ہیں۔
غریب بچے کہ جو شعاعِ سحر گہی ہیں
ہماری قبروں پہ گرتے اشکوں کا سلسلہ ہیں۔
یہ شاعری معتبر اور لائق سپاس سطح کی ہے۔

"چٹکتی کلیاں، کہ جن سے بوڑھی اداس گلیاں، مہک رہی ہیں" وہ مصرعے ہیں جنھیں ایلیٹ

The illuminated lines کہتا ہے۔ اور پھر دیکھو ان نوخیز بچوں کا المیہ کرب ہر روز جب سحر طلوع ہوتی ہے تو وہ اس المناک خبر کا ہمارے سامنے اعادہ کرتی ہے کہ یہ مہکتی زندگی جو بے انت صلاحیتوں سے نوازی گئی ہے، ہماری جہالت اور پس ماندگی کے باعث بے کار زندگی میں بدل گئی ہے۔ اور اگلی نسل پس ماندگی کی ذلت آمیز مدت گزار کر ماضی کے قبرستان میں چلی جائے گی۔ قدرت نے اپنے آنسوؤں کو ان بچوں کی شکل دے دی ہے جو وہ ہم زندہ مردوں کی قبروں پر گرا رہی ہے۔

اگلے بند میں شاعر وہ تابناک منظر دکھاتا ہے جو حالات کے بدلنے سے یہ نژاد نو زمین پر بچھا سکتی:

وہ منزلیں، جن کی جھلکیوں کو ہماری راہیں
ترس رہی ہیں۔
انھیں کے قدموں میں بس رہی ہیں۔
حسین خوابوں
کی دھندلی دنیائیں جو سرابوں
کا روپ دھارے
ہمارے احساس پر شرارے
انڈیلتی ہیں۔

شاعر تغیر کے امکان سے غافل نہیں۔ ایک مبہم سی آس تو ہے لیکن وہ آس بر نہ آئی تو کیا ہوگا؟ پھر یہ ساری کائنات وجود بے معنی اور بے حقیقت ہی رہے گی جیسی کہ اب ہے!

یہ توتلی نوخرام روحیں کہ جن کی ہر سانس انگبیں ہے
اگر ان ہی کونپلوں کی قسمت میں ناز بالیدگی نہیں ہے
تو بہتی ندیوں
میں آنے والی ہزار صدیوں
کا یہ تلاطم
، سکوت مبہم کا یہ ترنم
یہ جھونکے جھونکے میں کھلتے گھونگھٹ نئی رتوں کے
تھکی خلاؤں
میں لاکھ ان دیکھی کہکشاؤں
کی کاوش رم
ہزار ناآفریدہ عالم

تمام باطل!
نہ ان کا مقصد نہ ان کا حاصل
اگر ان ہی کو نپلوں کی قسمت میں ناز بالیدگی نہیں ہے۔

یہ نظم مجید امجد کے تصور حیات کو پوری صراحت سے سامنے لاتی ہے
یہ ساری کائنات نوع انسانی کی توفیق خود آگہی اور ذوق تکمیل کے لیے ہے۔
اگر انسانیت نوعی سطح پر خرسند و شادمان اپنا سفر ارتقا جاری نہیں رکھ سکتی۔
اگر کوئی آدمی زادہ اپنی تمام برتر صلاحیتوں کا حسب دل خواہ اظہار کرنے کے مواقع سے محروم رہتا ہے تو پھر یہ سارا عالم ہست محض ایک فریب ہے۔ باطل ہے۔ بقول عہد نامۂ عتیق All is vanity ۔ مجید امجد ایک بہتر دنیا کے خواب دیکھتا ہے۔ ایسی دنیا کے جو انسانی مساوات اور معاشرتی عدل کے اصولوں پر نئے سرے سے منظم کی گئی ہو۔ جس میں ہر شخص کو وہ عورت ہو کہ مرد خود شناسی اور تعمیر و تکمیل ذات کے وسائل میسر ہوں۔

میں نے مجید امجد کی برتر نظموں کی یہ چند مثالیں پیش کر کے مجید امجد کے جوہر اور اس کی تخلیقی کارگزاری کی وہ سطح قاری کے سامنے رکھ دی ہے جس سے وہ ایک قابل لحاظ تخلیق کار کا عصری ادب میں اپنے لیے مقام متعین کرلیتا ہے ۔ مجید امجد ، قیوم نظر اور یوسف ظفر کے Age Group کا شاعر ہے۔ اپنی اعلیٰ ترین سطح پر وہ اپنے ان معاصر شعرا سے بہتر ہے۔ مگر بالعموم وہ ان ہی کے پائے کا شاعر ہے۔ یوسف ظفر اور قیوم نظر نے جہاں تک مجھے ان کا کلام پڑھنے کا شرف حاصل رہا ہے غزل میں کوئی زندہ جاوداں شعر نہیں کہا۔ قیوم نظر کی غزل کا عمومی معیار مجید امجد کی غزلوں سے بہتر ہے کہ مجید امجد کی غزل کا اسلوب بوجھل ہے اور اس میں آورد بہت نمایاں ہے مثال کے طور پر ان کے مخصوص لہجے کے چند ابیات یہاں نقل کیے دیتا ہوں۔

ہے اس چمن میں نالہ ، صد عندلیب بھی
صرف ایک شورِ قافلہ ، رنگ و بو نہیں
چمن چمن میں بہ طغیان رنگ لالہ پھرو
ختن ختن میں بہ انبوہ صد غزالہ پھرو
سجا کے ہونٹوں پہ اک جشن زہر خند چلو
چھپا کے سینے میں صد موج آہ و نالہ پھرو

یہاں خاک کر مک دانہ جو بھی شریک رقصِ حیات ہے

نہ بس ایک جلوہ طور ہے نہ بس ایک شوقِ کلیم ہے

بیش تر غزلوں میں یہی لہجہ ہے۔ لفظیات میں بھی یہی بوجھل پن ہے۔ ایک آدھ غزل میراجی اور آرزو لکھنوی کے ہندی آمیز لہجے والی بھی ہے۔ مگر غزل میں مجید امجد کے پاس کوئی مضمون تازہ کوئی نیا آہنگ نہیں۔ جب مجید امجد کی غزل سامنے آئی معاً شیکسپیر، کا شہرہ آفاق مصرع ذہن میں گونجنے لگا

Full of sound had fury signifying nothing

اور ایلیٹ کا مصرع یہ ان غزلوں کے مطالعے کے بعد بے اختیار زبان پر آگیا!

Hear in no great matter میں نے اجمالاً مجید امجد کے پست و بلند کے Parameters کا تعین کر دیا ہے۔ لیکن یہاں بات مکمل نہیں ہو جاتی۔ خوشی محمد ناظر نے ساری عمر شاعری کی۔ جو تیسرے درجے کی بھی نہیں تھی۔ لیکن ایک لمحۂ تاباں میں وہ "جوگی" تخلیق کر گیا۔ جو اردو کی زندہ جاوداں نظموں میں ہمیشہ شامل رہے گی۔ اس طرح اسماعیل میرٹھی کی نظم "بارش کا پہلا قطرہ" ایک شاہکار ہے۔ اور یہی نظم اسماعیل میرٹھی کا حاصل عمر ہے۔ مجید امجد نے چند اچھی نظمیں کہی ہیں۔ غزل میں بھی وہ ایک زندہ جاوداں شعر کہہ گیا ہے۔ جو اردو کے یادگار ابیات میں جگہ پاکر ہماری اجتماعی جمالیاتی Sensibility میں شامل ہو جائے گا۔

میں روز ادھر سے گزرتا ہوں ، کون دیکھتا ہے

میں جب ادھر سے نہ گزروں گا ، کون دیکھے گا

یہ بے مثال شعر ہے۔ یہ بات ہر شاعر نے کہی ہے۔ ہومر سے لے کر عصر رواں کے معتبر شعرا تک۔ لیکن اپنے اس شعر میں مجید امجد سب سے الگ کھڑا نظر آتا ہے۔ وہ ہمارے ادبی سرمایے میں یہ شعر Contribute کر گیا۔ یہ شعر اس کا نام آئندہ نسلوں کو بھی یاد دلاتا رہے گا اور مجید امجد کے پورے کلام کا جائزہ لینے والے پر ایک اضطراری کیفیت طاری کرتا رہے گا، دور بہ دور۔ لیکن ابھی ایک بڑی نظم کا تذکرہ باقی ہے۔ یہ نظم ہر اعتبار سے ایک بڑی نظم ہے جس میں یکایک مجید امجد کی عمر بھر کی ریاضت اپنی انتہائی رفعت پر پہنچ جاتی ہے۔ اور وجدان یوں روشن ہوتا ہے کہ ایک زندہ و پائندہ نظم تخلیق ہو جاتی ہے جو نادر فنی مہارت کا کرشمہ نظر آتی ہے۔ اس نظم میں مجید امجد کی شاعری اس مقام پر ہے جس مقام پر خوشی محمد ناظر کی شاعری میں نظم جوگی۔ ہے میں نے اس نظم کو بار بار اول تا آخر پڑھا ہے۔ اور ہر بار مجھے یہ احساس ہوا کہ مجید امجد نے ساری عمر جو شبانہ روز مشق سخن کی تھی۔ انتہائی خلوص لگن اور انکسار کے ساتھ قدرت نے اسے

اس نظم کی شکل میں وہ خلعت خاص انعام کے طور پر عطا کر دیا جس کا وہ خواہاں بھی تھا اور مستحق بھی۔ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ یہ مجید امجد ہی کا ماسٹرپیس نہیں، ہمارے شعری سرمائے میں بھی اس نظم کو ہمیشہ ایک موقر جگہ حاصل رہے گی۔ یہ نظم ہے۔ "نہ کوئی سلطنت غم ہے نہ اقلیم طرب۔ یہ نظم انسان اور اس کے مستقر والی حین کے ربط کی تمام جہتوں کا احاطہ کرتی ہے۔ سارے سوال سارے دکھ سکھ، ساری حسرتیں، ساری ناکامیاں، کرب دوری کے سارے عالم..... عیش وصال کی سب کیفیتیں، اس نظم میں بہم ہو کر ایک نامیاتی وحدت بن گئی ہیں۔ بس ذرا سی تاثر میں کمی ستاروں کے سرود سے آجاتی ہے۔

نظم کا آغاز یوں ہوتا ہے:

کیا کہوں۔ کتنے غموں۔ کتنے غموں کی شکن آلود بساط!
وقت کے گھومتے زینوں پہ مرے رکتے ہوئے قدموں کے سات
کس طرح چھتی لپٹتی ہی چلی آئی ہے
کیا بتاؤں یہ کہانی بڑی طولانی ہے

اب دیکھو اس نظم کی ہئیت میں مجید امجد کو یکایک کیسا خوش رنگ سلک وحدت مل گیا آخری مصرع اپنا قافیہ اور ردیف دے گیا۔ اور ہر مناسب وقفے اور نظم کے ارتقا کے ہر موڑ پر ایک مصرع الہامی سادگی اور سچائی کے ساتھ آتا ہے۔ غیر محسوس طور پر آتا ہے یکایک۔ اور دل و جاں پر محیط ہو جاتا ہے اور ساری نظم کو ایک ناقابل تقسیم وحدت کی طرح قاری کے احساس و شعور پر محیط کر دیتا ہے۔

یہ مرا قصہ، غم کون سنے؟ کس کو سناؤں؟ کس کو
اپنے احساس کا وہ جلتا ہوا زہر پلاؤں؟ کس کو
پستے پستے مری ایک عمر کٹی ہے۔ اک عمر

آخری دو لفظ (Emphasis) کے لیے آتے ہیں۔ شاعر تنہا ہے۔ اپنے اندر بھی۔ اس کا احساس اس کی آگہی صرف اسی تک محدود ہے۔ اور کوئی اس سطح پر اس کی دنیا میں نہیں۔ سو وہ اپنے احوال، اپنے دکھ، اپنے آلام کا قصہ کسے سنائے۔ اس اسلوب میں ایک ہلکا سا رنگ میراجی کی برتر نظموں کا ہے۔ لیکن اسے مجید امجد نے اس طرح داری سے اپنایا ہے کہ یہ خالصتاً اس کا ہو گیا ہے۔ ایک دولت نایاب ہے جو اسلوب کی تزئین اور پیرائے کو جگمگانے کے لیے اسے مل گئی ہے

اب ابتدا ہی Linkline سے ہوتی ہے یعنی مرکزی قافیہ اور ردیف والے مصرعے سے۔

دیکھتے ہو وہ جو اک جادہ نورانی ہے
وہ جو اک موڑ ہے اور وہ جو ابھرو کا ہے سر بام بلند
کبھی پہنچی نہیں جس تک سحر و شام کے سایوں کی کمند

وہ جو جھکتی ہوئی مڑتی ہوئی دیواریں ہیں
جن کا مقصد ان ہی گلیوں کی نگہبانی ہے

یہ سطح فکر کی ۔ یہ جلا الفاظ کی، یہ وحدت ہئیت کی ۔ مجید امجد کے لیے بالکل نئی ہے ۔ یہاں صناعی ایک کامل فن کار کی ہے ۔ کہیں کوئی آورد نہیں ۔ کوئی بھرتی کا لفظ نہیں ۔ اس نظم کی فضا مجید امجد کے جہان فن کو پیش نظر رکھیں تو حیرت انگیز ہے ۔ طویل نظم ہے لیکن میراجی چاہتا ہے کہ اس نئی دنیا میں قاری کو میں اپنے ساتھ رکھوں:

وہ جو ہر شام ان ہی گلیوں میں کوئی مست سی لے
بند ہوتے ہوئے دروازوں کے آہنگ میں کھل جاتی ہے
وہ خموشی سفر شب کے تسلسل کی نقیب
جس کی میت پہ اندھیروں نے ردا تانی ہے
میں نے اک عمر اسی معمورہ ظلمات میں رقصاں جولاں
ہر قدم اپنے ہی قدموں کی صداؤں سے گریزاں، لرزاں
جگر جام سے چھینے ہوئے نشوں میں مگن
خاک ان راہوں کی یوں خاک بسر چھانی ہے
جس طرح ایک سہارے کی تمنا میں کسی ٹوٹتے تارے کی حیات
مہ و انجم کے سفینوں کی طرف اپنے بڑھائے ہوئے ہاتھ
غم افلاک سے ٹکرا کے تبسم ہو جائے
ان خلاؤں میں کسے تاب پر افشانی ہے

نظم کا موضوع ۔ اس کا موڈ ۔ اس کا Locale معین ہو چکا ۔ اور شاعر نے اب تک نادر تکنیکی مہارت، لفظیات میں کامل دست رس اور ہئیت میں دل نواز آہنگ اور قاری کے ذہن کو اپنی گرفت میں رکھنے کے لیے تسلسل ۔ اور ارتقا کی ہئیتی وحدت کو بھی بڑے بانکپن سے قائم رکھا ہے ۔

میں بھی پلکوں پہ امنگوں کے دیے لے کے گرجتے ہوئے طوفانوں میں
منتظر تھا کہ اچانک کہیں باغوں میں، بیابانوں میں
آکے بس جائے کسی نغمہ شیریں کی بہار!
یہ مرے گرد جو صد ساغر بہ شکستہ سے کلیاں پھوٹیں
میں نہیں کہتا کہ کلیاں نہیں مہکیں مرے گلزاروں میں
مجھ کو یہ غم ہے وہ اک لمحہ نایاب کہ جو
حاصل سلطنت عالم امکانی ہے

جب مری زیست سے ٹکرا کے بھسم ہو بھی گیا تب مجھے معلوم ہوا
تب میں سمجھا، کہ یہ راہیں، یہ گھروندے۔ یہ پھبکتی دنیا
اب یہ سب کچھ غم جاوید کی اک دھڑکن ہے
اب یہی زخم ہیں اور شغل مگس رانی ہے

سکھ کا لمحہ دکھوں کی تاریک رات میں ٹوٹتا تارہ تھا۔ پل بھر کو فضا روشن ہوئی پھر جب وہ غائب ہوئی تو اندھیرا اور روح فرسا ہو گیا۔ آخری مصرع Suggest کرتا ہے کہ شاعر حضرت ایوب کی سی مسلسل آزمائش میں مبتلا ہے وہ زندگی کو ہر حساس آدمی کے لیے ایک جاں گسل آزمائش سمجھتا ہے اتنی ہی کڑی جتنی حضرت ایوب کو پیش آئی تھی۔ جس کی ابتدا کھجلی سے ہوئی تھی پھر سارا جسم ناسور کی طرح ہو گیا۔ نظم اس آہنگ، اسی دھیمے تسلسل حسن و شعور کے ساتھ بڑھی چلی جارہی ہے۔

تار بربط کی کوئی لرزش پنہائی ہے
جو شب و روز کے ایواں میں فضا بن کے بکھر جاتی ہے
آسمانوں سے، زمینوں سے کسی دل کے دھڑکنے کی صدا آتی ہے
کوئی چپکے سے مرے کان میں کہہ جاتا ہے
"سنتے ہو۔ کس کی یہ آواز ہے، پہچانی ہے؟"

یہ آواز ستاروں کی ہے یہ مجید امجد کا "سرود انجم" ہے؟ نہیں یہ ابن آدم اور بنت حوا کی آواز ہے۔ ایک آدمی ایک عورت کی، جو ساری نوع کی نمائندگی کرتے ہیں۔ حقیقت کیا ہے اور خواب کیا ہیں! خواب صاحب دل لوگوں کے۔

یوں کب تک صبح و شام جئیں
بے سود جلیں، بیکار چلیں
جب دنیا والے سو جائیں
میٹھے سپنوں میں کھو جائیں
جب چلتے دریا تھم جائیں
تاروں کی نگاہیں جم جائیں
جب آگ بجھے چوپالوں کی
جب آنکھ لگے رکھوالوں کی
دیوار و در سے چمٹتے ہوئے
سائے کی طرح سمٹتے ہوئے
دو بھک منگوں کے بھیس میں ہم

جا نکلیں اور اک دیس میں ہم
کچھ دور افق کے پار ادھر
ہے ایک نیا سنسار ادھر
خوشبوں کی ۔ سنگاروں کی دنیا
پھولوں کی بہاروں کی دنیا

شاعر اپنے خوابوں اپنے جوانی کے ارمانوں اور امنگوں کی دنیا کو دوران سفر میں کھو آیا ہے

آہ وہ دنیا جسے کھوکے میں پھر پا نہ سکا
یوں تو آفاق میں دنیاؤں کی ارزانی ہے

یہاں اس بہت خوب صورت اور بہت برتر نظم میں یکایک "آہ" کے لفظ سے جو روایتی شاعری کا کلیشے ہے اور دبی ہوئی الف والی دنیا سے میری طبیعت مرجھا گئی ۔ پہلا مصرع ذرا محنت سے بہتر ہو سکتا تھا ۔

"میرے خوابوں کی وہ دنیا کہ جسے کھو کے میں پھر پانہ سکا" یا ایسا کوئی مصرع لکھا جا سکتا تھا جس سے نظم کا جمالیاتی رتقا بے گز ند رہتا ۔ مگر اس شعر سے صرف نظر کرتے ہوئے، ہم آگے بڑھتے ہیں:

ان خلاؤں میں ستارے بھی ہیں ، خورشید بھی ہے ماہ بھی ہے
کون جانے کہ زمانے کے سمندر کی کوئی تھاہ بھی ہے

ان دو نہایت چابک دستی سے ترشے ہوئے مصرعوں کے بعد پھر وہی خامی دہرائی گئی ۔ لیکن اک دنیا جسے کھوکے میں پھر پانہ سکا ۔ تاہم نظم مجموعی سطح پر کلاسیک ہونے کی توانائی اور جمال رکھتی ہے سو آگے بڑھتے ہیں ۔ وہ دنیا:

میری سم خوردہ تمناؤں کی نظروں سے گریزاں ہی رہی
لاکھ ڈھونڈا ۔ مگر افسوس کہ اک رنج پشیماں نکلی
بوجھ بن کر مری تقدیر کی پلکوں پہ رہا
اب مرا دل ہے کہ اک عالم حیرانی ہے

دوسرا اور تیسرا مصرع تابندہ Lines ہیں ۔ اور اب شاعر اس نتیجے پر پہنچا ہے ۔

مجھ سے پوچھو تو مرے سامنے اب یہ دنیا
ورق مصحف اندوہ گراں جانی ہے

آخری مصرع غالب کے اس دور کی شاعری کی گونج ہے جب وہ اسد تخلص کرتے تھے ۔ اور اردو میں بیدل کی فارسی کی بلند آہنگی دکھاتے تھے جو اردو میں آکر Shrillness بن جاتی تھی ۔ مگر یہاں ایک اہم اور Complex احساس اور تاثر کے ابلاغ کے لیے اس ادق لہجے کا اک گونہ

جواز ہے۔ اور اب شاعر اپنی ساری محنت اپنے سارے رنج سفر پر نگاہ دوڑاتا ہے۔ دیکھیے یہ بازدید!

سوچتا ہوں یہی دو گھونٹ جو میں نے غم دوراں سے پیے
یہی دو سانس، شبستان ابد میں یہی دو جلتے دیے
دوش و فراد کی فصیلوں میں یہی دو رخنے
یہی جو سلسلۂ زندگی فانی ہے

دو سانس ابد میں پہنچ کر بھی بجھتے دیے بن گئے۔ کیا یہ "بجھنے" کی کیفیت دوام میں ساکت Freeze ہو گئی ہے؟ یہ سوال اس لیے پیدا ہوا کہ پھر یہ دو سانس دوش و فردا کے وقت کی ردا میں دو رخنے۔ دو سوراخ بن گئے ہیں۔ شاعر سوچتا ہے کہ یہی دو ساعت کی وہ مختصر مہلت بھی جس کے لیے اس نے لتنے دشوار سفر کیے، لتنے جو کھم سہے۔ یہاں ایک مصرع آیا ہے جس میں ایک لفظ ایسا آگیا ہے جو باقی ساری نظم کی لفظیات سے مختلف ہے۔ اور یہاں بہت اجنبی لگتا ہے:

کوئی مکھ، کوئی نگہہ، کوئی تبسم، کوئی جینے کا سبب؟

ہر لفظ شناس قاری محسوس کرے گا کہ یہاں "مکھ" نہایت نامناسب لفظ ہے۔ سارے آہنگ کو خلل پذیر کر دیتا ہے۔ جدید شاعری کے پہلے دور کے تین شاعر فیض، راشد، میراجی ایسی لغزشوں سے مقام کمال پر پہنچ کر محفوظ ہوگئے تھے۔ اسی لیے ان کے فوراً بعد کی Generation of Poets قیوم نظر یوسف ظفر مجید امجد اپنی اپنی کلیت میں اپنے پیش رووں سے بہت کم تر رہے:

لیکن اس مصرع کے بعد دو مصرعے آتے ہیں جو نظم کے ارتقا میں بہت اہم ہیں۔ شاعر جب بہ صد اندوہ و اضطرار اس مسئلے پر سوچتا ہے تو اسے توقع ہوتی ہے کہ:

آسمانوں سے صدا آئے تو کیا ڈھونڈتا ہے
تیرا ساماں تو یہی بے سرو سامانی ہے

نہایت اثر انگیز مصرعے ہیں!

اب نظم آگے بڑھتی ہے۔ اساسی سوال کا سطح آگہی سے جواب چاہتی ہے۔

کس کی فتراک میں ہیں عرش بریں، فرش زمیں کون کہے
پس صد پردۂ افلاک کوئی ہے کہ نہیں؟ کون کہے
جانے کن گہرے دھندلکوں سے ضیا پاتی ہے
درحقیقت یہ حقیقت کی جو تابانی ہے

پھر شاعر معاً بغاوت پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ !To Hell with it All غالب تو قیام ازل کو چیلنج کرتا ہے اور کہتا ہے کہ "ہر برق کہ بے صرفہ جہد بر اثرم ریز" غالب عظیم شاعر تھا

اور نوعی سطح کا ازلی ابدی دل جگر رکھتا تھا۔ مجید امجد نسبتاً کم توفیق ہے۔ سو وہ عطائے تو بہ لقائے تو کی طرف راغب ہو جاتا ہے۔

دیگ گردوں میں ابلتے ہوئے زہراب سے اک خم بھر کر
دیگ گردوں کہ ابد زنگ شکم میں جس کے
کھولتے دردوں کا ہنگامہ لافانی ہے
اسی زہراب سے خم بھر کے پخ دوں افق دوراں پر
آگ ہی آگ برسنے لگے اس پھولوں بھرے بستاں پر

میں اپنی بے یقینی (Disbelief) کو بہ طیب خاطر معطل کر چکا ہوں سو یہ نہیں پوچھا کہ وہ گردوں جس کے شکم میں زہراب ابل رہا ہے۔ اس کی اوپر کی سطح بستاں کیسے بن گئی پھولوں سے بھرا بستاں؟ اب شاعر چاہتا ہے کہ اس ارض کے سینے پر سے بھی نشاط و انبساط کے سارے عارضی مظاہر کو برباد کر دے۔

چاہتا ہوں کہ یہ زیتون کے جنگل کا سکوت
(جس کی وسعت ہے کہ اک عالم حیرانی ہے)
میری کھوئی ہوئی دنیاؤں کے کہرام سے تھرا اٹھے

شاعر تغیر چاہتا ہے۔ وہ کسی نوعیت کا ہو:

ہاں یہ سب سلسلۂ رنگ یہ گہوارۂ حسن و افسوں
میں اسے اپنی دکھی روح کی ان راگنیوں سے بھر دوں
جن کی لہریں کبھی آنسو ہیں کبھی آہیں ہیں
جن کی تقدیر کبھی آگ، کبھی پانی ہے

اپنے جوش کو اظہار دے کر جب شاعر آسودہ ہو جاتا ہے تو پھر اس ساری کائنات کے وجود کو دیکھتا ہے۔ اس کی نگہہ ایک خاموش سوال ہے۔

کوئی غایت، کوئی منزل، کوئی حاصل سفر ہستی کا
کوئی مقصود بلندی کا کہ مفہوم کوئی پستی کا
کوئی مشعل بھی نہیں، کوئی کرن بھی تو نہیں
شب اندھیری ہے، گھٹا ٹوپ ہے، طوفانی ہے
بولو۔ اے نغمہ سرایان تحیر کدۂ کہکشاں
میں کہاں جاؤں۔ کہاں جاؤں۔ کہاں جاؤں۔ کہاں؟؟

بے مثال زیبائی سے نظم کو اپنے موضوع کے ایک اہم نقطہ ارتکاز تک پہنچایا ہے۔ شاعر خود اپنے سوالوں کا جواب تلاش نہیں کر سکا۔ سو وہ عالم بالا کے دانایان راز کو مخاطب کرتا ہے اور نہایت بے بسی کے عالم میں پوچھتا ہے جو اس نے آخری مصرعے میں پوچھا۔ پورا سوال تین بار دہرا کر پورا Stress پورا Emphasis اپنے سوال کو دے دیا۔ اور آخر میں صرف ایک لفظ آیا ہے۔ کہاں ؟ یہ اختصار بہت ارفع کلام کی سطح پر ہے، کہ جذبہ صدق کے کمال تک پہنچ جائے تو وہ منفرد لفظ میں بیان ہو جاتا ہے۔ اس کی بے پایانی کو وہ ایک لفظ اپنے اندر موجود بے کراں وسعت میں سمیٹ لیتا ہے۔ اور ادا ہو کر قاری کے سارے وجود پر محیط ہو جاتا ہے۔ اسے اپنے Pathos میں غرقاب کر دیتا ہے۔

شاعر کے سوال کا جواب مختلف کو اکب اپنے اپنے رنگ میں دیتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں نظم کا یہ حصہ باقی نظم کی سطح سے خاصا کمتر ہے کہ اقبال کی نظم "سرود انجم" قاری کے پیش نظر رہے گی۔ دائموس کہتا ہے۔ اے سوال کنندہ!

ناچ ناچ۔ گھوم گھوم۔ اور رقص والہانہ کے دوران میں
دیکھنا ادھر ضرور۔ اک نظر
ناچتا ہے نزد و دور۔ بے خبر
دامن نگاہ نور تھام کر
کہکشاں کے موڑ پر فاصلوں کا اک ہجوم۔ (ناچ ناچ۔ گھوم گھوم)
وسعت ابد پناہ اک ترنگ
عالم شب سیاہ اک امنگ
منزلیں نشان راہ سحر رنگ
شعلہ شعلہ انگ انگ آگ روم روم۔ ناچ ناچ گھوم گھوم

یہاں مجید امجد، یوسف ظفر کی سطح "مرمری ناگن رقص کر" سے تو بہت برتر سطح پر ہے کہ ناچ ناچ گھوم گھوم کی کمزور Link line کے باوصف معنی کی سطح بہت بہتر ہے۔ ستارہ کہتا ہے۔ ابن آدم اپنی بے بسی اپنے آلام، شکست کے غم کو والہانہ رقص کے بھنور میں غرق کر دے۔ کائناتی نزد و دور کو وسعت ابد پناہ کو دیکھ اور اس میں اپنا مقام تلاش کر۔ دوسرا ستارہ طیبو کس ہے جو کہتا ہے! جگ جگ پھیل گیا کاجل۔ دم دم دھم دھم گرے محل۔ بہتی ہوئی صدیوں میں چلے ڈھلتے رہے۔ دیے جلتے رہے۔

ہر آن راتوں کا میلا
ہر سمت سے کا ریلا
چلے گھر گھر مری نو کا بھنور بھنور

بوجھ لتنے ہیں کڑیل جن کے
یہ دکھ سکھ بیتے تنکے
گریں ابھر ابھر مری ناؤ کا بھنور بھنور

سیارہ خلا میں تیر رہا ہے۔ وہ اپنے مقام پر ایک چھوٹی سی کشتی ہے اور خلا بے کراں سمندر ہے۔ اور اس خلا کے سمندر میں کہیں کہیں گیسیں تند طوفانوں کی قوت رکھتی ہیں۔ یہ گیت باقی نظم کی سطح پر نہیں ہیں مجید امجد رقص کی لے اور موضوع کی رفعت اور تندی کو پوری کامیابی سے ہم آمیز نہیں کر سکا۔

سیارہ پلوٹو کہتا ہے۔

کتنے زمانے ۔ کتنے سپن
توڑ گئے اپنے درپن
نیر بہاتے رہیں نین
وقت کے جھکڑ گگن گگن
چلتے رہے۔ دیے جلتے رہے

اندھیاروں کے زہر پیے
آنکھوں کو گل رنگ کیے
امر اجالے لو میں لیے
جیون کی منڈلی میں دیے
جلتے رہے۔ دیے جلتے رہے

یہاں تک آکر کھلا کے ستاروں کے تخاطب دو نوع کے ہیں۔ پہلا اور تیسرا کوکب ایک گیت کی استائی استعمال کرتے ہیں اور دوسرے اور چوتھے کے اساسی بول ایک ہیں۔

کوکب آڑ ناؤس سے ندا آتی ہے
کوئی ساحل ہے نہ کنارا!
اک پھیلتا بڑھتا دھارا
بہے نگر نگر مری نو کا بھنور بھنور
آتے ہوئے قرنوں کا تبسم
ہم تم
جگ مگ دمکو۔ جھم جھم جھمکو۔ چمکو کتنی اندھیری رات ہے۔ چمکو
(یہ بند بہت کمزور ہے)

یہاں آسمانی وجود چمکنے دمکنے کی دعوت دیتے ہیں۔ یوں شاعر نوع انسانی کے دکھی لوگوں

کی جو سچا دل اور خیر کی لگن رکھتے ہیں تب و تاب مسلسل کا پیغام دیتا ہے۔ ایک مثبت قدر فرد کی اور نوع کی زندگی کی اساس کے طور پر پیش کرتا ہے۔

اب زمین اور اہل زمین نے عرشیوں کی ندا اور فغاں دونوں سن لیں۔ اور اب ہمارا مستقر زمین یوں نغمہ سرا ہوتی ہے:

نہ عکسِ خاک کہیں اور نہ رقصِ نور کہیں
نہ کوئی وادیِ ایمن نہ شمعِ طور کہیں
بجھی ہے راکھ میں غلطاں مئے طہور کہیں
پڑا ہے شیشۂ افلاک چور چور کہیں

اسی اداس منظر نامے کے بعد زمین اپنے ضمیر میں چھپی بات کہتی ہے۔ جو دراصل انسان کی غایتی طبع کی آئینہ داری ہے:

یہ اضطرابِ مسلسل کی خوں چکاں گھڑیاں
ہے ان سے بڑھ کے کوئی دولت سرور کہیں
اگر ہمیں بھری دنیا میں مسکرا نہ سکے
تو ڈول جائیں گے یہ سلسلے ضرور کہیں

اب نظم اپنے Climax تک پہنچنے کے مقام تک آگئی ہے۔ اور شاعر اپنے فکر و احساس کا تجزیہ کر کے عالم بالا کی نغمہ سرائیوں کو سن کر زمین کو اپنا اساسی زاویہ نگاہ جان لینے کے بعد اپنے دل کی بات اپنے فکر و نظر کا ماحصل ہم تک پہنچاتا ہے!

شہر در شہر منادی ہے کہ

"اے خندہ فروشانِ حیات"
ہر بجھی روح کے آنگن میں کھلا ہے چمن امکانات
نہ کوئی سلطنت غم ہے نہ اقلیم طرب
زندگی ہی فقط آئین جہاں بانی ہے
جانے اس تیرہ افق سے یہ گھٹاؤں کے تھرکتے سائے
ماہتابوں کے چمکتے ہوئے سینوں سے نتھر کر آئے
ساتھ لے کر وہ خنک موج خمادیں جھونکے
جن کی زد میں مری تپتی ہوئی پیشانی ہے
اپنے سینے میں جگا کر ان ہی دردوں ان ہی یادوں کے فسوں
پھر تمناؤں کے تصویر کدے میں نگراں بیٹھا ہوں
سامنے صفحۂ صد رنگ رموز کونین

کانپتی انگلیوں میں موقلم مانی ہے

اس ساری دروں نگاہی اور خارجی کائنات سے کشف کے سے عالم میں ربط خاص کے بعد شاعر کے جذبات کی تطہیر و تہذیب کا عمل مکمل ہو گیا۔ اب وہ آگہی کی تابندہ دنیا میں آچکا ہے۔ (A Saner and wiser man) سو وہ یہ جان لیتا ہے کہ وہ جو کچھ بھی ہے جیسا بھی ہے۔ یہ کائنات اسی کے دم سے اپنی شناخت حاصل کرتی ہے۔ اس رنگا رنگ نظاروں والی وسیع کارگاہ کی رونق اسی کے دم سے ہے۔ وہ نہیں تو پھر کچھ ہو کر بھی کچھ نہیں۔ ہر چیز ہر نظام بے مقصد بے شناخت ہو جائے گا۔ سو وہ وجود کی کم مائیگی اور مہلت مختصر کے باوصف پھر تزئین جہاں کے لیے عمل پیرا ہو جاتا ہے۔ اس کی مہلت یک آن کا ادراک اسے عاجزی دیتا ہے۔ لیکن اس عاجزی کے پیچھے ایک مصمم ارادہ ایک Firm resolve ہے۔ بہتر مناظر والا جہاں بنانے کا۔ سو وہ کانپتے ہاتھوں میں مصور کا موقلم اٹھالیتا ہے کہ قرطاس وجود پر نیا ارژنگ بنائے جو پہلے Land scape سے زیادہ خوش نما اور خوش آیند ہو۔ میں سمجھتا ہوں یہ نظم "نہ کوئی سلطنت غم ہے نہ اقلیم طرب" مجید امجد ہی کا نہیں اس کی نسل کے تمام سرمایۂ شعر کا حاصل ہے۔ جدید اردو شاعری کی دوسری نسل کی تخلیقی صناعی کا سب سے پائندہ اور دل افروز شاہکار ہے۔ جب میں یہ کہتا ہوں تو اس نظم کے زمانی و مکانی محل کو پیش نظر رکھتا ہوں۔ یہ نظم بھی راشد اور میراجی کے وسیع ترین کلام کی سطح تک شاید نہیں پہنچی۔ نہ تیسری نسل کی شاعری کی انتہائی سطح کمال کی ہم سطح ہے۔ لیکن ۱۹۱۴ء کے ادھر ادھر والی نسل میں کوئی تخلیق کار اس نظم تک نہیں آسکا۔ اپنی بلند ترین وجدانی سطح پر بھی۔ یہ نظم اعلیٰ اور محکم صناعی کی دمکتی مثال ہے اور آہنگ میں اتنی نشاط انگیز ہے کہ میری ناچیز رائے کے مطابق یہ اردو شاعری کے کل سرمائے میں شامل رہے گی۔ اور وقت اس کے جمال کو کم نہیں کر سکے گا۔ یہ "حسن کوزہ گر" اور "سمندر کا بلاوا" سے کم تر ہے۔ مگر راشد اور میراجی کی اچھی سطح کی نظموں کے ساتھ رکھی جا سکتی ہے۔

مجید امجد اپنے کلام میں پنجابی کے الفاظ کو بڑی دلیری سے استعمال کرتے تھے۔ سو میں بھی یہاں ایک پنجابی کہاوت پر اس جائزے کو ختم کرتا ہوں۔ یہ نظم مجید امجد کی دنیا کا مرکزی معبد ہے۔ اس کا حاصل عمر کارنامہ ہے۔ چناں چہ ٹکے پڑے اجاڑ پر! اس نظم پر اتنی تفصیل سے بات ہو گئی تو مجید امجد کے فکر و فن کا اس کی اعلیٰ ترین سطح پر مشاہدہ ہو گیا ہے۔ بعد کا کوئی کلام اس سطح پر نہیں پہنچا۔ میں اس خاموش طبع آزردہ رو درویش شاعر کی طمانیت میں شریک ہوں کہ اسے اردو ادب میں پایندہ جگہ مل گئی۔ مجھے امید ہے اب وہ جنت الفردوس میں جہاں بھی ہے میری طرف سے اس کی آزردگی بڑی حد تک ختم ہو جائے گی۔

شان الحق حقی

اردو زبان کے معیار کا مسئلہ

یہ وقت کا ایک اہم اور غور طلب مسئلہ ہے۔ جسے میں نے ایک بار پہلے بھی اپنے ایک مقالے میں چھیڑا تھا جو سبط حسن مرحوم کے رسالے "اردو ادب" میں چھپا تھا اور میرے دوسرے مجموعہ مضامین "نقد و نگارش" میں بھی شامل تھا۔ میں نے مسئلے کا انجام نہیں کیا تھا، نہ کر سکتا تھا، صرف اس کے خد و خال واضح کیے تھے۔

خلاصہ: زبان انسان کا وسیلہ اظہار ہے جس کے بغیر متمدن زندگی کا تصور ممکن نہیں، ہم اسے قانون سے لے کر ادب تک ہر قسم کے نازک مطالب کے اظہار کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اس کے قواعد، لغات و محاورات کا معیار ہونا شرط ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ زبان کوئی جامد شئے نہیں۔ ہر جیتی جاگتی، پھلتی پھولتی شئے کی طرح اس میں بھی افزائش و نمو کا عمل ہوتا رہتا ہے۔ ہر دور میں نئی نسل کی زبان بڑے بوڑھوں کی زبان سے تھوڑی بہت مختلف ہوتی ہے۔ پھر زندگی کا قدم جتنا تیز ہو گا، یہ تغیر اتنا ہی نمایاں ہو گا۔ اگرچہ ہمارے بزرگوں کو عیار اور ٹکسال پر بڑا اصرار رہا اور سند کے لیے اگلوں ہی کی طرف دیکھا جاتا رہا۔ پھر بھی فصاحت کا معیار دور بہ دور بدلتا رہا ہے۔ اصولاً شاعری کی زبان نثر کی نسبت سست رو اور قدیم تر ہوتی ہے۔ اس کے باوجود پیچھے پلٹ کر دیکھیے تو میر و مرزا کی زبان وہ نہیں تھی جو ذوق و غالب کی زبان تھی، اور پھر حالی، شبلی، اقبال اور ان کے ہم عصروں کی زبان اور بھی مختلف ہو گئی۔ اس سے آگے تو اتنے نئے اثرات پڑے کہ اگلے لوگ سنیں تو ہماری بات شاید بالکل نہ سمجھ سکیں۔

اب سوال یہ ہے کہ معیار کیوں کر متعین ہوتا ہے۔ شہنشاہی یا جاگیرداری معاشرے میں کلام الملوک کو افصح الکلام مانا گیا تھا۔ یہ سچ بھی ہے کہ درباری ثقافت کا مرکز ہوتا تھا۔ انگریزی میں بھی فصیح زبان کے لیے "کنگز انگلش" کی اصطلاح مقرر رہی۔ دلی میں واقعتہً لال قلعے والوں کی زبان عوام الناس کے لیے قابل سند تھی۔ جس نے ان کی خراب و خستہ آل اولاد میں بھی جن کو دیکھا ان کی بول چال کو کھرا پایا۔ خود ذوق کی زبان فصاحت میں بہادر شاہ کی زبان کو نہیں پہنچتی۔ ذوق کے ہاں محاورہ بندی قدم قدم پر چونکاتی بلکہ کھٹکتی ہے۔ شعر میں محاورے باندھنا اور زبان دانی کی دھاگ بٹھانا ظفر کا مذاق فصاحت نہ تھا۔ میں نے ان کی ضخیم کلیات کے بہت سے خس و خاشاک میں سے (جس میں ذوق کے عطیات بھی شامل ہوں) ایک دیوان کے بقدر ایسا کلام برآمد کیا ہے، جو نہ صرف اپنے مطالب اور واردات کے لحاظ سے بلکہ لہجے اور انداز گفتار کے لحاظ سے بھی کسی اور شاعر سے نسبت نہیں رکھتا۔ دیکھیے ہنگامہ ۱۸۵۷ء کی پیش گوئی کس طرح کرتے ہیں

کہ ترغیب اقدام نہیں تو ایک وجدانی پیش گوئی ضروری تھی:

کشتہ قامت جتنے ہیں اس کے آپس میں سب مل جل کر
کردیں اگر اک حشر بپا ، کیا اچھا ہو ، کیا اچھا ہو!

(دیوان چہارم)

لطف یہ کہ قدم تغزل سے باہر نہیں۔ اس صدی سے پہلے تک اگرچہ ہمارے اساتذہ گردوپیش کے احوال سے چنداں بے خبر نہ تھے، اور متاثر ہونا بھی لازمی تھا، لیکن اس طرح کے تمام کلام پر تغزل کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ میں نے اس مسئلے پر اپنے ایک اور مقالے میں بحث کی ہے (غزل کا سفر سعدی سے اقبال تک) غزل کو یہ نیا موڑ اقبال نے دیا کہ سیاسی مطالب پر سے تغزل کا پردہ اٹھادیا:

مغرب ز تو بے گانہ مشرق ہمہ افسانہ
وقت است کہ در عالم نقش دگرانگیزی
آنکس کہ بہ سر دارد سودائے جہانگیری
تسکین جنونش کن بانشتر چنگیزی

اب ہماری جدید غزل اکثر و بیش تر رومانی یا عاشقانہ مضامین سے خالی ہوتی ہے تو یہ اقبال کا پرتو ہے۔ پچھلے ادوار میں سیاست کا سب سے گہرا پرتو ظفر کے کلام میں ملتا ہے۔ کہیں کہیں تو پردہ بھی اٹھ گیا ہے یا یوں ہی سا رہ گیا ہے:

اعتبار صبر و طاقت خاک میں رکھوں ظفر
فوج ہندوستان نے کب ساتھ ٹیپو کا دیا

(دیوان چہارم)

ذکر معیار فصاحت کا تھا تو ظفر کا اصل لہجہ اپنے تمام معاصرین سے مختلف اور منفرد ہے:

رونا میرا پوچھتے کیا ہو ، آنکھ سے آنسو بہنے دو
اب مجھ کو تصور اور بندھا ہے ، ایک ذرا چپ رہنے دو

خوب دیکھا ، خوب ڈھونڈا کچھ نظر آیا نہیں
آج تک اپنے میں ہم نے آپ کو پایا نہیں

چشم ظاہر بیں سے تو دیکھا نہیں جاتا اسے
تم نے بھی اے دل کی آنکھوں اس کو دکھلایا نہیں

بلاسے گرچہ ہوتا رازدل افشا ہے رونے میں
نہ روکو مجھ کو رونے سے ، مزا آتا ہے رونے میں

اٹھارویں صدی سے انیسویں صدی تک پھیلے ہوئے جوانی سے بڑھاپے تک کے اس کلام میں صرف سوز ہی نہیں، چچہے بھی بہت ہیں اور وہ بھی اپنی جگہ بے مثل ہیں:

ہواہو ابرو مل ہو پھر تو چہلیں ہوں تماشا ہو
نشے میں رشک گل ہو پھر تو چہلیں ہوں تماشا ہو

اور کہیں دونوں کی عجیب و غریب آمیزش:

کیا رنگ دکھاتی ہے ہر چشم تر او ہو ہو
خون جگر آہاہا ، لخت جگر او ہوہو !

گویا ایک مجذوب کی تصویر کھینچ دی ہے۔ سب سے کھرا روزمرہ ظفر کے ہاں ملتا ہے۔ جو محض محاورہ بندی سے گراں بار نہیں:

ہمیں ہر بات پر دیتے ہو صاحب گالیاں اوہو
تصدق اس زباں کے تم بھی یہ سیکھے زباں اوہو

مرا کہنا کہ کیا عالم ہے تجھ پر واہ وا صدقے
او ان کا ناز سے ہنس ہنس کے یہ کہنا کہ ہاں ، اوہو!

یہ ایک ضمنی تذکرہ تھا دور شہنشاہی میں "شاہی زبان" کا۔ ہر جمے جمائے معاشرے میں زبان کی ایک معیاری بولی ہوتی ہے اور کئی فروعی یا تحتی بولیاں جو اس کے ارد گرد بستی ہیں۔ زبانوں کی ایک کھڑی تقسیم ہوتی ہے۔ اور ایک پڑی تقسیم۔ ڈایلیکٹ پڑی یا افقی تقسیم میں آتے ہیں۔ کھڑی یا عمودی تقسیم طبقہ داری ہوتی ہے۔ مختلف انسانی گروہ اپنے اپنے پیشے، ماحول اور مذاق یا ثقافتی پس منظر کے مطابق مختلف لسانی رجحانات رکھتے ہیں۔ حساس کان نہ صرف مقامی لہجے اور محاورے کو پہچان لیتے ہیں بلکہ مختلف پیشوں، حرفوں، طبقوں، محلوں، گھرانوں تک کی بولی کو تاڑ لیتے ہیں۔ دلی میں لوگوں کے کان بتادیتے تھے کہ یہ لہجہ جامع مسجد کے آس پاس کا نہیں، حویلی حسام الدین حیدر کا ہے۔ یا یہ لفظ تو مسلمانوں کے منھ کا نہیں، تیل کے کٹڑے میں کسی ہندو لالہ کی زبان سے سنا جا سکتا تھا۔

(مثلاً: بندگی (آداب عرض) ؛ گونا (رخصتی) ؛ بھاتیا (سمدھی) ؛ بچلنا (بچھڑنا) پریوار (کنبہ) ؛ سوڑھ (زچگی) ؛ گونگو (شلغم) ؛ ماتا سیتلا (چیچک) ؛ پانڈ (عمر سے ڈھلی سن یاسن کو پہنچی ہوئی عورت) یہ الفاظ ہندوؤں سے مخصوص تھے۔)

خیر وہ بساط الٹ چکی۔ اب ایک نئی دنیا ہے اور اس کے نئے تقاضے۔ معیار کی ضرورت تسلیم لیکن تلفظ کے ان اختلافات کو اہمیت دینا بے جا ہوگا جو فطری مخارج سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں ش ق اتنا اہم نہیں جتنا املا و انشا۔ شین قاف میں نے محاورۃً کہا۔ تفصیلاً کہا جائے تو ث، ذ، ص، ض، ط، ظ، ع، ق کہنا چاہیے۔ ان میں سے کتنی اصوات کو ہم اصل عربی مخارج کے

مطابق ادا کرتے ہیں یا کر سکتے ہیں؟ لیکن املا میں ان کا برقرار رہنا ضروری ہے، ورنہ الفاظ کی شکل ہی بدل جائے گی اور شناخت دشوار ہو جائے گی۔ ہم الفاظ کو اسی طرح پہچانتے ہیں، جیسے اشخاص کو ان کے چہرے مہرے سے۔ ان کے ہجے نہیں کرتے۔ اسی لیے انگریزی میں تبدیلی املا کی کوئی تحریک نہ چلنے پائی، حالاں کہ انگریزی املا حد سے زیادہ بے قاعدہ ہے جس میں کسی حرف خصوصاً واول کی کوئی قیمت ہی متعین نہیں۔

جب اردو کی ایک جامع لغت کی تدوین کا آغاز ہوا تو ترقی اردو بورڈ (حال اردو ڈکشنری بورڈ) کے سامنے لازماً معیار کا مسئلہ بھی آیا۔ نیز یہ کہ اردو زبان کے حدود اربعہ کیا ہیں۔ کیا اردو ہے اور کیا اردو نہیں۔ اس مسئلے پر میں نے ایک اور مضمون میں بحث کی تھی (اردو زبان کے حدود اربعہ مطبوعہ طلوع افکار کراچی جنوری ۱۹۹۱ء)۔ اردو کے لکھنے اور برتنے والوں میں ہر طبقے اور خطے کے لوگ شامل ہیں۔

ایک طرف مسلمان علما نے ہر فارسی عربی لفظ کو اپنا مال سمجھ کر برتا ہے، تو دوسری طرف ہندو مت ہندوانی علوم اور متعلقہ موضوعات پر معتبدہ لٹریچر ایسا ہے جو زیادہ تر اردو خواں ہندوؤں کے مطالعے کے لیے لکھا گیا، اور اس میں شدھ سنسکرت اصطلاحیں لازماً فراوانی سے برتی گئی ہیں۔ ان کو سن کر عام پڑھے لکھے اردو داں کہہ اٹھتے ہیں کہ یہ لفظ تو اردو نہیں لگتا۔ مراد یہ ہے کہ اردو ایک وسیع زبان ہے جس کے حدود اربعہ کا تعین آسان نہیں۔ انگریزی الفاظ برتنے کی روش بھی اب بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ ان میں سے کیا اردو ہے اور کیا نہیں؟

اب تک مذکورہ لغت کی ۱۶ جلدیں چھپ چکی ہیں۔ ہر جلد بڑی تقطیع کے ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔ کیا یہ لغت اردو کا معیار متعین کرتی ہے؟ کیا یہی وہ ٹکسال ہوگی جس کی معیار کے سلسلے میں تلاش ہے؟ یہ ان معنی میں کوئی دستور الفصاحت مہیا نہیں کرتی کہ معنی، تلفظ یا محاورے پر حتمیت کی مہر لگائے۔ مرتبین لغات و اضعین لغات نہیں ہوتے۔ یہ تاریخی اصول پر مدون کی گئی ہے اور اسے اردو زبان کے ارتقا اور عہد بہ عہد لسانی تبدیلیوں کا ایک ریکارڈ یا دستاویز کہہ سکتے ہیں۔ اس میں تمام دکھنی لغات بھی سما گئے ہیں اور جدید تر تبدیلیوں اور اضافوں کو بھی سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بورڈ کے سامنے سوال یہ تھا کہ معیار کیا ٹھہرایا جائے۔ سند کے لیے کون سے مآخذ سے رجوع کریں۔ ان مآخذ کا دائرہ کتنا وسیع یا کتنا محدود ہو۔ خالص پسندوں کا ایک گروہ وہ بھی تھا جو یہ سمجھتا تھا کہ سند صرف مستند اساتذہ یا اہل زبان کی تحریروں سے لینی چاہیے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس طرح لغت بہت محدود ہو کر رہ جاتی۔ طے ہوا کہ مانے ہوئے اہل قلم کو شامل کیا جائے خواہ کہیں کے ہوں۔ دوسری طرف ایسے بھی اصحاب تھے جو کہتے تھے کہ تم نے ہمیں سے سند لی تو کیا لی، ہم تو خود جاننا چاہتے ہیں کہ کیا صحیح ہے اور کیا ا!!۔ بالآخر دائرہ استناد کو وسیع سے وسیع تر کر دیا گیا۔ بلکہ حال حال میں تو ضرورت سے زیادہ ہی ڈھیل دے دی گئی ہے۔

اس طرح ادارہ۔ لغت نے تو مسئلے کو اپنے لیے آسان کر لیا۔ یعنی یہ لفظ فلاں مصنف کے ہاں ملتا ہے جو فلاں مقام سے تعلق رکھتا ہے، اب آپ اس پر جتنا بھی اعتبار کریں۔ لیکن معیار کا مسئلہ اپنی جگہ موجود ہے۔

عموماً طبقۂ اعلیٰ کی زبان کو مستند سمجھا جاتا ہے۔ لیکن یہ بھی ایک دل چسپ حقیقت ہے کہ معیار اوپر سے مسلط نہیں ہوتا، نیچے سے ابھر کر آتا ہے۔

البتہ طبقۂ اعلیٰ معیار کا پاسبان بن جاتا ہے۔ روما کی عوامی زبان جسے LOW LATIN کہتے تھے۔ بالآخر ٹکسالی زبان بن گئی۔ لو جرمن نے اولڈ ہائی جرمن کو بے دخل کر دیا۔ جرمینک اور رومانس گروپ کی سب زبانیں بازاری بولیاں تھیں جو اب علمی ادبی زبانیں ہیں۔ جنوبی ایشیا میں بھی پراکرتوں نے سنسکرت کو گوشۂ گیر کر دیا تھا۔ یہ ضرور ہے کہ جدید زبانوں نے اپنی نشو و نما اور ذہنی ارتقا کے سلسلے میں کلاسکی زبانوں سے بھرپور استفادہ کیا اور آج تک کر رہی ہیں۔ اردو نے بھی کئی طرح سے استفادہ کیا ہے۔ کئی متمول گھرانوں کی میراث پائی ہے۔

سمائی اس پریم بانی کی پوچھو
بھرے ہیں یہاں چار سمتوں سے دریا

اس کی ساخت ہی میں اکتساب کی بھرپور صلاحیت موجود تھی۔ اس کا دائرہ۔ اصوات عربی فارسی، ہندی، انگریزی سب سے زیادہ وسیع ہے۔ تفریس، تعریب وغیرہ کی طرح تارید کی ضرورت نہیں۔ عربی میں پ، چ، گ وغیرہ کا پتہ نہیں۔ فارسی میں ٹ، ڈ، وغیرہ کا، انگریزی میں ت اور د تک نہیں جس کے بغیر ہم ایک جملہ بھی شاید نہیں بول سکتے۔ "پاکستان" زندہ بیڈ" "ہنڈوسٹین ہمارا" ہی لکھ سکتے ہیں، اپنے عام الفاظ اور نام تک نہیں لکھ سکتے، اور پھر بھی یہ ہم پر راج کر رہی ہیں۔ خان کو کھان بلکہ کان اور سید کو شیڈہی لکھ سکتے ہیں۔ ہائیہ صوتیے جن سے اردو نے بڑے کام لیے۔ ان دوسری زبانوں میں نہیں۔ میں نے دو چشمی ھ پر ایک الگ مضمون میں بحث کی ہے۔ (دو چشمی ھ کی کرشمہ کاریاں۔ ") اردو کی دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ترکیب و تالیف دونوں موجود ہیں۔ جملے کی بنیادی ساخت اس طرح کی ہے کہ بیرونی الفاظ بہ آسانی کھپتے چلے جاتے ہیں۔ آپ عربی یا انگریزی میں اس طرح اردو رکھ کر نہیں بول سکتے، جس طرح اردو میں انگریزی رکھ کر بے تکلف بول دیتے ہیں۔ اس سہولت کی بنا پر یہ رجحان بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے۔ اس میں فائدہ بھی ہے اور نقصان بھی کہ اپنے چلتے چلاتے اچھے خاصے الفاظ بے موت مر رہے ہیں۔ لہٰذا اعتدال شرط ہے۔ یہ بھی وہی معیار کا مسئلہ ہے کہ حد کون اور کیوں کر مقرر کرے۔

جیسا کہ عرض کیا زبان نیچے سے بن کر ابھرتی ہے۔ عربی، فارسی، سنسکرت الفاظ میں جو تصرفات ہوئے ان کے بانی علما یا پنڈت نہیں ہو سکتے تھے۔ یہ عوام ہی تھے۔ جنھوں نے سُوال کو

سوال اور اکال کو کال بنایا۔ ایسے تصرفات کی تعداد سینکڑوں (صحیح سیکڑوں) سے گزر کر ہزاروں تک ہے۔ لیکن آخر انھیں خواص نے بھی قبول کر لیا۔ عربی کا مقولہ ہے "غلط العام فصیح" چناں چہ زبان کی تشکیل میں خواص سے زیادہ عوام کا دخل ہوتا ہے۔ پھر بھی کسی ایک وقت میں معیار وہی ٹھہرتا ہے جو خواص کا چلن ہو۔ خواص میں صرف دولت مند شمار نہیں ہوتے ورنہ بنیوں اور سیٹھوں کی بولی معیاری ٹھہرتی۔ اہل اقتدار جو دربار سے منسلک ہوتے وہی کلچر سے زیادہ لگاؤ رکھتے تھے۔ ادیبوں، عالموں کی صحبت اٹھاتے، اور ادیبوں عالموں سے زیادہ ذی اثر ہوتے تھے۔ میرے خیال میں جہاں کہیں دو حصہ اقتدار، ایک حصہ دولت اور ایک حصہ علمیت جمع ہو جاتے ہیں ٹکسال کے لیے فضا ساز گار ہو جاتی ہے۔

ہم ایک جمہوری نظام میں رہتے ہیں یا کم از کم جمہوری اصول کو تسلیم کرتے ہیں۔ مگر یہ طبقاتی تقسیم سے خالی نہیں۔ ہمارا ذی اثر طبقہ اعلیٰ کئی طرح کی زبانیں بولتا ہے، اور اردو کی نسبت انگریزی سے زیادہ مانوس ہے۔ بری اردو کی نسبت بری انگریزی زیادہ شرم کی بات سمجھی جاتی ہے۔ یہ صورت ایک عرصہ دراز سے قائم ہے، اور عجیب یہ ہے کہ آزادی کے بعد سے یہ رجحان اور بھی روز افزوں ہے۔ ہمارے سیاسی اکابر نے اس وقت بھی ٹوٹی پھوٹی اردو میں تقریر کرنے کا ایک ایسا انداز قائم کر دیا تھا کہ اس کے بعد سے ایسی اٹکتی کھٹکتی تقریر زیادہ نہیں چونکاتی جیسی کہ پنڈت جواہر لال نہرو یا قائد اعظم جناح کرتے تھے۔ یہی لوگ جب انگریزی میں تقریر کرتے تو خطابت کی شان کچھ اور ہوتی تھی۔ یہ ان کا اپنا جوہر تھا جو انگریزی میں رنگ پر آتا تھا۔ عین اسی طرح جیسے ہمارے بے شمار ریسرچ اسکالروں کے علمی کارنامے انگریزی کے پلے میں جاتے رہے ہیں۔ ان مجبوریوں کے باوجود جتنا بھی علمی سرمایہ اردو نے پیدا کیا خاصا جراءت انگیز ہے۔

اوپر اردو کی تین بنیادی خصوصیات کا ذکر آیا جو اس کی ترقی کی ضامن رہی ہیں اور رہیں۔ وسیع صوتیات اور ترکیب نحوی جو ایک آغوش کشادہ کی حیثیت رکھتی ہے اور بیرونی الفاظ کو آسانی سے سمالیتی ہے، بلکہ مرکبات، محاورات، صفات و فجائیہ کلمات بلکہ فقروں کو بھی۔ اس میں نئے مصادر ڈھالنے کی صلاحیت بھی موجود ہے۔ امدادی افعال کرنا، ہونا وغیرہ کے ساتھ لاتعداد مرکب مصادر بھی بن سکتے ہیں۔ یہ عمل عربی، فارسی، انگریزی میں اتنا آسان نہیں جن کے مادے اور مصادر لگے بندھے ہیں، عہد بہ عہد ان ہی کے معنی میں کشادگی پیدا کی جاتی رہی، اور ایک لفظ کے بہت سے معنی ہو گئے۔

ہم چاہیں تو نامہ، آما، وانا، یانا، لاحقوں سے بہتیرے نئے مصدر بنا سکتے ہیں۔ جیسے برقانا، فلمانا، وصولنا، قبولنا، بخشنا، نوازنا، انگیزنا وغیرہ جو سب وصفی صورتیں ہیں۔ اس سے پہلے اردو نے اور بھی ڈھیروں مصادر وضع کیے تھے۔ بدلنا، بخشنا، شرمانا، گرمانا، خریدنا، تراشنا، ورغلانا،

گزرنا، گزارنا، گزرانا.... مگر پھر یہ سلسلہ سست پڑ گیا۔ عربی فارسی ترکی ہندی کو ملا کر بہت سے گنگا جمنی مرکبات و محاورات بھی بنائے گئے ۔ کھٹکے دار منھ درمنھ، دھینگا مشتی، کٹ حجتی، غل غپاڑا، دھڑے بندی، گراں ڈیل، لاپتہ، فوق البھڑک، بے فکرا، دیدارو، چال باز، میل خورا، نیک چلنی، دماغ چوشٹا پن، مختلف طرح کی چند مثالیں ہیں۔ اسی طرح انگریزی کو اردو انا بھی شروع کر دیا گیا تھا سیکڑوں یورپی الفاظ ہیں کہ بالکل اردو ہو گئے ہیں۔ بکس، دراز، الماری، بم، کارتوس، بالٹی، چابی، فراش بین، گھاس لیٹ، کف، کالر، چھینٹ، رفل، فیس، لنکلاٹ، کنستر، گیٹس، بکلوس، بٹن، مسمریزم، افسر، اردلی، حتیٰ کہ بوریت اور جھاپلزم جیسی اختراعات بھی۔

پھر اس میں سابقوں، لاحقوں کی تعداد غالباً ہر زبان سے زیادہ ہے۔ انگریزی میں گنے چنے سابقے، لاحقے ہیں جو اس نے یونانی یا لاطینی سے مستعار لیے ہیں۔ اردو میں ان کی گنتی آسان نہیں۔ اس نے عربی، فارسی، ترکی، ہندی وغیرہ کے ڈھیروں سابقے لاحقے اپنا لیے ہیں۔ ترکی "چی" سے کتنے ہی لفظ بنا لیے گئے، "ڈفالچی" ترکستان سے نہیں آیا تھا۔ چی کی تانیث "چن" بھی بنالی گئی۔ نفی کے لیے کتنے ہی لاحقے اور سابقے موجود ہیں۔ جب تک زبان کی اختراعی صلاحیتیں کام کرتی رہیں، یہ اپنی ضروریات کے مطابق الفاظ کے ڈھیر لگاتی رہی ۔ پھر اس کے پر باندھ دیے گئے۔ دراصل اختراع اور اصطلاح سازی میں عوام کا مجموعی جینیس جو کمال دکھاتا ہے، کوئی اصطلاح ساز کمیٹی اس کو نہیں پہنچ سکتی۔ inoculation کے لیے کمیٹی بہت سے بہت عربی لفظ "جدرین" کو اپنالے گی یا اس سے جدرین کاری بنالے گی۔ عوام نے ٹیکا بنایا اور چلا دیا۔

یوں تو اردو ضرورت کے تقاضے سے چل رہی ہے اور آپ اپنے بل پر زندہ ہے۔ انگریزی کی طرح ملکوں ملکوں بولی جارہی ہے۔ لیکن معیاری انگریزی کا بھرم قائم ہے۔ تھوڑا بہت مقامی فرق جو امریکی، کینیڈین، آسٹریلیائی انگریزی کے درمیان ہے زیادہ نمایاں نہیں۔ کچھ عرصے سے برصغیر کی انگریزی کا ذکر بھی سننے میں آتا ہے۔ مگر اسے مبتذل ہی خیال کیا جاتا ہے، نہ کہ معیاری ۔ سوال یہ ہے کہ آئندہ معیاری اردو کا پیمانہ کیا ہوگا، اور اس معیار کا پشت پناہ کون ہوگا۔ یہاں ایک بڑا سا استفہامیہ مقدر ہے جو اہل الرائے کو دعوت دیتا ہے۔

○ ○ ○

رشید حسن خاں

لسان الغیب

دیوانِ حافظ سے فال نکالنے کا رواج ایران اور ہندوستان، دونوں ملکوں میں رہا ہے۔ [اور ملکوں کا احوال مجھے معلوم نہیں] ۔ دیوانِ حافظ کے ایک مرتب سید عبدالرحیم خلخالی کے الفاظ میں:

> "این موضوع باندازہ، شیوع و شہرت دارد کہ ہر کس بدون استثنا از شاہ تا گدا ، از غنی تا فقیر، از عارف تا عامی، از پیر تا جوان علاقہ مند و پابندِ آن ہستند۔ تو گوئی اساساً دیوانِ خواجہ براری فال گرفتن ایجاد شدہ است"
>
> [حافظ نامہ، ص ۵۷]

اس سلسلے میں ایسی ایسی روایتیں سامنے آتی ہیں کہ آدمی حیرت میں پڑجاتا ہے۔ یہ، بہ خوبی ممکن ہے کہ کچھ روایتیں محض خوش عقیدگی کی تراشیدہ ہوں، مگر اچھی خاصی تعداد میں ایسی روایتیں بھی موجود ہیں جو واقعے کا درجہ رکھتی ہیں۔ مثال کے طور پر عرض کردوں کہ خدا بخش اورینٹل لائبریری (پٹنہ) میں دیوانِ حافظ کا ایک بیش قیمت خطی نسخہ محفوظ ہے جو مغل بادشاہوں کے کتب خانے میں رہا ہے۔ اس کے کئی صفحات کے حاشیوں پر فال سے متعلق اندراجات ملتے ہیں، ان میں جہانگیر کے قلم کے اندراجات بھی ہیں۔ میں جہانگیر کے ایک اندراج کا حوالہ دینا چاہتا ہوں، جو اس نسخے کے ص ۱۳۶ کے حاشیے پر ہے۔ جہانگیر نے (اپنے قلم سے) لکھا ہے کہ شکار میں "تعویذِ الماس تراشیدہ" گر پڑا۔ میں نے اسے بدشگونی سمجھا۔ خواجہ حافظ کے دیوان سے فال نکالی، وہ غزل سامنے آئی جس کا مطلع یہ ہے:

دلِ رمیدہ، مارا رفیق و مونس شد — ستارہ، بدرخشید و ماہِ مجلس شد

اس سے، یعنی ستارہ، بدرخشید و ماہِ مجلس شد سے، اس نے یہ مراد لی کہ وہ الماس [جو ستارے کی طرح چمکتا تھا] ماہِ مجلس بن جائے گا، یعنی مل جائے گا اور دوسرے دن وہ "الماسِ تراشیدہ" مل گیا۔۔۔۔ میں اس مطلع کو ایک بار پھر پڑھتا ہوں؛ آپ ذرا سی دیر کے لیے اسے اس واقعے سے غیر متعلق کرکے دیکھیے:

دلِ رمیدہ، مارا رفیق و مونس شد — ستارہ، بدرخشید و ماہِ مجلس شد

اب اس پر غور کیجیے کہ شعر میں لفظ "ستارہ" کس طور پر آیا ہے۔ کیا یہ استعارہ ہے؟ جی ہاں، آپ اسے بہ آسانی استعارہ کہہ سکتے ہیں۔ اگر کسی شخص کے ذہن میں کوئی ایسا خیال ہو جو اس

سے متعلق کسی مناسبت کی تشکیل کر سکے، یعنی وجہ جامع بن سکے، تو یہ لفظ اسی خیال کی ترجمانی کر سکتا ہے۔ مان لیجیے کسی شخص کے دل میں یہ خیال آئے کہ میرا محبوب آج آئے گا یا نہیں، وہ فال نکالے اور یہی شعر نکلے، تو اس شخص کے لیے یہی لفظ "ستارہ" محبوب کا مرادف بن جائے گا۔

استعارے میں معنوی وسعت ہوتی ہے۔ "ستارہ" بہت سی چیزوں کے لیے بہ طور استعارہ آسکتا ہے، ان ساری چیزوں کے لیے جن میں ستارے سے کوئی بھی نسبت پیدا کی جا سکتی ہو جس شخص کا جو معبودِ ذہنی ہوگا، یہ لفظ اس کے لیے اسی کا اشاریہ بن جائے گا۔ اس طرح یہ استعارہ، اس شعر کے واسطے سے بہت سے مطالب کا اور بہت سے لوگوں کے مختلف خیالات کا ترجمان بن سکتا ہے اور ہر شخص یہ سمجھنے میں حق بجانب ہوگا کہ یہ شعر اسی کے خیال کی ترجمانی کر رہا ہے۔

تلمیح کی معنویت کا دائرہ استعارے کے مقابلے میں چھوٹا ہوتا ہے۔ اس کے باوجود اکثر تلمیحات میں بھی اتنی معنوی وسعت ہوتی ہے کہ وہ خیال کو ایسے بہت سے مختلف الاحوال واقعات کی طرف منتقل کر سکیں جن میں اور اصل واقعے میں کسی بھی طرح کا ربط پیدا ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر حضرت یوسفؑ کا جو قصہ ہے، اس میں ایسے متعدد پہلو نکلتے ہیں۔ "یوسف گم گشتہ" ہی کو لیجیے۔ فرض کر لیجیے کہ جہانگیر کے سامنے حافظ کا وہ شعر آتا ہے جس کا پہلا مصرع یہ ہے:

"یوسفِ گم گشتہ باز آید بہ کنعان غم مخور"

تو کیا اس مصرع سے ذہن اس طرف منتقل نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ اشارہ ہے گم شدہ الماس کے متعلق، کہ وہ مل جائے گا۔ اس مصرع سے یہ مفہوم بہ خوبی اور بہ آسانی مراد لیا جا سکتا ہے۔ اس تلمیح سے متعلق دو فالوں کا بیان دل چسپی سے خالی نہ ہوگا اور ان سے میرے اس خیال کی وضاحت بہتر طور پر ہو سکے گی۔

خلخالی نے حافظ نامہ میں دوسری جنگ عظیم کے زمانے کی ایک فال کا حوالہ دیا ہے۔ ایک شخص، جو ایران سے باہر چلا گیا تھا، سخت پریشان تھا۔ وہ اکثر سوچتا تھا کہ "دیگر روی وطن عزیز را نخواہد دید۔" ایک دن خواجہ حافظ کے دیوان سے فال نکالی، یہ غزل نکلی:

یوسفِ گم گشتہ باز آید بہ کنعان، غم مخور　　　کلبہ ۔ احزاں، شود روزے گلستاں، غم مخور

فال دیکھنے والے کو یقین ہو گیا کہ اسے دوبارہ ایران جانا نصیب ہوگا۔ اس نے "یوسف گم گشتہ" اپنے آپ کو قرار دیا اور "باز آید بہ کنعان" سے یہ مراد لی کہ وہ ایران پہنچ جائے گا۔۔۔۔ اسی غزل سے ایک اور فال کا احوال تحریری شکل میں سامنے آتا ہے۔ کنعان بیگ قزوینی کے بھائی کا نام یوسف تھا۔ وہ احمد آباد گجرات کی جنگ میں گم ہو گیا۔ کنعان بیگ نے مایوس ہو کر خواجہ حافظ کی روح سے استدعا کی تو مندرجہ ذیل شعر نکلا:

یوسفِ گم گشتہ باز آید بہ کنعان ۔۔۔۔[رسالہ۔ آج کل (دہلی) اپریل ۱۹۴۷ء] یہاں فال

دیکھنے والے نے "یوسف گم گشتہ" سے اپنا بھائی مراد لیا ہے اور " باز آید بہ کنعان" سے یہ مراد لی ہے کہ وہ اپنے گھر واپس آجائے گا۔ دونوں اشخاص کی تفہیم بجائے خود درست ہے، یوں کہ اس تلمیح میں اس قدر معنوی وسعت ہے کہ ایسے دو ہی نہیں، بہت سے واقعات اور مرادوں کی تعبیر کے کام آسکتی ہے۔

اسی سلسلے کی ایک اور فال کا تذکرہ دل چسپ ہوگا۔ چودھری محمد علی ردولوی سے بیشتر اردو والے واقف ہوں گے۔ وہ اپنے علاقے کے تعلقے دار بھی تھے۔ جب خاتمہ ٔ زمین داری کی گفتگو زور شور سے ہو رہی تھی، تب انھوں نے دیوان حافظ سے فال نکالی تھی۔ بہ قول ان کے یہ شعر نکلا تھا:

آن جامہ ٔ کہ بود درو بوی یوسفم   ترسم برادرانِ غیورش قبا کنند

اس شعر سے چودھری صاحب نے کیا مطلب نکالا تھا، اسے انھیں کے الفاظ میں سننا بہتر ہوگا۔ اس فال کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں: "رونا کیا روتے ہو، حافظ رحمتہ اللہ علیہ نے تو کہہ ہی دیا ہے کہ علاقہ جائے گا ضرور" [سوغات، ۸، ص ۴۸۱]۔

اگر اس شعر میں خاتمہ ٔ زمین داری کا اشارہ دیکھا جاسکتا ہے، زمین داری کو " جامہ ٔ یوسف" اور زمین داری ختم کرنے والوں کو " برادرانِ یوسف" مانا جاسکتا ہے، تو واضح طور پر اس کا مطلب یہی ہوا نا کہ فال دیکھنے والے کا ذہن، اپنے معہود ذہنی کی مناسبت سے، بہت دور کی مناسبتوں کو بھی بنیاد بنا کر حسبِ منشا مفہوم نکال سکتا ہے۔ بہ ظاہر اس شعر کا خاتمہ ٔ زمین داری سے دور کا بھی واسطہ نہیں معلوم ہوتا، مگر فال دیکھنے والے کا اس سے قریب کا واسطہ تھا اور یہاں اس قول کی تائید ہوتی ہے کہ متن کی معنویت دراصل قاری متعین کرتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ استعارے سے [اور کسی حد تک تلمیح سے بھی] مفاہیم کے نئے نئے رخ نمایاں ہوسکتے ہیں، لیکن وسعتِ خیال کی تشکیل کے لحاظ سے غزل میں کنایے کی کارفرمائی ان دونوں اجزا سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ غزل کے شعر میں جو یہ معنوی وسعت شامل ہوجاتی ہے، بلکہ یوں کہیے کہ اشعار میں تہ نشیں ہوجاتی ہے، کہ ایک شعر جو نہ معلوم کب کہا گیا تھا اور شاعر نے بہ طور خود کس خیال کو ادا کرنا چاہا تھا، وہ شعر الگ الگ انداز سے نہ معلوم کتنے واقعات کی ترجمانی کرسکتا ہے اور ہر بار یہ محسوس ہوگا کہ یہ شعر تو جیسے اسی موقعے کے لیے کہا گیا تھا، یہ کثیر الجہتی کنایے سے پیدا ہوتی ہے۔

اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ علمِ بیان کے قواعد کے مطابق استعارے میں یہ پابندی ضرور ہوتی ہے کہ لفظ کے حقیقی اور مجازی معنوں میں سے صرف ایک معنی یعنی مجازی معنی ہی مراد لیے جاسکتے ہیں، حقیقی معنی مراد نہیں لیے جاسکتے۔ اس کے برخلاف، کنایے میں لفظ کے حقیقی اور مجازی، دونوں معنی بہ یک وقت مراد لیے جاسکتے ہیں۔ یعنی کنایہ، مجاز اور حقیقت دونوں پر

یکساں انداز میں معنی کا اطلاق کرتا ہے۔ اس طرح ایک طرف تو الفاظ ان حقیقی معنوں کی ترسیل کرتے ہیں جن سے ذہن بہ خوبی متعارف اور مانوس ہوتا ہے اور اس طور پر حقیقی واقعات کی نقش گری ہو جاتی ہے۔ دوسری طرف مجاز کی نسبت سے ایسے مفاہیم کی تشکیل میں معاون ہوتے ہیں جس سے اس وقت، یعنی شعر پڑھتے وقت، اس کو کسی طرح کا ذہنی یا جذباتی تعلق ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ایک قاری ایک وقت میں جس شعر سے ایک مفہوم مراد لیتا ہے، وہی قاری کسی دوسرے وقت، کسی دوسرے خیال یا واقعے کی نسبت سے اسی شعر سے کوئی دوسرا مفہوم مراد لے سکتا ہے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ متعدد مختلف الخیال افراد بہ یک وقت اسی شعر سے کئی مفاہیم مراد لیں۔ اور وہ سب اپنی اپنی جگہ برحق ہو سکتے ہیں۔

فارسی اور اردو، ان دونوں زبانوں میں غزل کا انداز اور احوال ایک جیسا رہا ہے، اس لیے مثالیں خواہ فارسی اشعار سے دی جائیں یا اردو اشعار سے، دونوں میں کچھ فرق نہیں ہوگا۔ غزل کی شعریات مکمل طور پر ان دونوں زبانوں میں ایک ہی ہے۔ میں نے اس محفل کی رعایت سے مثالوں کے لیے اردو اشعار کو ترجیح دی ہے۔ یوں تو مثالوں کی کوئی ایسی خاص ضرورت نہیں تھی؛ کیوں کہ علوم بلاغت، خاص کر علم بیان کے طالب علم اور ان سے دل چسپی رکھنے والے حضرات، جو یہاں موجود ہیں، ان باتوں سے بہ خوبی واقف ہوں گے؛ محض اپنی آسانی کے لیے، یعنی اپنی بات کی وضاحت کے لیے میں دو چار مثالوں سے کام لینا چاہوں گا۔ مرزا غالب کا معروف شعر ہے:

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے، نہ ڈر ہمدم! گری ہے جس پہ کل بجلی، وہ میرا آشیاں کیوں ہو

اس شعر میں "قفس، چمن، ہمدم، بجلی، آشیاں؛ یہ پانچ لفظ بہ طور کنایہ آئے ہیں۔ پہلا لفظ "قفس" ہے۔ یہ پرندے کا پنجرا بھی ہے اور آدمی کا گھر بھی۔ اس کا گاؤں، شہر اور اس کا ملک بھی مراد لیا جا سکتا ہے۔ اس سے پردیس بھی مراد لے سکتے ہیں اور جیل خانہ بھی۔ اس سے ہر وہ مقام مراد لیا جا سکتا ہے جس کے حقیقی یا مجازی حدود کا کسی بھی اعتبار سے تعین کیا جا سکتا ہو۔ اسی طرح "بجلی" سے برقِ آسمانی کے ساتھ ساتھ ایسی ہر طاقت مراد لی جا سکتی ہے جو تباہ کر سکتی ہو؛ وہ سیلاب کا پانی ہو، فسادات کی آگ ہو یا ایسی ہی بے شمار چیزیں، جن کو طوفان بلا مانا جا سکتا ہو۔ یہی احوال دوسرے تین لفظوں کا ہے۔ کنایے کی مدد سے یہ ایک شعر سیکڑوں واقعات کی ترجمانی کر سکتا ہے۔

۱۹۴۷ء کا ایک واقعہ یاد آیا، جب غالب کے الفاظ میں موجِ خوں سر سے گزر گئی تھی۔ ہندوستان کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے نئے سال کے سلسلے میں ۳۱/ دسمبر کو تقریر کی تھی۔ پنڈت جی نے یہ بھی کہا تھا کہ میں توقع کرتا ہوں کہ آنے والا سال امن اور مسرت کا پیغام لے کر آئے گا۔ اگلے دن لکھنؤ کے روزنامے تنویر میں اس تقریر سے متعلق اڈیٹوریل تھا، جس کا

سرنامہ غالب کے اس شعر کو بنایا گیا تھا:

دیکھیے، پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض　　　اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

ایسا معلوم ہوا جیسے مرزا صاحب نے یہ شعر اسی موقعے کے لیے کہا تھا۔ یہ خوبی کنایے کی پیدا کی ہوئی ہے۔ بت، عشاق، برہمن، یہ تینوں لفظ بہ طور کنایہ آئے ہیں۔ ذرا اس شعر کو دیکھیے:

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے　　　جن پہ تکیہ تھا، وہی پتے ہوا دینے لگے
(ثاقب لکھنوی)

کیسا وسیع المفہوم شعر ہے! نہ معلوم کتنی بار لوگوں نے اسے پڑھا ہوگا اور ہر پڑھنے والا، خواہ وہ اپنے دوستوں کی سازش کا شکار ہوا ہو، یا ایسے ہی کسی دوسرے حادثے سے دوچار ہوا ہو، اس کو یہ شعر اپنی حالت کا ترجمان معلوم ہوا ہوگا۔ بات وہی ہے کہ شعر میں باغبان، آگ، آشیانہ، جن پہ تکیہ تھا وہی پتے؛ ان سب اجزا نے کنایے کے واسطے سے وسیع الذیل مفاہیم کی ترجمانی کی صلاحیت اس شعر میں تہ نشین کر دی ہے۔ یا مثلاً اس شعر کو دیکھیے:

جلے پتوں پہ آتی ہیں نظر مبہم سی تحریریں　　　یہ وہ تاریخ ہے بجلی گری تھی جب گلستاں پر

تشریح کی ضرورت نہیں، شعر سنتے ہی بہت سی عام مصیبتوں، خاص کر فسادات سے متاثر ذہنوں پر ایسے بہت سے واقعات کی پرچھائیاں کانپنے لگی ہوں گی جن کی ترجمانی کا حق یہ شعر ادا کر سکتا ہے۔ جلے پتوں، مبہم سی تحریریں، بجلی، گلستاں؛ ان سب میں کنایے کی معنی آفرینی پنہاں ہے۔

مرزا غالب کے ایک شعر کے سلسلے میں روزنامہ تنویر (لکھنو) کا حوالہ اوپر آچکا ہے۔ اردو کے اہم اخباروں کا یہ عام انداز رہا ہے کہ اڈیٹوریل کے شروع میں کوئی ایسا شعر لکھا جائے جو اس تحریر سے مناسبت رکھتا ہو۔ جو لوگ اس پر نظر رکھتے ہیں، ان کو خوب معلوم ہوگا کہ اکثر اوقات سرنامے کا شعر، مکمل تحریر کے مفہوم کی ایسی ترجمانی کرتا ہے جیسے وہ تحریر اسی شعر کی شرح ہو۔ میں ایسی ایک ہی مثال پر اکتفا کروں گا۔ اب سے کچھ پہلے چین نے ایٹمی تجربہ کیا تھا تو اس پر بہت لے دے کی گئی تھی۔ یہ کہا گیا تھا کہ ماحولیات اور انسانی نسل پر اس کے بہت برے اثرات پڑیں گے۔ ۲۰/ اگست ۱۹۹۵ء کے قومی آواز (دہلی) میں اس پر ادارتی نوٹ لکھا گیا تھا اور سرنامہ مرزا غالب کے اس شعر کو بنایا گیا تھا:

رگ و پے میں جب اترے زہر غم تب دیکھیے کیا ہو　　　ابھی تو تلخیِ کام و دہن کی آزمائش ہے

یہ واقعہ ہے کہ ادارتی نوٹ میں جو کچھ لکھا گیا تھا، اس میں اس قدر جامعیت اور اثر انگیزی نہیں تھی، جتنی اس شعر میں ہے کہ ابھی کیا ہے، ابھی تو صرف تلخی کام و دہن کی بات ہے کہ لوگ برا کہہ رہے ہیں۔ جب انسانی نسل اور ماحولیات پر اس کے اثرات پڑیں گے اور رگ و پے میں یہ زہرِ غم سرایت کرے گا تب معلوم ہوگا کہ یہ تجربے کس قدر ہلاکت آفریں اور تباہی

بنیاد تھے۔ کہاں بیسویں صدی کے اواخر کا ایٹمی تجربہ اور کہاں انیسویں صدی کے شاعر کا شعر، مگر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس شعر میں اسی ایٹمی تجربے پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ یہ وہی کنایے کی وسعت آفرینی ہے۔ اس سلسلے میں ہم کو یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ شاعر جتنا بڑا ہوگا۔ کنایے کا [اور استعارے کا بھی] عمل اس کے یہاں انتہائی وسیع الذیل ہوگا۔ غالب ہوں یا حافظ، اپنے اپنے دائرے کے لحاظ سے دونوں بڑے شاعر تھے۔

اس کے ساتھ ساتھ حافظ کی غزل میں ایک اور خصوصیت ہے جو اس انداز سے اور اس پیمانے پر دوسروں کے یہاں نہیں ملتی۔ وہ ہے ان کا ایسا پیرایہ بیان جس میں تصوف کے لحاظ سے حقیقت اور مجاز، دونوں پہلو برابر سے توجہ طلب نظر آتے ہیں۔ حافظ صوفی تھے یا نہیں، ان کی شراب شرابِ معرفت تھی یا شرابِ انگور، اس میں تو اختلاف ہے اور یوں اختلاف ہے کہ خوش عقیدگی نے مجاز کی واقعیت پر متصوفانہ انداز کی مفروضہ حقیقت پسندی کو ترجیح دینا ضروری سمجھا ہے، مگر اس پر سب کا اتفاق ہے کہ حافظ درجہ اول کے غزل گو تھے اور اپنے انداز کے منفرد شاعر تھے۔ وہ اندازِ خاص کسی دوسرے شاعر کو نصیب نہ ہوسکا۔ اس سے بھی اتفاق کیا گیا ہے کہ فارسی غزل کے بڑے حصے پر متصوفانہ انداز کے گہرے اثرات چھائے رہے ہیں اور حافظ کے کلام میں ان کی نمود درجہ کمال پر نظر آتی ہے۔ اس کے نتیجے میں اس سطح پر بھی ان کے اشعار میں بڑی پہلوداری پیدا ہو گئی ہے۔

اس طرح دو طاقت ور اجزا ہوئے: ایک کنایہ [اور کسی حد تک استعارہ] اور دوسرا یہ متصوفانہ پہلو دار اندازِ بیان۔ ان دونوں کے واسطے سے حافظ کی غزل میں ایسی معنویت سما گئی ہے کہ ایک شعر، بہت سے واقعات کا ترجمان بن سکتا ہے اور مختلف العقیدہ اور مختلف الخیال لوگ ایسے اشعار کے آئینوں میں اپنے اپنے خیالات، خواہشات اور سوالات کے عکس دیکھ سکتے ہیں دیوانِ حافظ کے اولین مقدمہ نگار کے الفاظ میں:

"در ہر واقعہ سخنے مناسب حال گفتہ و برائی ہر معنی لطیف غریبہ، انگیختہ و معانی بسیار بلفظ اندک خرج کردہ۔۔۔۔ سماعِ صوفیاں بے غزل شور انگیزاو گرم نشدے و مجلسِ مے پرستاں بے نقلِ سخنِ ذوق آمیزاو رونق نیافتے۔"
[دیوانِ حافظ مرتبہ قزوینی وقاسم غنی]۔

اس سلسلے میں یہ پوچھا جاسکتا ہے کہ آخر خواجہ حافظ ہی کے دیوان سے فال کیوں نکالی جاتی ہے۔ ایران میں تو بڑے بڑے صوفی شاعر گذرے ہیں، جیسے: رومی، سنائی، عطار، (وغیرہ)۔ اس ضمن میں کئی باتیں ہمارے سامنے رہنا چاہییے۔ ایک تو یہ کہ حافظ کے کلام سے ہر طرح کی فالیں نکالی جاتی ہیں، ان میں عاشقانہ اور رندانہ فالیں بھی شامل ہیں۔ مثلاً یہ کہ محبوب کا وصال میسر ہوگا کہ نہیں (وغیرہ)۔ رومی، سنائی، عطار جیسے اعلا مرتبے والے صوفی شعرا کے دواوین سے ایسی فالیں

نکالنے کا ارادہ کرنا بھی ترکِ ادب سمجھا جاسکتا تھا، یوں کہ یہ لوگ از سرتاپا صوفی اور خدارسیدہ بزرگ ہیں۔ یہ عالمِ طریقت کے سیاح ہیں۔ حافظ کے سلسلے میں البتہ ایسی کوئی بات سوچی ہی نہیں جاسکتی تھی۔ وہ تو سب کے خواجہ ہیں، عاشقانِ دل باختہ اور رندانِ قدح خوار کے خاص طور پر۔ انھوں نے خود ہی کہا ہے:

برسرِ تربتِ من چوں گذری ، ہمت خواہ — کہ زیارت گہہ رندانِ جہاں خواہد بود

دوسری بات یہ ہے کہ رومی، عطار، سنائی، ان تینوں کی شہرت اور عظمت کی ترجمانی دراصل ان کی مثنویاں کرتی ہیں۔ مثنوی کے اشعار میں غزل کے اشعار جیسی پہلوداری نہیں ہوتی اور اس میں کنایے کا عمل غزل کی طرح کارفرما نہیں ہوتا، یوں کہ بنیادی طور پر مثنوی بیانیہ صنفِ سخن ہے، اس لیے مثنوی کے متفرق اشعار غزل کے متفرق اشعار کی طرح مختلف مفاہیم کی تشکیل نہیں کرپاتے۔

اب رہیں ایسے شعرا کی غزلیں، تو جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا، ان شاعروں اور ان جیسے شاعروں کے ساتھ ادب آداب اور بزرگی و عظمت کی ایسی صفات وابستہ رہی ہیں کہ ان کے کلام سے عمومی طور پر ہر طرح کی فالیں نکالنے کی جرات نہیں کی جاسکتی تھی۔ یوں تو قرآن پاک سے بھی فال نکالی جاتی ہے، لیکن "رندانِ جہاں" میں سے شاید ہی کوئی شخص رندانہ مطلب کی فال کے لیے اس کی طرف رجوع کرنے کی جرات کرے۔ یہ شرف تو حافظ ہی کو حاصل ہے کہ وہ اللہ کے نیک بندوں اور خالص دنیا داروں، بادشاہوں اور فقیروں، سب کے لیے ایک جیسی حیثیت رکھتے ہیں۔ شخصی سطح پھر قربت اور ذہنی سطح پر یگانگت کا جیسا احساس حافظ کے کلام سے وابستہ ہے، قربت و یگانگت کا ویسا احساس کسی دوسرے ایرانی شاعر کے کلام سے پیدا نہیں ہوسکا۔ یہ وہی بات ہے جس کو حافظ نے اس طرح کہا ہے: "قبول خاطر و لطفِ سخن خداداد است۔"

غیبی اشاروں کی مدد سے معلومات حاصل کرنا کسی نہ کسی شکل میں ہر زمانے میں ہر جگہ رائج رہا ہے۔ قرآن سے فال نکالنا اور استخارہ دیکھنا اسی جذبہ بے اختیار شوق کی تسکین کی مختلف شکلیں ہیں۔ اس کا قوی امکان ہے کہ کسی شخص نے کسی خیال کے تحت دیوانِ حافظ کھولا ہو اور اس کے سامنے ایسی غزل یا ایسا شعر آگیا ہو جو اس کے خیال کے مطابق اس کی کسی مشکل سے متعلق اشارہ نما ہو اور حسنِ اتفاق سے وہ کام حسبِ مراد بن گیا ہو۔ اس طرح کسی ایک واقعے نے یا ایسے بعض اتفاقات نے ایک روایت کی تشکیل میں مدد کی ہو۔ عقیدت کی خوش بو جنگل کی آگ کی طرح پھیلتی ہے، یوں خواجہ حافظ کا اور دیوانِ حافظ کا پردہ کشائے اسرارِ غیب ہونا گویا مسلم ہوگیا۔

فال نکالنے کے ایک طریقے کے مطابق دیوانِ حافظ کھولنے سے پہلے یہ کہنا چاہیے: "اے خواجہ حافظ شیرازی، تو کاشفِ ہر رازی، من طالبِ یک فالم، بر من نظر اندازی" [حافظ نامہ]۔ اس میں یہ جو ٹکڑا ہے: "تو کاشفِ ہر رازی" یہ اس عام خیال کی ترجمانی کر رہا ہے کہ خواجہ حافظ

لسان الغیب ہیں ، ان کا کلام کاشف اسرار یعنی چھپی ہوئی باتوں کو ظاہر کرنے والا ہے۔ جب عقیدت کسی معاملے میں اپنی جگہ بنالیتی ہے، تو پھر منطق کے لیے اور حقیقی اسباب کی جستجو کے لیے کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ یہی نہیں، یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ ایسے معاملات میں جو شخص اسباب اور وجوہ کی تلاش پر زور دیتا ہے، وہ یا تو بد عقیدہ ہے یا خواجہ صاحب کے مرتبے سے ناواقف ہے ، اور اس کے بعد کچھ کہنے سننے کی گنجائش رہتی ہی نہیں۔ اس طرح کی عقیدت کسی دوسرے فارسی شاعر سے پیدا نہیں ہو سکی ، اس لیے ظاہر ہے کہ ان کے کلام سے فال نکالنے کی روایت بھی فروغ نہیں پا سکتی تھی۔ آخر میں یہ بات کہ بھی کہ کسی دوسرے شاعر کی غزل میں مجاز اور حقیقت کی ایسی شوخ رنگی نہیں جو حافظ کی غزل کا خاصہ ہے۔ دوسروں کے یہاں تو مجاز نمایاں ہے یا حقیقت کا رنگ بہت گہرا ہے۔ یہ بات نہیں کہ شعر پڑھتے ہی رند اور صوفی ، خاص کر دنیا زدہ صوفی [اور ہمارے زمانے میں تو صرف یہی قوم باقی رہ گئی ہے] دونوں کو بے ساختہ یہ محسوس ہو کہ یہ تو ہمارے دل کی آواز ہے۔

ادب کے طالب علموں کا معاملہ عقیدت مندوں کے طرز عمل سے مختلف ہوتا ہے اور ہونا چاہیے۔ تحقیق اور تنقید سے تعلق خاطر رکھنے والوں کے لیے لازم ہے کہ وہ ادبی معاملات کو ادب کی عینک سے دیکھیں۔ فارسی غزل میں اور اس کے اثر سے اردو غزل میں جو تہہ داری اور پہلو داری ہے، اس کا تجزیہ ادبی طریق کار کے تحت کریں۔ علم بیان کے قاعدوں [تشبیہہ ، استعارہ ، کنایہ ، مجاز مرسل] نے ادائے مفہوم کے جن پیرایوں کی نقش گری کی ہے، ان کا جائزہ ان ہی قواعد کی روشنی میں لیا جانا چاہیے۔ خوش ذوقی ادب کے طالب علم کے لیے لازم ہے ، مگر خوش گمانی اور خوش فہمی سے اس کا دور کا بھی واسطہ نہیں ہونا چاہیے۔ روایت کا منکر ہونا اور اس سے بے تعلقی کے اظہار کو لازم سمجھنا یقیناً غلط ہے اور ناقابل قبول ، لیکن روایت کے تجزیے کا قائل ہونا اور اس پر قادر ہونا لازم ہے۔ تجزیے کی صلاحیت سے محروم شخص ادب فہمی اور روایت دوستی ، دونوں کا حق ادا نہیں کر سکتا۔

الحاقی کلام کا مسئلہ

اب اس بحث کے ایک اور اہم پہلو کی طرف توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔

ایران کے سب سے بڑے محقق اور دیوان حافظ کے ایک مرتب قزوینی کے قول کے مطابق دیوان حافظ کے مختلف نسخوں میں کم و بیش کی نسبت کے ساتھ الحاقی کلام پایا جاتا ہے۔ ان کے قول کے مطابق بعض نسخوں میں سو (۱۰۰) یا سو (۱۰۰) سے کچھ کم غزلیں ، اور بعض میں تین سو (۳۰۰) تک الحاقی غزلیں ہیں۔ اب یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فال میں اگر کوئی ایسا شعر نکلے جو الحاقی کلام سے تعلق رکھتا ہو ، یعنی اسے حافظ سے منسوب کر دیا گیا ہے ، مگر وہ حافظ کا ہے نہیں ، تب کیا کہا جائے گا؟

میں اس کی وضاحت ایک مثال سے کرنا چاہوں گا۔ دیوان حافظ سے نکالی گئی ایک نہایت مشہور فال کی اس طرح نشان دہی کی گئی ہے:

"شاہانِ اودھ میں کسی کے زمانے کا یہ واقعہ مشہور ہے کہ محل میں بادشاہ کی بیش قیمت انگوٹھی یا کوئی جواہر گم ہو گیا۔ رات کے وقت اسے چراغ کی روشنی میں تلاش کیا جارہا تھا کہ دیوانِ حافظ میں فال دیکھی گئی تو سرِ صفحہ یہ بیت برآمد ہوئی:

زفروغ چہرہ نقش رہ دین زند ہمہ شب
چہ دلاور است دزدی کہ بکف چراغ دارد

چناں چہ جس کنیز کے ہاتھ میں شمع تھی، اس کے پاس سے گم شدہ جواہر برآمد ہوا۔"

[مجلہ، آج کل (دہلی) شمارہ، اپریل ۱۹۴۷ء]۔

دیوان حافظ کے جو معتبر نسخے ہیں، مثلاً: نسخہ، قزوینی وقاسم غنی، نسخہ، نذیر احمد وجلالی نائنی (وغیرہ) ان میں اس زمین میں حافظ کی غزل تو ہے، "چراغ" کا قافیہ بھی ایک شعر میں ہے، مگر اس غزل میں یہ شعر موجود نہیں۔ دیوان حافظ کے خطی نسخے مخزونہ، خدا بخش لائبریری (پٹنہ) میں بھی یہ شعر موجود نہیں۔ [اس خطی نسخے کا ذکر ابتدائے مضمون میں آچکا ہے]۔ "چراغ" کا قافیہ اس غزل کے جس شعر میں آیا ہے، وہ یہ ہے:

شبِ ظلمت و بیاباں بکجا توان رسیدن مگر آنکہ شمعِ رویت برہم چراغ دارد[1]

اس صورت میں اس نہایت مشہور فال کے متعلق کیا کہا جائے گا؟ بالفرض حافظ کا کلام اسرارِ غیبی کا پردہ کشا ہو اور وہ لسان الغیب ہوں، مگر اس شعر میں تو کسی طرح کی پردہ کشائی کی برکت پنہاں نہیں ہو سکتی۔ معلوم نہیں یہ کس کا شعر ہے۔

اس کا واضح طور پر مطلب یہ ہے کہ (غزل) کے اچھے اشعار میں استعارے اور کنایے کی پیدا کی ہوئی صفت معنی آفرینی کار فرما ہوتی ہے، وہ شعر کسی کے ہوں۔ معروف شاعر کے ہوں یا غیر معروف شاعر کے۔ شاعر مسلمان ہو یا غیر مسلم۔ باقی سارا کھیل عقیدت کا ہوتا ہے، وہ جس شعر سے جو معنی چاہے نکال لیے اور فال دیکھنے والے کا معہود ذہنی اسے اپنے حسب حال قرار دے لے۔

---

(۱) یہ مصرع بہ طور ضرب المثل مشہور رہا ہے۔ علی اکبر دہخدا نے اپنی قابل قدر کتاب امثال و حکم میں اس مصرع کو درج کیا ہے، مگر شاعر کا نام نہیں لکھا۔

فال سے متعلق معتبر اور غیر معتبر روایتیں

دیوان حافظ سے فال نکالنے کی جو روایتیں مشہور ہیں، ان میں سے کچھ روایتیں تو وہ ہیں جن کے صحیح ہونے پر شک نہیں کیا جا سکتا، کیوں کہ ان سے متعلق ایسے تحریری ثبوت موجود ہیں جو تحقیق کے نقطہ نظر سے قابل قبول ہیں۔ اگر کچھ روایتیں ایسی بھی ہوں جن کے متعلق اعتماد کے ساتھ یہ نہ کہا جا سکے، تو اس پر تعجب نہیں ہونا چاہیے۔ روایتیں گڑھنے اور قصے بنانے کا ہنر بہت عام رہا ہے، خاص کر ان معاملات میں جن کا تعلق خوش عقیدگی اور خوش گمانی سے ہو۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ جس فال کی جو سماعی روایت ہے، اصلاً بھی وہ اسی طرح ہو۔ میں ایک مثال سے اس کی وضاحت کرنا چاہوں گا:

سید عبدالرحیم خلخالی نے حافظ نامہ میں ایک فال کا حال اس طرح لکھا ہے: "" و نیز شنیده ام جوان صبیح المنظری بر سر تربت خواجه برای حاجتی استمداد طلبیده خالی می گیرد، این بیت میاید: سرمست در قبای زر افشان چو بگذری یک بوسه نذر حافظ پشمینه پوش کن - ظاهراً حاجتش برآورده می شد بار دیگر بر مقبره خواجه آمده برای مقصود دیگر تفاءل کرده - این بیت می آید: گفته بودی که شوم مست و دو بوست بدہم وعده از حد شد و مانه دو دیدیم و نه یک (ص: ۶۲) ۔ "میں نے سنا ہے کہ ایک " جوان صبیح المنظر " نے خواجہ صاحب کی قبر پر حاضر ہو کر اپنی مشکل میں استمداد کی درخواست کی اور دیوان سے فال نکالی۔ یہ شعر نکلا:

سرمست در قبای زر افشاں چو بگذری   یک بوسہ نذر حافظ پشمینہ پوش کن

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا وہ کام بن گیا۔ دوسری بار کسی دوسری مراد کے سلسلے میں پھر آیا اور فال نکالی۔ یہ شعر نکلا:

گفتہ بودی کہ شوم مست و دو بوست بدہم   وعدہ از حد بشد و مانہ دو دیدیم و نہ یک

اب اس فال کی ایک دوسری روایت دیکھیے۔ قاضی سجاد حسین (مرحوم) نے جو مترجم دیوان حافظ شائع کیا تھا، [سب رنگ کتاب گھر، دہلی] اس کے مقدمہ نگار نے اسی واقعے کو ان الفاظ میں لکھا ہے:

> "فتح علی سلطان ایک نہایت حسین نوجوان تھا۔ خواجہ حافظ کے مزار کے پاس پہنچا اور فال نکالی تو یہ شعر نکلا: سرمست با قبای زر افشاں۔۔۔۔۔فتح علی نے کہا کہ ایک بار نہیں، بلکہ دو بار بوسہ دوں گا، لیکن بوسہ نہ دیا اور واپس ہو گیا۔ اگلے ہفتے پھر مزار پر پہنچا اور فال نکالی تو یہ شعر برآمد ہوا: گفتہ بودی کہ شوم مست۔۔۔۔۔فتح علی نے کہا کہ میں دو (۲) بوسے نہیں، بلکہ تین بوسے دوں گا اور پھر بغیر بوسے دیے چلا گیا۔ تیسری بار جب خواجہ صاحب کے مزار پر پہنچا اور فال نکالی تو یہ شعر برآمد ہوا:

سہ بوسہ کز دولبت کردہ، حوالت من
اگر ادا نہ کنی ، وام دار من باشی

فتح علی اپنی جگہ سے اٹھا اور پے در پے مزار کو بوسے دیے۔" [ص ۲۲]

اس روایت میں یہ قصہ اچھی خاصی کہانی کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ کیسی رنگین کہانی ہے۔ اس واقعے کے دونوں راویوں نے اپنے اپنے ماخذ کا حوالہ دیا نہیں۔ ماخذ کے حوالے کے بغیر روایت میں اضافوں کی آسانی حاصل ہو جایا کرتی ہے۔ میرے ذہن میں تو یہ خیال آتا ہے کہ تیسری بار بوسہ دینے کی جو بات شامل فال ہوئی، خواجہ صاحب کے اس شعر کو سامنے رکھ کر اس کا اضافہ کیا گیا: سہ بوسہ کز دولبت ۔۔۔۔۔ کسی شعر کو دیکھ کر نثر میں ایک مضمون پیدا کرنا یا کسی روایت میں ایک نئے پیوند کا اضافہ کرنا، یہ بہت عام باتیں رہی ہیں۔

اسی کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی ذہن میں رہنا چاہیے کہ یہ معلوم ہونا ازبس ضروری ہے کہ کسی فال کے سلسلے میں جو تفصیلات بیان کی گئی ہیں، وہ معلوم کس طرح ہوئیں؟ جیسے اسی فال میں فتح علی سے منسوب جو الفاظ نقل کیے گئے ہیں، ان کا راوی کون ہے؟ شنیدہ ام، گفتہ اند، روایت ہے، لوگ کہتے ہیں، مشہور ہے؛ ایسے کلمات پر جن روایتوں کی بنیاد ہو، ان کی تصدیق ضروری ہے۔ ہمارے اکثر لکھنے والے حوالہ دینا ضروری نہیں سمجھتے، یا اس کی ضرورت نہیں سمجھتے کہ جو کچھ بیان کیا گیا ہے، وہ بھی دیکھ لیں کہ وہ قابل قبول بھی ہے۔ اس لیے ایسی روایتوں کو آنکھ بند کر کے مان لینا ادب کے طالب علموں کے لیے جائز نہیں ہوگا۔

اچھا یہ ہوگا کہ ادب کا کوئی ذہین طالب علم، جو عقیدت کا مارا ہوا اور زود یقینی کا ستایا ہوا نہ ہو، وہ دیوان حافظ سے منسوب فالوں کا مفصل گوشوارہ بنائے اور ہر روایت کا اس لحاظ سے بھی جائزہ لے کہ وہ تحقیق کے نقطہ نظر سے قابل قبول ہے یا نہیں، اور یہ بھی کہ اختلاف روایت کی صورت میں مرجح صورت کون سی ہے۔

فال نکالنے کا طریقہ

اس سلسلے میں مختلف بیانات ملتے ہیں۔ خلخالی کا قول اوپر نقل کیا گیا ہے۔ ان کی مکمل عبارت یہ ہے:

> "ہر کس ہر وقت و ہر موقع کتاب حافظ بدست بیاورد، ابتداءً بدون فوت وقت صلوات و سلامی بروح خواجہ فرستادہ، "اے خواجہ حافظا شیرازی، تو کاشف ہر رازی، من طالب یک فالم، بر من نظر اندازی" گفتہ بانہایت ادب و احترام کتاب را باز کردہ شروع بخواندن کردہ و گفتہ، خواجہ را بانیت خود تطبیق، و بآن عمل میکند۔" (حافظ نامہ)۔

اس عبارت میں "شروع بخواندن کردہ" سے واضح طور پر یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کہاں

سے پڑھے۔ بہ ظاہر یہ مطلب نکلتا ہے کہ جو صفحہ سامنے آئے، اس کو پڑھنا شروع کرے۔ جب کوئی ایسا شعر سامنے آجائے جو اس کے مقصود سے کچھ مطابقت رکھتا ہو، تو سمجھ لے کہ یہی شعر فال کے طور پر نکلا ہے۔

مغل بادشاہ جہانگیر کی ایک تحریر [جو خطی نسخہ، دیوان حافظ مخزونہ، خدا بخش لائبریری پٹنہ کے ص ۱۳۶ پر ہے] معلوم ہوتا ہے کہ داہنی طرف کے صفحے کی غزل کے مطلعے سے فال نکالی گئی ہے۔ اشعار کے شمار کے لحاظ سے اس صفحے کا تیسرا شعر ہے۔ اسی صفحے کے حاشیے پر ایک اور اندراج ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی صفحے کے دوسرے شعر سے فال نکالی گئی ہے، جو اس غزل کا آخری شعر ہے۔

اسی نسخے کے ص ۱۴۷ کے حاشیے پر جو اندراج ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بائیں طرف کے صفحے کے آخر سے جس غزل کا آغاز ہوتا ہے، اس کے مطلعے سے فال نکالی گئی ہے۔ شمار کے لحاظ سے یہ اس صفحے کا بارھواں شعر ہے۔ اسی نسخے کے ص ۲۲۳ کے حاشیے کے اندراج سے معلوم ہوتا ہے کہ اس صفحے کے گیارھویں شعر سے فال نکالی گئی ہے اور ص ۲۳۱ کے اندراج سے معلوم ہوتا کہ اس صفحے پر موجود مکمل غزل سے فال لی گئی ہے، جس کا آغاز ص ۲۳۰ کی آخری سطر سے ہوتا ہے۔ خلخالی نے حافظ نامہ میں ایک فال کے تحت لکھا ہے کہ "در ابتدای صفحہ این شعر برآمد۔" یعنی فال کے لیے شروعِ صفحہ کے شعر سے کام لیا گیا اور ص ۶۳ پر لکھا ہے کہ پوری غزل سے فال نکالی گئی ہے۔

میرے ایک دوست نے مجھ سے بیان کیا کہ میں خواجہ حافظ کی روح پر فاتحہ پڑھ کر، آنکھیں بند کرکے دیوان کھولتا ہوں۔ جہاں سے کھل جاتا ہے، اس کے پہلے صفحے کے ساتویں شعر کو دیکھتا ہوں۔ مفید مطلب نہیں ہوتا تو دوبارہ کھولتا ہوں۔ میرے ایک دوسرے کرم فرمانے بتایا کہ وہ داہنی طرف کے صفحے کے پہلے شعر سے فال نکالتے ہیں۔ دیوان حافظ مترجم (ترجمہ: قاضی سجاد حسین) کے آغاز میں مولوی محمد میاں قمر دہلوی نے "کلام حافظ اور فال" کے عنوان سے ایک مضمون شامل کیا ہے، اس میں انھوں نے فال نکالنے کے کئی طریقے لکھے ہیں۔ ایک تو یہ کہ "بعض صاحبان بسم اللہ پڑھ کر دیوان حافظ کھولتے ہیں اور پھر کسی شعر پر انگلی رکھ کر، اس شعر کے مطلب سے فال نکالتے ہیں۔ بعض صاحبان دیوان حافظ کھول کر دائیں صفحے کے ساتویں شعر سے فال لیتے ہیں۔ بعض صاحبان نے فال نکالنے کی حسب ذیل جدولیں تجویز کی ہیں۔" اس کے بعد وہ جدولیں درج کی ہیں اور طریقہ لکھا ہے۔ یہ بیان اس قدر پیچیدہ اور طویل ہے کہ چھے (۶) صفحے میں آیا ہے اور اس طریقے کے مطابق فال نکالنا، ریاضی کے کسی پیچیدہ سوال کو حل کرنے کے برابر ہے۔

ابھی میں نے اس تمنّا کا اظہار کیا ہے کہ کوئی مستعد طالب علم دیوان حافظ سے منسوب

فالوں کا گوشوارہ تیار کر کے، ان کا تجزیہ کرے تو اس سے صحیح صورت حال سامنے آسکے گی۔ اسی کام کے دوسرے جز کے طور پر یہ بھی کیا جائے کہ دیوان حافظ سے فال نکالنے کے جن طریقوں کا تحریری اور زبانی روایتوں کی صورت میں احوال ملتا ہے، ان کو بھی یک جا کر دیا جائے۔ اس طرح یہ پہلو بھی وضاحت کے ساتھ سامنے آسکے گا۔

حافظ نے کہا ہے:

از غم ہجر مکن نالہ و فریاد کہ دوش زدہ ام فالے و فریاد رسے می آید

کسی فریاد رس کا انتظار، کسی مسیحا نفس کی تمنا اور کسی اشارہ غیبی کی جستجو انسانوں کو ہمیشہ رہے گی۔ کسی نے کسی انداز کی حسرت تعمیر سے کوئی دل کبھی خالی نہ رہ سکے گا۔ آشوب زندگی کو گوارا بنانے کے لیے، حوصلے کو زندہ رکھنے کے لیے اور ناامیدی کے اندھیرے کو دور کرتے رہنے کے لیے ایسے مفروضہ سہاروں کی اور ایسی خیالی روشنیوں کی تلاش اور ضرورت شاید ہمیشہ رہے گی۔ اسی لیے ستاروں کی چال سے مستقبل کی رفتار کا اندازہ بھی کیا جاتا رہے گا، سروش غیب کی آواز پر کان بھی لگے رہیں گے، لوگ استخارہ بھی دیکھتے رہیں گے اور فال بھی نکالتے رہیں گے۔ بہ قول شاعر:

یہ قدر پیمانہ تخیل سرور ہر دل میں ہے خوشی کا
اگر نہ ہو یہ فریب پیہم، تو دم نکل جائے آدمی کا (عروج مظہری)

"منٹو کا افسانہ" کا بقیہ:۔

وقت میں جب کہ واقع ہو رہا ہو۔ ان حالات میں بیانیہ وقت کا لباس پہنتا ہے اور کہانی خود وقت بن جاتی ہے۔ اس میں وہ سب اشارے اور عملیات پائے جاتے ہیں جن سے وقت شکل اور جسم پاتا ہے۔ کہانی کا وقت چوں کہ خود صرف بیانیہ ہی ہے کہانی کو پڑھنے والے بیانیہ کے ایک ایک لفظ کو یوں پڑھیں گے جیسے وہ وقت کو ایک ادبی دنیا میں دیکھ رہے ہوں۔ حقیقی وقت کیا ہے۔ یہ ایک دوسرا مسئلہ ہے لیکن ادبی وقت ہی کہانی کا حقیقی وقت ہے۔ جس میں سب کچھ ہو رہا ہے۔ منٹو کی کہانی "دھواں" اس اعتبار سے "سلیمان کا گیت" پر مبنی جدید کہانی ہے جس کا اپنا ہی وقت ہے اور اس کے علاوہ یہ اہم بات کہ بیانیہ جدید وقت میں ہو رہا ہے۔ اس معنی میں نقادوں کا یہ موقف کہ تکنیک کے اعتبار سے "دھواں" ایک نازک کہانی ہے، بہت درست ہے۔ اسی کہانی میں منٹو تکنیک کے کمال کو چھوتا ہے۔ "دھواں" کہانی کے جذباتی ٹکڑے منٹو کی اور دوسری کہانیوں میں بھی ملتے ہیں۔ اس اعتبار سے شاید یہ کہانی منٹو کے فلسفے کے بند دروازوں کی ایک واحد چابی ہے۔ اس کہانی میں نہ صرف فنی تکنیک پائی جاتی ہے بلکہ فنی تنظیم بھی جس میں اخلاق کا ایک بنیادی تصور بھی ملتا ہے۔

(طویل مضمون کا پہلا حصہ)

اختر احسن

منٹو کا افسانہ "دھواں"
(فنی تنظیم کا ایک تہذیبی مرقع)

(۱)

ابتدائیہ

میرے اس مضمون کا مقصد صرف یہ ہے کہ منٹو کے بارے میں کچھ تازہ خیالات مہیا کیے جائیں۔ میری اپنی سوچ کے مطابق منٹو کا ایک طرف امیر خسرو کی چھو ساقن جیسی چیزوں سے تعلق ہے اور دوسری طرف اس کے ڈانڈے "سلیمان کا گیت" سے ملے ہوئے ہیں۔ اگر قارئین تھوڑا غور کریں تو منٹو کے ہاں خیالات کے جڑاؤ میں انھیں ایک گہری مذہبی روایت کا عکس ضرور ملے گا۔ منٹو میں یقیناً ایک حکیمانہ جہت ملتی ہے۔ اس کے ہاں معنویت، علامت پسندی سے گزرتی ہوئی ایک ایسی انسانی محبت میں تحلیل ہو جاتی ہے، جہاں طوائف کا ذکر ذاتی لگاؤ کی بنا پر نہیں بلکہ ایک ادبی انتخاب پر نظر آتا ہے اور جہاں ابدیت کا دھارا ادبی پاکیزگی کے سرچشمے سے دوبارہ جاری و ساری ہوتا ہے۔ اچھے ادب کے ہاں برے لوگوں کا ذکر محض ذکر کی خاطر نہیں بلکہ انتخاب کے طور پر آتا ہے۔ اور ادبی انتخاب ذاتی انتخاب سے ایک علاحدہ اور بالاتر چیز ہے۔

(۲)

ادبی انتخاب

اب کچھ انمل بے جوڑ باتوں کے بارے میں سنیے۔ امیر خسرو پر لکھتے ہوئے مولانا شبلی نعمانی نے اشارہ کیا ہے کہ ان میں بے جوڑ باتوں کو ملا کر شعر کہنے کی بے پناہ طاقت تھی۔ اس کی طرف منٹو کے نقادوں نے بھی اشارہ کیا ہے کہ وہ انمل باتوں کو جوڑ دیتا تھا۔ اس سلسلے میں منٹو کے بارے لکھتے ہوئے محمد حسن عسکری نے کہا: "مگر پہلی بات تو یہ ہے کہ آمد اور آورد کا فرق ادب میں کوئی معنی نہیں رکھتا۔ کوئی چیز آمد ہو یا آورد فیصلہ کن بات تو یہ ہے کہ اس سے نتیجہ کیا برآمد ہوا۔" بے جوڑ باتوں کو جوڑنے کے علاوہ امیر خسرو اور منٹو میں ایک اور چیز بھی ایک ساتھ ملتی ہے جس کا ذکر کچھ لوگوں کے نزدیک ادب سے بالکل خارج ہونا چاہیے اور وہ ہے منٹو کے ادب میں ایسے لوگوں کا ذکر جن سے لوگ عموماً کتراتے ہیں۔ مولوی محمد حسین آزاد کی امیر خسرو پر

ایک تحریر ہے جس میں وہ لکھتے ہیں:

"محلے کے سرے پر ایک بڑھیا ساقن کی دکان تھی۔ چھّو اس کا نام تھا۔ شہر کے بیہودہ لوگ وہاں بھنگ چرس پیا کرتے تھے۔ جب یہ (خسرو) دربار سے پھر کر آتے یا تفریحاً گھر سے نکلتے تو وہ بھی سلام کرتی۔ کبھی کبھی حقہ بھر کر سامنے لے کھڑی ہوتی۔ یہ بھی اس کی دل شکنی کا خیال کر کے دو گھونٹ لے لیا کرتے۔ ایک دن اس نے کہا بلالوں، ہزاروں غزلیں، گیت، راگ، راگنی بناتے ہو۔ کتابیں لکھتے ہو۔ کوئی چیز لونڈی کے نام پر بھی بنادو۔ انھوں نے کہا: بی چھو بہت اچھا۔ کئی دن کے بعد اس نے پھر کہا کہ بھٹیاری کے لڑکے کے لیے خالق باری لکھ دی۔ ذرا لونڈی کے نام پر بھی کچھ لکھ دو گے تو کیا ہو گا۔ آپ کے صدقے سے ہمارا نام بھی رہ جائے گا۔ اس کے بار بار کہنے سے ایک دن خیال آگیا۔ کہا لوبی چھو سنو:

اوروں کی چوبہری باجے چھو کی اٹھ پہری
باہر کا کوئی آئے نا ہیں آئیں سارے شہری
صاف صوف کر آگے راکھے جس میں ناہیں توسل
اوروں کے جہاں سینگ سمائے چھو کے وہاں موسل

(یعنی یہ بادشاہوں سے بھی بڑی ہیں جنگلی گنواروں کا کام نہیں سفید پوش آتے ہیں۔ پیالہ۔ بنگ صاف مصفی حاضر کرتی ہے جس میں تس تنکا نہ ہو بھنگڑ فخریہ کہا کرتے کہ ہیں کہ وہ ایسی بھنگ پیتا ہے کہ جس میں گاڑھے پن کے سبب سے سینگ کھڑی رہے۔ آپ مبالغہ کرتے کہ یہ ایسی بھنگ بناتی ہے کہ جس میں موسل کھڑا رہے) خیر۔ ان کی بدولت چھو کا بھی نام رہ گیا۔ حق پوچھو تو جس طرح ہر جان دار کی عمر ہے اسی طرح کتاب کی بھی عمر ہے۔ مثلاً شاہنامہ کو ۹ سو برس ہوئے۔ سکندر نامہ کو ۷ سو برس سمجھو۔ گلستاں بوستاں کو ۶ سو برس کہو۔ زلیخا کی عمر تقریباً ۳ سو کے ہوئی۔ مگر اب تک سب جوان ہیں اردو میں باغ و بہار بدر منیز وغیرہ جوان ہیں۔ فسانہ عجائب جاں بلب ہو گیا۔ بہت کتابیں اول شہرت پاتی ہیں پھر گم نام ہو جاتی ہیں۔ یہ گویا بچے ہی تھے کہ مر گئے بہتیری تصنیف ہوتی ہیں اور چھپتی ہیں۔ مگر کوئی نہیں پوچھتا۔ یہ بچے مرے ہوئے پیدا ہوئے ہیں۔۔۔۔ بعض کتابوں کی عمریں میعاد معلوم پر ٹھہری ہوئی ہیں۔ وہ مدارس سرکاری کی تصنیفیں ہیں۔ کیوں کہ جب تک تعلیم میں داخل ہیں تب تک چھپتی ہیں۔ اور خواہ مخواہ بکتی ہیں۔ لوگ پڑھتے

ہیں۔ جب تعلیم سے خارج ہو گئیں۔ مر گئیں۔ کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ قبول خاطر و لطف سخن خداداد است۔ خدا یہ نعمت نصیب کرے۔"

امیر خسرو ایک بڑا شاعر تھا۔ وہ بالعموم دھتکارے ہوئے لوگوں کے بارے میں تو نہیں لکھا کرتا تھا لیکن جب چھوّ ساقن نے اس سے درخواست کی کہ وہ اسے ابدی بنا دے تو امیر خسرو نے انکار نہ کیا۔ اور یہ نہ سوچا کہ چھو کے ذکر سے اس کا اپنا ادب گندا ہو جائے گا۔ اس وقت اس نے تو صرف وہی سوچا جو چھو نے سوچا تھا کہ ادب پارے میں ذکر اسے ایک ایسی پاکیزگی بخشے گا جو اس زندگی میں اسے نہ مل سکی۔ اس زندگی میں وہ بیہودہ لوگوں کے درمیان تھی۔ وہ بیہودہ لوگ کون تھے؟ ان کے درمیان سے گزرتا ہوا ایک شخص امیر خسرو بھی تھا۔ امیر خسرو چھو کو ابدیت اور بدنامی کے دوراہے پر ملا۔ چھو نے امیر خسرو کے اندر ایک بلند ادیب دیکھا اور اس نے استدعا کی کہ وہ اسے ابدیت بخشے۔ چھو نے امیر خسرو سے انسانی ہمدردی کی نہیں بلکہ نزاکت احساس کی درخواست کی تھی۔ میرے خیال میں منٹو کے گندے اور بیہودہ کرداروں نے بھی منٹو سے یہی درخواست کی اور اس کے جواب میں منٹو نے انھیں ابدیت بخشی۔ اس لحاظ سے منٹو ایک ایسا مذہبی انسان تھا جس کے ہاں تمام تر انسانی اختلافات ایک کاسناتی حس کی اکائی میں جا ملتے ہیں۔

(۳)

سلیمان کا گیت

کہا جاتا ہے کہ پرانا عہد نامہ ایک مذہبی کتاب ہے۔ کچھ لوگ اسے صرف ادبی پارہ ہی مانتے ہیں مذہبی نہیں مانتے۔ اس سلسلے کی تنقید بھی دو قسم کی ہے۔ ایک مذہبی اور دوسری ادبی۔ پھر یہ مذہبی تنقید بذات خود دو قسم کی ہے۔ تنقید کی ایک قسم اسے وحی مانتی ہے اور دوسری قسم تحریفوں کی ایک اختلاف زدہ داستان، یا دوسرے الفاظ میں بدعات کا ایک مجموعہ۔ پرانے عہد نامے میں "سلیمان کا گیت" جو شعر الاشعار کے نام سے بھی مشہور ہے مختلف لوگوں کے ہاں وحی، تحریف اور خرافات کا مجموعہ سمجھا جاتا ہے۔ اہلِ یہود اس کے جنسیاتی ننگے پن کے باوجود اسے ہر نئی بہار کے آنے پر اپنے ہیکلوں میں گاتے ہیں۔ بقول نصاریٰ یہ ناجائز گانا بجانا ہے۔ کئی عیسائی نقادوں کے مطابق اس کتاب کو عہد عتیق کی کتابوں سے خارج کر دینا چاہیے۔

جب سے نظم شعر الاشعار وجود میں آئی مذہبی نقاد اس کے وجود سے کتراتے رہے ہیں۔ جنسی لذّتیت خود سلیمانی خاکے پر ایک دھبّہ تصور کی جاتی ہے کہ قہر خدا کا باعث۔ اب مظفر علی سید کے منٹو کے بارے میں یہ الفاظ سنیے: "بہت سے تو اب بھی اس کے ذکر سے کتراتے ہیں۔ حالاں کہ اسے مرحوم ہوئے پینتیس (۳۵) ایک برس ہونے کو آئے ہیں اور کسی مرحوم ادیب سے دانستہ تغافل برتنے کا یہی مفہوم ہو سکتا ہے کہ وہ اب بھی ایک خطرے کی طرح ہمارے آس

پاس منڈلا رہا ہے کہ ہم میں اتنا حوصلہ نہ ہو کہ اس کے فن کو اس کے ماحول سے الگ کر کے دیکھ سکیں" اس سلسلے میں محمد حسن عسکری نے کہا تھا" اقبال کی وفات سے لے کر آج تک کسی اردو ادیب کا اس طرح ماتم نہیں ہوا جس طرح منٹو کا۔ آخر کوئی چیز تو تھی جس نے لوگوں کو اتنا سوگ منانے پر مجبور کیا۔" محمد حسن عسکری نے منٹو پر سوگ کے سچ کو اپنے بھرپور انداز میں دکھایا لیکن مظفر علی سید کی یہ سچائی کہ لوگ اب بھی منٹو سے کتراتے ہیں، محمد حسن عسکری کی سچائی سے ذرا آگے کی بات ہے۔" تنقید کا ایک کام یہ بھی ہے کہ پڑھنے والے کو جگائے۔" مظفر علی سید کے الفاظ کے مطابق منٹو کی ایذا دہی میں نہ صرف برطانوی سرکار کے زمانے کے پنجاب کے اخبار بلکہ دہلی اور بمبئی کے اخبارات بھی شامل تھے حتیٰ کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے عہدے داروں نے بھی یہی رویہ اختیار کیا ہوا تھا۔ فیض کے نزدیک منٹو کے انجام میں شاید اس کا اپنا ہی قصور تھا یا سارا قصور معاشرتی حالت کا تھا۔ مظفر علی سید کے اپنے لفظوں میں بات یوں ہے:" دونوں قسم کی توجیہیں سادہ لوحی کی مختلف صورتیں ہیں جب کہ فیض صاحب کے نزدیک فن اور زندگی کے درمیان پیکار کی صورت میں بہترین راستہ یہ ہے کہ دونوں کو یک جا کر کے جد و جہد کا مضمون پیدا کیا جائے جو صرف عظیم فن کاروں کا حصہ ہے۔ ان کی رائے میں منٹو عظیم نہیں تھا لیکن بہت دیانت دار، بہت ہنرمند اور راست گو ضرور تھا۔ ظاہر ہے کہ فیض صاحب بھی منٹو کی جد و جہد سے کماحقہ واقف نہیں تھے۔" خود ایک مرتبہ منٹو نے کہا تھا کہ اس کا اشتراکیوں سے" کوئی تعلق نہیں اگر ہے تو ناجائز۔" ظاہر ہے فیض صاحب منٹو کی جد و جہد سے کیوں کر واقف ہو سکتے تھے؟ اگر لفظ ناجائز کو پیش نظر رکھا جائے تو اگلا سوال یہ اٹھتا ہے کہ پھر خود منٹو کے ہاں" اخلاق" کا تصور کیا ہے۔ اگر منٹو اشتراکی نہیں تھا ترقی پسند نہیں تھا، مبلغ نہیں تھا تو اس کے ہاں اخلاقی کشمکش کے کیا معنی ہیں۔ منٹو کی ہاں نیکی اس کے انتخاب میں چھپی ہوئی ہے۔ اس کا اخلاق ادبی اخلاق ہے۔

" سلیمان کا گیت" کا خالق ایک بہت بڑا شاعر تھا یا محض ایک لغو گو؟ کیا شعر الاشعار اخلاق کا مرقع ہے یا فضولیات کا مردود چیتھڑا؟ اس کا فیصلہ تو خود مذہبی نقاد ہی کرنے پر مصر ہیں۔ لیکن ان مذہبی نقادوں کے لیے یہ بڑی مصیبت ہے کہ انھوں نے اس نظم کو وحی کی کتابوں میں مشمول پایا اور وہاں سے اس کا نکالنا مشکل ہے۔ وہ سوچتے ہیں کہ مذہبی تنقید کو اس کا کچھ کرنا ہی ہوگا۔ لیکن بات یوں ہے کہ دھتکار یا پھٹکار جو بھی ہم کریں یا نہ کریں یہ نظم ہمارے سامنے موجود رہے گی۔ شاید اس نظم کا اخلاق اس بات میں ہے کہ انسانی تاریخ میں یہ باغ عدن کی یاد دہانی کراتی ہے۔ انسانی تاریخ نے یقیناً ہم سے کوئی اہم چیز چھین لی ہے اور یہ اس کی یاد تاریخ میں دلاتی رہے گی۔ اسی خاطر یہ نظم ہمیشہ زندہ رہے گی۔ اس نظم کی سطح میں الھڑ ہیں اس لیے کہ انسانی تاریخ میں الھڑ ہیں۔ اور پھر باغ عدن کی یاد داشت میں بھی تو الھڑ ہیں۔ اسی لیے ہر چیز کے منظر پر ایک ہلکی سی کہر کی نشست ہے۔ اس میں یاد کا ذکر ہے لیکن یہ یاد بھی پگھلی ہوئی ہے۔ اس نظم

کے وسط میں ایک امید اور ایک نوحہ بستا ہے اور یہی اس کی تعلیم ہے۔ یہی اس کا اخلاق ہے۔ اخلاق یاد کا پگھلنا ہے۔ یہی بہار ہے۔ شعرالاشعار اور "دھواں" میں ایک ایسے نظریہ اخلاق کی مطابقت ہے جو ساری انسانیت کے بارے میں ہے۔ منٹو اسی معنی میں مذہبی ہے۔ اس کا اخلاق بہت گہرا ہے اور اس میں انسان کے دکھ کا ذکر ہے۔ یہ ذکر ترقی پسندوں کی طرز کا نہیں بلکہ کسی اور ہی طرز کا ہے۔ "دھواں" میں ایک ترقی یافتہ عورت کا ذکر نہیں بلکہ ایک بنیادی عورت کا ہے جس کی چوڑی چکلی کمر ہے اور جو کانگڑی لیے درباری کی سرگم یاد کر رہی ہے اور ایک اور عورت کا جو کہانی کے آخر میں آتی ہے۔ یہاں مرکزی کردار ایک لڑکے کا ہے جو جوانی کی اولین منازل میں داخل ہو رہا ہے اور پہلی عورت کا بھائی ہے۔

یہاں قارئین کی اطلاع کے لیے میں کچھ اشارے سلیمان کے گیت کے بارے میں مہیا کرنا چاہتا ہوں۔ شعرالاشعار میں عورتوں کے کئی کردار ہیں لیکن ان میں دو کردار زیادہ طور پر واضح ہیں۔ پہلی عورت کا کردار ایک مرکزی عورت کا ہے جس کی چھاتیاں مناروں کی طرح بلند اور مضبوط ہیں، لیکن دوسرا کردار ایک ایسی عورت کا ہے جو ابھی عمر میں چھوٹی ہے اور اس کی چھاتیاں بھی چھوٹی ہیں ان دو کرداروں کے بارے میں شعرالاشعار سے چند شعری سطور نقل کرتا ہوں:

(ا) پہلی عورت جو بہن اور پتنی ہے اور جو مرکزی عورت ہے

"تو نے میرا دل لوٹ لیا میری بہن میری پتنی۔ تو نے ایک ہی نظر سے میرا دل لوٹ لیا۔ گلے کی ایک ہی زنجیر سے۔

تیرا پریم کتنا خوب صورت ہے، میری بہن میری پتنی۔ شراب سے کہیں زیادہ نشہ انگیز ہے اور تیرے بدن کا روغن ان سب خوش بودار مسالوں سے کہیں بڑھیا ہے۔

تیرے ہونٹ، آہ میری پتنی! جیسے سہال۔ تیری زبان تلے شہد اور دودھ ہیں۔ تیرے لباس کی خوش بو لبنان کی خوش بو ہے۔

میری بہن کھنچی ہوئی دیواروں کے بیچ ایک باغ ہے۔ میری پتنی ایک چشمہ جو بند کر دیا گیا، ایک چشمہ جو مقفل کر دیا گیا۔

میں آگیا، باغ میں آگیا۔ میری بہن میری پتنی۔"

(ب) "دوسری عورت جس کی چھاتیاں ابھی چھوٹی ہیں اور جو دیر سے یا بعد میں آنے والی عورت ہے۔"

اور ہماری ایک چھوٹی بہن ہے۔ وہ ابھی بغیر چھاتیوں کے ہے۔ ہم اپنی بہن کے لیے کیا کریں۔ اس دن کے انتظار میں جب کوئی اس کا ذکر کرے گا۔

اگر وہ دیوار ہے تو ہم اس دیوار پر ایک چاندی کا محل کھڑا کریں گے۔ اگر وہ دروازہ ہے تو ہم اسے صنوبر کے تختوں سے مرصع کریں گے۔

میں دیوار ہوں اور میری چھاتیاں مناروں کی طرح ہیں۔ تو پھر وہ میں ہی تھی جس نے اس کی آنکھوں کی مہربانی میں جگہ پائی۔

"شعر الاشعار"، اور "دھواں" میں کئی جگہ مطابقت نظر آتی ہے جس میں اولین جگہ بہن کے ذکر کو دی جا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ دونوں کے مناظر میں کافی چیزیں ایک سی پائی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر کہانی "دھواں" میں موسم سردی کا ہے لیکن سردی میں شدت نہیں۔ فضا دھندلی ہے چوں کہ کہر کی ایک پتلی سی تہہ ہر شے پر چڑھی ہوئی ہے۔ اس سے نظر آنے والی چیزوں کی نوک پلک کچھ مدھم پڑ گئی ہے۔ یہی صورت حال "سلیمان کا گیت" میں ہے "دیکھو تو سردی گزر گئی اور بارش برس کر چلی گئی" اور "یہ کون ہے جو جنگل سے دھویں کے ستونوں کی طرح آرہا ہے، خوشبوؤں سے لدا ہوا۔"

"مجھے اپنے دل پر مہر کی طرح بٹھالو اور اپنے بازو پر۔ اس لیے کہ محبت موت کی طرح طاقت ور ہے۔ اور رشک قبر کی طرح ظالم ہے۔ اس کے کوئلے آگ کے دھکتے ہوئے کوئلے ہیں، وہ آگ جو بڑے زور سے بھڑک رہی ہو۔" "سلیمان کا گیت" کے ان الفاظ کے بعد "دھواں" کے یہ الفاظ سنتے جلئیے۔ "دھواں اٹھتا دیکھا تو اسے راحت محسوس ہوئی۔ اس دھویں نے اس کے ٹھنڈے گالوں پر گرم گرم لکیروں کا ایک جال سا بن دیا۔ اس گرمی نے اسے راحت پہنچائی اور وہ سوچنے لگا کہ سردیوں میں ٹھنڈے یخ ہاتھوں پر بید کھانے کے بعد اگر یہ دھواں مل جایا کرے تو کتنا اچھا ہو۔"

"سلیمان کا گیت" میں کئی لفظ اور ان کے خیالات بار بار دہرائے گئے ہیں۔ چیزیں یوں بار بار واپس آتی ہیں کہ واپسی سے نظم کا مافی الضمیر آگے بڑھتا نظر آتا ہے۔ "دھواں" میں مسعود کی بہن کلثوم ایک کانگڑی لیے درباری کی سرگم یاد کر رہی ہے جس میں منٹو کے مطابق سارے گاما کئی دفعہ آتا ہے" اور وہ اپنے بھائی کو کہتی ہے "ادھر میرے پلنگ پر آکر جلدی کمر دباؤ ورنہ یاد رکھو بڑے زور سے کان اینٹھوں گی" اور پھر، "جب اس نے پیروں سے دبانا شروع کیا، ٹھیک اسی طرح جس طرح مزدور مٹی گوندھتے ہیں تو کلثوم نے مزا لینے کی خاطر ہولے ہولے ہائے کرنا شروع کیا"

(۴)

تکنیک یا ادبی تنظیم اور اخلاق

منٹو کو اپنے افسانے کی تکنیک پر ناز تھا اور اس تکنیک میں اس کی نیکی اور اخلاق پوشیدہ تھے۔ یہیں ان کی دریافت بھی ہے۔ منٹو کی افسانہ سازی یا تکنیک پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ مثلاً کرشن چندر نے کہا ہے "منٹو اپنے افسانوں کا لباس نفاست سے تیار کرتا ہے۔ ان میں کہیں جھول

نہیں آتا۔ کہیں کچے مانکے نہیں ہوتے۔ استری شدہ صاف ستھرے افسانے، زبان منجھی ہوئی، سلیس اور سادہ.... " پھر اس کے ساتھ ہی کرشن چندر منھ بناکر اعتراض کرتا ہے " لیکن مجھے منٹو کے افسانے تکنیک کے اس کمال کی وجہ سے اچھے نہ لگتے تھے۔ تکنیک کے کمال میں بناوٹ مضمر ہو سکتی ہے۔ اور آہستہ آہستہ یہ بناوٹ جو افسانے میں نہاں ہوتی ہے گراں گزرنے لگتی ہے۔ " یہی لوگ یہ بھی کہتے تھے کہ اگر منٹو زندہ ہے تو تکنیک کے کمال کی وجہ سے نہیں بلکہ انسان دوستی کی وجہ سے، اور یہ کہ منٹو کے کئی افسانوں کی کئی آخری سطور کاٹی جا سکتی ہیں اور افسانہ کہیں بھی ختم ہو سکتا ہے منٹو کو ڈرامائی انجام زیادہ پسند ہیں حالاں کہ حقیقی زندگی میں ایسی تنظیم کم ملتی ہے۔ لیکن منٹو دراصل افسانوں میں مواد کی عظمت ہی کی بنا پر عظیم نہیں اور تکنیک اس کی ایک ضروری شکل ہے۔ " دھواں " ایک ایسا افسانہ ہے جہاں تکنیک ہی فیصلہ کرتی ہے کہ مواد کہاں اور کس طرح رکھا جائے گا۔ یہاں مواد اور تکنیک یوں گھل مل گئے ہیں (بذریعہ تکنیک) کہ منٹو اس پر جتنا بھی فخر کرے کم ہے

" دھواں " میں کہانی اس دن شروع ہوتی ہے جس دن اس دنیا میں تہذیب طفلاں کا دروازہ یعنی اسکول بند تھا کیوں کہ اس کا سکتر مر گیا تھا۔ اس کے بعد کے چند گھنٹوں کی واردات اس کہانی کو ان چوٹیوں پر لے جاتی ہیں جہاں سے دھندلکوں میں لپٹی ہوئی باغ عدن کی سرزمین صاف نظر آتی ہے۔ لیکن اس میں داد دینے کی بات یہ ہے کہ کہانی میں انسانی تہذیب اور عدن کا فاصلہ بھی قائم رہتا ہے۔ یہاں منٹو اپنی ہی واحد طرز کا حقیقت جو نظر آتا ہے نہ وہ انسان پرست ہے اور نہ ترقی پسند۔ وہ جدید زمانے میں ایک بہت پرانی کہانی کا لکھاری ہے۔ اس کی کہانیوں میں اس ایک پرانی کہانی کی طرف اشارے ملتے ہیں۔ ہر قسم کے اشارے۔

منٹو کے ہاں کرداروں کے نام عموماً کہانی کے مطابق ہوتے ہیں یعنی اس کے کسی نہ کسی پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ کہانیوں " دھواں " اور " موذیل " میں خاص طور پر اگر قارئین غور کریں تو یہ پہلو بالکل سامنے نظر آتا ہے۔ موذیل کا تجزیہ اس سلسلے میں بعد کو ہوگا یہاں آپ کچھ " دھواں " کے کرداروں کے بارے میں دیکھ ڈالیے۔

" دھواں " چوں کہ ایک لحاظ سے سردی سے موسم بہار کے آنے کے بارے میں ہے اور جوانی کی پہلی پہلی لہر اس کا موضوع ہے اور باغ عدن سے دوری اس کا چھپا ہوا اشارہ ہے۔ کہانی کے کرداروں کے نام اسی حقیقت کو اجاگر کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ لڑکا جو جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ رہا ہے اس کا نام مسعود ہے جس کا مطلب ہے مبارک یعنی کلیان میہ خوشی اور قسمت والا جو پھلے پھولے گا۔ اس لحاظ سے مسعود کی بہن کلثوم کا نام دیکھ لیجیے جس کا ایک مطلب ہے جھنڈے کے سرے کا ریشم۔ حریر علی راس العلم۔ کہانی کے آخر میں کلثوم جس لڑکی کی چھاتیوں کی طرف دیکھ رہی ہے اس کا نام نرملا ہے جس کا مطلب ہے صاف اور پاکیزہ جسے ابھی کسی نے نہ میلا کیا ہو یعنی نہ

چھوا ہو۔ میل اور گرد سے پاک، بے داغ۔ کلثوم کا مطلب علم کے ریشم کے علاوہ ایک اور بھی ہے یعنی چہرے اور گالوں کا گوشت۔ یہ ایک گوشت بھرا چہرہ ہی تو تھا جو نرملا کی چھاتیوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اور یہ چہرہ حریر علیٰ راس العلم بھی تھا۔ منٹو کہتا ہے کہ "دھواں" کے پیچھے ایک صدمہ ہے جسے وہ بھول چکا ہے۔

افسانہ نگار اس وقت اپنا قلم اٹھاتا ہے۔ جب اس کے جذبات کو صدمہ پہنچتا ہے۔ مجھے یاد نہیں کیوں کہ بہت عرصہ گزر چکا ہے۔ لیکن "دھواں" لکھنے سے پہلے مجھے کوئی منظر کوئی اشارہ یا کوئی واقعہ دیکھ کر ضرور ایسا صدمہ پہنچا ہو گا جو افسانہ نگار کے قلم کو حرکت بخشتا ہے۔

"دھواں" پر چوں کہ مقدمہ چلا منٹو نے کہانی کی حمایت میں کچھ تعارفی الفاظ لکھے ہیں جو شاید سرکاری اہل کاروں کے لیے ہی ہوں لیکن وہاں اس افسانے پر تنقید کے بارے میں کچھ اشارے بھی ملتے ہیں۔ وہ کہتا ہے:

میں نے اس کہانی میں کوئی سبق نہیں دیا۔ اخلاقیات پر یہ کوئی لکچر بھی نہیں کیوں کہ میں خود کو نام نہاد ناصح یا معلم اخلاق نہیں سمجھتا۔ البتہ اتنا ضرور سمجھتا ہوں کہ اس لڑکے کو مضطرب کرنے والی چیزیں خارجی تھیں۔ انسان اپنے اندر کوئی برائی لے کر پیدا نہیں ہوتا۔ خوبیاں اور برائیاں اس کے دل و دماغ میں باہر سے داخل ہوتی ہیں۔ بعض ان کی پرورش کرتے ہیں۔ بعض نہیں کرتے۔ میرے نزدیک قصائیوں کی دکانیں فحش ہیں۔ کیوں کہ ان میں ننگے گوشت کی بہت بد نما اور کھلے طور پر نمائش کی جاتی ہے۔ میرے نزدیک وہ ماں باپ اپنی اولاد کو جنسی بیداری کا موقع دیتے ہیں جو دن کو بند کروں میں کئی کئی گھنٹے اپنی بیوی سے سر دبوانے کا بہانہ لگا کر اس سے ہم بستری کرتے ہیں۔

کلثوم کے چہرے کا گوشت۔ قصائیوں کی دکانوں پر ننگے گوشت کی نمائش اور مسعود کا یہ خیال کہ اگر کلثوم کو ذبح کیا جائے تو کھال اترنے پر کیا اس کے گوشت سے دھواں نکلے گا؟ کلثوم کو ذبح کرنے کا خیال مسعود کے ذہن میں کہاں سے آیا؟ کیا ہم اس حقیقت سے انکار کر سکتے ہیں کہ کتنی ہی کروڑوں کلثومیں ہماری انسانی تاریخ آج تک ذبح کر چکی ہے۔ اور خود مسعود جو اپنی بہن کی کمر اور رانیں دبا رہا ہے شہوت سے بالکل ملوث نہیں بلکہ وہ ایک مزدور کی طرح ہے جو مٹی گوندھ رہا ہے ایک بازی گر کی طرح جو ایک کھنچے ہوئے رسّے پر چلنے کا منظر پیش کر رہا ہے۔ مزدوری اور بازی گری بھی تاریخ ہی کی طرف اشارے ہیں۔ انسانی تاریخ منٹو کے نزدیک غیر مہذب ہے۔ یعنی محض مزدوری اور بازی گری کی ایک شکل۔ مسعود کو اس میں سے بہر حال گزرنا ہی پڑے گا۔

منٹو کے ہاں صحیح تہذیب ادبی تہذیب سے معیار پاتی ہے۔ تکنیک اس کا قرینہ ہے جس کی آخری حدیں ادبی تہذیب سے ملتی ہیں۔ منٹو نے اپنی تحریروں میں کئی بار کہا ہے کہ اسے غیر مہذب چیزیں پسند نہیں۔ جو بھی کیا جائے یا کہا جائے سلیقے اور قرینے اور تہذیب سے کیا جائے تو اسے کسی سے جھگڑا نہیں۔ منٹو نے ہمیشہ ایک ایسے قرینے یا ادبی تہذیب کی طرف اشارہ کیا جس میں ہر چیز ایک توازن پاتی ہے اور ایک ابدیت کے رنگ سے آشنا ہوتی ہے۔ "گنجے فرشتے" اس قسم کے اشاروں سے بھری پڑی ہے۔ "لذت سنگ" میں لکھتے ہوئے وہ کہتا ہے "میں سلیقے کا بہت قائل ہوں۔ ناگوار سے ناگوار چیز بھی اگر سلیقے سے کی جائے تو مجھے ناگوار معلوم نہیں ہوتی" اس کا سرکاری مقدموں کے بارے میں بھی یہی خیال تھا کہ محتسبوں کا رویہ ادبی تہذیب سے ناآشنا تھا۔ قانونی اہل کار اور محتسب جو اس کے سر پر سوار تھے انھیں ادب کا کوئی پتہ نہیں تھا۔ منٹو کے ہاں کسی عمل یا فن پارے کی ترغیب میں ایسی نیت کا ہونا از حد ضروری تھا۔ اور یہ بھی کہ وہ نیت ادبی تہذیب سے نکلتی ہو اور اس کا انتخاب ادبی ہو۔ بڑی بات یہ ہے کہ "دھواں" میں ادبی تہذیب کے ساتھ ساتھ عدلی اشارہ بھی شامل ہے۔ جب بھی کوئی ادیب ایسا بڑا ادبی انتخاب کرتا ہے تو انسان کو اس انتخاب کے ذریعے تاریخ کی غلامی سے نجات ملتی ہے۔ نئے قانون کے "نفاذ" یا "نہیں" کا نعرہ سے یا محض مسلح بغاوت کے ذریعے انسان کو تاریخی غلامی سے نجات نہیں مل سکتی۔ اس سلسلے میں اپنی آل انڈیا ریڈیو سے نشر کی ہوئی تقریر کے بارے میں منٹو کہتا ہے:

پچھلے دنوں میں نے آل انڈیا ریڈیو بمبئی سے ایک تقریر نشر کی تھی۔
اس میں میں نے کہا تھا:

"ادب ایک فرد کی اپنی زندگی کی تصویر نہیں۔ جب کوئی ادیب قلم اٹھاتا ہے تو وہ اپنے گھریلو معاملات کا روزنامچہ پیش نہیں کرتا۔ اپنی ذاتی خواہشوں۔ خوشیوں۔ رنجشوں۔ بیماریوں اور تندرستیوں کا ذکر نہیں کرتا۔ اس کی قلمی تصویروں میں بہت ممکن ہے۔ آنسو اس کی دکھی بہن کے ہوں۔ مسکراہٹیں آپ کی ہوں اور قہقہے ایک خستہ حال مزدور کے۔۔۔۔ اس لیے اپنی مسکراہٹوں اپنے آنسوؤں اور اپنے قہقہوں کی ترازو میں ان تصویروں کو تولنا بہت بڑی غلطی ہے۔ ہر ادب پارہ ایک خاص فضا۔ ایک خاص اثر۔ ایک خاص مقصد کے لیے پیدا ہوتا ہے۔ اگر اس میں یہ خاص فضا یہ خاص اثر اور یہ خاص مقصد محسوس نہ کیا جائے تو یہ ایک بے جان لاش رہ جائے گی۔"

• اگر ہر ادب پارے میں ایک خاص فضا ایک خاص اثر اور ایک مقصد ہوتا ہے تو "دھواں" میں کون سی ترغیب موجود ہے؟ اس کے بارے میں منٹو اس افسانے کا تجزیہ خود ہی پیش کرتا ہے۔ اس کے اپنے الفاظ میں یہ ادبی ترغیب کچھ یوں ہے:

" دھواں " میں شروع سے لے کر آخر تک ایک کیفیت، ایک جذبے ایک تحریک کا نہایت ہی ہموار نفسیاتی بیان ہے۔ اصل موضوع سے ہٹ کر اس میں دور از کی باتیں نہیں کی گئیں، اس میں ہمیں کہیں بھی ایسی ترغیب نظر نہیں آتی جو قارئین کو شہوانی لذتوں کے دائرے میں لے جائے۔ اس لیے کہ افسانے کا موضوع " شہوت " نہیں ہے۔ استغاثہ اگر ایسا سمجھتا ہے تو یہ اس کی کم نظری ہے۔ خشخاش کے دانے افیم کی گولی بننے تک کافی مرحلے طے کرتے ہیں۔

خدا جانے استغاثہ اس افسانے کو فحش کیوں کہتا ہے کہ جس میں فحاشی کا شائبہ تک موجود نہیں۔ اگر میں کسی عورت کے سینے کا ذکر کرنا چاہوں گا تو اسے عورت کا سینہ ہی کہوں گا۔ عورت کی چھاتیوں کو آپ مونگ پھلی میز یا استرہ نہیں کہہ سکتے۔ یوں تو بعض حضرات کے نزدیک عورت کا وجود ہی فحش ہے مگر اس کا کیا علاج ہو سکتا ہے۔ "

اور مسعود میں جنسی بیداری کے بارے میں منٹو کہتا ہے:

مسعود ایک کم سن لڑکا ہے غالباً دس بارہ برس کا۔ اس کے جسم میں جنسی بیداری کی پہلی لہر کس طرح پیدا ہوتی ہے۔ یہ افسانے کا موضوع ہے۔ ایک خاص فضا اور چند خاص چیزوں کا اثر بیان کیا گیا ہے جو مسعود کے جسم میں دھندلے دھندلے خیالات پیدا کرتا ہے۔ ایسے خیالات جن کا رجحان جنسی بیداری کی طرف ہے۔ یہ بیداری وہ سمجھ نہیں سکتا۔ لیکن نیم شعوری طور پر محسوس ضرور کرتا ہے۔

بے کھال کا بکرا جس میں سے دھواں اٹھتا ہے۔ سردیوں کا ایک دن جب کہ بادل گھرے ہوتے ہیں اور آدمی سردی کے باوجود ایک میٹھی میٹھی حرارت محسوس کرتا ہے۔ ہانڈی جس میں سے بھاپ اٹھ رہی ہے۔ بہن جس کی ٹانگیں وہ دباتا ہے---- یہ سب عناصر مل کر مسعود کے بدن میں جنسی بیداری پیدا کرتے ہیں۔ جوانی کی اس پہلی انگڑائی کو وہ غریب سمجھ نہیں سکتا اور انجام کار اپنی ہاکی اسٹک توڑنے کی ناکام سعی کرتا کرتا تھک جاتا ہے---- یہ تھکاوٹ اس بے نام سی چنگاری کو، اس " کچھ کرنے " کی تحریک کو دبا دیتی ہے۔ "

منٹو کے ہاں جنس کی بیداری نفس پرستی نہیں اور نہ ہی یہ بہیمیت یا حیوانیت کی نشانی ہے۔ لیکن انسان کے بارے میں ترقی پسندوں کی ایک رائے یہ بھی ہے کہ انسان بنیادی طور پر

خود غرض، خود پرست، کمینہ، لالچی اور غصہ ور حیوان ہے۔ ایسے ہی بنیادی جذبوں کو دبا کر یا سدھار کر وہ انسان بنتا ہے۔ اس نقطہ نظر کے مطابق انسان صدیوں کی محنت کا حاصل ہے۔ ترقی پسندوں کے نزدیک منٹو انسان پرست اس لیے ہے کہ جب وہ "انسانوں" کو "حیوانوں" جیسے فعل کرتے دیکھتا ہے تو تلملا اٹھتا ہے۔ "دھواں" کا تجزیہ کرتے ہوئے منٹو ان سب خیالات کی تردید کرتا ہے۔ وہ بہیمانہ یا شہوانی خیالات کے خلاف جنگ آزما نہیں بلکہ خود تاریخ کے خلاف لڑ رہا ہے۔ "دھواں" میں انسان ایک دوسرے علاحدہ زاویے سے پیش کیا گیا ہے۔ یہی منٹو کا اصل انسان ہے۔ اس میں تاریخ کی لغزشوں کا ذکر ہے۔ منٹو خود کہتا ہے:

افسانے کا مطالعہ کرنے سے یہ امر اچھی طرح واضح ہو سکتا ہے کہ میں نے اس بے نام سی لذت میں جو مسعود کو محسوس ہو رہی تھی خود کو یا قارئین کو کہیں شریک نہیں کیا۔ یہ ایک اچھے فن کار کے قلم کی خوبی ہے۔

اس افسانے میں سے چند سطور پیش کرتا ہوں۔ جن سے افسانہ نگار کے غائت درجہ محتاط ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ اس نے کہیں بھی مسعود کے دماغ میں شہوانی خیالات کی موجودگی کا ذکر نہیں کیا۔ ایسی لغزش افسانے کا ستیاناس کر دیتی۔

۱۔ مسعود کے وزن کے نیچے کلثوم کی چوڑی چکلی کمر میں خفیف سا جھکاؤ پیدا ہوا۔ جب اس نے پیروں سے دبانا شروع کیا۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح مزدور مٹی گوندھتے ہیں تو کلثوم نے مزا لینے کی خاطر ہولے ہولے ہائے ہائے کرنا شروع کیا۔

۲۔ کلثوم کی رانوں میں اکڑی ہوئی مچھلیاں اس کے پیروں کے نیچے دب دب کر ادھر ادھر پھسلنے لگیں۔ مسعود نے ایک بار اسکول میں تنے ہوئے رسے پر ایک بازی گر کو چلتے دیکھا تھا۔ اس نے سوچا کہ بازی گر کے پیروں کے نیچے تنا ہوا رسا بھی اسی طرح پھسلتا ہو گا۔

۳۔ بکرے کے گرم گرم گوشت کا اسے بار بار خیال آتا تھا۔ ایک دو مرتبہ اس نے سوچا۔ "کلثوم کو اگر ذبح کیا جائے تو کھال اترنے پر کیا اس کے گوشت میں سے دھواں نکلے گا۔" لیکن ایسی بیہودہ باتیں سوچنے پر اس نے اپنے آپ کو مجرم محسوس کیا اور دماغ کو اسی طرح صاف کر دیا۔ جس طرح وہ سلیٹ کو اسفنج سے صاف کیا کرتا تھا۔

خط کشیدہ الفاظ اس بات کے ضامن ہیں کہ مسعود کا ذہن کہیں بھی شہوت سے ملوث نہیں ہوا۔ وہ اپنی بہن کی کمر دباتا ہے۔ جس طرح مزدور مٹی

گوندھتے ہیں۔ ٹانگیں دباتا ہے تو اس کا خیال بازی گر کی طرف چلا جاتا ہے ۔
جس کا تماشا اس نے ایک بار اپنے اسکول میں دیکھا تھا اور جب یہ سوچتا ہے کہ
اس کی بہن ذبح کر دی جائے تو کیا اس کے گوشت میں سے دھواں نکلے گا تو فوراً
اسے بری بات سمجھ کر اپنے دماغ سے نکال دیتا ہے اور خود کو مجرم سمجھتا ہے۔

منٹو ترقی پسند اس لیے نہیں تھا کہ اس کے ہاں وقت کا تصور مختلف ہے اور ترقی پسندوں سے بالکل نہیں ملتا۔ ترقی پسند ایک لحاظ سے تاریخ پرست ہیں یعنی ان کے مطابق تاریخ کی ابتدا میں اندھیرے اور بہیمانہ اذیت کا دور دورہ تھا اور تاریخ انسان کے ارتقا کی نشانی ہے۔ اس تاریخ کا وقت ایک عامیانہ گھڑی کی طرح ہے جس میں جب صدیاں گزرتی جاتی ہیں تو انسان نتیجتاً بہتر سے بہتر ہوتا چلا جاتا ہے۔ ہر صدی انسان کی کوششوں کا پھل ہے۔ ترقی پسندوں کے نزدیک تاریخ ہی کے ذریعے انسان اپنے دکھوں کا علاج پائے گا۔ تاریخ ہی اس کا ملجا و ماوا اور خدا ہے یعنی مالک اور نجات دہندہ ۔ اگر تاریخ میں ارتقا انسانی کوششوں کا پھل ہے تو تاریخ میں مجرم کون ہے۔ بیہودہ لوگوں کی بیہودہ باتیں ہی جرم ہیں۔ لیکن بیہودہ لوگ کہاں سے آئے ؟ یہ وہی لوگ ہیں جنھوں نے ترقی میں حصہ نہ لیا۔ منٹو کے ہاں جرم کی جڑیں کسی اور جگہ ہیں یعنی ترقی کے جھوٹ میں۔ اس کے ہاں صحیح وقت ادبی تہذیب ہی میں پایا جاتا ہے باقی سب کچھ جھوٹ اور بہتان ہے۔ "دھواں" میں بادل گدلے ہیں اور کہرا مٹیالا ہے اور جب پچھلے سال مسعود کے دادا جان کی وفات ہوئی تو وہ قبرستان کے کیچڑ میں ایسا پھسلا کہ دادا جان کی قبر میں گرتے گرتے بچا۔ "دھواں" کی تکنیک میں پرانے وقت کی اساطیر ہیں۔ اب مسعود جو جوانی میں داخل ہو رہا ہے اسے صرف موت، مزدوری یا بازی گری ہی سامنے نظر آتے ہیں۔ شاید خواہش محض بہتان ہے اور موت اس کا حل! لیکن اس کے باوجود وہ زندہ رہنا چاہتا ہے اگرچہ اس زندگی میں اسے کتنی ہی سزا ملے۔ "دھواں" کیا ہے ؟ کہانی میں چھپا ہوا ایک گیت ہے اور اس گیت کی طاقت اس کے بیانیہ کی تکنیک میں چھپی ہے۔

عدن کے بعد دو ہی بڑے پڑاؤ ہیں۔۔۔۔ قبرستان اور ادب ۔ ادب تکنیک کے ذریعے وقت کا ایک علاحدہ تصور پیدا کرتا ہے جو ایک بیانیہ یا کہانی کا نام پاتا ہے۔ سب سے پہلے پرانے دیوتاؤں کا طعام انسانوں نے بند کر دیا۔ اس کے بعد جب مندروں سے سب دیوتا چلے گئے تو دنیا بے ادب ہو گئی۔ یعنی دیومالائی اعتبار سے یہ دنیا سچائی سے خالی ہو گئی۔ سلیمان کا گیت دیوتاؤں کے بن باس کے بارے میں نہیں بلکہ انسانی تاریخ میں باغ عدن کی ایک سریلی یاد دہانی ہے۔ اس کی کہانی انسان کے باغ عدن سے نکاس کی کہانی کی یادگار ہے۔ اسی طرح منٹو کی کہانی "دھواں" بھی چوں کہ ساری کی ساری انسان کے نکاس کے بارے میں ہے اس لیے یہ کہانی نہ صرف سلیمان کا گیت کے زیادہ قریب ہے بلکہ خود انسانی تاریخ میں لپٹی ہوئی نظر آتی ہے۔ دیومالا پر مبنی جدید زمانے کی کہانیوں (مثلاً فاؤسٹ) میں وقت اور بیانیہ کا تعلق ویسا نہیں پایا جاتا جیسا کہ حقیقی

(بقیہ صفحہ ۹۵ پر)

ڈاکٹر آفتاب احمد

مشتاق احمد یوسفی۔۔۔"آبِ گم" کے آئینے میں

واقعہ تو یہ آج سے چودہ برس پہلے کا ہے مگر میرے گھر کے نشست کے کمرے میں ایک گروپ فوٹو رکھی ہے جو مجھے یوسفی صاحب سے اپنی پہلی ملاقات کی یاد دلاتی رہتی ہے۔ یہ تصویر ایک ایسی محفل کی یادگار ہے جو لندن میں الطاف گوہر کے مکان پر جب کہ وہ خود انگلستان سے باہر تھے ان کے بیٹے ہمایوں گوہر نے فروری ۱۹۸۱ء میں فیض احمد فیض کی سترویں سالگرہ کے موقع پر ترتیب دی تھی۔ میں بھی اتفاق سے ان دنوں مختصر دورے پر لندن میں موجود تھا۔ اس ملاقات کے بعد اکتوبر ۱۹۸۹ء میں لندن ہی میں یوسفی صاحب سے دوسری ملاقات ہوئی جس میں ہم ایک دوسرے کے زیادہ قریب آگئے۔ چند مہینوں کے بعد یعنی ۱۹۹۰ء کے اوائل میں وہ لندن سے کراچی واپس آگئے۔ پھر ان کی کتاب "آب گم" شائع ہوئی جو انھوں نے مجھے بطورِ خاص مرحمت فرمائی۔ اس وقت سے اب تک کے دوران یوسفی صاحب سے میرا وہ تعلق خاطر استوار ہوا جس کی بنا پر میں نے انھیں اپنا ایک محترم یار عزیز قرار دیا ہے۔

خواتین و حضرات!

اردو کے طنز و مزاح کے ادب میں یوسفی اپنی تصنیفات "چراغ تلے" "خاکم بہ دہن" اور "زرگزشت" کے ذریعے جو مقام و مرتبہ حاصل کر چکے تھے "آب گم" نے انھیں اس سے کہیں بلند تر مقام و مرتبے تک پہنچا دیا ہے۔ ان کی تحریروں میں لحظہ بہ لحظہ زبان و بیان کے جو شگوفے پھوٹتے ہیں ان کی خوش بو سے تو ان کے پڑھنے والوں کے دماغ اس سے پہلے معطر ہو چکے تھے مگر "آب گم" میں یوسفی نے ایک نہایت سنجیدہ مسئلے کو اپنا موضوع بنا کر جس سلیقے سے اپنے معروف انداز نگارش کو اس کے مطابق ڈھالا ہے وہ ایک ایسا کمال ہے جو صرف ایک حقیقی معنوں میں بڑے ادیب ہی سے ممکن تھا۔ آب گم میں یوسفی ایک ذرا بدلے ہوئے روپ میں نظر آتے ہیں۔ وہ سراسر وہ نہیں جنھیں ہم پہلے سے جانتے پہچانتے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں ان کا موضوع بدلا ہوا ہے۔

مجھے اعتراف ہے کہ میں "آب گم" کا قتیل ہوں۔ پہلا وار تو مجھ پر اس کتاب کے نام نے کیا۔ شاید آپ کو معلوم ہو گا کہ "آبِ گم" بلوچستان کی سنگلاخ سرزمین میں کوئٹہ کے قریب ایک قصبے کا نام ہے۔ میں نے تو فقط اس کا ریلوے اسٹیشن ہی دیکھا ہے مگر مشہور یہ ہے کہ یہ قصبہ اسم بامسمیٰ ہے یعنی اس کا حال اس کے نام کے عین مطابق ہے۔ کتاب پڑھنے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ موضوع اور مواد کی رعایت سے اس نام کا انتخاب بجائے خود صاحبِ کتاب کا ایک تخلیقی کارنامہ

ہے۔ یہ کتاب سوائے ایک قبا علی خان صاحب کے کہ جسے یوسفی کا ایک طرفہ اور بے مثال تحفہ، "ایک یادگار کردار کہنا چاہیے، ایسے افراد کی داستان ہے جو تقسیم کے بعد ترک وطن کر کے کانپور سے کراچی آئے ہیں۔ جنھیں کراچی کی جلکوئی بات ج پسند نہیں اور کانپور کی یاد جن کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ چناں چہ غالب کی ایک نادر اور حسین ترکیب مستعار لیتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ یہ چند "طائرانِ آشیاں گم کردہ" کی داستان ہے۔ ان کے بارے میں مصنف کتاب کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

"اس مجموعے کے بیش تر کردار ماضی پرست، ماضی زدہ اور مردم گزیدہ ہیں۔ ان کا اصل مرض ناسٹل جیا ہے۔ زمانی، مکانی، انفرادی اور اجتماعی۔ جب انسان کو ماضی حال سے زیادہ پرکشش نظر آنے لگے اور مستقبل نظر آنا ہی بند ہو جائے تو باور کرنا چاہیے کہ وہ بوڑھا ہو گیا ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ بڑھاپے کا جان لیوا حملہ کسی بھی عمر میں، بالخصوص جوانی میں ہو سکتا ہے۔ اگر افیم یا ہیروئن دستیاب نہ ہو تو پھر اسے یاد ماضی اور فینٹیسی میں، جو تھکے ہاروں کی آخری پناہ گاہ ہے ایک گونہ سرخوشی محسوس ہوتی ہے۔ جیسے کچھ حوصلہ مند اور جفاکش لوگ اپنے زور بازو سے اپنا مستقبل بناتے ہیں اس طرح وہ زور تخیل سے اپنا ماضی آپ بنالیتا ہے یادوں کا سرشور دریا دشت امروز میں بہتے بہتے خواب سراب کے آب گم میں اتر جاتا ہے۔ (۱) ۔۔۔۔۔۔۔۔ کبھی کبھی تو میں بھی اپنے اوپر ماضی کو مسلط کر لیتی ہیں۔ غور سے دیکھا جائے تو ایشیائی ڈرامے کا اصلی ولن ماضی ہے۔"

چناں چہ مصنف نے کتاب میں اس سنجیدہ اخلاقی نقطۂ نظر کی بنا پر ان کرداروں کی ماضی پرستی سے پیدا ان کی خام خیالیوں، بوالعجبیوں اور پریشان حالیوں کا خاکہ اڑایا ہے اور ان کے گرد طنز و مزاح کی نہایت پر لطف کہانیاں بنی ہیں ان کہانیوں کے بین السطور ناپسندیدگی کی لہر جاری و ساری ہے مگر کہیں کسی مقام پر حقارت یا نفرت کا گمان نہیں گزرتا، اس لیے کہ اس لہر کا منبع و مخرج وہ ہمدردی ہے جو مصنف ان کرداروں کے لیے اپنے دل میں رکھتا ہے۔ یوسفی کے اپنے قول کے مطابق انھیں دنیا کے عام اور معمولی آدمیوں ہی سے لگاؤ اور پیار ہے اور انھوں نے زندگی کو ایسے ہی لوگوں کے حوالے سے دیکھا، سمجھا، پرکھا اور چاہا ہے۔ یہ بات ان کی دوسری تحریروں سے بھی صاف عیاں ہے۔ یوسفی نے مقدمے میں ایک جگہ اپنی طبعی یاس پسندی کا ذکر کیا ہے اور اس حوالے سے مشہور انگریزی مصنف جوناتھن سوفٹ کو بھی یاد کیا ہے۔ میرا ذاتی تاثر تو یہ ہے کہ سوفٹ کے ہاں طنز و مزاح میں نفرت و حقارت کا جذبہ بھی نمایاں ہے۔ یہ آج سے پچاس برس پہلے میرے طالب علمی کے زمانے کی بات ہے مگر مجھے یاد ہے کہ میں نے جب GULLIVERS TRAVELS پڑھی تو متن پر ایک ایسا مقام آیا کہ میں نے صفحے کے حاشیے پر فارسی کا یہ شعر لکھ دیا:

مرا بہ روزِ قیامت غمے کہ ہست این است
کہ روئے مردمِ عالم دوبارہ باید

اب اگر یہ کتاب میں پھر سے پڑھوں تو معلوم نہیں میرا ردِ عمل کیا ہو مگر یوسفی کے بارے میں تو میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ حشر کے دن کی نفسا نفسی کے عالم میں بھی اپنے کرداروں کو یہ کہتے ہوئے گلے سے لگالیں گے کہ:

آملے ہیں سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک

آب گم کو مصنف نے اپنی ساخت میں بے ترتیبی کے اعتبار سے سوناٹ اور پھیلاؤ اور فضا بندی کے لحاظ سے ناول کے قریب قرار دیا ہے۔ میرے خیال میں اسے مواد اور موضوع کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے انگریزی ہی کی ایک اور صنف TRAGI-COMEDY یعنی الم ناک طربیہ کہا جاسکتا ہے۔ طربیہ تو اس لیے کہ اس کے اسلوبِ نگارش میں مزاح کی چاشنی اس طرح گھلی ہوئی ہے کہ اس نے طنز کی تلخی کو بھی گوارا بلکہ ذائقہ دار بنادیا ہے اور المیہ اس لیے کہ مصنف نے بیش تر کرداروں کے نوسٹل جیا کو ان کے ٹریجک فلا یعنی کردار کی اس خامی کے طور پر پیش کیا ہے جو ان کے المیے کی ذمہ دار ہے۔

مزاح نگاری میں زبان و بیان کو وہی درجہ حاصل ہے جو عشق میں دیدار کے بعد گفتار کا بتایا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یوسفی کے فن کو ان کی قدرتِ زبان و بیان نے چار چاند لگادیے ہیں۔ ذرا سوچیے تو ان کی نثرنگاری کا انداز اردو کے کتنے مزاح نگاروں کو نصیب ہوا ہے۔ خالص ادبی حسن و خوبی کے علاوہ انھوں نے کتنی بڑی تعداد میں کتنے متروک، بھولے بسرے اور نامانوس لفظوں کو کس خوش سلیقگی، ہنرمندی اور محبت بھری احتیاط سے برتا ہے اور محض چند مضامین میں نہیں بلکہ داستان در داستان سینکڑوں صفحوں پر پھیلی ہوئی کتابوں میں۔ زبان و بیان کے باب میں ان کی تحقیق و تفتیش کی یہ مثال اس دور میں کسی اور اردو ادیب کے ہاں نہیں ملتی۔ اردو میں عام طور پر افعال کی کمی کی شکایت کی جاتی ہے۔ یوسفی نے اشیا کے ناموں کے علاوہ کتنے ایسے بے شمار اسماسے افعال بنائے ہیں جن کو ہم صرف عام مروّجہ افعال کے ساتھ جوڑ کے استعمال کرنے کے عادی ہیں۔ ان سب خصوصیات کی بنا پر مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ یوسفی کی نثر اردو نثر کا ایک نادر نمونہ ہی نہیں ایک درس گاہ بھی ہے۔ ہاں مگر یہ کہ اس سے کماحقہٗ لطف اندوز ہونے کے لیے شائستہ ادب و شعر ہونا ضروری ہے۔

ادب کے بعض ناقدوں نے ادب کو نقدِ حیات کہا ہے اور طنز و مزاح کا ایک مقصد تفنن و تفریح کے علاوہ اصلاحِ احوال کو بھی قرار دیا ہے مگر اردو کے مزاح نگاروں کا فن ہلکی پھلکی ہنسی، فقرہ بازی اور لطیفہ گوئی سے آگے نہیں بڑھتا۔ یوسفی ان سے بہت مختلف ہیں۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا ان کے ہاں ایک سنجیدہ اخلاقی نقطہ نظر ہے جو خصوصاً آبِ گم میں ان کے کرداروں کے افعال و

اقوال اور مختلف قسم کے اشاروں کنایوں سے ظاہر ہوتا رہتا ہے اور کبھی کبھی ایسے بلاواسطہ طریقے سے بھی جسے خود مصنف نے یونانی ڈراموں کے کورس کی فلسفہ طرازی کا نام دیا ہے۔ اس نقطۂ نظر کا اظہار ایک دلچسپ عنوان سے کتاب کے مقدمے کے آخری حصے میں بھی موجود ہے۔ یوسفی زبان کے معاملے میں بڑے حساس واقع ہوئے ہیں۔ انھیں مستقل یہ فکر لگی رہتی ہے کہ کہیں ان کی تحریر میں ان کے وطن راجستھان کا لہجہ اور محاورہ راہ نہ پا جائے۔ چناں چہ انھوں نے آبِ گم کا مسودہ اپنی بیگم کو کہ میر و غالب کی جنم بھومی آگرہ سے تعلق رکھتی ہیں، اصلاح کی غرض سے پڑھنے کو دیا۔ مسودہ پڑھنے کے بعد بیگم صاحبہ نے بڑے پتے کی بات کہی جو میں انھیں کے الفاظ میں نقل کرتا ہوں:

"پڑھائی ختم ہوتے ہی علی گڑھ سے اس گھر میں آ گئی پینتالیس برس ہو گئے اب مجھے کچھ یاد نہیں کہ میری زبان کیا تھی اور تمھاری بولی کیا۔ اب تو جو سنتی ہوں سبھی درست معلوم ہوتا ہے۔"

اس پر یوسفی کا تبصرہ بھی ملاحظہ فرمایئے۔

"ایک دوسرے کی چھاپ تلک، سب چھین کر اپنا لینے اور دریائے سندھ اور راوی کا ٹھنڈا پانی پینے کے بعد تو یہی کچھ ہونا تھا اور جو کچھ ہوا بہت خوب ہوا فی الحمد اللہ رب العالمین" ۔ سو یہ ہے زبان و ثقافت کے بارے میں یوسفی کا نقطہ ٔ نظر جو دوسرے معاشرتی حالات و کوائف پر بھی حاوی ہے۔ وہ اپنے کرداروں سے بھی دراصل یہی کہنا چاہتے ہیں کہ انھیں ماضی کی طرف دیکھتے رہنے کی بجائے نئی زندگی کو قبول کرکے حال و مستقبل کی تعمیر کرنی چاہیے۔

یوسفی کا یہ نقطہ ٔ نظر ادیب کی سماجی ذمہ داری کے شعور سے پیدا ہے۔ چناں چہ "آبِ گم" کے مقدمے میں انھوں نے اپنے ادبی عقیدے کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

"کوئی لکھنے والا اپنے لوگوں، ہم عمر ادیبوں، ملکی ماحول و مسائل، لوک روایت اور کلچر سے کٹ کر کبھی کوئی زندہ اور تجربے کی دہکتی کٹھالی سے نکلا ہوا فن پارہ تخلیق نہیں کر سکتا"۔

ادیب کی سماجی ذمہ داری کے اس شعور کی بنا پر یوسفی نے اس مقدمے میں جنرل ضیاء الحق کے مارشل لا دور کا ذکر بڑی وضاحت اور تلخ و ترش لہجے میں کیا ہے اور جنرل موصوف کی اس تقریر کا حوالہ بھی دیا ہے جس میں نام لیے بغیر انھوں نے بعض ادیبوں کو جن میں پاکستان کی آبرو فیض احمد فیض بھی شامل تھے غدار اور وطن دشمن قرار دے کر ان پر اس زمین کا رزق، اس کی چھاؤں اور چاندنی حرام کر دینے کی بشارت دی تھی۔ یہ دور جولائی ۱۹۷۷ء سے شروع ہوا اور ڈیڑھ سال کے بعد یعنی جنوری ۱۹۷۹ء میں یوسفی لندن چلے گئے مگر انھوں نے اپنے ہم وطنوں اور اپنے ملکی ماحول و مسائل کا رشتہ اپنے تجربے کی دہکتی کٹھالی سے ٹوٹنے نہیں دیا۔ چناں چہ "آبِ گم" وہ زندہ فن پارہ ہے جو انھوں نے اس دور میں تخلیق کیا۔ ان کے اپنے الفاظ میں "یہ دور ضیا کا تلخاب ہے"۔

اب میں مارشل لا کے نفاذ کے کوئی چھ مہینے بعد کا ایک واقعہ سناتا ہوں جس کا تعلق یوسفی صاحب کی ادبی نہیں بلکہ منصبی زندگی سے ہے۔ جنرل ضیاء الحق نے ایک دفعہ وزارت خزانہ کے سکریٹری اور بینکوں کے سربراہوں کی میٹنگ بلائی۔ یوسفی صاحب اس وقت بینکنگ کونسل کے چیرمین تھے یعنی بینکوں کے سربراہوں کے سربراہ۔ دوران ملاقات، جنرل صاحب کسی بات پر خفا ہوگئے اور انھوں نے بینکوں کے سربراہوں کے بارے میں نہایت گری ہوئی اور توہین آمیز بات کردی۔ یوسفی صاحب سے رہا نہ گیا۔ انھوں نے فوراً جیب سے اپنے دفتر کی کنجیاں نکال کر میز پر پھینک دیں اور بڑے سخت لہجے میں جنرل موصوف کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "آپ کو بڑا سچا مسلمان ہونے کا دعویٰ ہے آپ کو اس قسم کی بات کہنے کی جرأت کیسے ہوئی"۔ محفل پر سناٹا چھا گیا اور اس دوران یوسفی صاحب نے اسی لہجے میں اپنا سوال پھر دہرایا۔ ظاہر ہے کہ جنرل موصوف کچھ سٹپٹا گئے۔ انھوں نے کسی سرکاری اہل کار کے یہ تیور کب دیکھے تھے۔ لیکن آدمی ہشیار تھے لہٰذا دھیمے پڑ گئے اور خفیف ہو کر کہنے لگے "آخر میں بھی تو انسان ہوں" اس وقت تو یوسفی صاحب نے بہ وجوہ معاملے کو طول نہیں دیا اور بات آئی گئی ہو گئی۔ آٹھ دس مہینے کے بعد جب اس واقعے کی بدمزگی کا غبار ہٹ گیا تو یوسفی صاحب نے خاموشی سے بینکنگ کونسل کی چیرمین شپ سے استعفیٰ دے دیا۔

سو خواتین و حضرات!

خاتمہ کلام اس پر کرتا ہوں کہ میرا محترم یار عزیز مشتاق احمد یوسفی بڑا ادیب ہی نہیں، بڑا انسان بھی ہے اور مردِ مومن کے اس دوگونہ وصف کا حامل بھی جو اقبال نے اپنے اس شعر میں بیان کیا ہے:

ہو حلقۂ یاراں تو ہے شبنم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

[مشتاق احمد یوسفی کے ساتھ ایک شام، کی تقریب کی صدارتی تقریر جو الائیڈ بینک کی سوسائٹی برائے فروغ فن و ثقافت کے زیرِاہتمام ۲۶۔مارچ ۱۹۹۵ء کو اسلام آباد میں سنائی گئی۔]

---

(۱) تاثیر کا شعر بے اختیار یاد آیا:

وہ رودِ خشک ہوں جسے صحرا نگل گیا
پابندِ وقفہ ہائے مراحل نہیں ہوں میں

یوسفی کو اس شعر کا علم نہیں تھا۔ میں نے جب سنایا تو انھیں بہت پسند آیا۔

==== OOOO ====

نیر مسعود

کیسری کشور

کئی برس ہوئے ایک دن میں اپنے مکان کے بیرونی کمرے میں نیم مردہ لیٹا ہوا تھا کہ باہر موٹر رکنے کی آواز آئی، پھر کمرے سے متصل برآمدے میں قدموں کی آہٹ سنائی دی ۔ میں رات سے بہت بیمار تھا اور اس وقت کسی ملاقاتی کے تصور نے مرض کی تکلیف کو اور بڑھا دیا ۔ اسی وقت آنے والے نے بلند آواز سے پوچھا:

"کیا یہاں کوئی صاحب بیمار ہیں؟"

میں اس سوال پر غور کر رہا تھا کہ کھلے ہوئے دروازے سے مجھے لیٹا دیکھ کر وہ صاحب ہاتھ میں بیگ لیے ہوئے کمرے کے اندر آ گئے ۔ بیگ سے اسٹیتھو سکوپ نکال کر انھوں نے میرا معائنہ کیا، حال پوچھا، کچھ دوائیں اپنے پاس سے دیں، کچھ کے نام پرچے پر لکھ کر دیے اور ضروری ہدایتیں دیتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے ۔ میں نے دبی زبان سے فیس کو پوچھا تو ہاتھ جوڑ کر انکار کرتے ہوئے انھوں نے کہا:

"مجھے ڈاکٹر کیسری کشور نے بھیجا ہے ۔" اور فیس لیے بغیر واپس چلے گئے ۔

میں نے ان کے دیے ہوئے پرچے پر نظر ڈالی تو پتا چلا کہ وہ شہر کے ایک بہت ممتاز ڈاکٹر تھے ۔ مجھے یاد آ گیا کہ سویرے ڈاکٹر کیسری کشور نے مجھ کو فون کیا تھا تو انھیں بتایا گیا تھا کہ میں بیمار اور فون تک آنے سے معذور ہوں ۔

==========

ڈاکٹر کشور کو میں نے اول اول لکھنو یونیورسٹی کے اسٹاف کلب میں دیکھا تھا جہاں وہ کبھی کبھار آنکلتے تھے ۔ میرا ان سے ذاتی تعارف نہیں تھا لیکن اپنے ساتھیوں سے مجھے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ وہ میڈیکل کالج میں پڑھاتے ہیں، اردو لکھنا پڑھنا نہیں جانتے لیکن اردو شاعری کا بہت اچھا ذوق رکھتے ہیں اور کلام غالب کے حافظ ہیں ۔ اس کے بعد معلوم ہوا کہ وہ خود بھی شعر کہنے لگے ہیں، پھر ایک دو مشاعروں میں ان کا کلام سننے کا موقع بھی ملا ۔ اسی دوران پروفیسر ولی الحق انصاری صاحب کے یہاں ایک شعری نشست میں ان سے ملاقات ہوئی اور مجھے دیکھتے ہی انھوں نے قریب آکر کہا:

"کیوں جی، سنا تم ہمارے کلام کی تعریف کرتے ہو؟"

میں نے ان کے بھاری بھرکم بدن اور رعب دار چہرے کو ایک نظر دیکھا اور آہستہ سے پوچھا:

"یہ آپ سے کس نے کہہ دیا؟"

"ولی کہہ رہے تھے۔" انھوں نے جواب دیا اور گواہی کے لیے ولی الحق صاحب کو آواز دی میں نے کہا:

"کلام زوردار ہوگا تو تعریف کرنا ہی پڑے گی۔"

"زوردار کلام سے تمھاری کیا مراد ہے؟"

لیکن میرے جواب دینے سے پہلے نشست کا آغاز ہو گیا۔ اس نشست میں ڈاکٹر کشور نے اپنی تازہ غزل سنائی۔ پھر میرے پاس بیٹھ کر چپکے سے پوچھا:

"کہو بھئی، ہماری غزل کیسی رہی؟"

"زوردار" میں نے کہا۔

"پھر وہی" انھوں نے ہنستے ہوئے پوچھا "آخر زوردار کا مطلب کیا ہے؟"

اب مجھے یاد نہیں کہ میں نے جواب میں کیا کہا تھا لیکن اس نشست کے بعد ان سے اکثر ملاقات ہونے لگی۔ مڈیکل کالج لکھنو کے فارماکولوجی ڈپارٹمنٹ کی تجربہ گاہ کے ایک سرے پر ان کا کمرہ تھا۔ تجربہ گاہ کی ادب کش فضا سے اس کمرے میں پہنچ کر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ریگستان کا مسافر نخلستان میں پہنچ گیا۔ سامنے کرسی پر ڈاکٹر کیسری کشور لطائف و ظرائف کے پھول بکھیرتے اور اشعار آب دار کے موتی رولتے نظر آتے۔ بھانت بھانت کے لوگ ان کے پاس آتے رہتے تھے۔ کسی کو اپنے رشتے دار کا آپریشن کرانا ہے تو کوئی خود اپنا معائنہ کرانا چاہتا ہے۔ کوئی اسپیشل وارڈ کا جویا ہے تو کسی کو بیش قیمت دوائیں بلا قیمت مطلوب ہیں، اور ڈاکٹر کشور اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے سب کی مشکلیں حل کر دیا کرتے تھے۔ ادبی گفتگو اور شعر خوانی کا سلسلہ بھی جاری رہتا۔ بیچ بیچ میں ایسا بھی ہوتا کہ تجربہ گاہ سے ان کا کوئی شاگرد ہاتھ میں کسی کیمیائی مرکب کی شیشی لیے کمرے داخل ہوتا اور کہتا:

"سر، یہ Dilute نہیں ہو رہا ہے۔"

اور ڈاکٹر کی زبان پر "ابہام"، "تنسیق الصفات"، "پیکر تراشی" وغیرہ کی جگہ علم الادویہ کی ادق لاطینی اصطلاحیں رواں ہو جاتیں۔ شاگرد مطمئن ہو کر باہر چلا جاتا اور ڈاکٹر امانت لکھنوی کا کوئی مزے دار شعر سنا کر بچوں کی طرح ہنسنے لگتے۔ ان کی ہنسی میں معصومیت اور شوخی کا عجیب امتزاج ہوتا تھا۔ جب بھی وہ کسی مشاعرے میں کامیاب غزل پڑھ کر ڈائس سے نیچے اترتے تھے تو اس طرح ہنستے تھے جیسے شریر بچہ کوئی نئی شرارت کر کے ہنستا ہے۔ ایک بار میں نے کہا بھی:

"ڈاکٹر صاحب، آپ کی اس ہنسی سے گمان ہونے لگتا ہے کہ آپ کسی دوسرے کا کلام اس کی لاعلمی میں اپنے نام سے پڑھ دیتے ہیں۔"

"تو امتحان لے لو نا،" انھوں نے کہا "لاؤ نکالو کوئی طرح۔"

میں نے ایک مشکل طرح نکالی اور انھوں نے مشاعرہ گاہ سے نکلتے نکلتے اس طرح میں کئی بہت اچھے شعر کہہ دیے۔

=========

جب ڈاکٹر کیسری کشور کو اتر پردیش اردو اکادمی کی مجلس عاملہ کا ممبر نامزد کیا گیا تو بعض حلقوں میں ایک غیر اردو داں کی نامزدگی پر چہ میگوئیاں ہوئی تھیں۔ اسی زمانے میں ایک دن میں نے ان سے پوچھا:

"ڈاکٹر صاحب، کیا یہ واقعہ ہے کہ آپ اردو لکھ پڑھ نہیں سکتے یا آپ نے مصلحتاً ایک غلط بات کو شہرت۔۔۔۔"

"نہیں بھئی" وہ بولے، "میں نے کسی سے نہیں کہا۔ دراصل میں نے اردو ادب کا سارا مطالعہ ہندی رسم الخط میں کیا ہے۔ تم لوگوں کو اندازہ ہی نہیں ہے کہ ہندی میں اردو کا کتنا سرمایہ منتقل ہو چکا ہے۔ اردو پڑھ لیتا ہوں مگر ہندی کے مقابلے میں دیر لگتی ہے۔ اردو لکھ بھی سکتا ہوں لیکن مشکل سے۔" پھر وہ اسی بچکانہ شوخی کے ساتھ مسکرا کر بولے "میں تو اس لیے خاموش ہوں کہ کوئی من چلا میرا نام لے کر اخبار میں یہ بات لکھ دے کہ میں اردو لکھنا پڑھنا نہیں جانتا، تو میں اس پر ہتک عزت کا مقدمہ دائر کر دوں اور عدالت میں جج کے سامنے اردو لکھ اور پڑھ کر تاوان وصول کروں اور اس رقم سے تم لوگوں کی دعوت کروں۔"

"دعوت تو اس غریب مدعا علیہ کو ذبح کیے بغیر بھی ہو سکتی ہے۔"

"چلو یہی سہی، اب کی اتوار کو آؤ۔" انھوں نے کہا "البتہ اس مال کی دعوت میں تمھیں اپنے ہاتھ کا پکایا ہوا مرغ مسلم کھلاتا۔"

"مرغ مسلم پکانا مذاق نہیں ہے۔"

"میاں لکھنؤ کے کسی بھی باورچی سے مقابلہ کرا لو۔" انھوں نے بڑے دعوے کے ساتھ کہا۔

اور یہ واقعہ ہے کہ وہ کھانا پکانے کے ماہر تھے اور اسی کے ساتھ کھانے کھلانے کے شوقین بھی۔ ریور بینک کالونی میں بیلی گارد (لکھنؤ ریزیڈنسی) کی چار دیواری سے متصل ان کے مکان میں ہم لوگوں نے بارہا ان کے ہاتھ کے پکوانوں کا مزہ لیا ہے۔

اس زمانے میں ڈاکٹر کشور کی طبیعت آمد پر تھی۔ خوب خوب شعر کہہ رہے تھے۔ شمس الرحمان فاروقی بھی لکھنؤ ہی میں تعینات تھے۔ دونوں کی ملاقات کرائی۔ آناً فاناً دونوں ایک دوسرے کے گرویدہ ہو گئے۔ ڈاکٹر نے پوچھا:

"کیا یہ سچ ہے کہ تم تنقید میں رورعایت سے کام نہیں لیتے؟"

"کوشش تو کرتا ہوں۔" فاروقی نے کہا، "آپ کچھ سنائیے۔"

ڈاکٹر نے کچھ سنایا۔ فاروقی بولے:

"کلام تو زوردار ہے، لیکن ----"

"---- الفاظ دقیق و غریب کا وفور ہے۔" میں نے جملہ پورا کیا۔

"تو اس میں حرج کیا ہے؟" ڈاکٹر میری طرف پلٹ پڑے۔

"کچھ نہیں۔"

"واہ۔ فاروقی، تم بولو۔"

"مجھے تو الفاظ دقیق و غریب کا استعمال پسند ہے، بہ شرطے کہ سلیقے کے ساتھ ہو۔"

"اب آپ فرمائیے۔" وہ مجھ سے بولے۔

"شرط سلیقہ ہے ہر اک امر میں۔"

اس کے بعد جب بھی فاروقی سے ملاقات ہوتی، استعمال الفاظ پر بحث ضرور ہوتی۔ ایک دن فاروقی نے کہا:

"اصل میں آپ نے ہندی حرفوں میں اردو پڑھی ہے اس لیے اردو لفظوں کا مزاج آپ ٹھیک سے نہیں پہچانتے۔"

"یہ کیا بات ہوئی؟"

دیر تک بحث رہی۔ ڈاکٹر قائل نہیں ہوئے۔ لیکن دوسرے دن صبح صبح انھوں نے مجھے فون کیا:

"کل فاروقی مذاق کر رہے تھے یا سیریس تھے؟"

"مذاق غالباً نہیں کر رہے تھے۔"

"تم دونوں کی کوئی سازش تو نہیں ہے؟"

"نہیں۔"

"اچھا تو آج یونیورسٹی جاتے ہوئے مجھے میر انیس کے مرثیے دیتے جانا۔"

میں نے اسی دن "روح انیس" ان کے حوالے کی۔ شام کو پھر فون آیا:

"لے ستمگر، جو نہ جاتا تھا تو اب جاتا ہوں!"

"خدا حافظ۔ جہاں جائیے خوش رہیے۔"

"مذاق نہیں۔ کیا بہادری ٹپکتی ہے:

ہاں سوئے ابن شہنشاہِ عرب جاتا ہوں
لے ستمگر جو نہ جاتا تھا تو اب جاتا ہوں

اگلے تین چار دن میں انھیں میر انیس کا مرثیہ "بہ خدا فارس میدان تہور تھا حر" بیشتر حفظ ہو چکا تھا اور حر کی زبان سے یہ مصرع "لے ستمگر جو نہ جاتا تھا----" وہ قریب قریب ہر ملنے

والے کو سنا چکے تھے۔ پانچویں چھٹے دن پھر فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے رسیور اٹھا کر اپنا فون نمبر بتایا۔ ادھر سے آواز آئی:

"حقا کہ افصح الفصحا ہے انھیں کا جد۔"

"اچھا اچھا، "جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے" زیرِ مطالعہ ہے؟"

"یار، اس افصح الفصحا، کا کوئی جواب ہے؟ بھئی مزہ آگیا۔ اور تم لوگ مجھے گاڑھی زبان کا طعنہ دیتے ہو!"

"شرط سلیقہ ہے۔ اس سے بھی گاڑھی زبان ملاحظہ فرمائیے۔ گدا علی گدا کہتے ہیں۔۔۔۔"

"ارشاد۔"

امام تشنہ جگر نے پس از نماز عشا   بہن کے سر کو لگا چھاتی ساتھ رو رو کہا

کہ اے حبیبہ، ام الائمۃ الحسنا۔۔۔

"کیا؟ ٹھہرو ٹھہرو۔ کہ اے حبیبہ،۔۔۔۔؟"

"کہ اے حبیبہ، ام الائمۃ الحسنا۔"

"مر گئے۔ ایک منٹ۔ ارے سدھا!" انھوں نے فون ہی پر اپنی بیگم کو زور سے پکارا۔ کچھ دیر تک ان سے کچھ کہتے رہے۔ پھر مجھ سے بولے، "ہاں، اب سناؤ۔"

میں نے مصرع دہرا کر اگلا مصرع پڑھا:

"ترے بلکنے ستی کانپتے ہیں ارض و سما۔"

"ایک منٹ، ایک منٹ۔ کہ اے۔۔۔ حبیبہ،۔۔۔۔ ام۔۔۔۔ آگے؟"

میں نے آگے بول کر پوچھا:

"یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟"

"کچھ نہیں۔ نوٹ کر رہا تھا۔"

"ہندی میں؟"

"ہاں۔ مگر یار ہندی میں لکھا ہوا کچھ عجیب سا معلوم ہو رہا ہے۔ اچھا میں شام کو آرہا ہوں۔ مجھے اردو میں لکھ دینا اور معنی بھی لکھ دینا۔ مگر بھئی مزہ آگیا۔ کہ اے حبیبہ، ام الائمۃ الحسنا۔ یہ گدا بھی بڑا ظالم آدمی تھا۔ یا شام کو تم ہی نہ آجاؤ؟ اپنے ہاتھ کے پکوڑے کھلاؤں گا۔"

"پکوڑے؟" میں نے کہا، "لاحول ولا قوۃ۔ اس ٹھاٹھ کا مصرع اور اس کے انعام میں پکوڑے!"

"اور نہیں تو کیا آپ کے لیے دربہشت، راحت جان اور لقمی میانہ پر خاصگی تیار کروں؟ اماں ایک بار، ہم ایک نواب صاحب کے یہاں دعوت کھانے پہنچ گئے۔۔۔۔"

اس کے بعد وہ دیر تک مسلم پکوانوں کے شاعرانہ نام گناتے رہے۔ فون رکھ دیا، ذرا ہی

دیر بعد پھر ملایا:

"یار، اردو میں ائمتہ الحسنا کس طرح لکھا جائے گا؟"

ڈاکٹر کے فون زیادہ تر اسی ڈرامائی انداز میں آتے تھے۔ ایک دن گھنٹی بجی۔ میں نے رسیور اٹھایا۔ آواز آئی:

"بڑھ گئی، بڑھ گئی!"

"کچھ اور بتائیے، کب بڑھی، کتنی بڑھی، کیوں کر بڑھی؟ اور مناسب سمجھیے تو یہ بھی بتائیے کہ کیا بڑھی۔"

"اماں ریڈیو اسٹیشن سے آرہا ہوں۔ فاروقی بیٹا کو بھی بتا دینا۔"

معاملہ میری سمجھ میں آگیا۔ تین چار دن پہلے میرے یہاں فاروقی اور ڈاکٹر بیٹھے ہوئے تھے ریڈیو پروگراموں کی فیس کا ذکر نکل آیا۔ معلوم ہوا ڈاکٹر کی فیس سب سے کم ہے۔ ہم لوگوں نے اس پر تعجب کا اظہار کیا تو بولے:

"بات یہ ہے تم لوگ بہت پہلے سے پروگرام دے رہے ہو۔ میں تو ابھی میدان میں آیا ہوں۔"

اس کے بعد ایک ادبی مسئلے پر بحث چھڑ گئی۔ ڈاکٹر نے اپنی کچھ رائے ظاہر کی تو میں نے روکھا لہجہ بنا کر کہہ دیا:

"جب دو سینیئر براڈ کاسٹر بات کر رہے ہوں تو جونیر لوگوں کو بیچ میں نہیں بولنا چاہیے۔"

"اچھا استاد، اچھا۔ دیکھوں گا۔"

یہ سیاق و سباق یاد آگیا تو میں نے پوچھا:

"یعنی آپ نے اپنی فیس بڑھوالی؟"

"کیا سمجھتے ہو؟ آج میں ریڈیو اسٹیشن گیا اور دندناتا ہوا ڈائرکٹر کے کمرے میں ۔۔۔۔ اپنے کو انگریزی میں انٹروڈیوس کرایا اور صاف صاف کہہ دیا کہ آپ لوگوں نے میری فیس اتنی کم رکھی ہے کہ کل کے لڑکے مجھے لونڈا سمجھتے ہیں۔ یا تو فیس بڑھائیے یا میرا نام اپنے یہاں سے کاٹ دیجیے۔ بس، بڑھ گئی۔"

اپنا مجموعہ، کلام "ہنوز شیشہ گراں" ڈاکٹر نے بڑے چاؤ سے تیار کیا تھا۔ کتابت شروع کرانے سے پہلے مسودہ مجھے دے کر انھوں نے کہا:

"اسے ایک بار پھر دیکھ لو، اور حتو کہیں بھی ہو، فوراً بتاؤ۔"

مختصر مجموعہ تھا۔ میں نے اسی وقت ورق گردانی کی اور کہا:

"یہ جو شعر ہے:

نذرِ آتش آؤ کر دیں ہم بھی ماضی کے خطوط

لان پر مالی جلادیتے ہیں سوکھی پتیاں

اس میں "لان پر" کی کوئی خاص ضرورت نہیں۔ اس کے بغیر بھی مضمون پورا ہے۔"

"لان پر مالی۔۔۔ہاں، یہ بات تو ہے۔ پھر اسے ہٹا کر فاعلن کے وزن کا کوئی اور لفظ رکھا جائے۔"

"جب مضمون پورا ہے تو جو لفظ بھی رکھیے گا، وہ حشو ہوگا۔"

"واہ، آخر حشو ملیح بھی تو کوئی چیز ہے۔"

"آپ ملیح اور قبیح کے جھگڑے میں کیوں پڑیے۔ ایسا کیجیے کہ "لان پر" کی جگہ "فاعلن" ہی رکھ دیجیے۔"

"یعنی فاعلن مالی جلادیتے ہیں۔۔۔؟"

"جی ہاں، اور اس پر حاشیہ لکھ دیجیے کہ مضمون پورا ہو گیا تھا مگر ایک رکن کم پڑ رہا تھا۔ مناسب سمجھا گیا کہ بھرتی کے کسی لفظ سے یہ کمی پوری کرنے کے بجائے وہی رکن رکھ دیا جائے جو کم پڑ رہا تھا۔"

خوب ہنسے اور شام کو فون کیا:

"مسودہ کتابت کو دے رہا ہوں۔ وہ مصرع یوں ہی کر دیا ہے:

فاعلن مالی جلادیتے ہیں سوکھی پتیاں

حاشیے کی عبارت سن لو۔"

"یعنی آپ سنجیدگی سے میری تجویز۔۔۔"

"کیا حرج ہے؟ بات بالکل معقول ہے۔ اماں، مزہ آئے گا۔"

"ایسا غضب نہ کیجیے گا۔"

بڑی مشکل سے راضی ہوئے اور وہ مصرع "لان پر" ہی کے ساتھ چھپا۔

اکتوبر ۱۹۷۸ء میں "ہنوز شیشہ گراں" کی اشاعت ہوئی، لیکن اس کی کتابت طباعت ڈاکٹر کے حسب منشا نہیں تھی، لہٰذا انھوں نے اس پورے ایڈیشن کو مسترد کر دیا اور نئے سرے سے کتابت کرواکے دسمبر ۷۸ء میں دوسرا ایڈیشن شائع کیا، اور یوپی اردو اکادمی کی طرف سے اس پر انعام حاصل کیا۔ انھوں نے خاص خاص احباب سے اس پر تبصرہ لکھنے کی بھی فرمائش کی مگر سب نے قریب قریب ایک ہی جواب دیا کہ ایسی جلدی کیا ہے۔

اسی دوران ایک دن اطلاع ملی کہ ڈاکٹر کیسری کشور پر سخت قلبی دورہ پڑا ہے اور وہ میڈیکل کالج کے شدید نگرانی والے وارڈ میں داخل کر دیے گئے ہیں۔ میں انھیں دیکھنے پہنچا۔ صرف ایک منٹ کے لیے ان کے پاس خاموش کھڑے ہونے کی اجازت ملی۔ وہ مختلف آلات میں جکڑے ہوئے پڑے تھے۔ میں چپ چاپ انھیں دیکھ رہا تھا کہ ان کی آنکھیں ذرا سی کھلیں۔ مجھے

دیکھ کر انھوں نے اشارے سے پاس بلایا اور جب میں اپنا کان ان کے منھ کے قریب لے گیا تو نہایت نحیف آواز میں بولے:

"رفتہ رفتہ وہ رفعت پائی، جاں پہ گرفت سمت نہیں"

میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ وہ پھر بولے:

"دوسرا مصرع سنو۔"

میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور بولا:

"ہرگز نہیں سنوں گا۔ آپ نے بھی انتہا کر دی۔ اس وقت شعر و شاعری۔۔۔"

"سنو تو" وہ بولے، "بھائی، میں اس دورے میں آدھے سے زیادہ مر گیا تھا۔ جب ایمبولنس میں اسپتال لایا جا رہا تھا تو ذرا دیر کو ہوش آیا۔ میں نے سوچا کہ ختم ہو رہا ہوں، چلتے چلتے ایک مطلع تو ٹھونک ہی دیا جائے۔ لو، اب دوسرا مصرع سنو۔"

لیکن دوسرے مصرعے سے پہلے ہی دوسرا منٹ شروع اور ملاقات کا وقت ختم ہو گیا۔

اسپتال میں کچھ عرصے تک زیرِ علاج رہنے کے بعد ڈاکٹر ٹھیک ہو کر گھر آ گئے۔ معالجوں سے وعدہ کر کے آئے تھے کہ گھر پہنچ کر ایک ہفتے تک کسی سے نہیں ملیں گے۔ لیکن پہلے ہی دن ان کا فون آیا:

"بھائی، گھر آ گیا ہوں۔ تمھیں فرصت ہو تو آجاؤ۔"

"یہ وعدہ خلافی؟"

"نہیں یار، خود کچھ نہیں بولوں گا۔"

"جی معاف کیجیے۔ یک طرفہ گفتگو میرے بس کی بات نہیں۔"

"سنو تو۔ وہ ایک دفعہ تم نے ذکر کیا تھا، کوئی دعا ہے شاید، وہی جس کی عبارت کا بہاؤ ... ارے وہی جو تم شب قدر میں پڑھتے ہو۔"

"اچھا، جوشن کبیر؟"

"جوشن کبیر، ہاں۔ اگر فرصت ہو تو آ کر مجھے سناؤ۔"

"مگر وہ بہت لمبی دعا ہے۔"

"تو کیا ہوا؟ آہستہ آہستہ پڑھتے جانا۔ میں چپ چاپ پڑا سنتا رہوں گا۔"

"اچھا تو دو تین دن آرام کر لیجیے، پھر۔۔۔"

"نہیں یار، چلے ہی آؤ۔"

تھوڑی دیر بعد وہ بڑی یک سوئی کے ساتھ آنکھیں بند کیے سن رہے تھے:

"یا مَنْ ہُوَ فِی عَہْدِہٖ وَفِیٌّ، یا مَنْ ہُوَ فِی وَفَائِہٖ قَوِیٌّ۔ یا مَنْ ہُوَ فِی قُوَّتِہٖ عَلِیٌّ، یا مَنْ ہُوَ فِی عُلُوِّہٖ قَرِیبٌ، یا مَنْ ہُوَ فِی قُرْبِہٖ

لطیفٌ، یامَنْ ہُوَ فی لطفہٖ شریفٌ، یامن ہُوَ فی شرفہٖ عزیزٌ، یامَنْ ہُوَ فی عزّہٖ عظیمٌ، یامَنْ ہُوَ افی عظمتہٖ مجیدٌ، یامَنْ ہُوَفی مجدہٖ حمیدٌ ا اللہمّ اِنّی اَسئلک باسمک یا کافی، یاشافی، یاوافی، یامعافی، یاہادی، یاداعی، یاقاضی، یاراضی، یاعالی، یاباقی...“

دعا ختم ہوئی تو بولے:

”اسے ریکارڈ کر کے مجھے دینا، پھر کچھ دن میں مجھ سے زبانی سن لینا۔“

=========

ڈاکٹر کی بیماری کے دوران ان کی والدہ انھیں دیکھنے کے لیے الہ آباد سے لکھنو آگئی تھیں لیکن یہاں آکر وہ خود بستر سے لگ گئیں اور کئی مہینے کی علالت کے بعد یہیں ان کی وفات ہو گئی۔ ماں کی شب و روز تیمارداری کی تکان، پھر ان کی موت کے صدمے نے ڈاکٹر پر برا اثر کیا۔ کچھ دن بعد ان پر پھر قلبی دورہ پڑا۔ اور اگرچہ اسپتال سے چھٹی پانے کے بعد انھوں نے زبان سے کبھی مایوسی کا ایک لفظ بھی نہیں نکالا لیکن اس دوسرے دورے کے بعد میں نے انھیں مسکراتے نہیں دیکھا۔

”۲۲/جون کی صبح ان کا فون آیا:

”میں کیسری کشور بول رہا ہوں۔“

”آداب عرض۔ آپ کیسے ہیں؟“

”ٹھیک۔ فون اس لیے کیا ہے کہ میں اردو اکیڈمی کے انعام کی رقم واپس کر رہا ہوں۔ تمھارے یہاں ”ہنوز شیشہ گراں“ کی جو کاپیاں رکھوائی ہیں انھیں تلف کرا دینا۔ اور عابد سہیل نے اس پر تبصرہ لکھنے کا وعدہ کیا ہے، انھیں روک دینا۔“

”یہ آپ کو کیا ہو رہا ہے؟“

”کچھ نہیں۔ وہ کتاب اس قابل نہیں کہ لوگ اس پر رائے ظاہر کر کے اپنا وقت برباد کریں۔“

”اچھا میں آرہا ہوں۔“

"کیا کرو گے۔ ایک روتے ہوئے بیمار آدمی سے مل کر ۔۔۔"

"اچھا ٹھیک ہے، آپ بھابھی کو فون دیجیے۔"

"ہاں، ان سے بھی بات کر لو"، اور انھوں نے کم زور آواز میں پکارا، "سدھا!"

ان کی بیگم نے رسیور لیا تو میں نے پوچھا:

"یہ کیا حال ہے؟ کیا وہ واقعی رو رہے ہیں؟"

ہاں بھیا، دو تین دن سے انھیں پتا نہیں کیا ہو گیا ہے۔"

"میں آجاؤں؟"

"آجائیے تو اچھا ہے۔"

ریور بینک کالونی پہنچا۔ پوچھا:

"آج آپ یہ کیسی باتیں کر رہے تھے؟"

وہ دیر تک خاموش رہے، پھر بولے:

"کچھ نہیں۔ اطہر نبی کل بمبئی جا رہے ہیں۔ کہہ رہے تھے کہ اگر تبصرہ مل جائے تو وہ اردو بلٹز میں فوراً چھپوا سکتے ہیں۔"

"تو میں انھیں تبصرہ لکھ کر دیے دیتا ہوں۔"

"جی چاہے تو دے دو"

میں اس گھر میں جاتا تھا تو ڈاکٹر دور ہی سے شور مچاتے ہوئے ملاقاتی کمرے میں داخل ہوتے تھے، لیکن اس وقت مجھے ان کی آواز بہ مشکل سنائی دے رہی تھی۔ میں ان سے یہ کہہ کر چلا آیا کہ شام کو اطہر نبی کسی کو میرے یہاں بھیج کر تبصرہ منگوالیں۔ دن کو میں نے تبصرہ لکھ کر شام کو آدمی کے حوالے کر دیا۔

۸/ جولائی (۱۹۷۹ء) کو ان کا فون آیا:

"بلٹز آگیا ہے"، انھوں نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔

"تبصرہ چھپ گیا؟"

"ہاں۔ تم نے تو ہماری بڑی تعریف کر دی ہے۔"

(بقیہ صفحہ ۱۲۶ پر)

انور ظہیر خان

"ظ" صاحب
(طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئینہ)

ہر بات کی کوئی گفتنی ناگفتنی معلوم اور نامعلوم وجہ ہوتی ہے۔ دل کے بلّیوں اچھلنے، دل مسوس کر رہ جانے، دل کے سلگنے کا موجب کوئی مشغلہ اور چٹکلہ، دید کا کوئی زاویہ، شنیدنی کا کوئی رُخ، ارد گرد کے منظر کا کوئی حصہ، آپ کے کیف و سرور، رنج و الم، تدبّر، تاثر و تجربے کی کوئی پرت، کوئی کرن، غرض کچھ بھی ہو سکتا ہے......!
آج نہ جانے کیوں ڈاکٹر ظ۔ انصاری مرحوم بے اختیار یاد آئے، اور یاد آتے ہی چلے گئے۔ ان کی یاد کو بارہا کوشش کے باوجود ذہن سے جھٹک نہیں سکا۔ سوچنے لگا یہ کیا معمہ ہے؟ پھر خود ہی اپنے آپ کو دلاسا دیا کہ میری معمولی سی ہستی کو اُن کی شخصیت اور فکر و نظر سے گہرا اسمبندھ ہے۔ ظاہر ہے جن سے ذہنی، قلبی یا فطری نسبت ہو انہیں شعور اور لاشعور کے اسکرین سے ہٹا دینا آسان نہیں ہوتا، ان سے تو لاگ لگاؤ ہمیشہ رہتا ہے۔ ڈاکٹر ظ۔ انصاری کا چہرہ کسی حد تک گول اور گال ذرا پچکے ہوئے سے تھے۔ آنکھیں روشن، جانے انجانے اندیشوں سے باخبر، ماتھے کی ریکھائیں گزرے سیلابوں کا پتہ دیتی ہوئیں، کھچڑی بال آگے سے پیچھے کی طرف پلٹے ہوئے، جن کی آدھی تعداد مہ و سال کی ہوا اُڑا لے گئی تھی۔ گردن موٹی جو عموماً بالوں سے عاری رہتی۔ نتھنے پھولے ہوئے، ناک اونچی، جیسے اونچی رکھنے کا سودا سر میں سمایا ہوا۔ رنگ سانولا سُرخ، دہانہ قدرے بڑا، ہونٹ اوسطاً موٹے، دانتوں کی فصل کھڑی اور ہری بھری خوبصورت ٹھوڑی اور ٹھوڑی میں گڑھا، چہرہ کلین شیو، ناک پر چشمہ، چشمے کے پیچھے جگر جگر کرتی آنکھیں، چھاتی کڑی کمان کی طرح تنی ہوئی، جس کا تناؤ چھوٹی سی توند کی وجہ سے کم معلوم پڑتا۔ سردی کے موسم میں کبھی کبھی گلے میں اسکارف لپٹا ہوا جسے دیکھ کر پشکن کی اسکارف والی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی۔ آواز بہت دلکش تو نہ تھی مگر

خوش آواز ہونے کا غرّہ۔ بولتے وقت "ہاتھوں کے کنول"، "دیدوں کے دیئے" ہی جنبش نہ کرتے بلکہ سروسینہ بھی۔ آواز میں کسی اداکار کا سا اُتار چڑھاؤ پیدا کرتے۔ منبر اور مرثیے کے ماحول سے اٹھے تھے اس لئے ساری اداکاری کے باوجود علم کا وقار، تقریر کا جادو، زبان کا ذائقہ باقی رہتا۔ قد دبتا ہوا نہ دراز، چال سنبھلی ہوئی اور کچھ بہکی بہکی بھی، لہجہ علم اور ایکٹنگ کا سنگم۔ صفائی، نزاکت، نفاست، ناک پر غصّہ، سفید رومال، دو چار سوٹ پانچ سات ٹائی، چار چھ جوڑ چپّل جوتے، ایک آدھ شیروانی، ٹی پاٹ، ٹی کوزی، چند پیالیاں، بھرا ہوا سوٹ کیس، بندھا ہوا بستر، ایک عدد فائل، ایک ڈائری اور حوالے کے چند نوٹس سے پُر سفید رنگ کا روسی بریف کیس، پین، پیڈ، اخبارات، کتابوں، رسالوں کا سودا، پڑھنے کی پیاس جنم جنم کی، لکھنے کا ہوکا، سگریٹ پینے والے مگر جیب سگریٹ، ماچس لائٹر سے اکثر بے نیاز، کلپنا میں ساگر سمان، ہاتھ زیادہ تر خالی اور بینک کے اکاؤنٹ میں ہر سمے دس بیس ہزار، لاکھ دو لاکھ کی پونجی جمع، روپے کے جیب سے ہاتھ اور ہاتھ سے ہاتھ تک پہنچنے کے درمیان ایک لمبا راستہ، باتیں روغنی ٹکیہ کی سی گول گول، سڈول، چکنی چپڑی، وعدے، وفاداریاں اور بے وفائیاں، مشکل کشائی کے جتن فون سے، خط سے اور کبھی کبھی رُو برو بھی۔ اردو، فارسی اور روسی زبان و ادب کی گرہ کشائیاں، خسروؔ، غالبؔ، پشکن اوڑھنا بچھونا نہروؔ اور آزادؔ سے والہانہ عقیدت، زبان اور برتاؤ میں اردو کلچر کی جھلک، اور مکان اردو کلچر سے پورم پور تو نہیں پر خالی خالی سا۔ ڈرائنگ روم کی ایک دیوار پر اوم کا بڑا سا فریم آویزاں، بچوں کے نام اسلامی، ہر ہونے والی بیوی مشرّف بہ اسلام، خود "مسلمانی" سے کوسوں دور اور کفر و اسلام کے بین بین رہے۔ کمیونزم سے رشتہ تھا۔ رگِ گلو کا سا اور اخیر میں عدو جیسا۔ عمر بھر شکاری رہے اور شکار بھی ہوتے رہے۔ پیشانی سے پیر تک شعلہ تھے بے قرار، جھومتا، ناچتا ہوا شعلہ، جو جلد بھڑکتا اور جلد ہی سمٹ جاتا۔ قلم ہو کہ قدم، دل ہو کہ دماغ، کہیں ٹھہراؤ نہیں تھا۔ زندگی ورق ورق رہی مگر اسی بکھراؤ سے حسنِ ترتیب کے پہلو بھی نکلتے رہے۔ پیروں میں مخالف سمتوں کا ناتمام سفر باندھ رکھا تھا۔ زندگی بھر ٹھیکیاں لیتے، کاوا کاٹتے، راستہ لپیٹتے آگے بڑھتے رہے۔ جسم و جان اور زبان کو دیکھتے ہوئے لگتا تھا عمر بہت لمبی ہے مگر ایذا پہنچانے والی ہی نہیں جان لیوا بیماری کی راہ سے ہو کر جلد گزر گئے اور وہاں جا پہنچے کہ لاکھ پکارو۔ ع

"اللہ رے سنّاٹا آواز نہیں آتی!"

کسی بھی زبان میں فنکاروں کی کمی نہیں ہوتی لیکن باکمالوں اور منفرد فنکاروں کا قحط ہمیشہ رہا ہے۔ موجودہ دور میں جب کبھی نثر اور اسالیبِ فن اور صاحبِ طرز نثر نگاروں کا جائزہ لیا جائے گا، گہر اور خزف کی چھان پھٹک ہوگی تو ڈاکٹر ظ۔ انصاری گوہر کے خانے میں رکھے جائیں گے۔

ڈاکٹر ظ۔ انصاری طنطنہ اور ہمہمہ، توانائی اور برنائی، ناز اور انداز، جودت اور ندرت، تفکّر اور تاثّر انانیت اور انفرادیت کا نام ہے۔ یہ چیزیں شخص کے مزاج و طبع اور زمین و زماں کی دین ہوتی ہیں۔ ظ۔ صاحب ایک مخصوص زاویۂ نگاہ رکھتے تھے۔ انھوں نے زندگی کو برتا اور زمین و زماں کو دیکھا بھالا تھا۔ وہ ان سے محبّت بھی کرتے تھے اور ان کا احترام بھی، مگر یہ چیزیں جب اپنے حصار سے نکلنے کی کوشش کرتیں تو انھیں رنج ہوتا اور غصہّ بھی آتا تھا۔ وہ ہر چیز کو تہذیب و شرافت، اخلاص و اخلاق کی کسوٹی پر کستے تھے کہ کھرا کھوٹا الگ ہو جائے۔ سچ ہے دھرتی کی بُو باس، موروثی عقیدے کے نقوش (جس سے انھیں عنفوانِ شباب میں نفور پیدا ہوا) خاندانی روایات، اخلاقی اقدار، تہذیبی معیارات کے اثرات۔ دامن جھٹک دینے کے باوجود، انکار و انحراف کے بعد بھی کسی نہ کسی صورت میں باقی رہتے ہیں۔ چونکہ وہ بیک وقت روایت میں ڈوبے اور درایت میں نہائے ہوئے تھے۔ لہٰذا شَے ہو یا شخص، ادب ہو یا نظریہ۔ ہر جگہ تنقید، تحلیل، تجزیہ اور دلیل سے کام لیتے تھے۔ اس لئے توازن نہ بگڑتا، میانہ روی برقرار رہتی۔ شاید "سلامت روی" اسی کو کہتے ہیں۔

وہ سہارنپور کی مردم خیز علمی اور مذہبی خاک سے اٹھے۔ میرٹھ کی زرخیز اور انقلابی سرزمین پر مسیں بھیگیں۔ ایک مقام پر جمے رہنا محال تھا۔ سو نقطے سے دائرے کی جانب سفر کیا۔ گو کہ یہ سفر خطِ مستقیم میں نہیں، خطِ منحنی میں تھا سانپ کی لوٹن کے مشابہ۔ یہ سفر کھائی اور کھانچے، ٹیڑھے میڑھے راستے کا سفر تھا جو قلم کی مشعل، کاغذ کے علَم، جذب و شوق، رجحان و میلان، احساس و ادراک کے سہارے بے تکان طے کیا گیا تھا۔ اور عمر بھر، سانس اور آس کی پناہ میں جاری رہا۔ دورانِ سفر ہجر کی راتوں اور وصل کی گھاتوں سے سابقہ پڑا مگر دل میں کوئی اور ہی تمنّا اور سر میں کچھ اور ہی سودا سمایا ہوا تھا۔ فن کسی جامد شئے کا نام نہیں، یہ سکونی نہیں حرکی ہوتا ہے۔ اس کی ہیئت اور ماہیت بدلتی رہتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ فنکار کی ذہنی اور قلبی حالت بھی یکساں نہیں رہتی اور ہر آن چولے بدلتی رہتی ہے۔ اسی اضطرابِ مسلسل سے تحریص اور ترغیب، ترقی اور توسیع کے نئے نئے باب وا ہوتے رہتے ہیں۔ جن کی بدولت "دردو داغ و جستجو و آرزو" کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ فن کی کوئی منزل نہیں ہوتی لیکن فنکار کی ایک منزل ہوتی ہے۔ فن، فنکار کو پیہم حرکت، اضطراب اور مسافت میں رکھتا ہے۔ جس کی کمر ٹوٹ جاتی ہے وہ وقت کے غبار میں گم ہو جاتا ہے۔ جو حوصلہ و ہوس کا نگار خانہ سجائے رکھتا ہے، منزل اس کے قدموں میں رہتی ہے۔ ڈاکٹر ظ۔ انصاری کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ وہ اپنے تیکھے اور سلونے اسلوب کی بدولت رہروِ درماندہ نہیں، رہبرِ منزل تھے۔ ان سے مل کر، انھیں نظروں میں بھر کر، ان کی شخصیت و سیرت کے رنگ اپنے میں جذب کر کے سلام و کلام کا سلیقہ آجاتا۔ انھیں پڑھ کر

ذہن میں بٹھاکر، دل میں اتار کر، لفظوں کی روح ٹٹولنے، نبض دیکھنے اور دودھیا کاغذ پر انھیں جمانے اور سجانے کا ہنر پیدا ہو جاتا تھا۔

ڈاکٹر ظ۔ انصاری سیماب صفت تھے۔ ان کے یہاں یک رنگی نہیں، ہمہ رنگی تھی۔ ان کی پیاس ایک آدھ جام یا ایک ہی طرح کی "گلابی" سے نہیں بجھتی تھی۔ زبان نئی لذتیں تلاش کرتی رہتی۔ وہ کسی ایک مقام پر ٹھہرتے نہیں۔ کسی ایک چیز سے سیری نہیں ہوتی۔ انھیں چلنے کے لئے نئی زمینیں اور اڑان بھرنے کے لئے نئی فضائیں درکار ہوتی ہیں۔ وہ زندگی جینا چاہتے تھے اور بھرپور جینا چاہتے تھے۔ لیکن کہیں نہ کہیں، کوئی نہ کوئی کور کسر رہ جاتی تھی۔ یہی کمی، کھٹک اور کسک بن کر انھیں بے قرار، متحرک اور بیدار رکھتی تھی۔ ایسوں کے آگے دنیا بھی رکھ دیجئے تو ہیچ مقدار ٹھہرے گی۔ اس کے علاوہ ان کی فطری ذہانت اور مطالعے کی وسعت بھی کسی ایک چیز سے لگاؤ پیدا نہیں کرنے دیتی۔ سو وہ کبھی اسے چھوتے اور کبھی ادھر لپکتے تھے۔ وہ اپنی فطرت اور مزاج سے ایسا کرنے پر مجبور تھے۔ اگر ایسا نہ کرتے تو آبگینۂ تندیٔ صہبا سے تڑخ جاتا۔ وہ یقیناً پارے کی سرشت رکھتے تھے۔ مگر اُن کا یہاں وہاں لپکنا اور جھپٹنا کبھی بھی بے مقصد نہیں رہا۔ وہ فائدے کے ساتھ گھاٹے میں بھی رہے لیکن کم۔ صحافت اور ترجمہ، تنقید اور تبصرہ، خطوط نگاری اور مرقع نویسی، ہر جگہ انھوں نے اپنی دھاک جمائی، ساکھ بنائی کہ مارکیٹ میں دھنّا سیٹھوں اور ادب و انشاء کے پارکھوں کے ساتھ ان کا نام لیا جاتا ہے۔ مختلف نثیر بازاروں میں جن کے نام کا سکّہ رواں ہو ایسے لوگ کم ہی ہوتے ہیں۔ ظ۔ انصاری ان میں سے ایک تھے۔

اُن کے دل کی سڑک لمبی تھی، چوڑی تھی اور ڈھلوان بھی۔ جس میں گھماؤ تھے۔ زلفِ بیجاں کے سے۔ اور پیچ پیچ تھے کسی شرابی کی باتوں کی طرح۔ جس پر دورویہ پھول پھل سے لدے، ہرے بھرے سایہ دار پیڑ تھے۔ ٹھارد وپہر میں پگڈنڈی یا گلیارے میں چلنے والے، بھولے بھٹکے، تھکے ماندے راہی جس کی گھنیری چھاؤں میں گھڑی دو گھڑی سستانے بیٹھ جاتے تھے۔ چونکہ اس پر پھسلن بھی بہت رہی اس لئے بعض پھسلے تو زندگی بھر سنبھل نہ سکے۔ یہ سڑک جرنیلی سڑک کی طرح عمر بھر آباد رہی۔ مگر اس پر ان کے بیوی بچوں کی چلت پھرت کم، یاروں، دلداروں، طرحداروں کی چہل قدمی زیادہ نظر آتی ہے۔ بعض جانے انجانے قدموں کی آہٹ کچھ وقفے کے لئے، بعض کی وقفے وقفے سے اور بعض کی اس طرح سنائی دیتی ہے کہ تار ٹوٹنے نہیں پاتا۔ غالب نے عمر بھر ایک ڈومنی کو مار رکھا تھا، انھوں نے نہ جانے کن کن کو!

وہ اس درجہ حسن پسند تھے کہ حسن پرستی کا شائبہ گذرتا تھا ۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی حسن پسندی اور حسن پرستی کے بیچ صرف ایک آدھ بال کا فاصلہ تھا اور اس فاصلے کو عمر بھر برقرار رکھا ۔ البتہ عمر کے آخری دس برسوں میں یہ فاصلہ مٹ گیا تھا ۔ اس میں ان کی حسن پسند بلکہ حسن پرست طبیعت سے زیادہ حالات کا دخل تھا ۔ حالات کا دخل اس لحاظ سے کہ شستشی سے (مرحوم کی دوسری مرافقن اور روسی داں بیوی) ناچاقی کا کوئی کارن تھا اور وہی کارن عائشہ سے (آشا، مرحوم کی آخری روسی داں بیوی جو اُن سے عمر میں کافی چھوٹی ہیں اور حیات ہیں) عشق فرمانے کی وجہ بھی ۔ گمان غالب ہے کہ عائشہ سے عشق بازی بھی شستشی سے تعلّقات کی خرابی کا سبب ہو ۔ بہرحال وجہ کچھ بھی ہو، شستشی سے کشیدگی، شستشی کی خودکشی کا سبب بنی ۔ عائشہ کی طرف کھنچاؤ، شادی، خانہ خرابی تک لے گیا ۔ خانہ خرابی اس اعتبار سے کہ شستشی کے جنیے عقیم حالات کے بہاؤ اور ہوا کی سرگوشیاں سن کر اعلیٰ ڈگری کے حصول کا بہانہ کرکے امریکہ سدھار ے، پہلی بیوی کے جوان بیٹے پہلے سے گریزاں تھے ۔ اب متنفّر ہو گئے ۔ ظ ۔ انصاری اپنی اندرونی تنہائی کو دور کرنے اور زندگی کی لگ بھگ چونسٹھ پینسٹھ بہاریں دیکھنے کے بعد روٹھی ہوئی جوانی کو منانے کے جتن کرنے لگے ۔ اور جوانی بھی کونسی ؟ جوانیِ موعودہ! بوڑھی سانسوں کے بدلے میں خریدی گئی بوڑھی جوانی ۔ خیر چھوڑیئے یہ جوانی دیوانی کی باتیں ۔ ہاں، ذکر تھا رازوں کی پردہ داری کا ۔ مشہور ہے کہ ظ ۔ انصاری نے روس میں ایک خوبصورت، کم سن حسینہ سے شادی کر لی تھی ۔ جسے وہ روسی گورنمنٹ کے قانون کے مطابق انڈیا نہیں لاسکتے تھے ۔ مجبوراً وہیں چھوڑ کر چلے آئے ۔ لیکن مرحوم کا بیان کچھ ایسا تھا کہ اسے تو .K. G. B نے ان کے پیچھے لگا دیا تھا ۔ تاکہ وہ ان کی بات چیت پر، ملنے جلنے والوں پر، چلت پھرت پہ نظر رکھے ۔ خدا جانے، مرحوم جانیں، وہ حسینہ جانے، مسٹر اسداللہ آف برلن جانیں، یا رشین گورنمنٹ کہ یہ بیانِ واقعہ ہے یا افسانہ طرازی کا کوئی دلکش یا حق کُش باب!

ڈاکٹر ظ ۔ انصاری کی پہلی بیوی سے پہلوٹی کے بیٹے خورشید حیدر سے روایت ہے:

"بھائی صاحب کے (ظ ۔ انصاری کے تمام بچّے انھیں بھائی صاحب کہتے تھے) سینے میں ایک بے لچک پتھّر تو نہیں مگر پتھّر سا دل ضرور تھا اور نگاہ تو سر بسر دشمن کی سی ۔ وہ ہمیں پڑھانے لکھانے، تربیت کرنے سے کبھی غافل نہیں رہے ۔ لیکن پڑھانے کے بعد لاتعلّق ہو گئے ۔ البتہ وہ شادی، غمی، تیج تہوار میں، رسم و رہِ دنیا نبھانے یا دنیا کو دکھانے کے لئے چل کے شریک ہو جاتے یا فون پہ اظہارِ خوشی، اظہارِ غم کرکے فرصت پا لیتے تھے ۔ شستشی جی کی (ظ ۔ صاحب کی مرافقن، روسی داں بیوی) خودکشی کے بعد گھر والوں اور گھر ملو پن کی یاد جب بہت بیکل کرتی

تو وہ گھر آکر ہماری امّی، اپنی بہو، پوتے اور ہمارے چھوٹے بھائی انور انصاری سے مِل ملا لیتے یا ہمارے منجھلے بھائی (اطہر انصاری) سے کنیڈا فون کھڑکھڑا کر بات کر کے جی ہلکا کر لیتے۔"

واقعہ یہ ہے کہ ظ۔ انصاری نے اندرونی تنہائی اور بے کلی کو زندگی بھر پالے رکھا۔ ان کے لڑکے جب کمانے، کھانے کھلانے کے قابل ہوئے تو انھوں نے بار ہا چاہا کہ اپنی خدمت گزاریوں سے ان کی آتما کی اداسی کو کچھ کم کریں۔ لڑکوں نے لاکھ التجائیں کیں لیکن انھوں نے کب کسی کی سنی تھی جو اِن کی سنتے۔ سچ تو یہ ہے کہ موت کی اندھی گپھا سے انھیں خاموش بلاوے آنے لگے تھے۔ اور وہ لاشعوری طور پر آہستہ آہستہ کوچ کا سامان کرنے لگے تھے۔ کینسر تو ایک بہانہ بن گیا۔

ظ۔ انصاری کے چھوٹے صاحبزادے انور انصاری بیان کرتے ہیں:

"میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد رہنمائی حاصل کرنے بھائی صاحب کے پاس گیا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ سروس یا کوئی چھوٹا سا ذاتی بزنس۔" کہنے لگے۔ "اب تمہارے انگلی پکڑ کے چلنے کے دن گئے۔ خود ہی طے کرو کہ تمہیں کیا کرنا ہے اور کیا بہتر ہو سکتا ہے۔"

ایک ڈھلتی سی شام ہے۔ ڈاکٹر ظ۔ انصاری اپنی خانقاہِ انصاریہ میں (یونیورسٹی کلب ہاؤس کے دوسرے منزل پر ظ۔ انصاری کا کیبن/آفس) بڑے سے ٹیبل سے لگی کرسی پر براجے ہیں۔ سامنے، پیچھے، نیچے، دائیں بائیں ہر طرف کتابیں ہی کتابیں ہیں، فائلیں ہیں۔ حاضری دینے ہمارے پیر بھائی ندیم صدّیقی پہنچے ہیں اور پیر صاحب (ظ۔ انصاری) کے حضور ایک سچے اور پکّے با ادب عقیدت مند کی طرح ہاتھ باندھے بیٹھے یوں ہمہ تن گوش ہیں گویا حقیقت کے رموز و اسرار سمجھنا چاہتے ہوں یا سمجھ رہے ہوں۔ کرسی پر دونوں آسن جمائے ہوئے ہیں۔ پیری مریدی کے مرحلے طے ہو رہے ہیں۔ کہ ظ۔ انصاری کے بڑے صاحبزادے خورشید حیدر عجز و انکسار، حلم و حیا، کم سخنی، ایثار نفسی کے پیکر، ملنے کے لئے آتے ہیں۔ انھوں نے نئی نئی موٹر بائک خریدی ہے۔ نیا نیا شوق ہے۔ لے کر بمبئی کی ساری سڑکوں پر دوڑاتے رہتے ہیں۔ باپ آخر باپ ہوتا ہے۔ کب تک لاتعلق رہ سکتا ہے۔ جب موقع مِل جاتا خورشید حیدر اور موٹر بائک کو لے کر کوئی تلخ و ترش جملہ تیر سا ان کی زبان سے نکل جاتا اور لگتا جا کے نشانے پر۔ مگر وہ اُف نہ کرتے، سب انگیز کرتے جاتے۔

"اخاہ آپ زندہ ہیں۔ میں روزانہ سویرے اُٹھ کر ٹائمز آف انڈیا میں ٹریفک حادثات کی خبریں پہلے پڑھتا ہوں کہ آپ بیکے صحیح سلامت ہیں یا خدانخواستہ.....!" کرسی سے اٹھتے ہوئے: "I am going

for evening walk & will come bac after half an hour."

"I am here & awaiting" "جی بہتر ہے۔"

سمندر کنارے مونگ پھلی اور ناریل پانی کھا پی کر، سندر سندر مکھڑوں سے آنکھیں سینک کر، دو چار سگریٹ راکھ کر کے، جان پہچان والوں سے علیک سلیک، ہیلو ہائے، گڈ بائے، باتوں کے ہیرے موتی لٹانے کے بعد جب لوٹے تو پونے دو گھنٹے بیت چکے تھے۔ اور خورشید حیدر جہاں بیٹھے تھے وہیں انتظار کی مورت بنے ملے۔

"ارے آپ بیٹھے ہیں۔ ہم تو سمجھے چلے گئے ہوں گے۔" (چھوٹا ہو کر بڑا، وہ ہر ایک سے آپ جناب سے بات کرتے تھے۔ بہت کم دیکھنے میں آیا کہ وہ آپ سے تم پر آئے ہوں)

"آپ کا حکم تھا چلے کیسے جاتے۔ اور جب پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ہم بغیر اجازت چلے گئے ہوں تو آج کیسے جا سکتے تھے۔"

"ہاں تو اب جا سکتے ہیں۔ جائیے خدا حافظ!"

دن بھر کی تھکن اور پونے دو گھنٹے کے انتظار کی بوریت سے چور خورشید حیدر اپنا پاؤچ اٹھاتے ہوئے:

"خدا حافظ!!"

ڈاکٹر ظ۔ انصاری جیسے صاحبِ نظر اپنے گرد و پیش کے منظر، نام اور مقام سے باخبر کبھی کبھی امیروں کبیروں، وزیروں کی صحبتوں میں اس قدر با ادب دکھائی دیتے تھے کہ لوگ باگ سوچ میں پڑ جاتے کہ آخر سبب کیا ہے؟ دراصل تعلقات کے زینے اور سماجی مرتبے اہلِ علم، اہلِ قلم، اہلِ نظر کے قد کا پیمانہ نہیں ہوتے۔ اصل پیمانہ ان کی بے نیازی ہوتی ہے۔ جس سے ان کے اقبال اور عظمت کا ستارہ روشن رہتا ہے۔ دنیوی درجے اور عہدے خود چل کے اُن کے پاس آتے ہیں۔ بھلا کنوئیں کو کسی نے پیاسے کے پاس جاتے دیکھا ہے؟ لیکن ایک مرتبہ کسی چیز کا چسکا لگ گیا تو پھر "چھٹتی نہیں ہے منھ سے یہ کافر لگی ہوئی"۔ مناصب اور مراتب کی ہوس کے سوا اور بھی بہت سی ان کی "ہوسیں" تھیں۔ دولت کی ہوس، شہرت کی ہوس، عورت کی ہوس، بولنے کی ہوس، سیر سپاٹے کی ہوس، قیمتی اور صاف ستھرے کپڑوں کی ہوس، زیادہ لکھنے کی ہوس، علم کی ہوس، حیثیت سے زیادہ بڑے گھر کی ہوس، غرض ہوس ہی ہوس، جس کا کوئی اور چھور نہ تھا۔ جب ہوس شدید ہو اور ڈھیر ساری تو پھر دل کی کلی مرجھا جاتی ہے اور بے کلی جان سے جونک کی طرح چمٹ کر گلی گلی، گاؤں گاؤں شہر در شہر بھٹکاتی ہے۔ ظ۔ انصاری بھی پہلے فلیٹ کی تمنا لئے اور بعد میں اپنے ہوادار اور کشادہ فلیٹ سے

نکل کے دُھلے دُھلائے نفیس کپڑے زیب تن کئے، جیبوں میں روپے بھرے اور بینکوں میں دھرے، جیبیں خریدتے من بہلاتے، شہرت کی گٹھڑی لئے، حسن کے اوراق الٹتے پلٹتے، رتجگے کرتے، شہروں شہروں، ملکوں ملکوں، کچھ اور کی طلب لئے، خوب سے خوب تر کی جستجو میں ناکام وشاد کام زمینیں ناپتے رہے۔ بالآخر کہیں نہ کہیں تو تھمنا تھا، گردِ سفر جھاڑنی تھی، برسوں کی تھکن اتارنی تھی۔ سو جس طرح ۶ رفروری ۱۹۲۵ء کو اس دنیا میں روتے بسورتے آئے تھے، ۳۱رفروری ۱۹۹۰ء کو اسی دنیا سے، اپنی بیویوں، بہو بیٹوں، یاروں اور غمگساروں کو روتا بلکتا چھوڑ کر ڈھائی فٹ گہری زمین میں جا سوئے۔

وہ زندگی بھر جوجھتے اور لوہا لیتے رہے، کبھی اردو کی حمایت میں ڈاکٹر راہی معصوم رضا اور کملیشور سے، کبھی سخت گیر مولویوں سے، مولویوں کے بھیس میں پڑے ہوئے جذباتی افراد سے، اپنے ہم نوالہ و ہم پیالہ فنکاروں سے اور کبھی اپنے رفقائے کار سے، آخر کار مسلسل چھ ماہ ایذا پہنچانے اور قبر کے قریب لا کر کھڑا کرنے والے مرض سے۔ اور لگاتار ایک ہفتہ بستر مرگ پر ایڑیاں رگڑتے، موت سے لڑتے لڑتے ایک جھٹکے میں سانسوں کے سارے تار اور وجود کی ساری طنابیں توڑ دیں کہ لو اب تو خوش ہو خس کم، جہاں پاک!

خون پسینہ ایک کر کے، قلم کو خوب گھس کے، کاغذ کو سیاہی سے رنگ کے، زبان سے لفظوں کے موتی رول کے، کتابوں پر دیدے ٹپکا کے، راتوں کو آنکھوں میں کاٹ کے، غرض سو جتن سے دولت کمائی اور اس کی اہمیت جانی۔ سو کسی عیاش کی طرح یا مالِ مفت دلِ بے رحم کی طرح لٹائی نہیں بلکہ بینک بیلنس بڑھایا جو بعد از موت پہلی اور بوڑھی بیوی اور ان کے بچوں کے کم اور شاید آخری بیوی کے زیادہ کام آ رہا ہوگا۔ "آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔" بہر حال جو ہونا ہے سو ہو کے رہے گا۔ ہونی کو کون ٹال سکتا ہے! ان کے مزاج میں رنگینی تھی لیکن بڑے دکھ جھیلے تھے۔ مولوی کا کورس کیا تھا اور کورس کے دوران ہی اپنی اٹھان اور اونچی اڑان دیکھ کر بھانپ گئے تھے کہ یہ مولوی ملاؤں کا ذکر و زاری، تسبیح ہزاری، نری خشک اور پابندیِ آداب کی دنیا میرے کام نہیں۔ یہاں عبا، عمامے اور حجرے میں دم گھٹ کے رہ جائے گا۔ آزادی پسند طبیعت آزادی کے راستے پر لگ گئی۔ دلّی پہنچے، کمیونزم سے اپنا رشتہ استوار کیا۔ کمیونسٹ پارٹی کے آرگن سے جُڑ گئے۔ پھر بمبئی وارد ہوئے، "کمیون" میں رہے اور وہ کرسی ملی جسے چھوڑ کر سبطِ حسن گئے تھے۔ یہاں پیسوں کے نام پر اتنا مل جاتا تھا کہ زندگی کی گاڑی کسی طرح چلتی رہے۔ غرض اس زمانے میں زندگی مختلف مرحلوں سے گزرتی اور مختلف اخباروں سے رشتہ جوڑتی اور ناتا توڑتی رہی۔ بمبئی کے ایک اخبار کا دفتر جو اُن کا گھر بھی ہے، پیغمبری کے دور سے گزر رہے ہیں۔ انڈے

والے سے انڈے، ڈبل روٹی والے سے بریڈ اُدھار لیا، وہیں دفتر میں فرائی کیا، پان بیڑی والے سے قرض کی سگریٹ لی، دھواں دھکڑ کے بعد وہیں دفتر میں لپٹا ہوا بستر کھلا، ٹانگیں پھیلائیں، چادر تان کے سو رہے۔ صبح ہوئی تو پھر وہی خیر، دفتر اور لوح و قلم کا چکّر۔ ظاہر ہے اتنی ساری صعوبتیں اٹھانے کے بعد اچھّے وقتوں میں عقلمند لوگ اللّے تللّے نہیں کرتے۔ رئیسانہ مزاج کے باوجود کفایت شعاری سے، بہت نہ سہی تو تھوڑا کل کے واسطے بچا کے، پس انداز کر کے رکھ لیتے ہیں۔ وقت کا کیا بھروسہ، کب بدل جائے ؎

زمانے کے ہاتھوں سے چارا نہیں ہے زمانہ ہمارا تمہارا نہیں ہے

ظ۔ انصاری بلا کے کفایت شعار تھے۔ ظاہر ہے جب کفایت شعاری بلا کی ہو تو کبھی کبھی بخیلی میں بدل جاتی ہے۔ ان کی حد سے بڑھی ہوئی کفایت شعاری پر کنجوسی کا دھوکا ہوتا تھا۔ وہ خرچیلے نہ تھے پر کم خرچ بھی نہ تھے۔ اکثر یہ دیکھا گیا کہ مہینے کے آخری دنوں میں ان کی جیب ساتھ نہیں دے پاتی تھی۔ لہٰذا اُدھار لینے میں بھی عار محسوس نہیں کرتے تھے۔ لیکن بینک میں جمع شدہ رقم میں سے کچھ نکالنا اس وقت تک ضروری نہیں سمجھتے تھے جب تک کوئی بڑا اہم اور ضروری کام نہ آ پڑے۔

گائے کے گھی جیسے دن پر شفق کا رنگ حاوی ہونے لگا ہے۔ ڈاکٹر ظ۔ انصاری یونیورسٹی کلب ہاؤس کی دوسری منزل پر اپنے کمرے میں کرسی پر بیٹھے ہیں۔ ٹیبل پر کہنیاں ٹکی ہوئی ہیں۔ چہرہ ہاتھوں کے کٹوروں میں دھرا ہوا ہے۔ ہونٹوں کے بیچ سگریٹ پھنسی ہوئی ہے، جس سے اٹھتی ہوئی دھوئیں کی ٹیڑھی ٹیڑھی لکیر ایک بالشت بھر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد فضا میں تحلیل ہوتی جاتی ہے، اور کبھی یہی دھواں ان کے ہند روسی نقوش کے گرد پھیل کر حسن، بزرگی، رعب، علم اور آگہی کا ملا جلا ایک عجب خوشگوار سا تاثر پیدا کر رہا ہے۔ سامنے میز پر پلیٹو کی "ریپبلک" (REPUBLIC) رکھی ہے اور نگاہیں اس پر جمی ہوئی ہیں۔ میری آنکھوں میں ان کے علمی خشوع و خضوع کے ایسے نہ جانے کتنے منظر بسے ہوئے ہیں۔ بار بار کے تجربوں نے مجھے سکھا دیا ہے کہ علمی استغراق کے ان لمحوں میں کسی کی آمد پر وہ ظاہراً خوشی کا اظہار تو کرتے ہیں لیکن اندرونی طور پر بیشتر اُن کا پارہ چڑھ جاتا ہے۔ میں چپکے سے جا کر ایک کرسی سے چپک جاتا ہوں۔ لب سئے بیٹھا ہوں۔ وہ میرے پہنچنے سے باخبر ہو چکے ہیں۔ مگر ابھی تو افلاطون کے ذہنی ہم سفر بنے ہوئے ہیں، مجھ جیسے کم سواد کی سطح تک آتے آتے وقت لگے گا۔ میں "نقوش" کے ادبی معرکے نمبر میں کھو گیا اور اس وقت چونکا جب ان کی آواز ابھری:

"اچھا تو آپ آگئے! آج میں گھڑی میں چابی دینا بھول گیا، سو بند ہو گئی، آپ کی گھڑی میں کیا وقت ہوا ہے؟"

"میرے پاس تو گھڑی ہے نہیں، میں جو نادار اور بیکار ٹھہرا۔ ڈاکٹر حامد اللہ ندوی سے معلوم کر کے بتاتا ہوں۔"

"سوا پانچ بجے ہیں۔"

"تو چلئے SEA SHORE پر چہل قدمی کرتے ہیں"۔

"چلئے۔"

"آیئے سامنے سے ماچس لے لیں۔ سگریٹ کی طلب بڑی دیر سے پریشان کئے ہوئے ہے اور ماچس ختم ہوگئی ہے"۔

"ایک ماچس دیدو۔" (پندرہ پیسے بڑھاتے ہوئے کہا)

"صاب! ماچس بیس پیسے کا ہوگیا ہے۔"

"ابھی پرسوں تو تم نے پندرہ پیسے میں دی تھی۔ آج بیس پیسے کی کیسے ہوگئی؟"

"صاب! ریٹ بڑھ گیا ہے۔ ہم کیا کرے گا۔"

"نہیں نہیں۔ تم نے بڑھا دیا ہے۔ کل ہم نے چرچ گیٹ اسٹیشن کے سامنے، سنگار ہوٹل کے پاس کی دوکان سے پندرہ پیسے میں خریدی تھی۔ تم ہم سے پانچ پیسے زیادہ لے رہے ہو۔ یہ لو اپنی بیس پیسے والی ماچس۔ ہم پندرہ پیسے والی ماچس خریدیں گے اور کل تمہیں لا کے بتائیں گے۔"

"آیئے چلیں اسٹیشن کی طرف اور وہاں سے سمندر کنارے چلیں گے۔"

"ایک ماچس دینا۔" (پندرہ پیسے بڑھاتے ہوئے)

"یس سر! یہ آپ کا ماچس۔ پر سر! اب ماچس کا دام بڑھنے والا ہے۔"

"ارے بھائی! بجٹ تو مارچ میں آتا ہے۔ اس وقت تو چیزوں کے دام بڑھ چکے ہیں۔ اب کیوں بڑھا رہے ہو؟"

"وہ سر! اپن کو کیا معلوم۔ پیچھے مہنگا ملتا ہے تو مہنگا بیچتا ہے۔ اپن گھر میں تو ماچس اگاتا نئیں۔"

"تم دام بڑھاتے ہو تو گورنمنٹ سے کہو ہماری تنخواہ بھی تو بڑھائے۔"

"سر! وہ بڑا بڑا لوگ اندرا بائی کو بولتا ہے تو سنتا نئیں تو اپن کی کیا سنے گا؟"

"دیکھا آپ نے (مزید پانچ پیسے دیکر ماچس اٹھاتے اور مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے) ہمارا اپنے اسکیل حکومت کی مہربانی سے جتنا بھی بڑھا ہے، مہنگائی اتنی ہی تیزی سے آگے بڑھتی جارہی ہے۔ بھلا بتلائیے یہ کوئی بات ہے کہ پانچ پیسے ایک ماچس پر بڑھ گئے۔ میں جتنی ماچس استعمال نہیں کرتا اس سے زیادہ کھو دیتا ہوں۔ اس طرح ہر مہینے میں یومیہ ایک ماچس کا اوسط بیٹھتا ہے۔ یعنی ڈیڑھ روپے مہینے کا خرچ بڑھ

گیا۔ بھی لغنگی کہیں کی کانگریس گورنمنٹ"۔

میں نے انھیں چھیڑتے ہوئے کہا:

"ڈاکٹر صاحب! آج آپ کانگریس کو بُرا بھلا کہہ رہے ہیں، ایمرجنسی کے زمانے میں بھلا کوئی جرأت کرسکتا تھا؟"

(لمبی سانس لیتے اور سینہ پھلاتے ہوئے) "میاں، یہ ظ۔ انصاری اس دور میں بھی خاموش کہاں بیٹھا تھا۔ ساری ہمدردیاں ان مظلوموں کے ساتھ تھیں جن پر ایمرجنسی کا پہاڑ ٹوٹا، جو سلاخوں کے پیچھے سڑنے اور گھلنے کے لیے ڈال دئیے گئے تھے۔ مجھے جب موقع ملا میں نے کبھی ڈھکے چھپے، کبھی کھلے ڈلے اس کا اظہار کیا۔ کیا آپ رسالہ "گگن" کے "ہندوستانی مسلمان نمبر" کی رسمِ اجراء کا منظر بھول گئے کہ میری آواز سے لوگوں کا کلیجہ دہل گیا تھا۔ میری للکار پر لوگ بغلیں جھانکنے لگے تھے اور وہ بیچارے "گگن" کے ایڈیٹر شمس کنول کی کیا حالت ہوئی تھی بھول گئے کیا؟ یاد رکھئے! حاکمِ وقت کے خلاف لب نہ کھولنا، سینہ سپر نہ ہونا اتنا ہی بڑا جرم ہے جتنا کہ ظلم کا روا رکھنا۔ جناب! اگر مجھے گرفتار کیا جاتا تو میں اپنی کھال کھنچوانے اور ہڈیاں تڑوانے کے لئے تیار تھا۔ امن اور ارتقاء کی دیوی قربانی چاہتی ہے۔ ڈھیر سارا خون پسینہ طلب کرتی ہے۔ سولھویں صدی کے فرانس میں آزادی پسندوں اور نئی روشنی کے متوالوں پر کیا کیا بیتی، تاریخ چپ نہیں ہے، سب کچھ بتاتی ہے۔ ایک ایک واقعے کی تفصیل، ایک ایک کردار کی نقل و حرکت اور عمل۔ روس میں زار شاہی کے دور میں پشکن، اس کے ہم مشرب اور ہم سفروں کو عذاب و عتاب کے کن کن جہنموں سے گزرنا پڑا۔ روسی تاریخ کا ہر طالب علم، روسی ادب کا ہر قاری یہ سب کچھ جانتا ہے۔ یہاں جب زار شاہی اور پشکن کی بات آئی ہے تو دنیا کے پہلے نفسیاتی فلسفی ناول نگار دستوئیفسکی کا ذکر بھی لازمی ہے۔ زنجیروں کے نشان عمر بھر اس کے بدن پر رہے۔ راولپنڈی سازش کیس کے سلسلے میں بنے بھائی (سجاد ظہیر) اور فیض احمد فیضؔ کی گرفتاری بھی......"

"لیکن ظ۔ صاحب! آپ، بلراج ساہنی، مجروح سلطانپوری وغیرہ جب کمیونسٹ ہونے کے جرم میں، جواہر لال نہرو کے دورِ اقتدار میں گرفتار ہوئے تھے تو آپ اور بلراج معافی نامہ لکھ کر کیوں اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر چلے آئے تھے؟"

"ہماری گرفتاری اور پھر رہائی کے سلسلے میں مجروح نے بڑی بدگمانیاں پیدا کی ہیں؟"

"لیکن وہ دھڑلے سے یہ سارا ماجرا بیان کرتے ہیں اور آپ کی کھلّی اڑاتے ہیں۔ آپ اصل صورتِ واقعہ

سے پریس کے ذریعے لوگوں کی بدگمانی کو کیوں نہیں دور کر دیتے؟"

(ایک ٹھنڈی آہ بھر کر) "ہاں۔ سمجھاؤ اچھا ہے۔ دیکھوں گا۔"

اس گفتگو کے بعد کم و بیش دس سال ظ۔ انصاری جئے۔ لیکن مجروح سلطانپوری کے بیانات کی تردید نہیں کی۔ تردید نہ کرنے کی وجہ؟ — اس طرح کے نہ جانے کتنے راز ہیں جن پر بڑی بڑی، موٹی موٹی چادریں پڑی ہوتی ہیں۔ خدانخواستہ اگر کہیں سے کوئی چادر سرک گئی، راز جھانکنے لگے تو اوّل ظ۔ انصاری نے پھر سے چادر ڈالنے کی کوشش کی۔ کوشش میں ناکامیاب رہے تو اپنی چرب زبانی اور افسانہ طرازی سے اُسے کچھ کا کچھ بنا دیا۔

شمس کنول صاحب نے اپنے مکان پر (علی گڑھ) مجھ سے بیان کیا:

"سکندر علی وجد نے بمبئی میں کئی لوگوں کی موجودگی میں کہا تھا کہ جتنا بڑا جھوٹ ہو ظ۔ انصاری اُسے اتنا ہی بڑا سچ بنا کر پیش کر سکتے ہیں۔"

بمبئی یونیورسٹی کے کانووکیشن ہال میں ایک سیمینار ہے۔ سردار جعفری اپنا افتتاحی مقالہ کرشن چندر کی کہانی "کالو بھنگی" پر پڑھنے والے ہیں۔ راجندر سنگھ بیدی پر اسی صفحات کا مقالہ لے کر احمد آباد سے وارث علوی شرکت کرنے پہنچے ہیں۔ سردار جعفری کا عالمانہ مقالہ غور و فکر کے نئے زاویے دے جاتا ہے۔ وارث علوی چند صفحے سنا کر بیدی کے فکر و فن پر ایک طول طویل تقریر کرتے ہیں۔ ظ۔ انصاری پہلی صف میں بیٹھے اندر ہی اندر کھول رہے ہیں۔ سیمینار ختم ہوتا ہے تو اکھڑے اکھڑے سے ہیں۔ ان کے ایک مدّاح ان کے دل کی بات شاید چہرے پر پڑھ کر کہتے ہیں:

"ظ۔ صاحب! جعفری اور علوی صاحبان دونوں تحریر اور تقریر کے سورما ہیں۔ حوالوں کے دھنی ہیں۔ جعفری صاحب کا مقالہ فکر انگیز اور اثر کرنے والا تھا۔ اور علوی صاحب کی تقریر بھی معلوماتی اور دل پذیر۔ اگر آپ کی بھی اس میں کسی نہ کسی حیثیت سے شمولیت ہوتی تو کیا بات تھی؟"

"ظ" ایک سرد آہ کھینچتے ہوئے بولے: "بھائی ہمیں کون پوچھتا ہے۔ جبکہ آج کے پروگرام کے شرکاء، سامعین اور منتظمین میں سے کسی نے بھی کرشن چندر پر اتنا نہیں لکھا جتنا میں نے۔ کرشن پر میں نے دو بھرپور تنقیدی مضامین اور دو مضمون نما خاکے تحریر کئے ہیں۔ یہاں تو معاملہ یہ ہے کہ آپ ہماری ڈفلی بجائیں ہم آپ کا گن گان کریں گے۔"

وہ یونیورسٹی کے کانووکیشن ہال سے نکل کر جب چرچ گیٹ جانے والی کشادہ اور ہوادار سڑک پر ہولئے

دودھ کی کیتلی اٹھا کے دھار بناتے ہوئے۔ "بتائیے کتنا؟" میں چپ سادھے بیٹھا ہوں اور کپ میں دودھ گرنے کی آواز سنائی دے رہی ہے۔

"میاں بولئے بھی اور بابس؟" کپ چھلکنے کو ہے۔ دودھ کی دھار پتلی ہوتی جارہی ہے۔

"ڈاکٹر صاحب! بس بس!!"

"میاں آپ نہ کہتے تو دودھ کی دھار جب تک بے دھار نہ ہو جاتی ہم بند نہ کرتے۔ دیکھئے اب اس میں چائے کہاں ہے۔ دودھ ہی دودھ ہے۔ خوب اوٹائے ہوئے دودھ کی رنگت کا۔"

میں کہتا کچھ نہیں، مسکرائے جاتا ہوں۔ میری مسکراہٹ کا مضمون بھانپتے ہوئے کہتے ہیں۔

"یہ چائے ہے کہ سیّال حلوہ۔ انگریز تو اس چائے کو دیکھ کر پکار اٹھے LET ME DIE اور چائے کی پہلی چسکی لیتے ہی۔

"ہائے۔ آپ نے ہمیں باتوں میں الجھائے رکھا۔ کمبخت چائے، پانی ہو گئی۔ گرٹال کا دھوون لگ رہی ہے۔"

"ڈاکٹر صاحب! یہ تو لائٹ چائے ہے۔ گرٹال کا دھوون اس سے کہیں مزیدار ہوتا ہے۔"

"ہاں ہاں کیوں نہیں اور ہمیں باتوں میں لگائے رکھئے اور سارا دودھ انڈیلوا لیجئے۔"

"کیا کروں ڈاکٹر صاحب! میں کالج میں پڑھتا ہوں، روزی روٹی کے نام پر چند ٹیوشن ہیں، ایک غریب دوست کی "کھولی کے کانے دل" میں کرائے پر رہتا ہوں، بسی میں کھاتا ہوں، ناشتہ کبھی جڑتا ہے اور کبھی نہیں۔ دودھ تو میری زندگی سے یوں دور ہے جیسے غریب کی جھونپڑی سے سویرا۔"

میں نے یہ ساری باتیں مزاح کے طور پر کہی تھیں۔ مگر وہ ایک سرد آہ بھر کر کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گئے۔ پھر فرمایا۔ "ایسا کیجئے، روزانہ آپ کے پاؤ لیٹر دودھ کے پیسے ہمارے ذمّے۔"

میں نے پھر مزاح کے انداز میں عرض کیا۔ "ناشتے میں صرف دودھ سے کام تھوڑے ہی چلتا ہے۔"

وہ ڈر گئے کہ یہ تو ہنسی ہنسی میں ناشتے کا سارا بوجھ مجھ پر ڈالے دے رہا ہے۔ پھر اپنی مدد آپ کی اہمیت پر وہ لچھے دار اور جوشیلی تقریر کی کہ بازوؤں میں طاقت کی بجلیاں کوندنے لگیں، سینہ حوصلے سے بھر گیا، جسم فولادی سا لگنے لگا۔ چو طرفہ دودھ کی ندیاں بہتی، بلکہ رہے لیتی نظر آنے لگیں۔

روزنامہ "انقلاب" (بمبئی) کے دفتر میں ظ۔ انصاری اپنے کیبن میں بیٹھے ہیں۔ میں دروازے پر آہستہ سے ناک (KNOCK) کرتا ہوں۔ اندر سے وہ دھیمے سُروں میں کھینچتے ہوئے بولتے ہیں۔ "تشریف لائیے۔"

دروازہ کھول کر اندر قدم دھرتے ہوئے میں نے کہا: "آداب!"

"آداب! آداب!! بیٹھئے۔ میں دن بھر جھبتا رہا، اڈی ٹوریل نہیں سوجھا۔ گھنٹہ بھر پہلے سوجھا تو ایک اچھوتے ٹاپک پر۔ بس ختم ہوا چاہتا ہے، پھر آپ سے باتیں بھی ہونگی اور چائے کی چسکی بھی لی جائے گی۔"

پھر لکھنے میں کھو جاتے ہیں۔ اداریہ مکمل ہونے کے بعد نوک پلک سنوار رہے ہیں کہ ادارتی عملے کے ایک رکن "سانحۂ ارتحال" کا مراسلہ لے کر حاضر ہوتے ہیں۔ مراسلہ اپنے ہاتھ میں تھام کر پڑھتے ہیں۔

"میاں! ہم ان کے انتقال پر اپنے گہرے رنج و ملال کا اظہار کرتے ہیں۔ مرحوم کے پسماندگان کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ یہاں تک سب ٹھیک ٹھاک ہے۔ لیکن خدائے تعالیٰ انھیں جنّت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ اس کی کیا ضرورت؟ اللہ میاں تو بصیر و خبیر، رحیم و کریم بلکہ رحمان ہیں۔ وہ آپ کی سفارش پر انھیں جنّت اور وہ بھی جنّت الفردوس کا داخلہ پاس تھوڑے ہی دیں گے۔ وہاں نیتیں پرکھی جائیں گی اعمال تولے جائیں گے۔"

میں نے عرض کیا۔ "ڈاکٹر صاحب! آپ نے ابھی ابھی اللہ میاں کے تعلق سے جو کچھ فرمایا۔ کل اسے آپ کے عقیدے کے سلسلے میں سند کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔"

وہ سمجھ گئے کہ میں کہاں سے بات کر رہا ہوں۔ مجھے کنکھیوں سے دیکھا اور مسکرانے لگے۔

روزنامہ "انقلاب" (بمبئی) کی ایڈیٹری کے دوران اکثر مجھے ترغیب دیتے کہ میاں، آپ ڈگری کالج میں تو فل ٹائم سروس کر رہے ہیں۔ فیچر رائٹر کی حیثیت سے پارٹ ٹائم "انقلاب" جوائن کر لیجئے۔ مالی اور قلمی دونوں فائدے ہوں گے۔ میں ٹالنے کے لئے کہتا کہ سوچوں گا اور بات آئی گئی ہو جاتی۔ جب کبھی مہینے دو مہینے میں نظیٹ آفس یا کسی پروگرام میں ملاقات ہوتی وہ موقع نکال کر پھر مجھے "انقلاب" سے جز وقتی طور پر منسلک ہو جانے پر اکساتے کہ دیکھئے جناب! ابھی آپ کو گھر اور گھر والی دونوں کا انتظام کرنا ہے۔ آپ کی کوئی بیکنگ (BACKING) بھی نہیں ہے۔ جو کرنا ہے سو اپنے بل بوتے پر کرنا ہے۔ اس لئے کمائیے زیادہ، خرچ کم کیجئے۔ ورنہ کنوارے ہی رہ جائیں گے۔ نہ گھر ہو پائے گا نہ بیوی۔ اب آپ برسرِ روزگار ہیں، بہت ہو چکی خانہ بدوشوں کی سی زندگی، گھر بسائیے، گھریلو زندگی کی بسم اللہ کیجئے۔

ایک روز جوں ہی انھوں نے یہ قصّہ چھیڑا، میں نے کہا کہ آپ جہاں بھی رہے، استغفیٰ بغل میں رہا۔

ڈاکٹر صاحب! آپ ذرا یہ بتا دیں کہ کب تک "انقلاب" میں جمے رہیں گے؟

سنتے ہی پہلو بدلتے ہوئے قلم میز پر رکھ دیا۔ چشمہ اتار کر ایک لمحے کے لئے میرے چہرے پر بہت دور تک دیکھنے والی آنکھوں کی ٹارچ ماری اور کہیں سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر مڑی تڑی سی سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبائی اور ماچس تلاشنے لگے۔ وہ نہ ملی تو زچ ہو کر ہونٹوں میں دبی سگریٹ میز کی دراز میں رکھ دی اور میرے چہرے کو اپنی سوچتی آنکھوں کے ہالے میں لیتے ہوئے زور دے کر آہستہ آہستہ صرف اتنا کہا:

"آپ سچ کہتے ہیں، ہم کب تک یہاں ٹکیں گے، اللہ میاں کو خبر ہو تو ہو، ہمیں نہیں ہے"۔

اس کے بعد پھر کبھی انھوں نے "انقلاب" سے وابستہ ہونے کے لئے نہیں کہا۔

ایک دن کی بات ہے۔ وہی انقلاب کا دفتر، وہی مدیر، وہی مدیر کا کیبن۔ میں بعد آداب کے ٹیبل کے قریب جا کھڑا ہوا۔ چند ثانیوں کے بعد انھوں نے لکھتے لکھتے شفقت بھرے غصّے سے کہا:

"کیا جب ہم یہ کہیں کہ جنابِ عالی، تشریف رکھئے، تو آپ بیٹھیں گے؟"

میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ دو منٹ بعد ایک لکھا ہوا کھرا میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے ایک مرتبہ پڑھا، دو مرتبہ پڑھا، تیسری مرتبہ پڑھنے جا رہا تھا کہ ہاتھ سے کاغذ لیتے ہوئے لب کھولے۔

"لائیے لائیے! آپ نظر لگا دیں گے۔ یہ حرف جب پکّی سیاہی میں چھپیں تو قیمت آنکیے گا"۔

میں نے مسکراتے ہوئے چند لفظ کہے جن میں تعریف کم مرعوبیت زیادہ تھی۔ پھر ایک ٹھنڈی آہ بھر کر فرمانے لگے۔

"اگر یہ لفظ ارون شوری اور گری لال جین لکھیں تو ان کی پیٹھ تھپتھپائی جائے، اور نیچے دام ملیں۔ اگر یہی لفظ خشونت سنگھ کے قلم سے ٹپکیں تو سونے میں تلیں۔ مگر اپنی اس ذلیل زبان کے ذلیل ادیب و صحافی کے ان شبدوں کی قیمت کیا آنکیں گے یہ اردو کے سودو زیاں والے جو کھل کر سر اٹھانا بھی نہیں کر سکتے"۔

"آپ یہ سونے میں تلنے اور قیمت آنکنے کی بات کیوں کرتے ہیں؟ فن کار کو تو تن ڈھانکنے کے لئے دو جوڑے کپڑے اور دو وقت کی روٹی چاہئے۔ بس! جب پیٹ بھرا ہوگا تو ادب کہاں سے سوجھے گا، بے ادبی سوجھے گی"۔

ہلکا سا قہقہہ بلند کرتے ہوئے "بھئی یہاں ادب اور بے ادبی کا استعمال بھلا لگا۔ ویسے نہ میں اتر میے نہ تمہاری بات پوری پوری سچ ہے اور نہ آپ کی صد فی صد درست، مگر ففٹی پرسنٹ سچائی ہے دونوں کی باتوں میں ؎

نہ تم جیتے، نہ میں ہارا
چلتے ہیں، چل کے کھائیں کھاجا"

اُسی زمانے میں ایک لطیفہ ہوا۔ وہ اپنے کیبن میں براجمان تھے۔ میں پہنچا۔ بڑے شگفتہ موڈ میں تھے۔ چائے والا چائے لے کر آیا تو اس سے پوچھا:

"کیوں میاں اڈی ٹوریل پڑھا؟"

وہ بے چارہ جواب نہیں دیتا۔ کچھ ڈرا ڈرا سا سوالیہ نگاہوں سے کبھی مجھے اور کبھی ظ۔ انصاری کو تکے جا رہا ہے۔ پھر سوال کرتے ہیں۔

"ارے میاں ہم پوچھتے ہیں کہ ہمارا آج کا اڈی ٹوریل پڑھا؟"

وہ اپنے حواس مجتمع کر کے جواب دیتا ہے۔

"ہم کا جانی ہڈی ٹھوریل کا ہوت ہے؟"

"کیوں! تم پڑھنا نہیں جانتے؟"

"صاحب! پڑھے ہوئت تو کاہے چہیا کری دوکینہ ماں نوکری کرت۔ ہم ہو سسر کونی جگہیہ، کوتوالیس کرسب بیٹھے ہوئت۔"

وہ تو اُن کا موڈ چوپٹ کر کے چلتا بنا۔ ہندوستان اور دنیا کے پسماندہ ممالک میں ناخواندگی پر سارا لیکچر مع اعداد و شمار مجھے سننا پڑا۔ میری معلومات میں اضافہ تو یقیناً ہوا مگر کل چھیالیس منٹ کا لیکچر ایک عدد چائے کے بدلے مہنگا پڑا۔ اس لئے کہ معمول کے خلاف لیکچر میں شیریں بیانی کے بجائے جھلاّہٹ زیادہ تھی۔

اکثر لوگوں کی زبانی میں نے سنا کہ وہ بے فیض آدمی تھے۔ میں دور نہیں جاتا، اسی شہر بمبئی میں ایسے لوگ موجود ہیں جن کی ہستی کا دیا ان کے شعلے سے روشن ہے، ورنہ اماوس کی رات ہو گئے ہوتے۔ اپنا ذکر اچھا نہیں معلوم ہوتا مگر یہ اعتراف ضروری ہے کہ مجھے بھی انھوں نے بار بار روشنی کا غسل دیا۔ ان کی شاباشیاں، دلداریاں اور دلاسے نہ ہوتے تو کیا عجب کہ محرومیوں کے اندھے غار میں مر گیا ہوتا۔ میں کالج میں پڑھتا تھا۔ فٹ پاتھیوں کا سا جیون تھا۔ کہیں نہا دھو لیا، کہیں کسی طرح کھا پی لیا، جب جیسے جہاں موقع ملا فرش کو گدہ، ٹری، چھت یا آسمان کو کملی بنا کر سو رہا۔ اُن سے یہ باتیں ڈھکی چھپی نہ تھیں۔ ایک روز شام کے قریب ان کے پاس پہنچا۔ کہنے لگے کہ آپ کے لئے ایک ٹیوشن کا انتظام کیا ہے۔ یونس سلیم صاحب دلّی والے کے ایک کروڑپتی دوست کارٹر روڈ (باندرہ) پر رہتے ہیں۔ ان کے صاحبزادے گریجویشن کر رہے ہیں۔ انھیں اردو پڑھانی ہے۔ اب آپ کا رہنا، کھانا پینا وہیں ہوگا۔ پیسے بھی معقول دیں گے۔ آپ کی تعلیم بھی جاری رہے گی۔ البتہ وہاں یہ بتائیے گا کہ آپ ایم۔ اے کر چکے ہیں۔

پی۔ایچ۔ڈی کر رہے ہیں اور سروس کی تلاش جاری ہے۔ پتہ دیتے ہوئے کہا:

"کل پہنچ جائیے اور فقیری میں امیری کی شان پیدا کیجئے۔"

کارٹر روڈ (باندرہ) کے اسی بنگلے میں فون آتا ہے۔

"دہلی سے خلیق انجم (انجم) آئے ہوئے ہیں۔ کل انجمن ترقی اردو (مہاراشٹرا) کی تشکیلِ نو ہوگی۔ ہو سکے تو ابھی چلے آئیے۔ اسی سلسلے میں کچھ باتیں کرنی ہیں۔ ہم آپ کے نوجوان کندھوں پر اس کا بار ڈالنا چاہتے ہیں اگر ممکن ہو سکا تو۔"

"ڈاکٹر صاحب! عصر کا وقت ہو چکا ہے۔ روزہ افطار کے بعد میں آؤں گا۔"

"آپ کیا روزے سے ہیں؟"

"جی۔"

"بھئی خدا کی نظروں سے کچھ پوشیدہ نہیں۔ وہ آپ کی حالت اور صحت سے آگاہ ہے۔ آپ رحم کیجئے اپنے خدا پر اور خود پر بھی۔ کل سے روزہ نہ رکھنا۔ سمجھے جناب! وہ دلوں کے بھید جانتا ہے۔"

ایک زمانہ تھا کہ وہ لوگوں کو مارکسزم کی باریکیاں بڑے انہماک سے استدلال کے ساتھ سمجھایا کرتے۔ اور کہیں لکھا بھی ہے: "مارکسزم ذہنی جلاب ہے۔"

لیکن ایک وقت ایسا بھی آیا کہ جب وہ انتہائے جذبات میں شاہد ندیم سے کہہ گئے:

"میاں شکر کرو تمہارے پاس تو تمہارا خدا ہے۔ یہ سب سے بڑا سہارا ہوتا ہے۔ ہم تو اس سہارے سے محروم ہیں۔ بغیر خدا کے جینا کتنا بڑا عذاب ہے، ان کے دل سے پوچھو جو اسے جھیل رہے ہیں۔"

اور زندگی کے آخری دنوں میں وہ لمحہ بھی آیا کہ کمیونزم سے برأت کا اعلان کیا اور اپنے خون پسینے سے لکھے کو منسوخ ٹھہرایا۔

بیمار تھے۔ میں دسویں پندرھویں دن عیادت کے لئے جایا کرتا۔ ایک روز گھر پہنچا تو دیکھا کہ جسم کے نام پر صرف کھال اور ہڈیاں بچی ہیں۔ مجھے دیکھ کر نہ جانے کہاں سے زور سمیٹ کر زہریلی ہنسی ہنسنے کی کوشش کی۔ کہا:

"ہمیں دیکھ کر مزہ آیا۔"

میں روہانسا ہو گیا تو کہنے لگے۔

"ہیاؤ رکھو۔ آنسوؤں کو کل کے واسطے بچائے رکھو۔ کچھ دنوں میں ہمارا جنازہ اٹھے گا اور پھر تمہیں اور

تمہاری نسل کو حسن نعیم، سردار، مجروح، اخترالایمان، باقر مہدی وغیرہ کے جنازے بھی اٹھانے ہیں۔" پھر ٹھہر ٹھہر کر ادا کیا: "موت ..... سے ..... کس ..... کو ..... رستگاری ..... ہے!"

کچھ دیر بعد ان کے اور میرے جذبات نارمل ہوئے تو میں نے پوچھا۔ ڈاکٹر کیا کہتا ہے۔

"کہتا کیا ہے۔ بس ہر ڈاکٹر ادب کے اس ڈاکٹر سے پیسے خرچ کرا رہا ہے۔ جیسے ہنڈی گرٹی ہے۔ اب تو دوا سے زیادہ دعا کا سہارا ہے۔ آج پونا سے (مولانا) حسن عباس فطرت آئے تھے۔ بہت دیر تک جھاڑ پھونک کرتے رہے۔ ذرا سکون ملا۔ ہماری چھوٹی بہن پاکستان سے آئی ہیں۔ آج صبح سورۂ رحمان کی تلاوت کر رہی تھیں۔ میں نے کہا بس تلاوت کئے جا رہی ہو کہ کچھ سمجھتی بھی ہو۔ پھر میں نے اس کی تفسیر بیان کی تو ایسا لگا کہ منھ اور سینے سے مدتوں کی جمع غلاظت بہہ رہی ہے۔"

بولتے بولتے تھک چکے تھے۔ اٹک اٹک کر جگر کا مصرعہ پڑھا

اللہ اگر توفیق نہ دے انساں کے بس کا کام نہیں

ظ۔ انصاری جاگیردارانہ ماحول کے پروردہ تھے۔ مگر جاگیرداروں کی رعونت، خشونت، سہل پسندی اور اور وقت گزاری کی عادت نہ تھی۔ بلکہ گذران کے لئے انتھک محنت اور اپنی مدد آپ کو اپنایا۔ البتہ عورت اور نفاست کو، شریفوں کا وطیرہ جان کر، عمر بھر جی جان سے لگائے رکھا۔ عورت مرتے دم تک حواس پر سوار رہی۔ اور نفاست کا یہ عالم تھا کہ چال چلن میں، سینے کی جلن میں، قیام، طعام اور رجام میں، قلم کاری اور کلام میں، سفر و حضر، خلوت و جلوت میں، شخصی تراش خراش اور لباس میں، بزم بپا کرم اور برہم کرنے میں ایسی نفاست سے کام لیتے تھے کہ نفاست نزاکت کا اور نزاکت نرگسیت کا چولا پہن لیتی تھی۔

ساری زندگی میزبانی اور مہمانی کا دامن پکڑے پکڑے توازن قائم رکھنے کی دھن میں لگے رہے مگر اپنی اخیر عمر میں طبیعت کی بے اطمینانی اور مزاج کی نازکی اور کچھ قسمت کے ہاتھوں، کھن کھن بجتی چوڑیوں، کھنکتے کنگنوں والی کے وجود کی محرومی، میزبانی اور مہمانی کے پلڑوں کو غیر متوازن کر گئی۔ زندگی کے آخری دہے کے یار دوستوں نے جانا کہ ظ۔ انصاری میزبان بننے سے زیادہ مہمان بننے کے قائل ہیں۔ مجبوری اور مزاج میں بہت فرق ہوتا ہے۔ ان دونوں کے فرق کو سمجھے بغیر کوئی رائے قائم کر لینا قرینِ انصاف نہیں ہے۔ بارہا یہ دیکھا کہ کھانے کے وقت جو آیا شریکِ طعام ہو گیا۔ وقت ہوا تو کچھ اہتمام کر لیا گیا۔ تنگیٔ وقت نے اجازت نہیں دی تو جو کچھ بھی موجود ہوا، سامنے رکھ دیا گیا۔ اگر کم ہوا یا کچھ بھی نہ ہوا تو قریب کے ہوٹل سے یا دہلی دربار سے منگا کے یا آئے ہوئے مہمان کو دہلی دربار

لے جا کے ضیافت کی اور مسکراہٹوں کے بیچ رخصت کیا۔ بمبئی کی آپادھاپی اور نفسا نفسی کی زندگی میں اس سے زیادہ کی امید باندھنا فضول ہے۔ مرحوم کو طرح طرح کے کھانوں کا شوق تھا۔ چیزیں بھلے ہی کم ہوں مگر قابیں سلیقے سے سجی ہوں کہ ورائٹی کا پتہ چلے۔ خوش خوراک نہ تھے۔ خود کم کھاتے دوسروں کو زیادہ کھلاتے۔ کھانے کی میز پر اپنے مطالعے، حافظے، زبان دانی کے وہ کرشمے جگاتے کہ شریکِ طعام حیرت کا پتلا بن جاتا۔ کھانے کی ایک ایک چیز پر، اس کے آغاز و ارتقا اور اقسام پر وہ سیر حاصل گفتگو کرتے کہ لوگ سوچ میں پڑ جاتے کہ یہ بمبئی یونیورسٹی میں روسی زبان کے پروفیسر، عربی داں، فارسی کے ماہر، ہندی کے واقف کار، جرمن اور فرنچ کی شد بد رکھنے والے، اردو کے بلند مرتبت صحافی، بے مثل مترجم، صاحب طرز ادیب اور دانشور ڈاکٹر ظ۔ انصاری ہیں یا کوئی رکاب دار، کسی خانساماں کی اولاد کہ خاندانی خون رگوں میں دوڑ رہا ہے۔ چوپاٹی کے قریب اسلام جم خانہ میں عید ملن کا پروگرام ہے۔ ریاستی وزیر اعلیٰ شریف آف بامبے، میئر آف بامبے، وزیر، سفیر، نامی گرامی پروفیسر، ڈاکٹر، بیرسٹر، عالم اور دانشور، سوشیل ورکر، ادیب، شاعر اور ایکٹر۔ غرض ہر شعبے کے چیدہ چیدہ افراد موجود ہیں۔ ظ۔ انصاری تقریر کرنے کھڑے ہوتے ہیں۔ انھیں کہیں کبابوں کی قاب نظر آجاتی ہے۔ اب کبابوں کی تاریخ، اس کی قسموں، پکانے کی ترکیبوں اور مختلف ملکوں میں اس کی شکلوں پر وہ معلوماتی اور دلنواز تقریر شروع کی کہ لوگوں کے منھ میں پانی بھر بھر گیا۔ لوگ جو کھانے پر ٹوٹے تو پہلے ہی حملے میں کباب ندارد اور قابیں خالی۔ یہ تھا ظ۔ انصاری کی تقریر کا چٹخارہ۔ اس دن سے آج تک بمبئی میں ظ۔ انصاری کے شناساؤں اور ناآشناؤں سے لے کر بھیونڈی میں ان کے شیدائی ایڈوکیٹ یاسین مومن تک ان کی تقریر کو یاد کر کے کباب بنواتے، شوق سے کھاتے اور قسمیں دے دے کر بڑے چاؤ سے کھلاتے ہیں۔

مٹھائی کے حد درجہ شوقین تھے۔ جگہ جگہ جا کے مٹھائی کھاتے اور کھلاتے۔ کہیں باہر جاتے تو وہاں کی مشہور یا اپنی من بھاون مٹھائی ضرور لاتے۔ اور لوگوں کو بہ اصرار کھلاتے۔ ساتھ ہی خاندانی حلوائیوں، مٹھائی کی قسموں، مختلف مقامات کی مٹھائیوں کی لذتوں پر لیکچر بھی دیتے جاتے۔ لیکچر اتنی دلجمعی اور زبان کی شیرینی اور چٹخارے کے ساتھ دیتے کہ چاٹ نہ کھانے کے باوجود بھی چاٹ کا سارا مزہ آجاتا۔

مثنوی کی بر جا و بیجا حمایت، چند بنیادی اصولوں پر غزل کی شدید مخالفت، روسی ادب میں انسانیت کی پکار، امیر خسرو کی دنیاداری اور فنکاری، غالب کی آزادہ روی اور عظمت کا قصیدہ، قومی یکجہتی کی اہمیت، افادیت اور ضرورت پر زور، آخر عمر میں مولانا آزاد اور پنڈت نہرو کے زندگی، زمین اور زمانے کے بارے میں رویے اور

نظریے، حصولِ آزادی کی جدّو جہد میں ان کا قول اور کردار، اس کے علاوہ ان دونوں بڑی ہستیوں کے درمیان موافقت اور مماثلت، ایک دوسرے کی نظر میں ایک دوسرے کی وقعت و اہمیت ——— یہ ظ۔ انصاری کے منتخب اور پسندیدہ موضوعات تھے۔ قومی یکجہتی اور غالب پر مختلف پہلوؤں سے سو سو لیکچروں کا مارکیٹ بنایا تھا، جسے انھوں نے جینے جی، اچھے حالوں، بہ ہوش و حواس پورا کر دیا تھا۔ شاہد ندیم راوی ہیں :

"مالیگاؤں میں ضلع مجسٹریٹ کی طرف سے ہر سال قومی یکجہتی کا جلسہ و مشاعرہ ہوتا ہے۔ ایک سال جلسے میں تقریر کا قرعۂ فال ظ۔ صاحب کے نام نکلا۔ ضلع کلکٹر کا ظ۔ صاحب کے گھر فون آیا، پھر وہ خود آئے، آنے کا وعدہ لیا۔ جا کے دعوت نامے اور پوسٹر پرنٹ کرائے، جلسے کو جب دو دن رہ گئے تو پھر کلکٹر صاحب کا فون آیا، ساری تیاریاں آپ کے شایانِ شان مکمل ہو چکی ہیں۔ آپ کی آمد کے اعلان سے لوگوں میں بڑا جوش و خروش پایا جا رہا ہے۔ ظ۔ صاحب بیمار لہجے میں کہتے ہیں۔ بھئی دو دن سے دست آ رہے ہیں، کمزوری بہت بڑھ گئی ہے۔ خیر کوشش کروں گا پہنچنے کی۔ ڈسٹرکٹ کلکٹر نے اپنی عزت کا اور بھگوان کا واسطہ دیا کہ آپ اگر نہیں آئے تو میری ناک کٹ جائے گی۔ ہندو کم لیکن وہاں کا مسلمان اور کمیونسٹ طبقہ مجھ سے بہت ناراض ہو جائے گا۔ بھئی آپ پریشان نہ ہوں، میں چاہے اسٹریچر پر آؤں مگر آؤں گا۔ اسے مطمئن تو کر دیا مگر جانے کے موڈ میں نہ تھے۔ دوسرے روز پھر فون آدھمکا۔ انھوں نے پھر وعدہ کر لیا اور یہ بھی کہہ دیا کہ کوئی اہتمام نہ کیجئے گا۔ بس کھچڑا کی بیوی کھچڑی بکوا لیجئے گا۔ میں سمجھ گیا کہ ڈاکٹر صاحب جُل دینے کے موڈ میں ہیں۔ میں نے کہا ڈاکٹر صاحب اگر آپ نہیں گئے تو ضلع مجسٹریٹ کی بھد ہو گی، آپ وعدہ خلافی کریں گے۔ اس طرح آپ کا امیج خراب ہو گا۔ شاید آپ نہیں جانتے کہ مالیگاؤں کا مزدور ہو یا مالک، ان پڑھ ہو یا پڑھا لکھا، سیکولر ہندو ہو، جذباتی مسلمان ہو یا کٹر کمیونسٹ سب آپ کی تحریر کی شگفتگی، آپ کی جادو بیانی کے بے پناہ معترف ہیں۔ آپ کو دیوانہ وار چاہتے اور آپ کا بے انتہا احترام کرتے ہیں۔ جوش میں آ گئے۔ کہا، اب ضرور جاؤں گا مگر ایک شرط یہ کہ شاہد ندیم میرے ساتھ ہوں۔ میں نے چار و ناچار حامی بھر لی۔ چونکہ جانا نہیں چاہتے تھے اس لئے نہ ریزرویشن کرایا تھا اور نہ ہی میزبان کو گاڑی کا انتظام کرنے دیا تھا۔ بہرحال میں انھیں لے کر وی۔ ٹی۔ اسٹیشن پہنچا۔ ہم دونوں UNRESERVED کمپارٹمنٹ میں اوپر کی برتھ پر جا بیٹھے۔ اب کہنے

ہیں میاں تیاری تو ہے نہیں، بولوں گا کیا؟ صرف "شاعر" کا قومی یکجہتی نمبر لایا ہوں۔ راستے بھر کبھی "شاعر" کا مطالعہ کرتے رہے اور کبھی مجھے مخاطب کر کے تقریر۔ ادھر منماڑ اسٹیشن آیا۔ ادھر وہ بولے: میاں تقریر تیار! جب مالیگاؤں کے گورنمنٹ گیسٹ ہاؤس پہنچے تو دیکھا کہ لوگ بچھے جا رہے ہیں۔ مرحوم کی ساری بیماری دور ہو گئی۔ خود بھی کھل اٹھے۔ کھانا کھا کے جلسہ گاہ میں جانا تھا۔ ضلع کلکٹر نے کھانے کا بڑا زبردست اہتمام کیا تھا۔ لیکن ظ۔ صاحب کے سامنے کھچڑی کی پلیٹ رکھی گئی۔ وہ کھچڑی کو دیکھتے، گاہ مرغ و ماہی پر اچٹتی سی نظر ڈالتے۔ کھانا شروع ہوا۔ کھچڑی کی تعریفیں کیے جا رہے ہیں اور کنکھیوں سے مرغن قابوں کو دیکھے جا رہے ہیں۔ ایک صاحب بھانپ گئے۔ عرض کیا۔ ظ۔ صاحب! ذرا یہ چکن تندوری بھی چکھ کے دیکھیں۔ کہا: لائیے۔ دیکھوں اس کی لذت کیا کہتی ہے۔ اتنے میں باورچی سامنے آکھڑا ہوا۔ ایک صاحب نے کہا: کھانا انھوں نے پکایا ہے۔ اب جو تعریفوں کے پُل باندھنے شروع کیے تو بس پوچھئے مت! قابیں سرکا سرکا کر اس قدر چکھا بلکہ کھایا کہ مجھے ڈر سا لگنے لگا کہ ایک طرف دستوں کا سلسلہ جاری ہے، اور دوسری طرف کھانے پر جم جم کر حملے کیے جا رہے ہیں اور تقریر بھی کرنی ہے۔ خدا خیر کرے۔ ساڑھے نو بجے جلسہ گاہ میں پہنچے تو دیکھا پنڈال کھچا کھچ بھرا ہوا ہے۔ آہستہ آہستہ تقریر شروع کی، طبیعت جوش پر آنے لگی۔ مسلسل ڈھائی گھنٹے بولنے کے بعد تھمے اور کہا: حضرات یہاں مشاعرہ بھی ہے۔ شعراء اور مشاعرے کے سامعین مجھے گالیاں دے رہے ہوں گے۔ لہٰذا اب میں شاعروں اور ان کے سننے والوں کے درمیان حائل نہیں رہنا چاہتا۔ اسٹیج پر بیٹھے شعراء اور پنڈال کے سامعین دونوں جانب سے یہ آواز بہ یک وقت گونجی کہ مشاعرہ نہ ہو، نہ سہی، آپ تقریر جاری رکھیے۔ پھر ہم کہاں سنیں گے ایسی باتیں، ایسی زبان!"

واقعی آج وہ نہیں ہیں تو ایسے مواقع پر بے اختیار یاد آتے ہیں۔ اب کون ہے جو یوں معلومات کے دریا بہائے اور زبان دانی کے جوہر دکھائے۔ ویسے کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ جب ان کے پاس مواد کم ہوتا تھا تو وہ بہت اچھا بولتے تھے۔

بعضے کہتے ہیں ظ۔ انصاری کے عجیب و غریب، مختلف و متضاد مشغلے تھے۔ وہ روس جانے سے قبل دن بالرات کے کسی حصے میں، بھنڈی بازار، جے جے اسپتال، ناگپاڑہ، مدنپورہ، کالا پانی (مومن پورہ) کے کسی نہ کسی گھر میں

کسی تنگ و تاریک گلی، کسی چوراہے پر، کسی بھٹیار خانے یا شراب خانے میں، سوتے، جاگتے، لکھتے، پڑھتے، بولتے، لیکچر دیتے، چلتے چلاتے نظر آتے تھے۔ لیکن جب روس میں جا کے ڈاکٹر اور "رشیا ریٹرن" ہو گئے تو اپنے حالی موالی، مداحوں اور محسنوں کو فراموش کر گئے اور ان گلی کوچوں کو بھول گئے کہ جہاں مزدوروں کے کندھے پر ہاتھ رکھے پھرا کرتے تھے۔

"شاہد صاحب! (مکتبہ جامعہ والے) ذرا عنایت اختر کو میرے ساتھ کر دیجئے۔ یہ میرے ساتھ کچھ دور چل کر مدن پورہ کا راستہ بتا دیں۔"

تیوریاں بدلتے ہوئے عنایت اختر صاحب نے کہا:

"حضور! یہاں سے جب آپ جے جے اسپتال کے چوراہے پر جائیں تو دو ٹانگی کی طرف منہ کر کے یا دوسرے لفظوں میں قبلہ رُخ ہو کے روڈ پار کریں۔ داہنی جانب این یو کتاب گھر کی گلی میں مُڑ جائیں۔ گلی کے خاتمے پر بائیں طرف کا رُخ کریں۔ چند قدم کے فاصلے پر آپ کو مستان تالاب کا میدان نظر آئے گا، جہاں آپ تقریر کیا کرتے تھے۔ اور وہیں ایک اخبار کے دفتر میں کام کرتے، وہیں کھاتے اور وہیں پڑ کے سو جاتے تھے۔ اس کے آگے نیبر ہڈ ہاؤس نظر آئے گا۔ وہاں بھی آپ کمیونزم اور ترقی پسندی پر لیکچر دے چکے ہیں۔ غالباً اسی سے لگا ہوا "ہوٹل سارو ی" ہے جہاں کے سیخ کباب آپ مزے لے لے کر کھاتے تھے اور بل کی ادائیگی کے وقت اکثر دامن جھاڑ کے ......! بس وہیں کھڑا پارسی (ناگپاڑہ جنکشن) کا چوراہا کراس کر کے، کیڈی کمپنی کی اسی سڑک پر ہولیں جو برین روڈ (مولانا آزاد روڈ) کہلاتی ہے۔ ذرا آگے بڑھیں گے تو روزنامہ "انقلاب" کا آفس ہے، جہاں آپ کبھی ملازمت کر چکے ہیں۔ بس وہیں سے مدنپورہ شروع ہو جاتا ہے۔" ظ۔ صاحب معاملے کو بھانپ کر شکریہ ادا کرتے ہوئے مکتبہ جامعہ سے اتر گئے۔

"شاہد بھائی! یہ ظ۔ انصاری صاحب کو کیا ہو گیا ہے۔ آج سوٹیڈ بوٹیڈ ہو گئے ہیں۔ رشیا میں جا کر ڈاکٹر بن گئے ہیں تو اپنے برے دن بھول گئے۔"

شاہد بھائی، عنایت اختر صاحب کے ان سخت و سست جملوں پر خاموشی سے مسکراتے اور دھواں دھکڑ کرتے رہے۔

ہوٹل سراج میں ایک صاحب کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی اپنے کچھ ہونے اور کرنے کا ڈھنڈورہ "ظ" مرحوم کو ڈھنڈورچی بنا کر پٹوانا چاہتے ہیں۔ ظ۔ انصاری گویا ہوتے ہیں:

"جناب! آپ کے کام سے غالبؔ اور فیضؔ کی روح خوش ہوگئی۔ عمر بھر جو کام ہم درسیوں مضامین اور کتابیں لکھ کر، بیسیوں تقریر کر کے نہ انجام دے پائے وہ آپ نے ایک کتابچے کے ذریعہ انجام دیدیا۔ ہم عمر بھر گدھے کی طرح لگے رہے مگر وہی ڈھاک کے تین پات، دھوبی کا کتّا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا۔ ایک سے ایک ماہرِ غالبیات پڑا ہے۔ لیکن وہ توفیق ہم میں سے کسی کو نہیں ہوئی جو آپ نے کر دکھایا۔ کبھی کبھی چھوٹے پیمانے کا کام بھی ڈھول تاشے سے بے نیاز ہوتے ہوئے کارناموں پر سبقت لے جاتا ہے۔"

یہ سب کچھ ان کی دل جوئی کی خاطر کہنے کو کہہ گزرے۔ مگر وہاں چند نوجوان اہلِ قلم بھی موجود تھے۔ حیرت اور افسوس کے ساتھ سوالیہ نشان بن گئے کہ "یاالٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟ کیا یہ وہی ڈاکٹر ظ۔ انصاری ہیں جو "غدا الگئی" کہنے کی بدولت دنیا بھر میں اپنے ہم سفروں اور ہم عصروں سے دشمنی مول لیتے ہیں؟"

گفت و شنید، نشست و برخاست، قیام و طعام، تحریر و تقریر، آواز اور اندازِ غرض ہر چیز میں اپنی کلاہ کج رکھتے تھے۔ مزاج کی کجی شخصیت کی کجروی تو نہیں لیکن شناخت نامہ ضرور بن گئی تھی۔ نزاکت ایسی پائی تھی گویا "فرشِ مخمل پہ مرے پاؤں چھِلے جاتے ہیں" صفائی اور صحت کا اس قدر خیال کہ نزلہ خواہ مرحوم کو ہو یا ملاقاتی کو اس حالت میں مصافحہ نہیں کرتے تھے۔ انفرادیت پسندی، فطرت کا خاصّہ تھی۔ شخصیت بھی جوشیلی اور زوردار تھی جیسے نرگسیت کی امربیل نے جکڑ لیا تھا۔ کوئی شخصیت اگر پورے طور پر نرگسیت کے نرغے میں آجائے تو وہ ضدّی، بدمزاج، بدخو، بدکلام، بے لگام، گوشہ نشین ہو جاتی ہے۔ مرحوم نرگسی تو صد فی صد ہو گئے تھے۔ لیکن اعصاب فولادی تھے۔ اسی لئے اپنے جذبے، جوش اور جولانی پر کنٹرول رکھا تھا۔ سو نرگسیت کو سہارے گئے۔ میرؔ کی بددماغی مرزا یگانہ کی مردم بیزاری اور مردم آزاری نہیں اختیار کی۔ لہٰذا حسن نعیم اور باقر مہدی ہونے سے بچ گئے۔

نچلا بیٹھنا سیکھا ہی نہیں تھا۔ اونچی کرسی کی ہمیشہ تلاش میں رہتے تھے یا اونچی کرسی انھیں تلاش کر لیا کرتی تھی۔ اپنی کتاب "ورق ورق" میں انھوں نے یہ فیصلہ صادر فرمایا تھا کہ سردار جعفری کو کسی اسکول کا ہیڈ ماسٹر اور کیفی اعظمی کو کسی وقف کا متولی ہونا چاہئے تھا۔ خیر سردار جعفری نہ ہیڈ ماسٹر بن سکے اور نہ کیفی اعظمی متولی۔ لیکن ظ۔ انصاری نے بمبئی یونیورسٹی میں روسی زبان کے استاد ہو کر ایک بلند مرتبت اور باوقار کرسی اپنے لئے چنی کہ ہم عصروں سے ذرا الگ تھلگ اور اونچا بیٹھیں۔ پروگراموں میں سامعین کے ساتھ بیٹھنے کی بجائے اسٹیج پر بیٹھنا اپنا حق اور فرض دونوں سمجھتے تھے۔ اور اسٹیج کے فرائضِ منصبی ادا کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے تھے۔ اس لئے مائک جلد نہیں چھوڑتے تھے۔ اکثر سب سے آخر میں بولنے کی زحمت دی جاتی تھی۔ جیسے

زحمت سمجھ کر قبول کرتے تھے۔ مگر بولنے کی بے تابی نمبر سے پہلے ہی کئی مرتبہ مائک یا مائک کے بغیر ہی بولنے پر مجبور کر دیتی تھی۔ طرہ یہ کہ بار بار بولنے کے بعد بھی اپنی باری محفوظ رکھتے تھے۔ اور وقت آتے ہی رومال سے منھ صاف کرتے۔ چشمہ درست کرتے ہوئے پوڈیم پر آ کھڑے ہوتے تھے۔ پھر پانی پی پی کر لفظوں کے وہ موتی رولتے معقولات اور منقولات کے ٹھٹ لگائے جاتے کہ پھر کوئی جغادری اپنی خوش گفتاری کا چراغ نہیں جلا سکتا تھا کہ ہوا اکھڑ چکی ہوتی تھی اور بال اجڑ رہا ہوتا تھا۔ ظاہر ہے دیواروں سے ہر شخص تو باتیں نہیں کر سکتا۔ اس کے ماہر معدودے چند ہی ہوتے ہیں۔ آج کل یہ ہنر صرف قیصر الجعفری کو آتا ہے: "دیواروں سے باتیں کرنا اچھا لگتا ہے۔"

صوبائی یا مرکزی وزیر کبھی نہیں رہے۔ راجیہ سبھا کے ممبر بھی نہیں تھے۔ اور نہ کسی ریاست کے گورنر۔ لیکن رئیسوں اور پرنسوں، وزیروں اور گورنروں سے تعلقات ہمیشہ رکھے۔ کبھی ان کے سامنے ذرا ذرا جھک جاتے اور کبھی اپنی ذہانت، ظرافت و متانت، دلداری، وضع داری اور طرحداری، باتوں اور بار بار کی ملاقاتوں سے انھیں لچک پیدا کرنے یا جھک جانے پر مجبور کر دیتے تھے۔

کسی پروسیشن، کسی جلوس کی قیادت کبھی نہیں کی کہ جیل کی ہوا جی جان کو راس نہ آتی تھی۔ لیکن جلسوں کانفرنسوں، سیمیناروں اور مشاعروں میں نظامت، خطابت، صدارت اور سرپرستی اپنا حق سمجھتے تھے۔ جب تک جئے اپنے سے بہتر کسی کو نہیں جانا اور نہ جلدی کسی کی دال گلنے دی۔ بلکہ اس میدان کے کھلاڑیوں کے سینے پر ہمیشہ مونگ دلنے کی کوشش کی۔

چھٹی کے دن شام میں مہاراشٹرا یونیورسٹی (بمبئی) کی لائبریری میں اردو اکیڈمی کی جانب سے فیض اور بیدی کا تعزیتی جلسہ ہے۔ ان دو بڑے فنکاروں پر بولنے والے ظ۔ انصاری تنہا ہیں۔ ہال کی کرسیاں سامعین سے خالی ہیں۔ اس بھرے پرے شہر میں، آج کے ہندوستان میں، اردو کے گڑھ میں بیدی اور فیض کے نام پر بمشکل پچاس حضرات جمع ہوئے ہیں۔ ظ۔ انصاری لمبی چوڑی تقریر کے ارادے سے اور پورے ساز و رخت کے ساتھ آئے تھے۔ یہ سارا منظر دیکھ کر بد دل اور بدمزہ ہو جاتے ہیں۔ افسوس کے ساتھ پھٹ پڑتے ہیں کہ ان مرحوم فن کاروں کے نام پر سامعین کی یہ مٹھی بھر تعداد، یہ خالی خالی کرسیاں ہمارا مذاق اڑا رہی ہیں۔ یورپ اور ایشیا میں معمولی معمولی ادیبوں، شاعروں کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے اس سے زیادہ لوگ جمع ہو جاتے ہیں یہ ہمارے لئے ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ ان مرحومین کی محبت اور یاد میں، کسی کھلے میدان میں، آسمان کے نیچے، کسی چوک چوراہے پر جلسہ ہوتا اور اتنے لوگ جمع ہوتے کہ ٹریفک جام ہو جاتا۔ تاکہ لوگوں کو

معلوم تو پڑتا کہ اردو کے دو بڑے قطب نما، اس دنیا کو اپنے ذہن و نظر کا اجالا دیتے دیتے موت کی تاریک راہوں میں کھو گئے۔ جلسے کے خاتمے پر ہوٹل ساگر میں چائے پی اور پلائی۔ مستان تالاب سے گزرتے سمٹے بیتے ہوئے دنوں، واقعوں سے پردے ہٹاتے ہٹاتے قلابہ جانے والی تین نمبر بس میں سوار ہو گئے۔ گھر جا کر ٹیبل لیمپ روشن کیا۔ پیڈ اور پین لے کر بیٹھ گئے۔ ڈاکٹر محمد حسن کو جو اُن کے ہم عصر، ہم سفر، ہم مشرب ہیں، انھیں خط میں کچھ اس طرح کے الفاظ لکھے کہ "آج ہمارے تمہارے فیض اور بیدی کا تعزیتی جلسہ تھا۔ یہ دونوں فنکار مانوتا کا شیشہ اونچا رکھنے کے لئے زندگی بھر کٹیلی راہوں پر پھول بکھیرتے بکھیرتے دھول ہو گئے اور لوگوں سے اتنا بھی نہیں ہوا کہ آ کے قرض کا سود چکا جاتے۔ ہائے رے بے حسی اردو والوں کی۔ سوچتا ہوں بیدی، فیض اور اردو کا پرسہ کیسے دوں۔ بیدی کا پرسہ تمہیں، فیض کا مجروح کو اور اردو کا اپنے آپ کو دیتا ہوں۔"

جب تک ہاتھ میں قلم اور آنکھ میں دم رہا وہ ایک لکھاڑ ادیب کی طرح لکھتے رہے۔ ہزارہا صفحات سیاہ کر ڈالے۔ ان کے قلم کی سیاہی ان کی چند کتابوں کے علاوہ اخباروں اور رسالوں کے اوراق میں بکھری ہوئی ہے۔ شاید کوئی تحقیق کا مردِ میدان اٹھے اور اس بوند بوند سیاہی کو یکجا کرے اور دریا بنائے۔ یہ کام ہے انتہائی دشوار لیکن ناممکن نہیں ہے۔ انھوں نے جو بھی لکھا سوچ بچار کے بعد سلیقے سے لکھا۔ وہ اخیر دم تک تھکے نہیں۔ سانس پھولا نہیں، کاغذ کا اسٹاک ختم نہیں ہوا، روشنائی قلم میں بھی رہی اور بوتل میں بھی۔ پتہ مارنا، آس پاس بکھرے موضوعات کو پکڑنا، سمیٹنا، راتیں آنکھوں میں کاٹنا، سینے کی جلن کو قرطاس پر بکھیرنا کبھی ترک نہیں کیا۔ آفریں ہے ایسے جذبے، کام اور ہمتِ دشوار پسند پر۔ سوال یہ ہے کہ وہ ہمتِ دشوار پسند جو اپنے جذبۂ بے تاب کی عالم پر کمند پھینکتی تھی، وہ طاقتِ گفتار کہ گفتار کے غازیوں کو رشک و حسد سے دوچار کرتی تھی، کہاں کا فیضان تھا؟ وہ حسنِ تحریر کہ لوگ جس کی بلائیں لیتے ہیں اور جس کے لئے بلا بھی بن جاتے ہیں، کہاں سے آیا؟ وہ مشاہدہ، مجاہدہ، مطالعہ، تجربہ، تجزیہ تنقید، تبصرہ کہ جس سے لوگ خوش بھی ہوتے ہیں ناخوش بھی، کیسے پیدا ہوا؟ اپنے یاروں اور پیاروں، نقیبوں اور رقیبوں کے ساتھ برتاؤ کا یہ انداز کیونکر آیا؟ کہ یہی لوگ وفادار اور جفاکار بن جاتے ہیں۔ بات یہ سمجھ میں آئی کہ یہ سب مزاج و ماحول، ٹیڑھی بانکی شخصیت، ایقان اور گمان کے میدانوں اور بیابانوں میں بھٹکنے اور "خدا لگتی" کہنے کا میٹھا اور کڑوا پھل ہے۔ اگر اثرات دو رس اور دیرپا ہوں تو کڑواہٹ اور کسیلے پن میں قباحت کیا ہے؟

ظ۔ انصاری کا مخصوص اور منفرد اسٹائل پائے نگاہ میں زنجیر ڈال دیتا ہے۔ انھوں نے بات پیش کرنے کے اتنے پینترے آزمائے ہیں کہ اس میدان میں ان کا کوئی مدِمقابل نہیں۔ وہ بات اس ڈھب سے بیان کر جاتے ہیں کہ اچھوتی

تو میں اُن کا دم چھلا بن گیا۔ اتنے میں ایک صاحب آدھمکے۔ ظ۔ انصاری کو آداب کرتے ہوئے ڈرتے ڈرتے کہنے لگے:
"ڈاکٹر صاحب! آپ نے ..... دو سال پہلے..... تین سو روپے ..... !"
"ہاں ہاں بھئی ضرور آپ کو دیں گے۔ اس دوران آپ جب جب ملے تو جیب میں ہاتھ ڈالا تو خالی ملی۔ کل ہی ایک صاحب سے کچھ پیسے ملنے والے ہیں۔ اگر زحمت نہ ہو تو آپ خود آجائیں یا کسی کو شیریں (وہ بلڈنگ جہاں رہتے تھے) بھیج دیں۔ ہم آپ کی رقم ادا کر دیں گے۔ ورنہ کل کے کل ہم خود فون کر کے آپ کے مکان پر حاضر ہو کر پکوان کھائیں گے اور آپ کا قرض بھی چکا دیں گے۔"
میں نے عرض کیا "ڈاکٹر صاحب! اور کھلانے کا حساب ..... ؟"
زیرِ لب مسکراتے ہوئے: "میاں، آپ کو اٹھکیلیاں سوجھی ہیں ...... !"

ایک دوسرا منظر دیکھئے۔

شعبۂ اردو بمبئی یونیورسٹی نے اردو املا پر سہ روزہ سیمینار منعقد کیا۔ سیمینار کے آخری سیشن کے بعد مہاراشٹر اردو اکادمی نے بیجوائے جمخانہ (قلابہ) میں عشائیے کا اہتمام کیا ہے۔ ظ۔ انصاری اکادمی کے نائب صدر ہیں۔ مدعوئین کے استقبال اور خاطر تواضع کے بعد میرا ہاتھ پکڑ کر ایک گوشے میں لے گئے اور پرس سے پیسے نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا: "یہ رہے آپ کے پچاس روپے جو ہفتہ بھر پہلے آپ سے قرض لئے تھے۔"
"لیکن ڈاکٹر صاحب! میں نے آپ سے کوئی تقاضا تو کیا نہیں، رکھئے، اطمینان سے دیجئے گا۔"
میری جیب میں ٹھونستے ہوئے بولے: "میں تو دے رہے ہیں، رکھ لیجئے۔ ورنہ ہمارے پاس ٹکیں گے نہیں ادھر سے آئے ہیں ادھر چلے جائیں گے۔"

شام کا سمے تھا۔ بی روڈ چرچ گیٹ پر واقع یونیورسٹی کلب ہاؤس میں پوسٹ گریجویشن کرنے والے لڑکے اور لڑکیاں باتیں کرتے، محبت کی پینگیں بڑھاتے، دوستی کے ہاتھ ملاتے، الجھتے، چہچہاتے، یہاں وہاں، اس روم سے اس روم، اس پروفیسر سے اس پروفیسر کے پاس آجا رہے ہیں۔ اور ظ۔ انصاری اپنے کمرہ نما کیبن میں فارین لینگویجیز ڈپارٹمنٹ کے انچارج (نگراں/سربراہ) کی حیثیت سے بیٹھے چائے بنانے، کیتلی میں انڈیلنے، ٹی کوزی اڑھانے، ڈھانکنے میں لگے ہیں۔ دنیا جہان کی، خدا اور انسان کی باتوں میں مگن ہیں۔ اچانک چائے کا خیال آتا ہے۔ گرم پانی سے کھنگالے کپ آگے سرکاتے ہوئے چائے انڈیلنے لگتے ہیں۔
"شکر بنائیے ایک یا دو اسپون؟"

بھی لگتی ہے اور بھلی بھی۔ ان کے اشہبِ قلم کے قدم مختلف میدانوں، مختلف سمتوں میں نظر آتے ہیں۔ ان کا یہ "گھوڑا" اونچی راس کا ہے۔ رفتار میں تیز، کاٹھی کا مضبوط اور موقع کی نزاکت کو سمجھنے والا۔ میدانی اور ہموار راہ پر سرپٹ دوڑتا ہے، اور بڑ کھابڑ راستے کو آہستہ روی سے طے کرتا ہے۔ راکب کو نظر میں رکھ کر، اپنے آپ کو سنبھال کے خطرات اور خدشات سے چوکنا رہ کر۔ ان کا طرزِ تحریر خواص پسند اور عوام پسند دونوں ہے۔ وہ عمارت کی تعمیر میں ایسا اینٹ گارا، شہتیر اور سریا (سلاخ) استعمال کرتے ہیں کہ عام طور پر سستا ہوتا ہے مگر عمارت پختہ۔ وہ سفیدی ایسی اور اس طرح کرتے ہیں کہ خواص کی نگاہ نہیں ٹھہرتی اور عوام اونچے داموں بھی مہنگا نہیں سمجھتے۔

ڈاکٹر ظ۔ انصاری تقریباً چھیاسٹھ برس جیے۔ لگ بھگ چالیس برس بے تکان لکھا۔ ترجمے کیے، کالم تحریر کیے، اداریے لکھے، اردو روسی اور روسی اردو لغت ترتیب دی، تنقید، تحقیق، ترجمہ، تبصرہ، خاکہ نگاری، غرض ہر میدان میں قلم کاری کی۔ اردو میں دانشوری کی روایت کو آگے بڑھایا۔ صاحبِ طرز ادیب کہلائے۔ ترقی پسندی سے شروع ہوئے تھے۔ ڈھلمل یقینی اور بین بین رہنے کے کارن ترقی پسندوں کے جھگھٹے میں کوئی خاص جگہ نہیں ملی۔ انھیں جدیدیت سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ مگر جدیدیوں سے یارانہ رہا اور بگاڑ بھی۔ کوئی ادبی گروہ، نظریہ، ازم انھیں اپنی تاریخ میں سینت اور سمیٹ کر نہیں رکھے گا۔ مگر وہ اپنے لچکیلے اور ادلتے بدلتے ادبی رویے اور اسٹائل میں زندہ رہیں گے، اپنے علم کے عَلَم، قلم اور زبان کے جوہر کی بدولت۔ اگر اپنی رنگارنگ دلچسپیوں کو سمیٹ کر، کسی ایک شاخ پر نشیمن بنا لیتے، کسی ایک صنف یا شعبے میں بند ہو جاتے تو دنیا کے عظیم فنکاروں کے ساتھ بٹھائے جاتے۔ افسوس کہ ساری صلاحیتوں کے باوجود عالمی معیار کا ایک بھی شاہکار نہیں دے سکے۔ مگر ان کا ریزہ ریزہ بکھرا، ڈال ڈال، پات پات پھیلا۔ مجموعی کام انھیں اردو کے بڑے فن کاروں میں جگہ دلاتا ہے۔ اس حیثیت سے وہ ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

انیس قدوائی

چودھری محمد علی ردولوی

سرخ و سفید رنگ، خوب گھنی سیاہ بڑی بڑی مونچھیں۔ ململ کا کرتا۔ اس پر انگرکھا۔ بڑی مہری کا لٹھے کا پاجامہ۔ کبھی شیروانی اور چوڑی دار پاجامہ۔ ایک شان دار ملازم ساتھ، لڈوؤں کی ہانڈی، شراب کی بوتلیں اور سوڈے کا کیس تھامے ہوئے۔ بڑے بے تکلفانہ انداز میں پھاٹک سے داخل ہوتے۔ ان کی غیر معمولی شوخی و ظرافت اور کھلے ہوئے ہاتھ کی بدولت بچوں، بوڑھوں اور نوکروں سبھی کو ان کی آمد کی خوشی ہوتی۔ بزرگوں تک کو تحفہ تحائف سے نوازتے، نوکروں پر انعام و اکرام کی بارش ہوتی، اور بچے مٹھائی کی ہانڈیاں فوراً اچک لیتے۔

میرے والد سے ان کی دوستی کی ابتدا ان دنوں ہوئی تھی جب وہ نئے نئے علی گڑھ سے وکالت پاس کر کے بارہ بنکی آئے تھے اور پریکٹس شروع کی تھی۔ محمد علی چچا کا علاقہ کورٹ تھا اور وہ کوشش کر رہے تھے کہ کسی طرح علاقہ واگزار ہو جائے۔ برٹش گورنمنٹ ہر راجا یا تعلقہ دار کے نابالغ لڑکے کو اپنی سرپرستی میں لے کر اس کا علاقہ کورٹ آف وارڈس کے سپرد کر دیتی تھی۔ اگر بیٹا ناخلف نکلا تو ضبطی کا بہانہ مل جاتا تھا۔ ورنہ اکثر جوان ہوتے ہی لوگ اپنی جائداد چھڑانے کی کوشش کرتے تھے اور زیادہ تر کامیاب بھی ہوتے تھے۔

محمد علی چچا بھی کامیاب ہو گئے۔ ریاست چھٹی تو وہ بھی تمام بندھنوں سے رہا ہو گئے۔ کالون اسکول (جو اب کالج ہے) راجاؤں اور تعلقہ داروں کے بچوں کے لیے مخصوص تھا، وہیں تعلیم پائی تھی۔ والدین کے اکلوتے بیٹے تھے، ایک بڑی بہن تھی جس کی شادی ہو چکی تھی۔ اس لیے گھر میں سارا لاڈ پیار، شان، رنگ رلیاں ان کی تھیں۔

سنتی ہوں، ردولی کی دو حسین ترین بیگمات میں سے ایک ان کی والدہ تھیں۔ حالاں کہ میں نے جب دیکھا ضعیف ہو چکی تھیں اور حلیہ بدل چکا تھا۔ بس آثار کہہ رہے تھے کہ عمارت عظیم رہی ہوگی۔ بڑے کلّے ٹھلے کی بیوی تھیں۔ انیسویں صدی کے دل پھینک تعلقہ دار کی ان گنت محبوباؤں کے ہوتے ہوئے بھی بیگم کا رعب و دبدبہ اور عزت و احترام مثالی تھا۔

ایک واقعہ ان ہی لوگوں کی زبانی سنا ہوا یاد ہے کہ تعلقہ دار مرحوم کا قاعدہ تھا کہ بیگم کو خوش کرنے اور راضی بہ رضا رکھنے کے لیے اکثر نفیس زیورات اور ملبوسات تحفے میں دیا کرتے تھے۔ خاص طور پر اگر بائی صاحبان کے لیے کوئی زیور خریدتے تو بالکل اسی طرح کا بیگم کے لیے بھی آتا۔ یوں چاندی سونے کی بارش کر کے بیوی کے غیظ و غضب کو ٹالا کرتے تھے۔

ایسے ہی ایک موقع پر ارباب نشاط میں سے کسی نے خواہش کی کہ میرا آپ کی طرح اچکن

پہننے کو جی چاہ رہا ہے۔ فوراً لکھنو کے کاری گروں سے زردوزی سے مرصع اچکن سلوائی مگر ایک نہیں دو عدد۔ ایک فرمائش کرنے والی کو عنایت ہوئی دوسری خود لے کر خوش خوش بیوی کے پاس پہنچے۔ بیگم نے کھولی، دیکھا اور اپنا سر پیٹ لیا۔

"میں کہتی ہوں، تمھاری غیرت کو کیا ہو گیا ہے۔ اللہ کی شان اب مجھے موئی ٹکاہیوں اور ناچنے والیوں کا سا لباس پہناؤ گے۔ ایسا دیدہ ہوائی ہے کہ شریف زادیوں اور کمینوں کا فرق بھی مٹ گیا۔ ایسے پہننے والیوں پر اللہ کی مار بس اور کیا کہوں لو دیکھو۔"

اور یہ کہہ کر جھٹ کپڑوں کو دیا سلائی دکھادی۔ اچکن جل کر خاک ہو گئی اور میاں بے چارے ایک لفظ بھی نہ بول سکے۔

ہاں تو صاحب وہی مرتضائی بیگم ہمارے محمد علی چچا کی والدہ تھیں۔ بہت سخت مذہبی تھیں، اس لیے محمد علی چچا کی سنی بیوی کے آتے ہی انھوں نے برابر کے مکان میں رہائش اختیار کر لی اور انھیں آزاد چھوڑ دیا۔ دن میں دو چار بار آکر بیٹے بہو کو ڈانٹ ڈپٹ جاتیں۔ باقی اپنے حصے میں نذر و نیاز، مجلس، تعزیہ داری، ماتم سب کرتی رہتیں، کیوں کہ محمد علی چچا نے آخر عمر میں تعزیہ داری بند کر دی تھی۔

محمد علی چچا کے مصاحبین میں حکیم نعمت رسول (جو ان کی بیوی کے حقیقی چچازاد بھائی بھی تھے)، منیجر نوشاد علی صاحب اور خاصے کی چیز میاں مٹھو ملازم تھے۔ اور چچا کا حکم تھا کہ پرانے نوکروں کو دادا۔ چچا۔ ماموں کہہ کر بلایا جائے، تاکہ ان کو یہ محسوس ہو کہ وہ بھی خاندان کے ایک فرد ہیں۔

میرے والد (ولایت علی صاحب) کے انتقال کے بعد ان کے دوستوں میں سے سب زیادہ محبت و خلوص ہمیں ان ہی سے ملا۔ خود کہا کرتے تھے کہ دو آدمیوں نے میری زندگی تلخ کر دی۔ ایک ولایت دوسرے بیوی۔ والد کے انتقال کے بعد بھی وہ ہم سے ملنے مسولی آیا کرتے تھے اور میرے چھوٹے بھائی ردولی بھی پہنچتے تھے۔

پھر جب لکھنو میں ہمارا قیام ہوا تو اکثر ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ ہزاروں قصے ان کے پاس تھے۔ اور سننے والوں کا کثیر مجمع۔ سارے لڑکے لڑکیاں ان کو گھیر لیتے اور اس وقت کوئی دیکھتا ان کی گل افشانی گفتار۔ لکھنوی اور قصباتی دونوں زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ فارسی اور انگریزی میں بھی برق تھے، 'امامن مہری'، کے فلسفیانہ خیالات لکھ کر ساری عورتوں پر بیگماتی زبان کے ماہر ہونے کا سکہ انھوں نے بٹھادیا تھا۔ رئیس زادے ہوتے ہوئے بھی عوام میں گھل مل کر اودھی زبان کے لطیفے، مثالیں اور کہانیاں بھی ازبر کر لی تھیں۔

کپڑے، زیورات، تمیز تہذیب اور معاشرتی رکھ رکھاؤ ان کا طرہ۔ امتیاز تھا۔ مجھے یاد ہے جب انھوں نے "صلاح کار" لکھی ہے تو ہم لوگ خوب ہنستے تھے کہ خدا کی شان! نوجوانوں کے

صلاح کار محمد علی چچا بن گئے، جن کے دل پھینک اور دل نواز ہونے کے چرچے سارے ضلع میں پھیلے ہوئے تھے۔

انگریزی تہذیب سے مرعوب تھے اور اپنی تہذیب کے عاشق۔ اسلامی اور ہندوستانی کلچر نے ان کا دل موہ لیا تھا۔ خاص طور سے مسلمان عورتوں کو وہ چاہتے تھے کہ اس راہ سے قدم نہ ہٹائیں۔ ویسے تعلیم نسواں کے ان دنوں بہت بڑے چمپین تھے۔ ایک روز کہنے لگے، بھئی بیوی کو تو ایسا ضرور ہونا چاہیے کہ اپنے شوہر کی خوش ذوقی و سخن شناسی کی قدر داں ہو اور اسے سمجھ سکتی ہو۔ تمھیں معلوم ہے؟ فلاں صاحب کا کیا لطیفہ ہوا۔ اتنا بڑا شاعر سارا وقت فکر سخن میں کھویا رہنے والا۔ اس نے بیوی سے نکھٹو کا خطاب پایا۔ ایک دن ان کے دماغ میں ایک مصرع آیا۔ مصرع بڑا زوردار تھا۔ دن گزر گیا، رات آگئی، چراغ پاس رکھے اور قلم ہاتھ میں لیے بیٹھے ہیں مگر دوسرے مصرع کا تک ہی نہیں بیٹھ رہا تھا۔ ایک بارگی روشنی نمودار ہوئی اور دوسرا مصرع برجستہ نکل پڑا زور سے پکار اٹھے وہ مارا۔ کیا لاجواب شعر ہوا ہے۔

بیوی سو چکی تھی۔ آواز سن کر چونک پڑی اے ہے کیا ہوا۔ کیوں چلائے۔ عاجزی سے کہا۔ بیگم بس سن لو۔ کیا معرکے کا مطلع ہوا ہے۔ شعر کچھ اس قسم کا تھا (اگرچہ انھوں نے سنایا تھا یاد نہیں رہا) باغ تھا، بہار تھی شبنم نے رات کو موتی لٹائے تھے اور سرو ناز نظارہ۔ صبح میں محو تھی تشنہ لبان دیدار، ہم جلوے تھے وغیرہ وغیرہ۔

بیوی نے شعر سن کر کروٹ بدل لی "میں کہتی ہوں تم جھوٹ کتنا بولتے ہو۔" یہ داد ملی، بےچارے کا منھ اتنا سا رہ گیا۔

ایک دن اپنی نئی نئی شادی کا اور بیوی پر فریفتگی کا قصہ بیان کرنے لگے کہ میری بیوی کے پیٹ میں زور کا درد اٹھا۔ میں دواؤں پر دوائیں دے رہا تھا اور وہ مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھی۔ اتنے میں قصبے کی ایک بیوی ملنے کو آگئیں۔ وہ کراہ رہی تھیں اور میں بے تاب ہو رہا تھا۔ درد کی شدت سے انھوں نے ایک چیخ ماری اور میں دیوانہ وار یہ کہتا ہوا ان پر جھک پڑا "جان من میں کیا کروں کیسے تمھاری تکلیف دور کروں۔"

مہمان بیوی نے جو یہ سماں دیکھا تو ڈوپٹے سے اپنا آدھا چہرہ ڈھک لیا۔ اور بولیں "بھیا مجھے کوئی ڈولی بلا دو میں اپنے گھر جاؤں، اب یہاں جان من وان من ہونے لگا ہے۔"

مولانا کرامت حسین نے اسکول کھولا تو پہلی لڑکیاں محمد علی چچا کی داخل ہوئیں میرے والد کو شاید وہ راضی نہ کر سکے اس لیے میری حسرت پوری نہ ہو سکی۔

دو ہی سال کے اندر ماں نے آفت مچا دی اور دونوں بڑی لڑکیاں واپس بلائی گئیں۔ تب ان کی تعلیم کے لیے ایک حسین نوجوان انگریز لیڈی کا تقرر ہوا، جو انھیں لکھنا پڑھنا اور بولنا سکھاتی تھی۔

لڑکیاں تو برائے نام تعلیم حاصل کر سکیں مگر چچا کے تعلقات اتنے بڑھ گئے کہ چچی کو اندیشہ پیدا ہو گیا اور والدہ تو شمشیر برہنہ ہو گئیں۔ ناچار ٹیچر صاحبہ کو رخصت کرنا پڑا۔ انھوں نے اپنے اور بچی کے گزارے کا دعویٰ دائر کر دیا۔ آخر کار وکلاء نے درمیان میں پڑ کر خطیر رقم ماں بچی کی کفالت کے لیے دے کر چھٹکارا دلوا دیا۔

بیوی بڑی خدا ترس، مرنجاں مرنج اور مذہبی تھیں۔ حج کو جانے لگیں تو چچا بمبئی تک چھوڑنے گئے۔ جدائی کے وقت بیوی کے آنسو نکل پڑے۔ پھر کیا تھا۔ دوڑ دھوپ کر کے جہاز پر جگہ حاصل کی اور خود بھی حج کو روانہ ہو گئے۔ یہ خبر سن کر سب حیران رہ گئے۔

واپس آئے تو ہم نے کہا۔ چچا آپ اور حج۔ یہ معجزہ کیسے ہو گیا۔ کہنے لگے یہ بیوی تھی جو مجھے اس دربار میں لے گئی۔ مگر مدینے پہنچ کر بہت ہی دل خوش ہوا۔ بے حد لطف آیا۔

حج سے آنے کے بعد نماز بھی پڑھنے لگے۔ انھوں نے ایک کتاب "میرا مذہب" بھی لکھی اور اسے پڑھ کر مجھ سے خاصا الجھا دا رہا۔ میں نے کہا، مجھے اس پر اعتراض نہیں کہ آپ شیعہ فقہ پسند ہیں۔ کیوں کہ میں دونوں فقہ سے نابلد ہوں۔ مگر سوال یہ ہے کہ شیعہ فقہ میں آپ کو صرف متعہ اور تقیہ ہی کیوں پسند آیا۔ اگر تقیہ شریعت کی چیز تھی اور جائز تھی تو حضرت علیؑ نے، حضرت امام حسنؑ و امام حسینؑ نے اور حضرت زینبؓ نے کیوں تقیہ نہیں کیا؟

کہنے لگے۔ امام تقیہ نہیں کر سکتا۔ یہ تو عوام اور کمزوروں کے لیے جائز ہے۔ بہت دیر اس پر بحث رہی، مگر نہ وہ مجھے قائل کر سکے نہ میں انھیں۔

شادی بھی سنّی بیوی سے ہوئی۔ اور ایسی کٹر کہ سب صعوبتیں سہہ لیں مگر ٹس سے مس نہ ہوئیں۔ آخر کار چچا نے خاندان والوں سے ان کا پیچھا چھڑایا اور سب کو اس پر راضی کر لیا کہ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔

دوسرا نکاح بھی سنی عورت ہی سے کیا۔ شیعہ اور سنی فقہ سب پڑھ ڈالیں۔ قرآن اور حدیث کا ورد رکھا۔ ادبی ذوق کی تکمیل کے لیے تمام شعرا اور ادیبوں سے تعلقات بڑھائے۔ اچھا کتب خانہ جمع کر رکھا تھا۔ ہر موضوع پر اور ہر زبان میں پڑھتے تھے۔ اس لیے بہت وسیع معلومات تھیں۔

۲۱ء سے ۳۰ء تک کانگریس سے بھی بہت دل چسپی رہی۔ جواہر لال جی سے دوستانہ تعلقات رہے۔ ایک تکیے دار چرخا بھی ایجاد کیا تھا۔ مجھے بھی تحفہ دیا تھا۔ اور اس کا نام "چمرو چرخا" رکھا تھا۔ چمرو ان کے نام کا جزو تھا جسے فخریہ استعمال کرتے تھے۔ ان کی ماں کے بچے نہیں جیتے تھے۔ ایک کثیر الاولاد چمار کے ہاتھ انھیں ٹکے میں بیچ دیا تھا۔ اس لیے چمرو، ان کا تخلص بن کر رہ گیا تھا۔ اس چمار کے خاندان پر ہمیشہ نظر عنایت رہی۔

محمد علی چچا، جیسا کہ میں پہلے کہہ چکی ہوں، بیوی کے عاشق زار ہوتے ہوئے بھی بلا کے

حسن پرست تھے ۔ خوب صورت خوب صورت کپڑا، حتیٰ کہ کراکری اور فرنیچر تک دیکھ کر لوٹ پوٹ ہوجاتے تھے ۔ اپنے بچوں سے شدید محبت تھی اور دوستوں کے بچوں سے بھی گہرا لگاؤ ۔

اکثر ان کی حسن پرستی کے قصے زبان زد عوام ہوتے ۔ چچا سے پوچھو تو کبھی انکار نہ کرتے ۔ جب یو ۔ پی کونسل میں زمان بازاری کے اخراج اور ان کو لائسنس عصمت فروشی نہ دینے کا سوال آیا تو محمد علی چچا نے مخالفت میں بڑی زوردار تقریر کی اور کہا کہ ہمیشہ سے رؤسا کے بچے علم مجلس سیکھنے کے لیے طوائفوں کے یہاں جاتے رہتے ہیں ۔

اور ہم لوگ یہ پڑھ کر ان سے جھگڑ پڑے ۔ بہت دیر گرما گرمی رہی ، ہنس ہنس کر انھوں نے بہت سے لطیفے سنائے ۔ مگر یہ ایک بات بڑے پتے کی کہہ گئے کہ اگر یہ اڈے ختم کر دیے گئے ، جہاں سوسائیٹی کا فاسد عنصر نکال کر ڈالا جاتا ہے تو ہر گھر میں ایسے اڈے کھل جائیں گے اور شریف زادیوں کی اصلاح ختم ہوجائے گی ۔

لطف یہ ہے کہ اپنی بیوی ، بیٹیوں اور تمام رشتہ داروں ، عورتوں کے لیے وہ اخلاق ، شرافت ، شوہروں سے وفاداری وغیرہ لازمی سمجھتے تھے ۔ مگر پرانے جاگیردارانہ نظام میں پرورش پانے کا اتنا گہرا اثر تھا کہ مردوں کے لیے نظر بازی و شاہد پرستی میں کوئی برائی نہیں سمجھتے تھے ۔ محمد علی چچا ، عجیب معجون مرکب تھے ۔ میرے والد کے تقدس و معصومیت کے قائل تھے ، مگر کسی مجتہد یا مولوی کی برتری و بزرگی پر برافروختہ ہوجاتے تھے ۔

وہ بہ یک وقت صوفی منش بھی تھے اور رنگین مزاج بھی ۔ ان کی ذات میں تلون ، سخاوت خوش مزاجی اور مغلوب الغضبی کا حیرت انگیز امتزاج تھا ۔ رسولؐ اور آل رسول سے محبت رکھتے ہوئے بھی نکاح خود بیٹھ کر پڑھ لیتے اور اس کو جائز سمجھتے اور بلا متعہ کیے کسی عورت سے ملنا گناہ سمجھتے تھے ۔

ہم لوگ ایک آدھ بار رات کو بھی ردولی پہنچے ۔ مگر پوری پوری خاطر مدارات سے مستفیض ہوکر رات کے بارہ ایک بجے واپس لوٹے ۔ اس وقت ان کی خوشی قابل دید ہوتی تھی ۔ چاہتے تھے کیا کچھ ہمیں کھلادیں اور کتنی خاطر کریں ۔

بلا کے ذہین ، غیر معمولی خوش مزاج ۔ کھلا ہوا دل ، کھلا ہوا ہاتھ ، وسیع مطالعہ اور زندگی کا بھرپور تجربہ ، کیوں کہ انھوں نے جی بھر کر زندگی سے لطف اٹھایا تھا ، بلا کسی دغدغے کھٹکے کے زندگی کی بہاروں میں ہر پھول سے رس نچوڑا تھا ۔

اور پھر وہ زمانہ بھی آیا کہ وقت نے چہرے پر اپنے نشان ثبت کر دینے شروع کر دیے ۔ سیاہی سفیدی سے ، سرخی تانبے سے اور اعضا کی توانائی فالج کی مار سے بدلی ۔

پہلی بیوی کے انتقال کو عرصہ ہوگیا تھا ۔ مگر ایک دن سج بن کر باہر نکلے تو ایک کاشت کار نے ٹوکا ۔ چودھری صاحب کیا بیاہ کرنے والے ہو اور پھر سچ مچ انھوں نے ایک جوان عورت

سے نکاح کر لیا۔

ایک بار لکھنؤ آئے تو کہنے لگے ۔ بھئی میں تو بڈھا ہوں اور یہ ہیں بالکل جوان ۔ اس لیے وجو (میرے بھائی) دیکھو اگر میں نہ رہوں، تو تم ان کی سرپرستی کرنا۔

میرے منھ سے بے ساختہ نکلا ۔ ہائے چچا چوہنی کتیا اور جلیبیوں کی رکھوالی ۔ محمد علی چچا بہت محظوظ ہوئے، جاکر سب لڑکیوں کو بتایا کہ آج انہیں نے یہ جملہ کہا ہے ۔ مگر قیصر (ان کی نئی بیوی) رو دیں ۔ انھوں نے بہت شکایت کی کہ تم نے میرے لیے ایسا کیوں کہا۔

آخر زمانے میں مسوری میں کافی دن ساتھ رہا ۔ نچلی منزل ان کے پاس تھی ۔ اوپر کی میرے پاس ۔ ان ہی دنوں ایک صاحب مع برقع پوش خاتون کے چچا کے پاس آئے اور طالب مدد ہوئے کہ مسوری میں جیب کٹ گئی ہے بہت پریشان ہوں ۔ نہ پیسہ پاس ہے نہ رہنے کا ٹھکانا اور زنانہ ساتھ ہے ۔ چچا بے ساختہ بولے ۔ "اور زنانہ بھی اپنا نہیں پرایا ہے ۔" اتنا سننا تھا کہ ان کا چہرہ فق ہو گیا ۔ چچا نے کچھ رقم ہاتھ پر رکھ دی اور وہ فوراً چل دیے ۔ ہم لوگوں نے کہا کہ آپ کو کیسے اندازہ ہوا کہ زنانہ پرایا ہے ۔ بہت ہنسے کہنے لگے ۔ "دریافت کر لو ۔ دوسرے ہی کا نکلے گا ۔" بعد کو معلوم ہوا کہ ان کا اندازہ صحیح تھا ۔ واقعی زنانہ کہیں سے اڑا لائے تھے ۔

پہاڑیوں کے رسم و رواج کا ذکر ہو رہا تھا کہنے لگے ۔ بھئی نینی تال میں ایک پہاڑی میرے پاس آیا ۔ کہنے لگا ۔ صاحب! آپ پڑھا لکھا آدمی ہے ۔ ہمارا ایک کاغذ لکھ دو ۔ میں نے قلم سنبھالا اور کہا بتاؤ کیا لکھوں ۔ اس نے کہا ہمارے پاس دو عورت ہے اور اس کا عورت مر گیا ہے ۔ مگر اس کے پاس ایک گھوڑی ہے ۔ ہم ایک عورت اس کو دے دیا ہے اور یہ اپنا گھوڑی ہم کو دے گا ۔ اس کا پکا کاغذ لکھ دو ۔ اور یہ عہد نامہ میں نے لکھ دیا ۔

عجیب باغ و بہار شخصیت تھی ۔ خالص جاگیر داری ماحول کی پیداوار ۔ نہ اب کسی کو اتنے مواقع ہیں نہ فرصت ۔ اس لیے میں نے سوچا ایک ہلکا سا خاکہ پیش کر دوں ۔ کیوں کہ اس دور میں نہ ایسی شخصیتیں بنیں گی، نہ ان کی ضرورت ہے ۔ ایک بات اور بتا دوں ۔ بوالہوسی سے سخت نفرت کرتے تھے اور فن کارانہ عیاشی کو آرٹ سمجھتے تھے اور اپنا پیدائشی حق ۔

خدا مغفرت کرے ۔ جب تک جیے خوش رہے ۔ دوسروں کو خوش رکھا اور سب کو خوش دیکھنا پسند کیا ۔ آخر میں فالج سے معذور ردولی میں بیٹھ رہے تھے ۔ بچے سب پاکستان چلے گئے تھے ۔ دو چھوٹے لڑکے پاس تھے ۔ اس میں ایک خبط الحواس تھا ۔ دوسرا ابھی پڑھ رہا تھا ۔ اس وقت وہی ردولی میں ان کا نام لیوا ہے ۔ بڑی حسرت و غم سے پاکستان جانے والے لڑکے و لڑکیوں کو یاد کرتے تھے ۔

محفلوں کی رونق، جلسوں کے صدر نشین، دوستوں کے محبوب اور مذہبی حلقوں سے بر سرپیکار ۔ یہ تھے محمد علی چچا!

(بقیہ صـ۱۹۱ پر)

"گیسری کشور" کابقیہ:-

"کلام زوردار ہوگا تو تعریف کرنا ہی پڑے گی۔"

بہت دیر تک خاموش رہنے کے بعد وہ بولے:

"بڑی سخت گرمی پڑ رہی ہے، مگر بارش کے آثار ہیں۔ پانی برستے ہی مجھ سے ملنے آنا۔"

دوسرے دن میں باہر سے اپنے گھر میں داخل ہوا تو چھوٹے بھائی نے پوچھا:

"آپ ڈاکٹر کشور کے یہاں سے آرہے ہیں؟"

"نہیں۔ کل یا پرسوں جاؤں گا۔"

"ان کے یہاں سے فون آیا تھا۔ وہ ختم ہو گئے۔"

========

جب میں ولی الحق صاحب کے ساتھ گومتی کے گھاٹ پر پہنچا تو چتا کو آگ دی جا چکی تھی اور اس کے اوپر شمشان کی چھت کا مین شعلوں سے تپ کر سرخ ہونے کے قریب تھا۔

○ ○ ○

"مکاتیب" کابقیہ:-

تھے مگر جگہ کے تخفیف میں آنے کی وجہ سے یہ سوال تھا کہ وہ واپس سٹی اسکول جائیں یا شادانی صاحب کی دعوت پر پاکستان چلے جائیں۔ اختر انصاری صاحب چاہتے تو یہ تھے کہ شعبۂ اردو میں رہیں مگر یہ نہ ہو سکا۔ رشید صاحب نے کوشش کر کے انھیں ٹریننگ کالج میں لکچرر مقرر کرا دیا۔ بالآخر یہیں سے ریٹائر ہوئے مگر شعبۂ اردو میں نہ رہنے کا رنج انھیں ہمیشہ رہا۔ "دہانِ زخم" ان کا مجموعۂ کلام، افسانوں کے کئی مجموعے، "ایک ادبی ڈائری" اور "غزل کی تدریس" ان کی اہم کتابیں ہیں۔ جذباتی تھے اور کچھ قنوطی بھی۔ اپنی بدقسمتی کا اکثر تذکرہ کرتے تھے۔ میں چونکہ ان کا ہمدرد تھا اس لئے مجھے کبھی کبھار اپنی دلی کیفیت سے مطلع کرتے رہتے تھے۔ انھوں نے اپنی بدقسمتی کا جس انداز سے ذکر کیا ہے اس سے غالب کے ایک خط کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

۶۔ شمس الرحمٰن فاروقی کا خط اس لئے شامل کیا جا رہا ہے کہ اس میں "روزمرہ" اور "محاورہ" کے سلسلے میں ایک اہم بحث آگئی ہے۔ ان کے کسی مضمون میں اس مسئلے کا ذکر تھا۔ میں نے حالی کے حوالے سے ان کے نقطۂ نظر کی مزید وضاحت چاہی تھی۔ انھوں نے اس خط میں اپنی بات کہہ تو دی ہے لیکن میرے خیال میں ابھی اس مسئلے پر مزید گفتگو کی گنجائش ہے۔

مکاتیب

- اثر لکھنوی
- احمد شاہ بخاری (پطرس)
- حامد حسن قادری
- احتشام حسین
- اختر انصاری
- شمس الرحمٰن فاروقی

آل احمد سرور کے نام

کشمیری محلہ، لکھنؤ - ۲ / جون ۱۹۵۵ء

مکرمی! تسلیم ــــــــ اپنی تصنیف "ادب اور نظریہ" کے صفحہ ۲۳۶ کی یہ عبارت ملاحظہ فرمائیے:

"ہم نے بعض روایات کو اہمیت دے رکھی ہے اور بعض کو نظر انداز کر دیا ہے۔ مثلاً آتش نے کہا تھا ؎

بندش الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں　　شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

آتش نے الفاظ میں وہ چمک دمک پیدا کی ہے جو نگینوں میں ہوتی ہے۔ ان کی مرصع سازی میں ایک حیرت انگیز چستی اور نفاست ہے مگر شاعری صرف مرصع سازی نہیں ہے ..... اردو شاعری میں حسن کاری کی روایت جب مرصع کاری میں محدود ہو گئی تو گویا حسن کاری کا تصور محدود ہو گیا۔ شیفتہ صفا بندش، معانی خوبصورت کے قائل تھے ......"

آپ نے آتش کے قطعہ بند دو اشعار کا صرف آخری شعر لے لیا۔ پورا قطعہ یوں ہے ؎

کھینچ دیتا ہے شبیہ شعر کا خاکہ خیال　　فکر رنگیں کام اس پر کرتی ہے پرداز کا

بندش الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں　　شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

آتش نے شاعری کو صرف الفاظ کی چمک دمک تک محدود نہیں کیا ہے۔ بلکہ حسن ادا، خوبی تخیل دونوں کو ضروری سمجھا ہے۔ شعر کو ایک مرصع کار زیور کہا ہے۔ اس زیور کا خاکہ خیال نے تیار کیا، فکر رنگیں نے اس کے نقش و نگار ترتیب دئے، اگر کہیں کھردرا پن تھا تو اس کو دور کیا۔ پھر یہ طے کیا کہ اس زیور میں کون کون سے جواہر (بیچ نگ) کہاں کہاں جڑے جائیں۔ قد کیا ہو، رنگ کیا ہو۔ خیال نے ایک صورت اختیار کر لی اور اس کی حدیں مقرر ہو گئیں۔ اب طبیعت نے الفاظ کے نگینے جڑنے شروع کئے اور شعر عالم ظہور میں آیا۔ تخیل مجسم ہو گئی۔ اگر نگوں (الفاظ) کے انتخاب اور ان کی ترتیب میں سلیقہ نہیں برتا گیا یا خود زیور کا خاکہ (تخیل) بھدا یا کاواک ہے یا تخیل اور الفاظ اور آلۂ اظہار تخیل میں توازن و تناسب (تال میل) نہیں ہے تو اہل نظر اسے صناعت کا عمدہ نمونہ قرار نہ دیں گے۔ یہ امر بدیہی ہے کہ آتش نے صرف الفاظ میں چمک دمک پیدا نہیں کی ہے بلکہ حسن تخیل کو بھی اہمیت دی ہے، بلکہ مقدم رکھا ہے۔ خود زیور بھدا ہے تو نگ جتنے بھی خوش رنگ و آب و تاب ہوں، اس کا بھدا پن دور نہیں کر سکتے۔

آپ نے ستم بالائے ستم یہ کیا ہے کہ آتش کی شاعری کو بندش الفاظ تک محدود کر دینے کے بعد معانی کی اہمیت اجاگر کرنے کو یہ قول شیفتہ (نواب مصطفیٰ خان) سے منسوب کیا ہے۔ "صفا بندش معانی خوبصورت" حالاں کہ یہ مصرع بھی بہ ادنیٰ تغیر تخریب آتش ہی کا ہے، شیفتہ جس کے مالک بن بیٹھے ہیں۔ اور یہ شاید فطرت کی ستم ظریفی ہے کہ مقطع کا مصرع ہے جس میں اس کا تخلص موجود ہے ؎

ہلادیں دل نہ کیوں اشعار آتش　　صفا بندش ہے معنی خوبصورت

اس نے شعر پر کھنے کا پورا گُر بتا دیا ہے۔ بندش میں گنجلک نہ ہو، تخیّل میں حسن اور ترفّع ہو۔ اسی کے ساتھ تاثیر ہو اور ایسی تاثیر کہ سامع کے دل کے ایک ایک تار کو چھیڑ کر یا جھنجھوڑ کر نغمے یا نوحے کا آہنگ پیدا کر دے۔

حیرت یہ ہے کہ آپ کے ایسے محتاط اور وسیع النظر نقّاد سے ایسے تسامحات سرزد ہوں۔ میں نے جو کچھ عرض کیا ہے اُسے منظرِ عام پر لانا نہیں چاہتا صرف آپ کے گوش گذار کر دیا۔ ایک پرستارِ ادب کی حیثیت سے۔

امید ہے آپ مع الخیر ہوں گے۔ بیماری میرا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ نیازمند: اختر

کشمیری محلّہ، لکھنؤ - ۲۱ر جون ۱۹۵۵ء

مکرمی! تسلیم ——— خدا کا شکریہ۔ میں آج شام کو رانی کھیت جا رہا ہوں۔ وہاں اور نینی تال میں تقریباً ڈیڑھ ہفتے قیام رہے گا۔ میری کتابیں منتشر پڑی ہوئی ہیں اور کوئی فہرست بھی مرتب نہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ ببلوگرافی کے لئے مواد فراہم نہ کر سکوں گا۔

آپ کی غزل دیکھی۔ ماشاءاللہ خوب ہے۔ امتثالِ امر میں عرض کرتا ہوں کہ اگر مطلع اس طرح ہو تو کیسا ہو؎

حسن سے جلوۂ صد رنگ چھپائے نہ بنے　　عشق سے پردۂ نیرنگ اٹھائے نہ بنے

مکمّل ترصیع ہے۔ حسن سے، عشق سے۔ جلوۂ صد رنگ، پردۂ نیرنگ۔ چھپائے، اٹھائے۔ حسن و عشق کی ماہیت کی طرف بھی خیال رجوع ہوتا ہے۔ حسن کی رنگا رنگی عشق ہی کا نیرنگ یا افسوں ہے مگر کہتے نہیں بنتی ورنہ حسن بھی عشق ہی کا ایک مظہر ثابت ہو۔ وہ عشق ہی تھا جس نے حسن کو جلوہ نمائی اور چمن آرائیِ جلوہ پر مائل کیا ورنہ ہُو کا عالم تھا۔

وائے وہ جلوہ جسے دور سے دیکھا کیجے　　وائے وہ جام جو ہونٹوں سے لگائے نہ بنے

جلوے کے متعلق "وائے" استعمال کرنا جلوے کی توہین اور منقصت ہے۔ میرے نزدیک اس جگہ "ہائے" چاہئے۔ "دور سے دیکھا کیجے" سے "دور سے تکتے رہئے" غالباً بہتر ہو۔ "تکنے" میں اشتیاق و آرزو کا اظہار ہے۔ "دیکھنے" میں یہ پہلو نمایاں نہیں ہوتا۔ دوسرے مصرعے میں "ہائے" کو "حیف" سے بدلا جا سکتا ہے۔

گر جنوں دے نہ اُسے تاب و تواں اور سرور　　عقل کا بار بھی انساں سے اٹھائے نہ بنے

پہلا مصرع پھُس پھُسا ہے (معافی کا خواستگار ہوں) اور "اور" کا کوئی محل نہیں۔ میرے نزدیک یہ مصرع شاید یوں چست ہو جائے ؏ یہ حقیقت ہے جنوں آڑے نہ آئے تو سرور۔ میں نے بربنائے محبّت اور آپ کے دریافت کرنے پر یہ جرأت کی ورنہ ایاز اپنی قدر پہچانتا ہے۔

جوشؔ پر جو مضمون میرا ہے وہ نہ چھاپئے۔ مصلحت نہیں۔ جب چھپے گا تو میرے نام سے چھپے گا۔ فرضی نام سے نہیں۔ نیازمند: اختر

کشمیری محلہ، لکھنؤ۔ ۱۹ ستمبر ۱۹۵۷ء

مکرمی! تسلیم ——— ۱۵ ستمبر کے "ہماری زبان" میں آپ کا خط پڑھا۔ چند واقعات جو غالباً آپ کے علم میں نہیں، بیان کر کے آپ سے فیصلے کی استدعا کروں گا کہ میں کہاں تک قصوروار ہوں اور فراقؔ صاحب کہاں تک ذمّہ دار ہیں۔

جولائی ۱۹۳۷ء کے "نگار" میں ان اشعار پر فراقؔ صاحب کی تنقید ملاحظہ فرمائیے۔ شعر پروفیسر بیخودؔ موہانی مرحوم ؎

نشیمن پھونکنے والے ہماری زندگی یہ ہے
کبھی رو دئیے کبھی سجدے کئے خاکِ نشیمن پر

تنقیدِ فراق: "......حضرت بیخود کے اس شعر میں رونے والے کے بگڑے ہوئے چہرے کے ساتھ ہی بہتی ہوئی ناک اور منھ سے گرتی ہوئی رال، ناک کی سُرخی اور تھرتھراہٹ، آنکھ کی سرخی اور گندگی بھی نظر آ رہی ہے جس سے شعر نہایت گھنونا ہو گیا ہے۔ اور مظلوم کے غم کا احترام یا اس کے ساتھ ہمدردی پیدا ہونے کے بجائے اس ذلیل قسم کی رقّت سے نفرت و بیزاری پیدا ہوتی ہے۔ یہ رونا نہیں ہے، یہ سوز و ساز نہیں ہے، یہ زخموں کی سینہ کوبی ہے، یہ اظہارِ غم نہیں، جھک مارنا ہے۔ اور یہ ابتذالِ لب و لہجہ سے پیدا ہوتا ہے۔"

شعر صفیؔ مرحوم ؎

دیکھئے کیوں کوئی تربت ہوگی
آپ کو مفت ندامت ہوگی

تنقیدِ فراق: "......ردیف کی شوخی اور مختصر انداز نے شاعر کو اس امر پر غور کرنے کا موقع ہی نہیں دیا کہ آخر میں کیا کہہ رہا ہوں، کتنی ذلیل چٹکی لے رہا ہوں، کتنا بازاری طرز اس شعر میں آگیا ہے، کتنی خباثتِ روح کا اظہار کر رہا ہوں......" میں نے جواب دیا اور مندرجہ بالا اشعار کی خوبیاں دکھائیں۔

اپنے دوسرے مضمون مندرجہ رسالہ "کلیم" دہلی ۱۹۳۸ء میں فراقؔ صاحب نے حملے کا رُخ بدل دیا اور بیخودؔ مرحوم کے شعر کو اس طرح اصلاح دی: "کبھی رو دئیے کبھی چپ ہو رہے شاخِ نشیمن پر"۔ نیز اپنے متعدد اشعار اس دعوے کے ساتھ پیش کیے کہ "اثر ان کو بھی ہاتھ لگائیں اور میری ہرزہ سرائی کو اجاگر کریں"۔ میں نے اس کی بھی تعمیل کر دی۔ فراقؔ صاحب کی یہ چال جب شہرت حاصل کرنے میں ان کی معین نہیں ہوئی تو انھوں نے خود اپنے اور دوسروں کے نام سے پروپگنڈا شروع کیا۔ ایک ایسے مضمون کا حوالہ رسالہ "پروین" الٰہ آباد۔ بابت ۱۹۴۸ء میں ہے۔ دو اقتباسات ملاحظہ ہوں:

"میری رائے میں تو آنند نارائن ملّا کی غزلوں کے ساتھ آج تک کی غزل گوئی کی کہانی کو ہم ختم کر سکتے ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو میری ناچیز کی کوششیں بھی شامل کر لیں لیکن ان کے بارے میں کیا کہوں۔"

آنند نارائن ملّا کو محض دھوکے کی ٹٹّی بنایا گیا تھا کیوں کہ اس وقت یہ عام افواہ تھی کہ انھوں نے اردو میں شعر کہنا ترک کر دیا ہے۔

لہٰذا اردو کے واحد مالک فراقؔ صاحب رہ گئے اور جو کچھ کہا وہ اپنے متعلق اور اپنی ثنا و صفت میں کہا۔ ایک نمونہ ملاحظہ فرمائیے:

"خاص کر حسن کو سمجھنا اور حسن سے ہم آہنگی، حسن کی نئی ہمدردی، ایک نئی بے صبری اور ایک نیا صبر، ایک نئی داخلی معاملہ بندی جو ہمیں اس دور میں ملتی ہے وہ میرؔ، غالبؔ، مومنؔ، جراتؔ اور داغؔ کے یہاں نہیں ملتی......"

میرؔ، غالبؔ وغیرہ یوں دفنا دئے گئے۔ اب متاخرین کی باری آئی۔ ارشاد ہوتا ہے:

"میں نے حسرتؔ و اقبالؔ، یاسؔ یگانہ، اصغرؔ، فانیؔ، جگرؔ کے دور کو لگ بھگ ۱۹۱۵ء سے شروع کر کے لگ بھگ ۱۹۳۵ء میں اب سے چار برس پہلے ہی کیوں ختم کر دیا......"

اس سے واضح ہو گیا کہ مضمون ۱۹۳۹ء میں لکھا گیا تھا یعنی بجنود اور مصحفی پر حملے کے بعد۔ جب سے یہ پروپگنڈا برابر جاری ہے اور حیرت ہوتی ہے کہ جن شاعروں کے نام لئے گئے اُن کے ماننے والوں کے منہ میں گھنگھنیاں بھری ہوئی ہیں۔ اور کوئی صدائے احتجاج بلند نہیں کرتا۔ صرف ایک اثرؔ فراقؔ صاحب کی راہ میں کانٹے کی طرح کھٹک رہا ہے۔ اس کو گالیاں دے کر خاموش کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ستمبر کے "ساقی" میں حسنؔ عسکری صاحب نے فراقؔ صاحب کی حمایت میں قلم اٹھایا ہے۔ لطف یہ ہے کہ آج تک میں نے فراقؔ صاحب کے بیسیوں اشعار پر اعتراض کیا اور اصلاحیں دیں، کسی ایک کا بھی جواب نہیں دیا گیا (اسرورؔ صاحب نے بالکل غلط لکھا ہے کہ فراقؔ صاحب نے اعتراضات کا جواب دیا۔ وہ ایک بھی مثال اپنے ادّعا کے ثبوت میں پیش نہیں کر سکے) نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ ایک صاحب نے تمام شاعروں کو جو فراقؔ صاحب کی طرح مردی یا بہیمیت کا مظاہرہ نہیں کرتے، نامرد کا خطاب دے دیا ہے۔ اور وہ شخص شاعر عزا ہے جو نامرد شاعروں کا مال چُراتا ہے:

غالبؔ: کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے — پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھائے نہ بنے

فراقؔ: ان حجاباتِ دو عالم کو پہنچتے نہیں ہاتھ — پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھائے نہ بنے

شاہ ظفرؔ: اس طرف بھی تمہیں لازم ہے نگاہ ہے گا ہے — دم بدم لحظہ بہ لحظہ نہیں گاہے گاہے

فراقؔ: کون کہتا ہے ہر اک سے نہ ملے تیری نگاہ — نگہِ ناز مری سمت بھی گاہے گاہے

صباؔ لکھنوی: دل میں اک درد اٹھا آنکھوں میں آنسو بھر آئے — بیٹھے بیٹھے ہمیں کیا جانئے کیا یاد آیا

فراقؔ: مری پلکوں کے نیچے اک نمی سی تھرتھراتی ہے — نہیں معلوم دل کو آج کس کی یاد آتی ہے

آپ ہی انصاف سے کہئے کہ زبان "یاد آتی ہے" یا "یاد آ رہی ہے" صحیح ہوگی کہ یاد آتی ہے"۔

میرؔ: جائیں تو جائیں کہاں، جو گھر رہیں کیا گھر رہیں — یا دین لگتا نہیں جی، کاش کہ ہم مر رہیں

فراقؔ: گھر رہوں یا کہیں نکل جاؤں — کیا کروں چھٹ کے تجھ سے کیا نہ کروں

جگر: کیا عشق نے سمجھا ہے کیا حسن نے جانا ہے ہم خاک نشینوں کی ٹھوکر میں زمانا ہے

فراقؔ صاحب نے پہلے مصرعے سے پورا شعر ترتیب دے دیا ؎

حسن کو تو نے کیا جانا ہے عشق کو تو نے کیا سمجھا ہے

میں یہ نہیں کہتا کہ فراقؔ صاحب نے آج تک کوئی اچھا شعر کہا ہی نہیں۔ کہے اور میں نے تعریف بھی کی مگر وہ گوشے سمجھ میں نہیں آتے جن کی بنا پر تمام شعرائے ماضی وحال کی افسری ان کو بخشی گئی ہے۔ میں نے بیشتر اُن کے ایسے اشعار کو پرکھا جو اُن کے بہترین سمجھ کر پیش کئے گئے تھے۔ مجھے تو اُن میں مشکل سے پانچ فیصد کام کے اور بے عیب معلوم ہوئے۔

میں نے صورت حالات اپنے حتیّ المقدور اختصار کے ساتھ عرض کر دی۔ اگر آپ اب بھی یہی فرمائیں گے کہ فراقؔ کے کلام پر تنقید نہ کیا کرو تو میں بسر وچشم تعمیل کروں گا مگر یہ فرمائیں کہ تنقید کروں مگر متانت کے ساتھ تو یہ میرے لئے ناممکن ہے۔ مثلاً جنّت ماں کے قدموں کے نیچے سمجھی جاتی ہے مگر فراقؔ صاحب فرماتے ہیں:

موجزن کوثر و تسنیم تری زلفوں میں جنّتیں مجھ کو ملی ہیں ترے قدموں کے تلے

قلم سے بے اختیار یہ فقرہ نکلتا ہے کہ "نہ معلوم دودھ بخشوانے کے مدے کیا سمجھوتا ہوا۔"

سمع خراشی کے لئے معافی کا خواستگار ہوں نیازمند: اثرؔ

(○)

۴۶۔ جیل روڈ، لاہور۔ ۱۹ رجون ۱۹۳۵ء

محترم بندہ! سلام مسنون ———— مجموعۂ کلام موصول ہوا۔ "برائے ریویو" دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا تھا کہ یہ صاحب چین سے لطف اندوز نہ ہونے دیں گے۔ پھر سوچا کہ اخلاقاً لکھ دیا ہوگا۔ یہ معلوم نہ تھا کہ آپ اصرار بھی کریں گے۔ آپ تحسینِ ناشناس اور سکوتِ سخن شناس دونوں سے باخبر ہیں۔ ایک تیسری چیز یعنی سکوتِ ناشناس آپ کے ذہن سے اتر گئی۔ ورنہ عجب نہیں کہ آپ مجھے اس سے فائدہ اٹھانے دیتے۔

میں دیباچے اور ریویو لکھنے سے گھبراتا ہوں۔ بڑے بوڑھوں کی سی حرکت ہے۔ اپنی کہولت کا احساس ہوتا ہے۔ رہ رہ کر یہی خیال آتا ہے کہ بس اب لوگ تم سے دیباچے اور ریویو لکھوایا کریں گے۔ تم جیتے جی آباء و اجداد میں شامل ہو گئے۔ کام اور لوگ کریں گے تم اظہارِ رائے کیا کرو گے۔ تمہارا تصنیف کا مختصر سا دور ختم ہو لیا۔ آپ ہی کہئے، حقیقت سے یوں دوچار ہونا کیونکر گوارا کر لوں۔

علاوہ بریں ریویو میں اکثر جھوٹ بولنا پڑتا ہے۔ لیکن یہ سمجھ کر کہ آپ ہم پیشہ ہیں، جانتا ہوں کہ یہ مجبوری "سلسبیل" کے معاملے

میں پیش نہ آئے گی۔ اور حق تو یہ ہے کہ آپ کے کلام کو سراہنے کے لئے ضمیر کا خون کرنا قطعاً ضروری نہیں۔ سچ سچ عرض کروں گا تو زیادہ سے زیادہ اپنی ساکھ بگاڑوں گا۔ آپ کے کلام پر آنچ نہ آئے گی۔

چنانچہ بہ تعمیلِ ارشاد "متاعِ عقل کو رسوا سرِ بازار کرتا ہوں"۔ مجموعہ شروع سے آخر تک پڑھا۔ بعض نظمیں اور بعض نظموں کے اشعار تو اس قدر پسند آئے کہ کئی مرتبہ پڑھے اور دوستوں کے حلقے میں سنائے۔ کشمیر والی نظموں میں آپ کو وہی دقت پیش آئی ہے جو اکثر جدید شعرا کو پیش آتی ہے۔ وہ یہ کہ پرانے الفاظ اور ترکیبوں کے ذریعے سے نئے نئے خیالات کا اظہار کیونکر کیا جائے؟ یہ کیونکر ہو کہ آغوش، جلوہ، ضیا، خورشید، گلگشت، ارنگیں قبا، گلستان، پردہ (حجاب، عریاں.....) موج، سیماب، خرام ناز (محشر.....) سرمستی (بادہ) وادی ایمن، تبسم، مہتاب، شباب، شراب..... یہ ساز و سامان تو بدلنے نہ پائے لیکن لباس کی قطع پھر بھی نرالی ہو۔ اس لئے میں آپ کی ہمت کی داد دیتا ہوں۔ اس بندش کے ہوتے ہوئے اگر کوئی ترش رو آپ کی مساعی کے متعلق یہ کہے کہ "رگوں میں لہو تیز تر دوڑتا تھا۔ مگر رنگ لایا نہ تھا قلب مضطر" تو میں یہ سمجھوں گا کہ پھر بھی آپ بے انتہا تحسین کے مستحق ہیں۔ ہماری شاعری الفاظ کی غلام ہے۔ دشت کے ساتھ مجنوں کا لفظ یا مجنوں کا خیال ایسا چپکا ہوا ہے کہ اس سے پیچھا چھڑانا مشکل ہے۔ وہ دن دور نہیں کہ آپ جیسے جدت طرازوں کے طفیل الفاظ شاعر کے غلام بن جائیں۔ لیکن ابھی ہمیں وہ آزادی حاصل نہیں ہوئی۔ چنانچہ سخن گو اور سخن فہم دونوں اس غلامی میں پل رہے ہیں۔ اسی نے "وہ موتی کہ ہے آبروئے سمندر" ایک رسمی نظم بن کر رہ گئی ہے۔ حالاں کہ اس میں جذبات جا بجا سطح کو توڑ کر شعر میں بہہ نکلتے ہیں۔ اور اس بات کا پتہ دیتے ہیں کہ لکھنے والا شاعر ہے، شعبدہ باز نہیں۔ "چلئے" "دعا" اور "شاہ دلگیر" میری رائے میں بہت کامیاب نظمیں ہیں۔ خصوصاً "شاہ دلگیر" کہ اس میں پڑھنے والے کو ابتداء، وسط اور تکمیل کا احساس ہوتا ہے۔

جب "پیام یار" کا دور گزر گیا تو اردو شاعری سے امیدیں وابستہ ہونے لگیں۔ تھوڑے عرصے کے بعد ثابت ہوا کہ محض یار ہی غائب ہوا ہے۔ اب صرف پیام کا دور دورہ ہوگا۔ خدا کا شکر ہے کہ بحیثیت مجموعی آپ اس سے مصئون ہیں۔ اس لئے جب آپ فرماتے ہیں کہ "رازِ حیات قوم پہ افشا کریں گے ہم" تو میں اسے اقبال کی صحبتِ بد کا اثر سمجھتا ہوں۔ اور آپ کے اس قبیل کے اشعار کو، جن کی تعداد الحمدللہ بہت تھوڑی ہے، آپ کی نیک نیتی پر محمول کرتا ہوں۔ اور "اے مسیحا تو نے مسلم لیگ کو زندہ کیا" "یا کامریڈ کا تو نے لہرایا فضاؤں میں علَم" یا اسی قسم کے اور مصرعوں کو، جن سے ارشد گورگانی علیہ الرحمہ کی یاد تازہ ہوتی ہے آپ کے بقیہ کلام کا ہم پلہ نہیں سمجھتا۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ آپ جب چاہیں فرسودہ یعنی مردہ الفاظ کو زندہ کر سکتے ہیں۔ "ہوائیں لے کے آئی ہیں بہاریں....." والی نظم (غزل؟) اس بات کی شاہد ہے۔ مختصر ہے مگر بہت خوب۔ بالعموم بھی آپ کی غزلیں بہت بلند پایہ ہیں۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

میری کوئی بات ناگوار گزرے تو للہ معاف کر دیجئے۔ میں آپ کی بڑائی اسی میں سمجھتا ہوں کہ ہم جیسے بیکار، آپ جیسے کے متعلق جو منہ میں آئے کہا کریں اور آپ ماتھے پر بل نہ آنے دیں۔ پھر اگر کوئی شخص مدّاح و معترف ہو اور بہ سبیلِ تذکرہ نکتہ چینی بھی کر بیٹھے تو آپ کو درگزر کرنا چاہئے۔ میرا خط رشید صاحب کو دکھا دیجئے۔ جہاں وہ مجھ سے متفق نہ ہوں وہ فقرہ قلم زد کر دیجئے تاکہ قیامت کے دن میں اُسے اپنے بائیں ہاتھ میں نہ پاؤں۔

رشید صاحب کا تعارف پڑھ کر بہت لطف آیا۔ ایسی چست نثر آجکل کم پڑھنے میں آتی ہے اور پھر رشید صاحب آجکل لکھتے بھی کم ہیں۔ ان کی آخری تصنیف در حمایت ڈاکٹر ضیاء الدین اخبار میں پڑھی تھی۔ غرضیکہ بزم اغیار میں گا ہے سرِ راہے گا ہے۔

آپ کبھی لاہور تشریف لائیں تو نیاز حاصل کرنے کا موقع ضرور دیجئے۔ لاہور جُہلا کا شہر ہے، دار العلوم نہیں۔ تاہم نہ اتنا اجاڑ کہ دو ایک دن آپ کا جی نہ بہل سکے۔ رشید صاحب ملیں تو اے بادِ صبا ان سے یوں کہیو کہ جو کمرہ غریب خانے میں آپ کے لئے مخصوص کر رکھا ہے، اُسے تو جھاڑتے جھاڑتے بھی تھک گئے۔ چندے ریلوے ٹائم ٹیبل کا مطالعہ کرتے رہے کہ علی گڑھ سے کون کون سی ٹرین آتی ہیں۔ پھر یہ شغل بھی چھوڑ دیا اور دعائیں مانگتے رہے کہ اللہ میاں! رشید صاحب کو بھیج۔ اب محض آہیں بھرتے ہیں۔!

رشید صاحب کو میرا اسلامِ شوق پہنچا دیجئے۔ خود عزّت افزائی کا شکریہ قبول کیجئے۔ از راہِ تمسخر یا ہمہ دانی کوئی نامناسب فقرہ قلم سے نکل گیا ہو تو معاف کر دیجئے۔ اس ریویو (!؟) کے بہانے سے آپ کو مخاطب کرنے کا فخر حاصل کر لیا۔

فقط۔ نیاز۔ خاکسار: بخاری

○

محلہ عالم گنج، آگرہ۔ ۵ فروری ۱۹۴۴ء

محبِ مکرم! السّلام علیکم ——— ابھی آدھ گھنٹہ نہیں ہوا کہ آپ کا لفافہ ملا۔ مجھے بھی ایسا لطف آیا کہ فوراً جواب لکھنے بیٹھ گیا حالانکہ ابھی ایک کتاب کی کاپیاں پریس بھیجنے کے لئے درست کر کے دوسری کتاب کا مسودہ سنبھالا تھا کہ کاتب کا تقاضا ہے، وہ ہاتھ روکے بیٹھا ہے۔

شکر ہے آپ نے میرے مضمون کو پسند کیا۔ حالانکہ میری نظر میں کچھ بہت پسند کے قابل نہ تھا۔ میرا زاویۂ نگاہ بہت قدیم ہے۔ "جدیدیت" سے بالکل ہم آہنگ ہونا میرے لئے محال کے قریب ہے لیکن نا انصافی اور حق تلفی یا حق ناشناسی میری طبع و فطرت سے بُعدِ بعید رکھتی ہے اور عجیب اتفاق ہے کہ باوجود قدیمیت کے میں بڑا جدّت پسند واقع ہوا ہوں۔ ہر نئی چیز مجھے بڑی دلکش معلوم ہوتی ہے بشرطیکہ مکروہ نہ ہو۔ میں اپنے نظریہ و عمل کے خلاف ہر بات کو بڑی توجہ سے سنتا ہوں۔ اپنے مضامین و خیالات کی تنقید

کو بڑے غور اور دلچسپی سے پڑھتا ہوں اور اپنی غلطی معلوم ہونے پر بڑا لطف آتا ہے۔ آپ کو لطف آئے گا یہ سن کر کہ چند بار ایسا ہوا ہے کہ پڑھاتے ہوئے میں نے شعر کا ایک مطلب بیان کیا۔ کسی طالب علم نے ٹوکا اور اس سے بہتر مطلب بتایا اور میں نے فوراً اس کی تصدیق و تحسین کی اور اپنے قصورِ فہم کا اعتراف کیا۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ میری تنقید پر کسی نے اعتراض کیا اور میں نے کلاس میں اس کو بیان کر دیا باوجود اس کے کہ طلبہ کو اس تنقید و اعتراض کی مطلق خبر نہ تھی۔ اس سلسلے میں ایک لطیفہ یہ ہے کہ مجھ سے بالکل حال ہی میں ایک غلطی سرزد ہو گئی ہے اور چھپ گئی ہے۔ لکھتے وقت مطلق ادھر ذہن منتقل نہ ہوا۔ چھپنے کے بعد پڑھا تو اپنی غلطی صاف نظر آگئی اور بہت افسوس ہوا کہ دشمنوں کے ہاتھ میں ایک ہتھیار دے دیا۔ ابھی اس پر کوئی رد و قدح نہیں ہوئی ہے۔ شاید ہو۔ یعنی سینٹ جانس میگزین کے نئے نمبر میں "فانی کے نقاد" کے عنوان سے میں نے ایک مضمون لکھا ہے، اس میں سیماب صاحب کے ان اعتراضات کے جواب دئے ہیں جو انھوں نے آپ کے "فانی نمبر" میں لکھے ہیں۔ یہ مضمون ساجد علی خان راز کی فرمائش سے لکھا ہے۔ اُن کو شفق کا وہ پرچہ بھیج دیا تھا اور لکھ دیا تھا کہ آپ کو بھی دکھا دیں۔ انھوں نے وعدہ کیا تھا کہ آپ کو ضرور دکھا دیں گے۔ اب آپ وہ مضمون پڑھ کر بتائیے میں نے کیا غلطی کی ہے۔ آپ کو نہ ملے گی تو میں بتا دوں گا۔ اس میں خط کتابت ہی کا لطف رہے گا۔ راز سے وہ پرچہ نہ ملے تو میں بھیج دوں گا۔ اتنا پتا یہ ہے کہ ایک محاورہ یا روزمرّہ کی غلطی ہے۔ اس کے علاوہ مفہوم و مضمون کی جو غلطیاں آپ کو نظر آئیں وہ بھی لکھیے گا۔

"نگار" کے اس سالنامے کو دیکھ کر مجھے بڑی مایوسی ہوئی۔ میرے نزدیک سب مضامین تھرڈ کلاس ہیں۔ میرے مضمون سمیت۔ صفدر حسین، عبادت بریلوی اور خواجہ احمد فاروقی تینوں تازہ واردوں میں شامل ہیں۔ ان سے کسی گہرائی اور دوررسی کی امید مشکل سے تھی۔ خواجہ احمد میرے عزیز اور شاگرد ہیں، صفدر حسین آپ کے تازہ دست آموز ہیں۔ عبادت بھی یقیناً نوجوان ہوں گے۔ حال ہی میں منظرِ عام پر آئے معلوم ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے تینوں کے مضامین غنیمت ہیں بلکہ صفدر حسین کا دوسروں سے بہت بہتر ہے۔ اختر تلہری کو میں بالکل نہیں جانتا مگر مقالہ اچھا لکھا ہے۔ سیماب صاحب کی تنقید اس کی مصداق ہے ــــــ "چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستم گاری میں"۔ اگرچہ کوئی معشوق اس پردۂ زنگاری میں نہیں ہے۔ وہ خود ہی جلوہ فرما ہیں۔ سب سے پہلا پیراگراف دیکھئے۔ بسم اللہ ہی غلط ہے۔ کیا بات ذہن میں اتاری ہے کہ "ادبِ اردو کا دورِ قدیم و جدید کہہ سکتے ہیں لیکن ادبِ قدیم و جدید نہیں کہہ سکتے۔" مجھے تصوّر بھی نہ تھا کہ سیماب صاحب کا مضمون بھی اسی "نگار" میں ہو گا ورنہ میں "بزرگی" میں مرزا جعفر علی خان صاحب اثر کے ساتھ سیماب صاحب کا بھی استثنا کر دیتا۔ وہ مجھ سے بڑے ہیں۔ وہ فقرے میں اپنی رو میں لکھ گیا تھا اور مسوّدہ بھی بھیج دیا تھا۔ چھپنے پر کچھ اچھے نہ معلوم ہوئے۔ مگر مضائقہ بھی کیا ہے۔ میری قدیمیت کی شدیدیت واضح ہوتی ہے۔ تمام مضمون ایک رَو اور بہاؤ کی طرح لکھا ہے اور اس طرح کہ کچھ گھر میں لکھا، کچھ اسٹاف روم میں، کچھ امتحان کے کمرے میں۔ نیاز صاحب کے

تقاضے آرہے تھے کہ کتابت جاری ہے چنانچہ بغیر نظرِ ثانی روانہ کر دیا۔ لکھنے کے بعد پھر کچھ دیکھا بھالا نہیں۔ "نگار" کی کتابت میں ہمیشہ غلطیاں بہت ہوتی ہیں۔ میرے مضمون میں بھی غلطیاں کر دی ہیں، جن میں سے ایک ضروری التصحیح ہے۔ یعنی صہ ۹۶ پر اکبر الٰہ آبادی کے دوسرے مصرعے میں کاتب نے عجیب اصلاح کر دی کہ شاعر کا مضمون اور میرا مقصود فوت ہو گیا۔ لیکن بات چونکہ پھر بھی با معنی رہی اس لئے ممکن ہے کہ ناظرین کو پتہ نہ چلے۔ اکبر کا مصرعہ یہ ہے ——— "بند کر لے اگر آنکھیں اگر انسان میں ہو"۔ اور لکھا گیا ہے ——— "انسان میں نہ ہو"۔

ڈاکٹر ابو اللیث صاحب کا مقالہ سالنامے کے موضوع سے الگ ہے۔ پروفیسر کلیم الدین احمد صاحب سے دست و گریباں ہوئے ہیں۔ صرف غزل کے نزاع میں۔ لیکن میرے نزدیک اکثر وار اوچھے پڑے ہیں اور مضمون تشنہ رہ گیا ہے۔ مقالے کی ہیئتِ مجموعی سے قطع نظر کر کے بھی مجھے ان کی بعض رایوں سے اختلاف ہے۔ مجھے بڑا لطف آیا اور بہت تعجب ہوا کہ ابو اللیث صاحب کلیم صاحب سے سخت مرعوب ہو گئے ہیں۔ کلیم صاحب کے اعتراضِ بے ربطیٔ غزل کی تردید میں لیث صاحب نے غالب کی ایک غزل میں ربط پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگر غالب کو یہ ربط مقصود تھا تو اس سے زیادہ کج دماغ اور ناشاعر دوسرا نہیں ہو سکتا۔ بھلا سوچئے تو سہی کہ نام، جامۂ احرام اور حمام والے شعروں میں کوئی ربط ممکن ہے؟ اور یہ کیا ربط ہوا جو لیث صاحب نے دکھایا؟ نہایت وثوق و اعتماد اور فخر و مسرت کے ساتھ اس بات کا اعلان کرنا چاہیئے کہ غزل میں ہرگز کوئی ربط نہیں ہوتا۔ غزل کی یہی خوبی ہے کہ اس میں ربط نہیں ہوتا۔ کوئی شخص ربط پیدا کرے تو ہم کو منظور نہیں۔ مربوط و مسلسل غزلوں کی قسم ہی الگ ہے۔ عام غزل میں اگر دو دو برابر رکھے ہوئے شعروں میں اتفاقی ربط نکل بھی آئے تو وہ شاعر کو مقصود نہیں ہوتا۔ ہم اسی کو غزل سمجھتے ہیں جس میں ربط نہ ہو۔ ہم اسی کو باقی و قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ ہم اسی غزل پر فخر کرتے ہیں۔ اس دعوے اور اعلان میں آخر حجاب کیا؟ شرم کیوں؟ ندامت کیسی؟

دوسرا ثبوت "مرعوبیت" کا لیث صاحب نے مضمون کے آخر میں مطلع اور مقطع نقل کر کے دیا ہے۔ یہ مرعوب ہونا نہیں تو کیا ہے کہ کلیم صاحب نے اعتراض کیا غزل میں ابتدا، ترقی اور انتہا نہیں ہوتی۔ لیث صاحب نے کہا لیجئے ان مطلعوں میں ابتدا ہے اور ان کے مقطعوں میں انتہا ہے۔ ان میں ہرگز کوئی ابتدا و انتہا مقصود نہیں ہے۔ زنہار غزل میں کوئی نفسیاتی اتار چڑھاؤ نہیں ہوتا۔ بالکل اتفاق ہے کہ غالب و فانی کے بعض مطلع و مقطع ایسے واقع ہو گئے ہیں۔ خود شاعر کے اندر جذبات کا نفسیاتی اتار چڑھاؤ ہوتا ہے لیکن غزل میں اس کی نفسیات منتشر ہوتی ہیں۔ اس کی غزلوں کے انتخاب سے اشعار کو اس طرح مرتب کیا جا سکتا ہے کہ ابتدا، ترقی اور انتہا کی ترتیب قائم ہو جائے لیکن عموماً غزل اس ارادے سے نہیں لکھی جاتی۔ حاشا و کلا۔ غالب و فانی نے یہ مطلع اور مقطع اس خیال سے نہیں لکھے کہ جس جذبے کی ابتدا مطلع میں ہے، اس کی انتہا مقطع میں کر دی جائے۔ غالب تو غالب، فانی کے ذہن میں بھی غزل کی یہ ابتدا و انتہا کبھی نہ آئی ہو گی۔ ڈنکے کی چوٹ پر اس بات کو کہنا چاہیئے اور ہرگز لومۃ لائم کا خوف نہ کرنا چاہیئے۔

لیثؔ صاحب معاف فرمائیں، میں ان کی اس ترکیب کو مداہنت و مراعاۃ اور ہاں میں ہاں ملانا سمجھتا ہوں۔ کیا واقعی لیثؔ صاحب ان مطلع و مقطع میں یا اس غزل میں بھی ربط و علاقہ سمجھتے ہیں؟ ہرگز نہیں سمجھ سکتے۔ صرف برائے گفتن کہہ دیا ہے لیکن ناگفتنی کہا ہے۔

لیثؔ صاحب کو کلیمؔ صاحب کے جواب میں بس وہی بات کہنی چاہئے تھی جو اس کے بعد صفحہ ۱۴۹ پر نمبر (۴) میں کہی ہے کہ اس کی میکانکی ترتیب پر اصرار کرنا محل نظر ہے اور اس "نظر" کو واضح و ثابت کرنا چاہئے تھا جو ان کی آٹھ دس سطروں میں نہ ہوا۔ بلکہ انھوں نے جو اس ترتیب پر اصرار نہ کرنے کو نظم تک وسیع کر دیا ہے، یہ میرے نزدیک درست نہیں۔ نظم میں تدریجی ارتقا ضروری ہے اور ہر کامیاب نظم میں ضرور ہوتا ہے۔ اور اس کام کے لئے شاعر کو کسی میکانکی قانون کی دانستہ پابندی نہیں کرنی پڑتی کہ اس کو آورد کہا جائے۔ یہ ترتیب خود بخود "آمد" کی شان کے ساتھ پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر شاعر شاعر میں فرق ہے۔ اس امر میں جوشؔ اکثر ناکام رہتے ہیں اور اقبالؔ اکثر کامیاب ہوتے ہیں۔

لیثؔ صاحب کے سب سے آخری پیراگراف (۵) سے بھی مجھے اختلاف ہے اور تعجب ہے کہ یہ بات ان کے ذہن و قلم سے کیونکر نکلی، اگر بات کی پچ کرنی نہ تھی؟ اور اگر پچ نہیں کی تو کلیمؔ صاحب کی عبارت منقولہ کو سمجھے نہیں۔ بلاشبہ شاعر کی نظم تکمیل کے بعد ایک جذبے یا خیال کی ترجمان نہیں ہوتی بلکہ مختلف چیزوں سے مرکب ہوتی ہے اور یہ تعریف جن معنوں میں نظم پر صادق آتی ہے اُن معنوں میں ہرگز غزل پر صادق نہیں آتی۔

سب سے پہلے یہ بات سوچنی چاہئے تھی کہ اگر ان فقروں پر وہ اعتراض ہو سکتا جو لیثؔ صاحب نے کیا تو کلیمؔ صاحب اتنے نادان نہیں ہیں کہ غزل کے مقابلے میں نظم کی یہ تعریف لکھ دیتے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ ان فقروں کا کوئی ایسا مفہوم ہوگا جو غزل پر صادق نہ آئے۔ اس مفروضہ یا نقادانہ انصاف پسندی سے فکر کی راہ کھل جاتی اور لیثؔ صاحب غور کرتے کہ نظم کی اس تعریف کا کیا مفہوم ہے۔ میرے نزدیک کلیمؔ صاحب بڑے اچھے نقاد ہیں۔ ان کی بعض کج ادائیوں سے اختلاف شدید کے باوجود میرے دل میں ان کی بڑی عزت ہے۔ اردو میں ایسا نقاد اب تک پیدا نہ ہوا تھا۔ ان کے خلوص کا میرے دل پر سب سے زیادہ اثر ہے۔ بہت سوچ سمجھ کر بات کہتے ہیں اور اکثر بڑے پتے کی بات کہہ جاتے ہیں۔

بہرحال، ایک نظم میں کسی وارداتِ قلبی، مشاہدۂ خارجی کا جب شاعر انکشاف کرتا ہے تو لازم و ناگزیر ہے کہ احساس و تاثر اور بیان و اظہار دونوں میں ایک اثر کے ساتھ دوسرا اثر اور ایک جذبے کے ساتھ دوسرا جذبہ خود بخود پیدا ہوتا چلا جائے۔ مثلاً ایک افسردہ و غمزدہ شخص شام کو کسی پارک میں جا نکلے۔ وہاں باغ و بہار کی شادابی و رنگینی کے علاوہ کچھ حسین صورتیں بھی نظر آئیں، کچھ معصوم بچے کھیل رہے ہوں، قہقہے لگا رہے ہوں وغیرہ وغیرہ۔ ان مناظر کو دیکھ کر وہ شخص ایک لمحے کے لئے اپنا غم بھول جائے اور اس کا دل کھل جائے۔ پھر ذرا سی دیر کے بعد اس کو اپنی حالت یاد آئے اور افسردگی چھا جائے تو اب اگر وہ شخص اس کیفیت کو نظم میں بیان کرے گا تو لازم ہے کہ مختلف اثرات و نقوش سے وہ نظم مرکب ہوگی۔ لیکن وہ سب اثرات، جذبات، نقوش اس نظم کے اجزا و عناصر ہوں گے اور

باہم مربوط - اور وہ نظم نظم ہوگی غزل نہ ہوگی ۔ لیکن وہ شخص اگر غزل کا شاعر ہوگا اور غزل میں یہ تاثرات لکھے گا تو ایک شعر میں ایک جذبہ آئے گا، دوسرے میں دوسری کیفیت، تیسرے میں تیسری ۔ آپس میں متعلق و مربوط نہیں ہوسکتے ۔ یہی مقصود ہے کلیم صاحب کا ۔

میں یہ مضمون چھپوانے کے لئے لکھتا تو اقبال کی کوئی مختصر نظم نقل کر کے اس کے مختلف اثرات و نقوش کا ربطِ باہم پیش کرتا ۔ اب یہ کام آپ اور لیثؔ صاحب مل کر کر لیجئے ۔ اگر میری سمجھ کی غلطی ہو تو بے تکلف اور بلا تامّل لکھ دیجئے ۔

"نگار" کا یہ پرچہ دیکھ کر ارادہ ہوا تھا کہ رسید و شکریہ کے ساتھ مضامین پر اپنی رائے بھی لکھوں لیکن اب تک رسید لکھنے کی بھی نوبت نہیں آئی ۔ نیازؔ صاحب کو لکھتا تو دوسرے مضامین کے ساتھ لیثؔ صاحب کے مضمون پر بھی یہ سب کچھ مَعَ شَیٔ چیزِ زائد لکھتا اور پھر اب آپ کو نہ لکھتا، کہ آپ وہاں دیکھ ہی لیتے ۔ اب آپ کو لکھ دیا تو نگار کو دوبارہ لکھنا مشکل ہے ۔ اور مجھے کچھ خواہ مخواہ اشاعت کی ضرورت بھی نہ تھی ۔ امید ہے لیثؔ صاحب میرے اس تبصرے سے خفا نہ ہوں گے ۔

نیازؔ صاحب کے اعلان سے کہ بعض مضامین دیر میں آئے، مجھے خیال ہوا تھا کہ آپ کا مقالہ بھی ہوگا ۔ آپ نے بڑی غفلت کی کہ اتنی دیر میں بھیجا ۔ مجھے اسی پرچے میں توقع تھی اور اسی میں ہونا ضروری تھا ۔ جو لوگ چند ماہ یا چند سال بعد اس نمبر کو اس کی خصوصیت کے سبب سے منگائیں گے، وہ جنوری و فروری کا پرچہ طلب کریں گے ۔ مارچ والے مضامین کی انھیں کیا خبر ہوگی ۔ نیازؔ صاحب کو چاہیئے کہ دونوں پرچوں کی یکجائی قیمت رکھیں اور اس کا اعلان کر دیں ۔ میں آپ کے مقالے کا منتظر اور مشتاق رہوں گا ۔ اس کے متعلق کچھ لکھنے کے لئے اگر کوئی چھیڑ نکل آئی، جیسی اب آپ کے خط سے نکلی، تو پھر اس سے بھی زیادہ لیجئے ۔ ورنہ مختصر تو ہر حال میں دشوار نہیں ۔ لیکن آپ زیادہ لکھنے کا موقع ہی نہ دیں گے ۔

اوپر کا آخری جملہ لکھنے کے بعد میں دیر تک قلم ہاتھ میں لئے سوچتا رہا کہ آپ کی نقادی کے متعلق اپنے تاثر کا اظہار کروں یا نہ کروں ۔ اس لئے کہ منھ پر سچی تعریف بھی میں بہت نہیں کیا کرتا ۔ کچھ حجاب سا آتا ہے ۔ کبھی مفصل لکھنے کا ارادہ ہے ۔ اس لئے کہ انشاء اللہ اب کے جس کتاب کا نمبر ہے، وہ یا تو نقادوں پر ایک نظر ہوگی یا غزل پر ایک نظر ۔ طاہرؔ صاحب دوسری کتاب کے لئے اصرار کر رہے ہیں کہ وہ مسلسل اور مکمل مستقل کتاب ہوگی ۔ اور میں پہلی لکھنا چاہتا ہوں کہ وہ لکھنے میں آسان ہے ۔ مسالہ دونوں کے لئے تقریباً تیار ہے ۔ شروع کرنے کے لئے اطمینان میسّر نہیں آیا ۔

بہرکیف ۔ مختصر یہ کہ آپ کی نقادیت کے متعلق میں بڑی اعلیٰ رائے رکھتا ہوں ۔ آپ کے "اشارے" دیکھ کر میں نے جو کچھ لکھا تھا وہ صرف تین چار مضمون پڑھ کر اور باقی کتاب کی صرف سیر کر کے لکھا تھا ۔ سارے اشارے پڑھ کر اور "نگار" کے تنقید نمبر والا مقالہ پڑھ کر میں نے یہ رائے قائم کی ہے کہ اس قدر صحیح نقاد کوئی دوسرا نہیں ہے ۔ آپ کی رائے اور تحریر دونوں میں اس قدر جامعیت اور متانت (اصلی و لغوی معنوں میں: مضبوطی) ہوتی ہے کہ اور کہیں مشکل سے ملتی ہے ۔ (بقول مولوی عبدالحق صاحب) خدا نظرِ بد سے بچائے ۔

اس کی تشریح اور موازنہ پھر کبھی سنئے گا یا کہیں پڑھئے گا۔ اس خط کو مضمون کیوں بنوائے دیتے ہیں۔ سب کچھ یہیں کیوں لکھ دوں۔ بقول رشید صاحب: رکھوں کچھ اپنی بھی مژگاں خون فشاں کے لئے۔ یہ خط آپ کے فائل میں رکھا رہے گا یا شاید ردی دان میں پہنچ جائے اور میں ان باتوں کا ڈھنڈورا پیٹنا چاہتا ہوں۔

آپ کے خط کی اور باتوں کا جواب رہا جاتا ہے۔ میں سادگی کو محض سادگی کی بنا پر رد نہیں کرتا۔ بناوٹ بھی ایک فن ہے جو جانتا ہو۔ نری سادگی کچھ نہیں جانتے ہیں۔ میں نے نظم آزاد کی بعض سادگیوں کو نظم پابند کے مقابلے میں رد کیا ہے۔ ورنہ سادگی بڑی پُرلطف چیز ہے۔

بشیر احمد شاہ کو اپنے تنقیدی مضامین ضرور دے دیجئے۔ ان کو بہت انتظار رہا اور اب بھی شاید انھوں نے آپ کے لئے کاغذ روک رکھا ہے۔ اب ان کے پاس وہ کاغذ نہیں ہے جس پر "نقد و نظر" چھپی ہے بلکہ وہ ہے جس پر مبشر علی صدیقی صاحب کے "ادبی مقالات" چھپے ہیں۔ آپ نے یہ کتاب دیکھی ہوگی، تیار ہو گئی ہے۔ اسی کاغذ پر میری ایک کتاب آج کل چھپ رہی ہے۔ یہ کاغذ بھی غنیمت ہے۔ کتابت، طباعت، جلد وغیرہ میں بشیر کافی اہتمام کرتے ہیں۔ مبشر علی صاحب کے لئے تو انھوں نے خاص ڈیزائن اور بلاک بھی بنوایا ہے مگر مجھے اس میں آورد سی معلوم ہوتی ہے۔ آپ اپنی کتاب کے لئے اپنے شرائط ان سے طے کر لیجئے۔ میرے تعلقات بشیر احمد کے بزرگوں سے بہت قدیم ہیں۔ تقریباً تیس سال پرانے۔ اس لئے اپنی کتاب کے متعلق کچھ لکھا پڑھی کرنے میں مجھے ہمیشہ حجاب سا معلوم ہوا۔ ۲۰ فیصدی رائلٹی کا زبانی وعدہ ہے۔ "نقد و نظر" کی پہلے سال کی رائلٹی انھوں نے اسی حساب سے دے دی ہے لیکن کسی قسم کی کوئی تحریر نہیں ہے۔ حد یہ ہے کہ روپیہ کی رسید بھی انھوں نے مجھ سے نہیں لی۔ لیکن آپ باضابطہ معاملہ کریں۔ آپ دور بھی ہیں غیر بھی۔ اس لئے آپ کو تحریر لینے میں آسانی ہے۔ پھر مجھے بھی اپنے لئے کہنے کی گنجائش ہو جائے گی اور حجاب اٹھ جائے گا۔ بشیر آدمی بہت معقول اور خوش اخلاق ہے۔

اب آپ کی ایک بات اور رہ گئی: ناد اور لنگر والی محترمہ۔ ان کا پردہ ہی رہنے دیجئے۔ میں خوب جانتا ہوں۔ اگرچہ دیکھا نہیں۔ اتنا اور سن لیجئے کہ کنواری ہیں۔ آپ نے شعر کی تعریف میں لکھا ہے، مگر شعر کی چستی تو دیکھئے اور "چستی" کے لفظ پر توجہ دلائی ہے!! آپ کے بھی پھبتی باز ہونے میں شک نہیں۔ میں تو پھکڑ ہوں ہی۔ ؏ پیرے کہ دم ز عشق زند بس غنیمت است

والسلام: احقر حامد حسن قادری

آپ نے میرے خفا ہونے کی خوب کہی! اس میں شبہ کی بھی کیا وجہ؟ آپ چھیڑ دیا کیجئے اور پھر سنا کیجئے۔ آپ نے بھی اس عرصے میں کب لکھا تھا۔ آپ جیسے اہلِ نظر کو تو ضروری کام چھوڑ کر خط لکھا کرتا ہوں۔ میں تقریباً دو مہینے سے پریشان ہوں۔ دنیا کے معمولی کوائف ہیں۔ لیکن میری زندگی اللہ تعالیٰ کے خاص الخاص فضل و کرم سے ایسی پُرسکون رہی ہے کہ اس میں ذرا

ساتموّج بھی مجھے لڑکھڑا دیتا ہے۔ اگرچہ یہ ہلکی سی جنبش بھی برسوں کیا قرنوں نہیں ہوتی۔ دو مہینے ہوئے ۲ دسمبر کو میرے سب سے چھوٹے لڑکے (۱۲ سالہ) کے بائیں ہاتھ میں چوٹ لگ گئی تھی۔ کہنی اکھڑ گئی اور کچھ ذرا سی ٹوٹ بھی گئی۔ اتفاق سے وہ اپنے بڑے بھائی کے پاس سیوہارہ (بجنور) میں تھا۔ وہ ذرا سی جگہ ہے۔ ڈاکٹر نے جوڑ جاڑ کر پلاسٹر لگا دیا۔ لیکن ایک مہینے سے زیادہ ہاتھ ٹوٹا ہی رہا۔ آخر اب ۲۵ روز سے یہاں کے شفاخانے میں ہے۔ ہاتھ کی ہڈی درست ہو گئی ہے لیکن زخم مندمل نہیں ہوا ہے۔ دن رات شفاخانے کی دوڑ دھوپ رہتی ہے۔ اس خط کے شروع کرنے سے ختم کرنے تک مجھے دو بار شفاخانے جانا پڑا۔ ایک بار لڑکے کی والدہ و ہمشیرہ کو لے کر گیا۔ آجکل ہر کام، تصنیف و تالیف تک کا، اسی بے اطمینانی میں ہو رہا ہے۔ دعا فرمائیے۔

کٹرہ خانخاناں۔ آگرہ

محبّ مکرم! السّلام علیکم ——— کل آپ کا کارڈ ملا۔ بڑی خوشی ہوئی۔ بہت دنوں میں یاد کیا۔ دعوت نامہ ابھی نہیں ملا۔ مگر اب ان کاموں کے لئے ہمارا کالج ختم ہے۔ انجمن ترقی اردو آپ کی یاد میں باقی ہے مگر برائے نام۔ اس سال بھی عہدے دار مقرر کر دئے گئے ہیں۔ مگر تا ایں دم کوئی جلسہ، کوئی مشاعرہ نہ ہو سکا۔ لڑکے واجبی رہ گئے ہیں۔ ان میں بھی کوئی جوش اور ولولہ نہیں۔ اس سال جولائی سے مہاجن صاحب پرنسپل ہو گئے ہیں۔ مجھ پر، مسلمانوں پر، انجمن پر بہت کرم فرماتے ہیں۔ اب کے کانوکیشن میں ہر اکسیلنسی "گورنرہ" بلبلِ ہند آئی تھیں۔ مہاجن صاحب نے بڑا کرم کیا کہ خود بغیر میری درخواست کے مسز سروجنی نائیڈو کو "ہفتہ یونین" کے مشاعرے کی صدارت کے لئے دعوت دی اور اس کے بعد مجھ سے تذکرہ کیا۔ وہ پہلے ۱۹۴۰ء میں بھی ہمارے مشاعرے کی شرکت و صدارت کر چکی ہیں اور وہ مشاعرہ ان کو اب تک یاد ہے۔ میں بڑا خوش ہوا کہ بہت عمدہ مشاعرہ اور جلسہ ہو جائے گا۔ مگر مدعوہ نے معذرت لکھ بھیجی کہ مشاعرے میں شرکت کا تو وقت نہیں ہے۔ البتّہ دوسرے دن اتوار کو شام کے ۵ بجے کالج آ کر اساتذہ کے ساتھ چائے پی لیں گی۔ چنانچہ بہت پر لطف جلسہ اور پارٹی رہی۔

خلاصہ یہ کہ آپ کی دعوت کا قبول کرنا مشکل ہے۔ پھر بھی میں نے آج مغیث الدین فریدی کو آپ کا کارڈ دکھا دیا اور کوشش کے لئے کہہ دیا ہے۔ مغیث سے آپ واقف تو ضرور ہوں گے۔ یہ اس سال سے ہمارے کالج میں زاہد حسن فریدی کی جگہ ہو گئے ہیں۔ آپ کی یاد فرمائی کا بہرحال شکریہ۔

آپ سے اپریل کے بعد سے خط کتابت ہی نہ ہوئی۔ میرے حالاتِ اجتماعی میں بڑا انقلاب ہو گیا۔ طاہر صاحب مع اہل و عیال ہجرت کر گئے۔ فریدی صاحب مرحوم کے لڑکے زاہد حسن فریدی مع خاندان چلے گئے۔ خالد تنہا چلے گئے اور کراچی میں ایک اسکول میں ملازم ہو گئے۔ اس حساب سے آگرہ میں اب میں اکیلا اپنے اہل و عیال باقی کے ساتھ رہ گیا۔ تنہائی کی بڑی وحشت رہی۔

اب تک اثر ہے۔ پھر میں آخرِ اگست میں بیمار ہوگیا۔ اور ایسا ہوا کہ ستمبر، اکتوبر ڈھائی مہینے مسلسل کالج سے رخصت پر رہا۔ بخار آنے لگا تھا اور لازم ہوا جاتا تھا۔ بڑی مشکل سے رفع ہوا۔ اُس نے اس قدر کمزور کردیا کہ اب تک زیادہ چلا پھرا نہیں جاتا۔ اگرچہ یکم نومبر سے بخار بالکل نہیں ہے، سواری میں کالج آتا جاتا ہوں۔ بہرحال شکر ہے کہ اچھا ہوگیا۔ اس عرصے میں لکھنا تو بالکل بند ہی رہا۔ پڑھنا کچھ نہ کچھ رہا۔ "نگار" کالج میں آتا ہے مگر آپ کے مضمون کا علم نہ ہوا۔ مغیث نے بھی نہ کہا۔ اب تلاش کرکے ضرور دیکھوں گا۔ میں نے نیاز صاحب سے وعدہ کرلیا تھا اگست میں کہ ان کے سالنامے "فسانہ نمبر" کے لئے انگریزی سے ایک افسانہ ترجمہ کرکے بھیجوں گا۔ مگر اس کے بعد بیمار ہوگیا اور نہ لکھ سکا۔

طاہر صاحب یہاں سے ڈھاکہ گئے تھے مگر سحر بنگالہ کو توڑ تاڑ کر اب لاہور یونیورسٹی میں ملازم ہوگئے۔ ایم۔ اے فارسی اور ایم۔ اے۔ اردو کا کام سپرد ہوا ہے۔ پتہ بالفعل یہ ہے: معرفت قومی کتب خانہ، ریلوے روڈ۔ لاہور

انھوں نے مجھ سے میرے غیر مطبوعہ مسوّدات مانگے ہیں۔ میرے پاس بالفعل تنقیدی مضامین ایک مجموعے کی قدر موجود ہیں۔ ان کو نقل کراکے بھیجنے کا ارادہ ہے۔ یہ آپ کو اس لئے لکھا کہ آپ کی کوئی کتاب تیار ہو تو اُن کو بھیجئے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ قومی کتب خانہ خوب چل رہا ہے۔ بڑی ساکھ پیدا کرلی ہے۔ تنقید، تاریخ، افسانہ ہر قسم کی کتابوں کی مانگ ہے۔ آسانی سے جلدی چھپ سکتی ہیں اور اب اردو کی نکاسی ادھر ہی ہوسکتی ہے۔ لہٰذا آپ بھی فائدہ اٹھائیے۔ طاہر صاحب کو لکھ کر حالات معلوم کیجئے۔

عبادت صاحب کے مقالے کے متعلق میرا بھی یہی خیال تھا کہ وہ میری ملکیت ہوگیا ہوگا۔ آپ امانت رہنے دیجئے۔ منگانے کی ایک یہ سبیل ممکن ہے کہ مغیث الدین فریدی کی رشتے داری بلکہ ننھیال کا نپور میں ہے۔ اکثر جاتے ہیں اور موقع ملتا ہے تو لکھنؤ بھی ہو آتے ہیں۔ پچھلے دنوں میں دو بار لکھنؤ جاچکے ہیں۔ وہ آپ کے پاس جاکر مقالہ لاسکتے ہیں۔ ورنہ بقول آپ کے زبانی امتحان کے موقع پر آکر لے لوں گا۔ مگر کیا پھر لکھنؤ بلائے جانے کی توقع ہے؟ اگر ہو تو قیام کا مسئلہ ابھی سے طے ہو جائے۔ پار سال جب میں نے عرض کیا تھا مسعود صاحب نے بڑی شکایت کی تھی کہ میں نے یونیورسٹی کی اطلاع کے ساتھ آپ کو دعوت دی تھی مگر آپ نے ہفتوں جواب نہ دیا اور سرور صاحب کی دعوت کا انتظار کرتے رہے، جب انھوں نے آپ کو لکھ دیا تو آپ نے میری دعوت مسترد کردی۔

اور کیا عرض کروں۔ کچھ تاریخیں اور سنادوں۔ آپ کو اس فن سے تو دلچسپی نہ ہوگی مگر ان مسائل و واقعات اور ان قطعات سے کچھ نہ کچھ لطف آ ہی جائے گا۔ مجھے تو آپ جانیں ایسا خبط ہے کہ سبب بے سبب، بات بات پر تاریخ کہہ دیتا ہوں۔ مثلاً ایک دن، رات کو سوتے وقت بجلی گل کی تو معلوم ہوا صحن میں خوب چاندنی پھیلی ہوئی ہے، جو بجلی کی

روشنی میں بالکل نظر ہی نہ آتی تھی۔ فوراً مصرع ذہن میں آیا "سامنے بجلی کے غائب چاندنی" عدد نکالے تو پورے ۱۳۶۷ھ تھے۔ مگر یہ بالکل اتفاق تھا کہ تاریخ کا مصرع ہی زبان سے نکل گیا۔

۲۹ نومبر کو کالج میں امتحان ششماہی تھا۔ لڑکوں نے ہڑتال کردی۔ آگرہ کالج اور سینٹ جانس دونوں جگہ۔ اس کی تاریخیں سنئے ؎

آگرہ کالج و سینٹ جانس کا بگڑا ہے مذاق — گویا سنجیدہ ہے یہ بات کہ پڑھنا ہے مذاق

امتحاں دینے نہ آئے تو یہ تاریخ ہوئی — لڑکے ہڑتال کو بھی سمجھے کہ اچھا ہے مذاق

۱۹۴۸ء

(۲)

یہ لڑکوں کی ہڑتال کیا اور کیوں — نہ عقل آئی تعلیم و تادیب سے

ہے آزادی ایسی تو تاریخ ہے — کہ آزادی اخلاق و تہذیب سے

۱۹۴۸ء

۷ر نومبر کو ایک رہتکی دوست کو کراچی لکھ کر بھیجی ؎

ہیں جدا دوستوں عزیزوں سے — کیوں نہ ہو زندگی سے دل ہی اچاٹ

ملک کی بانٹ یہ ہوئی اچھی — کہ دیا دل کو گرد غم سے پاٹ

چھوڑ کر رہتک، آگرہ، بھراؤں — پہونچے کوئٹہ، کراچی اور کوہاٹ

ہوئے برباد بے وطن ہو کر — ماس کے ماس اور لاٹ کے لاٹ

اس لئے کیا غلط ہے یہ تاریخ — ہو گئے خاندان بارہ باٹ

۱۳۶۸ھ

۱۵ر اکتوبر سے پرمٹ جاری ہونے پر کہا ؎

ہوئیں پابندیاں جانے پہ عائد — بڑھی کچھ اور پاکستاں سے دوری

کہی تاریخ سن کر قادری نے — ہوا ہے لیجئے پرمٹ ضروری

۱۹۴۸ء

مقتدار خواہاں تھا اپنا قاسم رضوی — کر رہا تھا دھوکے میں سود کے زیاں اپنا

یہ جو نکلی ہے تاریخ "تعمیہ" ہے ضرور اس میں — بن گیا رقیب آخر، تھا جو رازداں اپنا

۱۹۲۷
۲۱
۱۹۴۸ء

(۲)

بتاریخ دکن می گویم و "صدق" اندرو دانی — چرا کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی

۱۱۷۳
۱۹۴
۱۳۶۷ھ

اب کے بقر عید میں قربانی نہ ہو سکی تو کہا تھا "عید اضحیٰ کیا جو قربانی نہ ہو" ۱۳۶۷ھ — احقر: حامد حسن قادری

(۱۰)

واشنگٹن - ۱۵؍اکتوبر ۱۹۵۲ء

برادرم سرور صاحب! تسلیم ——— خط لکھنے کا خیال برابر آتا رہا لیکن کسی نہ کسی وجہ سے دیر ہوتی گئی۔ ابھی مسعود صاحب کو مفصل خط لکھ چکا ہوں۔ جو باتیں اس میں ہیں انھیں کیا دہراؤں۔ دونوں خط ملا کر بہت سی باتیں ہو جائیں تو اچھا ہے۔ اپنا خط مسعود صاحب کو دکھا دیجئے گا اور مسعود صاحب کا خط پڑھ لیجئے گا۔

یہاں پہنچ کر طے ہوا کہ میں سارے امریکہ میں پھروں گا اور زیادہ تر ان مصنفوں، ناشروں، لوگوں سے ملوں گا جنھیں ہندوستان اور ایشیا سے دلچسپی ہے اور یہ اندازہ لگاؤں گا کہ خاص کر علمی حلقوں میں ایسی دلچسپی کی نوعیت کیا ہے۔ ہندوستان کے متعلق یہاں لوگوں کی معلومات کتنی ہے۔ کتنی بڑھائی جا سکتی ہے۔ کیا طریق کار ہو سکتا ہے۔ کیا ہندوستان میں لکھی ہوئی انگریزی کتابیں یہاں چھپ سکتی ہیں، کیا کچھ ترجمے ہو سکتے ہیں، کیا ہندوستان کی مختلف زبانوں کی جو تعلیم یہاں دی جا رہی ہے اس میں اضافہ ہو سکتا ہے؟ میں جو تعصبات لے کر آیا ہوں غالباً انھی کا نتیجہ ہے کہ مجھے اس کام سے زیادہ دلچسپی نہیں پیدا ہو رہی ہے۔ یوں لوگوں سے مل رہا ہوں۔ سننے پر آمادہ دیکھتا ہوں تو بہت سی باتیں کہہ بھی جاتا ہوں۔ دوسروں کا نام لے کر بہت سے شکوک کا اظہار بھی کر دیتا ہوں لیکن کیا نتائج نکلیں گے، میں ابھی نہیں کہہ سکتا۔ جہاں تک یونیورسٹی کے حلقوں کا تعلق ہے وہاں تو ہندوستان کے متعلق جاننے اور اس میں دلچسپی لینے کی خواہش گہری معلوم ہوتی ہے۔ شروع میں یہ محض لسانی معلومات (خاص کر ہند یورپی زبانوں کے متعلق) تک محدود تھی۔ اب بڑھ رہی ہے۔ اور تہذیب، علوم و فنون، فنونِ لطیفہ، قانون اور جدید زبانوں کو بھی اپنے دائرے میں لے رہی ہے۔ بظاہر اس کوشش میں خلوص اور علم کی پیاس کا پتہ چلتا ہے۔ ابھی میں بہت سے لوگوں سے نہیں ملا ہوں۔ لیکن جن سے ملا ہوں وہ اپنی آزاد خیالی کا اظہار کرتے ہیں اور سچائی کا یقین دلاتے ہیں۔ SATURDAY REVIEW OF LIT. کے ایڈیٹر نارمن کزنس سے دیر تک اور دلچسپ باتیں ہوئیں۔ ابھی یہاں کے گھاگھ قسم کے نقادوں سے ملاقات نہیں ہوئی۔ میں صرف آٹھ دس سے ملوں گا۔ باتیں کر کے یہ اندازہ ہوا کہ یہاں کی تنقید نگاری گروہوں اور مکاتیبِ خیال سے نکل کر شخصی جستجو کی شکل اختیار کر رہی ہے۔ یہ کیفیت محض نفسیاتی بھی نہیں ہے۔ کتابیں اتنی چھپتی اور بکتی ہیں کہ خدا کی پناہ۔ رسائل اور اخبارات اتنے نکلتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ ہر اخبار دن میں کئی ایڈیشن نکالتا ہے۔ "نیو یارک ٹائمس" روزانہ اڑتالیس (۴۸) سے چونسٹھ (۶۴) صفحات پر نکلتا ہے اور اتوار کو تقریباً ڈھائی سو (۲۵۰) صفحات۔ اسی میں ایک حصہ بالکل الگ کتابوں کے متعلق بھی ہوتا ہے۔ قیمت ایک روپیہ (بیس سنٹ) کے قریب ہوتی ہے۔ کتابوں کے متعلق

بہت سے رسائل نکلتے ہیں ۔ ترقی پسند رسالہ صرف وہی MASSES AND MAINSTREAM ہے ۔ وہ ہر جگہ دستیاب نہیں ہوتا ۔ میں نے دو دن کی تلاش کے بعد اس کے دفتر کا پتہ لگایا ۔ گیا تو کسی نے کوئی خاص دلچسپی نہیں لی ۔ ان کی کتابیں صرف چند دکانوں پر مل سکتی ہیں ۔ وجوہ ظاہر ہیں ۔ ہاورڈ فاسٹ وغیرہ سے ملنے کا ابھی کوئی ذریعہ نہیں نکلا ۔ ماسز اینڈ مین اسٹریم والوں نے کہا کبھی کبھی آجاتے ہیں ۔ بہر حال کوشش کروں گا ۔ کمیونزم کے معاملے میں ابھی خاصی سختی ہے ۔ اور یہاں ہر قسم کی آزادی ہے ۔ لیکن یونیورسٹیوں کے بعض اساتذہ ، کچھ طلبا کبھی کبھی احتجاج بھی کرتے رہتے ہیں ۔ اس وقت یہاں کا سب سے بڑا مسئلہ صدر کا انتخاب ہے اور ہر دفعہ سے زیادہ معرکہ خیز شکل اختیار کر گیا ہے ۔ ڈیماکریٹوں کے خلاف سب سے بڑا حربہ یہ استعمال ہو رہا ہے کہ وہ چوبیس سال سے برسرِ اقتدار ہیں ۔ اب بدلنا چاہئے ۔ الیکشن کی تقریروں میں ذاتیات اس قدر ہوتی ہیں کہ ہمارا ہندوستان بھی پیچھے رہ جائے ۔ ابھی کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کیا ہوگا ۔ یہ بالکل ظاہر ہے کہ اگر جنرل آئزن ہاور صدر ہو گئے تو یا تو حالات بہت زیادہ خراب ہو جائیں گے یا امریکہ پھر اپنی علاحدگی کی پالیسی پر گامزن ہو جائے گا ۔

یونیورسٹیوں کی تعلیم ، لائبریری کا استعمال اور سیمینار کے طریقوں سے میں متاثر ہوا ۔ میرا خیال ہے کہ یہاں طلبا اور اساتذہ دونوں اپنے کام سے گہری دلچسپی لیتے ہیں ۔ بعض یونیورسٹیوں کی وسعت پر حیرت ہوتی ہے ۔ کیلی فورنیا میں چالیس ہزار طلبا اور ساڑھے چار ہزار پڑھانے والے ہیں ۔ ایک ایک شہر میں کئی کئی یونیورسٹیاں ہیں ۔ میں سبھی بڑی یونیورسٹیوں میں جانے کا ارادہ رکھتا ہوں ۔ حالاں کہ میرا جی یہاں گھبرا رہا ہے اور مجھے امید نہیں ہے کہ میں کچھ زیادہ کام کر سکوں گا ۔ میری طبیعت سے آپ کسی قدر واقف ہیں ۔ میں نہ تو بہت گھومنے پھرنے والا آدمی ہوں اور نہ بہت سوشل کہ نئے لوگوں سے ملوں ، جھوٹ سچ باتیں بناؤں اور احتیاط کے پردے میں ریا کاری سے کام لوں ۔ پھر بھی جو نتائج ہوں گے انھیں الٹے سیدھے لکھ کر انھیں دے دوں گا ۔ ڈائری البتہ لکھ رہا ہوں ، گو بہت ذاتی اور تاثراتی ہے لیکن شاید انھیں میں کچھ چیزیں کام کی نکلیں ۔

سرورؔ صاحب ! یہاں کی کتابوں کے ذخیرے ، کتب خانے ، میوزیم وغیرہ دیکھ کر آنکھیں کھل گئیں ۔ امریکہ کی تہذیب کی جڑیں گہری نہیں ہیں لیکن ان لوگوں نے فنونِ لطیفہ سے محبت کرنا سیکھا ہے ۔ سبھی مشہور عمارتوں میں اطالوی نشاۃ ثانیہ کے اثرات ہیں ۔ مجسموں میں بھی وہی بات ہے ۔ عمارتوں پر جو کتبے ہیں وہ ان کی جنگ آزادی کی تاریخ سے متعلق ہیں ۔ پروسیقلیس ، منروا اور دوسرے ایسے ہی علاقائی کرداروں کے مجسمے اور تصاویر نہ جانے کتنی تعداد میں ملتی ہیں ۔ لنکن اور واشنگٹن کے بعض مجسمے تو حیرت میں ڈالتے ہیں ۔ کانگریس لائبریری کے اندر عجیب و غریب نوادر ہیں ۔ ایک طرف قدیم انجیل کی نمائش ہو رہی ہے ، دوسری طرف ترکی کے علم و فن کی ، ایک طرف نیپال کی کتابیں رکھی ہیں دوسری طرف امریکہ کی تاریخ نقشوں اور تصویروں میں ۔ انجیل کا وہ نسخہ بھی دیکھا جو پہلے پہل چھاپے کے موجد گٹن برگ نے چھاپا تھا ، اور اسی زمانے کا قلمی نسخہ بھی ۔ وہ اصل اعلانِ آزادی دیکھا جو جیفرسن نے لکھا تھا اور جس پر امریکہ کی

جمہوریت کی بنیاد ہے۔ طبیعت فکرمند نہ ہو اور انسان واقعی وقت گزارنا چاہے تو یہاں بہت کچھ ہے۔

نیویارک میں ہندوستان اور پاکستان کا نسلیٹ میں گیا تھا۔ ہندوستان کے کانسل جنرل مسٹر آرتھر لال پڑھے لکھے اور معقول آدمی ہیں۔ پاکستان پطرس سے ملنے کے لالچ میں گیا تھا۔ وہ نہیں تھے۔ پھر نہ جا سکا۔ وہاں راشد الخیری کے پوتے سعد خیری علیگ وائس کونسل ہیں۔ آپ کے شاگرد نہیں مگر جانتے ہیں۔ ان سے دیر تک باتیں ہوئیں۔ پاکستان پچیس ہزار (۲۵۰۰۰) ڈالر سالانہ کولمبیا یونیورسٹی کو دے رہا ہے کہ پاکستان اسٹڈیز کا شعبہ قائم ہو۔ ہو گیا۔ خبر تھی کہ اختر رائے پوری آ رہے ہیں۔ نیویارک واپس جاؤں گا تو پتہ چلے گا۔ کل واشنگٹن ہندوستان کے سفارت خانے میں گیا تھا۔ شعبۂ تعلیم کے انچارج پروفیسر سندرم ہیں جو کبھی آگرہ کالج میں تھے۔ آدمی ہوشیار ہیں اور تین سال سے یہاں ہیں۔ یونیورسٹیوں وغیرہ میں بڑا رسوخ پیدا کر لیا ہے۔ یہاں ہندوستان کے اخبارات پڑھے۔ لکھنؤ یونیورسٹی کی خبریں دیکھیں۔ تیواری کے لکھے ہوئے یونیورسٹی کے ہفتے دیکھے۔ آپ کی بزم ادب اور اردو سوسائٹی کے انتخاب کا ذکر دیکھا۔ یونیورسٹی میں جو کھیل ہو رہے ہیں، میڈیکل کالج کے قصے، سب پر اچٹتی ہوئی نظر ڈالی اور اپنے وہاں نہ ہونے پر دل دکھا۔ وہاں کے اور حالات لکھئے۔ اب تک تو آپ نے بہت سی نظمیں اور غزلیں کہہ لی ہوں گی۔ دو چار شعر تو لکھ بھیجئے۔ ڈپارٹمنٹ کے دوستوں کو سلام مسعود صاحب کے خط میں لکھ چکا۔ آپ اور لوگوں سے کہہ دیجئے گا۔ نصیر خان، وزیر بہادر، گلشن، ناگر، ایس۔ کے نرائن، فاروقی صاحب، نریش، لومبا، ہندی ڈپارٹمنٹ کے ملنے والے سبھوں سے سلام کہئے گا۔ یونیورسٹی کے باہر ملّا صاحب سے بہت بہت سلام کہئے گا۔ غالباً چترا کی شادی ہو چکی ہو گی۔ میری طرف سے مبارکباد دے دیجئے گا۔ رضیہ آپا سے ملاقات ہو تو ضرور تسلیم کہئے گا۔

ہاں یہ لکھنا بھول گیا کہ سفارت خانے میں دو (۲) اردو اخبارات بھی آتے ہیں۔ آپ سمجھے کون کون سے۔ پرتاپ اور تیج۔ اردو میں کوئی خاص کتاب یا کتابیں چھپی ہوں یا کوئی خاص بات ہو تو ضرور لکھئے گا۔ ابھی نومبر کا "آج کل" تو آیا نہ ہوگا، میرا مختصر سا مضمون اس میں تھا۔ میں یہاں پڑھ بالکل نہیں رہا ہوں۔ جی نہیں چاہتا۔ کتابیں خریدوں تو کہاں کہاں لئے پھروں۔ یہ بہت بڑا مسئلہ ہے۔ آنے لگوں گا تو دس بیس (۱۰، ۲۰) کتابیں خرید لوں گا۔

آپ کا: احتشام

لندن۔ ۵ رمئی ۱۹۵۳ء

محبی سرور صاحب! تسلیم ——— جواب خط میں تاخیر کے لئے شرمندہ ہوں۔ کئی دن طبیعت خراب رہی اور ساری دنیا سے بلکہ زندگی سے جی اچاٹ سا معلوم ہوا۔ یہ کیفیت دو (۲) بار امریکہ میں بھی ہوئی تھی۔ کبھی خیال ہوتا ہے کہ کوئی قلبی تکلیف ہے، کبھی محض ذہنی کیفیت معلوم ہوتی ہے۔ بہرحال ڈاکٹر کو دکھایا۔ کوئی خاص بات نہیں۔ اس کا ذکر میں نے بیوی بچوں

سے کبھی نہیں کیا کہ وہ پریشان ہوں گے۔ حقیقتاً بات کوئی بھی نہیں ہے۔ شاید میں باہر گھبرا گیا ہوں، شاید معدہ کی خرابی ہے۔ اگرچہ جب سے یہاں ہوں کھانا ہندوستانی کھاتا ہوں۔ لیکن آپ کو خیال ہوگا لکھنؤ میں بھی مجھے پیٹ کی مختلف شکایتیں ہو جایا کرتی تھیں۔ یہاں علاج میں آسانیاں ہیں لیکن اسپتال میں جا کر پڑے رہنے کو جی نہیں چاہتا۔ خیر یہ باتیں تو معذرت کے سلسلے میں لکھ گیا۔ حالت یہ ہے کہ امریکہ میں لوگ جس گرمجوشی سے ملتے تھے وہ یہاں نہیں ہے۔ اس لئے بعض اوقات ملنا جلنا ٹلتا رہتا ہے۔ میں نے اورینٹل اسکول کے بہت سے لوگوں سے مل لیا۔ باہر بھی دو چار سے ملا ہوں۔ لندن میں JACK LINSAY THOMSON ALIKWEST پالڈین، ڈیوی وغیرہ سے اور مل لینا چاہتا ہوں۔ وسط مئی میں آکسفرڈ اور کیمبرج جاؤں گا۔ آکسفرڈ میں کم اور کیمبرج میں کئی نام ایسے ملے ہیں جن سے ملنے کی خواہش ہے۔ شیکسپیئر کے مزار تک جانا تقریباً طے ہے۔ اس وقت یہاں شیکسپیئر سیزن بھی ہے۔ شاید کوئی اچھا کھیل دیکھنے کو مل جائے۔ حالانکہ جگہیں بہت پہلے سے بک ہو چکی ہیں۔

یہاں اورینٹل اسکول والوں سے مل کر یہی احساس ہوا کہ ان کی دنیا ہماری دنیا سے بہت الگ ہے۔ کہیں بہت دور سے باتیں کرتے ہیں۔ میں نے ان لوگوں کو زیادہ تر ہندوستان کی موجودہ لسانی گتھیوں کے متعلق ٹٹولا، انھیں ان کے علم کا واسطہ دیا، انگریزی عالموں کی روایات یاد دلائیں، سر ولیم جانسن اور گلکرائسٹ سے لے کر بیلی تک کے احسانات گنوائے۔ اس کے بعد پوچھا کہ اس وقت ہندوستان میں قومی زبان کا جو مسئلہ چھڑا ہوا ہے، ہندی کو جو سنسکرت بنایا جا رہا ہے، اردو کو غیر ملکی زبان کہا جا رہا ہے اس کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے تو بحث مباحثے کے بعد وہی کہتے ہیں جو ہمارا آپ کا خیال ہے۔ لیکن اس کے متعلق کچھ لکھنے کو تیار نہیں ہیں۔ ان کی دنیا خطوط و خمار کی نمائش تک ہے۔ زبان ایک زندہ حقیقت کی حیثیت سے ان کے سامنے نہیں ہے، صرف چند آوازوں کا مجموعہ ہے۔ تاہم میں نے اسکول کے ڈائرکٹر مسٹر رالف ٹرنر کو اس بات پر آمادہ کیا ہے کہ جب وہ ہندوستان جائیں تو وہاں کے علمائے لسانیات سے اس کے متعلق ضرور گفتگو کریں۔ مئی ہی کے آخر میں پونا میں ایک غیر رسمی قسم کی مشاورتی کانفرنس زبان کے متعلق ہو رہی ہے۔ یقین سے نہیں کہہ سکتا لیکن راک فیلر نے کچھ روپیہ اس کے لئے الگ کیا ہے کہ ہندوستان میں لسانیات کے مطالعے کے لئے کوئی اسکول پونا میں قائم کیا جائے۔ ٹرنر صاحب اس میں شرکت کے لئے جا رہے ہیں۔ جانتا ہوں کہ اس کانفرنس میں اردو کا نقطۂ نظر پیش کرنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ پونا، کلکتہ اور غالباً واردھا کے لوگ ہوں گے۔ آؤں گا تو اس سلسلے میں کچھ اور باتیں ہوں گی۔ یہ لوگ یعنی اورینٹل اسکول والے مسعود حسین خاں سے خوش نہیں۔

اصول نقد پر یہاں کوئی بنیادی کام نہیں ہو رہا ہے۔ میرا مطلب APPROACH اور ATTITUDE سے ہے۔ ویسے کتابیں نکلا کرتی ہیں۔ کتابوں کی دکانوں میں وقت گزارنے کی جو بیماری ہے وہ اب بھی لے جاتی ہے اور گھنٹوں سر کھپاتا ہوں لیکن یا تو مجھ میں پڑھنے لکھنے کا حوصلہ نہیں رہا یا کوئی اور بات ہے، کوئی ایسی کتاب نہیں نظر آتی جو دامن تھام لے۔ EMPSON

والی کتاب آپ کے لئے لاؤں گا۔ میرا انگریزی ادب کا مطالعہ اتنا وسیع نہیں کہ اس سے پوری طرح لطف اندوز ہو سکوں۔ پھر مجھے EMPSON اور ان کے گرو RICHARDS دونوں کے تنقیدی مطمحِ نظر سے دلچسپی نہ پیدا ہو سکی۔

ادھر کسی نے لکھا تھا کہ آپ کئی جگہ مشاعروں میں ہو آئے اور اسی سلسلے میں کشمیر پر بھی حملہ کرنے کا ارادہ ہے۔ سال بھر کے اندر اندر کشمیر کے دو چکر، میں تو آپ کی طرف سے ڈرنے لگا ہوں۔ کہیں شاعری ضرورت سے زیادہ مطالبہ نہ کرنے لگے۔ اس خط میں آپ نے کتنی بہت خوبصورت شعر بھیجے ہیں۔ آؤں گا تو سبھی غزلیں اور نظمیں سنوں گا۔ یہاں رسائل وغیرہ تو ملتے نہیں۔ انتظار حسین نے لاہور سے "خیال" نکالا ہے۔ اس کے دو پرچے آئے۔ بعض عجیب چیزیں چھاپ رہے ہیں۔ ہاں یاد آیا آپ نے تو لکھا ہی ہے، محمد حسن نے بھی رسالہ نکالنے کے متعلق لکھا ہے۔ کیا کہوں، جو پنچ کی رائے وہ میری بھی۔ لیکن وہی بات کہ کچھ دنوں کے لئے پیسے اور مضامین جمع ہو جائیں اسی وقت شروع کیا جائے۔ دو ایک نمبروں کے بعد تاخیر، اپیل، صفحات میں کمی، ان کا سلسلہ نہ شروع ہو۔

معلوم نہیں دستخطوں کی مہم کے سلسلے میں کیا ہو رہا ہے۔ کہیں سے غیر سرکاری طور پر کوئی سن گن ملتی ہے کہ کیا ہوگا؟ کسی نے کبھی رفیع قدوائی سے بھی اس کے متعلق باتیں کیں؟ ان کا کیا اندازہ ہے؟ اس مہینے میں تو آپ امتحانوں کے کام میں مصروف ہوں گے۔ معلوم نہیں فکر کی مہم سر ہوئی یا نہیں؟ دیکھئے وہ ضروری بات رہی جاتی ہے۔ وہی موم کی پتلیوں کا ذکر۔ اس کا مختصر جواب تو یہ ہے کہ ؎

ہمیشہ سے یونہی نہیں تیرہ قسمت — میں زلفوں کے سائے میں بھی سو چکا ہوں

(یہ میرا ہی شعر ہے) اب تو یہ حال ہے کہ کوئی بھولے بھٹکے پیار سے دیکھ بھی لے تو ڈر معلوم ہوتا ہے کہ کہیں پھر شاعری کا سلسلہ شروع نہ ہو جائے۔ اس لئے منظر سے کہئے گا کہ "رخ نکو" کا شوق تو ایک آزار ہے جس کے جراثیم کبھی نہیں مرتے لیکن بہت دور تک نگاہ کرنے کے بعد سے جی کو ہم مار رکھتے ہیں۔ بیگم سرور کو تسلیم کہئے گا اور بچوں کو دعائیں۔

آپ کا: احتشام

نور اللہ روڈ، الٰہ آباد۔ ۶ نومبر ۱۹۶۹ء

محبّی! سلام شوق ———— آپ نے مفصل خط لکھا۔ جی خوش ہو گیا۔ مجھے یقین تھا کہ آپ وہاں کی علمی فضا میں خوش ہوں گے۔ سیاسی نظام اور اوپری طبقے کے عزائم کی بات اور ہے۔ یونیورسٹیوں میں تحقیق اور علمی ذوق، اساتذہ میں کام کی لگن اور اپنے موضوع سے شغف قابلِ رشک ہے۔ شکاگو میں بھی دس بارہ دن انٹرنیشنل ہاؤس میں رہا تھا۔ مختلف شعبوں میں بھی گیا تھا۔ کچھ انگریزی، مشرقی علوم، سوشل سائنسز اور تاریخ کے اساتذہ سے ملا بھی تھا۔ لیکن میری حیثیت محض ایک سیاح کی ہو کر رہ گئی تھی۔ ہر جگہ چند دن ٹھہرنا، دو چار آدمیوں سے ملنا، ہنسنا بولنا اور پھر دوسری جگہ کے لئے رختِ سفر باندھنا۔ اس میں فائدے بھی تھے لیکن نقصان بھی تھا کہ ہر روز نئے لوگوں سے ملنا، وہیں سے بات شروع کرنا اور جب "محبت میں کچھ مزا آنے لگے" تو جدا ہو جانا۔ شہر میں بھی

گھوما پھرا، بلیشی گن کے کنارے بھی سیر کی، ایک آدھ اساتذہ کے گھر بھی چلا گیا، بعض ہندوستانی، پاکستانی طلبا سے بھی ملاقاتیں ہوئیں لیکن صرف چند روز۔ آپ کو موقع ہے، وہاں لوگوں کو اچھی طرح دیکھئے اور سمجھئے۔ بیگم سرور کو ضرور تنہائی کا احساس ہوگا۔ لیکن اگر آپ کچھ وقت گھر پر گزار کر ان کا دل بہلائیں گے اور برتن باسن بھی سنبھال لیں گے تو انھیں بھی خاصے دلچسپ تجربے ہوں گے۔ کچھ تکلیف بھی ہوئی تو یہ کیا کم ہے کہ وہ تکلیف آپ کی معیت میں ہوگی۔ جن دنوں میں وہاں گیا تھا سوشل سائنسز میں ایک دلچسپ کام ہو رہا تھا۔ عنوان تو یاد نہیں لیکن تحقیق کا موضوع تھا AN INVESTIGATION INTO THE READING HABITS OF PEOPLE ان کے ذریعہ وہ BEST SELLERS اور اچھے ادب وغیرہ کی خصوصیات، ذوق کی تربیت اور قاری کے رجحانات کا تجزیہ کرنا چاہتے تھے۔ اگر رپورٹ چھپی ہو تو حاصل کیجئے گا۔ گو ہمارے حالات مختلف ہیں لیکن شاید کچھ فائدہ اس طرح کا کام کر کے ہم بھی حاصل کر سکیں۔

میں نے بھی کہاں کہاں کی باتیں چھیڑ دیں۔ دکھوں کچھ اپنی بھی مژگاں خوں فشاں کے لئے۔ ادھر صحت خراب رہی، مجھ سے زیادہ بیوی بیمار رہیں۔ ادھر ایک ہفتہ سے زیادہ تکلیفیں ہیں۔ شکر آتی ہے۔ اس کی پیچیدگیاں ہیں۔ میں علی گڑھ مہینوں سے نہیں گیا۔ شاید ۱۳ کو جاؤں۔ ایکلیٹو کی میٹنگ ہے۔ خورشید اور جذبی کے معاملے کی وجہ سے علی گڑھ میں خاصی گروہ بندی اور انتشار ہے۔ جذبی کی طرف سے ہائی کورٹ میں رٹ بھی ہے۔ مجھے صورت حال معلوم نہیں۔ ڈاکٹر مقبول آگئے تھے۔ انھیں سے کچھ باتیں معلوم ہوئیں۔ کچھ جبر آر جیدر سے معلوم ہوئیں۔ اپریل میں خورشید کے باہر جانے کی بھی خبر ہے۔

یوپی کے اردو بورڈ کی صرف تشکیل ہوئی ہے۔ ابھی کوئی میٹنگ نہیں ہوئی۔ ہو بھی کیسے۔ کانگریس شدید بحران کا شکار ہے۔ اندرا اور سنجے کی لڑائی نقطۂ عروج پر ہے۔ اور سب صرف تماشائی نہیں گھات میں لگے ہوئے ہیں۔ کیرل کی متحدہ محاذ کی وزارت ختم ہو گئی۔ بنگال میں ڈانواڈول ہے، مرکز کے انتشار کا اثر صوبائی کانگریسی حکومتوں پر بھی پڑے گا اور مرکز پر بھی۔ اگلے دو ہفتوں میں ساری باتیں کھل کر سامنے آئیں گی۔ وہاں کے اخبارات میں یہاں کی خبریں برائے نام ہی ملتی ہوں گی۔ آپ نیویارک یا واشنگٹن میں ہوتے تو EMBASSY کے اخبارات سے کام چل جاتا۔ خیر چند مہینوں تک یہ بے خبری بھی بری نہیں رہے گی۔

نعیم کے وہاں ہونے سے آپ کو یقیناً آسانیاں ہوں گی۔ انھیں دعا کہئے گا۔ کل ہی ڈاکٹر تارا چند سے اور ردیب صاحب سے ایک میٹنگ میں ملاقات ہو گئی۔ آپ کا سلام پہنچا دیا۔ وہ لوگ بھی سلام لکھاتے ہیں۔ اعجاز صاحب آج ہی ملے تھے۔ اچھے ہیں۔ سلام کہتے ہیں۔ آج کل مسلم ہوسٹل میں سخت بحران ہے۔ وہ سکریٹری ہیں، اس سے پریشان ہیں۔ چند دنوں سے جبر آر جیدر سے ملاقات نہیں ہوئی۔ ملوں گا تو تفصیلات بتاؤں گا۔ جن دوستوں سے ملاقات ہوگی سلام کہوں گا۔ ۲۷ ستمبر کو لکھنؤ میں حسینی صاحب کا انتقال ہو گیا۔ اپنی وضع اور رنگ کے بے مثال انسان تھے۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی کی بیوی کا اچانک انتقال ہو گیا۔ دسمبر میں بمبئی کے اردو دوست کنونشن کر رہے ہیں۔ کوئی قابلِ ذکر کتاب نہیں چھپی ہے۔ بیگم سرور سے تسلیم کہئے۔ پھر کبھی تفصیل سے لکھئے۔

آپ کا: احتشام

(۱)

۲۔انجنیئرنگ کوارٹرز، زین العابدین روڈ۔ علی گڑھ۔ ۷ رجون ۱۹۵۰ء

سرورصاحب مکرم! السلام علیکم ——— امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ پچھلی دفعہ جب آپ علی گڑھ تشریف لائے تھے تو رشید صاحب کے دولت کدے پر شب کے وقت ملاقات ہوئی تھی۔ اس وقت میں آپ سے اپنے بارے میں کچھ بات چیت کرنا چاہتا تھا لیکن مہلت نہیں ملی۔ تاآں کہ آپ تانگے پر سوار ہو کر اسٹیشن کے لئے روانہ ہوگئے۔ آپ نے چلتے وقت کہا تھا کہ میں چند روز کے لئے مئی میں آؤں گا اور فراغت کے ساتھ دو چار دن یہاں رہوں گا۔ چنانچہ میں آج تک آپ کی تشریف آوری کا منتظر رہا۔ اب مایوس ہو کر اور یہ سوچ کر کہ دوسری مصروفیتوں کی بنا پر آپ نہیں آسکے اور شاید نہیں آسکیں گے، یہ خط لکھ رہا ہوں اور بذریعہ تحریر ہم کلام ہونا چاہتا ہوں۔

آپ کو یاد ہوگا کہ مارچ ۱۹۴۶ء میں میں نے آپ کو ایک خط لکھا تھا جس میں اپنی شومیٔ بخت کا رونا رویا تھا کہ میرا حال "ڈوبنے جاؤں تو دریا ملے پایاب مجھے" کے مصداق ہے۔ میں تیرہ سال تک اسکول میں پڑا رہا۔ ادبی افسون کہانی اور ایم۔ اے کرنے نہیں دیا۔ لیکن اب جب کہ بالآخر میں نے ایم۔ اے۔ کرلیا تو اردو ہی اس ملک سے رخصت ہوگئی یا جلاوطن کردی گئی۔ جب ۱۹۳۴ء میں سیدین صاحب نے مجھے سٹی اسکول میں جگہ دلائی تو یہ اسکول جوہر اعتبار سے یوپی کا بہترین اور خوشحال ترین اسکول تھا، میرے آتے ہی مالی و اقتصادی بدحالی کا شکار ہوگیا۔ اور مسلسل چار سال تک سالانہ ترقیاں بند رہیں۔ اب ۱۹۴۷ء میں ایم۔ اے۔ کیا تو میری سبز قدمی کی بدولت شعبۂ اردو پر ادبار کی گھٹائیں چھانے لگیں بلکہ اردو ہی کا ستارہ گہنا گیا۔ گویا نہ میں اردو میں ایم۔ اے۔ کرتا نہ انڈین یونین میں اردو پر تباہی آتی۔ وہی مرزا غالب والی بات کہ جس سے عشق کیا اس کو مار رکھا۔ جس کی شان میں قصیدہ لکھا وہ نیست و نابود ہوا اور جس سرکار کے متوسل اور وظیفہ خوار بنے وہی سرکار ملیا میٹ ہوکر رہی۔

آپ کو یہ معلوم کر کے رنج ہوگا کہ آج دو سال کے بعد بھی میں جہاں تھا وہیں ہوں۔ بلکہ شاید حالات پہلے سے بھی بدتر ہیں اور مایوسی و ناکامی کے سائے زیادہ گہرے ہوگئے ہیں۔ گزشتہ مارچ میں ایگزیکٹو کونسل نے میرے متعلق یہ رزولیوشن پاس کیا کہ ۱۲ ستمبر سے میں اسکول واپس جاؤں۔ یہ فیصلہ باوجود اس امر کے ہوا ہے کہ مسعود صاحب دو سال کے لئے انگلستان جا رہے ہیں۔ گویا ۱۹۴۷ء میں جو تعداد تھی اس کے مقابلے میں تین لکچرر کم رہیں گے۔ ایک تو مسعود صاحب کی جگہ خالی رہے گی، دوسری وہ جس کو میں ۱۲ ستمبر کو خالی کردوں گا اور تیسری وہ جو ۱۹۴۶ء سے خالی پڑی ہے۔ جس پر میرا تقرر ۱۹۴۷ء میں ہوا تھا اور جو

میرے تقرر کے چند ماہ کے بعد ہی ABEYANCE میں ڈال دی گئی تھی۔ کس قدر عجیب بات ہے کہ جب بھی میرے تقرر کا وقت آتا ہے ایک پوسٹ ABAYANCE میں چلی جاتی ہے۔ اور جب بھی یونیورسٹی میں RETRENCHMENT کا شور بلند ہوتا ہے اور تخفیف کی آندھی چلتی ہے ایک میں ہی ہوں جس کی ملازمت کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے اور کہیں کوئی دوسرا شخص تخفیف میں نہیں لایا جاتا۔ سنہ ۱۹۴۸ء کے آغاز میں نواب اسمٰعیل خان صاحب نے اخراجات میں کمی کرنے کے مقصد سے ہر شعبے کے صدر سے بات چیت کی اور نتیجہ اس شکل میں ظاہر ہوا کہ صرف شعبۂ اردو میں ایک جگہ معطل کر دی گئی اور یہ وہ جگہ تھی جس پر چند ماہ پیشتر میرا تقرر ہوا تھا۔ اب پچھلے دنوں پھر تخفیف کا سلسلہ شروع ہوا اور مجھے اسکول واپس جانے کا حکم مل گیا۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ ابھی چند ماہ پیشتر گریڈ اوّل میں دو تقرر کئے جا چکے ہیں۔ اس وقت نہ تو یہ سوال پیدا ہوا کہ شعبے میں کام کم ہے اور نہ یہ مسئلہ اٹھا کہ یونیورسٹی کے اخراجات میں کمی کرنے کی ضرورت ہے۔ لطف یہ ہے کہ میں بھی ان دو جگہوں میں سے ایک کے لئے درخواست دے سکتا تھا اور اپنے آپ کو مستحق ثابت کر سکتا تھا لیکن میں نے ایسا نہیں کیا، یہ سوچ کر کہ میرے لئے یہی بہت کافی ہے کہ گریڈ دوم میں مستقل کر دیا جاؤں، بے صبری اور بے قراری سے کام کیوں لوں۔ وقت آئے گا تو گریڈ اوّل بھی مل رہے گا۔ افسوس ہے کہ میرے صبر کا مجھے کوئی اچھا پھل نہیں ملا۔

میں اپنے آپ کو دوسروں سے فائق و برتر خیال نہیں کرتا۔ مجھے اپنی حدود، اپنی خامیوں، اپنی نالائقیوں اور بدتوفیقیوں کا پورا علم ہے لیکن یہ ضرور محسوس کرتا ہوں اور شاید کہنے کا بھی حق رکھتا ہوں کہ میں نالائق نہیں ہوں۔ میں نے تین سال تک شعبۂ اردو میں خاصی لیاقت، محنت اور کارکردگی کا ثبوت دیا ہے۔ ٹائم ٹیبل اس بات کا شاہد ہے کہ ایم۔ اے۔ میں سب سے زیادہ گھنٹے میں پڑھاتا رہا ہوں۔ اس کے علاوہ رشید صاحب نے جب بھی کسی کام کی فرمائش کی میں نے پورے انہماک، توجہ اور سرگرمی کے ساتھ اس کو انجام دیا ہے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ امتثالِ امر یا تعمیلِ ارشاد میں مجھ سے کوتاہی ہوئی ہو یا میں نے نیت و لعل سے کام لیا ہو۔ چنانچہ رشید صاحب مجھ سے خوش ہیں۔ میرے کام سے اور مزاج و کردار سے مطمئن ہیں، میرے مدّاح ہیں اور بے حد قدر افزائی سے کام لیتے ہوئے میری لیاقت کے معترف ہیں۔ ان کو اگر مجھ سے شکایت ہے تو یہی کہ میں ضرورت سے زیادہ محنتی ہوں۔ کبھی کسی کام کے لئے فرماتے ہیں تو یہ ضرور کہتے ہیں کہ بھئی آپ محنت بہت زیادہ کر ڈالتے ہیں۔ اتنی محنت کی ضرورت نہیں۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ جہاں تک محنت و جانفشانی اور پڑھانے کا تعلق ہے غالباً کوئی مجھ پر سبقت نہیں لے جا سکے گا۔ پھر میرا ادبی کام ہے، میری تصانیف ہیں، میری ادبی شہرت ہے۔ میں نے ادب کی متعدد اصناف میں کام کیا ہے۔ میں ایک درجن کتابیں شائع کر چکا ہوں اور تین چار کتابیں بہت جلد شائع کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ اور آپ جانتے ہیں یہ ادبی کام کوڑا کرکٹ نہیں ہے۔ اس کے بعض حصے خاصے وقیع اور قابلِ قدر ہیں اور اردو ادب میں مستقل اہمیت رکھتے ہیں۔ اپنے بارے میں کسی قسم کی لب کشائی

کو میں اچھا نہیں سمجھتا اور پھر جب آپ سے مخاطب ہو رہا ہوں تو یہ چیز بے ضرورت ہی ہے۔ کیونکہ آپ مجھے اچھی طرح جانتے ہیں۔ یہ چند جملے محض اظہارِ حقیقت کے سلسلے میں زبان قلم سے نکل گئے ہیں۔ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ اس سب کے باوجود میرے متعلق جو فیصلہ یونیورسٹی نے کیا وہ صریحی بے انصافی ہے، جس کا مجھے بہت رنج ہے۔ بلکہ آپ اجازت دیں تو کہوں کہ یہ ایک جانکاہ صدمہ ہے کیونکہ مجھے ہرگز ہرگز اس بات کی توقع نہیں تھی کہ میرے ساتھ یہ برتاؤ روا رکھا جائے گا۔ میں عمر بھر اس صدمہ کو نہیں بھلا سکوں گا۔ اور یہ نہیں بھول سکوں گا کہ علی گڑھ کے شعبۂ اردو میں میرے لئے گنجائش نہیں نکل سکی۔

میں علی گڑھ میں سترہ (۱۷) سال سے پڑا ہوا ہوں اور آج تک گریڈ دوم کا لکچرر بھی نہیں ہو سکا۔ ان سترہ (۱۷) سالوں کے دوران میں میں نے سٹی اسکول کے علاوہ ٹریننگ کالج میں بھی کام کیا۔ شعبۂ اردو میں بھی اور گرلز کالج میں بھی۔ اور آپ جانتے ہیں کہ ہر جگہ میں نے اعلیٰ کارکردگی کا ثبوت دیا۔ اس کے باوجود آج میرا یہ حال ہے! آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ حقیقت میرے ساتھ کتنی المناک اور شرم انگیز نہ ہوگی؟ میں نے یہ سب باتیں آپ کو اس لئے لکھیں کہ آپ میرے دوست ہیں، کرم فرما ہیں، انصاف پروری کا جذبہ رکھتے ہیں۔ جو افتاد مجھ پر پڑی ہے اس سے آپ کو مطلع کرنا ایک قدرتی خواہش تھی۔ دوسرے اس لئے کہ میں آپ کا مشورہ چاہتا ہوں۔ اور مشورہ اس لئے کہ میں اسکول واپس نہیں جاؤں گا۔ میری عمر چالیس (۴۲) سال کی ہو گئی۔ بیوی بچوں والا آدمی ہوں۔ ایک خاص معیار سے زندگی بسر کرتا ہوں۔ اپنے آپ کو بہت ملیامیٹ کر چکا۔ اس سے زیادہ کا حوصلہ نہیں۔ اسکول کے ڈیڑھ سو (۱۵۰) روپے میرے کس کام آئیں گے؟ غرض کہ اسکول واپس نہیں جاؤں گا۔ پاکستان بھی نہیں جانا چاہتا۔ حالانکہ شادانی صاحب تین سال سے برابر مجھے بلا رہے ہیں۔ میں اپنے نجی حالات، اپنی طبیعت کے انداز اور اپنے عقائد کی بنا پر وہاں نہیں جانا چاہتا۔ تو پھر آخر مجھے کیا کرنا چاہئے؟

آپ کا: اختر انصاری

۲۸ / اپریل ۱۹۸۳ء

مکرمی جناب سرور صاحب! تسلیم ——— آپ کا نوازش نامہ ملا تھا۔ خیال تھا کہ اپریل میں آپ سے ملاقات ہوگی۔ لیکن آنا نہ ہو سکا۔ میرے نام دعوت نامہ بھی نہیں تھا۔ شاید ۲۱ / اپریل کا جلسہ اس سال نہیں ہوا؟ نارنگ سے اور پھر آصف سے معلوم ہوا کہ آپ جولائی میں انسٹی ٹیوٹ چھوڑ رہے ہیں۔ کشمیر اور اقبالیات کا تو نقصان ہے لیکن ہم لوگوں کا، اردو ادب کا اور آپ کا فائدہ ہے۔ آپ جم کر علی گڑھ میں رہیں اور ادھورے کام مکمل کریں۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے بارے میں نارنگ سے بات ہوئی تھی۔ جیسا کہ آپ نے کہا تھا جب تک آپ کے اختیارات وغیرہ کی بات صاف نہ ہو انسٹی ٹیوٹ

میں آپ کا ہونا کوئی خاص سود مند نہ ہوگا۔ ابھی نارنگ سے مزید بات کر کے آپ کو پھر خط لکھوں گا۔

پچھلے خط میں آپ نے فرمایا تھا کہ میں "روزمرہ" کے بارے میں اپنے تصور کی وضاحت کروں۔ میرا خیال ہے "روزمرہ" وہ بامحاورہ زبان ہے جو عام اظہار خیال کے لئے کام میں آتی ہے۔ ایسی زبان جس میں تصورات اور جذبات کی نزاکتوں کا اظہار نہیں ہوتا۔ ہمارے یہاں "روزمرّہ" کی جو تعریف ہے اس کے لئے انگریزی میں COLLOQUIAL اور IDIOMATIC دونوں الفاظ بیک وقت استعمال ہونے چاہئیں۔ "بامحاورہ" سے میری مراد یہ نہیں کہ ایسی زبان میں FIXED IDIOMS ہوں۔ مثلاً "پانی پانی ہو جانا" وغیرہ۔ بلکہ میری مراد یہ ہے کہ الفاظ کو برتنے کا وہ طریقہ جو رواج عام کا SANCTION رکھتا ہے۔ مثلاً "اردو وہ زبان ہے جو لاکھوں لوگوں سے پڑھی جاتی ہے" صحیح ہے لیکن بامحاورہ نہیں ہے۔ اس جملے کی بامحاورہ شکل یہ ہوگی: "اردو وہ زبان ہے جسے لاکھوں لوگ پڑھتے ہیں"۔ حالی کی جو مثال آپ نے لکھی ہے وہ بھی روزمرہ یعنی IDIOMATIC ہے۔ (۱) "دلّی سے آگرے تک چار یا پانچ کوس پر سرائیں تھیں"۔ یہ جملہ "عام زبان" نہیں ہے۔ بلکہ میرے خیال میں UNIDIOMATIC ہے۔ (۲) "دلّی سے آگرے تک ہر چار چار پانچ پانچ کوس پر سرائیں تھیں"۔ یہ جملہ بامحاورہ یعنی IDIOMATIC AND COLLOQUIAL ہے۔ (۳) "دلّی سے آگرے تک ہر چار یا پانچ کوس کے فاصلے پر سرائیں واقع تھیں"۔ یہ جملہ IDIOMATIC تو ہے لیکن COLLOQUIAL نہیں ہے۔ اس لئے جملہ (۲) کو میں روزمرہ کہتا ہوں۔ یا مثال کے طور پر "دلّی سے آگرے تک" نہ بول کر "دلّی سے آگرہ تک" (یعنی امالے کے بغیر محض AGRA نہ کہ AGREY) بولا جائے تو یہ غلط تو نہ ہوگا لیکن روزمرّہ کے خلاف ہوگا۔

آپ والی کتاب جامعہ والوں کو ہی دے دوں گا۔ ان سے بات کر لی ہے۔ وہ بخوشی راضی ہیں۔ اصغر عباس نے BIBLIOGRAPHY — اب تک نہیں بھیجی ہے۔ ورنہ کام تقریباً مکمل ہے۔ امّی کو آداب۔

خادم: شمس الرحمٰن

حواشی

۱۔ اثرؔ لکھنوی کے دو خط میرے نام ہیں اور تیسرا ارشدؔ صاحب کے نام ہے جو انھوں نے میرے پاس بھیج دیا تھا۔ پہلے خط میں اثرؔ صاحب نے آتشؔ کے مشہور قطعے کے متعلق اظہار خیال کیا ہے۔ میں نے اپنے ایک مضمون میں صرف پہلے شعر کی بنا پر آتشؔ کے نظریۂ شعر کی طرف اشارہ کیا تھا۔ اثرؔ صاحب نے اس پر بحث کرتے ہوئے آتشؔ کے قطعے کے دونوں اشعار کے حوالے سے آتشؔ کے نظریۂ فن کی ترجمانی کر دی ہے۔

دوسرے خط میں میری ایک غزل کے چند اشعار کے سلسلے میں اپنی رائے ظاہر کی ہے۔ بعض اشعار میں انھوں نے اصلاحیں بھی

تجویز کی ہیں۔ اس سے پہلے بھی اثؔر صاحب نے میری کئی غزلوں پر اظہارِ خیال کیا تھا۔ بعض اشعار کی تعریف کی تھی اور بعض میں اصلاحیں تجویز کی تھیں۔

رشیؔد صاحب کے نام جو خط ہے اس کے سلسلے میں یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ ۱۵ر ستمبر ۱۹۵۸ء کے "ہماری زبان" میں رشیؔد صاحب کا ایک خط چھپا تھا۔ اس خط میں انھوں نے اس بحث پر اظہارِ افسوس کیا تھا جو اس زمانے میں ادبی رسالوں میں اثؔر اور فراؔق کے درمیان چل رہی تھی اور جو روز بروز تلخ ہوتی جارہی تھی۔ یہ خط اثؔر صاحب نے جواب میں لکھا تھا۔ ہماری زبان کے اسی پرچے میں اس موضوع پر میرا اداریہ بھی تھا۔ یاد آتا ہے کہ حسؔن عسکری نے بھی اس سلسلے میں بعد میں اظہارِ خیال کیا تھا۔

۲- جب ۱۹۳۵ء کے شروع میں میرا پہلا مجموعۂ کلام "سلسبیل" شائع ہوا تو میں نے نیاؔز فتح پوری، اصغؔر گونڈوی، پطرؔس بخاری، مولوی عبدؔالحق اور کچھ اور حضرات کو ریویو کے لئے ایک ایک نسخہ بھیجا۔ رسالہ "نگار"، "ہندوستانی" اور "اردو"، اورنگ آباد میں اس پر ریویو نکلے تھے۔ پروفیسر بخاری نے جواب میں جو خط لکھا تھا اس میں "سلسبیل" کی خوبیوں اور خامیوں دونوں کا جائزہ لیا گیا تھا۔ لیکن لہجہ عمومی طور پر ہمدردانہ تھا۔ یہ خط ان کے اسلوب کا اچھا نمونہ ہے۔ "رشید صاحب کا تعارف" سے مراد وہ تعارف ہے جو انھوں نے "سلسبیل" پر لکھا تھا۔ رشیؔد صاحب کی چست نثر کا بھی پطرؔس بخاری نے اعتراف کیا ہے۔ کچھ دن پہلے رشیؔد صاحب نے ڈاکٹر ضیاؔء الدین کی حمایت میں کوئی مضمون لکھا تھا، اس کا بھی تذکرہ ہے۔ پطرؔس بخاری کا یہ جملہ خاص طور سے توجہ طلب ہے "جب پیام یار کا دور گزر گیا تو اردو شاعری سے امیدیں وابستہ ہونے لگیں۔ تھوڑے عرصے میں ثابت ہوا کہ محض یار ہی غائب ہوا ہے۔ اب صرف پیام کا دور دورہ ہوگا۔"

۳- پروفیسر حامد حسن قادری "داستان تاریخ ادب اردو" کے مصنف کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ میں جب سینٹ جانس کالج، آگرہ میں پڑھتا تھا تو اگرچہ سائنس کا طالب علم تھا مگر ادب سے دلچسپی کی وجہ سے حامد حسن قادری اور ان کے بڑے بھائی عابد حسن فریدی صاحب سے ملاقات رہتی تھی۔ فریدؔی صاحب فارسی اور قادؔری صاحب اردو پڑھاتے تھے۔ اس زمانے میں سینٹ جانس کالج میں بی۔ اے۔ میں اردو اور فارسی دونوں پڑھائی جاتی تھیں۔ اردو اب تک پڑھائی جاتی ہے۔ قادؔری صاحب نے مجھے کالج کی اردو سوسائٹی کا سکریٹری بھی بنادیا تھا۔ "داستان تاریخ اردو" کے علاوہ "کمال داغ" کے نام سے داؔغ کے کلام کا انتخاب اور "تاریخ و تنقید" کے نام سے مضامین کا ایک مجموعہ بھی ان سے یادگار ہے۔ قادؔری صاحب قدیم مشرقی روایات کے علمبردار تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کے مزاج میں ایک شوخی بھی تھی۔ قدیم اردو ادب پر گہری نظر کے علاوہ تاریخ گوئی میں بھی قادؔری صاحب کو ملکہ حاصل تھا۔ اردو میں تاریخ گو شعرا کا اگر کوئی تذکرہ مرتب کیا جائے گا تو اس میں ان کا نام بہت ممتاز ہوگا۔ کلیؔم الدین صاحب نے غزل پر جو اعتراضات

گئے تھے ان کا جواب ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے "نگار" کے سالنامے میں دیا تھا۔ قادری صاحب کو ابواللیث صدیقی سے سخت اختلاف تھا۔ ان کا یہ جملہ بہت دلچسپ ہے کہ "نہایت وثوق و اعتماد اور فخر و مسرت کے ساتھ اس بات کا اعلان کرنا چاہیے کہ غزل میں ہرگز کوئی ربط نہیں ہوتا۔ غزل کی یہی خوبی ہے کہ اس میں ربط نہیں ہوتا۔ کوئی شخص ربط پیدا کرے تو ہم کو منظور نہیں۔ مربوط و مسلسل غزلوں کی قسم بھی الگ ہے۔"

دوسرے خط میں اگرچہ تاریخ نہیں ہے مگر سیاق و سباق سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۹۴۸ء کا ہے۔ اس خط میں ان کی بعض بے ساختہ تاریخیں ہیں۔ تقسیم پر یہ تاریخ داد سے مستغنی ہے سے ہو گئے خاندان بارہ باٹ

۱۳۶۸ھ

یاد آتا ہے کہ جب وہ پاکستان جا رہے تھے تو اپنے ایک خط میں داغ کے ایک شعر سے اپنے جانے کی تاریخ نکالی تھی سے

اب ہم بھی جانے والے ہیں سامان تو گیا

۴۔ مشہور مارکسی نقاد سید احتشام حسین لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو و فارسی میں میرے رفیق تھے۔ ۱۹۵۲ء میں ان کو راک فیلر فیلو شپ ملی تھی تاکہ وہ امریکہ اور انگلستان کا دورہ کر کے عالمی ادبی رجحانات کے متعلق اپنے علم میں اضافہ کریں۔ انھوں نے اپنے اس سفر کی روداد وطن واپسی کے بعد "ساحل اور سمندر" کے نام سے شائع کر دی تھی۔ یہ کتاب ان کے اسلوب کا اچھا نمونہ ہے۔ میرے اور دوسرے دوستوں کے نام خطوں میں وہ اپنے تاثرات لکھ بھیجتے تھے۔ دو خط اسی سفر سے متعلق ہیں۔ پہلا واشنگٹن سے لکھا گیا ہے اور دوسرا لندن سے۔ ان دونوں خطوں میں ان کے تاثرات خاصے معنی خیز ہیں۔ پہلے خط میں امریکہ کے علمی ماحول کے متعلق اور دوسرے میں انگلستان کے متعلق تاثرات ہیں۔ لندن اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز والوں کی ہندوستان کی موجودہ لسانی گتھی کے متعلق خاموشی پر تبصرہ معنی خیز ہے۔ احتشام صاحب کے اس خط سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ انگریز اپنی سیاسی مصلحتوں کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ علمی اور لسانی حقائق کو کم۔ تیسرا خط جو نومبر ۱۹۶۹ء کا لکھا ہوا ہے، اس زمانے کا ہے جب میں شکاگو یونیورسٹی میں وزِٹنگ پروفیسر تھا۔ احتشام صاحب کی امریکہ کے متعلق یہ رائے قابل غور ہے کہ "سیاسی نظام اور اوپری طبقے کے عزائم کی بات اور ہے۔ یونیورسٹیوں میں تحقیق اور علمی ذوق، اساتذہ میں کام کی لگن اور اپنے موضوع سے شغف قابلِ رشک ہے۔"

۵۔ اختر انصاری: اردو کے مشہور شاعر، ادیب، افسانہ نگار اور استاد۔ قطعات کے مجموعے "روحِ نغمہ" کی وجہ سے ان کی شہرت شروع ہوئی۔ ایک عرصے تک سٹی ہائی اسکول، علی گڑھ میں استاد رہے۔ ۱۹۴۷ء میں ایک عارضی جگہ پر شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں لکچرر مقرر ہوئے۔ ابھی انھیں اس جگہ پر کام کرتے دو سال ہی گزرے تھے کہ یہ جگہ تخفیف میں آگئی۔ ان کی سلیکشن کمیٹی میں ایکسپرٹ کی حیثیت سے میں لکھنؤ سے آیا تھا۔ رشید صاحب بھی ان کے کام سے مطمئن اور خوش

(بقیہ صفحہ ۱۲۶ پر)

اخترالایمان

"..... اس آباد خرابے میں"

پندرھواں باب

یہ خود نوشت جو آباد خرابے کے عنوان سے لکھی گئی ہے، اس کا نام "چلتے چلاتے"، "آپ بیتی"، "ایک جہاں گرد کی کہانی" یا کچھ اور بھی ہو سکتا تھا مگر محمود ایاز نے "سوغات" میں اس کا نام "اس آباد خرابے میں" رکھ دیا۔ یہ عنوان انھوں نے میری ہی ایک نظم "یادیں" کے ایک مصرعے سے لیا ہے ع

"دیکھو ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں"

اس کتاب کا لکھا جانا بھی ایک کہانی ہے۔ اب تو میں "ڈائیلے سز" کے سبب تھوڑا مجبور ہوں۔ چلنا پھرنا محدود ہو گیا۔ مگر پہلے کافی اِدھر اُدھر جاتا تھا اور ادبی ہنگاموں، جلسوں اور مشاعروں میں شریک ہوتا تھا۔ ایک نشست میں شہریار نے کسی بات پر کہا "اختر بھائی! اپنی سوانح کیوں نہیں لکھتے آپ"۔ بہت دن بعد کہیں ایک اور ایسا ہی اجتماع تھا کہ وارث علوی نے یہی بات دہرائی۔ بنگلور جانا ہوا تو محمود ایاز نے بھی یہی بات کہی اور پھر اس کے بعد انھوں نے تقاضوں کی ڈاک بٹھا دی۔ ایک بار کچھ لکھنے کی رو آئی تو میں نے قلم برداشتہ کچھ صفحات لکھے تھے۔ پھر یہ سوچ کر قلم روک لیا تھا کہ سرگزشت تو اہم لوگوں کی ہوتی ہے۔ میرا ایک مصرعہ ہے ع

زندگی بھیک ہے جو جبرِ مشیت سے ملی

بھکاری کی سرگزشت کیا۔ ایک شاعری ہے جس میں عمر کھپا دی۔ معلوم نہیں اس کا بھی کیا حشر ہوتا ہے۔

اپنی پیدائش کے سلسلے میں کہیں قلعہ پتھر گڑھ کا ذکر کیا ہے میں نے۔ اب تو یہ ایک بے نام سی بستی ہے۔ منہدم قلعے پر آثارِ قدیمہ کا بورڈ لگا ہے مگر میری پیدائش سے کافی پہلے یہ بڑی سیاسی اور فوجی سرگرمیوں کا گڑھ تھا۔ نجیب خان ایک روہیلا پٹھان تھا۔ بہت زیرک اور بہادر۔ کہیں افغانستان کی طرف سے آیا تھا۔ یہ اسی کے توڑ جوڑ کا نتیجہ تھا کہ

احمد شاہ ابدالی دلّی پر حملہ کا ارادہ ترک کر کے پانی پت کے میدان میں مراٹھوں سے ٹکرا گیا اور اُن کا زور ختم کر دیا۔ نجیب خان ہندوستان کی تاریخ میں نجیب الدّولہ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ۱۷۵۵ء میں قلعہ پتھر گڑھ اُسی نے بنوایا تھا۔ نجیب آباد شہر بھی اُسی نے آباد کیا تھا۔ انگریز نجیب الدّولہ سے بہت خائف تھے۔ اس پر پے در پے حملے کرائے گئے۔ جھنکو راؤ سندھیا اور ملہار راؤ مراٹھے نے چاندی کے متّصل گنو مکھ گھاٹ سے اتر کر قلعہ پتھر گڑھ اور نجیب آباد پر حملہ کیا۔ قلعہ پر توپیں چلائیں اور نجیب آباد کو لوٹا۔ شاہ عالم کے وقت میں نجف خان، سندھیا اور ٹکوجی مراٹھے نے نجیب الدّولہ کے بیٹے ضابطہ خان پر چڑھائی کی۔ قلعہ پتھر گڑھ اور نجیب آباد کو برباد کیا۔ ۱۷۷۴ء میں شجاع الدّولہ نے اس قلعہ کو اپنے قبضہ میں لے لیا۔ ۱۸۰۱ء میں یہ جگہ انگریزوں کے قبضے میں آ گئی۔ یادگار کے طور پر اب یہاں نجیب الدّولہ کے بھائی جلال الدین کا مقبرہ ہے۔ نوبت خانے کے کھنڈرات ہیں۔ نواب معین الدین کا لگایا ہوا باغ ہے۔ مبارک بنیاد کے نام سے ایک عمارت ہے۔ جس روز جلال الدین کے یہاں بیٹا پیدا ہوا تھا اسی دن اس عمارت کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ یہاں اور کچھ عمارتیں اور مسجدیں ہیں، جو گذرے وقت کی یاد دلاتی ہیں۔ یہاں ۱۸۶۶ء میں پہلی میونسپلٹی قائم ہوئی تھی۔ یہ سارا علاقہ بجنور کے ضلع میں شامل ہے۔ بجنور اور نجیب آباد کے درمیان غالباً پچیس تیس میل کا فاصلہ ہے۔ بجنور کا سلسلہ مورخین راجہ چندر گپت سے جوڑتے ہیں۔ یہ اُن کی قلمرو میں شامل تھا۔ راجہ بھرت، جن کے نام پر ہندوستان کا نام بھارت پڑا، اُن کی ماں کیکئی بجنور ہی کی رہنے والی تھیں۔ نے اپنے سفرنامہ میں جس ندی کا ذکر کیا ہے وہ یہی یاکنی ندی ہے جو آج عرفِ عام میں یالآوالی کہلاتی ہے۔ اس علاقے میں جو تاریخ کی دست برد سے بچ گیا وہ میرے بچپن کی یادوں میں شامل ہے۔

ادب اور قلم کے اعتبار سے میرے لئے ۱۹۶۰ء سے ۱۹۸۵ء کا دور بہت اہم ہے۔ اس دوران میں نے کئی شعری مجموعے شائع کئے۔ "یادیں" جو ۱۹۶۱ء میں چھپی تھی اُس پر مجھے ساہتیہ اکادمی کا انعام ملا۔ میری پہلی کتاب "گرداب" ۱۹۴۴ء میں دلّی سے چھپی تھی۔ ساقی بکڈپو نے شائع کی تھی۔ اس کے بعد تھوڑے تھوڑے وقفے سے "تاریک سیارہ" اور "آبِ جو" چھپیں۔ یہ دونوں کتابیں مکتبۂ اردو، لاہور اور مکتبہ جدید نے چھاپی تھیں۔ اس کے بعد "سب رنگ"، "یادیں" "بنت لمحات"، "نیا آہنگ"، "سرو ساماں" اور "زمین زمین" شائع ہوئیں۔ ان سب ہی کتابوں پر کسی نہ کسی اردو اکادمی اور ادبی اکادمی نے انعامات دئے، جن میں اردو اکادمی لکھنؤ، میر اکادمی لکھنؤ، غالب اکادمی دلّی، اردو اکادمی دلّی شامل ہیں۔ ان کے علاوہ مہاراشٹرا اردو اکادمی اور مدھیہ پردیش اردو اکادمی نے بھی مجھے انعامات سے نوازا۔ مدھیہ پردیش ہی نے "سرو ساماں" پر اقبال سمان سے سرفراز کیا جو ایک لاکھ روپئے کا تھا۔ مہاراشٹرا کی

حکومت نے بھی اسٹیٹ ایوارڈ دیا جو ایک لاکھ روپے کا تھا۔

میری شعری زندگی کا آغاز میری عربک کالج کی زندگی کے آخری سالوں میں ہوا۔ میں کالج کی زندگی کا بھرپور ذکر پیچھے کسی باب میں کر چکا ہوں۔ مگر ایک واقعہ ایسا ہے جسے میں یہاں ضرور بیان کروں گا۔ میں اپنے زمانے کا ابھرتا ہوا شاعر اور بہترین مقرر مشہور تھا۔ میں تقریریں لکھ کر اور رٹ کر نہیں بولتا تھا، فی البدیہہ بولتا تھا۔ مقابلہ شروع ہونے سے پہلے صدر سے درخواست کرتا تھا مجھے شروع میں نہ بلائیں، دو چار مقرروں کے بعد بلائیں۔ میں ان مقرروں کو سُن کر اپنی تقریر ذہن میں تیار کر لیتا تھا اور دھواں دھار بولتا تھا۔ اس زمانے کا ایسا کوئی کالج میرے ذہن میں نہیں جہاں سے مجھے پہلا انعام اور اکثر ٹرافی بھی نہ ملی ہو۔ لکھنؤ یونیورسٹی، علی گڑھ یونیورسٹی (ان دنوں میں اینگلو عربک کالج دلی میں پڑھتا تھا) کانپور کالج، لاہور گورنمنٹ کالج، دلّی ہندو کالج اور لا کالج دلّی، غرض ایسی کوئی جگہ نہیں تھی جہاں سے مجھے پہلا انعام نہ ملا ہو۔

میری ایک نظم تھی جس کا عنوان مجھے یاد نہیں رہا۔ اس کا ایک مصرع تھا جو تھوڑے تھوڑے وقفے سے نظم میں دُہرایا جاتا تھا۔ ع "سچ بتا کیا زندگی سے بھاگ کر آیا ہے تو؟"

یہ نظم میرے مجموعے میں کہیں شامل نہیں۔ وہ نظم میں نے چھپنے کے لئے "ادبی دنیا" میں بھیجی۔ میراجی اس کے ایڈیٹر تھے، خاص طور سے حصّۂ نظم کے۔ وہ نظم انھوں نے واپس کر دی اور ایک چھوٹی سی تحریر اُس کے ساتھ نتھی کر دی۔

"جس عالم میں آپ نے یہ نظم کہی ہے اسی عالم میں اس پر نظرِ ثانی کیجئے۔"

انھیں دنوں میرے کالج کا سالانہ جلسہ تھا جس میں ہندوستان کے اُن تمام کالجوں سے لڑکے آتے تھے جہاں جہاں میں جاتا تھا۔ کالج کے اس جلسے میں لیڈی ہارڈنگ کالج اور اردو کالج کی لڑکیاں بھی بہت تعداد میں شریک ہوتی تھیں۔ اس جلسے کے صدر جو صاحب تھے وہ مجھے پسند نہیں کرتے تھے۔ جب مجھ سے نظم پڑھنے کی فرمائش کی گئی میں نے وہی نظم

ع "سچ بتا کیا زندگی سے بھاگ کر آیا ہے تو؟"

پڑھ دی۔ اس نظم میں ایک بند تھا جس کا ایک مصرع تھا۔ ع جس طرح اک فاحشہ عورت کو شوہر کا خیال۔

صدر صاحب چلائے۔ "بند کرو، یہ فحش نظم ہے"۔

مگر ہال میں بیٹھے ہوئے لڑکے لڑکیوں نے شور مچایا۔ "نظم فحش نہیں، ہم سنیں گے"۔ جب صدر نے اپنی بات پر اصرار کیا تو میں اسٹیج چھوڑ کر اُتر آیا۔ اور اسی بات کو لے کر اگلے روز سے کالج میں ایک لمبی ہڑتال شروع ہو گئی جس کی تفصیل میں پچھلے صفحات میں دے چکا ہوں۔

میری فلمی زندگی کا آغاز ۱۹۴۳-۱۹۴۲ء میں پونا سے ہوا۔ شالیمار فلم کمپنی میں تین سال کام کیا۔ پھر ہندوستان کا بٹوارہ

ہوگیا اور وہیں کام کی تلاش میں بمبئی آگیا۔ یہاں پرونماد اس کی فلم لکھی۔ نجم نقوی اور یوسف کی فلمیں لکھیں۔ اس کے بعد گریٹ انڈیا پکچرس اور بخشب جارچوی کی فلمیں لکھیں۔ فلمستان کی کچھ فلمیں لکھیں۔ پریم جی اور راج گھوسلہ کی فلمیں لکھیں۔ اور پھر بی۔ آر۔ فلمز سے متعلق ہوگیا اور یہ سلسلہ اگلے اٹھارہ سال تک چلا۔ بی۔ آر۔ فلمز کی پہلی فلم جو میں نے لکھی اس کا نام "قانون" تھا۔ اس فلم میں کوئی گانا نہیں تھا۔ یہ اپنے ڈھب کی پہلی فلم تھی جو صرف مکالموں پر کامیاب ہوئی۔

جب بی۔ آر۔ فلمز سے ایک مستقل رابطہ قائم ہوا تو میرا کام فلمیں لکھنے کے علاوہ یہ بھی تھا کہ میں ایکٹر، ایکٹرسوں کو مکالموں کی ریہرسل بھی کراؤں۔ اس سلسلے میں بہت سے لڑکوں اور لڑکیوں سے ملاقات ہوئی۔ جن میں سے دو ایک میرے ساتھ کئی کئی فلموں میں شریک رہے اور ان سے ایک بڑا قربت کا رابطہ قائم ہوگیا۔ ان میں دو قابلِ ذکر ہیں۔ انیتا اور صوفی۔ انیتا کی ماں بنگالی تھی اور باپ نیپالی۔ اسے اچھے مکالمے بولنے اور زبان سیکھنے کا بہت شوق تھا۔ وہ بڑی خوش شکل اور زندہ دل تھی۔ جب کبھی فرصت ملتی تھی اور ہم باتیں کرتے تھے انیتا اپنی تنہائی کا رونا بہت روتی تھی۔ اس کا میرا کئی فلموں میں ساتھ رہا۔ دو فلموں کی ہیروئن تو وہی تھی جو ایک کے بعد ایک بنی تھیں۔ یہ کم و بیش ڈھائی تین برس کی مدت ہوجاتی ہے۔ میری لڑکیاں اسے میری گرل فرینڈ کے نام سے پکارتی تھیں۔ ایک بار (آخری ملاقات ہی کہہ لیجئے اسے) مہدی حسن بمبئی آئے ہوئے تھے۔ اپنی منجھلی لڑکی اسماء اور سلطانہ کے ساتھ میں بھی انھیں سننے گیا۔ وہاں انیتا بھی تھی۔ اسماء نے کہا: "آپ کی گرل فرینڈ پیچھے کھڑی ہے۔" پلٹ کر دیکھا تو انیتا تھی۔ بڑی گرم جوشی سے اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور ہم بڑی دیر تک کھڑے باتیں کرتے رہے۔ اس وقت تک جب تک مہدی حسن نے گانا شروع نہیں کیا۔ اُسی رات وہیں مہدی حسن سے بھی ملاقات ہوئی۔

صوفی انیتا کے مقابلے میں چھوٹی تھی۔ اس نے بھی ایک کے بعد ایک میری تین چار فلموں میں کام کیا۔ جس فلم کے لئے میں جرمنی گیا تھا وہ اس فلم میں بھی تھی۔ نیورمبرگ، ہمبرگ، فرینک فرٹ، مائنز اور جرمنی کے دوسرے شہروں کی سیر میں وہ برابر میرے ساتھ رہی۔ جس طبقہ سے وہ آئی تھی اس کا ایک لطیفہ یہ ہے کہ ایک نوجوان پروڈیوسر اُس پر عاشق ہوگئے اور اس سے شادی کرنے کے ارادے سے اس (صوفی) کی ماں سے ملنے گئے۔ صوفی کی ماں نے ان کی بڑی آؤ بھگت کی اور گھر کے بچوں کو آواز دی۔ کوئی آٹھ دس بچے آکر لائن میں کھڑے ہوگئے۔ ماں نے کہا: شادی شوق سے کیجئے، پہلے ہمارا شجرہ سمجھ لیجئے۔ یہ سب بچے ایک باپ کی اولاد نہیں۔ کسی کا باپ ہوٹل کا مالک ہے، کسی کا بڑا سرکاری افسر ہے اور کسی کا بمبئی کا بڑا سیٹھ۔ گھر کا پس منظر معلوم ہوتے ہی عاشقی ہوا میں اُڑ گئی۔ صوفی اپنی ذات سے بہت اچھی اور پیاری لڑکی تھی۔ حلیم الطبع سی لڑکی۔ فلمی زندگی سے دور چلے جانے کے بعد اس طرح کے لوگوں سے ملاقات مشکل ہوجاتی

ہے۔ وہ بڑی آیک لڑکی تھی۔ افسوس ہے، وہ اس دنیا میں نہیں رہی۔ وہ میری فلم "ہمراز" کی ہیروئن تھی۔ اس نے پہلے کبھی فلم میں کام نہیں کیا تھا۔ چوپڑہ نے اسے یہ کہہ کر میرے حوالے کر دیا "اسے جو سکھانا ہے آپ سکھائیے"۔ بڑی کم گو قسم کی لڑکی تھی۔ فلم کے دوران میرا ایک مرتبہ کلکتہ جانا ہوا۔ ایک مشاعرے کے سلسلے میں۔ وہ مجھ سے ملنے آئی اور جب تک میں کلکتہ میں رہا برابر آتی رہی۔ وہ کلکتہ ہی میں رہتی تھی۔

بی۔ آر۔ فلمز میں شریک ہونے سے پہلے نجم نقوی نے "رنگیلی" کے نام سے ایک فلم بنائی تھی جو میں نے ہی لکھی تھی۔ اس میں ریحانہ کے ساتھ ایک نیا لڑکا لیا تھا۔ بڑا اچھا خوش مزاج سا اچھا قد آور نوجوان تھا۔ وہ فلم نہیں چلی۔ اس کے بعد اس نے ایک اور فلم میں کام کیا جس کا نام "آبشار" تھا۔ وہ بھی نہیں چلی۔ اسی دوران میں بی۔ آر۔ فلمز میں چلا گیا تھا۔ وہاں میں ایک فلم پر کام کر رہا تھا جس کا نام "وقت" تھا۔ اس میں ایک لڑکے کی ضرورت تھی۔ میں اپنے اس دوست کو لے گیا اور چوپڑہ سے ملوایا۔ سب لوگوں نے انھیں پسند کیا اور انھیں "وقت" میں لے لیا گیا۔ وہ فلم بے انتہا کامیاب ہوئی اور ان کا شمار بڑے اداکاروں میں ہونے لگا۔ اس فلم "وقت" کے مکالمے بھی بہت مشہور ہوئے۔ اتنے کہ زبان زدِ عام ہو گئے۔ لوگ تھیٹر میں تالیاں بجاتے تھے اور پیسے پھینکتے تھے۔ ایک مکالمہ بہت زیادہ مقبول ہوا:۔

"جن کے اپنے گھر شیشے کے ہوں وہ دوسروں پر پتھر نہیں پھینکتے"۔

جہاں جہاں بھی فلم کی نمائش ہوتی تھی اور اس فلم کے اداکار اس میں شامل ہوتے تھے وہاں اس ایکٹر سے اسٹیج پر اس مکالمے کی فرمائش ہوتی تھی۔ فلم میں یہ جملہ میرے اسی دوست ہی نے بولا تھا جن کا میں نے ذکر کیا۔ ایک روز لوگوں کی فرمائش پر وہ چڑ گئے اور چلّائے "فلم میں میں نے بھی کچھ کیا ہے کہ سب مکالمے ہی مکالمے ہیں"۔ اس کے بعد وہ دوسری فلموں میں مصروف ہو گئے۔ میں بھی نہیں مل سکا۔ ان کی میں نے کوئی فلم لکھی بھی نہیں۔ کچھ دنوں پرانی بات ہے، ایک روز ہوائی جہاز میں مل گئے۔ میں دلّی جا رہا تھا۔ کچھ دیر بیٹھے ہنستے ہنساتے رہے۔ پھر دلّی آ گیا اور ہم اُتر کر اپنے اپنے راستے چلے گئے۔

یہ سب بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ پروگرام بنا کر کوئی کسی بھی قسم کی کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔ کامیابی اتفاقی چیز ہے۔ ان کا اس فلم "وقت" میں اتفاقاً کام کرنا ان کے لئے نیو کا پتھر بن گیا۔ اگر انھیں اس وقت میری کوشش سے وہ فلم نہ ملتی تو پھر خدا جانے کب وہ فلم ملتی جو انھیں اوپر لے جاتی اور کب ان کا شمار اچھے اور بڑے اداکاروں میں ہونے لگتا۔ میں فلم کی کسی بات یا کسی واقعے کو قاعدہ کلیہ نہیں بنا رہا صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ ہر کام میں محنت کو دخل ضرور ہے اور بنیادی ذہانت بھی ضروری ہے مگر لفظ "کامیاب" کا اطلاق بہت کم لوگوں پر ہوتا ہے۔ اور کبھی کامیابی ہر ممکن کوشش کے باوجود بھی نہیں ملتی۔

بی۔ آر۔ فلمز کی میں نے "قانون" اور "وقت" ہی نہیں، اور بہت سی فلمیں لکھیں۔ جن میں "گمراہ"، "اتفاق"، "آدمی

اور انسان"، "ہمراز" اور "ضمیر" شامل ہیں۔ اس کے علاوہ باہر کے پروڈیوسروں کی کامیاب فلمیں لکھیں، جن میں "گمراہ" "نغمہ"، "پھول اور پتھر"، "پتھر کے صنم"، "میرا سایہ"، "ایکٹرس" اور "دھرم پتر" شامل ہیں۔ "وقت" اور "دھرم پتر" پر مجھے فلم فیئر ایوارڈ بھی ملا تھا۔

یہ فلیٹ "ہل ویو" جس میں ان دنوں رہتا تھا اس میں میرا بہت جی نہیں لگا۔ یہاں وہ خاموشی نہیں تھی جس کی مجھے عادت تھی یا جو "زیبو بیرولا" میں میسر تھی۔ محبوب اسٹوڈیو کے بالکل سامنے ایک احاطہ تھا جس میں تین چار عمارتیں تھیں یہ سب مکان نئے بنے تھے۔ میرا فلیٹ بالکل اسٹوڈیو کے سامنے والی عمارت میں تھا۔ اس فلیٹ کے اوپر نیچے کے گھروں میں تین چار فلم کمپنیوں کے دفتر تھے۔ جہاں لوگوں کی ہر وقت آمد جاری لگی رہتی تھی۔ اس احاطے میں جتنی عمارتیں تھیں ان کے لڑکے لڑکیاں مل کر شام کو ہل ویو کے احاطے میں بیڈمنٹن کھیلا کرتے تھے۔ میری لڑکیاں شہلا اور اسماء بھی کھیلا کرتی تھیں۔ یہ ان کے اسکول کا آخری سال تھا۔ کس کالج میں بھیجوں، یہ ابھی میں فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ ایک روز ایک واقعہ پیش آیا۔

میرے فلیٹ کے سامنے والی عمارت میں ایک صاحب رہتے تھے جن کا نام زکریا خان تھا۔ پشاور کے رہنے والے تھے۔ اچھے مشہور اداکار تھے اور فلموں میں جینت کے نام سے جانے جاتے تھے۔ ان کے دو لڑکے تھے امتیاز خان اور امجد خان۔ دونوں باندرہ ہی کے ایک کالج میں پڑھتے تھے۔ ایک روز اُن کی والدہ قمر جہاں آئیں اور اپنے چھوٹے بیٹے امجد خان سے شہلا کے رشتے کی بات کی۔ شہلا کی ابھی شادی کی عمر نہیں تھی۔ اس نے صرف اسکول کی تعلیم ختم کی تھی۔ میں نے قمر جہاں سے شہلا کے پیغام کا شکریہ ادا کیا اور کہا: میں نے ابھی لڑکیوں کی شادی کے بارے میں کچھ سوچا نہیں۔ ابھی ان کی تعلیم بھی پوری نہیں ہوئی۔ میں اس بات پر تھوڑا غور کر لوں پھر بتاؤں گا آپ کو۔ وہ چلی گئیں مگر میں دُبدا میں پڑ گیا۔ اس پیغام میں شہلا کی مرضی کو بھی دخل تھا۔ وہ میں نے جاننا مناسب نہیں سمجھا۔ اس کی واقعی شادی کی عمر نہیں تھی۔ دوسرے یہ کہ لڑکیوں کے بارے میں میری ہمیشہ یہ رائے رہی تھی کہ انھیں اتنا تعلیم یافتہ ضرور ہونا چاہئے کہ آگے چل کر کوئی مشکل آپڑے تو وہ خود کفیل ہو سکیں۔ زیبو بیرولا جہاں یہ بچے بڑے ہوئے تھے وہاں گوانی عیسائیوں اور مراٹھی بولنے والوں کی اکثریت تھی۔ ان کی دوست یا تو گوانی لڑکیاں تھیں یا مراٹھی لڑکیاں۔ ان کے ذہن اور سوچ پر بھی میں نے کوئی پابندی نہیں لگائی تھی مگر یہ اتنی آزاد بھی نہیں تھیں کہ من مانی کرتی پھریں۔ اس آخری بات کا میری ذات یا میری سوچ سے بھی تعلق تھا۔ میں آج کے زمانے کا آدمی ضرور ہوں مگر بہت سی باتوں کو میں نے عقلاً تسلیم کیا ہے عملاً نہیں۔ انسان کے بارے میں مجموعی طور پر میری رائے یہ ہے کہ اس کی کوئی اخلاقی قدر ابدی یا پائیدار نہیں۔ جیسے جیسے اس کا کائنات اور اپنے گرد و پیش کا علم بڑھتا جاتا ہے اس کی سوچ میں بھی تبدیلی آتی چلی جاتی ہے۔ وہ بندر سے انسان بنا ہے، یہ نظریہ بھی اب کمزور پڑنے

لگا ہے۔ اس لئے کہ بندر کے علاوہ اس میں اور بہت سے جانوروں کے خواص ہیں۔ شیر، کتا، بھیڑیا، گیدڑ، اسے کچھ بھی کہا جا سکتا ہے۔ وہ آدم خور بھی ہے۔ اس کی ساری قدریں اس کی ضرورت سے جڑی ہوئی ہیں۔ اس کی کوئی نفسیات نہیں اور جانوروں کی طرح وہ صرف جبلّت پر بھی نہیں جیتا۔ خیر یہ تو موضوع ہی دوسرا ہو گیا۔ میں لڑکیوں کی تعلیم اور اُن کے مستقبل سے متعلق بات کر رہا تھا۔

علی گڑھ یونیورسٹی میری نظر میں ہمیشہ سے ایک قابلِ قدر ادارہ رہا ہے۔ بہت سوچنے کے بعد میں نے طے کیا دونوں لڑکیوں کو علی گڑھ بھیج دوں۔ میرے وہاں بہت دوست بھی تھے اور اساتذہ بھی۔ سلطانہ نے میری اس رائے کی تائید نہیں کی مگر میں اپنی بات پر اڑا رہا۔ دونوں کو علی گڑھ لے جا کر یونیورسٹی میں داخل کر دیا اور قمر جہاں کو کہلا بھیجا کہ شہلا اسماء تعلیم سے فارغ ہو لیں گی تو اُن کی شادی کے بارے میں سوچوں گا۔ اس بیچ فلمی قلم کار کی حیثیت سے میری اچھی خاصی مانگ ہو گئی تھی۔ بی۔ آر۔ فلمز کے علاوہ باہر کی بھی بہت سی فلمیں میرے پاس تھیں۔ اس دوران پروتما مجھ سے برابر ملتی رہی۔ وہ کوئی اگلی فلم بنانا چاہتی تھی مگر فلم کیا بناتی، اس کی مالی حالت ہی ٹھیک نہیں رہی تھی۔ ایک روز آئی اور ایک بجلی کا بل مجھے دیا۔ بہت معمولی رقم تھی۔ مجھے اس کا وہ زمانہ یاد آ گیا جب میں اس سے پہلی بار ملا تھا۔ وہ ورلی پر سمندر کے کنارے جس مکان میں رہتی تھی اس کا نام "راحت ولا" تھا۔ نیچے کی منزل میں لیلا ڈیسائی رہتی تھی۔ وہ بھی اپنے زمانے کی مشہور ہیروئن رہی تھی۔ دوسری منزل پر پروتما اور تیسری پر کشوری نام کی ایک عورت رہتی تھی۔ اس کے نقوش بڑے تیکھے اور چہرے پر بڑا اپیل تھا۔ اکثر پروتما ہی کے یہاں ملاقات ہوتی تھی۔ بعد کے زمانے میں ایک پولس انسپکٹر کے قتل کے جرم میں اسے سزا ہو گئی تھی۔ میں اُس زمانے کے پروتما کے گھر کے ماحول کو جنّت نگاہ کہہ سکتا ہوں۔ ڈیوڈ اُن دنوں ایک مشہور اداکار تھا۔ شالیمار پکچرس کی پہلی فلم "غلامی" جو میں نے لکھی تھی، اس میں بھی اس نے کام کیا تھا۔ اسی نے بمبئی میں میری ملاقات پروتما سے کرائی تھی۔ ان دنوں رات کو بھی اکثر شوٹنگ ہوا کرتی تھی اور فلم کی کہانی پر کام کرنے کا طریقہ یہ نہیں تھا کہ شوٹنگ سے پہلے لکھنے کا سارا کام مکمل ہو جائے بلکہ ساتھ ساتھ لکھتے جاتے تھے اور شوٹنگ کرتے جاتے تھے۔

میں شالیمار کے بند ہو جانے کے بعد سخت بے روزگاری کے دور سے گزر رہا تھا۔ اب پروتما کا کام ملا تھا۔ ۳۰ مئی ۴۷ء کو میری شادی ہوئی تھی اور سلطانہ بھی بمبئی آ گئی تھیں۔ مجھے خوش ہونا چاہئے تھا۔ خانہ آبادی بھی ہو گئی اور کام بھی مل گیا۔ مگر میں خوش ہونے کی جگہ ایک دھرم سنکٹ میں پڑ گیا۔ پروتما چاہتی تھی میں ہر وقت اس کے ساتھ رہوں تاکہ اس کی فلم تیزی سے بن سکے اور ازدواجی زندگی کا تقاضا تھا میں زیادہ سے زیادہ وقت سلطانہ کے ساتھ گزاروں۔ وہ ابھی دلہن ہی کہلانے کی منزل میں تھیں۔ ابھی شادی ہوئی تھی مگر میں نے رسم اور جذبات پر ضرورت کو ترجیح دی۔ اس کی فلم کی جلدی تکمیل کے

پیشِ نظر اکثر شامیں پرؔ تنہائی کے ساتھ گزرتی تھیں، کبھی کبھی راتیں بھی۔ سنگطانہ آج تک اس رویّہ کے لئے مجھے موردِ الزام ٹھہراتی ہیں۔ مگر وہ بھی کچھ غلط نہیں کہتی تھیں اور میں بھی حق بجانب تھا۔

کچھ دن بعد "ہل ویو" کا فلیٹ بند کر کے میں "بینڈ اسٹینڈ" والے گھر میں منتقل ہو گیا۔ یہ "ہل ویو" سے بڑا مکان تھا۔ اسے میں نے دو فلیٹ ملا کر ایک بنایا تھا۔ وہ ابھی زیرِ تعمیر ہی تھا۔ لڑکیاں چھٹیوں میں علی گڑھ سے آئیں تو خوش نظر آتی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا انھوں نے علی گڑھ کی زندگی کو قبول کر لیا ہے۔ ان کی عادات و اطوار میں بھی فرق آ گیا تھا۔ بمبئی کی فضا کا اثر کم ہو گیا تھا۔ بول چال بھی زیادہ صاف ہو گئی تھی۔ مختصر یہ کہ وہ زیادہ مشرقی ہو گئی تھیں۔

جب بینڈ اسٹینڈ والا فلیٹ تیار ہو گیا تو دونوں لڑکیوں نے اصرار کیا کہ میں "ہل ویو" سے اس فلیٹ میں آجاؤں۔ میں نے یہ فلیٹ اس نیت سے خریدا تھا کہ اسے کرائے پر اٹھا دوں گا اور کچھ مزید آمدنی کا سلسلہ شروع ہو جائے گا مگر ان کے اصرار پر میں "ہل ویو" چھوڑ کر یہاں آ گیا۔ یہ فلیٹ پانچویں منزل پر تھا۔ فلیٹ کے ہر کمرے سے سمندر نظر آتا تھا۔ صبح صبح سمندر کنارے کشتیاں بہت اچھی لگتی تھیں۔

دونوں لڑکیوں کو بمبئی کی للک ضرور تھی مگر علی گڑھ بھی بہت راس آیا۔ شہلاؔ کا امتحان ہوا تو وہ یونیورسٹی میں اوّل آئی۔ کنووکیشن کے موقعے پر اسے گولڈ میڈل ملے گا۔ مجھے خوشی ہوئی مگر شہلاؔ کا خط آیا گولڈ میڈل اسے نہیں، کسی اور لڑکے کو دیا جا رہا ہے جو اُس امتحان میں شامل بھی نہیں ہوا تھا جس میں شہلاؔ اوّل آئی تھی۔ معلوم ہوا علیم صاحب لڑکے کی پشت پناہی کر رہے ہیں۔ علیمؔ صاحب کٹّر کمیونسٹ مشہور تھے۔ یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی تھے اور بڑے دیانتدار مشہور تھے۔ شہلاؔ نے لکھا اُسے گولڈ میڈل نہ دیا گیا تو وہ احتجاج میں یونیورسٹی چھوڑ کر واپس آجائے گی۔ میں فوراً علی گڑھ گیا۔ آلِ احمد سرورؔ کو ساتھ لے کر علیمؔ صاحب کے پاس گیا۔ انھوں نے جواب میں جو کہا مجھے سُن کر افسوس ہوا۔

"مجھے نہیں معلوم تھا شہلاؔ آپ کی لڑکی ہے۔"

"یہ معلوم ہونے کی بات نہیں علیم صاحب! صحیح اور غلط کی بات ہے۔ دیانتداری اور بددیانتی کی بات ہے۔"

وہ چپ رہے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے اٹھتے اٹھتے کہا:

"علیم صاحب! میں وکیل کے پاس جا رہا ہوں۔ شہلاؔ کو گولڈ میڈل نہ ملا اور اُس کی جگہ کسی اور کو دیا گیا تو اپنی صفائی آپ عدالت میں دیں گے۔"

کنووکیشن ہوا تو وہ میڈل کسی کو نہیں ملا۔ پھر کسی ایک عام سے جلسے میں شہلا کو بلا کر وہ میڈل دے دیا گیا۔ جس کی کوئی اہمیت ہی نہیں معلوم ہوتی۔ جب تک یہ دونوں لڑکیاں علی گڑھ میں رہیں میرا آنا جانا لگا رہا۔ ایک بار شہلا بیمار ہو گئی تو میں فوراً گیا۔ ایک بار اسماء نے کہا وہ بی۔ اے۔ کے بعد ایک سال کا وقفہ دے گی۔

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔ معلوم ہوا انگریزی شعبہ کے صدر کی بیٹی بھی اسی کی کلاس میں ہے اور سب اساتذہ اسے فوقیت دیتے ہیں۔ اسماء کا اوّل آنا مشکل ہے۔ اسی سفر کے دوران اسماء نے مجھے ایک لڑکے سے ملوایا جو انجنئرنگ کر رہا تھا اور اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔ میں نے کہا: ایم۔ اے۔ کر لو۔ اس بیچ ہم بھی لڑکے کا گھر بار دیکھ لیں گے اور اس کے عزیزوں سے بھی مل لیں گے۔ لڑکے کے والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ وہ لکھنؤ کے محکمۂ تعلیم میں تھے۔

وقت گزرتے دیر نہیں لگتی۔ شہلا، اسماء بی۔ اے۔ کر کے علی گڑھ سے واپس آگئیں۔ اسماء کو تو اس سال علی گڑھ نہیں جانا تھا، شہلا چلی گئی۔ اسماء ایک سال گھر پر رہی تو پتہ چلا امجد سے رشتے کو شہلا بھی پسند کرتی ہے۔ میں اس شادی کے حق میں نہیں تھا۔ اس کی کئی وجوہ تھیں۔ ایک تو میرا خیال امجد کے بارے میں یہ تھا کہ وہ لڑکیوں سے صرف تفریح کرتا ہے سنجیدہ نہیں ہوتا۔ دوسرے امجد برسرِ روزگار نہیں تھا۔ تیسرے مجھے یہ اندیشہ تھا کہ اگر پورا خاندان کبھی بمبئی چھوڑ کر پشاور چلا گیا تو لڑکی سے ملنا ہی مشکل ہو جائے گا۔ اور سب سے بڑی وجہ رہن سہن اور گھر کا کلچر تھا۔ جن گھروں میں لڑکے لڑکی کا رہن سہن اور زندگی کرنے کا طریقہ ایک جیسا نہیں ہوتا وہاں بہت سی پریشانیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ کنبہ، بستی، خاندان، قبیلہ اگر ایک نہ ہو اور کوئی ثقافتی مماثلت بھی نہ ہو تو پھر چاہے کھینچ تان کر زندگی گزار دے جائیں مگر ایک اجنبیت ہمیشہ باقی رہتی ہے۔ اس خیال سے میں نے کئی لڑکے دیکھے یا کئی لڑکے تجویز ہوئے۔ ایک لندن میں تھا، ایک امریکہ میں، ایک کہیں اور۔ مگر شہلا تیار نہیں ہوتی۔ میں نے سوچا اب اس موضوع پر بات کرنا بیکار ہے۔ میں نے اسماء سے کہہ کر امجد کو بلوایا۔ میں نے پوچھا شادی کیوں کرنا چاہتے ہو؟ نہ برسرِ روزگار ہو نہ شاید تمہاری تعلیم پوری ہوئی ہے۔ نہ کوئی کاروبار یا تجارت کا سلسلہ ہے۔ ایسی صورت میں بیوی کی ذمہ داری کیسے لو گے؟ اس نے کہا: وہ ایم۔ اے۔ پاس ہے، کوئی بھی کام کر کے اپنا اور بیوی کا گزارہ کر سکتا ہے۔ اور میں مان اس لئے گیا کہ میں خود تن بہ تقدیر جیتا رہا تھا۔ اپنے مستقبل کا بھی کوئی پلان میرے پاس نہیں رہا تھا۔ نتیجہ میں شہلا کی شادی ہو گئی اور وہ اپنے گھر چلی گئی۔ اسماء واپس علی گڑھ چلی گئی اور ایم۔ اے۔ میں بہت اچھے نمبر کر پاس ہوئی۔ کچھ مدت بعد اس کی بھی شادی ہو گئی اور وہ لکھنؤ چلی گئی۔

گھر میں صرف دو بچے رہ گئے۔ دانش اور درخشندہ۔ درخشندہ علی گڑھ نہیں جانا چاہتی تھی۔ اسکول کی تعلیم ختم کر کے خود ہی سینٹ زیویر کالج میں گئی اور داخلہ لے لیا۔ جب وہ انگریزی سے بی۔ اے۔ آنرز کر چکی

تو کچھ دن ایک انگریزی اخبار میں کام کرتی رہی پھر اس کی بھی شادی ہو گئی۔ اس کا شوہر فہیم خان جسے ہم جاوید کے نام سے پکارتے ہیں، رام پور کا رہنے والا تھا اور ابوظہبی میں ہلٹن ہوٹل کا ڈائریکٹر تھا۔ رخشندہ بھی ابوظہبی چلی گئی۔ رآمش البتہ میرے لئے ایک مسئلہ بنا رہا۔ اس کا سبب میری کوتاہی تھی۔ جتنی توجہ اس کی طرف دینی چاہئے تھی میں نے نہیں دی۔ میں اس گمان میں رہا لڑکیاں ٹھیک پڑھ رہی ہیں تو یہ کیوں نہیں پڑھے گا۔ دوسرے، میری فلم کی معروفیت بہت بڑھ گئی تھی۔ رآمش بالکل نظر انداز ہو گیا۔ ایک وقت آیا جب اُسے اسکول سے نکال دیا گیا۔

وہ ہر وقت لڑائی جھگڑے اور مار پیٹ میں لگا رہتا تھا۔ گھر میں کھو کھری رکھی ہوتی تھی، رامپوری چاقو تھا۔ آدھی آدھی رات تک ہوٹلوں میں ناچ کرتا رہتا تھا۔ دن بھر لڑکیاں اس سے ملنے آتی رہتی تھیں۔ یہ سب میرے علم میں تھا مگر میں نے اسے ٹوکا نہیں۔ میرا خیال تھا اولاد کا بزدل ہونے سے دلیر ہونا بہتر ہے۔ یہی سوچ کر میں چپ رہا مگر جب اس کے اسکول کے پرنسپل نے مجھے بُلایا اور کہا اپنے لڑکے کو اس اسکول سے لے جائیے تو میں تھوڑا پریشان ہوا۔

یہ مکان "زیویر ولا" جہاں میں اُن دنوں رہتا تھا گوانی عیسائیوں کی بستی تھی۔ میرے گھر سے تھوڑے فاصلے پر ایک سڑک تھی جسے وروڈا روڈ کہتے تھے۔ وہ اب بھی ہے۔ شراب پر پابندی لگنے کے بعد وہ علاقہ ایک بہت بڑا شراب کا اڈا بن گیا۔ بہت سے گھروں میں شراب کشید ہونے لگی تھی۔ اکثر گھروں میں بچی بھی جانے لگی تھی۔ جس اسکول میں رآمش پڑھتا تھا وہاں اکثریت وروڈا روڈ کے لڑکوں کی تھی۔ ویسے بھی یہ پورا علاقہ وروڈا روڈ ہی کہلاتا تھا۔ رآمش پر اس ماحول کا اثر بھی ضروری تھا۔ آٹھویں جماعت پاس کرنے کے بعد میں رآمش کو بھوپال لے گیا۔ اس لئے کہ اس کے پرنسپل نے کہا تھا اس کا ماحول بدل دیجئے۔ بھوپال میں کچھ دوست اور کرم فرما تھے۔ جاں نثار اختر میرے دوست تھے۔ وہاں اُن کی سسرال بھی تھی۔ ان کے بڑے سالے کا نام عباس تھا۔ میں رآمش کو لے کر اُن کے پاس گیا۔ وہ میرے جانے سے بہت خوش ہوئے۔ وہ بہت سے لوگوں کو جانتے تھے۔ انھوں نے رآمش کا نویں کلاس میں داخلہ کرا دیا مگر رآمش کا وہاں بہت جی نہیں لگا لیکن ری پیٹ کر بارھویں جماعت پاس کر لی۔ اس بیچ میرا ایک قدم بھوپال اور دوسرا بمبئی میں رہا۔ بارھویں جماعت کے بعد میں رآمش کو علی گڑھ لے گیا اور وہاں داخلہ کرا دیا۔ علی گڑھ میں بھی میرے بہت کرم فرما تھے۔ خورشید الاسلام، ساجدہ زیدی اور زاہدہ زیدی۔ رآمش شروع میں کچھ دن ساجدہ زیدی کے پاس رہے پھر انھیں ہوسٹل میں جگہ مل گئی اور یہ وہاں منتقل ہو گئے۔ شہریار وہاں اردو کے شعبے میں معلّم تھے۔ میں انھیں ان کے سپرد کر کے واپس آ گیا مگر معلوم ہوا کہ رآمش کو بمبئی کے مقابلے میں علی گڑھ کچھ زیادہ اچھا نہیں لگا۔ تیسرے سال بی۔ اے۔ کا ایک پرچہ چھوڑ کر واپس آ گئے۔ میں نے سوچا انھیں بطور ایکٹر اپنی فلم کی لائن میں داخل کر لوں۔ ایک تصویر "دھند" میں تھوڑا سا کام بھی کیا مگر کچھ دوستوں کے کہنے میں آ کر بعد میں دوبئی چلے گئے۔ میری چھوٹی لڑکی

رخشندہ ابوظہبی میں تھی۔ اس کا شوہر فہیم خان ہیلتھ ہوٹل میں ڈائرکٹر تھا۔ یہ کبھی کبھی دوبئی سے ابوظہبی بھی چلے جاتے تھے مگر وہاں کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ چھ سال بعد واپس بمبئی آگئے اور فلم میں جانے کی کوشش کرنے لگے۔

صاحبِ اقتدار اور زندگی میں کامیاب ہونے والے اکثر لوگوں کا وہی رویہ ہوتا ہے جس کی طرف شیخ سعدیؒ نے اشارہ کیا ہے۔

ع بسلامے برنجند و بہ دشنام خلعت می دہند

جن لوگوں کے لئے میں فلمیں لکھا کرتا تھا انھیں مجھ سے خلوص نہیں رہا تھا۔ انھوں نے آمنش کی کوئی مدد نہیں کی۔ میری فلمی زندگی کا زوال شروع ہوگیا تھا جو کم وبیش دس برس پر پھیلا ہوا ہے۔ میں نے بینڈ اسٹینڈ والے فلیٹ کے علاوہ اور دو فلیٹ خرید لئے تھے۔ وہ دونوں بک گئے۔ موسے پر ستو ڈرتے، میری صحت کا زوال بھی شروع ہوگیا۔

صبح کی سیر میری برسوں پرانی عادت رہی تھی۔ بینڈ اسٹینڈ والے مکان میں آکر بھی صبح کو باقاعدہ سیر کرتا تھا مگر اچانک ایک روز معلوم ہوا مجھے انجائنا ہوگیا ہے۔ معائنہ کرایا تو پتہ چلا میرے دل کی کئی نالیاں بند ہوگئی ہیں۔ مزید معائنے سے پتہ چلا کہ گردے بھی کمزور ہوگئے ہیں۔ انجوگرافی کرنے کے بعد ڈاکٹر لیلا جانی، جن کے زیرِ علاج میں تھا، انھوں نے مشورہ دیا کہ امریکہ چلا جاؤں۔ ہیوسٹن (ٹیکسا) میں سینٹ لیوک ہے، وہاں آپریشن کراؤں مگر ڈینٹن کول سے نہیں، ڈاکٹر جارج اول سے۔ مگر میرے کچھ دوست جو لندن میں تھے اور بی۔ سی۔ سی۔ آئی بینک سے وابستہ تھے، وہ کوشش کر رہے تھے بینک میرا علاج کرادے۔ ان کا ایک شعبہ تھا جو ادیبوں، شاعروں کے علاج کے لئے روپیہ دیتا تھا مگر بہت دن تک لندن سے کوئی جواب نہیں آیا۔ ڈاکٹر کا اصرار تھا میں جلدی چلا جاؤں۔ ابھی تک مجھے دل کا دورہ نہیں پڑا تھا۔ امکان تھا دورہ پڑ جائے۔ اس صورت میں علاج میں الجھن اور پیچیدگی پیدا ہوجاتی۔ ایک روز امجد اور شہلا گھر آئے اور اصرار کیا میں علاج کے لئے فوراً چلا جاؤں۔ میں تیار ہوگیا۔ امجد نے اپنے ایک ڈاکٹر دوست اشوک ٹھکر کو میرے ساتھ کردیا۔

میں ہوسٹن (ٹیکساس) کے اسپتال "سینٹ لیوک" میں داخل ہوگیا اور میرا آپریشن ہوگیا۔ پانچ بائی پاس ہوئے اور ایک والو بدلا گیا۔ وہاں آپریشن کرتے وقت ڈاکٹروں کا سارا دھیان میرے گردوں پر رہا اور میرے پھیپھڑے خراب ہوگئے۔ نتیجہ یہ کہ میں ایک مہینے تک سینٹ لیوک میں پڑا رہا جبکہ اکثر مریض وہاں سے دس روز میں ٹھیک ہوکر آجاتے ہیں۔ سلطانہ میرے ساتھ گئی تھیں۔ وہاں کی نرسوں کے باوجود انھوں نے رات رات بھر جاگ کر میری دیکھ بھال کی۔ آپریشن کے بعد جب مجھے ضرورت سے زیادہ دیر تک آئی۔ یو۔ سی۔ میں رکھا گیا اور مجھے کئی روز ہوش نہیں آیا تو یہ باہر بیٹھی گھنٹوں انتظار کرتی رہتی تھیں کہ مجھے کب ہوش آتا ہے۔ ایک مہینے تک سینٹ لیوک میں رہنے کے بعد ہر ڈاکٹر خواہش مند تھا کہ میں زندہ واپس چلا جاؤں جیسے انھیں میرے زندہ واپس جانے کا یقین نہ ہو مگر میری مشکل یہ تھی کہ میں اچھی طرح چلنے پھرنے کے قابل نہیں تھا اور

چاہتا تھا کہ بالکل ٹھیک ہو کر واپس جاؤں۔ ڈاکٹر آشوک بھی عاجز آ گئے تھے۔ وہ کتنے دن میرے ساتھ رہتے۔ "نانا وتی" اسپتال کے ملازم تھے مگر امجد کی وجہ سے میرا ساتھ نہیں چھوڑ رہے تھے۔ ایک روز خیال آیا میں چلا ہی جاؤں تو اچھا ہے۔ سب کو اطمینان ہو جائے گا۔ اور میں نے روانگی کی ٹھان لی۔ ہوسٹن میں میرے دوست شام کنشن کی بیٹی کملیتش بھی کام کرتی تھی۔ اس نے میری بہت مدد کی۔ ہم ایرپورٹ آئے تو معلوم ہوا کہ ہمارے لئے جگہ ہی نہیں جہاز میں۔ کملیتش نے بھاگ دوڑ کر کے جگہ نکالی اور ہم خدا خدا کر کے لندن پہنچے۔ سات گھنٹے وہاں پڑے رہے۔ جینا دوبھر معلوم ہو رہا تھا مگر اپنا دکھ تو خود ہی بھوگنا پڑتا ہے۔ رات کا جہاز ملا اور ہم بمبئی پہنچ گئے۔ اب تک بقیدِ حیات ہوں۔ یہ غالباً ۱۹۸۷ء کی بات ہے۔

ٹھیک ہو کر میں واپس آ تو گیا مگر اس بیچ کچھ دوسرے مسائل پیدا ہو گئے۔ رآمش دوبئی سے واپس آ گیا اور کہا کہ اب واپس نہیں جائے گا۔ اس کے فوراً بعد چھوٹی لڑکی رخشندہ اپنی دونوں بچیوں سمرا، عظمیٰ کو لے کر آ گئی۔ اس کی شوہر سے کچھ اَن بَن ہو گئی تھی۔ پھر وہی صورتحال پیدا ہو گئی جو ٹرنر روڈ والا مکان چھوڑتے وقت تھی۔ نہ کام نہ کام کرنے کی ہمّت۔ ابھی اتنا بڑا آپریشن کرا کے آیا تھا۔ رآمش، رخشندہ اور اس کے بچّوں کا خرچ، پھر میں اور میری بیوی۔ امجد نے ابھی میرے آپریشن پر اتنا روپیہ خرچ کیا تھا، اس سے بھی میں اپنی مالی حالت کے بارے میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ایک روز خیال آیا کہ میرے مسائل میرے سوا کون حل کرے گا۔ میں نے طے کیا کہ بینڈ اسٹینڈ والا یہ مکان جس میں رہتا ہوں، بیچ دوں۔ جو روپیہ ملے اس سے ایک ڈیڑھ دو سونے کے کمروں کا مکان خرید لوں اور باقی روپیہ کہیں لگا دوں۔ اگر کام نہ ملے یا میں کام کے قابل نہ رہوں تو بھی زندگی آرام سے کٹتی رہے۔ رآمش، رخشندہ اور اس کے بچوں کو بھی تکلیف نہ ہو۔ اور میں نے بینڈ اسٹینڈ والے مکان کا سودا کر لیا۔ یوسف ناظم مشہور شاعر ہونے کے علاوہ میرے کرم فرما بھی ہیں۔ وہ اپنے ایک دوست جینتے جال کو لائے اور انھوں نے وہ مکان خرید لیا۔ اس روپئے سے میں نے کارٹر روڈ پر ایک مکان خریدا۔ ڈیڑھ دو سونے کے کمرے، ایک بیٹھنے کا کمرہ، باورچی خانہ اور ڈیڑھ دو غسل خانے۔ یہ مکان میرے اور سلطانہ کے لئے کافی تھا۔ "زیویرولا" بھی تک میرے پاس تھا۔ رآمش وہاں رہنے چلے گئے۔ باقی روپیہ دو تین جگہ لگایا اور بسر کرنے لگا۔

رخشندہ بڑے پکّے ارادے کی لڑکی ہے۔ کچھ کرنے کی ٹھان لے تو پیچھے نہیں ہٹتی۔ بمبئی کے سینٹ زیویر سے انگریزی میں آنرز کرنے کے بعد پہلے اخبار نویسی میں لگی رہی۔ اس کے بعد اور ایک دو کام کئے پھر اس کی شادی ہو گئی۔ شادی میں اس کی مرضی کو کتنا دخل تھا، مجھے نہیں معلوم مگر لڑکا ہم سب کو پسند تھا۔

اس خاندان سے میری نجیب آباد میں ملاقات ہوئی تھی۔ جاوید کے بڑے بھائی محی الدین خان وہاں ایک سرکاری ملازمت میں تھے۔ بمبئی میں جاوید کچھ روز میرے پاس بھی رہا۔ اسے فلم کے پیشے سے دلچسپی تھی مگر کچھ دن بعد ابوظہبی چلا گیا اور وہاں ہوٹل بلٹن

سے متعلق ہوگیا۔ کچھ مدت بعد جاوید اور رخشندہ کی شادی ہوگئی اور وہ بھی ابوظہبی چلی گئی۔ وہاں جاکر بھی وہ کام کرتی رہی۔ ایک اسکول میں انگریزی پڑھاتی رہی۔ رخشندہ کے یہاں دو اولاد ہوئیں، ثمرہ اور عظمیٰ۔ دونوں لڑکیوں کی پیدائش کے بعد رخشندہ اور جاوید میں اَن بن ہوگئی اور رخشندہ دونوں لڑکیوں کو لے کر میرے پاس بمبئی آگئی۔ دونوں لڑکیوں کو یہاں اسکول میں داخل کردیا اور خود سعودی ایرلائنز میں کام کرنے لگی۔ رخشندہ کی ایک دوست قاہرہ چلی گئی تھی۔ ڈیڑھ سال سعودی میں کام کرنے کے بعد اُس نے قاہرہ جانے کا ارادہ کیا۔ قاہرہ جاتے وقت دو دن کے لئے وہ ابوظہبی میں رکی۔ وہاں سے اُسے کچھ اپنا سامان اور کپڑے لینے تھے۔ جاوید کو معلوم ہوا رخشندہ ابوظہبی آئی ہے تو وہ ملنے گیا اور دونوں میں سمجھوتہ ہوگیا۔ رخشندہ قاہرہ سے واپس آئی تو جاوید آکر رخشندہ اور بچّوں کو واپس لے گیا۔

اس دوران پروتما سے ملاقات نہیں ہوئی۔ ایک دن اچانک اطلاع ملی اس کا انتقال ہوگیا۔ مجھے ایک بڑے نقصان کا احساس ہوا۔ اس کے ساتھ ایسا رابطہ رہا تھا جو کبھی کسی کے ساتھ نہیں رہا تھا۔ وہ بہت اچھی دوست تھی۔ اس کے گھر کا مجھے اس زمانے کا نقشہ ابھی تک یاد ہے۔ اس کے ہاں بڑی ہماہمی تھی۔ بیگم پارہ اس زمانے کی مشہور اداکارہ تھی۔ وہ اور پروتما تو ساتھ رہتی ہی تھیں، ایک پارسی لڑکی خورشید تھی۔ ایک سنگاپور کی لڑکی تھی۔ سنگاپور ایرلائنز میں کام کرتی تھی۔ چھریرا بدن، طویل قامت۔ بڑی پیاری سی۔ موہنا نام کی ایک لڑکی تھی۔ بہت دیدہ زیب تھی۔ فلموں میں کام کرتی تھی۔ بہت اچھی طبیعت کی لڑکی تھی۔ فلم کی زندگی ترک کرکے کچھ دن بعد فرانس چلی گئی تھی۔ ابھی پچھلے دنوں میں نے اس کے انتقال کی خبر پڑھی۔ جب وقت ملتا تھا شام کو سب مل کر ساتھ بیٹھتے تھے۔ گپ کرتے تھے۔

پروتما نے شانتی نکیتن میں تعلیم پائی تھی۔ اردو شاعری اور مصوّری کی بڑی دلدادہ تھی۔ مجھ سے بہت مانوس اور میری بہت قدردان تھی وہ مرگئی۔ بیگم پارہ نے ناصر خان سے شادی کرلی تھی اور اَب وہ بھی حیات نہیں۔ امجد کے انتقال پر پارہ کا فون آیا تھا:——"اختر! میں بیمار ہوں"۔ شاید پت جھڑ کا موسم شروع ہو رہا تھا۔

اس دوران مجھے دو اَور بڑے حادثوں اور سانحوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اسماء میری دوسری لڑکی اپنی پہلی زچگی کے سلسلے میں دمّام سے میرے پاس بمبئی آئی۔ اسے ایک مقامی اسپتال میں داخل کرادیا۔ بچّہ ہونے تک خیریت گزری۔ اس کے بعد معاملہ بگڑ گیا اور وہ دو مہینے تک اسپتال میں پڑی رہی اور مرتے مرتے بچی۔ واپس گئی تو بچّہ کو ساتھ نہیں لے جاسکی۔ اگلے سال آکر لے گئی۔ لڑکا ہوا تھا۔ اس کا نام ہم نے جاذب رکھا۔

۱۵ اکتوبر ۱۹۷۸ء کی بات ہے۔ امجد ایک فلم کی شوٹنگ کے سلسلے میں گوا جارہا تھا۔ راستے میں گاڑی ایک پیڑ سے ٹکرا گئی۔ شہلا ساتھ تھی۔ شہلا کو بھی چوٹیں آئیں مگر امجد بری طرح زخمی ہوا۔ چوٹوں کے علاوہ پاؤں کی ہڈّی ٹوٹ

گئی۔ اطلاع ملتے ہی میں اور سلطانہ فوراً گوا آگئے۔ شہلا کو دلاسا دیا اور امجد کی صحت یابی کا انتظار کرتے رہے۔ جب وہ قدرے بہتر ہوا تو ایک جہاز کرایے کا لے کر سب کو بمبئی لے کر آئے اور وہ ایک مہینے تک نانا وتی اسپتال میں رہا۔ اس کے بعد میں سب کو اپنے پاس لے آیا۔ جس مکان میں امجد رہتے تھے اس میں لفٹ نہیں تھی۔ مہینہ، ڈیڑھ مہینہ تک امجد، شہلا اور بچے میرے پاس رہے اور جب امجد تھوڑا چلنے پھرنے کے قابل ہوگیا اپنے گھر چلے گئے۔

ایسے موقعوں پر انسانی زندگی کے بہت سے پہلو سامنے آتے ہیں۔ ایسے کئی پروڈیوسر تھے جنھوں نے امجد کی تیمارداری اور دیکھ بھال کے بہانے گوا کے ان ہوٹلوں کو جہاں انھیں ٹھہرایا گیا تھا پکنک گاہ اور تفریح کا اڈّا بنا لیا تھا۔ بے دریغ ڈھیروں مرغ، مچھلیاں شکم میں اتاری گئیں اور شراب لنڈھی۔ میں نے ایک زمانہ ہوا ایک فلم دیکھی تھی۔ جب مردے کی چتا میں آگ دی گئی تو جنازے میں شریک ہونے والوں میں سے ایک، اس پر ہاتھ تاپ رہا تھا۔ یہ منظر میں نے اس وقت دیکھا جب امجد کا اچانک انتقال ہوا۔ جنازہ اٹھانے کے وقت ہر ایکٹر کی کوشش تھی کہ پہلے وہ جنازے کو کاندھا دے۔ اس لئے کہ چاروں طرف کیمرے لگے ہوئے تھے اور اس پس منظر کے ساتھ ہر ایکٹر تصویر کھنچوانے کا خواہش مند تھا۔ اس لئے کہ اگلے روز وہ فلم سارے ہندوستان میں دکھائی جانے والی تھی۔ اپنی ذات کی نمائش کرنا بھی انسان کی خصوصیات میں سے ایک ہے لیکن اگر آدمی کسی خود نمائی کے شعبے سے وابستہ ہے جیسے فلم کا پیشہ تو یہ جبِس اور اُبھر آتی ہے۔

مختصر یہ کہ زندگی کی افتاد اپنی جگہ اور میرا کاروبارِ حیات اپنی جگہ۔ میں بینڈ اسٹینڈ کا مکان فروخت کر دینے کے بعد کچھ دن پرانے مکان "زیبرا ولا" میں رہا۔ سامان بہت تھا۔ کتابیں کچھ شہلا کے یہاں رکھیں، کچھ "زیبرا ولا" میں اور کچھ اِدھر اُدھر۔ اس کے بعد باندرہ ہی میں کارٹر روڈ پر ایک مکان خریدا اور وہاں منتقل ہوگیا۔ "زوی درشن" اس نئے مکان کا نام ہے۔

آنند بھوشن کی کہانی ختم ہوتے ہوتے اس کا کردار نہ سفید رہا نہ سیاہ۔ میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کیا واقعی پروردگار نے دنیا اس طرح بنائی ہے کہ انسان کے اعمال کا حساب، کتاب دنیا ہی میں ہو جائے؟ ٹرنر روڈ کا گھر ملیامیٹ ہو جانے کے بعد جہاں میری مالی حالت میں اتار چڑھاؤ آیا وہاں دونوں بہنوں نے بھی سمجھوتہ کر لیا اور ان کا میرے گھر میں آنا جانا شروع ہوگیا۔ ان کے یہاں دو اولاد ہوئیں۔ دو لڑکے وکاس اور زوبی۔ امجدی بیگم بہت خوش تھیں مگر ان دونوں کی طرف رویّہ اچھا نہیں تھا۔ دونوں لڑکے بڑے ذہین اور سمجھ دار تھے۔ حساس بھی بہت تھے۔ بھاگ بھاگ کر ہمارے ہاں آتے تھے۔ میرے بچے ہی تو اُن کے رشتہ دار تھے۔ شہلا، اسماء، رخشندہ اور آمش، یہی تو اُن کے بھائی بہن یا نزدیک ترین رشتہ دار۔ مگر آنند بھوشن نے اُن کے آنے پر پابندی لگا دی۔ وہ دونوں چھپ کر آنے لگے۔ ان کے گھر کے ماحول میں بھی دو فصلا پن پیدا ہوگیا۔ ماں مصلّے پر بیٹھی نماز پڑھ رہی ہے تو باپ پوجا کر رہا ہے۔ میاں بیوی کے تعلقات میں بھی توازن نہیں رہا تھا۔ آنند

رنگین طبیعت کا آدمی تھا اور کافی خسیس بھی تھا۔ بچّوں کو پورا جیب خرچ ہی نہیں ملتا تھا اور دونوں کو ماں باپ کی پوری محبت بھی نہیں ملی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں بچوں میں دو دلا پن پیدا ہوگیا اور دونوں نے زندگی سے فرار کے راستے تلاش کرنے شروع کر دیئے۔ وکاس جذباتی ناآسودگی کے سبب منشی چیزیں کھانے لگا اور بری صحبت میں پڑ گیا۔ روی امریکہ جانے میں کامیاب ہوگیا مگر باپ کی طرف سے پورا خرچ نہ ملنے کے سبب غلط صحبت میں پھنس گیا اور وہاں اس کا قتل ہوگیا۔ وکاس نشہ کرنے کے سبب ذہنی توازن کھو بیٹھا اور اسے ایک دماغی اسپتال میں رکھنا پڑا۔ بنگلور میں "آتما شکتی" نام کا ایک کلینک ہے جسے کنیڈا کے ایک پادری چلاتے ہیں۔ جنھیں لوگ فادر ہینک کے نام سے جانتے ہیں۔ وکاس کی وجہ سے آنند بھوشن اور امجدی بیگم بھی بمبئی کا مکان بیچ کر بنگلور چلے گئے۔ وہاں کچھ دن بعد آنند کا انتقال ہوگیا۔ وہ دمہ کے مریض تھے۔ بنگلور جانے سے پہلے آنند کبھی کبھی میرے پاس آتا تھا اور دونوں لڑکوں کا ذکر کر کے ان کی صورت حال پر روتا تھا۔ "چپ رہو"۔ میں بگڑ کر کہتا تھا "جو ہوا اس کے ذمہ دار تم ہو۔"

ان ہی واقعات کے ساتھ چھوٹے بڑے کچھ اور واقعات ہیں جو بہت اہم تو نہیں مگر انسان کے اندر جھانکنے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ ایک پروڈیوسر نے کام کرانے کے بعد مجھے ایک جھوٹا چیک دے دیا۔ ان کے نام کا ذکر غیر ضروری ہے۔ جگنو کا ذکر میں اوپر کر چکا ہوں۔ ان دنوں بابو نام کا ایک آدمی اس کا دوست تھا۔ غنڈہ گردی اس کا پیشہ تھا۔ میں نے وہ چیک اسے دے دیا۔ سنا ہے اس نے پروڈیوسر کے دفتر میں جا کر کچھ توڑ پھوڑ کی اور روپیہ وصول کر لیا۔ جن دنوں میں فلمستان میں کام کر رہا تھا وہاں ایک فلم ڈائرکٹر ہیمن گپتا سے ملاقات ہوئی تھی۔ فلمستان سے الگ ہونے کے بعد انھوں نے ایک فلم "فیری" بنائی۔ اس کے مکالمے مجھ سے لکھوائے۔ کام کے دوران کچھ پیسے دئے۔ کام ختم ہونے کے بعد جو رہ گیا تھا وہ دینے میں آنا کانی کرنے لگے۔ ان کے بارے میں مشہور تھا وہ بڑے انقلابی رہے تھے۔ ایک انگریز افسر کو گولی مار دی تھی۔ ٹھیک ہے مار دی ہوگی مگر جو روپیہ ان کی طرف رہ گیا تھا وہ تو لینا ہی تھا۔ اس کے لئے انھوں نے کہا آدھا دے سکتے ہیں، ان کی مالی حالت ٹھیک نہیں۔ میں تیار ہوگیا۔ انھوں نے فوراً ہی ایک کاغذ تیار کرایا اور اس پر مجھ سے دستخط لے لئے۔ جب طے شدہ روپیہ مانگا تو بولے روپیہ نقد تو ہے نہیں، چیک لے جاؤ۔ میں چیک لے آیا۔ بینک میں گیا تو چیک واپس ہوگیا۔ میں چیک لے کر ڈائرکٹر موصوف کے پاس گیا۔ جانے کیوں انھوں نے مجھے وہی کہانی سنائی جس میں انگریز افسر کو گولی ماری تھی۔ میں نے ان سے کہا کہ میں آپ کے بیان سے بہت متاثر ہوا اور مرعوب بھی مگر آپ نے مجھ سے ایک سمجھوتہ کیا ہے۔ اصل واجب رقم کو پہلے آدھا کیا۔ پھر ایک تحریری معاہدہ کیا اور روپیہ دیتے وقت بجائے نقد کے ایک چیک دیا جو بینک نے واپس کر دیا۔ پہلے تو نہیں تھے مگر اب آپ دفعہ چار سو بیس (۴۲۰) کے مجرم ہوگئے۔

"تو اس کے لئے کیا تم مجھ پر مقدمہ کروگے؟"

"نہیں! اتنا ہی روپیہ جتنے کا چیک ہے کسی بد دیانت پولس افسر کو دوں گا۔ آپ کو ہفتہ کے دن گرفتار کراؤں گا۔ دو دن آپ حوالات میں بند رہیں گے۔ جب دو دن بعد چھوٹ کر آئیں گے میں سمجھوں گا میرا روپیہ وصول ہوگیا۔"

یہ کہہ کر میں گھر آگیا۔ شام کو بھارت بھوشن میرے پاس آئے۔ ہیمن گپتا ان کی ایک فلم کی ہدایت دے رہے تھے۔ بولے: "یہ تم کیا کر رہے ہو؟ بہت بدنامی ہوگی گپتا جی کی۔ روپیہ میں دیتا ہوں، وہ چیک مجھے دے دو۔"

جن دنوں میں بی۔ آر۔ فلمز میں کام کر رہا تھا وہاں ایک لڑکا اسسٹنٹ تھا۔ نام بتانے کی ضرورت نہیں۔ وہ اچانک ڈائریکٹر بن گیا۔ وہ میرا بہت مدّاح تھا۔ اپنی پہلی فلم لکھوانے میرے پاس آیا۔ معاوضے کی رقم اس نے بہت کم بتائی اور ضد کی کہ میں ہی اس کی فلم لکھوں۔ میں تیار ہوگیا۔ وہ فلم "مجرم" کے نام سے بنی اور بہت کامیاب ہوئی۔ جب "مجرم" بن رہی تھی میں نے اسے ایک کہانی سنائی جس کا نام میں نے "پھول اور پتھر" رکھا تھا۔ "مجرم" کی کامیابی کے بعد ان صاحب نے اپنی فلم بنانے کا پلان بنایا اور "پھول اور پتھر" کو مجھے بتائے بغیر بنانا شروع کر دیا۔ ان دنوں بی۔ آر۔ فلمز میں "قانون" بن رہی تھی۔ وہ بھی میں ہی لکھ رہا تھا۔ راجندر کمار اس فلم میں ہیرو تھے۔ مجھے اچانک پتہ چلا میری کہانی "پھول اور پتھر" چوری سے بن رہی ہے۔ راجندر کمار سے ان چور ڈائریکٹر صاحب کی رشتہ داری تھی۔ میں نے راجندر سے کہا اُسے منع کرے اور تھوڑے دن بعد "پھول اور پتھر" کا چور میرے پاس آیا اور مجھ سے معافی مانگی اور بات آئی گئی ہوگئی۔ ان صاحب کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ کہانی نگار کو اس کے کام کا معاوضہ دینا جرم سمجھتے تھے۔ اتنا سب ہونے کے بعد بھی روپے کے معاملے میں میرے ساتھ انھوں نے تنگ دلی کا مظاہرہ کیا۔ میں نے ان کا منظرنامہ اٹھا کر ان کے منھ پر مار دیا اور انھیں گھر سے رخصت کر دیا۔ فلم "پھول اور پتھر" بہت کامیاب ہوئی مگر اسکرین پر میرا نام کچھ اس طرح تھا "کہانی کا خیال اختر الایمان سے لیا گیا ہے"۔ اس کا معاوضہ بھی کچھ ملا کچھ نہیں ملا۔

یہ فلم کی صنعت بہت بڑی اور اہم ہے مگر قلم کار کی طرف فلم بنانے والوں کا رویّہ اچھا نہیں۔ ہر فلم ساز جب اس صنعت میں پہلا قدم رکھتا ہے کہانی اس کی بغل میں ہوتی ہے اور وہ اکثر و بیشتر اسی کی اپنی ہوتی ہے۔ تقدیم بھی فلم کے پیشے میں بڑے اداکاروں کو دی جاتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ نشان کا ہاتھی اداکار ہوتے ہیں مگر میری رائے میں لکھنے کا شعبہ سب سے اہم ہے۔ خیر میں اس موضوع پر کوئی تفصیل طلب بات نہیں کرنا، ایسے ہی کہہ رہا تھا۔ چونکہ میری زندگی کے کم و بیش پچاس سال اس پیشے میں گزر گئے ہیں۔ آدمی بحیثیت مجموعی بہت ناہموار بلکہ اُدھ کچرا ہے۔ ان ہی واقعات میں ایک واقعہ اورنگ آباد کے ایک شاعر کا بھی ہے۔ میں ان صاحب کو صورت سے پہچانتا تھا۔ ایک دو بار حیدرآباد میں ملے تھے۔ ایک بار وہ میرے

پاس آگئے ۔ میں ان دنوں بینڈ اسٹینڈ والے مکان میں رہتا تھا ۔ کہنے لگے وہ بے روزگار ہیں، کام چاہیئے ۔ میں ان دنوں بی ۔ آر ۔ فلمز چھوڑ چکا تھا ۔ سمجھ میں نہیں آیا ان کے لئے کیا کروں ۔ ان کو رہنے کی جگہ بھی چاہیئے تھی ۔ میرے ایک دوست ہیں گلاٹھی ۔ تیار کپڑوں کی تجارت کرتے ہیں ۔ یورپ اور امریکہ سے جینز اور اسی قسم کے کپڑے منگواتے تھے ۔ "پین ڈرکرز" کے نام سے ان کا ایک دفتر اور شوروم تھا ۔ میں اپنے صحت مند دنوں میں ہمیشہ صبح سویرے سیر کو جایا کرتا تھا ۔ گلاٹھی بھی آتے تھے ۔ میں نے ان سے ذکر کیا اور ان کی سفارش کی اور شاعر موصوف کو گلاٹھی کے یہاں کام بھی مل گیا اور رہنے کی جگہ بھی ۔ کچھ دن بعد مجھے خبر ملی شاعر موصوف رات کے وقت میٹرو سنیما کے نزدیک گرفتار ہوگئے ۔ ان کے پاس ولایتی کپڑوں کی ایک گٹھری تھی ۔ رات کو گشت کرنے والے ایک پولس افسر کو شبہ ہوا اور تفتیش کرنے پر پتہ چلا وہ کپڑے چرائے گئے تھے ۔ ان دنوں حضور احمد خان پولس کمشنر تھے ۔ وہ بخشی جارجی کے بہت اچھے دوستوں میں تھے ۔ مجھ سے بھی یاد اللہ تھی ۔ ان کے توسط سے میں شاعر موصوف سے ملا ۔ وہ حوالات میں تھے ۔ جو بُرا بھلا مجھے کہنا تھا، اُن سے کہا ۔ گلاٹھی سے اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور بخشی کو سمجھایا کہ غلطی سب سے ہوتی ہے، خیال رکھنا اس غریب کو سزا نہ ہو جائے ۔ حضور احمد خان سے بھی اس کی سفارش کی اور بہت سے متعلقہ افسروں سے ملا ۔ غرض کہ کسی طرح بھاگ دوڑ کر کے انھیں سزا سے بچایا اور وہ جیل جانے سے بچ گئے ۔ مجھے خوشی ہوئی اس لئے کہ مجھے ان میں بہتر شاعر بننے کے آثار نظر آتے تھے ۔ خیریت آئی گئی ہوئی ۔ کچھ دن بعد یہ حضرت پھر تشریف لائے ۔ ان کے ساتھ ایک لڑکی تھی ۔ تعارف کرایا اُن کی شاگرد ہے ۔ میری عادت ہے جب لوگوں سے نئی ملاقات ہوتی ہے اور تعلقات بڑھتے ہیں، میں ان سے ان کے ذاتی معاملات اور نجی زندگی کے بارے میں کچھ نہیں پوچھتا جب تک وہ خود نہ بتائیں ۔ میں نے لڑکی کے بارے میں بھی استفسار نہیں کیا مگر موصوف دو تین روز بعد پھر آگئے اور اس کے بعد کئی چکر لگائے ۔ ایک روز میں نے پوچھا تم بار بار چکر لگا رہے ہو، کچھ کام ہے تمہیں مجھ سے ۔ اور انھوں نے بڑے مجوبانہ انداز میں بتایا "وہ لڑکی حاملہ ہے"۔

"تم نے شادی کر لی اس سے؟" میں نے پوچھا۔

"غلطی ہو گئی" ۔ انھوں نے سر جھکا کر کہا ۔

"تو بچے کا انتظار کرو" ۔ میں نے کہا ۔ مگر وہ اسقاط چاہتے تھے ۔ سلطانہ کو معلوم ہوا تو بہت ناراض ہوئیں ۔

"کیا سمجھ رکھا ہے ان لوگوں نے آپ کو ۔ کیا ہے یہ گھر؟ بدمعاشوں کا اڈا ہے؟"

سلطانہ کا خفا ہونا بجا تھا مگر میرے ذہن میں لڑکی کا مستقبل تھا ۔ میں نے سمجھا بجھا کر سلطانہ کو خاموش کر دیا ۔

میری پہچان کے ایک ڈاکٹر تھے ۔ عورتوں ہی کا علاج زیادہ کرتے تھے ۔ میں نے ان سے مدد مانگی ۔ وہ آمادہ ہوگئے اور لڑکی کو مشکل سے نجات مل گئی ۔ ڈاکٹر صاحب کا نرسنگ ہوم تھا ۔ وہیں انھوں نے لڑکی کو رکھا ۔ دو روز بعد میں لڑکی کو دیکھنے گیا ۔

ڈاکٹر نے بتایا۔ شاعر موصوف لڑکی کو بے کم بغیر بل ادا کئے اسپتال چھوڑ کر چلے گئے۔ مجھے ان صاحب کی اس حرکت سے بہت افسوس ہوا اور میں سوچتا رہا کیا شاعر یا اور کسی دوسرے فن کے تخلیق کار، مصور یا قلمکار کے فن کا اس کے کردار سے کوئی تعلق ہے یا نہیں اور اس طرح کا فنکار یا شاعر جس کا ذکر میں نے اوپر کیا، اچھی تخلیق کا اہل ہے؟ مگر کوئی ٹھیک جواب ذہن نے نہیں دیا۔ اس لئے کہ ادب اور شاعری کی تاریخ میں ایسے بہت بڑے بڑے فنکار ہیں جو بحیثیت انسان خراب ہی نہیں، بہت برے تھے مگر فنکار اور تخلیق کار کی حیثیت سے ان کا بہت بڑا درجہ ہے بلکہ وہ فن ان پر ختم ہوتا ہے۔

کم و بیش ان ہی دنوں سوسائٹی کے ایک ممبر رنگ راجن کے گھر میں اُن کی آیا یعنی ملازمہ کا قتل ہو گیا۔ لڑکی کا ایک عاشق جو اس سے شادی پر بہت دن سے اصرار کر رہا تھا اور لڑکی مسلسل انکار کر رہی تھی، ایک دن رنگ راجن کے یہاں آیا اور اُس لڑکی کا گلا کاٹ دیا۔

ان ساری ذہنی اور جسمانی پریشانیوں میں میری ذہنی حالت پھر ویسی ہی ہو گئی جو ٹرنر روڈ والا مکان چھوڑتے وقت تھی یا اس سے بھی بہت پہلے ۱۹۴۰-۴۱ء میں تھی۔ میرا کالج کا زمانہ ختم ہو رہا تھا اور میں بہت ڈانواڈول تھا اور سوچتا رہتا تھا بی۔اے۔ پاس کر کے کیا کروں گا۔ جواب ذہن میں نہیں آیا تھا مگر یہ بات ضرور سوجھی تھی کہ قوت ارادی مضبوط کروں۔ مگر کس طرح؟ میرے اس کمرے سے جو دریا گنج میں تھا حضرت خواجہ نظام الدینؒ کا مزار دو تین میل دور تھا۔ قدیم دلی شہر کی حد سے باہر۔ میں نے سوچا کہ میں روزانہ اپنے گھر سے حضرت نظام الدینؒ کی درگاہ پیدل جایا کروں گا۔ کیسا ہی موسم یا صورت حال کیوں نہ ہو۔ اور میں اپنی اس نیت پر بہت دن تک قائم رہا۔ روز شام کو گھر سے نظام الدین تک جانا اور آنا۔ ایک روز خیال آیا میں روزانہ بزرگ کے مزار تک آکر پلٹ جاتا ہوں کبھی ایک بار بھی فاتحہ نہیں پڑھی۔ میں نے مزار پر جاکر فاتحہ پڑھی۔ ساتھ ہی ذہن میں کچھ اس طرح کے فقرے بھی آئے "خواجہ! آپ کے فیض سے خسرو، خسرو ہو گئے۔ میں اچھی شاعری کرنا چاہتا ہوں مگر میرا نہ کوئی استاد اور رہنما ہے نہ مجھے معلوم ہے اچھی شاعری کیا ہو سکتی ہے۔ آپ کا فیضِ روحانی کچھ مجھے بھی عطا ہو تو شاید میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤں۔" اس کے بعد میں نے دلی چھوڑ دی اور ساغر نظامی کے ساتھ کام کرنے میرٹھ چلا گیا۔ وہاں سے واپس دلی آگیا۔ کچھ دن ایک سرکاری دفتر میں کام کیا۔ پھر ریڈیو اسٹیشن پر ملازم ہو گیا۔ وہاں سے چھوڑ کر علی گڑھ یونیورسٹی میں ایم۔اے۔ کرنے چلا گیا۔ آدھا کیا اور چھوڑ کر پونا میں فلم کی زندگی سے متعلق ہو گیا۔ تقسیم ملک کے بعد بمبئی آگیا۔ پھر فلمیں لکھتے لکھتے اور مکان بدلتے بدلتے بینڈ اسٹینڈ پر آ گیا تھا۔ پھر حالات کے اتار چڑھاؤ کے سبب یہ مکان بھی فروخت کر دیا اور اب "نروی درشن" کا دھر لدھوڈ پر رہ رہا ہوں اور اتنے امراض اور ذہنی و جسمانی تکلیفیں بھوگ کر گردوں کا مریض بن گیا ہوں اور ڈائیلیسز پر جی رہا ہوں۔

دل کے آپریشن کے علاوہ اور کچھ واقعات ہیں جن کا میں نے ذکر نہیں کیا یا دانستہ نظرانداز کر دیا۔ ایک دو واقعات

ذہن سے خارج ہو گئے۔ ان ذہن سے نکل جانے والے واقعات میں میرا امریکہ، کنیڈا کا سفر بھی ہے۔ دل کے آپریشن سے پہلے کی بات ہے ایک روز مرحوم عزیز قیسی کا فون آیا۔ انھوں نے کہا کہ مجھے ان کے ساتھ امریکہ، کنیڈا کے سفر پر جانا ہے۔ عزیز قیسی کے ایک بھائی احمد، نیویارک میں رہتے تھے۔ انھوں نے وہاں ایک ایسے گردشی مشاعرے کا اہتمام کیا تھا جس میں شعرا، شہر شہر جاکر اپنا کلام سنائیں گے۔ جب سے ہندوستان، پاکستان کے لوگ امریکہ اور کنیڈا میں کام کی تلاش میں جانے لگے تھے وہاں مشاعروں کا بڑا رواج ہو گیا تھا۔ وہاں انھیں ادبی اور تہذیبی زندگی کی کمی کا احساس شدید ہونے لگا تھا۔ اور مشاعرہ آسان ترین ذریعہ ہے اپنے کلچر سے قریب آنے کا۔

پروگرام نیویارک سے شروع ہوا۔ ان مشاعروں میں امریکہ میں کام کرنے والے شعراء اور خواتین شاعرات بھی شامل ہوتی تھیں۔ نیرہ رحمٰن اور احمد فراز ان میں زیادہ قابلِ ذکر ہیں۔ نیویارک کے بعد لاس اینجلیز، سانفرانسسکو، شکاگو اور اس کے علاوہ اور ایک دو شہروں میں پڑھنے کے بعد ہم پہلے مانٹریال اور پھر ٹورانٹو لے جائے گئے۔ نیویارک میں ٹھہرنے کا بندوبست احمد نے کیا تھا۔ سانفرانسسکو میں، میں نشاد کے پاس ٹھہرا۔ احمد آباد کے رہنے والے میرے ایک دوست تھے۔ شکاگو میں حبیب احمد کے پاس رہے۔ لاس اینجلیز میں کہاں ٹھہرے بالکل یاد نہیں۔ مانٹریال میں بھی ایک غیر معروف سے آدمی کے یہاں رکے۔ مانٹریال سے ٹورانٹو ہم ٹرین سے آئے۔ بہت اچھا لگا۔ بڑا آرام دہ سفر تھا۔ ٹورانٹو کے اسٹیشن پر ایک صاحب ملے۔ طویل قامت اور بڑے خوش آئند اور خوش انداز سے۔ میرے پاس آئے اور پوچھا۔ "اختر الایمان؟"

"جی۔"

مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "بیدار بخت۔ آپ میرے پاس ٹھہریں گے۔"

میں کنیڈا میں بہت دن رہا۔ مشاعرے پڑھے۔ پورے کنیڈا کی سیر کی۔ بیدار کی بیوی انیتا اور بچوں کے ساتھ بہت اچھا وقت گزرا۔ کنیڈا سے واپس آنے کے بعد بیدار کی کوشش سے پھر کنیڈا بلایا گیا۔ اس سفر میں سلطانہ بھی میرے ساتھ تھیں۔ ہم نے بیدار ہی کے یہاں قیام کیا۔ واپسی میں نیویارک اور لندن میں ٹھہرتے ہوئے ہندوستان واپس آ گئے۔

نیر مسعود

شیشہ گھاٹ

صد موج راز رفتن خود مضطرب کند
موجے کہ بر کنار رود از میان ما
(نظیری نیشاپوری)

And with such luck and loss
I shall content myself
Till tides of turning time may toss
Such fishers on the shelf
(George Gascoigne)

(۱)

آٹھ برس تک بڑی محبت کے ساتھ مجھے اپنے یہاں رکھنے کے بعد آخر میرا منھ بولا باپ مجبور ہوا کہ میرے لیے کوئی اور ٹھکانا ڈھونڈھے۔ زیادتی اس کی نہیں تھی، میری بھی نہیں تھی۔ اسے یقین تھا، اور مجھے بھی، کہ کچھ دن اس کے ساتھ آرام سے رہنے کے بعد میرا ہکلانا ختم ہو جائے گا۔ لیکن اس کو امید نہیں تھی، نہ مجھے، کہ گھر کے باہر لوگ میرا تماشا بنالیں گے، جس طرح کسی پہ گل کا تماشا بنالیا جاتا ہے۔ بازاروں میں میری بات سب سے زیادہ دل چسپی اور توجہ سے سنی جاتی تھی، اور وہ بات ہنسی کی ہو یا نہ ہو، لوگ اس پر ہنستے ضرور تھے۔ کچھ دن میں میری یہ حالت ہو گئی کہ بازار تو بازار، گھر کے اندر بھی اگر کبھی کچھ کہنے کی کوشش کرتا تو بول میرے ہونٹوں سے اور میرے دانتوں سے اور میرے تالو سے ٹکرا ٹکرا کر واپس چلے جاتے، جیسے پانی کی لہریں کنارے کو چھو کر پلٹتی ہیں۔ آخر میری زبان میں گرہیں سی پڑ جاتیں، گردن کی رگیں پھولنے لگتیں، گلے اور سینے پر اتنا زور پڑتا کہ دم گھٹنے لگتا اور ایسا معلوم ہوتا کہ سانس اکھڑ جائے گی۔ ناچار بات ادھوری چھوڑ کر ہانپنے لگتا اور سانس ٹھہرنے کے بعد نئے سرے سے بات شروع کرتا۔ اس پر منھ بولا باپ مجھے ڈانٹتا:

"جہاں تک کہہ چکے ہو، میں نے سن لیا۔ اب آگے بڑھو۔"

وہ اگر کبھی مجھے ڈانٹتا تو اسی بات پر ڈانٹتا تھا۔ لیکن میری مجبوری یہ تھی کہ میں بیچ سے

بات شروع نہیں کر سکتا تھا۔ وہ کبھی تو صبر سے میری بات سنتا اور کبھی ہاتھ اٹھا کر کہتا:

"اچھا، بس کرو۔"

لیکن میری مجبوری یہ بھی تھی کہ میں بات ادھوری نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ بڑی بے چینی ہونے لگتی تھی۔ آخر وہ مجھے ہکلاتا چھوڑ کر چلا جاتا اور میں اکیلا بولتا رہ جاتا۔ اس وقت کوئی مجھے دیکھتا تو ظاہر ہے پاگل سمجھتا۔

مجھے بازاروں میں گھومنے پھرنے اور لوگوں میں اٹھنے بیٹھنے کا بھی شوق تھا۔ میں خود اپنی بات تو ٹھیک سے نہیں کہہ پاتا تھا لیکن یہ کمی دوسروں کی باتیں غور سے سن کر اور دل ہی دل میں انھیں دہرا کر پوری کرتا تھا۔ کبھی کبھی میری طبیعت الجھنے ضرور لگتی تھی لیکن میں وہاں خوش بھی تھا اس لیے کہ وہاں کے لوگ مجھے ناپسند نہیں کرتے تھے، اور سب سے بڑھ کر اس لیے کہ میرا منھ بولا باپ مجھے بہت چاہتا اور میری ہر ضرورت کا خیال رکھتا تھا۔

لیکن کچھ دن سے وہ پریشان پریشان نظر آ رہا تھا۔ ایک نئی بات یہ ہوئی تھی کہ وہ دیر دیر تک مجھ سے باتیں کرنے لگا تھا۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسے سوال کرتا تھا جن کے جواب میں مجھے دیر تک بولنا پڑے، اور بیچ میں ٹوکے بغیر بڑی توجہ سے میری بات سنتا رہتا تھا۔ میں تھک کر ہانپنے لگتا تب بھی وہ میری بات پوری ہونے کا انتظار کرتا اور جب میں نئے سرے سے بولنا شروع کرتا تب بھی وہ اتنی ہی توجہ سے سنتا رہتا۔ میں سوچتا تھا کہ اب وہ مجھے ڈانٹنے ہی والا ہے اور میری زبان میں گرہ پڑنے لگتی، لیکن وہ کچھ بولے بغیر میری طرف دیکھے جاتا تھا۔

تین ہی دن میں مجھ کو اپنی زبان کچھ کچھ کھلتی معلوم ہونے لگی۔ سینے پر زور پڑنا بھی کم ہو گیا، اور میں اس دن کا خواب دیکھنے لگا جب میں بھی دوسروں کی طرح آسانی اور صفائی سے بولنے لگوں گا۔ میں نے دل ہی دل میں وہ باتیں بھی جمع کرنا شروع کر دیں جو دوسروں سے کرنا چاہتا تھا۔ لیکن چوتھے دن باپ نے مجھے پاس بلا کر بٹھایا۔ دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا، پھر چپ ہو گیا۔ میں انتظار کر رہا تھا کہ اب وہ مجھ سے کوئی سوال کرے گا، لیکن اچانک اس نے کہا:

"پرسوں تمھاری نئی ماں آ رہی ہے۔"

اس نے مجھے خوش ہوتے دیکھا، کچھ پریشان ہوا، پھر آہستہ سے بولا:

"تمھیں بولتے دیکھے گی تو پاگل ہو کے مر جائے گی۔"

دوسرے دن صبح میرا سامان بندھا ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ پوچھتا، باپ نے میرا ہاتھ پکڑا اور کہا:

"چلو۔"

○

سفر میں وہ مجھ سے کچھ نہیں بولا۔ لیکن راستے میں ملنے والے ایک آدمی کے پوچھنے پر اس نے بتایا:

"اسے جہاز نے مانگ لیا ہے۔"

پھر وہ دونوں جہاز کی باتیں کرنے لگے۔ مجھے بھی جہاز یاد تھا۔ جب میں شروع شروع میں باپ کے پاس آیا تھا تو جہاز میلوں اور بازاروں میں مسخرے پن کی نقلیں کر کے روزی پیدا کرتا تھا۔ وہ اپنی پیٹھ پر چھوٹا سا گلابی رنگ کا بادبان باندھے رہتا تھا۔ شاید اسی لیے اس کا نام جہاز پڑ گیا تھا، یا شاید جہاز نام ہونے کی وجہ سے وہ پیٹھ پر بادبان باندھنے لگا ہو۔ ہوا تیز چلتی تو گلابی بادبان پھول جاتا اور جہاز کچھ ایسا معلوم ہوتا کہ اسی بادبان کے سہارے آگے بڑھ رہا ہے۔ وہ طوفان میں گھرے ہوئے جہاز کی نقل بہت اچھی اتارتا تھا۔ بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا کہ غصیلی ہوائیں، بپھری ہوئی موجیں اور تیز گھومتے ہوئے بھنور کسی جہاز کو ڈبونے پر تل گئے ہیں۔ نقال کے منھ سے ہوا کی غراہٹ، موجوں کے تھپیڑوں، بھنور کے سناٹے، بلکہ بادبانوں کے پھڑپھڑانے اور تختوں کے چرچرانے تک کی آوازیں صاف نکلتیں، اور آخر وہ ڈوب ہی جاتا۔ یہ نقل بچوں لڑکوں کو بہت پسند تھی لیکن یہ صرف اس وقت دکھائی جاتی تھی جب ہوا تیز چل رہی ہو۔ اگر ہوا رک جاتی تو یہ چھوٹے تماشائی اور بھی خوش ہوتے اور شور مچانے لگتے:

"تمباکو، تمباکو!"

جہاز کا سا تمباکو پینے والا میں نے کوئی نہیں دیکھا۔ تمباکو کی جتنی قسمیں اور تمباکو پینے کے جتنے طریقے ہو سکتے تھے شاید وہ سب اس کے استعمال میں تھے اور رکی ہوئی ہوا میں وہ منھ سے دھوئیں کے بادل چھوڑ چھوڑ کر ان سے ایسے ایسے کھیل دکھاتا تھا کہ تماشائیوں کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آتا تھا۔ کبھی کبھی وہ دھوئیں کے بہت سے مرغولے نکال کر کئی قدم پیچھے ہٹ جاتا، پھر ہاتھوں اور کلائیوں کو اس طرح گھماتا اور موڑتا تھا جیسے نرم گندھی ہوئی مٹی سے کوئی مورت بنا رہا ہو۔ اور واقعی مرغولے کسی مورت کی صورت بن کر کچھ دیر تک ہوا میں ٹکے رہتے۔ کچھ نقلیں وہ ایسی بھی کرتا تھا جن کا دیکھنا سننا لڑکوں کو سخت منع تھا۔ ان موقعوں پر وہ بازاریوں کے تنگ ہوتے ہوئے دہرے تہرے دائروں میں چھپ جاتا اور دور والوں کو صرف جھونکے کھاتے ہوئے بادبان اور تماشائیوں کے قہقہوں سے پتا چلتا کہ جہاز نقلیں کر رہا ہے۔

منھ بولے باپ کے پاس میرے آنے کے پہلے ہی سال جہاز کی آواز خراب ہو گئی تھی اور وہ بری طرح کھانسنے لگا تھا۔ نقلیں دکھانے میں وہ بہت طرح سے بولا کرتا تھا لیکن اب کچھ بولنا شروع کرتا تو کھانسی بار بار اس کا گلا بند کر دیتی اور بعض وقت اسے بھی اپنی بات پوری کرنے

میں قریب قریب اتنی ہی دیر لگتی جتنی مجھے لگتی تھی۔ اس نے نقلیں کرنا بلکہ ہماری طرف آنا بھی چھوڑ دیا، اور پہلے سال کے بعد سے میں نے اسے نہیں دیکھا تھا۔

○

ہمارے راستے میں بڑی جھیل کے کناروں کی کئی بستیاں اور گھاٹ آئے۔ ہر جگہ میرے باپ کے جاننے والے موجود تھے اور سب کو وہ یہی بتاتا تھا کہ جہاز نے مجھے مانگ لیا ہے۔ اس کا مطلب میری سمجھ میں نہیں آتا تھا مگر میں نے باپ سے کچھ پوچھا نہیں۔ میں دل ہی دل میں اس سے ناراض بھی تھا اس لیے کہ اس کے پاس نہ رہنے کے خیال سے میں بالکل خوش نہیں تھا۔ لیکن خوش میرا باپ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ کم سے کم ایسا آدمی تو وہ بالکل نہیں معلوم ہوتا تھا جو دوسرے دن نئی بیوی لانے والا ہو۔

آخر ہم ایک میلی کچیلی بستی میں پہنچے۔ یہاں کے لوگ شیشے کا کام کرتے تھے۔ تھوڑے سے گھر تھے لیکن ہر گھر میں شیشہ پگھلانے کی بھٹیاں تھیں جن کی بھدی چمنیاں چھتوں اور چھپروں سے کچھ اوپر نکلی ہوئی دھواں چھوڑ رہی تھیں۔ دیواروں پر، گلیاروں میں، بلکہ وہاں کے درختوں پر بھی کلونس کی تہیں تھیں۔ آدمیوں کے کپڑے اور آوارہ کتوں بلیوں کے بدن بھی دھویں سے کالے ہو رہے تھے۔ میرے باپ کے جاننے والے یہاں بھی موجود تھے۔ ان میں سے ایک نے ہم کو کچھ کھانے پینے کے لیے بٹھا لیا۔ مجھے وہاں کی ہر چیز سے وحشت ہو رہی تھی۔ میرے باپ نے کچھ دیر تک غور سے میرے چہرے کو دیکھا، پھر اس سفر میں پہلی بار مجھ سے بات کی:

"یہاں لوگ بوڑھے نہیں ہوتے۔"

میری سمجھ میں اس کی بات نہیں آئی۔ میں نے وہاں چلتے پھرتے لوگوں کو دیکھا۔ واقعی ان میں کوئی بوڑھا نظر نہیں آرہا تھا۔ مجھے باپ کی آواز سنائی دی:

"دھواں انھیں کھا جاتا ہے۔"

"پھر وہ یہاں کیوں رہتے ہیں؟" میں نے پوچھنا چاہا لیکن یہ سوال مجھے بے فائدہ سا محسوس ہوا اور میں باپ کی طرف دیکھنے لگا۔

"جہاز بھی شیشے کا کام جانتا ہے،" کچھ دیر کے بعد اس نے کہا، "اس کا گھر یہیں ہے۔"

میں ایک جھٹکا کھا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ میری زبان میں ایک ساتھ بہت سی گرہیں پڑ گئیں، لیکن اب میں چپ نہیں رہ سکتا تھا۔ کیا اس بستی میں، جہاں کی ہر چیز پر سیاہ وحشت برستی معلوم ہوتی ہے، مجھ کو جہاز کے سے دھواں لگتے ہوئے بازاری مسخرے کے ساتھ رہنا پڑے گا؟ یہ بات پوچھے بغیر میں نہیں رہ سکتا تھا چاہے اس میں جتنی بھی دیر لگتی۔ لیکن باپ نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے اطمینان دلانے والے انداز میں کہا:

"لیکن وہ یہاں کا رہنا کب کا چھوڑ چکا ہے۔"

مجھے واقعی کچھ اطمینان ہوا۔ اگر جہاز یہاں، اس بستی میں، نہیں رہتا ہے، میں نے خود سے کہا، تو میں اس کے ساتھ کہیں بھی رہ سکتا ہوں۔ اسی وقت میرے باپ نے کہا:

"اب وہ گھاٹ پر رہتا ہے،" اس نے ایک طرف اشارہ کیا، "شیشہ گھاٹ پر۔"

اس نام پر ایک بار پھر مجھے وحشت ہونے لگی۔ یقیناً میرے باپ کو نہیں معلوم تھا کہ میں اسی کے گھر میں کچھ لوگوں سے شیشہ گھاٹ کا ذکر سن چکا ہوں۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ بڑی جھیل کا سب سے مشہور اور سب سے اجاڑ گھاٹ ہے اور بی بی نام کی ایک ڈراؤنی عورت اس کی تنہا مالک ہے۔ وہ ایک مشہور ڈاکو، یا شاید باغی، کی محبوبہ تھی، پھر اس کی بیوی ہو گئی۔ وہ بی بی ہی سے ملنے آیا تھا کہ مخبری ہو گئی اور اسی گھاٹ پر وہ سرکاری آدمیوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ لیکن اس کے بعد کچھ ایسی الٹ پلٹ ہوئی کہ پورا شیشہ گھاٹ بی بی کے حوالے کر دیا گیا جہاں اس کی بہت بڑی ناؤ جھیل میں پڑی رہتی ہے، اور بی بی نے اسی ناؤ میں اپنے رہنے کا ٹھکانا بنالیا ہے۔ وہ کچھ کاروبار بھی کرتی ہے جس کی وجہ سے کبھی کبھی کوئی آدمی گھاٹ پر آنے دیا جاتا ہے۔ باقی کسی کو ادھر کا رخ کرنے کی اجازت نہیں۔ کسی کی ہمت بھی نہیں۔ بی بی سے سب ڈرتے ہیں۔

جہاز شیشہ گھاٹ پر کس طرح رہنے لگا؟ کیا مجھے بی بی سے ملنا ہوا کرے گا؟ وہ مجھ سے باتیں تو نہیں کرے گی؟ مجھے اس کی باتوں کا جواب ضرور دینا پڑے گا؟ وہ میرے بولنے پر غصے سے پاگل تو نہیں ہو جائے گی؟ میں ان سوالوں اور ان کے خیالی جوابوں میں ایسا کھو گیا تھا کہ مجھے شیشے والوں کی بستی سے اٹھ کر چلنے کا بھی پتا نہیں چلا۔ میں اس وقت چونکا جب میرے کان میں باپ کی آواز آئی:

"پہنچ گئے۔"

(۲)

بڑی جھیل کا شاید یہی سب سے اجاڑ حصہ تھا۔ ایک بنجر میدان کے خاتمے پر پیٹالے پانی کا پھیلاؤ شروع ہوا تھا جس کا دوسرا کنارہ نظر نہیں آتا تھا۔ ہمارے بائیں ہاتھ پر تھوڑا پانی چھوڑ کر ایک بہت بڑی ناؤ جھیل کے کچھ حصے کو چھپائے ہوئے تھی۔ اس پر شاید کبھی لکڑی کے لٹھے لادے جاتے ہوں گے۔ اب اس میں لٹھوں ہی سے کئی چھوٹی بڑی کوٹھریاں سی بنالی گئی تھیں۔ ناؤ کے سارے تختے ڈھیلے ہو گئے تھے اور ان سے ہلکی چرچراہٹ کی آواز نکل رہی تھی جیسے کوئی بہت بڑی چیز دھیرے دھیرے ٹوٹ رہی ہو۔ جھیل کے کنارے ایک لمبی سی منڈیر زمین پر لیٹی ہوئی تھی۔ آس پاس چار پانچ چبوترے تھے جن میں بڑے بڑے شگاف پڑ گئے تھے۔ ان کے قریب ایک لمبا گلا ہوا بانس تھا جس کو مٹی نے قریب قریب چھپا لیا تھا۔ اتنی کم چیزیں تھیں پھر بھی مجھے یقین ہو رہا تھا کہ

جب یہ سب کچھ ٹوٹا پھوٹا ہوا نہیں ہو گا تو اس جگہ چہل پہل رہتی ہو گی ۔ اب گھاٹ کے نام پر صرف ایک لمبا سائبان رہ گیا تھا جس کا اگلا حصہ داہنی طرف کے نشیب میں جھیل کے تھوڑے سے پانی کو ڈھانکے ہوئے تھا ۔ سائبان کے پیچھے ذرا بلندی پر ایک بے ڈول سی عمارت تھی جس میں لٹھوں اور چکنی مٹی کا استعمال کچھ اس طرح ہوا تھا جیسے بنانے والا فیصلہ نہ کر پا رہا ہو کہ اسے لکڑی سے بنائے یا مٹی سے ، اور اسی ادھیڑ بن میں عمارت بن کر تیار بھی ہو گئی ہو ۔ چھت البتہ پوری لکڑی کی تھی ۔ اس کے بیچوں بیچ والے ابھار پر لگا ہوا گلابی رنگ کا ایک چھوٹا سا بادبان ہوا سے بار بار پھول رہا تھا ۔

میرا منھ بولا باپ ضرور پہلے بھی یہاں آیا ہو گا ۔ میرا ہاتھ پکڑ کر وہ تیزی کے ساتھ سیدھا نشیب میں اترا اور سائبان کے نیچے سے شروع ہونے والے مٹی کے پانچ زینے چڑھ کر عمارت کے دروازے پر جا کھڑا ہوا ۔

جہاز سامنے ہی زمین پر بیٹھا تمباکو پی رہا تھا ۔ ہم دونوں بھی اندر جا کر زمین پر بیٹھ گئے ۔

"آگیا؟" اس نے باپ سے پوچھا اور کھانسنے لگا ۔

آٹھ برس میں وہ بہت بوڑھا ہو گیا تھا ۔ آنکھوں کی زردی اور ہونٹوں کی سیاہی اتنی بڑھ گئی تھی کہ شبہ ہوتا تھا انھیں الگ سے رنگا گیا ہے ۔ کچھ کچھ دیر بعد اس کی گردن اس طرح ہل جاتی تھی جیسے کسی بات کا اقرار کر رہا ہو ۔ اور اسی طرح گردن ہلاتے ہوئے اس نے زرد آنکھوں سے مجھے دیکھا ، پھر بولا :

"بڑا ہو گیا ۔"

"آٹھ برس بعد دیکھ رہے ہو ،" میرے باپ نے اسے بتایا ۔

ہم بہت دیر تک خاموش بیٹھے رہے ۔ مجھے شبہ ہوا کہ وہ دونوں اشاروں میں باتیں کر رہے ہیں ۔ لیکن وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھ بھی نہیں رہے تھے ۔ اچانک میرا باپ اٹھ کھڑا ہوا ۔ میں بھی اس کے ساتھ اٹھا ۔ جہاز نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور پوچھا :

"کچھ رکو گے نہیں ؟"

"کام بہت ہے ،" میرا باپ بولا ، "ابھی کچھ بھی نہیں کیا ہے ۔"

جہاز نے اقرار کے انداز میں گردن ہلائی اور میرا باپ دروازے سے باہر نکل گیا ۔ مٹی کے زینے اترتے اترتے وہ رک کر مڑا ، واپس آیا اور مجھے چمٹا کر دیر تک چپ چاپ کھڑا رہا ، پھر بولا :

"دل نہ لگے تو جہاز کو بتا دینا ، میں آکر لے جاؤں گا ۔"

جہاز کی گردن پھر اسی طرح ہلی اور میرا باپ زینوں سے نیچے اتر گیا ۔

مجھے جہاز کے کھانسنے کی آواز سنائی دی اور میں اس کی طرف مڑ گیا ۔ اس نے جلدی جلدی تمباکو کے بہت سے کش کھینچے ۔ دیر تک اپنی گھر گھراتی ہوئی سانس کو ہموار کرتا رہا ، پھر اٹھا اور میرا

ہاتھ پکڑ کر سائبان کے نیچے آ گیا۔ وہیں کھڑے کھڑے وہ جھیل پر نظریں دوڑاتا رہا۔ پھر مٹی کے زینوں کی طرف واپس ہوا، لیکن پہلے زینے پر پیر رکھتے رکھتے رک گیا۔

"نہیں"، اس نے آپ سے کہا، "سب سے پہلے بی بی۔"

جھیل کے کنارے کنارے چلتے ہوئے، ہم بڑی ناؤ کے قریب پہنچے۔ دو لمبے لٹھوں کو ملا کر کنارے سے ناؤ تک پہنچنے کا راستہ بنایا گیا تھا۔ لٹھوں پر سنبھل سنبھل کر پیر رکھتے ہوئے ہم دوسرے سرے کی چھوٹی سیڑھی تک اور سیڑھی چڑھ کر ناؤ پر پہنچے۔ سامنے کی ایک کوٹھری کے دروازے پر ترپال کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ پردے کے آگے ایک دو رنگی بلی بیٹھی اونگھ رہی تھی۔ اس نے ادھ کھلی آنکھوں سے ہم کو دیکھا۔ جہاز پردے کے قریب پہنچ کر رک گیا۔ میں اس سے کئی قدم پیچھے کھڑا ہوا تھا۔ جہاز نے پھر کھانسنا شروع کیا تھا کہ پردہ ہٹا کر بی بی سامنے آ گئی۔

اسے دیکھ کر مجھے ڈر لگا، لیکن اس سے بھی زیادہ یہ سوچ کر حیرت ہوئی کہ یہ بے ہنگم عورت کبھی کسی کی محبوبہ تھی۔ اس نے جہاز کو دیکھا، پھر مجھ کو۔

"بیٹا آ گیا؟" اس نے جہاز سے پوچھا۔

"ابھی پہنچا ہے،" جہاز نے بتایا۔

بی بی نے مجھے سر سے پیر تک کئی بار دیکھا، پھر بولی:

"دکھیا معلوم ہوتا ہے۔"

جہاز کچھ نہیں بولا۔ میں بھی کچھ نہیں بولا۔ دیر تک خاموشی رہی۔ میں نے بی بی کی طرف دیکھا اور اسی وقت اس نے پوچھا:

"پیراکی جانتے ہو؟"

"نہیں،" میں نے گردن کے اشارے سے جواب دیا۔

"پانی سے ڈرتے ہو؟"

"ڈرتا ہوں،" میں نے پھر اشارے سے اسے بتایا۔

"بہت؟"

"ہاں بہت،" میں نے بتا دیا۔

"ڈرنا چاہیے،" اس نے یوں کہا جیسے میں نے اس کے دل کی بات کہہ دی ہو۔

میں نے جھیل کے پھیلاؤ کو دیکھا۔ رکی ہوئی ہوا میں مٹیالا پانی بالکل ٹھہرا ہوا تھا اور جھیل پر کسی بنجر میدان کا شبہ ہوتا تھا۔ میں نے بی بی کی طرف دیکھا۔ وہ ابھی تک مجھے دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ جہاز کی طرف مڑ گئی جو اس کی طرف تمباکو پینے کا سامان بڑھا رہا تھا۔ دیر تک وہ دونوں تمباکو پیتے اور باتیں کرتے رہے۔ کچھ حساب کتاب قسم کی کاروباری باتیں تھیں۔ اس بیچ میں بھورے رنگ کا ایک کتا کسی طرف سے نکل کر آیا اور مجھے سونگھ کر چلا گیا۔ اونگھتی ہوئی بلی نے

کتے کو دیکھ کر دم ہلائی اور پیٹھ اونچی کرلی، پھر پردے کے پیچھے چلی گئی۔ میں تھوڑی دیر بعد بی بی کو دیکھ لیتا تھا۔ مضبوط بنی ہوئی عورت تھی اور اپنی بڑی ناؤ سے بھی کچھ بڑی معلوم ہوتی تھی، لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ بھی اپنی ناؤ کی طرح دھیرے دھیرے ٹوٹ رہی ہے۔ کم سے کم اس کے چہرے سے ایسا ہی ظاہر ہوتا تھا، اور اس کی باتوں سے بھی جو مجھے صاف سنائی نہیں دے رہی تھیں۔ باتیں کرتے کرتے رک کر ایک بار اس نے گردن اٹھائی اور زور سے آواز دی:

"پریا!"

دور کسی لڑکی کے ہنسنے کی آواز پانی پر تیرتی ہوئی ہماری طرف آئی، اور جہاز میرا ہاتھ پکڑ کر لٹھوں والے راستے کی طرف بڑھنے لگا۔ سیڑھی کے پاس پہنچ کر میں نے اپنی پشت پر بی بی کی آواز سنی:

"اسے اچھی طرح رکھنا، جہاز،" اور پھر وہی، "دکھیا معلوم ہوتا ہے۔"

یہ اس نے کچھ اس طرح کہا کہ میں خود کو واقعی دکھیا سمجھنے لگا۔

(۳)

لیکن کوئی وجہ نہیں تھی کہ میں خود کو دکھیا سمجھتا۔ بی بی کے یہاں سے آکر جہاز نے مجھ کو میرے رہنے کا ٹھکانا دکھایا تو مجھے یقین نہیں آیا کہ یہ ایک اجاڑ گھاٹ پر بنے ہوئے اسی بے ڈول مکان کا حصہ ہے جس کے سامنے مٹیالے پانی کی جھیل اور پشت پر بنجر میدان ہے۔ وہاں میرے آرام کا اچھے سے اچھا سامان موجود تھا۔ سجاوٹ بھی بہت تھی جس میں شیشے کی چیزوں سے زیادہ کام لیا گیا تھا۔ دروازوں اور روشن دانوں میں بھی شیشے استعمال ہوئے تھے۔ مجھ کو تعجب ہوا کہ جہاز کسی جگہ کو اتنے سلیقے سے سجا سکتا ہے، پھر خیال ہوا کہ اس نے اس میں کسی اور کی مدد لی ہے، یا پھر سجاوٹ کا کام باقاعدہ سیکھا ہے۔ وہاں کئی چیزیں آج ہی لائی ہوئی معلوم ہوتی تھیں لیکن مجھے شبہ ہوا کہ وہاں سے کئی چیزیں ہٹائی بھی گئی ہیں، اور یہ بھی شبہ ہوا کہ اس جگہ مجھ سے پہلے، شاید بہت پہلے، کوئی اور بھی رہتا تھا۔

اپنے ٹھکانے کو دیکھ لینے کے بعد میں سوچ رہا تھا کہ پہلے ہی دن میں نے شیشہ گھاٹ کا سب کچھ دیکھ لیا ہے۔ لیکن پریا کو میں نے دوسرے دن دیکھا۔

مجھے آج تک حیرت ہے کہ میرے منھ بولے باپ کے یہاں جو لوگ شیشہ گھاٹ کی باتیں کر رہے تھے ان میں سے کسی نے بی بی کی بیٹی کا نام بھی نہیں لیا تھا۔ میں نے پہلی بار اس کا نام شیشہ گھاٹ پہنچنے کے پہلے دن سنا تھا جب بی بی نے ناؤ پر سے اسے پکارا تھا۔ اس دن کی گھبراہٹ میں مجھے یہ سوچنے کا بھی خیال نہیں آیا تھا کہ پریا کون ہے۔ لیکن دوسرے دن صبح میں نے گھاٹ

کے سامنے جھیل پر سے ہنسی کی آواز سنی۔ پھر کسی نے کہا:

"جہاز، تمھارے بیٹے کو دیکھیں گے۔"

جہاز نے لپک کر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

"بی بی کی بیٹی،" اس نے بتایا اور مجھے سائبان کے نیچے لا کھڑا کیا۔

کوئی پچاس قدم کے فاصلے پر جھیل میں دھیرے دھیرے ہلتی ہوئی پتلی سی کشتی کے پچھلے سرے پر میں نے دیکھا کہ پریا بالکل سیدھی کھڑی ہوئی ہے۔ پھر اس نے اپنے بدن کو ہلکا سا جھکولا دیا اور کشتی سائبان کی طرف بڑھی۔ پریا کے بدن نے ایک اور جھکولا کھایا۔ کشتی اور آگے بڑھی۔ اسی طرح رکتی بڑھتی ہوئی وہ سائبان کے بہت قریب آگئی۔

"یہی ہے؟" اس نے جہاز کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ یہ لڑکی بی بی کی بیٹی ہے، جس طرح اس پر حیرت ہوئی تھی کہ بی بی کسی کی محبوبہ رہ چکی ہے۔ میں نے اسے ذرا غور سے دیکھنا چاہا لیکن اب وہ مجھے سر سے پیر تک دیکھ رہی تھی۔

"دکھیا تو نہیں معلوم ہوتا،" اس نے جہاز سے کہا، پھر مجھ سے بولی، "دکھیا تو نہیں معلوم ہوتے۔"

"میں نے کب کہا تھا کہ میں دکھیا معلوم ہوتا ہوں،" میں نے ذرا جھنجھلا کر کہنا چاہا لیکن صرف ہکلا کر رہ گیا۔ پریا ہنس پڑی اور بولی:

"جہاز، یہ تو سچ مچ...."

پھر اس نے زور زور سے ہنسنا شروع کر دیا، یہاں تک کہ ناؤ پر سے بی بی کی پاٹ دار آواز آئی:

"پریا! اسے نہ ستاؤ۔"

"کیوں؟" پریا نے پکار کر پوچھا، "دکھیا جو ہے؟"

"پریا،" جہاز نے اسے سمجھایا، "اس سے تمھارا جی بہلے گا۔"

"ہمارا جی گھبراتا ہی نہیں ہے،" اس نے کہا اور پھر ہنسنے لگی۔

میں خود کو کسی مصیبت میں پھنسا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ لیکن اسی وقت اس نے مجھ سے پوچھا:

"تم نے اپنی نئی ماں کو دیکھا ہے؟"

"نہیں دیکھا،" میں نے سر کے اشارے سے اسے بتایا۔

"دیکھنے کو جی نہیں چاہتا؟"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور دوسری طرف دیکھنے لگا۔

"نہیں چاہتا؟" اس نے پھر پوچھا۔

جواب میں میرا سر اس طرح ہلا کہ اس کا مطلب ہاں بھی ہو سکتا تھا، نہیں بھی۔ مجھے خیال آرہا تھا کہ آج نئی ماں میرے پہلے گھر میں آنے والی ہے، یا شاید آچکی ہو۔

باپ نے کہا تھا وہ مجھے بولتے دیکھ کر پاگل ہو جائے گی۔ میں خیال ہی خیال میں خود کو بولتے اور اس کو دھیرے دھیرے پاگل ہوتے دیکھنے لگا۔ میں نے سوچنے کی کوشش کی کہ ایسی عورت کے ساتھ، جو میری وجہ سے پاگل ہو گئی ہو، میرا اس گھر میں رہنا کیسا ہوتا۔ مجھے یہ بھی خیال آیا کہ کل اس وقت تک میں اس گھر میں تھا، اور یہ مجھے بہت پرانے زمانے کی بات معلوم ہوئی۔ مجھے وہاں گزارے ہوئے آٹھ سال آٹھ لمحوں کی طرح یاد آئے۔ پھر مجھے اپنا منھ بولا باپ یاد آنے لگا جو کل مجھے چپٹا کر جہاز کے پاس چھوڑ گیا تھا۔ پہلے بھی مجھ کو یقین تھا، اب اور زیادہ یقین ہو گیا، کہ وہ مجھ سے بہت محبت کرتا تھا۔

"جہاز بھی تم سے بہت محبت کرے گا۔" پریا کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

میں اسے بھول گیا تھا لیکن وہ اتنی دیر سے میری ہی طرف دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ سنبھل سنبھل کر چلتی ہوئی کشتی کے دوسرے سرے پر آئی۔ اس کا بدن آہستہ سے گھوما اور سائبان کی طرف اس کی پیٹھ ہو گئی۔ بدن کے ایک جھکولے کے ساتھ اس نے کشتی کو آگے بڑھایا اور دھیرے دھیرے، ہم سے دور ہوتی گئی۔

مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں نے کوئی تجربہ دیکھا ہے۔

"اگر بی بی نے اس کا نام لے کر نہ پکارا ہوتا" میں نے خود کو بتایا، "تو میں اسے جھیل کی روح سمجھتا۔"

وہ جھیل کی روح نہیں تو تجربہ ضرور تھی، اس لیے کہ وہ پانی کے نیچے پیدا ہوئی تھی اور اس کے پیروں نے آج تک زمین نہیں چھوئی تھی۔

○

بڑی ناؤ بی بی کو باپ دادا سے ملی تھی اور معلوم نہیں کب سے جھیل میں پڑی تھی، پریا کے جانے کے بعد جہاز نے بتایا، لیکن خود بی بی جھیل سے دور کہیں اور رہتی تھی جہاں اس کا میاں، وہی ڈاکو، یا جو کوئی بھی وہ تھا، چھپ کر اس سے ملنے آیا کرتا تھا۔ جب پریا پیدا ہونے کو ہوئی تو میاں نے ایک دائی کے ساتھ بی بی کو ناؤ پر پہنچا دیا۔ ولادت کے وقت جہاز بی بی کے درد سے چیخنے کی آوازیں سن رہا تھا۔ پھر یہ آوازیں کچھ بدل گئیں۔ سرکاری آدمی پہنچ گئے تھے اور بی بی سے اس کے میاں کا پتا پوچھ رہے تھے۔ بی بی نے کچھ نہیں بتایا تو انھوں نے اس کو جھیل میں غوطوں

پر غوطے دینا شروع کیے۔ اور ایسے ہی کسی لمبے غوطے میں پریا پیدا ہو گئی۔

"میں نے صاف دیکھا" جہاز نے بتایا، "کہ پانی کے نیچے سے بی بی کی سانسوں کے بلبلے اٹھ رہے ہیں، اور انھیں بلبلوں کے بیچ میں ایک بار پریا کا چھوٹا سا سر ابھرا اور اس کے رونے کی آواز آئی۔"

تب ان لوگوں نے سمجھا کہ بی بی بن نہیں رہی تھی۔ وہ چلے گئے، لیکن گھات میں رہے۔ اور، جیسا کہ انھیں یقین تھا، ایک دن پریا کا باپ گھاٹ پر آ گیا۔ اسی ناؤ پر اس کو گھیرا گیا۔ اس نے بچ کر نکل جانا چاہا لیکن زخمی ہو کر جھیل میں گرا اور جھیل ہی میں ڈوب گیا۔

اس دن سے بی بی نے بڑی ناؤ کو اپنا اور پریا کا ٹھکانا بنا لیا ہے۔ خود بی بی کبھی کبھی دوسری بستیوں کی طرف نکل جاتی ہے لیکن پریا کو اس نے آج تک زمین پر نہیں آنے دیا ہے۔ وہ اپنی کشتی پر جھیل میں گھومتی رہتی ہے، یا پھر بڑی ناؤ پر ماں کے پاس آ جاتی ہے۔ یہ کیوں ہو رہا ہے؟ بی بی نے کوئی قسم کھائی ہے؟ کوئی منت مانی ہے؟ کسی کو نہیں معلوم، اس لیے کوئی نہیں جانتا کہ پریا کب تک جھیل میں چکر لگاتی رہے گی، اور اس کے پیر کبھی مٹی کو چھوئیں گے یا نہیں۔

(۴)

شیشہ گھاٹ پر میں نے ایک سال گزارا، اور اس ایک سال میں جھیل پر سے سب موسموں کو گزرتے اور ہر موسم میں پریا کی کشتی کو پانی پر گھومتے دیکھا۔ اس کے سوا وہاں میرے لیے دل بہلانے کا زیادہ سامان نہیں تھا۔ میرے ٹھکانے کا باہری دروازہ بنجر میدان میں کھلتا تھا جس کے نزدیکی کناروں پر شیشے والوں کی دھواں دیتی ہوئی بستی کو چھوڑ کر صرف مچھیروں کی آبادیاں تھیں، سوکھتی ہوئی مچھلیوں کی وجہ سے میں ان آبادیوں سے دور دور رہتا تھا۔ مچھیرے ہر وقت کسی نہ کسی کام میں بھی لگے رہتے تھے، اور میرے کسی کام کے نہیں تھے، جس طرح میں ان کے کسی کام کا نہ تھا۔ میدان کے دوسرے کناروں پر بہت گھاٹ تھے، ملاحوں کی بڑی بڑی آبادیاں بھی تھیں۔ کسی کسی گھاٹ پر بہت چہل پہل رہتی تھی، لیکن ایک دو بار جب میں کسی گھاٹ پر پہنچا تو پتا چلا کہ وہاں جہاز کے منھ بولے بیٹے کی خبر پہنچ چکی ہے اور لوگ مجھے پہچاننے ہی والے ہیں، اس لیے خالی میدان میں گھومنے اور وہاں کی کچھ چیزوں کو خواہ مخواہ اپنی دلچسپی کا سامان بنا لینے کے سوا زیادہ تر میں سائبان کے نیچے بیٹھا رہتا تھا۔ بوڑھا جہاز بھی اپنے کاموں اور ادھر ادھر کی گشتوں سے فرصت پا کر تمباکو پینے کے سامان کے ساتھ وہیں آ بیٹھتا اور طرح طرح کے قصے سناتا تھا جو یاد رکھنے کے قابل تھے مگر میں انھیں بھول گیا ہوں، البتہ یہ مجھ کو اب تک یاد ہے کہ جب اس کا کوئی قصہ میرا دھیان اپنی طرف نہ کھینچ پاتا تو وہ جوش میں آ کر بلکہ کچھ وحشت زدہ ہو کر، اسے اپنے پرانے نقالوں والے انداز میں بیان کرنے کی کوشش کرتا تھا، اس میں اس پر

کھانسی کا دورہ پڑ جاتا اور اس کے قصے کی رہی سہی دل چسپی بھی ختم ہو جاتی۔

شروع شروع میں میرا خیال تھا کہ شیشہ گھاٹ دنیا سے الگ تھلگ کوئی جگہ ہے اور جھیل کا یہ حصہ ہمیشہ ویران پڑا رہتا ہو گا۔ ایسا نہیں تھا، البتہ وہاں بی بی کی اجازت کے بغیر کوئی نہیں آسکتا تھا۔ یہی میں نے باپ کے گھر پر ان لوگوں سے سنا تھا اور فرض کر لیا تھا کہ بی بی کبھی کسی کو ادھر نہیں آنے دیتی۔ لیکن جہاز کے یہاں آنے کے بعد میں نے دیکھا کہ کچھ خاص خاص دنوں میں مچھیرے اپنی کشتیاں اور جال لے کر یہاں آتے ہیں۔ کسی کسی دن تو ان کی تعداد اتنی بڑھ جاتی تھی کہ معلوم ہوتا تھا پانی پر کوئی چھوٹا سا میلا لگا ہوا ہے۔ میں اپنے ٹھکانے پر، کبھی سائبان کے نیچے، بیٹھا ہوا مچھیروں کی آوازیں سنتا تھا کہ ایک دوسرے کو پکار رہے ہیں اور کچھ ہدایتیں دے رہے ہیں۔ ان کی آوازوں کے بیچ میں کبھی کبھی پریا کے ہنسنے کی آواز بھی سنائی دیتی تھی۔ کبھی ان کی آوازوں سے معلوم ہوتا کہ وہ پریا کو کسی بات سے روک رہے ہیں۔ کبھی کسی بوڑھے مچھیرے کی آواز سنائی دیتی کہ پریا کو ڈانٹ رہا ہے اور زور زور سے ہنستا بھی جا رہا ہے۔ اس وقت ناؤ پر سے بی بی کی آواز آتی:

"پریا! انھیں کام کرنے دو۔"

جواب میں پریا کی ہنسی سنائی دیتی اور بوڑھا مچھیرا بی بی کو منع کرتا کہ پریا کو کچھ نہ کہے۔

ان دنوں میں بھی اور دوسرے دنوں میں بھی پریا سویرے سویرے گھاٹ پر ضرور آتی تھی۔ سائبان کے سامنے اپنی کشتی پر کھڑے کھڑے وہ کچھ دیر تک جہاز سے باتیں کرتی، کبھی مجھ کو بھی سائبان کے نیچے بلوا لیتی، اور اگر جہاز اٹھ کر چلا جاتا تو مجھ سے باتیں کرنے لگتی۔ کچھ بچکانی سی باتیں کرتی تھی۔ اپنے کتے بلی کے قصے زیادہ سناتی، یا یہ بتاتی تھی کہ کل بی بی نے اسے کس کس بات پر ڈانٹا تھا۔ کبھی وہ مجھ سے کوئی بات اس طرح اچانک پوچھ بیٹھتی کہ مجھ کو گردن کے اشارے کی جگہ زبان سے جواب دینے کی کوشش کرنا پڑتی۔ اس پر وہ خوب ہنستی اور بی بی کی ڈانٹ کھاتی، پھر جھیل کے دور افتادہ حصوں کی طرف نکل جاتی تھی۔ دوپہر کو بی بی اسے زور سے پکارتی اور اس کی کشتی ناؤ کی طرف بڑھتی نظر آتی۔ اس کے بعد ناؤ پر سے بار بار اس کے ہنسنے اور بی بی کے بگڑنے کی آوازیں آتیں۔ تیسرے پہر کو وہ پھر نکلتی اور گھاٹ کے سامنے ٹھہرتی۔ اگر اس وقت جہاز موجود نہ ہوتا تو وہ مجھ سے اس کی باتیں کرتی تھی۔ اسے جہاز کی ہر بات میں ہنسی کا سامان نظر آتا تھا، چاہے وہ اس کا تمبا کو پینا ہو، یا اس کا بے ڈھنگا لباس ہو، یا اس کے مکان پر لگا ہوا بادبان

ایک دن، جب وہ مجھے جہاز کا کوئی قصہ سنا رہی تھی، مجھے شبہ ہوا، پھر یقین ہو گیا کہ اسے بالکل نہیں معلوم کہ آٹھ برس پہلے تک جہاز بازاروں میں مسخراپن کیا کرتا تھا۔ اور اس دن پہلی بار میں نے ذرا اطمینان کے ساتھ بولنے اور اسے جہاز کی نقالیوں کے بارے میں بتانے کی کوشش

کی ۔ دیر تک کوشش کرتا رہا ۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا ۔ پھر بھی وہ ہنسے بغیر بڑی توجہ سے میری بات سن رہی تھی ، جس طرح آخر میں میرا باپ میری بات سننے لگا تھا ۔ اسی وقت جہاز تمبا کو پیتا ہوا سائبان کے نیچے آگیا ۔ اس نے میری مشکل آسان کی اور پریا کو بتادیا کہ میں کیا کہنا چاہ رہا ہوں ۔ پھر اس نے دو تین چھوٹی چھوٹی نقلیں کر کے دکھا بھی دیں ۔ مجھ کو وہ اس کی پرانی نقلوں کی بھونڈی نقلیں معلوم ہوئیں لیکن پریا کو اتنی ہنسی آئی کہ اس کی کشتی ڈگمگانے لگی ۔ وہ کچھ اور نقلیں دیکھنا چاہتی تھی لیکن جہاز اتنی ہی دیر میں کھانسی سے ہلکان ہو گیا تھا ۔ پریا اس کی کھانسی کے رکنے کا انتظار کر رہی تھی ، لیکن جہاز نے ہاتھ سے اسے اشارہ کیا کہ وہاں سے چلی جائے ۔ پریا نے ہنستے ہوئے اپنی کشتی موڑی اور جاتے جاتے بولی:

"جہاز ، جہاز ، تم تو بی بی کو بھی ہنسادو گے ۔"

دوسری صبح وہ روز سے کچھ پہلے سائبان کے سامنے آگئی ، لیکن اس دن جہاز کہیں نکل گیا تھا ۔ اس نے مجھ سے جہاز کی باتیں شروع کر دیں اور کل کی نقلوں کا حال اس طرح بتایا جیسے میں نے کل ، بلکہ اس سے پہلے بھی کبھی ، جہاز کو نقلیں کرتے نہ دیکھا ہو ، بلکہ مجھے یہی پتا نہ ہو کہ جہاز کبھی نقلیں بھی کرتا تھا ۔ میں سنتا رہا ، پھر اسے بتانے کی کوشش کرنے لگا کہ جہاز پیٹھ پر بادبان باندھ کر بازاروں میں گھومتا تھا اور جہازوں کے ڈوبنے کی بھی نقلیں کرتا تھا ۔ نہیں بتا سکا ، نہ زبان سے ، نہ اشاروں سے ۔ آخر چپ ہو گیا ۔

"کل" ، میں نے دل میں کہا " جیسے بھی ہو ، میں تم کو ضرور بتاؤں گا ۔"

میں نے اسے واپس جاتے دیکھا ۔

"کل" میں نے پھر دل میں کہا ، " جیسے بھی ہو ۔"

اسی شام میرا منھ بولا باپ شیشہ گھاٹ پر آیا ۔

اس ایک سال میں وہ اتنا بوڑھا ہو گیا تھا جتنا آٹھ سال میں جہاز نہیں ہوا تھا ۔ اس کی چال میں لڑکھڑاہٹ آگئی تھی اور جہاز اس کو سہارا دیے کر لا رہا تھا ۔ آتے ہی اس نے مجھ کو چمٹا لیا ۔ آخر جہاز نے اس کو مجھ سے الگ کیا ، ٹھیک سے بٹھایا ، پھر میری طرف مڑا ۔

"تمھاری نئی ماں مر گئی ، " اس نے مجھے بتایا اور کھانسنے لگا ۔

(۵)

منھ بولے باپ سے میری کوئی بات نہیں ہوئی تھی ۔ جہاز اس کے آنے کے تھوڑی ہی دیر بعد اسے لے کر کہیں چلا گیا تھا اور رات گئے اکیلا واپس آیا تھا ۔ اس وقت میں سونے کے لیے لیٹ گیا تھا ۔ جہاز بھی کچھ دیر تک تمبا کو پینے کے بعد شاید سو گیا ۔ میں سوچتا رہا کہ میرا منھ بولا باپ

اتنی جلدی بوڑھا کس طرح ہو گیا۔ پھر مجھے اپنی نئی ماں کا خیال آیا جو مجھے بولتے دیکھے بغیر مر گئی تھی اور شاید پاگل بھی نہیں ہوئی تھی۔ پھر مجھے شیشہ گھاٹ پر گزارا ہوا اپنا ایک سال یاد آنے لگا۔ میں وہاں پھیلی ہوئی اور بہت کم ٹوٹنے والی خاموشی سے کبھی کبھی اکتا جاتا تھا لیکن اب مجھے احساس ہو رہا تھا کہ وہ جگہ ہمیشہ آوازوں سے بھری رہتی تھی۔ شیشے والوں اور مچھیروں اور دوسرے گھاٹوں کی سمت سے مدھم پکاریں آتی تھیں اور جھیل پر آبی پرندے بولتے تھے۔ لیکن میں دھیان نہیں دیتا تھا۔ اس وقت بھی میں نے ذرا سا کانوں پر زور دیا تو سائبان کی طرف سے کنارے کو چھو کر پلٹتی ہوئی لہروں کی رکی رکی آوازیں آئیں اور بی بی کی ناؤ کے تختوں کی ہلکی چرچراہٹ سنائی دی۔

میں نے فیصلہ کر لیا کہ شیشہ گھاٹ کو میرے ہی رہنے کے لیے اور مجھ کو شیشہ گھاٹ ہی پر رہنے کے لیے بنایا گیا ہے۔

"کل صبح میں جہاز کو بتادوں گا،" میں نے خود سے کہا اور سو گیا۔

صبح کو میری آنکھ روز کی طرح جہاز کے کھانسنے کی آواز سے کھلی۔ پھر مجھے پریا کی آواز بھی سنائی دی۔ دونوں روز کی طرح باتیں کر رہے تھے۔ لیکن جہاز جہاں بیٹھا تھا وہاں سے پریا کی کشتی دکھائی نہیں دیتی تھی، اس لیے جہاز کو زور سے بولنا اور بار بار کھانسنا پڑ رہا تھا۔

میں اٹھ کر سائبان کے نیچے آ گیا۔ پریا سامنے ہی اپنی کشتی کے بیچ میں کھڑی تھی۔ اس نے جہاز سے ایک دو باتیں اور کیں۔ بی بی کا کچھ ذکر تھا۔ پھر وہ الٹے قدموں چلتی ہوئی کشتی کے دوسرے سرے پر پہنچ گئی۔ اس کے پیروں کی ہلکی سی جنبش سے کشتی نے دھیرے دھیرے گھوم کر آدھا چکر کھایا۔ اب پریا کی پیٹھ سائبان کی طرف تھی۔ میں نے پہلی بار بی بی کی اس بیٹی کو سر سے پیر تک غور سے دیکھا اور یہ سوچ کر پہلے سے بھی زیادہ حیران ہوا کہ بی بی کی سی عورت اس کی ماں ہے۔ اسی وقت اس کے بدن نے جھکولا کھایا اور کشتی سائبان سے دور ہونے لگی۔ پھر آہستہ سے ڈگمگائی اور رک گئی۔ پریا نے اپنے داہنے بائیں اور سامنے پھیلی ہوئی جھیل کو دیکھا۔ کشتی پھر آہستہ سے ڈگمگائی لیکن پریا نے اپنے بدن کو سادھ کر اس کا توازن درست کر لیا۔ اس کے پیروں کو پھر ہلکی سی جنبش ہوئی۔ کشتی نے ایک بار پھر بہت دھیرے دھیرے گھوم کر آدھا چکر کھایا اور میں نے سامنے سے بھی پریا کو سر سے پیر تک دیکھا۔ مجھے اندیشہ سا ہوا کہ اس کو میرا اس طرح دیکھنا برا نہ لگے، لیکن اس کی نظریں میری طرف نہیں تھیں۔ وہ گھاٹ کے ٹھہرے ہوئے پانی کو بہت غور سے، جیسے زندگی میں پہلی بار، دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ رک رک کر چلتی ہوئی کشتی کے سائبان کی طرف والے سرے پر آ گئی۔ تھوڑا جھک کر اس نے ایک بار پھر پانی کو غور سے دیکھا، سیدھی کھڑی ہوئی، اپنے پورے بدن کو سادھا اور بہت اطمینان سے جھیل کی سطح پر پیر رکھ دیا۔

جیسے کوئی سوکھی زمین پر قدم رکھتا ہے۔ پھر اس کے دوسرے پیر نے کشتی کو چھوڑا۔ اس نے ایک قدم آگے بڑھایا، پھر دوسرا قدم۔

"پانی پر چل رہی ہے!" میں نے کچھ حیرت اور کچھ خوف کے ساتھ خود کو بتایا، ذرا دور پر تمبا کو پیتے ہوئے جہاز کی طرف گردن موڑی، پھر جھیل کی طرف دیکھا۔ پریا کی خالی کشتی اور سائبان کے درمیان صرف پانی تھا جس پر موٹی لہروں کے دہرے تہرے دائرے پھیل رہے تھے۔ چند لمحوں کے بعد ان دائروں کے بیچ سے پریا کا سر ابھرا۔ اس نے پانی پر کئی بار ہتھیلیاں ماریں جیسے جھیل کی سطح کو پکڑنا چاہ رہی ہو۔ پانی کی آواز کے ساتھ بہت سے چھینٹے اڑے اور مجھے جہاز کی آواز سنائی دی:

"پریا، پانی کا کھیل نہ کرو۔"

پھر اس کے گلے میں دھوئیں کا پھندا پڑا اور وہ کھانستے کھانستے دہرا ہو گیا۔ دم بھر کے لیے میری نگاہ اس کی طرف مڑی۔ اس پر دورہ سا پڑا ہوا تھا اور وہ کسی کی مدد کا محتاج معلوم ہو رہا تھا۔ میں نے پھر جھیل کی طرف دیکھا۔ مجھے سپاٹ پانی پر لہروں کے نئے دائرے پھیلتے دکھائی دیے۔ وہ پھر ابھری، اور پھر نیچے بیٹھنے لگی۔ میری نظر اس کی آنکھوں پر پڑی اور میں ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"جہاز!" میں نے زور سے پکارا، پھر میری زبان میں گرہیں پڑ گئیں۔

میں جہاز کی طرف لپکا۔ اس کی کھانسی رک گئی تھی لیکن سانس گھر گھرا رہی تھی۔ وہ ایک ہاتھ سے اپنا سینہ اور دوسرے سے آنکھیں مل رہا تھا۔ میں نے زینے چڑھ کر اس کے دونوں ہاتھ پکڑے اور اسے زور سے ہلایا۔

"...پریا..." میرے منھ سے نکلا۔

اپنی زرد آنکھوں سے کچھ دیر تک وہ میری آنکھوں میں دیکھتا رہا، پھر اس کی آنکھوں میں بجلی سی کوندی اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میرے ہاتھوں سے کوئی شکاری پرندہ چھوٹ گیا ہے۔ سائبان میں اترنے والے کچے زینوں پر دھول اڑ رہی تھی اور جہاز پانی کے کنارے تھا۔

پریا کی کشتی اب پورا چکر کاٹ چکی تھی۔ جہاز نے کشتی کو دیکھا، پھر پانی کو۔ پھر اس نے کسی اجنبی سی بولی میں پوری طاقت سے ایک آواز لگائی۔ میں نے سنا کہ ناؤ پر سے بی بی نے بھی اتنی ہی طاقت سے اس آواز کو دہرایا۔ پھر دور دور تک کئی طرف سے یہی آواز آئی۔ مجھے پھر بی بی کی آواز سنائی دی۔

"دکھیا؟"

"پریا!" جہاز نے اتنے زور سے کہا کہ اس کے سامنے جھیل کا پانی ہل گیا۔ دور اور قریب کی آوازوں نے جہاز کی آواز کو بار بار دہرایا اور مجھے جال گھسیٹتے ہوئے اور

خالی ہاتھ مچھیرے کئی طرف سے گھاٹ کی جانب دوڑتے دکھائی دیے۔ سائبان تک پہنچنے سے پہلے پہلے ان میں سے کئی پانی میں اتر گئے۔ جہاز انھیں اشارے سے کچھ بتارہا تھا کہ بائیں طرف سے پانی کے اچھلنے کی آواز آئی۔ میں نے دیکھا کہ بڑی ناؤ پر کتا بھونکتا ہوا ادھر سے ادھر دوڑ رہا ہے اور دور ننگی بلی پیٹھ اونچی کیے ایک کوٹھری کی چھت پر تنے اسے دیکھ رہی ہے۔ پھر میں نے دیکھا کہ بی بی، قریب قریب ننگی، کسی خارش زدہ آدم خور مچھلی کی طرح پانی کو کاٹتی چلی آرہی ہے۔ اس کا بدن پریا کی کشتی سے ٹکرایا اور کشتی اپنی جگہ پر پھرکی کی طرح گھوم گئی۔ بی بی غوطہ لگا کر کشتی کے دوسری طرف ابھری۔ اس نے جلدی جلدی مچھیروں کو کئی اشارے کیے اور پھر غوطہ لگایا۔

دوسرے گھاٹوں سے ملاحوں کی کشتیاں شیشہ گھاٹ کی طرف دوڑتی دکھائی دیں۔ کئی ملاح راستے ہی میں کود کر اپنی کشتیوں کے آگے آگے پیر رہے تھے۔

اب پریا کی کشتی سے سائبان تک اور سائبان سے کشتی تک پانی میں سر ہی سر تھے۔ جھیل کے کنارے کنارے بھی مجمع بڑھ رہا تھا۔ ہر چیز ہل رہی تھی اور ہر طرف ایک شور تھا۔ ہر ایک کچھ نہ کچھ کہہ رہا تھا لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کون کیا کہہ رہا ہے۔ پانی کی اچھالوں کا شور سب سے زیادہ تھا جس میں وقت کے گزرنے کا کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔ آخر ایک آواز نے بہت زور سے کچھ کہا۔ شور تیز ہو کر اچانک تھم گیا اور پانی میں اترے ہوئے سارے بدن بے آواز پیرتے ہوئے آہستہ آہستہ ایک جگہ جمع ہونے لگے۔ سب بالکل خاموش تھے، صرف ناؤ پر سے کتے کے بھونکنے کی آواز آرہی تھی۔ اور اس وقت مجھے محسوس ہوا کہ میرا ایک ہاتھ کسی شکنجے میں جکڑا ہوا ہے۔ جہاز میرے پاس کھڑا تھا۔

"چلو" اس نے میرا ہاتھ ہلا کر کہا۔

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ مجھے کدھر چلنے کو کہہ رہا ہے۔ مگر اب وہ مجھ کو مکان کے اندر لیے جارہا تھا۔ میں نے پیچھے گھوم کر جھیل کی طرف دیکھنا چاہا لیکن جہاز نے میرے ہاتھ کو ہلکا سا جھٹکا دیا اور میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔

"چلو" اس نے پھر کہا۔

ہم مکان کی پشت والے دروازے پر آئے۔ جہاز نے دروازہ کھولا۔ سامنے بنجر میدان تھا۔

"وہ مل گئی ہے،" اس نے مجھے بتایا، پھر میدان کے بائیں کنارے کی طرف اشارہ کیا اور جلدی جلدی کہنے لگا: "تھوڑی دیر میں شیشے والوں کے یہاں پہنچ جاؤ گے۔ وہاں سے سواری مل جائے گی۔ نہ ملے تو کسی کو بھی میرا نام بتا دینا۔"

اس نے رومال میں بندھی ہوئی کچھ رقم میری جیب میں ڈال دی۔ میں اس سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا اور ابھی وہاں سے جانا نہیں چاہتا تھا لیکن اس نے کہا:

"اسے صرف تم نے ڈوبتے دیکھا ہے۔ سب تم ہی سے ایک ایک بات پوچھیں گے، بی بی سب سے زیادہ۔ بتا پاؤ گے؟"

میری نگاہوں میں وہ منظر آگیا کہ سارے لوگ، کانوں میں بالے پہنے ہوئے مچھیرے، اور ہاتھوں میں کڑے ڈالے ہوئے ملاح، اور گھاٹ گھاٹ کے سیلانی، میرے گرد دہرے ہترے دائرے بنائے ہوئے ہیں، اور ہر طرف سے سوال ہو رہے ہیں، اور بی بی میری طرف دیکھ رہی ہے پھر سب چپ ہو جاتے ہیں، اور بی بی آگے بڑھ کر میرے قریب آجاتی ہے۔

جہاز نے میرے کپکپاتے ہوئے بدن کو دیکھا اور بولا:

"مجھے کچھ بتادو..... کچھ بھی.... وہ پانی میں گر گئی تھی؟"

"... نہیں... "، میں نے کسی طرح کہا۔

"پھر؟" جہاز نے پوچھا، "خود جھیل میں کود گئی تھی؟"

"نہیں،" میں نے کہا اور سر سے اشارہ بھی کیا۔

جہاز نے مجھے جھنجھوڑ کر کہا:

"کچھ بتاؤ، جلدی۔"

مجھے معلوم تھا کہ میں زبان سے کچھ نہ بتا پاؤں گا، اس لیے میں نے ہاتھوں کے اشارے سے اسے بتانے کی کوشش کی کہ وہ پانی پر چلنا چاہ رہی تھی۔ لیکن میرے ہاتھ بار بار رک جاتے تھے۔ مجھے محسوس ہوا کہ میرے اشارے بھی ہکلانے لگے ہیں اور ان کا کوئی مطلب نہیں نکل رہا ہے۔ لیکن جہاز نے گھٹی گھٹی آواز میں پوچھا:

"پانی پر چل رہی تھی؟"

"ہاں" میں نے پھر ذرا مشکل سے کہا۔

"اسی میں ڈوب گئی؟"

"ہاں"

"پانی پر.... بی بی کی طرف جا رہی تھی؟"

"نہیں۔"

"پھر؟" اس نے پوچھا، "ہماری طرف آرہی تھی؟"

"ہاں"، میں نے گردن کے اشارے سے بتادیا۔

جہاز نے گردن جھکالی اور میرے دیکھتے دیکھتے کچھ اور بوڑھا ہو گیا۔

"جس دن اس کا چھوٹا سا سر پانی سے ابھرا تھا،" دیر کے بعد اس نے کہا، "اس دن سے میں ہر روز اسے دیکھتا تھا،" اس کو کھانسی آتے آتے رکی، "مجھے یہ بھی پتا نہیں کہ اب وہ کتنی بڑی معلوم ہوتی تھی۔"

میں چپ چاپ کھڑا اس کو بوڑھا ہوتے دیکھتا رہا۔

"بس، بھاؤ،" اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولا، "میں انھیں کچھ بتا دوں گا۔ تم کسی سے کچھ نہ کہنا۔"

میں کسی سے کیا کہوں گا، میں نے سوچا اور میرا دھیان جو اتنی دیر میں گھاٹ کی طرف سے ہٹ گیا تھا، پھر ادھر چلا گیا۔ لیکن جہاز نے بہت آہستہ سے مجھے گھما کر میدان کی طرف بڑھا دیا۔

میدان میں پہنچ کر میں اس کی طرف مڑا، اور وہ بولا:

"تمھارا باپ کل ہی تمھیں لیے جا رہا تھا۔ میں نے کہا تھا کچھ دن بعد...."

پھر اسے ہلکی سی کھانسی آئی۔ اس نے دروازے کے دونوں پٹ پکڑ لیے اور دھیرے دھیرے پیچھے ہٹنے لگا۔

دروازہ بند ہونے سے پہلے ہی میں نے واپسی کا سفر شروع کر دیا، لیکن پندرہ قدم چلا ہوں گا کہ اس نے مجھے پکارا۔ میں نے گھوم کر اسے دیکھا کہ کچھ رک رک کر میری طرف بڑھ رہا ہے۔ اس وقت وہ طوفان میں گھرے ہوئے کسی ایسے جہاز کی نقل اتار تا معلوم ہو رہا تھا جس کے بادبان ہوائیں اڑا لے گئی ہوں۔ پاس آکر اس نے مجھے چپٹا لیا۔ دیر تک چپٹائے رہا۔ پھر مجھے چھوڑ کر پیچھے ہٹ گیا۔

"جہاز!" گھاٹ کی جانب سے بی بی کی دہاڑ سنائی دی۔

بوڑھے مسخرے کی زرد آنکھوں نے آخری بار مجھے دیکھا، اس کی گردن اقرار کے انداز میں ہلی اور میں مڑ کر آگے بڑھ گیا۔

○ ○ ○

"چودھری محمد علی" کا بقیہ:۔

وہ صاحب طرز ادیب اور افسانہ نگار بھی تھے۔ افسانوں کے دو مجموعوں کے علاوہ ان کے نام کو زندہ رکھنے والی متعدد کتابیں بھی ہیں۔ مثلاً اتالیق بیوی، صلاح کار، حیات کرامت حسین، میرا مذہب اور کشکول محمد علی شاہ فقیر وغیرہ۔ آرٹ کی پرکھ پر ایک مختصر سا کتابچہ "نقادی کے نکتے" کے نام سے اور دوسرا فیملی پلاننگ پر "پردے کی بات" کے نام سے لکھا تھا، اگرچہ اس وقت فیملی پلاننگ کا کسی کو خیال بھی نہ آیا تھا۔ "گویا دبستان کھل گیا" کے نام سے ان کے خطوط کا ایک مجموعہ ان کی بیٹی، ہما بیگم نے، ان کی زندگی ہی میں لاہور (پاکستان) سے شائع کیا تھا۔ اب ان کی کتابوں کے نام سے بھی بہت کم لوگ واقف ہیں۔

("اب جن کے دیکھنے کو...." مصنفہ: انیس قدوائی)

اقبال مجید

سڑی ہوئی مٹھائی

وید ھایک پرتاپ شکلا کے جنم دن پر ڈھیروں مٹھائی آئی پڑی تھی۔ چلتے وقت دو ڈبے کاجو کی برفی اس نے یہ سوچ کر شوکت جہاں کے ساتھ کر دی کہ پچھلے دو گھنٹے سے دونوں میں خاصی تکرار ہوئی تھی اور ماحول میں خاصہ تناؤ آگیا تھا۔

پرتاپ کسی سے باتوں میں الجھا ہوا تھا کہ یکایک شوکت جہاں سے پلٹ کر مخاطب ہو گیا۔

"سنو! ایک جیپ تم کو دلوائے دیتے ہیں۔

"جیپ لے کر کیا کروں گی پٹرول کہاں سے آئے گا۔"

"پرچار پرسار کا کام کرو نا۔ پارٹی دے گی پٹرول" وہ بولا۔

"میں نہیں بیٹھوں گی جیپ میں۔" شوکت نے ٹکا سا جواب دیا۔ جواب سن کر پرتاپ جلدی سے دوسرے آدمی سے مخاطب ہو گیا۔ پانچ منٹ بعد اس آدمی کو نمٹا کر اور اپنے سکریٹری کو یہ ہدایت کر کے کہ اب آنے والے ملاقاتیوں کو پیچھے کے تین الگ الگ کمروں میں بٹھلایئے اور جہاں وہ بیٹھا ہے وہاں کسی کو نہ بھیجیے وہ اطمینان سے شوکت کے قریب آکر بیٹھ گیا۔ دھیرے سے بولا۔

"جو میں کہوں اسے دھیان سے سمجھنے کی کوشش کرنا۔ کبھی نہرو اور کبھی آزاد کے ناموں کی رٹ مت لگانا۔"

"جیپ مجھے نہیں چاہیے۔" شوکت غالباً بات تک پہنچ گئی تھی کہ شاید پہلے بھی دونوں کے درمیان یہ معاملے کس شکل میں اٹھے۔

"تمھیں جیپ، ہم نہیں دے رہے، پرتاپ دھیرے سے بولا۔ "چلو جیپ، ہم اپنے پاس رکھ لیں گے۔ تم ہماری امبیسڈر چلاؤ۔

"آپ کی پرسنل گاڑی پر میں چلوں گی؟"

"اچھا۔۔۔۔ سوچتی ہو لوگ کیا کہیں گے۔"

"ظاہر ہے۔" شوکت نے تیور بدلے۔

"تو پھر راج نیتی چھوڑ دو اور لوگ جو کہیں وہ کرو۔ یہاں تو تم کو ہو سکتا ہے، ہمارے ساتھ صرف دو برتھ والے کوپے میں دکشن کے آخری چھور تک سفر کرنا پڑے۔ دو راتیں اور ایک دن کوپے کے اندر، ہمارے ساتھ، بند رہنا پڑے۔"

"مگر ایکا ایک گاڑی کس لیے۔؟" شوکت نے ٹٹولا۔

"تم مسلمان ہو۔۔۔۔"

"تو۔۔۔۔؟"

"سندر ہو۔ مطلب اس لیے نہیں سندر ہو کے جوان ہو، سندر تا سے مطلب رنگ روپ اور چھل بل سے ہے مطلب شریر کے سارے کٹاؤ دھار دار ہیں۔"

"اچھا۔۔۔۔"

اور تمھیں پسند بھی ہے آرام اور عیش کی زندگی۔ مطلب لوگ تمھیں دیکھیں اور من ہی من ایرشا کریں۔ہائے کیا شان ہے شوکت جہاں کی۔۔۔۔"

"ہاں۔ مگر کس قیمت۔۔۔۔"

"ٹھہرو۔۔۔۔" پرتاپ نے بات کاٹی۔ "ایک دم سے چھلانگ مت لگاؤ۔ تمھاری مصیبت یہ ہے کہ تم کو فوراً نہرو اور آزاد یاد آجاتے ہیں۔ اور رفیع احمد قدوائی جی کی بنیان کے چھید دکھائی دینے لگتے ہیں تم کو۔ تم یہ بھول جاتی ہو کہ ان کی اور ہماری لڑائی الگ الگ ہے، انھوں نے لڑائی لڑی تھی آزادی کے لیے اور ہم لڑائی لڑ رہے ہیں ستا میں بنے رہنے کے لیے۔ ان کی لڑائی میں جس ایمان داری کی ضرورت تھی وہ انھوں نے کھوج لی تھی۔ اور ہماری لڑائی میں جتنی بے ایمانی کی ضرورت ہے اسے ہمیں پکڑے رہنا ہے چھوڑنا نہیں ہے۔ پھر ایک آنکھ دباکر بولا۔ "تم سے سمجھ دار تو وہ مسلمان جرنلسٹ ہیں جو منتریوں کو یہ پڑھا کر کہ کچھ بھی ہو جائے مسلمان کانگریس نہیں چھوڑیں گے۔ اپنے فرضی اخباروں کے لیے ایڈورٹائزمنٹ لے لیتے ہیں۔ ایل پی جی کے کنکشن مار لاتے ہیں اور تو اور ایک دو تو پرائم منسٹر کے کیبن میں بیٹھ کر ودیش گھوم آتے ہیں۔

شوکت جذباتی ہو کر بولی۔ "میری آنکھوں کا پانی نہیں مرا ہے ابھی۔۔۔۔"

"تو مارو۔۔۔۔" پرتاپ فوراً بولا۔ "مگر جلدی مارو۔ وہ دن گئے جب مسولی میں قدوائی جی کو دفن کرنے نہرو جی ان کے چھپر کے نیچے کھڑے تھے اور ان کی کالی شیروانی کے کندھوں پر قدوائی جی کے چھپر کے پھونس کے تنکے بکھر گئے تھے۔ کسی نے ان تنکوں کو کندھے سے جھاڑنا چاہا تو نہرو جی نے اس کا ہاتھ روک لیا۔ اور بھیگی ہوئی آنکھوں سے بولے تھے۔ "رفیع بھائی آپ اتنے مہان تھے میں نہیں جانتا تھا"

"مجھے کیا کام کرنا ہوگا۔" شوکت نے دو ٹوک لہجے میں سوال کیا۔

"یہ جو اردو اردو کا گلا پھاڑ پھاڑ کر شور مچایا جا رہا ہے نا۔ جاؤ مسلمانوں میں جاؤ دھیرے دھیرے انھیں بتاؤ کہ کام کی بات کریں۔۔۔۔"

"کیا شور مچایا جا رہا ہے۔؟ مجھے تو کہیں دکھائی نہیں دیتا۔" شوکت جل کر بولی۔ "میں نے تو نہیں سنا کہ اردو کو لے کر کوئی ایک بھی موت ہوئی ہو، کوئی کرفیو لگا ہو، جیلیں بھری گئی ہوں۔"

"خیر ایسا کرنے والوں سے تو سرکار نپٹ ہی لیتی ہے۔ علی گڈھ کی ڈھپلی بجانے والوں سے بھی نپٹ لے گی۔"

آپ اردو کی بات کر رہے تھے۔ علی گڈھ کہاں پہنچ گئے۔"

"ایک ہی بات ہے۔"

"آپ کے کہنے سے حیات اللہ انصاری، برج موہن کھینی اور ڈاکٹر ذاکر حسین نے کسی کا سر نہیں پھوڑا تھا۔ یوپی سے ہی اردو کے لیے ۱۲لاکھ دستخط حاصل کیے تھے تو بھی کیا ہوا ۔۔۔۔"

"پھر وہی ۔۔۔۔" پرتاپ چڑھ گیا ۔۔۔۔ "میں نے بھی نہیں سنا کہ ذاکر صاحب نے راشٹرپتی بننے کے بعد کبھی سرکار سے اتنا ہی کہا ہو کہ فلاں فلاں آرٹیکل کے آدھار پر میں راشٹرپتی کے روپ میں سن تشٹ ہوں کہ اردو فلاں علاقے میں دوسری سرکاری زبان ہونا چاہیے ۔۔۔۔"

"مجھے نہیں پتہ ۔۔۔ مگر اب کیا ہونا چاہیے ؟"

"اب وہی ہونا چاہیے،" پرتاپ مسکرا کر بولا ۔۔۔۔ "جو ہمیں ستا میں بنائے رکھنے کے لیے ضروری ہو تاکہ میں منتری بن سکوں اور تم ۔۔۔۔" یکایک پرتاپ نے بریک لگایا، سوچنے لگا کہ یہ بات صاف لفظوں میں شوکت جہاں کو بتائے یا نہیں کہ پارٹی میں اصولوں کے کارن کوئی تبدیلی یا خفگی نہیں ہوا کرتی بلکہ اپنے اپنے فائدوں کو حاصل کرنے کے لیے پارٹی کے اندر ہی گروپ بنا کر ستا میں اپنی جگہ مضبوط کیے رکھنے کے لیے دوسرے گروپ کو دھول چٹائی جاتی ہے۔ اس لیے اردو ہمیں کتنا فائدہ پہنچا سکتی ہے پہلے یہ دیکھنا ہوگا نہ کہ یہ کہ ہم اردو کو کتنا فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔

"تو آپ کو منتری بننے کے لیے اردو اور علی گڈھ کو گالی دینا ضروری ہے۔"

"میرے لیے نہیں۔" پرتاپ بھڑک اٹھا۔ "تمہارے لیے ضروری ہے۔ مین اسٹریم میں شامل ہونے کے لیے۔ یہ باتیں ہندو تمہارے منھ سے سننا چاہتا ہے لیکن تم سمجھنا چاہو تب نا۔"

"یہ ہندو کا سیکولرازم تو نہیں ہے۔" شوکت نے ٹھنڈی سانس لی۔

"سیکولرازم کسی گھرانے کی جاگیر نہیں ہے۔"

شوکت کو یہ سن کر اچھا نہیں لگا۔ پرتاپ نے سمجھ لیا تھا کہ شوکت کو فی الحال جو اچھا نہیں لگا تھا بات وہیں پر ختم نہیں ہونا ہے کیوں کہ شوکت کو تو آگے بھی بہت کچھ اچھا نہیں لگنا ہے اور وقت شوکت کے اچھا لگنے یا نہ لگنے کے مطابق خود کو چلانے کا کام بہت عرصہ پہلے ہی چھوڑ چکا تھا۔ کمرے میں اس وقت ہر طرف مٹھائی کے ڈبے پھولوں کے بکے اور ہار وغیرہ بے ترتیب پڑے تھے پرتاپ نے ایک موٹا سا ہار اٹھایا اور گود میں سمیٹ کر سہلانے لگا۔

"میں نے تم سے یہ شکایت نہیں کی کہ میرے جنم دن پر تم ہار پھول لے کر کیوں نہیں آئیں لیکن میں تم سے یہ شکایت ضرور کروں گا کہ تم اپنے نیتا کی بات نہیں مانتیں جب تم سے کہا

جارہا ہے کہ مسلمانوں میں جاکر تم کو پرچار پرسار کا یہ کام کرنا ہے کہ انھیں اردو اور علی گڈھ سے اب اوپر اٹھنا چاہیے تو تم ویسا کرو۔ پر تم بحث کرنے بیٹھ جاتی ہو پھر منھ پھلا لیتی ہو۔"

"میں سمجھی تھی کہ آپ سچے کانگریسی ہیں دوسری طرح سوچتے ہوں گے۔"

"ہماری پریشانی کو تم نہیں دیکھتیں۔ بس جب تب سر پر کھڑے ہوکر دوستوں، عزیزوں اور محلے والوں کے کاموں کی سفارشیں ضرور کرائے جاتی ہو۔"

"آپ کی کیا پریشانی ہے۔؟ آپ ودیدھائک ہیں۔" شوکت چڑھ کر بولی۔

"بھئی ہم کس بل بوتے ودیدھائک ہیں؟ کاریہ کرتاؤں کے بل بوتے ہی نا؟ تو تم کچھ کام تو کرو۔"

"مسلمان اردو بولے گا تو آپ کا سنگھاسن ڈول جائے گا کیا۔؟"

"تمھیں پتہ ہے دھیرے دھیرے کیا ہورہا ہے۔ پاکستان تو بن گیا یہ کہہ کر کہ مسلمانوں کو ایک وطن چاہیے اپنا وطن۔ اب ہندو نے کہلنا شروع کردیا ہے۔ دھیرے دھیرے ڈنڈا کر رہا ہے، ہمارے اور، ہم کیا، ہمارے بڑے نیتا بھی نہیں سمجھ پا رہے اس لیے کہ ہندوستان سب کا ہے۔ اوپر سے تم جیسے سمجھ دار مسلمان بھی معاملے کو نہیں سمجھ پا رہے وہ بھی انگلی کرنے سے نہیں روک رہے خود کو۔ ہماری تو چھیچھا لیدر کررکھی ہے سب نے مل کر۔"

شوکت نے اپنا پرس کھول کر اس میں سے ایک بروشر نکالا جو اتر پردیش کی اردو اکادمی نے مولانا آزاد کے سلسلے میں کبھی چھاپا تھا۔ اسے پرتاپ کو دکھاتے ہوئے بولی۔

"۱۹۴۰ میں رام گڈھ میں ہونے والی انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس میں مولانا آزاد نے جو خطبہ پڑھا تھا اس کا ایک پیرا سنانے لائی تھی آپ کو۔۔۔۔"

پرتاپ شکلا نے شوکت کو دو پل گھور کر دیکھا پھر کچھ برا سا منھ بناکر بولے پڑھو۔ شوکت نے پڑھنا شروع کیا۔

"ہماری گیارہ صدیوں کی مشترک تاریخ نے ہندوستانی زندگی کے تمام گوشوں کو اپنے تعمیری سامانوں سے بھردیا ہے۔"

"تعمیر کے سامانوں سے کیا مطلب۔" پرتاپ نے ٹوکا۔

"مطلب سرجن آتمک سامگری۔"

"اچھا اچھا، پڑھو۔" شوکت نے پھر پڑھنا شروع کیا۔

"ہماری زبانیں، ہماری شاعری، ہمارا ادب، ہماری معاشرت، ہمارا ذوق، ہمارا لباس ہمارے رسم ورواج، ہماری روزانہ زندگی کی بے شمار حقیقتیں کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں ہے جس پر اس مشترک زندگی کی چھاپ نہ لگ گئی ہو۔ ہماری بولیاں الگ الگ تھیں مگر ہم ایک ہی زبان بولنے لگے۔ ہمارے رسم و رواج ایک دوسرے سے بیگانہ تھے مگر انھوں نے مل جل کر ایک نیا

سانچہ پیدا کر لیا، ہمارا پرانا لباس تاریخ کی پرانی تصویروں میں دیکھا جا سکتا ہے مگر اب وہ ہمارے جسموں پر نہیں مل سکتا۔ یہ تمام مشترک سرمایہ، ہماری متحدہ قومیت کی ایک دولت ہے اور ہم اسے چھوڑ کر اس زمانے کی طرف لوٹنا نہیں چاہتے جب ہماری یہ ملی جلی زندگی شروع نہیں ہوئی تھی۔ ہم ایک ہندوستانی قوم اور ناقابل تقسیم ہندوستانی قوم بن چکے ہیں ۔۔۔۔ ہمیں قدرت کے اس فیصلے پر رضامند ہو جانا چاہیے۔"

شوکت نے آخری سطر ختم کر کے پرتاپ کی طرف دیکھا۔ پرتاپ صوفے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔

"یہ سب مجھے کیوں سنا رہی ہو جاؤ اور ان مسلمانوں کو سناؤ جو پاکستان کے کرکٹ کا میچ جیتنے پر مٹھائیاں بانٹتے ہیں۔ کہو ان سے کہ ان کی قسمت ہم سے علاحدہ رہ کر نہیں بنے گی۔ ان سے کہو کہ سن چالیس سے لے کر یہ وقت آگیا ہے وہ قدرت کے فیصلے پر کب راضی ہوں گے۔ وہ ایک کے بجائے دو بنے رہنے کی ضد اور کب تک کرتے رہیں گے۔"

"مجھے تو بتایا گیا تھا کہ کانگریس ان ایکتا میں ایکتا کو مانتی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" پرتاپ چڑھ کر بولا۔ "تو کانگریسی نہیں ہوں میں۔ گھس آیا ہوں کانگریس میں۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب پہلے آر ایس ایس میں رہا ہوں گا۔ ان لوگوں نے گھسیڑ دیا مجھے کانگریس میں۔ تم بھی سب سے یہی کہو۔ نہرو آزاد اور جانے کون کون سب اپنی اپنی قبروں میں سو رہے ہیں۔ قبر کی مٹی گیلی ہے تو کیا ہوا ہیں تو ہزاروں من مٹی کے نیچے۔ ہم سے کیا بات کریں گے وہ۔ نیو پولیٹکل کامپلیکیشنس ہمیں جھیلنا پڑ رہے ہیں انھیں نہیں۔ وہ سب تو تمھیں اسکرو ڈرائیور ڈیما کریسی پکڑا کر کھسک لیے اور ان سالے مسلمانوں کے لیے کیا کہوں۔ وہ مثل ہے کہ بدن پہ نہیں لتہ اور پان کھائیں البتہ۔ مسلمانوں کو روٹی تو مل نہیں رہی اردو بولنے کی عیاشی میں مرے جا رہے ہیں۔ ارے بھائی پہلے چو تڑ ڈھکنے کا پربندھ کر لو تب اردو بولو، بولتے ہوئے اچھی بھی لگے گی۔"

"آپ سیدھے سیدھے بات کیوں نہیں کرتے۔ گالیاں کیوں بکتے ہیں اتنی۔"

پرتاپ ہنس پڑا۔ اور کچھ جھینپ بھی گیا۔ بولا۔

"ہاں مہلاؤں کا خیال رکھنا چاہیے۔ معافی دو بابا" دونوں کچھ دیر چپ رہے۔ اس خاموشی میں شوکت جانے کے لیے اٹھ پڑی۔

"تمھارا سوتیلا بھائی قدرت اللہ داڑھی رکھتا ہے نماز پڑھتا ہے اور ہندو سامپردائک پارٹی کا اخبار لکھتا ہے۔ روٹی کھاتا ہے ان کی جو مسلمانوں کو پائیں تو کچا چبا جائیں تم اس سے کچھ نہیں کہتیں، ہم چھوٹے موٹے کانگریسیوں پر انھیں سنگھی سمجھ کر شک کرتی ہو اور پارٹی میں بھی

بنی رہنا چاہتی ہو۔ چلو ٹھیک ہے بنی رہو۔ جس دن ہمارا انتر تجھ میں آجائے بتادینا۔" یہ کہہ کر اس نے مٹھائی کے دو ڈبے اٹھا کر شوکت کے ہاتھوں میں تھما دیے۔

" جارہی ہوں۔" شوکت دھیرے سے بولی۔ اور باہر کے دروازے کی طرف چل پڑی۔

" جہاں بھی جاؤ۔ دھیان رکھنا کہ تمھارے آس پاس کے لوگوں کے بھی آنکھیں ہیں۔ اور سوچنا پہنچانے کے لیے ایک زبان بھی۔" یہ کہہ کر پرتاپ غڑاپ سے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ شوکت خالی کمرے میں دو پل کھڑی ادھر دیکھتی رہی جدھر وہ پرتاپ غروب ہوا تھا۔ تب تک دوسرے کمرے سے پرتاپ کی اونچی آواز میں بھڑبھڑ کر کے فون پر کسی سے باتیں ہونا شروع ہو چکی تھیں۔ شوکت جہاں کو لگا کہ اس نے پیٹی کوٹ کا ازار بند بہت کھینچ کر باندھا ہوا ہے جس نے کمر کی کھال کو تکلیف دہ حد تک جکڑ رکھا ہے وہ کمرے سے ملحق باتھ روم کے اندر گھسی اور دروازہ بند کر لیا۔ دو پل بعد جب وہ باہر نکلی تو کسی حد تک بدلی ہوئی شوکت جہاں تھی اور سوچ میں تھی کہ مسلم گھرانے کی چوڑیاں بھری گوری کلائیوں سے کھنکتی ہوئی تسلیم اور آداب کرنے والی عورت کو بغل میں لے کر گھومنا اور اپنے فارم ہاؤسوں میں اکیلے لے جانا کیا ہندو ویدھانکوں کا Status symbol تو نہیں بنتا جارہا ہے۔ پتہ نہیں کیوں شوکت جہاں نے ایک دم سے اونچی آواز میں تقریباً گلا پھاڑ کر پرتاپ کو آواز لگائی۔ پرتاپ اس غیر متوقع پکار پر گھبرایا ہوا دوسرے کمرے سے نکل کر سامنے آیا تو شوکت جہاں بولی۔

" اگر میں یہ پارٹی چھوڑ دوں تو ـــــ؟" دو پل سناٹے میں کھڑا پرتاپ اسے ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا پھر بولا۔

" تمھاری مرضی۔ کسی پارٹی میں بھی جاؤ استعمال عیش و آرام کے لیے ہی کی جاؤ گی کیوں کہ شہید ہونے کے زمانے تو لد چکے ہیں۔ آگے تم جانو۔"

شوکت جہاں کمرے سے باہر نکل گئی۔ کاٹن کی کف دار فالسئی رنگ کی ساڑی شخصیت کو جاذب (elegant) بنانے والا سر پر جوڑا اور بڑی بڑی جگر مگر کرتی آنکھوں پر دھوپ کا چشمہ گورا رنگ لمبے قد اور پرکشش چال شاید دل میں پہلی بار عورت ذات کو کوستے ہوئے جو بھی پہلا رکشہ اسے نظر آیا ہاتھ کے اشارے سے روکا اور بیٹھ گئی۔

بڑے نالے کے پل پر اس کا رکشہ پہنچا ہی تھا کہ اسے لگا کہ مٹھائی کے ڈبوں کے اندر سے بو آرہی ہے۔ جیسے مٹھائی سڑ گئی ہو۔ شوکت جہاں نے ـــــ یہ تصدیق بھی نہ کی کہ بد بو نالے کی تھی یا مٹھائی کی۔ اس نے دونوں ڈبے رکشے پر چلتے چلتے ہوا میں اچھالے اور نالے کے حوالے کر دیے۔

(زیر تحریر ناول کا ایک باب)

معین الدّین جینا بڑے

برسو رام دھڑاکے سے

پچھلے دنوں ہندوستان میں میرے مختصر سے قیام کے دوران، اچانک ٹھنڈّی رام سے ملاقات ہو گئی۔ برسوں بعد غیر متوقع طور پر جب وہ مجھے ملا تو میں اُس سے لپٹ گیا۔ اُس نے بھی مجھے بھینچ لیا۔ بڑی دیر تک ہم ایک دوسرے سے گُتھے رہے۔ ویسے اگر آپ اُس وقت ہم دونوں کو دیکھتے تو یہی کہتے کہ یہ بھرت مِلاپ چند لمحوں کا تھا اور آپ کی بات کچھ غلط بھی نہ ہوتی کیونکہ گھڑی کی سوئیوں کے حساب سے تو ہم چند سیکنڈ ہی آپس میں لپٹے رہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہم دونوں اُس وقت ایک دوسرے سے ملنے کی خوشی میں کچھ ایسے پاگل ہو گئے تھے کہ وقت کو ناپنے والے اس آلے کی ٹِک ٹِک ہمارے لئے بے معنی ہو گئی تھی۔

جب ہم الگ ہوئے تو ذرا فاصلے سے ہم نے ایک دوسرے کو نظر بھر کر دیکھا۔ اب اس عمر میں دیکھنے جیسا کیا رہ گیا تھا۔ پھر بھی، میرے بالوں کی سفیدی اُس کے بالوں سے جھانک رہی تھی اور اُس کی آنکھوں کی نمی میری آنکھوں میں تیر رہی تھی۔ میں نے پہلی بار جانا کہ وقت واقعی بڑا سفّاک ہوتا ہے اور پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔

ہم ایک دوسرے کی سُننے اور اپنی سُنانے کے لئے اندر ہی اندر چھٹپٹا رہے تھے لیکن پہل دونوں میں سے کوئی نہیں کر پا رہا تھا۔ دراصل ہوا یہ تھا کہ ہمارا رُواں رُواں بول رہا تھا اور لفظ گونگے ہو گئے تھے —— اور جب لفظ گونگے ہو جاتے ہیں تو ہر چیز کو زبان مل جاتی ہے —— مسکراہٹ کو بھی ...... میری مسکراہٹ کے جواب میں ٹھنڈّی نے گردن ہلائی اور کہا:

"ہم لوگ تو سچ مچ ہی بوڑھے ہو گئے، رام کا نام لے کے۔"

مجھے شرارت سوجھی۔ یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے کہ ٹھنڈّی مل جائے اور میں اُس کے چُٹکی نہ لوں، چاہے وہ پچاس پچپن برس بعد ہی کیوں نہ ملا ہو۔ میں نے کہا۔ "اپنے ساتھ مجھے کیوں بڈّھا کہہ رہا ہے۔ بڑھئو! اور تو کوئی آج بوڑھا تھوڑے ہی ہوا ہے، تو تو پیدائشی بوڑھا ہے۔"

"تو میں پیدائشی بوڑھا ہوں، رام کا نام لے کے، اور تو ......؟"

"اور میں سدا کا جوان ہوں، رام کا نام لے کے!"

میرے اس طرح رام کا نام لینے سے وہ بڑا محظوظ ہوا۔ قہقہہ مار کر ہنسنے لگا اور مجھ سے لپٹ گیا۔ میں نے بھی اُسے بھینچ لیا۔
اب ہم دونوں مل کر ہنس رہے تھے اور راستہ چلتی بھیڑ میں سے کچھ راہ گیر ہماری طرف دیکھ کر مسکرا رہے تھے ..... رام کا نام لے کے!
"رام کا نام لے کے" بچپن ہی سے ٹھنڈی کا تکیۂ کلام رہا ہے۔ کبھی اُس کا جملہ اس فقرے سے شروع ہوتا تو کبھی اس پر ختم اور بعض اوقات جملے کے بیچ ہی میں کہیں جب وہ اٹکنے لگتا تو رام کا نام لے کے اُسے پورا کر دیتا تھا۔ اُس کی یہ عادت پورے گاؤں کے لئے مستقل تفریح کا باعث تھی۔ ہم اُسے رام کا نام لے لے کر چڑاتے تھے اور چھیڑ کا مزہ اُس وقت دوبالا ہو جاتا جب وہ ہمیں رام ہی کا نام لے کر صلواتیں سناتا۔ اس پر ہم اُسے بڑے سخت لہجے میں ٹوکتے کہ اَبے! رام جی کا نام لے کر گالیاں بکتا ہے۔ اور اس کا جواب اس سے نہ بن پڑتا۔ وہ جھلّاجاتا اور اپنی خفّت مٹانے کے لئے اور اونچی آواز میں اپنے تکیۂ کلام کے سہارے ہمیں بے نقط سنانے لگتا۔

بعض اوقات چھیڑ چھیڑ میں ہاتھا پائی کی نوبت آجاتی اور کبھی کبھار بات اس سے بھی آگے بڑھ جاتی۔ جیسے اُس شام ہوا تھا جب ٹھنڈی نے رام کا نام لے کر ایک نوکدار پتھر اٹھایا تھا اور نشانہ باندھ کر مجھے لہولہان کر دیا تھا ـــــــ وہ برسات کے دن تھے، شام کا وقت تھا، خوب گھنے بادل چھائے ہوئے تھے لیکن برس نہیں رہے تھے اور ہم سب کورس میں رام جی کی دُہائی دے رہے تھے ـــ

برسو رام دھڑاکے سے   بُڑھیا مر گئی فاقے سے

مجھے یہ سوال بار بار پریشان کرتا تھا کہ ہم دُہائی تو بُڑھیا کے مرنے کی دیتے ہیں لیکن کہا یہی جاتا ہے کہ رام جی کی دُہائی دے رہے ہیں۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ پتہ نہیں کیوں مجھے ایسا لگا کہ اس سوال کا جواب ٹھنڈی کے پاس ہوگا۔ اپنے ساتھیوں سے ذرا الگ ہو کر میں نے ٹھنڈی کو اپنے پاس بلایا تھا اور واقعی بڑی سنجیدگی کے ساتھ اس کے سامنے اپنا سوال رکھا تھا۔ یہ تو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ٹھنڈی چڑ جائے گا۔ میرا سوال سنتے ہی اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔ اُس وقت میں ٹھنڈی کو چھیڑنے کے موڈ میں ہرگز نہیں تھا لیکن اب ٹھنڈی اکڑ چکا تھا:

"دُہائی چاہے جس کی دیتے ہوں، تم رام کا نام نہ لیا کرو۔"

"کیوں نہ لیں؟"

ٹھنڈی کے پاس کوئی معقول وجہ نہیں تھی، ہو بھی نہیں سکتی تھی لیکن چپ رہنے میں بڑی سُبکی ہوتی اس لئے اُس نے جو منھ میں آیا سو کہہ دیا ـــــ "تو مسلمٹا جو ہے۔"

"مسلمان ہیں تو کیا رام جی کا نام نہ لیں؟"

"ہاں تو لیں!"

"اور تو جو محرم کی دسویں کے روز نشان کے ساتھ سب سے آگے آگے چلتا ہے؟"

"وہ تو ہم اپنے باپو کے ساتھ چلتے ہیں۔"

"چلتے تو ہو؟"

"ہم کوئی آج سے تھوڑے ہی چل رہے ہیں۔"

"ہم بھی کوئی آج سے تھوڑے ہی رام کا نام لے رہے ہیں۔"

"جو بھی ہو تم رام کا نام نہ لیا کرو۔"

"کیوں؟"

"کہہ جو دیا!"

"یہ کیوں نہیں کہتا کہ تجھے مرچیں لگتی ہیں، رام کا نام لے کے۔"

میرا ارادہ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں، اُس وقت ٹھنڈی سے لڑنے جھگڑنے کا ہرگز نہیں تھا لیکن میں خود کو روک نہیں سکا اور میں نے بھی وہی کہہ دیا جو منھ میں آیا۔ اگر یہ آخری جملہ میرے منھ سے نہ نکلتا تو وہ نوک دار پتھر وہیں سامنے زمین پر پڑا رہتا اور میری دائیں آنکھ کے اوپر بھوں کے بالوں سے جھانکتا ہوا زخم کا جو نشان آپ اس وقت دیکھ رہے ہیں، وہ نہ ہوتا ——— ٹھنڈی کی نظریں اُسی نشان پر جمی ہوئی تھیں۔ اُس نے مجرم کی سی کانپتی آواز میں کہا "میں سمجھا تھا ان برسوں میں، رام کا نام لے کے، یہ دھندلا گیا ہوگا۔" میں نے ٹھنڈی کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا۔ وہاں اب بھی نمی تیر رہی تھی اور اُس نمی کے پیچھے بہت دور تک اُداسیاں بھی ہوئی تھیں۔ میں نے نشان پر انگلی پھیرتے ہوئے کہا:

"ٹھنڈی! تیرا دیا ہوا یہ نشان اب میری پہچان بن گیا ہے۔ میرے پاسپورٹ اور تمام سرکاری کاغذات میں اس کی وہی اہمیت اور حیثیت ہے جو میرے نام اور ولدیت کی ہے۔ اس کے بغیر نہ میں، میں ہوں نہ میری تصویر میری۔ سرکاری کاغذات سے قطعِ نظر اب تو خود میں بھی اس کے بغیر اپنے ہونے کا تصور نہیں کر سکتا۔ شاید میرے ہونے میں کہیں کچھ کمی رہ گئی تھی جسے اس نشان نے پورا کر دیا ہے۔"

ٹھنڈی نے بجھی بجھی سی آواز میں بہت دھیرے سے کہا "اپنے نشان کو تو سنبھال کے رکھے ہو بھیا! پر کبھی ہمارے نشان کی بھی فکر کی ہوتی، رام کا نام لے کے۔"

میں ٹھنڈی سے کیا کہتا، اُسے کیسے سمجھاتا کہ جب زمین داروں اور جاگیرداروں کی اولاد کو گاؤں کی زمین بے دخل

گزرتی ہے تو اُن پر کیا گزرتی ہے، انھیں کیا کیا سہنا پڑتا ہے اور وہ اُن باتوں اور ایسے طعنوں کو سہنے کے لئے کہاں سے جگر لاتے ہیں!

ٹھنڈی مجھے اپنے ساتھ گھر لے گیا۔ بڑا شاندار فلیٹ تھا اُس کا۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ اُس کی بیوی پرلوک سدھار چکی ہے۔ لڑکے نے شادی کر لی ہے۔ بہو سگھڑ اور خوش اخلاق ہے لیکن ساس سے اُس کی نِبھ نہ سکی۔ ٹھنڈی نے بیوی کو سمجھانے کی بہت کوشش کی۔ یہاں تک کہہ دیا کہ یہ غریب صرف مسلمان کے گھر میں پیدا ہونے کی گنہگار ہے ورنہ تو اِسے، رام کا نام لے کے، نہ کلمے یاد ہیں نہ قرآن کی آیتیں۔

ٹھنڈی کی بیوی گنوار تھی لیکن اُس نے دنیا دیکھی تھی۔ وہ بس ایک ہی بات کہتی رہی کہ اس لڑکی کے پہننے اوڑھنے اور اٹھنے بیٹھنے سے ظاہر نہیں ہوتا کہ یہ کس مذہب اور کیسے گھر کی ہے۔ ٹھنڈی نے لاکھ اس سے کہا کہ آجکل کا ڈھنگ ہی یہ ہے۔ اِن باتوں کو اب بُرا نہیں سمجھا جاتا لیکن اُس کی بیوی ٹس سے مَس نہ ہوئی۔ دوسرے چاہے ان باتوں کو بُرا نہ سمجھتے ہوں اُس کے نزدیک یہی باتیں اَدھرمی ہونے کے لکشن تھے ——— ورنہ اتنی بات تو وہ بھی سمجھتی تھی کہ مسلمان ہونا کوئی پاپ نہیں۔ مَن مار کر لڑکے کی پسند کو وہ بھی پسند کر لیتی پَر مشکل یہ تھی کہ لڑکی ڈھنگ کی مسلمان بھی نہیں تھی اور بڑھاپے میں اَدھرمیوں کی سنگت کے خیال ہی سے اس کی روح کانپنے لگتی۔

ٹھنڈی نے چائے کے لئے بہو کو آواز دی اور مجھ سے کہا۔ "مسلمان تو خیر بڑی چیز ہوتا ہے، رام کا نام لے کے، ہم نے مسلمان دیکھے ہیں۔ اب تو ڈھنگ کا آدمی ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

ٹھنڈی کی بہو نے آکر مجھے "ہیلو" کہا اور ذرا توقف کے بعد "انکل" کا اضافہ بھی کر دیا۔ پھر اُس نے خبر دی کہ ڈرائیور ہوٹل گیا ہے۔ ذرا سی دیر میں میرا سامان لے کر آجائے گا۔ اُس نے مجھ سے میرے خورد و نوش کے معمولات دریافت کئے۔ یہ بھی پوچھا کہ GOD FORBID ذیابطیس یا دل کے مرض جیسے کسی عارضے کی وجہ سے پرہیزی کھانا تو نہیں کھاتا۔ میں نے جب اُس کی طرف دیکھا تو بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس کے لب و لہجے اور ناک نقشے نے مجھے میری بیٹی کی یاد دلا دی تھی۔ اب یہ کہنا تو مشکل ہے کہ میری بیٹی اور ٹھنڈی کی بہو میں واقعی بڑی مشابہت تھی یا میرے اندر کے کسی جذبے نے اپنے طور پر دونوں کو ایک روپ میں ڈھال لیا تھا، لیکن یہ سچ ہے کہ ڈھونڈنے کے باوجود مجھے دونوں کے چہرے مہرے اور رنگ ڈھنگ میں کوئی خاص فرق نہیں نظر آرہا تھا ——— سوائے اس کے کہ میری بیٹی نے جس بوائے فرینڈ کے ساتھ شادی کی ہے، وہ اتفاق سے مسلمان ہی ہے!

میں نے ٹھنڈی کی بہو سے کہا کہ وہ میرے لئے کوئی خاص زحمت نہ اٹھائے، بس اس بات کا خیال رکھے کہ میں ذیابطیس کا مریض ہوں۔ اس پر اُس نے اطمینان کا سانس لیا اور یہ کہتی ہوئی کچن کی طرف چلی گئی کہ ہمارے یہاں ویسے بھی شکر کا استعمال نہیں کیا جاتا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے ٹھنڈی کی طرف دیکھا۔ اُس نے اپنے DIABETIC ہونے یا نہ ہونے کے تعلق سے کچھ

کہنا ضروری نہیں سمجھا اور مجھے یہ مناسب نہیں معلوم ہوا کہ میں اُسے اس تعلق سے کچھ کہنے پر مجبور کروں۔ دراصل اپنی بیوی کو یاد کر کے ٹھنڈی بہت جذباتی ہو گیا تھا۔

"آج جیسے تو اتفاق سے مجھے مل گیا ویسے ہی جا کر چھ مہینے پہلے مل جاتا تو کتنا اچھا ہوتا!"

"کیوں؟"

"میں تجھے آرون کی ماں سے ملواتا۔ وہ بے چاری کسی ڈھنگ کے مسلمان سے ملنے کی حسرت اپنے ساتھ لے گئی۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اگر اُس کی یہ حسرت پوری ہو جاتی تو، رام کا نام لے کے، وہ کچھ برس اور جی لیتی۔"

میں نے خوش طبعی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا "مجھ سے مل کر کسی کی حسرت کیا پوری ہوتی۔ میں تو بڑا بے ڈھب آدمی ہوں۔ تو یہ بتا تجھے اتنے بڑے شہر میں ایک مسلمان نہیں ملا؟"

"مل جاتا تو بات ہی کیا تھی۔"

"اور یہ جو تیرے پڑوس کے محلّے میں مسجد ہے........؟"

"مسجد تو ہے، میں وہاں گیا بھی تھا۔ مسجد کے دروازے ہی پر "بحکم اراکینِ مسجد ھٰذا" رام کا نام لے کے، ایک "اہم اعلان" ٹنگا ہوا دیکھا:۔

"نمازی حضرات کو معلوم ہو کہ اس مسجد کے اراکین، امام اور مؤذّن اہلسنّت جماعت ہیں اور حنفی مسلک پر ہی نماز ادا کی جاتی ہے جو عین قرآن اور حدیث کے مطابق ہے۔ لہٰذا اُن حضرات سے، ادب کے ساتھ عرض ہے، جو لوگ آمین بلند آواز سے کہتے ہیں اور تکبیر سے پہلے یا شروع ہوتے ہی کھڑے ہو جاتے ہیں، وہ مسلک حنفی کی خلاف ورزی کر کے فتنہ پیدا نہ کریں ورنہ اُس کی ذمّہ داری اُنھی کے سر ہو گی۔"

ٹھنڈی نے مجھے بتایا کہ یہ اعلان پڑھنے کے بعد اندر جانے یا باہر ہی کسی سے بات کرنے کی ہمّت وہ نہیں جُٹا پایا۔ جہاں مسلک کے فرق سے فتنے کھڑے ہو سکتے ہیں وہاں مذہب کا فرق جو نہ کرے وہ کم ہے! اور پھر ٹھنڈی ڈرا ہوا بھی تھا۔ دسمبر اور اس کے بعد جنوری کے فسادکی ہولناکیاں اُس کے حواس پر چھائی ہوتی تھیں ـــــــ پولس کی مدد بلکہ اس کی سرپرستی میں مسلمانوں کا قتلِ عام تو فسادیوں نے کیا تھا اور فساد کے بعد ٹھنڈی جیسے بے قصور اور معصوم ہندو مسلمانوں کے محلّوں سے گزرتے سے کتراتے تھے۔ بحالتِ مجبوری اگر اُن کا وہاں سے گزر ہوتا تو ندامت کے بوجھ سے ان کی گردنیں جھکی ہوئی ہوتی تھیں اور دل میں یہ دھڑکہ بھی لگا رہتا تھا کہ کہیں کوئی شہدا گلی میں کھینچ کر کام ہی تمام نہ کر دے۔

ٹھنڈی وہاں سے الٹے پیروں لوٹ آیا۔ اُسی علاقے میں ذرا فاصلے پر ایک مسجد اور ہے۔ ناکے سے بائیں مُڑ کر بیس قدم چلیں

تو مارکیٹ کے سامنے کی گلی میں پڑتی ہے۔ عصر اور مغرب کے بیچ کا وقت تھا۔ عصر کے نمازی جا چکے تھے۔ مغرب کے نمازی ابھی آئے نہیں تھے۔ ٹھنڈی نے باہر ہی سے بغور جائزہ لیا۔ اراکینِ مسجد کے حق میں دل سے دعا نکلی کہ انھوں نے دروازے پر کوئی بورڈ نہیں ٹانگ رکھا تھا۔ ٹھنڈی نے سر پر رومال باندھا اور رام کا نام لے کر مسجد میں قدم رکھا۔

اندر دائیں جانب کونے میں ایک باریش شخص چند نوجوانوں کو دین کے ارکان یاد کروا رہا تھا۔ لڑکوں سے فارغ ہو کر وہ ٹھنڈی کی طرف متوجہ ہوا۔ ٹھنڈی کے سلام کا جواب دے کر اس نے مصافحے کے لئے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے ٹھنڈی نے اپنا تعارف پیش کیا۔ نام سن کر باریش شخص اس کے ساتھ بڑی گرم جوشی سے پیش آیا۔ وہیں مسجد کے دائیں کونے میں پنکھے کے نیچے بیٹھ کر دونوں باتیں کرنے لگے۔ انھوں نے بابری مسجد کی شہادت پر ایک دوسرے کو پُرسہ دیا۔ سماج میں پھیل رہی لامذہبیت پر تنقید کی۔ جب یہ سب ہو چکا تو ٹھنڈی نے بڑی امید کے ساتھ اپنے آنے کا مقصد بیان کیا۔

ٹھنڈی نے اس سے کہا کہ بھائی! میں نہ مسلمان ہوں نہ حسینی برہمن لیکن ہم لوگ حضرت امام حسینؓ کے پشتینی عقیدتمند ہیں۔ آج عاشورہ کا دن ہے۔ میرے گھر میں میٹھا پکا ہے۔ میں کسی دیندار مسلمان کی تلاش میں ہوں کہ اس سے فاتحہ پڑھواؤں۔ اگر آپ میری مدد کریں تو بڑی مہربانی ہوگی۔

اُس شخص نے ٹھنڈی کی مدد نہیں کی۔ فاتحہ کا نام سُن کر اُس کی گرم جوشی کی جگہ سرد مہری نے لے لی۔ ٹھنڈی تاڑ گیا کہ یہ مسجد اُن مسلمانوں کی ہے جن کی وجہ سے اب گاؤں میں تعزیے نہیں رکھے جاتے اور نہ ہی محرم کا جلوس نکلتا ہے۔ نِشان کی مسجد اب صرف نام ہی کی نشان کی مسجد رہ گئی ہے۔ مسجد کے جس کمرے میں ضریح اور عَلَم رکھے جاتے تھے، پچھلے دس برسوں سے اس کے دروازے پر ایک بڑا سا تالا جھول رہا ہے۔ ٹھنڈی کے اس انکشاف نے میرا کلیجہ چھلنی کر دیا کہ چاچا وِلایتی رام پر دل کا دورہ اور اس دروازے پر تالا دونوں ایک ساتھ پڑے تھے!

ٹھنڈی کے والد وِلایتی رام ولد سالگرام کی گاؤں میں نون مرچ کی دوکان تھی۔ دوکان داری کے ساتھ تھوڑی بہت ساہوکاری بھی کر لیا کرتے تھے۔ کاروباری حس بہت تیز تھی اور خوش مزاج بھی بہت تھے۔ بدلیسی مال کے بائیکاٹ کے دِنوں میں اپنے نام کی وجہ سے وہ اچھا خاصا مذاق بن کر رہ گئے تھے۔ یار دوست تو یار دوست، گاؤں کے بچوں تک نے انھیں نہیں بخشا تھا۔ پہلے کوئی انھیں "چاچاجی" بلاتا تو کوئی "چاچا وِلایتی رام" لیکن اب وہ ہر ایک کے لئے "وِلایتی چاچا" ہو گئے تھے۔ جب کوئی لونڈا انھیں "وِلایتی چاچا" بلاتا تو وہ چہک کر جواب دیتے۔ "بول دیسی بھتیجے!"

اِس خیال سے کہ کہیں اس ہنسی مذاق کا اثر اُن کی دوکان داری پر نہ پڑے چاچا وِلایتی رام نے اپنی دوکان پر، جس پر پہلے کبھی کسی نے کوئی سائن بورڈ نہیں دیکھا تھا، ایک تختہ ٹانگ دیا۔ اُس تختے پر جلی حرفوں میں لکھا تھا:

"خالص اور صرف دیسی مال کی دکان - مالک : فرزند سالگرام مرحوم"

اب تو فرزند سالگرام مرحوم، خود مرحوم ہو چکے ہیں - ہوا یہ کہ سریو کے کنارے مسجد کی شہادت کے بعد ملک بھر میں مسلمانوں کو قتل کرنے اور ان کی املاک لوٹنے یا جلانے کا ایک سلسلہ سا چل پڑا - بعض جگہوں پر اُن کی عبادت گاہوں کو مسمار کرنے کی کوششیں بھی ہوئیں - ایسی کچھ کوششیں کامیابی سے ہمکنار ہوئیں اور کچھ کامیابی سے ہمکنار نہ ہونے پائیں - نشان کی مسجد کے مینار ایک ایسی ہی ناکام کوشش کے گواہ ہیں -

ہجوم نے چاچا ولایتی رام سے بہت کہا کہ وہ ایک بے گناہ ہندو کی ہتیا کا پاپ اپنے سر لینا نہیں چاہتے - لہٰذا وہ اُن کے راستے سے ہٹ جائیں - لیکن چاچا ولایتی رام بس یہی کہتے رہے کہ میرے جیتے جی آپ لوگ نشان کی مسجد تک نہیں پہنچ سکتے - اسی تکرار میں خاصا وقت نکل گیا - آخر کار مجبور ہو کر اُن لوگوں نے چاچا ولایتی رام کو روندتے ہوئے اپنی راہ بنائی -

اس دوران مسلمانوں کو اتنا وقت ضرور مل گیا کہ وہ مسجد کے دفاع کے لئے صف آراء ہو سکیں - ان کے مقابلے پر اُتر آنے کی دیر تھی کہ ہجوم تتر بتر ہو گیا - اب ہجوم کی جگہ پولس نے لے لی - تربیت یافتہ پولس جوانوں نے لاٹھی اور بلّم بردار مسلمانوں پر وہ اندھا دھند گولیاں برسائیں کہ کشتوں کے پشتے لگ گئے اور شام کی شفق مسجد کی دیواروں سے لپٹ کر رونے لگی!

بچے کھچے مسلمانوں کو پولس نے بلوا کرنے اور ولایتی رام ولد سالگرام کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا اور قانونی کارروائی کے لئے آگے بڑھا دی - وہ تو کہئے کہ چاچا ولایتی رام نے دس برس قبل ہی جب ان پر دل کا دورہ پڑا تھا، بمبئی سے ٹھنڈی کو بلوا کر وصیت کر دی تھی - ورنہ اُن کی زندگی کے ساتھ ہی سب کچھ ختم ہو گیا ہوتا - ٹھنڈی کو اُن کا ایک ایک لفظ آج بھی یاد ہے - انھوں نے کہا تھا:

"بیٹا! ہم امام حسین کے غم کے امین ہیں - یہ ہمارے پرکھوں کی وراثت ہے - حضرت امام کی عظمت پر مٹھی بھر لوگوں کا اجارہ نہیں ہو سکتا - اس غم کو سہارنے کے لئے پہاڑ جتنا بڑا کلیجہ چاہئے - ہر کسی کے بس کی یہ بات ہے بھی نہیں - ایسے لوگوں کی حرکت کا کیا بُرا ماننا جو اس غم کی عظمت کو نہ سمجھ سکیں - میں آخری سانس تک اپنے دھرم کا پالن کروں گا - میرے بعد مجھے یقین ہے کہ تم اپنا پِتر دھرم نبھاؤ گے لیکن ایک بات کی تاکید ضرور کرنا چاہوں گا - فاتحہ کے لئے کسی دیندار مسلمان ہی کو بلوانا" ذرا سا وقفہ دے کر انھوں نے کہا تھا - "پریشان کیوں ہونا ہے؟ ڈھونڈنے سے خدا بھی مل جاتا ہے"

اُس سال بمبئی میں عاشورہ جون کی آخری تاریخ یا جولائی کی پہلی کو پڑا تھا اور اس سے پہلے ۸ دسمبر کے روز ٹھنڈی گاؤں کے شمشان سے پھول چن کر لوٹا تھا - وہ یہ سوچ کر حیران رہ گیا کہ ان چھ مہینوں کے عرصے میں اتنا وقت گزر چکا تھا کہ دیندار مسلمان

کی تلاش میں اُسے خدا یاد آگیا۔ رام کا نام لے کے!

ٹھنڈی کی بیوی بڑی مذہبی عورت تھی۔ اس نے زندگی میں کبھی ٹھاکر جی کو بھوگ لگائے بغیر ایک دانہ منھ میں نہیں رکھا تھا۔ اُسے اپنی سیوا اور شردھا پر بڑا وشواس تھا۔ وہ نیاز کا برتن لئے تمام رات بیٹھی یہی مناتی رہی کہ ایشور چاہے اُس کے پران لیں پر کچھ ایسا کریں کہ ہم اپنے باپ دادا کی روحوں کے سامنے شرمسار اور گنہگار ہونے سے بچ جائیں ــــــــــ رات آنکھوں ہی میں کٹ گئی، برتن رکھا رہ گیا اور پڑوس کے محلّے سے موذّن نے اذان دی!

چاچا ولائتی رام نے کہا تھا ڈھونڈنے سے خدا بھی مل جاتا ہے تو پھر ٹھنڈی کو دیندار مسلمان کیوں نہیں ملا؟ اب ٹھنڈی کس سے کہے کہ خدا کسی بھی جگہ مل سکتا ہے۔ کیونکہ وہ ہر جگہ ہے لیکن دیندار مسلمان کا ہر جگہ پایا جانا شرط نہیں۔ وہ تو وہیں ملے گا جہاں ہوگا ــــــــــ پتا نہیں اتنی بڑی دنیا میں وہ کہاں ہے؟

ٹھنڈی کے نزدیک بمبئی کچھ برا شہر نہیں ہے لیکن وہاں کے مسلمان کو آسمان پر ڈھونڈنے سے چاند نہیں ملتا اور قمری مہینے کی تاریخیں، رام کا نام لے کے، بڑھتی جاتی ہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ ایسے شہر سے کوئی کیا امید رکھے جو گزشتہ کئی برسوں سے ایک شرعی گواہ فراہم نہ کر سکا۔ کیا شہر میں ایک بھی ایسا شرع کا پابند مسلمان نہیں رہا جس کی بینائی سلامت ہو اور اگر ہے تو کیا وجہ ہے کہ بمبئی کے مسلمانوں کے نزدیک اس کی شہادت قابلِ قبول نہیں!

یہ نہیں کہ ٹھنڈی کے دوستوں میں کوئی مسلمان نہیں ہے۔ بہت ہیں۔ سب کے سب بڑی خوبیوں کے مالک ہیں اور تقریباً ہر ایک کے بارے میں وہ یقین کامل کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ انھوں نے کبھی زندگی میں عیدین کی نماز ناغہ نہیں کی لیکن مسلمان اور دیندار مسلمان میں بڑا فرق ہوتا ہے ــــــــــ وہی فرق جو زمین اور آسمان میں ہے ــــــــــ یا پھر ــــــــــ وہ فرق جو بصارت اور بصیرت میں ہے!

قصّہ مختصر یہ کہ اُس عاشورے کے دن بمبئی میں وہ سب کچھ ہوا جو ہر سال ہوتا آیا ہے لیکن ٹھنڈی کے یہاں فاتحہ نہ ہو سکی۔ ٹھنڈی کی بیوی اس صدمے کو جھیل نہیں پائی اور دو چار مہینوں میں وہ غریب پرلوک سدھار گئی۔ ٹھنڈی بھی بجھ سا گیا۔ اُس دن کے بعد ٹھنڈی کے گھر میں میٹھا نہیں پکا۔ میں نے ٹھنڈی کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ یہاں کی شکر میں اب مٹھاس باقی نہیں رہی۔ مجھے یاد ہے، ٹھنڈی نے کہا تھا:

"اب ہماری زندگی میں نہ رَس ہے نہ جس، بس جئے جا رہے ہیں۔ جی بھی کیا رہے ہیں، بیٹھے تھوک نگل رہے ہیں۔ جب شکر ہی سے مٹھاس نکل جائے تو زندگی میں کیا رہ جاتا ہے۔ تو میرا ایک کام کر۔ وہاں مملکتِ خداداد میں اگر شکر جیسی شکر ملتی ہو تو ذرا سی میرے لئے بھیج دینا۔ مرنے کے بعد مجھے اپنے پرکھوں کی

روحوں کا سامنا کرنا ہے!"

ٹھنڈی اپنے پُرکھوں کی روحوں کا سامنا جب کرے گا تب کرے گا، میں اس زندگی میں دوبارہ ٹھنڈی کا سامنا کرنے کا حوصلہ اپنے اندر نہیں پاتا۔ میں پاکستان کا شہری اور کراچی کا باشندہ ضرور ہوں لیکن جیسا کہ آپ جانتے ہیں ذیابطیس کا پُرانا مریض بھی ہوں۔ مجھے شکر کا ذائقہ تک یاد نہیں رہا۔ دوسرے یہ کہ جس چیز کو شکر قرار دیا جارہا ہے اُسے شکر کے طور پر قبول کرنے میں مجھے تامّل ہے۔ یہ شہر جو روزانہ ٹنوں کے حساب سے شکر کھا جاتا ہے، اگر واقعی شکر کھاتا رہا ہے تو یوں دن رات زہر نہ اگلتا۔

کچھ دن ہوئے ناشتے کی میز پر سب جمع تھے۔ مسجد میں نمازیوں کو گولیوں سے بھون ڈالنے کے واقعے پر بحث ہورہی تھی۔ میری بیوی، بیٹے، بہو حتّٰی کہ پوتے اور پوتی کے پاس بھی اس واقعے پر کہنے کے لئے بہت کچھ تھا۔ رات میں نے دو ایک پیگ زیادہ ہی پی لئے تھے۔ کسل مندی سی چھائی ہوئی تھی۔ اس لئے بڑی دیر تک خاموش بیٹھا سب کی سنتا رہا۔ یہاں تک کہ خود مجھے اپنا سکوت اکھرنے لگا۔ ابھی میں بحث میں حصّہ لینے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ پتا نہیں کیسے میرے منھ سے نکل گیا "آپ لوگ نمازیوں کی شہادت کو رو رہے ہیں اَب تو بمبئی میں جو ہو سو کم ہے۔" گھر والوں نے مجھے تقریباً پُچکارتے ہوئے سمجھایا کہ یہ واقعہ کراچی کا ہے، بمبئی کا نہیں۔ "ہوگا" میں نے کہا۔ "کیا فرق پڑتا ہے، بمبئی میں نہ ہوا کراچی میں ہوگیا۔ یہاں کے بھی تو کئی واقعے یہاں نہ ہوکر وہاں ہوچکے ہیں۔"

میری اس قسم کی بہکی بہکی باتوں کے گھر والے عادی ہوچکے ہیں، بالکل اسی طرح جس طرح بمبئی والے بمبئی کے اور کراچی والے کراچی کے ہوگئے ہیں۔

غلام محمد (بنگلہ دیش)

کس کی بات؟

طوطا جب واویلا مچا کر تھک گیا۔ اور دانیال نے اس پر کوئی توجہ نہ دی۔ تو اس نے غصے میں آکر پنجرے کی سلاخ اپنی چونچ میں پکڑ لی اور وہ پنجرے میں لٹک گیا۔

"یہ طوطا ہر چند خوب صورت سہی مگر ہے پرلے درجے کا بدتمیز۔ گذشتہ پندرہ سالوں سے وہ میری جان کا دشمن بنا ہوا ہے۔" دانیال نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "میں بھی کس الو کے پٹھے کے عشق میں گرفتار ہوا۔"

تم اسے پنجرے سے آزاد کیوں نہیں کر دیتے۔ میں نے مشورۃً کہا۔ تمھیں نجات مل جاتی اور اسے آزادی۔ دانیال ہنس پڑا۔ بولا۔ احسن یہ کم بخت اب تو اڑنے کے لائق بھی نہ رہا۔

کیوں کس لیے؟

اتنا کھاتا ہے کہ پروں کے مقابلے میں اس کا جسم غیر متوازن طور پر بھاری ہو چکا ہے۔ دانیال نے توقف کیا۔ سگریٹ کے چند کش لگائے۔ اس کے بعد اس نے کہا۔ گذشتہ سال میں نے اسے گالیاں دیں، پنجرہ کھول دیا۔ اور اسے آزاد کر دیا۔ یہ کہتے ہوئے کہ جا حرام زادے جہاں تیرا جی چاہے مر وہاں جا کے۔ وہ پھر سے اڑ گیا۔ اور منڈیر پر جا کر بیٹھا تھا۔ کہ دھپ سے زمین پر آ رہا۔ اس نے دوبارہ اڑنے کی کوشش کی۔ کئی بار اڑا بھی۔ مگر وہ مسلسل گرتا رہا اور اڑنے کی کوشش کرتا رہا۔ اس کے اندر اتنی سکت باقی نہ رہی تھی۔ کہ وہ دس فیٹ اونچا اڑ سکے۔ تو میں نے دوڑ کر اسے اٹھا لیا۔ کیا دیکھتا ہوں۔ کہ وہ پروں کے نیچے لہولہان۔ کئی دنوں تک میں نے اس کی مرہم پٹی کی۔ اس کے بعد کہیں جا کر وہ اچھا ہوا۔ یہ نالائق ہے انتہائی ذہین۔ جب میں اسے ڈانٹتا ہوں۔ تو فوراً خاموش ہو جاتا ہے اور تمام باتیں چپکے چپکے ذہن نشین کر لیتا ہے۔ پھر وہی باتیں غصے کی حالت میں مجھ پر اچھال دیتا ہے۔

طوطا جو اتنی دیر پنجرے میں لٹکا ہوا تھا۔ معاً اپنی نشست پر جا بیٹھا۔ اور لگا شور مچانے۔ میں نے اس کی آواز پر دھیان دیا۔ تو چند انتہائی گندی گندی گالیاں سنائی دیں۔ میں نے کہا۔ دانیال، تمھارا طوطا تو دنیا بھر کی گالیاں جانتا ہے۔ تم نے اسے کچھ اچھی باتیں بھی سکھائی ہوتیں۔

دانیال نے گفتگو منقطع کرتے ہوئے کہا، یعنی میں اپنی زبان اس پر مسلط کر دیتا؟

کیا فرق پڑتا ہے۔ میں نے کہا۔ وہ تو تمھاری ہی زبان میں گالیاں بکتا ہے۔

"یہ اس کا اپنا مسئلہ ہے۔" دانیال نے کہا۔ "میں کسی پر اپنی زبان مسلط کرنے کا قائل نہیں۔ آدمی ہو یا پرندہ۔ زبان اپنی اپنی۔

گویا تم نے اسے آزادی اظہار دے رکھی ہے۔
یہی سمجھو۔
کیا آزادی اظہار، پرندوں کا بھی جمہوری حق ہے؟
دانیال نے ہنستے ہوئے کہا، ایک طرف تو یہ طوطا پریشان کیے ہوئے ہے اور دوسری طرف، تم ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گئے۔ ذرا دیر پہلے میں نے اسے بھگوئے ہوئے چنے دیے تھے۔ پورا کٹورہ خالی۔ اس کا پیٹ تو بھر گیا ہے۔ مگر جی نہیں بھرا۔
طوطے کی گالیاں کمرے کی فضا متعفن کر رہی تھیں۔ وہ دانیال کو مسلسل گالیاں دیے جارہا تھا۔ اور دانیال تھا کہ بالکل چپ۔ نہ نوٹس لیتا تھا۔ نہ اس کے کٹورے میں خوراک ڈالتا تھا۔ طوطا غصے میں آکر، پنجرے میں لٹک جاتا تھا۔ "اس نے احتجاج کی اچھی صورت دریافت کی ہے۔" میں نے کہا۔
"احتجاج کس لیے؟" دانیال نے کہا۔ "اپنی آزادی کے لیے یا محض پیٹ بھرنے کے لیے؟"

میں لاجواب ہو گیا۔ بولا۔ "درمیان میں تو مجھے کچھ نظر نہیں آتا۔ ویسے تمھارے نیک اصول اپنی جگہ رہ گئے۔ طوطا بس ذرا کھسک گیا ہے۔"
دانیال نے فوراً اعتراف کر لیا۔ "بھائی میرے۔ یہی ہوا ہے۔"
"پھر اس کی معقول تربیت کا انتظام کرو۔"
"بہت دیر ہو چکی ہے۔"
"واقعی؟"
اس کی عمر پندرہ سال سے زیادہ ہے۔ دانیال نے کہا۔ اب میں اس بوڑھے طوطے کی تربیت کروں؟ وہ میری چودہ پشتوں کے پرخچے اڑا کر رکھ دے گا۔ اور تربیت بھاڑ میں جائے گی۔ وہ خوراک طلب کرے گا یا مجھے گالیاں دے گا اور انتہائے کار، پنجرے میں لٹک جائے گا۔ میں ہنسا۔ دانیال نے نتیجہ یہ اخذ کیا کہ اب اس حرام زادے کو برداشت کرنا پڑے گا اس کی جملہ بدتمیزیوں کے باوجود؟
جملہ بدتمیزیوں کے باوجود۔
"دانیال" میں نے کہا۔ "تم نے اپنے طوطے کو پہچانا اور تمھارے طوطے نے تمھیں۔ معاملہ دو طرفہ معلوم ہوتا ہے۔
یہی جانو۔
دانیال صوفے پر دراز ہو چکا تھا۔ اور یکے بعد دیگرے سگریٹ پھونکے جارہا تھا۔ اور وہ بڑے کرب میں مبتلا نظر آتا تھا۔ ادھر طوطے کی گالیوں کی بوچھار۔ کبھی سیدھی۔ کبھی ترچھی۔ وہ

اپنے طوطے کے معاملے میں واقعتہً بے حد کمزور بلکہ مجبور دکھائی دیتا تھا۔ لگتا تھا جیسے اسے بہ یک وقت، اپنے طوطے کی آزادی اور اس آزادی کے تحفظ میں، طوطے کی اپنی ناکامیاں پریشان کر رہی تھیں۔ اس نے کہا بھی کہ میں اگر اسے پنجرے سے نکال دوں اور کھلا چھوڑ دوں۔ تو ایک بلی اس کی گردن دبوچ بیٹھے گی، وہ اپنی مدافعت نہ کر پائے گا۔ تو آزادی اس کے لیے، خطرہ، جاں ہے۔ یوں پنجرہ ہی، دانیال کے خیال میں، طوطے کے لیے، محفوظ ترین پناہ گاہ کا درجہ رکھتا تھا۔

میں اس علاقے میں نیا نیا آیا تھا۔ لیکن بڑی قلیل مدت میں دانیال کی مجھ سے کافی بے تکلفی ہو چکی تھی۔ اس علاقے کے دوسرے لوگوں سے اس کے تعلقات رسمی تھے اور علیک سلیک تک محدود تھے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ بدچلن اور آوارہ ہے۔ ہر وقت شراب پیتا ہے۔ اس کی بیوی نے تنگ آکر اس سے علاحدگی اختیار کر لی اور طوطا اس کے ساتھ رہ گیا اور طوطا بھی انتہائی بدتمیز اور بیہودہ۔

دانیال کی جائداد اس کے گزارے کے لیے کافی تھی۔ اس کی عمر پچاس کے لگ بھگ تھی۔ وہ اپنا کھانا خود پکاتا تھا۔ پرندوں سے اسے گہرا لگاؤ تھا۔ تڑکے اٹھ کر وہ چڑیوں کی خوراک لان پر ڈال آتا تھا۔ بے شمار چڑیاں جو وقت مقررہ پر درختوں پر آبیٹھتی تھیں، فوراً لان پر اتر آتیں اور پھدک پھدک کر دانے چگنے لگتیں، دانیال اس دوران چپ چاپ ایک طرف کھڑا، ان چڑیوں میں گویا اپنے تئیں دریافت کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ سہ پہر کو وہ، دوبارہ ان کی خوراک پودوں کے گرد و پیش رکھ آتا تھا۔ اس وقت بھی چڑیاں لان پر اتر آتی تھیں۔

اس نے معاً چونک کر مجھ سے کہا۔ یار تم ذرا بیٹھو۔ میں لان پر چڑیوں کی خوراک ڈال آؤں۔

طوطا اب صاف لہجے میں گالیاں بک رہا تھا۔ دانیال طوطے کی گالیوں سے بے نیاز، اپنا بیگ اٹھا کر باہر نکل گیا۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے روانہ ہوا۔ تو اس نے محض اتنا کہا۔ تم بھی چلے آئے!

وہاں بیٹھ کر تمہارے طوطے کی گالیاں سننے سے یہ کہیں بہتر ہے۔

دانیال نے برق رفتاری سے پودوں کے آس پاس سرسبز و شاداب گھاس پر دانے بکھیرتے ہوئے کہا۔ "بہت دیر ہو گئی ہے۔ چڑیاں کب سے درختوں پر بیٹھی چہچہا رہی ہیں۔ میں انھیں وقت مقررہ پر کھلاتا ہوں۔ یہ میرا دستور ہے۔ اور وہ یہ سمجھتی ہیں۔ کہ درخت انھیں یہ خوراک مہیا کرتے ہیں۔"

میں نے حیران ہو کر کہا۔ "درخت خوراک مہیا کرتے ہیں؟"

ہاں چڑیوں کا یہ اندازہ ہے۔ کہ انھیں درخت، خوراک مہیا کرتے ہیں۔

یہ تم نے کیسے جانا؟۔

سالہا سال سے میں چڑیوں کی پرورش کر رہا ہوں ۔ اس نے اعتماد سے کہا۔ میں جانتا ہوں۔

تم جانتے ہو یہ ٹھیک ہے۔ میں نے کہا۔ چڑیاں یہ کیوں نہیں جانتیں۔ کہ تم انھیں خوراک مہیا کرتے ہو؟

اس نے بڑے درد بھرے لہجے میں کہا۔ چڑیوں کو معاف کیا جا سکتا ہے۔

طوطے کو؟

اسے بھی۔

اس نے توقف کیا۔ اس کے بعد کہا، اس حقیقت کے باوجود کہ چڑیوں میں اور اس طوطے میں بڑا فرق ہے۔

اور کوئی طوطا چشم ہو۔۔۔۔؟

اس نے فوراً میری بات کاٹی اور پریشان ہو کر اس نے میری طرف دیکھا۔ طوطا چشم؟ تم آخر کیا کہنا چاہتے ہو؟

بس یوں ہی کہہ دیا۔

"یعنی۔۔۔؟" اس نے کہا۔ "بس یوں ہی کہہ دیا۔ واہ!"

دانیال میں ملتجی ہوا۔ مجھ سے کوئی چوک تو نہیں ہو گئی؟

"نہیں نہیں۔" اس نے اپنے تئیں سنبھالا۔ وہ بہت پریشان نظر آرہا تھا۔ اس نے کمرے میں آکر اپنا بلڈ پریشر دیکھا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے دوا کھائی۔ میں نے پوچھا۔ کیا تمھارا پریشر بڑھ گیا ہے۔

کافی بڑھ گیا ہے ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ ایک کیلا طوطے کے پنجرے میں رکھ آیا۔ طوطا جو احتجاجاً پنجرے میں لٹکا ہوا تھا۔ کیلا دیکھتے ہی اپنی نشست پر جا بیٹھا۔ اور یوں لگا کھانے جیسے، ایک مدت دراز کے بعد اسے خوراک ملی ہو۔

"بری۔ تھی!" دانیال نے صوفے پر دراز ہوتے ہوئے کہا۔ "غلطی میری بھی تھی۔ وہ تنہا ذمہ دار نہیں۔

میں چونکا۔ برجستہ بول پڑا۔ کون؟

کس کی بات ہو رہی تھی؟ دانیال نے متعجب ہو کر پوچھا۔

طوطے کی۔

نہیں۔ طوطے کی نہیں۔ اس نے آنکھیں موند کر کہا۔ بات اس طوطا چشم کی ہو رہی تھی تھا؟

وہ کون؟

دانیال جھینپ گیا۔ پھر اپنے تئیں قابو میں لاتے ہوئے اس نے کہا، منڈیر پر بیٹھنے گیا تھا۔ دھپ سے گر پڑا۔

ہم لوگ غالباً ایک ہی موضوع پر بات نہیں کر رہے ہیں؟

یقیناً۔۔۔۔دانیال نے تصدیق کی۔

میں نے پوچھا۔ "تو کس کی بات ہو رہی تھی۔"

اب کے دانیال نے کہا۔ تم وضاحت کرو۔ یعنی، ہمارا موضوع کیا تھا؟

میں مشکل میں پھنسا۔ شاید ہم لوگ تمہارے طوطے کی بات کر رہے تھے۔ یا کسی طوطا چشم کی۔ یا مجموعی طور پر طوطا چشموں کی۔

دانیال نے انتہائی بیزاری سے کہا۔ "ممکن ہے۔"

ہو سکتا ہے، میں نے کہا۔ سو گئے کیا۔؟

"نہیں۔"

"حرام زادے۔ ایسی لات ماروں گا کہ تیرے پر نچے اڑ جائیں گے۔"

"الو کے پٹھے۔"

"کمینے۔"

"بدتمیز۔"

"جا جہاں تیرا جی چاہے۔ مر وہاں جا کے۔"

طوطا، جو گالیاں بکے جا رہا تھا، معاً، پنجرے میں لٹک گیا اور اس نے، زور زور سے اپنے پر پھڑپھڑائے۔

ایک بلی اس اثنا میں نہ جانے کدھر سے آنکلی تھی۔ وہ ایک سفید گٹھری کی مثال گول اپنی دم سنبھالے، سر اونچا کیے، پنجرے کے نیچے بیٹھی، طوطے کو دیکھ رہی تھی۔ پنجرے کے ساتھ اس کا سر جنبش کرتا تھا۔ پھر اس نے میاؤں کی۔ تو طوطے نے پنجرے میں دھما چوکڑی مچادی۔ گالیاں موقوف، اب وہ اپنی پوری قوت سے چیخ رہا تھا۔

وہ تو ڈر گیا ہے۔ میں نے کہا۔ سو گئے کیا دانیال؟

ہاں تم نے ٹھیک ہی کہا۔ دانیال آنکھیں موندے ہوئے تھا۔ بولا۔ موضوع واقعی وضاحت طلب ہے یعنی ہم لوگ کس کی بات کر رہے تھے، طوطے کی۔ یا اس طوطا چشم کی، یا مجموعی طور پر طوطا چشموں کی؟

پنجرہ، آزادی، پتہ نہیں کیا کیا؟ اس نے کروٹ بدلی، "اب تم بھی سو جاؤ احسن۔ میں کیوں طوطے پر اپنی زبان مسلط کروں؟ ویسے غلطی میری بھی تھی۔!" اس کی آواز، ڈوبتی چلی گئی

مشتاق احمد یوسفی

"اپنے آپ کو معاف کر دیا کیجیے"

فیض صاحب کے سیاسی مسلک سے لوگوں کو اختلاف رہا ہے اور میں بھی ان ہی میں سے ہوں ، لیکن آزادی ، احترام آدمیت اور انسانی اقدار کی پاس داری جس پامردی اور استقامت سے انھوں نے کی وہ لائق تحسین و تکریم ہے ۔ جس مسلک کج کلاہی کی سمت انھوں نے ایک دفعہ اپنا قبلہ درست کر لیا پھر اسے تا عمر نہیں بدلا اور اپنے اسی عہد وفا میں علاج گردش لیل و نہار ڈھونڈا اور انھوں نے یہ اس زمانے میں کیا جب مصلحت کدہ میں ایسے لکھنے والوں کا سکہ چلتا تھا جو ہر کھیل کے بعد اپنا اینٹنا Antenna کا رخ بدلتے رہتے تھے بلکہ بعضے تو دوسرے کے "اینٹنا" میں اپنا تار جوڑ کے "تماشائے اہل قلم دیکھتے ہیں ۔" کتنے ایسے ہیں جو نصف صدی تک ایک ہی وضع پر قائم رہے ہوں ؟ بدلتی رت کے ساتھیوں نے وفاداریاں بدلیں ، مسلک بدلے ، کچھ دکھیاروں پر تو ایسا بجوگ پڑا کہ انھوں نے مارے ڈر کے فقط مشرب ہی نہیں بدلا مشروب بھی بدل دیا یعنی سادہ پانی پی پی کے بہکنے اور لڑکھڑانے لگے ۔ برگزیدگی کی تلاش میں نکلے تھے صرف گزیدگی ہاتھ لگی ۔ ان کا ضمیر تو کیا صاف ہوگا ان بچاروں کا تو مافی الضمیر تک صاف نہیں ۔

فیض صاحب سے میری پہلی ملاقات چھ سال پہلے مخدومی ماجد علی صاحب کے یہاں ہوئی بہت سے نیاز مند فیض صاحب کا حلقہ کیے بیٹھے تھے ۔ مجھے اچھی طرح یاد نہیں کہ کسی نے فیض صاحب سے میرا تعارف کرایا یا نہیں ۔ بہر حال میں دو گھنٹے تک حسب معمول و موقع ، خاموش بیٹھا مزے مزے کی باتوں سے محظوظ ہوتا رہا ۔ دوسرے دن علی الصبح عزیز گرامی افتخار عارف کا فون آیا کہ فیض صاحب آپ کے یہاں آج کسی وقت آنا چاہتے ہیں ۔ ہوا یہ کہ آپ کے جانے کے بعد انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ وہ صاحب جو اپنی بیگم کے پہلو میں سر نہوڑائے ، گم صم بیٹھے تھے وہ کون تھے ؟ میں نے انھیں بتایا کہ وہ یوسفی صاحب تھے اور یہ ان کا نارمل پوز اور پڑوس ہے ۔ فیض صاحب کہنے لگے "تم نے تعارف کیوں نہیں کر دیا؟" میں نے کہا میں تو سوچ بھی نہیں سکتا کہ آپ یوسفی صاحب سے کبھی نہیں ملے ۔ کہنے لگے "ہاں کچھ ایسا ہی ہے ۔ مجھے بڑی ندامت ہے ، صبح ہی مجھے لے چلو ۔"

میں نے افتخار عارف سے کہا ۔ "فیض صاحب سے عرض کر دیجیے کہ آج شام عطار خود حاضر خدمت ہو کر اپنے مشک کا تعارف کروا دے گا ۔ جائے واردات وہی مرجع خلائق ماجد علی صاحب کا دولت کدہ ، شام کو ملاقات ہوئی تو فیض صاحب اتنے محجوب تھے کہ مجھے خود اپنے آپ سے شرم آنے لگی ۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ خود کو اس کوتاہی پر بھی قصوروار ٹھیرا رہے ہیں کہ میری اور ان کی

ملاقات پندرہ بیس سال پہلے کیوں نہ ہوئی! فیض صاحب کے اس انکسار اور حسن اخلاق سے میں اس لیے اور بھی متاثر ہوا کہ مجھے نہ جانے کیوں اب بھی یقین ہے کہ اس وقت تک انھوں نے میری کوئی تحریر نہیں پڑھی تھی، سنی سنائی تعریف پر ایمان لے آئے تھے۔ بات صرف اتنی سی تھی کہ وہ کم سخن تھے اور میں حسب معمول اپنے خول میں بند اور جب دونوں بزرگ فریق شرمیلے واقع ہوں تو برخوردار افتخار عارف کا طوطی اگر بولے نہیں تو کیا کرے۔

بعض باتیں ایسی ہیں جو فیض صاحب کے مزاج اور مسلک کے خلاف تھیں، مثلاً انھیں کبھی روپے کا ذکر کرتے نہیں سنا، اپنی کسی ضرورت کا ذکر کرتے ہوئے نہیں سنا۔ زمانے کی شکایت یا اپنے سیاسی مسلک کے بارے میں نثر میں کبھی گفتگو کرتے ہوئے نہیں سنا۔ کسی کی غیبت اور برائی نہیں سن سکتے تھے۔ کوئی ان کے سامنے ادبدا کر کسی کا ذکر بہ بدی کرتا تو وہ اپنا ذہن، زبان اور کان سب سوئچ آف کر دیتے تھے۔ ایک دفعہ مجھ سے پوچھا "آج کل کچھ لکھ رہے ہیں یا بینک کے کام سے فرصت نہیں ملتی۔" میں نے کہا "فرصت اور فراغت تو بہت ہے مگر کاہل ہو گیا ہوں۔ پتا نہیں مارا جاتا۔ مطالعے کی عیاشیوں میں پڑ گیا ہوں اور جب کسی لکھنے والے کو پڑھنے میں زیادہ مزہ آنے لگے تو سمجھیے حرام خوری پر اتر آیا ہے۔" میں بہت دیر تک خود کو اسی طرح برا بھلا کہتا رہا۔ فیض صاحب خاموش سنتے رہے پھر شفقت سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اتنے نزدیک آگئے کہ ان کی سگریٹ کی راکھ میری ٹائی پر گرنے لگی، کہنے لگے۔ "بھئی، ہم کسی کی غیبت نہیں سن سکتے۔ کسی سے کینہ رکھنا اچھا نہیں۔ اپنے آپ کو معاف کر دیا کیجیے۔ درگزر ثواب کا کام ہے۔"

(بشکریہ: "مطالعہ فیض۔ یورپ میں" مؤلف: اشفاق حسین)

"دامنِ یوسف ...." کا بقیہ:۔

صفحات میں نمبر شمار میں سو کا اضافہ کر دیا ہے جس کی وجہ سے ۱۲۶ صفحات ۲۲۶ ہو گئے ہیں۔ محترم قاری کی خدمت میں عرض ہے کہ یہ کتاب ہرگز مہنگی نہیں ہے۔ ۷۰ روپے دراصل اس کی تصویر کی قیمت ہے جو کتاب کے عقبی سرورق پر چھاپی گئی ہے جس میں فیض صاحب شب خوابی کا لباس پہنے ہوئے پلنگ پر نیم دراز ہیں اور ان کے شانوں پر ہاتھ رکھے کوئی اور موجود ہے۔ ستر روپے میں یہ تصویر خرید یے، کتاب اس کے ساتھ مفت ملے گی۔

(۸ / مارچ ۱۹۸۹ء)

(بشکریہ "خامہ بگوش کے قلم سے")

○ ○ ○

مشفق خواجہ

ایک اور غالب شکن

منفرد طنز و مزاح نگار محمد خالد اختر نے سترہ اٹھارہ برس پہلے غالب کے انداز میں خطوط کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا جو کئی ادبی رسالوں میں تقریباً دس برس تک شائع ہوتا رہا۔ غالب کے انداز تحریر اور اختر کی آرائش بیان کے امتزاج سے وجود میں آنے والے ان خطوں کو بے حد مقبولیت حاصل ہوئی۔ انداز تحریر سو برس پہلے کا ہے لیکن خطوں کے مندرجات کا تعلق محمد خالد اختر کے زمانے سے ہے۔ بے شمار ادبی، سیاسی اور معاشرتی مسائل پر ان خطوں میں اظہار خیال کیا گیا ہے۔ مکتوب الیہم میں زیادہ تر وہ ادیب ہیں جن سے خالد کے دوستانہ مراسم ہیں۔ چند خطوط تاریخی، سیاسی اور گم نام شخصیتوں کے نام بھی ہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ رسائل میں مدفون ان خطوں کو کتابی صورت میں "مکاتیبِ خضر" کے نام سے شائع کر دیا گیا ہے "خضر" مکتوب نگار کا قلمی نام ہے۔

محمد خالد اختر کے طنز میں تلخی نہیں شگفتگی ہے۔ دیباچہ نگار محمد کاظم نے جو خود بھی ممتاز نثر نگار ہیں، درست لکھا ہے کہ "ان خطوط میں مکتوب الیہ کی شخصیت اور کردار کی مناسبت سے ایک خوش طبع چھیڑ چھاڑ بھی ہے، گلہ و شکوہ بھی ہے، طنز بھی ہے، استہزاءِ خفی بھی ہے اور عہد کے بدلتے ہوئے سیاسی، سماجی اور ثقافتی حالات پر رائے زنی بھی۔"

"مکاتیب خضر" کے بارے میں، ہم ایک مفصل کالم لکھنا چاہتے تھے۔ لیکن اتفاق سے خود مرزا غالب نے جن کی تقلید خالد نے کی ہے، ایک خط خالد کے نام لکھا ہے جو ڈاک خانے کی غلطی سے ہمارے پاس آگیا ہے۔ مرزا غالب اور محمد خالد اختر دونوں سے معذرت کے ساتھ، ان کی اجازت کے بغیر، یہ خط ذیل میں درج کیا جا رہا ہے۔ واضح رہے کہ مرزا غالب نے اپنے خط میں جن آرا کا اظہار کیا ہے، ان سے ہمارا متفق ہونا ضروری نہیں۔

سعادت و اقبال نشاں، اخترِ فلک معنی و بیاں، محمد خالد المتخلص بہ اختر کو غالبِ خستہ کا سلام پہنچے۔ تمھاری کتاب "مکاتیب خضر" بہ سبیلِ ڈاک آئی۔ تمھارا نام نامی پہلے کبھی نہ سنا تھا۔ اس لیے تعجب ہوا کہ مجھ غریب الدیار کو تم نے کیوں شایانِ لطف گردانا۔ یہاں بہت سوں سے تمھارے بارے میں پوچھا لیکن کوئی آشنائی و آگاہی کا مدعی نہ ہوا۔ تقریظ سے کھلا کہ تم بہت بڑے ادیب ہو، ظرافت میں ید طولیٰ رکھتے ہو، یعنی عجیب و غریب ہو۔ لیکن یہ معلوم نہ ہو سکا کہ تقریظ نویس مسمی محمد کاظم کون ذات شریف ہے۔ میرے زمانے میں چھاپے کی کتاب پر تقریظ وہ لکھتا تھا

جو چاڑ دانگ عالم میں نام ور ہوتا تھا۔ اب مدح اور بھٹئی کے منصب کے لیے مادح اور بھاٹ کا مشہور ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ یہ بہرحال تقریظ کے مطالعے سے یہ معلوم ہوا کہ تم نے میرے انداز و روش میں نامہ نگاری کی کوشش کی ہے۔ اگر تقریظ میں بالصراحت یہ امر ملحوظ نہ ہوتا تو میرے لیے یہ قیاس کرنا بعید از امکان تھا کہ تم میرے مقلد ہو۔ میں نے کتاب کی ورق گردانی کی، مومن و صہبائی کو بھی دکھائی، مفتی صدر الدین آزردہ سے بھی مشورت کی لیکن یہ سب متفق اللسان ہو کر کہتے ہیں کہ تم نے جو مشقت کھینچی ہے اور جس طرح جگر خون کیا ہے، اس کا مجھ غریب کی نامہ نگاری سے کوئی تعلق نہیں۔ اس بات کو چند مثالوں سے ذہن نشین کرو۔ منشی ابن انشا کے نام کے مکتوب میں تم نے لکھا ہے: "ہاں بھئی رہتے تو تم شہر آشوب کراچی میں ہو" میں نامنجار بھلا ایسا کیوں لکھتا کہ مجھے معلوم ہے شہر آشوب رہنے کی نہیں، پڑھنے اور سننے کی چیز ہے۔ مولانا ماہر القادری کے نام کے خط میں تم نے کئی جگہ "قصہ" کی جمع "قصائص" لکھی ہے۔ لعنت ہو مجھ پر اگر میں "قصہ" کی جمع "قصص" کے سوا کچھ اور سمجھوں۔ "قصائص" از روئے لغت غلط از روئے لغویت درست۔ اسی خط میں تم لکھتے ہو: "اصل حال اب مجھ پر باز ہوا" بھائی، حال کوئی دروازہ نہیں کہ باز ہو۔ "باز" کے معنی کھلنے کے ضرور ہیں لیکن استعمال کا موقع و محل دیکھ لینا چاہیے۔ "حسن پرست" کی جمع تم "حسن پرستگان" لکھتے ہو۔ "کندہ، ناتراش" کی جگہ "ناکندہ، تراش" ارشاد فرماتے ہو۔ حیرت ہے کہ تمھیں کوئی ٹوکتا بھی نہیں۔ احمد ندیم قاسمی اور شفیق الرحمن کے تم بچپن کے یار ہو۔ دیکھو یہ دونوں کیسی عمدہ اردو لکھتے ہیں مگر بے فیض معلوم ہوتے ہیں کہ تم سے صحیح اردو لکھنے کا راز چھپا کے رکھا۔

عزیزی فیض احمد فیض کے نام کے خط میں تم لکھتے ہو: "خبر تمھارے قلم روئے روس کو مراجعت کی دیکھی۔ "میرے زمانے میں "مراجعت" کے معنی "لوٹنے" کے تھے تم نے ان معنی کو لوٹا کر "تشریف لے جانے" کے معنی میں لکھا ہے۔ یہ لغوی تصرف تمھاری زبان دانی پر دال ہے۔ "قلم رو روس" کی جگہ تم نے "قلم روئے روس" لکھا ہے۔ کسرہ اضافت کی جگہ یائے مجہول لانا، مجہولانہ فعل ہے۔ اسی خط میں تم نے ایک لفظ "خشمگی" لکھا ہے۔ یہ لفظ تم نے کس لغت میں دیکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی خود ساختہ لغت میں دیکھا ہوگا۔ ایسی بے پر کی تو صاحب برہانِ قاطع بھی نہ اڑاتا تھا۔ کیا "خشم" سے غصے کا مفہوم ادا نہیں ہوتا۔ یہ ویسے ہی ہے کہ جیسے کوئی "غصہ" سے "غصگی" بنا لے۔

بھائی! میری ان باتوں پر "غصگی" نہ کرنا۔ تمھاری کتاب کا غلط نامہ تیار کرنا مقصود نہیں۔ یہ چند باتیں محض اس لیے لکھ دی ہیں کہ تمھاری کتاب کے پڑھنے والے تمھارے لغوی تصرفات کو میری تقلید کا نتیجہ نہ گردانیں۔

تمھارے تقریظ نگار نے اطلاع دی ہے کہ تمھیں زبان اہل فرنگ سے بے حد رغبت ہے

اور یہی زبان تمہارا اوڑھنا بچھونا ہے۔ ایسی صورت میں زبان اردو سے تمہاری بے اعتنائی بعید از فہم نہیں، لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ تم اردو کی بجائے زبانِ اہلِ فرنگ میں کیوں نہیں لکھتے۔ اس زبان میں لکھنے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ تمہاری اردو کی غلطیوں پر کسی کی نظر نہیں جائے گی۔ مگر خدا کے لیے دوسروں کی زبان میں ویسے تصرفات نہ کرنا جیسے اردو میں کرتے ہو۔ صاحبانِ فرنگ کے نزدیک یہ امر نامطبوع قرار پائے گا۔

میں نے تمہاری کتاب از لوح تا تمت نہیں پڑھی کہ اب زیادہ مشقت کھینچنے اور دکھ اٹھانے کے قابل نہیں رہا تاہم کہیں کہیں سے اسے دیکھا ہے۔ باتیں بگھارنے کا ہنر تم خوب جانتے ہو۔ یہ امر مطبوعِ خاطر ہوا کہ تم نے اہلِ مذہب کا مذاق خوب اڑایا ہے۔ جو کام ہم شعرا کلام موزوں کی صورت میں انجام دیتے ہیں، وہی تم نے نثر ناموزوں میں کر دکھایا ہے۔ کل ملیح آباد کے جوش ملنے آئے تو سامنے تمہاری کتاب رکھی تھی۔ انھوں نے اسے ادھر ادھر سے دیکھا۔ مولانا احتشام الحق تھانوی اور مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام کے خط پڑھ کر بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے، یہ منشی مولویوں کی خبر خوب لیتا ہے۔ لیکن جب اپنے نام کا خط پڑھا تو ارشاد فرمایا: "اس شخص کا کوئی اعتبار نہیں، کبھی سچ بولتا ہے اور کبھی جھوٹ۔"

بندہ، روسیاہ عرض کرتا ہے کہ سچ جھوٹ کا فیصلہ کرنا تو مشکل ہے لیکن بعض لوگوں کے ساتھ تم نے جو ناملائم سلوک روا رکھا ہے، وہ اخلاق کے منافی ہے۔

بھوگ سنانے میں تمہارا جواب نہیں۔ مثلاً الطاف حسین قریشی کو مشورہ دیتے ہو کہ وہ اپنے رسالے کا نام "زندگی" کی بجائے "درندگی" رکھ لے۔ یہ خوش طبعی نہیں گزاف ہے۔ شائستگی کا اقتضا ہے کہ ظرافت اور پھکڑپن میں امتیاز کیا جائے۔

انتظار حسین کے بارے میں بھی تمہاری رائے کی اصابت مظنون ہے۔ تم اسے مشورہ دیتے ہو کہ لاہور میں رہ کر لکھنؤ کو یاد نہ کرے۔ راوی کے کنارے گومتی کو تصور میں نہ لائے۔ تم کون ہوتے ہو یہ مشورہ دینے والے۔ تمھیں کوئی تمہارے وطن بھاولپور سے زبردستی خارج کر دے تو پھر قدر عافیت معلوم ہوگی۔ مسلمانوں کو اندلس سے نکلے ہوئے صدیاں گزر گئیں۔ وہ آج تک اس کے لیے روتے ہیں۔ کیا قطب مینار اور تاج محل اور دلی کی جامع مسجد اور لکھنؤ کے قیصر باغ کے لیے چالیس پچاس برس بھی نہیں رویا جاسکتا؟ میاں! ہوش کے ناخن لو اور ایسی باتیں نہ کرو جن کا کوئی سر پیر نہ ہو۔

اور ہاں، یہ مختار مسعود سے تمھیں کیا پرخاش ہے۔ اس کا گلہ رکھتے ہو کہ اس نویسندہ، بے بدل کی کتابیں سفید چکنے کاغذ پر کیوں چھپتی ہیں اور پھر کیوں ہاتھوں ہاتھ بک جاتی ہیں۔ تم اس بے چارے کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہو۔ کہتے ہو اس نے مینار پاکستان کی جو کہانی لکھی ہے وہ خود نمائی کی داستان ہے۔ مینار پاکستان مختار مسعود کی نگرانی میں بنا تھا، کیا اسے حق نہیں کہ وہ

اپنے حوالے سے اس کی داستان بیان کرے۔ تم مشورہ دیتے ہو کہ مختار مسعود کو ان مزدوروں کا احوال لکھنا چاہیے تھا جنھوں نے اس مینار کو تعمیر کیا۔ یہ تو ویسی ہی بات ہوئی جیسے کوئی شاہ نامہ لکھنے پر فردوسی کی تعریف کرے اور تم کہو فردوسی کا کیا کمال ہے، اصل کام ان اہل حرفہ کا ہے جنھوں نے کاغذ بنایا اور روشنائی بنائی اور خامہ بنایا۔ اگر یہ چیزیں نہ ہوتیں تو فردوسی شاہ نامہ نہیں لکھ سکتا تھا۔ تم مقر ہو کہ تمھاری کتاب "کھویا ہوا افق" مہتمم مطبع کے گودام میں پڑی پڑی کرم خوردہ ہو گئی۔ اگر ایسا حادثہ مختار مسعود کی کتاب کو پیش نہیں آیا تو یہ حسد کی نہیں شکر کی جا ہے کہ کوئی نویسندہ تو محبوب خلائق ہوا۔ تم کچھ بھی کہو، مختار مسعود کی ادبی حیثیت مبطل نہیں کی جا سکتی۔ میری اس گذارش سے تم یہ نہ سمجھنا کہ مجھے مختار مسعود سے کوئی ذاتی علاقہ ہے۔ نا بھائی میرا اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ میرا شیوہ حفظ الغیب ہے۔ غائب کی تعریف کرنی کیا عیب ہے؟

ہائے ظالم! تو نے نے میرے مخدوم زادے اور خانوادہ، نواب علاء الدین علائی کے چشم و چراغ مرزا جمیل الدین عالی کو بھی نہ بخشا۔ اس کی نثر نویسی کے بارے میں ایسا زہر اگلا ہے کہ میری طبیعت منغض ہو گئی۔ ایسی حالت تو کبھی خود عالی کی نثر پڑھتے ہوئے بھی نہیں ہوئی۔ میاں! کیوں ناسپاسی و حق ناشناسی کرتے ہو، دل سے مہر و آزرم کو نکالتے ہو۔ شنید ہے کہ تمھاری اس کتاب پر جو مہتمم مطبع کے گودام میں پڑی پڑی کرم خوردہ ہو گئی تھی، عالی نے گلڈ کا انعام دلوایا تھا اس نیکی کا اجر اس بے چارے کو خوب ملا۔

اچھا اب اجازت دو۔ کوئی بات بری لگے تو معاف کر دینا مگر خدا کے لیے انتقام کے خیال سے میرے انداز تحریر میں کوئی اور کتاب نہ لکھ دینا۔ میری جان! اپنا راستہ الگ نکالو تا کہ تمھارے لکھے کو دیکھ کر لوگ یہ کہیں کہ ابداع اس کو کہتے ہیں، جدت طرز اس کا نام ہے۔ اگر ایسا نہیں کرو گے تو تمھاری تحریر دیکھنے والے یہی کہیں گے کہ یہ چاہِ بے آب ہے۔ ابرِ بے باراں ہے نخلِ بے میوہ ہے۔ خانہ، بے چراغ ہے۔ چراغِ بے نور ہے۔

اپنے کرم فرماؤں سے نجات کا طالب

غالب

(۳/ اگست ۱۹۸۹ء)

(بشکریہ "خامہ بگوش کے قلم سے")

======== ○○○ ========

مشفق خواجہ

دامنِ یوسف یا دامنِ تار تار

فیض احمد فیض بلاشبہ اردو کے مقبول ترین شاعروں میں سے ہیں۔ غالب و اقبال کے بعد وہی ایک شاعر ہیں جنھیں بر صغیر پاک و ہند سے باہر بھی جانا اور پہچانا جاتا ہے۔ فیض کی مقبولیت کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہوگا کہ ان سے نظریاتی اختلاف رکھنے والے بھی ان کے شعروں، مصرعوں اور شعری ترکیبوں کو اس طرح استعمال میں لاتے ہیں جیسے یہ مال غنیمت ہو۔ فیض کے کلام کو مال غنیمت سمجھنے والوں میں، ہم بھی شامل ہیں۔ بلکہ ہم نے تو ہمیشہ خود فیض صاحب کو بھی مال غنیمت سمجھا اور ان کے بارے میں بیسیوں "سخن گسترانہ" کالم لکھے۔ فیض صاحب سے ہمیں نیاز مندی کا شرف حاصل تھا۔ ہمارے بہت سے کرم فرما ہمارے کالموں کے حوالے سے فیض صاحب کے کان بھرتے تھے لیکن مرحوم نے ان باتوں کو کبھی در خور اعتنانہ سمجھا اور ہمیشہ ہم سے محبت اور شفقت سے پیش آتے رہے اور یوں ہمیں فیضیات میں مضامین نو کے انبار لگانے کے مواقع ملتے رہے۔

فیض کے انتقال کے بعد ہم نے ان کے بارے میں کبھی کچھ نہیں لکھا۔ فیض پر لکھنے کا مزہ تو ان کی زندگی میں ہی تھا۔ مگر آج ہم اپنی اس روایت کو توڑ رہے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اس وقت ہمارے سامنے ایک ایسی کتاب ہے جسے پڑھنے کے دوران احساس ہوا جیسے فیض صاحب ہمارے درمیان موجود ہوں اور ہم انھیں چلتے پھرتے ہی نہیں دوسروں کو ہنسلاتے بھی دیکھ رہے ہوں۔ فیض پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور آئندہ بھی بہت کچھ لکھا جائے گا لیکن اس وقت جو کتاب ہمارے سامنے ہے، اس کے بارے میں، ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ ایسی کتاب کبھی نہیں لکھی گئی اور شاید آئندہ بھی نہ لکھی جائے۔

اس کتاب کا نام ہے "دامنِ یوسف" اور یہ تالیف لطیف ہے محترمہ سرفراز اقبال کی۔ محترمہ نے اپنے نام فیض کے خطوں کو ان کے پس منظر کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس طرح یہ کتاب ان کی آپ بیتی کی صورت اختیار کر گئی ہے، ایک ایسی آپ بیتی جسے فیض کی سوانح حیات کا ایک باب بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس کتاب کا آغاز فیض کے اس معنی خیز شعر سے ہوتا ہے:

عشق دل میں رہے تو رسوا ہو
لب پہ آئے تو راز ہو جائے

محترمہ سرفراز اقبال کون ہیں؟ زیر نظر کتاب میں شامل خطوں کے حوالے سے عرض ہے کہ وہ ایک ادب نواز خاتون ہیں جن کے ہاں شاعروں، فن کاروں اور دوسرے معززین کی آمد و

رفت رہتی ہے ۔ ان کا دولت خانہ ادب و فن کا مرکز ہے ۔ محترمہ کے ہاں کی محفلوں کا تذکرہ ابنِ انشا نے اپنے ایک خط میں کیا ہے جو اسی کتاب میں شامل ہے ۔ وہ لکھتے ہیں: "آپ کو محفل آرائی اور دوست نوازی اور دیگر آرائیوں اور نوازیوں سے فرصت نہیں تھی تاہم ،ہم کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہے..... آپ کے سیول اور ملٹری دوستوں کا کیا احوال ہے ۔ افسوس کہ آپ کا گھر چھوٹا ہے لیکن سامنے کا پلاٹ خالی ہے ۔ وہاں شامیانے لگوا کر ہر روز صبح کو آپ کو اپنا دربار بھی منعقد کرنا چاہیے اور نذریں وصول کرنی چاہئیں اور خلعت و انعام تقسیم کرنے چاہئیں ۔ حد ہے اتنے دنوں سے وہ جگہ خالی ہے اور آپ لوگوں نے اس پر قبضہ کرکے اسے کچّی آبادی نہیں بنایا جو کبھی نہ کبھی تو مستقل ہوتی" ۔

محترمہ نے خود اپنا تعارف ان لفظوں میں کرایا ہے: "بعض اوقات میں سوچتی ہوں کہ یہ دوستی، محبت، عشق ،چاہت یہ سب کیا ہے لیکن مجھے اعتراف ہے کہ مجھے اس کی حقیقت سمجھ میں نہیں آسکی ۔ ممکن ہے بہت سے دوست یا لوگ اسے میری کمزوری تصور کریں مگر یہ حقیقت ہے کہ میں اس کے باوجود ان لفظوں کی معنویت کے اعتبار اور وقار پر پورا الیقین رکھتی ہوں ۔ ان باتوں کے بارے میں سوچنا اور سننا اچھا لگتا ہے ۔ میری خواہش ہے کہ یہ لفظ کاش کبھی مجسم ہوکر مجھ سے ملنے آئیں ، میں انھیں اپنے کمرے میں بٹھا کر دروازے کی چٹخنی چڑھا دوں اور پھر ان کی باتیں سنوں، سنتی جاؤں، سنتی ہی جاؤں، حتیٰ کہ سننے سنانے کے لیے کچھ باقی نہ رہے ۔آوازیں ختم ہوجائیں، کمرہ خالی رہ جائے" ۔(ص ۱۰۷))

وہ بقول خود، اسی قسم کی باتیں سوچتے ہوئے فیض کو خط لکھا کرتی تھیں اور اسی خط نگاری کے نتیجے میں زیرِ نظر کتاب وجود میں آئی، اور یہ کتاب بھی اس لائق ہے کہ دروازے کی چٹخنی چڑھا کر پڑھی جائے ۔

محترمہ پہلی مرتبہ احمد فراز کے ذریعے فیض صاحب سے متعارف ہوئیں ۔ فون پر بات چیت ہوئی ۔ وہ اس پہلی بات چیت میں فیض سے کہنا چاہتی تھیں: "مرے قاتل مرے دل دار مرے پاس رہو " مگر نہ کہہ سکیں ۔ (شاید اس لیے کہ کہیں احمد فراز یہ نہ سمجھے کہ روئے سخن اس کی طرف ہے ۔) اس غائبانہ ملاقات کا محترمہ پر کیا اثر ہوا، اس کا اندازہ ان الفاظ سے کیجیے : "فیض صاحب کا فون ریسیو کرنے کے بعد میری اس روز کی حالت کوئی نہیں جانتا ۔ اپنی باتوں اور اپنے انداز سے فیض صاحب مجھے کتنے معصوم لگے تھے اور میرا جی چاہا تھا کہ میں باہر صحن میں بیٹھ کر شگفتہ پھولوں اور معصوم چڑیوں کو دیکھتے ہوئے ساری عمر گزار دوں یا پھر اڑتے بادلوں کی نرماہٹ سے اپنے مکان کی دیواروں پر اتنی بار فیض صاحب کا نام لکھوں کہ دیواریں اور بادل دونوں ختم ہوجائیں ۔" (ص ۲۰)

بادلوں کی نرماہٹ سے دیواروں پر کسی کا نام لکھنا ایک نیا اور اچھوتا خیال ہے ۔ بلاشبہ

فیض بہت بڑے شاعر تھے لیکن خیال کی ایسی ندرت تو ان کے کلام میں بھی نہیں ملتی۔
کچھ عرصے بعد کراچی میں پہلی ملاقات ایک ہوٹل میں ہوئی۔ اس کے بعد خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ دوسری ملاقات پشاور کے ایک ہوٹل میں ہوئی جہاں احمد فراز محترمہ کو اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ اس ملاقات کا حاصل یہ مصرع تھا جو فیض نے ایک کاغذ پر لکھ کر اور اپنے دستخط کر کے محترمہ کو پیش کیا:

فراز اوج پہ پہنچے تو سرفراز ہوئے

محترمہ کا بیان ہے کہ: "فراز آج تک اس مصرع کی تاب نہ لاسکا۔" اس ملاقات کا محترمہ پر جو اثر ہوا، وہ انھیں کے الفاظ میں یہ ہے: "اگلے روز میں راولپنڈی واپس پہنچی تو فیض صاحب میرے لیے اس روشن ستارے کی مانند تھے، اندھیری رات کے مسافر جس سے رہنمائی حاصل کر کے منزلوں سے قریب تر ہوتے ہیں۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ جب بھی مجھے کوئی مشکل ہوگی میں ان سے ضرور مشورہ کروں گی کیوں کہ یہ وہ شخص ہے جو مجھے یوں محسوس کر سکتا ہے جیسے میں خود کو محسوس کرتی ہوں"۔ (ص ۲۵)

اس کے بعد خطوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ بیچ بیچ میں محترمہ کی باتیں بھی جاری رہتی ہیں۔ کہیں وہ کسی خط کا پس منظر پیش کرتی ہیں کہیں کسی غیر واضح جملے کی تشریح کرتی ہیں، کبھی فیض صاحب سے اپنی کسی ملاقات کی تفصیل بیان کرتی ہیں۔ انداز بیان اتنا خوب صورت ہے کہ کہیں کہیں تو فیض کی شاعری محترمہ کی نثر کے سامنے ماند پڑتی نظر آتی ہے۔ محترمہ کی عقیدت اس حد تک بڑھی ہوئی ہے کہ وہ فیض کے بعض سرسری اور بے مزہ خطوں کو بھی اپنی توضیح و تشریح سے ادب پارہ بنا دیتی ہیں۔

اس کتاب میں فیض کے کل ۵۶ خطوط ہیں۔ چند خط محترمہ کے بچوں کے نام ہیں لیکن ان میں بھی روئے سخن محترمہ ہی کی طرف ہے۔ تین چار کے علاوہ باقی سب خط مختصر ہیں لیکن ان کے اختصار میں ایک جہان معنی نظر آتا ہے۔ ابتدائی دو چار خط "عزیزی" سے شروع اور "فقط" پر ختم ہوتے ہیں۔ ان کے بعد کے خطوں کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کہاں سے شروع اور کہاں ختم ہوتے ہیں۔ پڑھنے والا ان کی ابتدا سے پہلے اور اختتام کے بعد بھی بہت کچھ پڑھ سکتا ہے اور بین السطور میں جو کچھ ہے، اس سے استفادہ کرنے کے لیے چشم بینا کی نہیں ذہن رسا کی ضرورت ہے۔ ان خطوں میں کیا کچھ ہے، اس کا کچھ اندازہ ذیل کے اقتباسات سے کیجیے:

"جو تم نے لکھا ہے، کیفیت اپنی بھی کچھ ویسی ہی ہے۔ یعنی جہاں تک بد عادتوں کا تعلق ہے، تمھاری عادت ہمیں بھی کچھ اتنی پڑ چکی ہے کہ آنکھ کھلتے ہی، صبا کے ہاتھ میں نرمی ہے ان کے ہاتھوں کی، کا مضمون ذہن میں آتا ہے"۔ (ص ۶۱)

"... تمھارے لیے اچھی بات یہی ہے کہ ہم تمھیں ٹکٹ بھجوا دیتے ہیں، تم میاں سے مہینے

بھر کی چھٹی لے کر ہمارے پاس آجاؤ اور ہم ضمانت دینے کو تیار ہیں کہ تمھیں صحیح و سالم واپس کر دیں گے۔" (ص ۶۶)

"تم نے ہمیں ٹی وی پر دیکھ لیا لیکن ہم کیسے دیکھیں۔ شاعر لوگ کہتے ہیں کہ دل میں تصویر رکھنی چاہیے اور، جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی۔ اس سے زیادہ آرام دہ صورت تو یہی ہے کہ بار بار گردن جھکانے کے بجائے تصویر کہیں سامنے ہی رکھ لی جائے، لیکن وہ تو تصویر ہوئی، اس سے بات کیسے کی جائے یا اس کی آواز کیسے سنی جائے" ۔(ص ۸۸)

"تمھارا کہنا غلط ہے کہ تمھیں ملاقات کی ہم سے زیادہ طلب ہے۔ تمھارے پاس تو پھر بھی وہاں دل لگی کا بہت سا سامان موجود ہے (خواہ اس سے کچھ نہ کچھ گڑبڑ کیوں نہ ہوتی رہے) یہاں تو یادوں کے سوا کچھ نہیں ہے... اسی وجہ سے ہم دامن چھڑا کر ادھر ادھر نکل جاتے ہیں لیکن وہاں وہ چیز تو نہیں ملتی جو پہلے نمبر ۱۰۴ اور اب سنا ہے کہ کسی نئے تاج محل میں ہے" ۔(ص ۹۱) (محترمہ کے پرانے مکان نمبر ۱۰۴ تھا، نئے تاج محل سے مراد نیا مکان ہے)

"ہم نے تمھاری عادتیں بگاڑ دی ہیں تو یہی شکایت یہاں تم سے بھی ہے اور اسی بگاڑ کی وجہ سے اپنا کمرہ اور اپنا بستر زیادہ یاد آتا ہے" ۔(ص ۹۵)

"کراچی سے روانگی سے پہلے تمھاری آواز سن کر خوشی ہوئی۔ تمھارا بہت ہی اچھا خط بھی ملا تھا۔ ہم کبھی کسی کا خط رکھتے نہیں ہیں لیکن یہ میں نے رکھ لیا ہے تاکہ سند رہے اور تم بھاگ نہ سکو" ۔(ص ۱۱۴)

ان اقتباسات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ فیض کی عادتیں کس حد تک "بگڑ" چکی تھیں اور آخری اقتباس سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ محترمہ کے خطوط بنام فیض ادب عالیہ کا نمونہ تھے۔ افسوس کہ فیض نے نہ جانے کن اندیشہ ہائے دور دراز کی وجہ سے محترمہ کے سارے خطوط ضائع کر دیے اور ایک خط جو بطور سند کے یا محترمہ کو "بھاگنے" سے روکنے کے لیے محفوظ رکھا تھا وہ بھی معلوم نہیں اب کہاں ہے۔ کاش محترمہ اپنے خطوں کی نقلیں اپنے پاس رکھ لیتیں تو ان کی شمولیت سے کتاب دو آتشہ بلکہ سہ آتشہ ہو جاتی۔ سہ آتشہ اس لیے کہ ایک آگ پڑھنے والے کے دل میں بھی تو بھڑک اٹھتی!

فیض کی شاعری میں "رشک" کا مضمون ذرا کم ہی نظر آتا ہے۔ وہ اتنے فراخ دل ہیں کہ رقیب سے مفاہمت کر لیتے ہیں۔ یعنی سانجھے کی ہنڈیا کے چٹخارے لیتے ہیں۔ لیکن ان خطوں میں معاملہ برعکس ہے۔ ذرا دیکھیے غالب کی طرح فیض کس کس انداز سے "رشک" کا مضمون باندھتے ہیں، رقیبوں پر نظر رکھنے کے لیے جاسوس مقرر کرنے کی سوچتے ہیں:

"تمھیں نیا گھر مبارک ہو۔ یہ افسوس ضرور ہے کہ ہم نے نہیں دیکھا... اس میں ہمارا کوئی کمرہ ہو گا۔ خیر کبھی وہ بھی ہو جائے گا لیکن اگر تمھارا ریٹائر ہونے کا ابھی ارادہ نہیں تو اس

دوران میں کیا ہو گا۔ خالد سعید بٹ کو لکھتے ہیں کہ جاسوسی کے فرائض انجام دے۔" (ص ۵۷)

"تم نے ہمارے دوست میر (علی احمد تالپور) صاحب کو بھی دریافت کر لیا۔ بھلا تم سے کوئی کیسے بچ سکتا ہے۔ لیکن کسی خوب صورت عورت کو میر صاحب کی رکھوالی میں دینا تو گوشت اور بلی والا معاملہ ہے۔" (ص ۸۲)

"غلط قسم کے دوست چننے میں جو تمھیں مہارت حاصل ہے، اس کا کچھ علاج ضرور ہونا چاہیے۔ مسکرا کر خیر مقدم کرنے تک تو ٹھیک ہے، لیکن اگر مسکرانے کا انداز ہی ایسا ہو کہ..... کسی کے دل میں لڈو پھوٹنے لگیں تو اس میں کسی کی کیا خطا۔ اس کے جواب میں تم کہو گی کہ ہم کیا کریں، ہماری صورت ہی ایسی ہے، تو وہ بات بھی ٹھیک ہے" ۔(ص ۱۰۳)

"رشک" کے معاملے میں محترمہ بھی فیض سے کم نہیں۔ فیض نے ایک خط میں کسی خاتون سے ملاقات کا ذکر کیا، اس کی باتیں انھیں پسند آئیں اور ان باتوں پر ایک گیت لکھ دیا۔ یہ گیت انھوں نے محترمہ کو بھیجا۔ محترمہ نے لکھا: "میں بھی تو باتیں کرتی ہوں" ۔ اس کے جواب میں فیض لکھتے ہیں: "تم نے چاہنے والوں کا ذکر کیا ہے، وہ تو ہیں اور اللہ انھیں خوش رکھے، لیکن ہر کسی سے تو وہ کچھ نہیں مانگ سکتے، نہ مل سکتا ہے جو حسن اتفاق سے وہاں میسر آگیا تھا اور جس کی طلب ہمیشہ کی طرح باقی ہے۔ تم نے لکھا تھا کہ تم بھی تو باتیں کرتی ہو اور شاید اسی وجہ سے اچھی لگتی ہو۔ تم اچھی ضرور لگتی ہو، لیکن اس میں باتیں کرنے کے علاوہ اور چیزوں کو بھی دخل ہے" ۔ (ص ۴۰)

خطوں کی توضیحی عبارتوں میں محترمہ نے بھی جگہ جگہ شاعری کی ہے۔ مثلاً:

"میرا جی چاہتا تھا کہ فیض صاحب مجھ سے ملیں تو میں ان کو یہ خط واپس کر دوں... لیکن میں ایسا نہ کر سکی۔ کر ہی نہیں سکتی تھی۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ بھلا کوئی شخص چودھویں کے چاند کو کیسے کہہ سکتا ہے کہ تم اپنی چاندنی کا یہ حصہ واپس لے لو جو ندی کے پانی کی بجائے اداس ہوا میں تیرتا جا رہا ہے" ۔(ص ۲۹)

"فیض صاحب کی شخصیت دراصل اب میرے لیے اس سنگ میل کی طرح تھی، زندگی کے سارے راستے جس سے ہو کر گزرتے ہیں۔"

"فیض کو الوداع کر کے.... جہاز کو دیکھ کر میں نے بے ساختہ ہاتھ ہلایا، مجھے اپنا وجود جہاز کے پیچھے اڑتا ہوا محسوس ہوا۔ اس وقت میرا جی چاہا میں بھی ایک پرندہ ہوتی.... " (ص ۵۷)

(یکم مارچ ۱۹۸۹ء)

(۲)

دامن یوسف فیض کے سدا بہار خطوں کا مجموعہ ہے۔ فیض شاعری میں نئی طرز سخن کے

موجود تھے ہی، نثر میں بھی انھوں نے ایک نئے انداز و اسلوب کی بنیاد رکھی ہے۔ کوئی تعجب نہیں، آگے چل کر، غالب کی طرح فیض بھی اپنی شاعری کے ساتھ ساتھ زیر نظر خطوں کے حوالے سے یاد رکھے جائیں۔ فرق یہ ہے کہ غالب:

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو

پر عامل تھے۔ فیض کا کوئی خط اور خط کا کوئی جملہ بھی بغیر "مطلب" کے نہیں ہے غالب نے خط دل لگا کر لکھے تھے، فیض نے خطوں میں اپنا دل نکال کر رکھ دیا ہے۔

اوپر کہیں ہم نے عرض کیا ہے کہ اس مجموعے میں محترمہ سرفراز اقبال کے بچوں کے نام فیض کے جو دو چار خط ہیں، ان میں بھی روئے سخن محترمہ ہی کی طرف ہے۔ اس اجمال کی تفصیل ملاحظہ فرمائیے۔ ایک بچے نے اپنے خط میں محترمہ کے حوالے سے فیض صاحب کو بے وفائی کا طعنہ دیا۔ ماشاء اللہ کتنا سمجھ دار اور معاملہ فہم بچہ ہے! اس کے جواب میں وہ فرماتے ہیں: "امی سے کہہ دینا یہ بے وفائی نہیں دنیا داری ہے"۔ (ص ۳۲) ایک اور خط میں ارشاد ہوتا ہے: "امی کے خط مل گئے ہیں تم جواب میں ہماری طرف سے پیار کر لینا"۔ (ص ۴۴) اسی طرح یہ جملہ بھی بیک وقت خوشی اور غم کا آئینہ دار ہے: "تم نے امی کا جو حال لکھا ہے، اسے پڑھ کر کچھ اداس بھی ہوں، لیکن دل کچھ خوش بھی ہوا کہ ہمیں کوئی یاد تو کرتا ہے"۔ (ص ۶۰)

فیض بچوں کی نفسیات سے پوری طرح واقف ہیں اور ان سے انھیں کی سطح پر آکر باتیں کرتے ہیں: "امی سے تم نے مقابلہ کب سے شروع کیا ہے۔ تم نے خود ہی لکھا ہے کہ وہ کبھی کبھی یاد کر کے رو بھی دیا کرتی ہیں لیکن تم نے کتنے آنسو بہائے ہیں؟" (ص ۶۲)

فیض کے خطوں پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے لیکن ابھی ہمیں ابن انشا اور سید سبط حسن کے خطوں کا ذکر بھی کرنا ہے، اس لیے فیض کے خطوں کی صرف ایک اور خصوصیت بیان کرنے پر اکتفا کی جاتی ہے اور وہ ہے ان کا مزاحیہ انداز۔ ایک مرتبہ محترمہ حج کر کے آئیں تو فیض نے انھیں لکھا: خوشی کی بات یہ ہے کہ تمھارے نو سو تو پورے ہو گئے۔ اب اگلے نو سو ہونے تک تمھیں کافی لمبی چھٹی ہے۔" (ص ۱۰۸) اپنی اور محترمہ کی عمروں کے حوالے سے یوں گل افشانی ہے: "تمھیں ابھی سے اپنی عمر کی فکر کیوں ہونے لگی۔ ابھی تو.... تمھیں اپنے دامادوں کو رام کرنا ہے اور تمھاری یہی صورت رہی تو ان کی اولادوں کو بھی۔ البتہ ہمیں اب کبھی کبھی یہ خیال ضرور آنے لگا ہے کہ اس عمر میں دنیا والوں سے منھ موڑ کر اللہ اللہ کرنا چاہیے لیکن تم جیسے لوگ یہ کرنے ہی نہیں دیتے۔ بلکہ اب ہم دہلی گئے تو تم جیسے لوگوں میں ایک آدھ کا اور اضافہ ہو گیا۔ اگرچہ یہ بات تم سے نہیں کرنی چاہیے۔" (ص ۸۸)

محترمہ جب پہلی مرتبہ نانی اماں بنیں تو فیض صاحب نے جو برسوں پہلے نانا ابا بن چکے تھے، انھیں مبارک باد کا خط لکھا۔ یہ خط نانا نانی کے باہمی ربط کی خوب صورت عکاسی کرتا ہے:

"..... آپ خدا کے فضل سے نانی اماں بن چکی ہیں مبارک ہو۔ میرے خیال میں اب تم اپنے لیے ایک گرینڈ مدر، کابج، بنوالو جو بہ وقت ضرورت سامنے لگا لیا کرو لیکن خیر نانی پن سے تم میں کیا فرق آئے گا۔ البتہ اب ہم واقعی ریٹائر ہونے کی سوچ رہے ہیں۔ اس سے پہلے کچھ دن تمھارے ساتھ گزار لیتے تو اچھا تھا"۔ (ص ۱۰۳)

مختصر یہ کہ فیض کے خط بہت اہم ہیں۔ اردو کے پس ماندہ اور درماندہ محققین کے لیے یہ ایک نیا موضوع ہے، اب وہ برسوں ان خطوں پر تحقیق کرتے رہیں گے۔ خود محترمہ کے نزدیک ان خطوں کی اہمیت کیا ہے، اس کا اندازہ ان کے ان الفاظ سے کیجیے: "میں جب فیض صاحب کے ان خطوں، ان کی باتوں، ان کے لفظوں اور ان کے پس منظر میں سانس لیتے جذبوں کو اپنی ذات کے حوالے سے دیکھتی ہوں تو یہ سب مل کر مجھے میرے ہونے کا احساس دلاتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے جیسے ابدی ہجرت میں یہی میرا زاد سفر ہوگا اور کبھی کبھی تو میرا یہ گمان ایمان کا روپ دھار لیتا ہے کہ جب میری روح مکاں سے لامکاں کی وسعتوں میں تحلیل ہو رہی ہوگی تو حد نظر پر کسی مقدس سمت سے اچانک کوئی خوش بو دھنک رنگ لہجے میں سرگوشی کرے گی۔ ارے بھئی میرے خط کہاں ہیں؟ وہیں دنیا میں چھوڑ آئی ہو۔۔۔۔ کیا ایسا ممکن ہے؟ کاش ایسا ممکن ہو۔" (ص ۱۸۸)

فیض کے خطوں کے اس مجموعے میں ابن انشا اور سید سبط حسن کے بھی چند خطوط شامل ہیں۔ ممکن ہے ان دونوں کے اور خطوط بھی ہوں جو الگ الگ مجموعوں کی صورت میں شائع ہوں۔ زیر نظر کتاب میں صرف وہی خطوط ہیں جن کا تعلق فیض صاحب سے ہے۔ پہلے ذرا ابن انشا کی استادانہ نثر کے کچھ نمونے ملاحظہ فرمائیے:

"فیض صاحب کے واپس آجانے کا اور وہاں موجود ہونے کا یہ مطلب تو نہیں کہ اور کوئی باقی نہیں رہا۔ سورج اپنی جگہ، چاند اپنی جگہ، چھوٹے موٹے ستارے اپنی جگہ۔ بعض ایسی راتیں بھی ہوتی ہیں کہ سورج ہوتا ہے نہ چاند ہوتا ہے۔ بس ستاروں کو دیکھ کر اور گن کر دل بہلانا پڑتا ہے بلکہ گننے اور دل بہلانے کے لیے ستارے زیادہ اچھے رہتے ہیں۔ سورج صرف ایک ہے، چاند بھی ایک ہے اسے کوئی کہاں تک گنے گا؟" (ص ۳۶)

"اس دور الفت میں دیکھنا اپنے ہاتھ وغیرہ نہ کٹا لینا۔ یہ ہر قسم کی چوری پر کاٹا جاسکتا ہے۔ سینہ زوری پر دونوں کٹنے چاہئیں۔" (ص ۳۷)

"...... اب تو میرا تعارف اس حیثیت سے کرایا جاتا ہے کہ ان سے ملو، یہ معمولی آدمی نہیں ہیں، یہ بیگم سرفراز اقبال کے جاننے والیں ہیں۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ جب اس شخص کا نام فیض، قدرت اللہ شہاب وغیرہ کی فہرست میں آتا ہے تو یہ بھی کچھ تو ہوگا۔ ایسے ویسے کو تو بیگم اقبال منھ لگانے سے رہیں۔ میں آپ کا Fan ہوں۔" (ص ۳۹)

ابن انشا تو خیر مزاح نگار تھے، ان سے اس قسم کی باتیں غیر متوقع نہیں لیکن خدا جانے سید

سبط حسن جیسے سنجیدہ آدمی کو کیا ہوا کہ انھوں نے فیض صاحب کے انتقال کے فوراً بعد ان کی "متروکات سخن" کو "متروکات منقولہ" سمجھ کر قبضہ کرنے کی ٹھانی۔ انھوں نے فیض کے انتقال پر تعزیت بھی محترمہ ہی سے کی۔ تعزیتی خط کے یہ الفاظ قابل توجہ ہیں: "میرے اچھے دوست! محبت، بہت لطیف، بہت پاکیزہ جذبہ ہے۔ لیکن بہت کم لوگ ہیں، قدرت جن کو یہ جذبہ عطا کرتی ہے۔ وہ ساری عمر گزار دیتے ہیں۔ نہ کسی سے محبت کر پاتے ہیں نہ کوئی ان سے محبت کرتا ہے مگر آپ تو ان خوش قسمت اور خوش خصلت انسانوں میں سے ہیں جن کو محبت کرنا آتا ہے۔ مجھ کو کبھی کبھی فیض صاحب پر رشک آتا تھا، ان کو کتنا پیار اچاہنے والا ملا ہے۔ مگر وہ تو خود بہت ٹوٹ کر پیار کرتے تھے۔ مجھ میں وہ دل داری کی صلاحیت کہاں، لیکن کوشش کروں گا کہ آپ کے غموں کو، جہاں تک ممکن ہو، ہلکا کر دوں یا بانٹ لوں۔" (ص ۱۲۱)

سید صاحب نے غموں کو ہلکا کرنے یا بانٹنے کی بات محض تکلفاً نہیں لکھی۔ وہ واقعی غم کی تصویر بن گئے۔ "میری مہربان دوست! خوش رہو۔ مگر تم بتاؤ یہ کوئی دوستی ہوئی کہ نہ خط نہ ٹیلی فون نہ تصویریں جن کا تم نے وعدہ کیا تھا۔ اب میں صبح شام اپنے ڈاک کے ڈبے کھولتا ہوں کہ شاید تمھارا کوئی خط ہو مگر ناکامی ہوتی ہے۔ پھر بھی، ہم فیض صاحب کا احسان کبھی نہ بھولیں گے جن کی بدولت تم سے ملنا نصیب ہوا، ورنہ اتنے بھرے دربار میں اس فقیر گوشہ نشین کی رسائی محال تھی۔ کئی دن سے تم بہت یاد آرہی ہو۔ کل جی بہت گھبرایا تو "نسخہ ہائے وفا" کی ورق گردانی شروع کر دی۔ پھر شعر گنگناتے گنگناتے کچھ مصرعے بننے لگے۔ بس تک بندی کی ہے اور شاعری کا خون کیا ہے۔ بہر حال جس کی یادوں نے یہ الٹے سیدھے شعر کہلوائے ہیں اس کی نذر ہیں۔" (ص ۲۲۴)

سید سبط حسن اور شاعری؟ جی ہاں انھوں نے شاعری بھی کی ہے۔ ان کی زندگی کی پہلی اور آخری نظم ایک ادبی "شاہ کار" ہے۔ یہ نظم ملاحظہ فرمایئے اور اس کی داد دیجیے کہ سید صاحب نے بارھویں مصرعے میں محترمہ کا نام کس خوب صورتی سے استعمال کیا ہے:

میرے محبوب کے ہونٹوں کے مٹھاس
میرے محبوب کے ہونٹوں کی حرارت
لبِ گویا! تری شیرینیِ گفتار کہاں سے لاؤں؟
تیرا اندازِ تکلم، جس سے خوش بوئے وفا آتی ہے
چاہت کی مہک، پیار کے پھول
الفت و مہر کا مژدہ لائے،
عہد و پیمان کا نغمہ جن کو
میرے کانوں نے سنا، میری آہوں نے سنا
اور قلبِ مضطر نے تسلی پائی

میرے غم خانے میں یہ کون آیا
آیا اور درد کا درماں بن کر
مجھ کو سرفراز کیا
خوشبوؤں کا در باز کیا

اور اب یادوں کی سب رنگ دھنک
تجدیدِ ملاقات کا ارماں بن کر
ان کی بانہوں کی طرح
میری فرقت کے شب و روز کو
اپنی آغوش محبت میں سکوں بخشتی ہے

فیض صاحب نے اپنے خطوں میں نثر میں شاعری کی ہے۔ سید صاحب نے شاعری میں نثر لکھی ہے۔ پہلے کام کی طرح یہ کام بھی بہت مشکل ہے۔

سید صاحب نے محترمہ کو خوش کرنے کے لیے اپنے ایک خط میں بیگم ایلس فیض کو ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا ہے: "ایلس کی بے رخی کا شکوہ فضول ہے۔ وہ فیض صاحب کی کسی چاہنے والی کو پسند نہیں کرتیں بلکہ اپنا رقیب سمجھتی ہیں۔ یہ ان کا احساس کمتری ہے جس کا کوئی علاج نہیں۔ آپ اپنا دل میلا نہ کریں۔" (ص ۱۲۱)

محترمہ ایلس فیض کی نظر سے جب یہ الفاظ گذریں گے تو انھیں رنج ہو گا کہ فیض کا ایک اتنا قریبی دوست ان کے بارے میں کیا رائے رکھتا تھا۔ ہماری دلی ہمدردیاں بیگم فیض کے ساتھ ہیں لیکن ہماری ہمدردیوں سے کیا ہوتا ہے! سنا ہے بیگم سرفراز اقبال کے پاس فیض کے کئی اور قریبی دوستوں کے خطوط بھی ہیں۔ جب یہ خطوط شائع ہوں گے تو معلوم ہو گا کہ فیض کیسے کیسے دوستوں کے درمیان زندگی بسر کر گئے!

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ کتاب کا نام "دامن یوسف" کی بجائے "دامن تار تار" ہونا چاہیے کیوں کہ اس کے ہر صفحے پر "دست زلیخا" کی کارفرمائیاں نظر آتی ہیں۔ ہمیں اس رائے سے اتفاق نہیں۔ اس کتاب میں پاکی داماں کی حکایت بیان کی گئی ہے، اس لیے وہی نام درست ہے جس نام سے یہ کتاب چھپی ہے۔ ویسے بھی نام میں کیا رکھا ہے۔ اصل چیز تو فریقین کا طریقۂ واردات ہے اور پڑھنے والوں کو اسی سے سروکار رکھنا چاہیے۔

ایک قاری نے یہ شکایت کی ہے کہ کتاب کی قیمت بہت زیادہ ہے۔ صرف ۱۲۶ صفحات ہیں اور قیمت ۷۰ روپے ہے۔ ناشر نے زیادہ صفحات کا تاثر دینے کے لیے کتاب کے آخری چار

(بقیہ صـ۲۱۳ پر)

گم شدہ تحریریں

مرتّب: نیّر مسعود

۱۔ لال بخار

("افسانۂ نادر جہاں": فخر النسّاء نادر جہاں بیگم بہ اصلاح مرزا عبّاس حسین ہوش لکھنوی)

۲۔ پریم چند کی آہٹ

("شریف زادہ": مرزا محمد ہادی رسوا)

۳۔ بڑے میاں

("جعفری خانم": خواجہ محمد عبد الرؤف عشرت لکھنوی)

۴۔ قیدِ یاغستان

(محمد اکرم)

۵۔ اسمِ اعظم

(کاظم)

نیر مسعود

گم شدہ تحریریں

سوغات (دورِ جدید) کے مقاصد میں ایک مقصد یہ بھی ہے کہ آج کے پڑھنے والوں کو ہمارے ان لکھنے والوں سے واقف کرایا جائے جنھیں زمانے نے قریب قریب بھلا دیا ہے یا کم از کم ان کی ادبی اہمیت کا صحیح اندازہ نہیں کیا ہے۔ سوغات کے کئی خصوصی مطالعے اسی مقصد کے پیشِ نظر تیار کیے گئے ہیں (رفیق حسین، محمد خالد اختر، محمد علی ردولوی)۔ یہ ایک ضروری کام ہوا ہے۔ ایک اور ضروری کام یہ ہے کہ ماضی کی ان نثری تحریروں کو شائع کیا جائے جو اپنے اسلوب (اور کسی حد تک موضوع) کی وجہ سے خصوصی توجہ کی مستحق تھیں، لیکن ہم نے انھیں گم کر دیا ہے۔ ایسی تحریروں کی بازیافت ہم کو نہ صرف اپنے ادبی ورثے کی اہمیت اور تنوع کا احساس دلا سکتی ہے بلکہ یہ تحریریں ہمارے لیے اردو نثر کے قابلِ تقلید نمونوں کا کام بھی کر سکتی ہیں اور ان کے غائر مطالعے کی مدد سے ہم نثر لکھنا سیکھ سکتے ہیں۔ اس خیال کے تحت ان اوراق میں پانچ ایسی تحریریں پیش کی جا رہی ہیں۔

(۱)

لال بخار ("افسانہ، نادر جہاں": فخر النسا نادر جہاں بیگم بہ اصلاح مرزا عباس حسین ہوش لکھنوی)

[مرزا رسوا کی "امراؤ جان ادا" سے پہلے کی تصنیف "افسانہ، نادر جہاں" اردو ناول کی تاریخ میں بہت نمایاں جگہ پانے کی مستحق تھی لیکن ہم نے اسے بھلا دیا۔ آصف فرخی جن کو اردو فکشن کے گم شدہ سرمائے کی بازیافت میں بہت انہماک ہے، انھوں نے اردو ناول پر اپنے مفصل مضمون "حیرتی ہے یہ آئینہ" (سوغات، پانچویں کتاب، ستمبر ۱۹۹۳ء) میں اس ناول کا تفصیل کے ساتھ جائزہ لیا اور اردو والوں کو اس کی اہمیت کا احساس دلایا ہے۔ بیانیے کی قوت کے لحاظ سے بھی یہ اردو کا مثالی ناول ہے۔ نمونے کے طور پر اس میں سے لال بخار کا بیان پیش کیا جاتا ہے۔ اس بخار کا ذکر اس زمانے کی دوسری تحریروں میں بھی ملتا ہے۔ سید مظہر علی سندیلوی کے روزنامچے "یادگارِ مظہری" میں ۲۲/ ستمبر ۱۸۷۲ء کا اندراج ہے:

"آج کل بخار فصلی جس کو سرخ بخار کہتے ہیں، اس گرد و نواح میں

خصوصاً اور تمام ہندوستان میں عموماً اس کثرت سے پھیلا ہوا ہے کہ کم تر لوگ اس سے محفوظ ہیں۔ تین دن تک شدت زیادہ رہتی ہے، بعد اس کے کم ہوجاتا ہے۔ اکثر شخصوں کے بدن پر دانے سرخ بھی پڑجاتے ہیں جو خارش ہوکر زائل ہوجاتے ہیں۔"

میر انیس کے بھائی میر مہر علی انس اسی زمانے کے خطوں میں اطلاع دیتے ہیں:

"تمام شہر میں تپ فصلی کا حشر بپا ہے۔ ہر شخص درد اعضا سے بعد بخار کے گھٹنوں کو اور ہاتھ کے گٹوں کو باندھے ہوئے ہے۔۔۔۔۔" "میرے گھر میں بتیس آدمی مع ماما اور نوکر چاکر ہیں، سب مبتلا ہوچکے۔۔۔۔۔ بڑے میر صاحب (انیس) کے گھر میں سب کو فصلی یہی تپ ہوئی تھی۔ سب صحت سے ہوئے۔"

اب "افسانہ، نادر جہاں" میں اسی لال بخار کا بیان دیکھیے۔]

○

گنوار کے ہلکے ہلکے گلابی جاڑوں میں لال بخار پھیلا، اور کوئی گھر ایسا نہ تھا جہاں وہ نہ گیا ہو۔ کوئی آدمی ایسا نہ تھا جسے نہ آیا ہو۔ ہمارے ہاں بھی اپنی اپنی باری سے آیا اور دو دو چار چار آدمی ایک ہی دفعہ ماندے ہوئے۔

مجھے اور استانی جی کو جمعے کے دن بخار چڑھا۔ دوپہر کو نماز پڑھتے پڑھتے وہ لوٹ پوٹ ہوئیں۔ انھیں بیٹھی ہوئی دبا رہی تھی کہ میرے ہاتھ پاؤں ٹوٹنا شروع ہوئے۔ پہلے بند بند دکھا، سنسنی اٹھی، پھر جھر جھری معلوم ہوئی، سردی لگی، آخر کو کلیجا تھر تھرانے لگا۔ پھر اس قدر کپکپی بڑھی کہ سارا بدن ٹوٹ گیا۔ تھیلے میں ہڈیاں بھری معلوم ہوتی تھیں۔ کوٹھے سے اترنا دشوار ہوا۔ گرمی کے باعث سے جاڑوں کی چیزیں مچانوں پر پا صندوقوں میں تھیں۔ وہاں دھرا کیا تھا جو اوڑھ لیتی۔ اس خیال سے کانپتی تھر تھراتی نیچے اتری، مگر معاذ اللہ! اتنی ہی دیر میں قریب تھا کہ دم نکل جائے۔ لرزے نے بھونچال کی صورت دکھادی۔ گرتی پڑتی صحنچی کے قریب پہنچ کر بوا رحمت کو آواز دی کہ:

"جلدی دوڑو، میں گرتی ہوں۔"

وہ ننگے پاؤں ٹھوکریں کھاتی آئیں۔ بغلوں میں ہاتھ دے کر سنبھالا۔ بوا عجوبہ نے دیکھا۔ وہ دوڑ پڑیں۔ دونوں نے دہنے بائیں سہارا لگایا۔ خیراتن نے جب تک بچھونا کیا میں لڑکھڑاتی وہاں تک پہنچی اور "کچھ جلدی اڑھاؤ" کہہ کر سمٹ سمٹا کے لیٹی۔ سردی کے مارے پیٹ سے گھٹنے

لگاکر گولالاٹھی ہو گئی، لیکن میرے کانپنے سے بوا رحمت اچھل اچھل پڑتی تھیں۔ جو جس کو گرا پڑا ملا اس نے چڑھانا شروع کیا۔ کوئی دھسا ڈال گیا، کوئی کمل، ایک بوغ بند اڑھا گیا، ایک قالین۔ اماں جان نے جو اپنے کمرے میں سے یہ دوڑ دھوپ دیکھی، گھبرا کر پوچھا کہ:

"ارے خیر تو ہے؟ یہ گھر بھر کے بچھونے کیوں اٹھائے جاتے ہیں؟"

کسی نے کہہ دیا کہ:

"چھوٹی بیگم کے دشمنوں کو بڑی شدت سے جاڑے کا بخار آیا ہے۔"

وہ جلدی سے کوٹھری میں گئیں۔ ماماؤں کو بلا کر مچان پر سے لحافوں کا گٹھر اتارا۔ گھبرائی ہوئی کمرے میں یہ کہتی آئیں کہ

"ارے! یہاں کیوں لٹا دیا؟"

رحمت نے کہا کہ:

"حضور، ان کے دشمنوں سے چلا تو جاتا نہ تھا، پھر کیا کرتے؟"

یہ سن کر وہ پلنگ پر آئیں۔ مجھ پر غالیچہ اور کمل لدا ہوا دیکھ کر خفا ہونے لگیں کہ:

"دیوانیو، تم ذرا میں بوکھلا کیوں جاتی ہو؟ سامنے مچانوں پر لحافوں کا انبار لگا ہے، زمانے بھر کا آخور لے کر میری بچی پر ڈال دیا۔"

میں بھی یہ سب باتیں سنتی ہوں اور دل اسی طرح کلیجے کے ساتھ کانپ رہا ہے۔ انھوں نے وہ سب چیزیں ہٹا کر تلے اوپر دھسے پر دو لحاف ڈالے اور سب طرف سے دبا کر بیٹھیں۔ تھوڑی دیر میں وہ سردی خدا خدا کر کے کم ہوئی۔ میں نے اماں جان سے کہا کہ:

"معلوم نہیں استانی جی پاس کوئی ہے یا اکیلی ہیں۔"

کہا: "کیوں؟"

میں نے کہا کہ:

"انھیں بھی بڑی شدت سے تپ چڑھی ہے۔ اے ہاں، میری اماں جان، میں آپ پر سے قربان، ایک لحاف کوٹھے پر بھی بھیج دیجیے۔ استانی جی پر بھی یہی الا بلا پڑی ہے۔ بے روئی دار کپڑے کے جاڑا نہ جائے گا۔ کسی سے کہیے کہ ہر وقت ان کے پاس رہے۔ میری ساری جان ان میں لگی ہے۔"

اماں جان نے اسی وقت اپنا لحاف نکلوا کر کہا کہ:

"جاؤ، استانی جی کو اڑھاؤ اور ایک آدمی وہیں رہے۔ خبردار جو انھیں اکیلا چھوڑا۔"

میں اسی کی منتظر تھی۔ یہ سنتے ہی میری آنکھ بند ہو گئی اور ایسی غفلت آئی کہ پھر مجھے اپنے تن بدن کی خبر نہ رہی۔

تیسرے روز بخار کا زور کم ہوا۔ نہیں معلوم کیونکر نماز پڑھی اور کس نے پڑھوائی۔

چوکی پر کون لے گیا، پہرا کس نے دیا، خبر کس نے لی، راحت کس نے دی۔ اماں جان بے چاری ہم دونوں کی الٹ پلٹ، رکھ رکھاؤ، دوا درمن، آگے تاگے میں ایسی پھنسیں کہ ان کی عادتوں میں فرق آگیا۔ خلاف وقت کھانے، رات بھر کے جاگنے سے بالکل پست ہو گئیں۔ آخر کو ایذا نہ سہہ سکیں، ان کے چاہنے والے بھی بیمار پڑ گئے۔ چوتھے روز جب میں اچھی طرح سنبھلی تو لیٹے لیٹے پیٹھ دکھنے لگی تھی، پسلیوں میں درد تھا، چاہا کہ اٹھوں۔ بوا رحمت اور انجوبہ نے مل کر اٹھایا۔ گاؤ سے لگ کر بیٹھی۔ دیر تک یہ لوگ ادھر ادھر کی باتیں کیا کیے۔ استانی جی کی خبر پوچھی۔ کہا کہ:

"اچھی ہیں۔ بخار اتر چلا ہے۔ نہ وہ غفلت ہے، نہ حالت۔ کم کم حرارت ہے۔"

میں نے کہا:

"کسی طرح مجھے ان کے پاس لے چلو۔"

سب نے کہا کہ:

"واہ بیوی، بیگم صاحبہ سنیں گی تو مار ہی ڈالیں گی۔ ہمیں اپنا سر کورے استرے سے منڈوانا منظور نہیں۔ ایک تو یوں ہی بخار سے سب بال اتر رہے ہیں۔ آپ چھلا بھنا کسیرو بنانا چاہتی ہیں۔ وائی بندی میں نہ حال ہے نہ طاقت، خدا نہ کرے چوٹ چپیٹ لگ جائے یا حرج سے بخار بڑھ جائے تو ہم کیا منھ دکھائیں گے؟ کیونکر جواب دہی کریں گے؟ یہ تو ہم سے نہ ہوگا۔ اور جو کہیے بجالائیں۔ آج ان کے بیریوں کی کچھ طبیعت سست ہے۔ اس سے لیٹی ہوئی ہیں، نہیں اب تک تو چار پھیرے کر گئی ہوتیں۔ ان کی تلملاہٹ دیکھی تھوڑی جاتی تھی۔ وہ تو یہ کہیے کہ خدا نے فضل کیا۔ آپ نے آنکھ کھولی، بات کی۔ ان کے دل کو قرار آگیا۔ تین رات دن برابر پلک سے پلک تو انھوں نے لگائی نہیں۔ کوٹھے سے یہاں آتی تھیں، یہاں سے کوٹھے پر جاتی تھیں۔ خدا ان کو اچھا رکھے۔ ہمیں تو کھٹکا ہے کہ ان کے دشمن کہیں لت پت نہ ہو جائیں۔"

بوا رحمت یوں مجھے بہلا رہی ہیں کہ ایک ماما نے بے تحاشا کہہ دیا کہ:

"بیگم صاحب کو وہ بخار چڑھا ہے کہ چنے ڈالو تو بھن جائیں۔"

رحمت: "نہیں بوا۔ ابھی تو میں وہاں سے آئی ہوں۔ خدا نہ کرے۔"

اور منھ پھیر کر اشارے سے منع کیا۔ وہ کچھ گھبرا کر کہنے لگی کہ:

"جی ہاں، نہیں، وہ تو اچھی ہیں۔ خیر اتن البتہ کل سے گری ہیں۔"

میں نے کہا کہ:

"اماں جان کہاں ہیں؟"

کہا "حضور مجھے نہیں معلوم۔" یہ کہہ کر وہ جلدی سے آڑ میں ہو گئی۔ میں سب سمجھی اور پیشاب کو اٹھی۔ وہاں سے اماں جان کے کمرے کا رخ کیا۔ اب بوا رحمت کا کچھ زور نہ چلا، مجبور ہو گئیں اور بازو تھامے وہاں تک لائیں۔ جب میں پہنچی تو دیکھا کہ بھینسوں بخار چڑھا ہے۔ پڑی

بلبلا رہی ہیں ۔ دو آدمی دو طرف سے دبائے بیٹھے ہیں جن میں سے نورن کا منھ تمتمایا ہوا ہے ۔ دیکھتے ہی دیکھتے اسے بخار چڑھ آیا ۔ ایک آدمی رہ گیا ۔ وہ اٹھ گئی ، میں جا بیٹھی اور پاؤں دبانے لگی ۔

بوا رحمت اپنی صحنچی میں گئیں ، بخار چمٹ گیا ۔ اجوبہ کوٹھری سے اناج نکال کے لائیں ۔ دال دھونے کو مٹکے سے پانی لینے گئیں ۔ ہاتھ ڈالنا تھا کہ سردی معلوم ہوئی ۔ سب چھوڑ چھاڑ اوڑھ لپیٹ کے لیٹ رہیں ۔ محمدی خانم وضو کر رہی تھیں کہ پانی نے کاٹا ۔ جب تک اٹھیں اٹھیں ، بخار نے پچھاڑ دیا ۔ ایک گرا ، دوسرا گرا ، اس کی خبر آئی ، اس کی واردی سنی ۔ دو روز میں سارا گھر جنگل اور گھر والے شیر ہو گئے ۔ اب اپنی اپنی جان کی پڑی ہے ۔ ایک ایک پڑا اچھل رہا ہے ۔ کوئی روکنے تھامنے والا نہیں ۔ آپ ہی اچھلتے ہیں ، آپ ہی گرتے ہیں ۔

تمام گھر کا گڑ گوڈ تقسیم ہو گیا ۔ باہر کے آدمی آ کر ، سب کو برابر لٹا کر دریاں چاندنیاں اڑھا گئے ۔ سردی تو کم ہوئی ، مگر ایک ایک بیمار کے لیے ایک ایک خبر گیر چاہیے تھا ، وہ کہاں ؟ نہ کوئی آگے نہ پیچھے ۔ پیاس سے حلق میں کانٹے پڑ گئے ، نہ خود ہلا جاتا ہے نہ کوئی اور پانی ٹپکانے والا ہے ۔ جو ہے وہ ایڑیاں رگڑ رہا ہے ، جو ہے بے آگ جل رہا ہے ۔ نفسی نفسی کا عالم ، ایک ایک کو جان دو بھر ، زندگی دشوار ۔ غفلت میں پیشاب نکل نکل گیا ، سارا گھر قلیتن ۔

نانا جان ماشاءاللہ سے اچھے تھے ۔ ایک ایک کو دیکھتے بھالتے پھرتے تھے ۔ آدمیوں سے کہا کہ :

" سارا گھر ایک سرے سے بیمار ہو گیا ، کوئی کسی کا پرسان حال نہیں ۔ جہاں سے بنے مامائیں لاؤ ۔ "

وہ دو چار گھڑی بعد ہاتھ جھلاتے چلے آئے ۔ کہا کہ :

" حضور ، مامائیں تو نہیں ملتیں ۔ تمام شہر میں بخار نے زور باندھ رکھا ہے ۔ اس کے ڈر کے مارے کوئی نہیں نکلتا ۔ کوئی گھر ایسا نہیں جہاں ایک دو اس بلا میں مبتلا نہ ہوں ۔ جو بچے ہیں وہ ان کی بیمار داری میں ہیں ۔ سانس تک تو لے نہیں سکتے ۔ نوکری کون کرے ؟ "

باری باری ایک ایک جاتا ہے اور خالی پلٹ آتا ہے ۔ مولوی صاحب کے آدمی خدا بخش نے کہا کہ :

" حضور ، مجھے تو ایک ماما ملتی تھی ، میں خود نہیں لایا ۔ "

نانا جان : " ارے بھئی کیوں ؟ "

کہا کہ :

" میں نے اس سے پوچھا کہ تجھے بخار تو نہیں آیا ؟ اس نے سر ہلایا ۔ میں سوچا کہ نہیں آیا ہے تو اب ضرور آئے گا ۔ ایسا نہ ہو کہ کام لینے کے عوض کام دینا پڑے ۔ دوسرے ایک اکیلی اتنے

بیماروں کی کیا خبر لے سکتی۔"

ناناجان نے فرمایا کہ:

"بھئی اسی طرح کوئی اور مل جاتی۔ تمھاری انجام بینی نے اور ستم ڈھایا۔ بندہ، خدا، جاؤ بھی، جلدی لاؤ۔ جیسا کچھ ہوگا دیکھا جائے گا۔ اس وقت تو ایک سہارا ہو جائے گا۔ جب تک وہ بیمار پڑے گی ایک آدھ لوٹ پوٹ کے اٹھ کھڑا ہوگا۔"

وہ بے چارہ پھر دوڑا گیا اور آکر کہا کہ:

"لیجیے حضور! جو میں نے عرض کیا تھا وہی ہوا نا؟ اب جو جاکر پکارتا ہوں تو کوئی خبر نہیں ہوتا۔ دن کو رات کا سا سناٹا پڑا ہے۔ دروازے کو جو ٹھیلا، کھل گیا۔ اندر گیا۔ دیکھا تو گودڑ میں گلہری کی طرح کھیل رہی ہے۔ اڑھا لپیٹ کر دبکا آیا، جب اچھلنا کودنا کم ہوا۔"

وہ یہ سن کر افسوس کرتے اندر آئے۔ اپنے ہاتھ سے جو پانی انڈیلنے لگے، سہو دان پر سے ٹھلیا زمین پر آرہی۔ سر سے پاؤں تک چھینٹیں پڑیں۔ طہارت مزاج میں بہت تھی، اور وہ جگہ ان کے نزدیک نجس۔ معلوم نہیں پانی بھی پیا کہ نہیں۔ باہر جاکر لنگی باندھ جھٹ حوض میں کود پڑے۔ غوطہ مار کر جو نکلے تو بخار موجود تھا۔ ابھی ذرا پانی سے بہت ہچکچاتے ہیں، لیکن وہ نماز و طہارت کے بڑے پابند تھے۔ وہی ان بیماروں کے ایک سہارا تھے، ان کو بھی بخار نے نہ چھوڑا۔ اب تو قیامت ہی کا سامنا تھا۔ کانپتے ہوئے حوض سے نکلے۔ خدا بخش نے چہرے سے پہچانا کہ یہ سرخی بے وجہ نہیں، سرکار کچھ رنگ لایا چاہتے ہیں۔ حرارہ لانے کا یقین ہوتا تھا کہ آگ سے بھر کر دو طرف دو انگیٹھیاں رکھ دیں، کمرے کے دروازے بند کیے، موٹے توے کی چلم بھر کر تیچوان لاکر لگا دیا۔ پنکھے پر سے دھسا مالیدے کا لاکر پیروں پر ڈالا۔ بدن پونچھ کر جلدی جلدی کپڑے بدلوائے۔ بھلا توبہ، ان تدبیروں سے بخار کہیں رکنے والا تھا۔ نام خدا مرد تھے، اور مرد بھی بہادر، بڑی دیر تک ٹالا، پھر ہاتھ پاؤں سیدھے کرنے کے خیال سے جیسے ہی پلنگ پر لیٹے کہ اس نے قابو پایا۔ اللہ دے اور بندہ لے۔ اس شدت سے بخار چڑھا کہ دور دور گرم اجزوں کی آنچ آتی تھی۔ غفلت، ہذیان، ہاتھ پاؤں کا ٹوٹنا، سر کا درد، ایک بات ہو تو سہار ہو سکے۔ باہر ہر وقت مردانہ رہتا تھا۔ سب نے مل کر الٹ پلٹ کی۔ دوسرے روز آنکھ کھلی مگر آٹھ پہر کے بخار میں پلنگ سے اترنے کے کام کے نہ رہے۔

ان کو بخار آئے دوسرا دن تھا اور مجھے ساتواں روز کہ گاؤں پر سے ابا جان کی علالت کا خط آیا۔ میرا رینگنا تھا کہ گرے پڑوں کی خبر گیری مجھ سے متعلق ہوئی۔ ان کا آگا تاگا لے کر استانی جی کی یاد آئی۔ طاقت نہ ہونے سے گر پڑنے کا خیال تھا، لیکن تمنائے زیارت اور آرزوئے خدمت لونڈی باندی کی طرح دونوں طرف سے سنبھال کر مجھے کوٹھے پر لے گئے۔ جاکر دیکھا بخار تو دھیما تھا مگر غفلت سے آنکھوں پر ویسے ہی جھپان پڑے تھے۔ تن بدن کی خبر نہ تھی۔ خدا کی قدرت تھی

کہ رات دن میں خیراتن یا اعجوبہ اس قابل ہو جاتی تھیں کہ کھسک کھسکا کر ان کے پاس جاتیں اور نماز کو اٹھا بٹھاتی تھیں۔ کبھی خود بیوی ہی کی آنکھ کھل جاتی تھی۔ نماز قضا نہیں ہونے پائی، دیر سویر البتہ ہو گئی۔ آج میں نے نماز ظہر کو اٹھایا اور سات سلام پڑھ کر دم کیے۔ ان کی محبت میں ان آیات کا یاد آنا تھا کہ پھر تو میں نے سب کے اوپر پڑھنا واجب کر لیا۔ ان کی برکت اور تاثیر سے وہ غفلت بھی اتری اور تپ بھی کم ہوئی۔ مجھے نسخہ ہاتھ لگا، جس پر تین دفعہ پڑھے وہ سنبھل گیا۔ پڑے پڑے اٹھ بیٹھا۔ آٹھویں روز استانی جی بھی اس لائق ہو گئیں کہ سہارے سے کچھ دیر بیٹھیں، ایک آدھ بات کی، پان کھایا، اپنے پاؤں سے پیشاب کو گئیں۔ تیمم کر کے تھوڑا سا قرآن شریف پڑھا۔ وظیفہ ناغہ ہونے کا بڑا صدمہ تھا۔ غفلت برطرف ہوتے ہی تسبیح ہاتھ میں آئی۔ استغفار شروع کی۔ تسبیحات اربعہ اور درود شریف اس کثرت سے پڑھتی تھیں کہ گنتی نہ ہو سکتی تھی۔

چھٹے، ساتویں، آٹھویں دن اپنی اپنی مدت بیماری ختم کر کے سب سنبھلے۔ پہلے رینگے، کھسکے۔ بیٹھے، پھر اٹھ کر چلنے پھرنے لگے۔ آخر کو اپنے اپنے کام میں مشغول ہوئے۔

محل میں سب کا اچھا ہونا تھا کہ باہر والوں کو بخار نے پکڑا۔ یہ الٹی چال تھی۔ باہر سے اندر آتا۔ نہیں، وہ پہلے گھر میں آیا، پھر باہر سدھارا۔ تقدیر میں تو یوں ہی لکھا تھا۔ وہی آٹھ سات روز ڈیوڑھی پر بھی سناٹا رہا۔ پلیٹئیں لکھ لکھ کر باہر بھیجیں، اور وہ دو دو تین تین روز پی پی کر جی اٹھے۔ اتنے دن نہ "حکم حیدر" کی رات کو آواز آئی، نہ دن کو جائزے کی ہانک پکار سنی۔

(۲)

پریم چند کی آہٹ ("شریف زادہ": مرزا محمد ہادی رسوا)

[مرزا رسوا نے "امراؤ جان ادا" کے علاوہ بھی کئی ناول لکھے ہیں۔ جن میں "شریف زادہ" بھی ہے۔ اردو کے نصابوں میں امراؤ جان سے زیادہ شریف زادہ کو شامل کیا گیا اس لیے کہ امراؤ جان ایک طوائف کی داستان ہے اور شریف زادہ ایک مثالی انسان کی سبق آموز کہانی۔ امراؤ جان کے برخلاف شریف زادہ میں گھریلو زندگی کے مرقعے، اور کامیابی کے لیے ایک انسان کی جدوجہد اور اس کی راہ کی مزاحمتوں کے بیانات بہت جان دار ہیں۔ شریف زادہ میں بہت سی ایسی تصویریں ہیں جو آگے بڑھ کر ہمارے افسانوں اور ناولوں میں بہ کثرت نظر آنے لگیں۔ شریف زادہ کوئی نایاب یا غیر معروف ناول نہیں ہے لیکن ہم اسے اپنے سامنے رکھ کر بھول گئے ہیں۔ پریم چند جن کا راست اثر اردو فکشن پر رسوا سے بہت زیادہ پڑا، رسوا سے بہت متاثر تھے۔ اس کا اندازہ "شریف زادہ" کے مندرجہ ذیل اقتباس سے ہو سکتا ہے، جس پر

پریم چند، بلکہ صرف پریم چند، کی تحریر ہونے کا گمان گزرتا ہے۔]

○

مرزا کی قسمت کے فیصلے میں تین دن باقی ہیں۔ شیو بہاری ٹھیکے دار اصل مستغیث اور رام دین ایک اور ٹھیکے دار، دونوں شراب خانے میں بیٹھے ٹھرا اڑا رہے ہیں اور یہ باتیں ہو رہی ہیں:

رام دین: کہو، اس مقدمے میں کیا ہوا؟

شیو بہاری: کون مقدمہ؟ مرزا والا؟

رام دین: وہی مقدمہ۔

شیو بہاری: مرزا اب نہیں بچتے۔ گئے چھ سات برس کو۔

رام دین: بڑے پن کا کام کیا تم نے!

شیو بہاری: کیوں؟ پن کا کام کیوں نہیں کیا؟ ایسے کا جانا ہی اچھا ہے۔ آپ کھائے نہ دوسروں کو کھانے دے۔ باپ قسم بھیا رام دین، جب سے یہ مرزا اس علاقے میں آیا میرا تو دس بارہ ہزار کا نقصان ہو گیا۔

رام دین: کیوں؟ کیا تمھارا کوئی بل کاٹ دیا؟

شیو بہاری: بل تو نہیں کاٹ دیا، مگر بالو کی صفائی میں، ہم کو ہزار ڈیڑھ ہزار ہر سال میں مل جایا کرتے تھے، چار برس سے ایک کوڑی بھی نہیں ملی۔

رام دین: کیوں؟ کیا ٹھیکہ توڑ دیا؟

شیو بہاری: نہیں، ٹھیکہ تو نہیں توڑا، پیمائش میں کوئی گنجائش نہیں رکھی۔ دو سو پچیس سات آنے وصول ہے۔ کہو جب اس کام میں دو سو پچھتر سال میں ملے تو ہم کیا کھائیں؟

رام دین: تو پیمائش میں کم ناپا ہو گا۔

شیو بہاری: تم تو سمجھتے ہو، پھر نادان بنتے ہو۔ کون کہتا ہے کہ کم ناپا۔

رام دین: پھر ان کی کیا خطا؟ جتنا کام تم نے کیا تھا اس کے دام دلوا دیے۔ ایک ہم کہیں گے کہ مرزا صاحب پیمائش کے بڑے سچے ہیں۔ ہم نے تو ایک بل بنوایا تھا، اس میں دیکھ لیا۔ ہمارا جتنا کام تھا اس میں ایک انچ نہ گھٹایا نہ بڑھایا۔ نہ ہمارا نقصان کیا نہ سرکار کا۔ پورے دام دلوا دیے۔ ہیڈ کلارک صاحب پانچ رپے مانگتے تھے۔ میں نے اپنا پورا بل آنہ پائی سے وصول کر لیا۔ کوڑی نہیں دی۔ دیتا کیوں؟ کام میں نے کیا، محنت کی، رپیا لگایا۔ پھر ہیڈ کلارک کون ہوتے ہیں جو رپیا لیتے؟

شیو بہاری: کتنے کا بل تھا؟

شبو بہاری: کتنے کا بل تھا؟
رام دین: پانچ ہزار چھ سو اکانوے رپے تیرہ آنے سات پائی کا۔
شبو بہاری: اور اودر سیر صاحب کو کیا دیا؟
رام دین: مرزا کو؟
شبو بہاری: ہاں اور کسے۔
رام دین: اتنی تو میں قسم کھا سکتا ہوں کہ مرزا نے کبھی ایک پیسا گھوس کا نہیں کھایا۔ تم نے اس غریب کو بے کار پھنسایا ہے۔ دیکھنا کیا، بھگتان بھگتتے ہو۔ اور پھر جھوٹی گنگا عدالت میں اٹھائی۔ مرزا دیوتا آدمی ہے۔ اس کو ستا کے پھل نہ پاؤ گے۔
اتنا کہہ کے رام دین نشے کی دھن میں زار و قطار رونے لگا۔

(۳)

بڑے میاں ("جعفری خانم": خواجہ محمد عبدالرؤف عشرت لکھنوی)

[خواجہ عشرت لکھنو کے مصنف اور کتب فروش تھے۔ چوک میں ان کی دکان ادبی اکابر کی نشست گاہ تھی۔ عشرت بڑے پر نویس بزرگ تھے۔ ان کی تحریریں رسالوں میں اس کثرت سے شائع ہوتی تھیں کہ آج ان کا شمار مشکل ہے (مشفق خواجہ صاحب نے مجھے بتایا کہ ان کو خواجہ عشرت کے پانچ ساڑھے پانچ سو مضامین اور افسانوں وغیرہ کا سراغ مل چکا ہے)۔ یہ تحریریں اپنی نادر معلومات کے علاوہ اسلوب نثر کے لحاظ سے بھی بہت اہم ہیں۔ عشرت کی نثر کچھ سہل ممتنع کی سی اور بول چال کی زبان سے قریب تر ہے۔ ان کی کتابوں میں اردو شاعروں کے تذکرے "آب بقا" اور "شاعری کی پہلی کتاب"، دوسری کتاب، تیسری کتاب... کو زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔ ان کے علاوہ بھی انھوں نے متعدد کتابیں لکھیں۔

عشرت ایسے مصنف نہیں تھے کہ ان کو فراموش کر دیا جاتا، نہ ان کی تصنیف "ہم جولی" ایسی تھی کہ ہم اسے بھلا دیتے۔ "ہم جولی" دو حصوں میں ہے۔ ان میں تینتیس افسانے ہیں اور کچھ کو چھوڑ کر سب افسانوں کا مرکزی کردار عورت کو بنایا گیا ہے۔ "ہم جولی" کی عورتوں میں اودھ کی شاہی بیگموں سے لے کر مفلوک الحال گھرانوں کی لڑکیاں تک شامل ہیں۔ اردو افسانوں کے کسی اور مجموعے میں عورت کے اتنے روپ شاید ہی مل سکیں۔ "ہندوستان کے طرز تمدن" کی تصویر کھینچنا "ہم جولی" کے افسانوں کا ایک مقصد تھا جو یہ

خوبی پورا ہوا ہے۔ بعد کے فکشن کی بہت سی تصویریں خواجہ عشرت کے یہاں اس قدر واضح نظر آتی ہیں کہ ان کے افسانے پڑھ کر بعد میں لکھے جانے والے بہت سے افسانے یاد آنے لگتے ہیں۔ ذیل کا اقتباس "ہم جولی" حصہ اول کے افسانے "جعفری خانم" سے لیا گیا ہے۔ بڑھاپے کی کس مپرسی اور نئی نسل کے ہاتھوں پرانی نسل کی خرابی آج تک ہمارے فکشن کا مقبول موضوع ہے۔ "جعفری خانم" کے اس اقتباس (اور "ہم جولی" کے بیش تر افسانوں) کو پڑھ کر یہ احساس شدید تر ہو جاتا ہے کہ ہم نے اردو فکشن کے ہر اول دستے کے ساتھ مجرمانہ غفلت برتی ہے۔]

○

بیٹوں کی نظر میں تو خاک بھی باپ کی عزت نہ تھی۔ اسی سبب سے بہویں بھی ان کو جوتی کی نوک پر مارتی تھیں۔ چھ چھ دفعہ تقاضا کرتے تھے تو کہیں مشکل سے کھانا نصیب ہوتا تھا۔ بے چارے آٹھ آٹھ آنسو روتے تھے اور دل ہی دل میں اولاد پر لعنت بھیجتے تھے اور سنگ آمد سخت آمد کہہ کر ٹال دیتے تھے۔ جائداد پر بیٹوں کا قبضہ تھا۔ بڈھے نے بہت کچھ چاہا کہ میری زندگی میں تو کچھ میرا وقار قائم رہے۔ اپنے مصارف کے لیے تجارت میں سے کچھ ماہوار لینے کی کوشش کی لیکن بیٹوں نے یہ (کہا) کہ:

"آپ کو کیا ضرورت ہے جب کہ ہم لوگ آپ کی خدمت کو موجود ہیں۔ آپ کونے میں بیٹھے ہوئے اللہ اللہ کیا کیجیے۔"

باپ نے کہا:

"بیٹا، یہ کون سی بات ہے کہ میں دو آنے حجامت کے تم سے منگواؤں تو ملیں، کسی نوکر کو چار پیسے انعام کے دینا چاہوں تو تم سے مانگوں۔ آدمی کے ساتھ دس خرچ ہر وقت لگے رہتے ہیں۔"

لڑکوں نے کہا:

"اول تو ہم سے مانگنے میں کون سی شرم کی بات ہے؟ ہم ہمیشہ آپ سے مانگا کیے۔ دوسرے آپ دکان کے دیوان سے جو کچھ منگوائیے گا وہ بے عذر دے دیں گے۔"

اب گھر کی حالت بدل گئی ہے۔ باپ کے ملنے والے جتنے آتے ہیں، پان حقے سے محروم چلے جاتے ہیں۔ بڑے میاں کا کچھ بس نہیں چلتا۔ بہروں پکارا کرتے ہیں "حقہ دے جاؤ، "پان دے جاؤ"، کوئی جواب تک نہیں دیتا۔ نوکر کہتے ہیں:

"بڈھے کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ دن بھر ہئیں ہئیں کیا کرتا ہے۔"

لڑکے کہتے ہیں:

"خدا جانے ابا کو کیا ہو گیا ہے ۔ جو کوئی ملاقات کو آتا ہے اس کے چمٹ جاتے ہیں ۔ بڑھاپے میں ایک یہ بھی سودا ہوتا ہے ۔"

شیر خاں اور علی بہادر کے دوست احباب آتے ہیں، کرسیوں پر ڈٹ جاتے ہیں ۔ بجلی کے پنکھے کی ہوا میں بیٹھے ہیں ۔ سگار منھ سے لگائے ہوئے، حقہ پان ہر وقت تیار ۔ گنجفہ، تاش، شطرنج، طبلہ، ہارمونیم سب موجود ۔ آج فلاں ڈپٹی صاحب تشریف لاتے ہیں، کل فلاں تحصیل دار صاحب کی دعوت ہے ۔ ڈاکٹر صاحب کے یہاں میوے کی ڈالی جا رہی ہے ۔ ڈپٹی کمشنر کو گارڈن پارٹی دی جاتی ہے ۔ مجسٹریٹ بہادر سے ہاتھ ملایا جاتا ہے ۔

باپ کو ایک صحنچی میں بیٹھے دیکھ کر آنے جانے والے سمجھتے ہیں کہ یہ کوئی بڑھا خدمت گار قدیم الخدمت ہے ۔ صاحبزادے دن رات شیروانی، کوٹ، پتلون، قمیص، نکٹائی، کالر کی تیاری میں مصروف ہیں ۔ پاس کی عورتیں جو اتفاق سے دیکھنے کے واسطے آتی ہیں ان کی ایسی خرابی ہوتی ہے کہ ایک بہو کہتی ہے:

"مجھ سے ان سے کیا واسطہ؟ کچھ میری سگی سوتیلی نہیں ہیں ۔"

دوسری بہو کہتی ہے:

"کم بخت کیسی بے غیرت ہیں! نہ ہم سے غرض نہ واسطہ، ڈولی میں سوار ہو، دھم مدار نازل ہو گئیں ۔ جیسی آئی ہیں ویسا ہی اپنا سر کھائیں ۔ کوئی ان کی بات تو پوچھنے کا نہیں ۔"

بڑے میاں ہیں کہ پھڑ پھڑاتے پھرتے ہیں کہ کوئی ان کی خاطر مدارات کرے، کوئی ان کی بات پوچھے ۔ کبھی اندر جاتے ہیں، کبھی باہر آتے ہیں ۔ "تم نے پان کھایا؟" بچوں کے واسطے پیسے دو پیسے کی چیز بھی لاتے ہیں ۔ آنے والی عورتیں گھر کی یہ حالت دیکھ کر کہ جن کے گھر میں جن کے منھ سے ہم آئے ہیں، کوئی انھیں کی بات نہیں پوچھتا تو ہم کس گنتی میں ہیں، ایک بار آکر کچھ ایسی سزا پاتی ہیں کہ دوبارہ ادھر کا رخ نہیں کرتیں ۔

(۴)

"قیدِ یاغستان" (محمد اکرم)

[اردو میں مہماتی تحریروں کی تعداد افسوسناک حد تک اور اچھی مہماتی تحریروں کی تعداد عبرتناک حد تک کم ہے، لیکن "قیدِ یاغستان" ان تحریروں کی چیزے دگر ہے ۔ ۱۹۱۰ء میں انگریزی حکومت کے ایک ملازم محمد اکرم اور ان کے ساتھی لالہ سندر لال کو سرحد کے فراری باغیوں نے اغوا کر کے یرغمال بنا لیا تھا ۔ دونوں عرصے بعد ان کی قید سے فرار ہو کر بہ مشکل وطن پہنچے تھے ۔ "قیدِ یاغستان" محمد اکرم کے قلم سے اس مہم کی روداد ہے ۔ محمد اکرم کا

شمار ادیبوں میں نہیں کیا جاتا بلکہ ان کا نام بھی حافظوں سے محو ہو چکا ہے لیکن ان کا یہ مہم نامہ واقعہ نگاری کے علاوہ زبان اور اسلوب کے لحاظ سے بھی خاصے کی چیز ہے ۔ محمد اکرم کی سی جان دار نثر لکھنے والے ہمارے یہاں کم کم ہوئے ہیں ۔ "قید یاغستان" کے چند اقتباس دیکھیے ۔ یہ کتاب اول سے آخر تک اسی طرح پڑھنے والے کو اپنی گرفت میں لیے رہتی ہے ۔]

○

(اپریل ۱۹۱۰ء)

پہاڑیوں کی نزدیک ترین چوٹیوں پر فوجی سپاہی بارانی وردی پہنے ہوئے سڑک کی حفاظت کر رہے تھے جس سے ہمارے دل کو ڈھارس ہو رہی تھی ۔ نو میل کے سفر کے بعد سامنے سے ایک تانگا آیا جس میں ایک یورپین افسر سفر کر رہا تھا ۔ میں نے لالہ جی کو حسرت سے کہا، "کاش ہماری سرکار اپنے سب اہل کاروں کی جانوں کی حفاظت اسی طرح کیا کرے ۔ دیکھیے ان صاحب کا تانگا گزر گیا ہے، اب سڑک پر سے پکٹیں اٹھ گئی ہوں گی ۔"

گھوڑوں نے ایشیا کے بلند ترین مقام پر پہنچ کر نیچے اترنا شروع کیا ۔ اس وقت بارش موسلادھار شروع ہو گئی ۔ چند میل کے سفر کے بعد ہم ایک کھلے میدان میں آنکلے جس کے وسط میں عیدک کا قلعہ دور سے بارش کے درمیان دھندلا سا نظر آرہا تھا.... عیدک کے میدان کو طے کر کے ہم پھر چھوٹی چھوٹی گھاٹیوں میں داخل ہو گئے اور ان کو جلدی سے عبور کر کے کھجوری کے وسیع میدان میں پہنچ گئے ۔ اس وقت چار بجنے کو تھے ۔ سڑک کا یہ حصہ دو تین میل تک خراب اور کچا تھا جس میں تانگے کے پہیے بارش کی وجہ سے دھنسے جا رہے تھے ..... تھوڑی ہی دور جا کر.... چند قدم کے فاصلے پر ایک نشیبی جگہ سے اچانک دو ہیبتناک شکلیں نمودار ہوئیں ۔ ایک نے لالہ سندر لال کو اور دوسرے نے مجھ کو رائفلوں کا نشانہ بنایا ہوا تھا ۔ سڑک کے دائیں بائیں سے بھی یکا یک دو مسلح قزاق کود پڑے ۔ لالہ جی نے فوراً تانگا روک لیا.... (اور) پشتو میں "مت مارو، مت مارو" کہتے ہوئے نیچے کود گئے ۔ میں اوسان خطا کیے بغیر موقعے کی تاک میں تانگے پر بیٹھا رہا ۔ کوئی حکم اترنے کا نہیں دیا گیا تاہم حکم منفہوم کو ہم اچھی طرح سمجھتے تھے جس کی عدولی کے باعث ایک سخت صدمہ بندوق کے کندے کا میری پشت پر پہنچا اور میں دھم سے آگے کو گر پڑا....

ہمارے کپڑے بھیگے ہوئے تھے اور میں سردی سے کپکپا رہا تھا ۔ یہ وہ موقع ہے جب کہ میں نے ان پانچ آدم خور انسانوں کو نظر بھر کر دیکھا ۔ میرے بائیں طرف ایک دراز قد، چالاک جسم، سیاہ رنگ جوان مدا امیر نامی پڑا تھا ۔ اس کی آنکھیں سرمے کی کثرت سے کوے کی آنکھوں کی طرح چمک رہی تھیں جن کے گرد اگرد شکل کو زیادہ مہیب بنانے کے لیے سرمے کا پلستر کر رکھا

تھا۔ اس کی تیز نگاہیں دل کو چھید بے جاتی تھیں ۔ چھوٹی سی سیاہ پگڑی کے نیچے سے لمبے لمبے بال لٹک رہے تھے ۔ منڈی ڈاڑھی، لمبی مونچھیں ۔ اس کی حرکات سکنات، طرز نگاہ اور حاکمانہ اشاروں سے صاف پایا جاتا تھا کہ وہ حد درجے کا محتاط، بیدار مغز اور چالاک آدمی ہے ۔ اس کے ابھرے ہوئے رخساروں، موٹی آنکھوں اور مختصر گفتگو سے اس کی طبیعت کی تندی، سختی اور بے پروائی ظاہر ہوتی تھی ۔ اس کے دائیں طرف وہ فربہ اندام، سبزہ آغاز نوجوان لیٹا ہوا تھا جس کا ذکر.... آچکا ہے، یہ خونے تھا ۔ اس کے پاس لالہ سندر لال دری اوڑھے، آنسو ڈبڈبائے، رونی صورت بنائے چپ چاپ قسمت کو رو رہے تھے ۔ ان کے دائیں طرف ایک یک چشم، عمر رسیدہ، میانہ قد سے ذرا اترتا ہوا، اپنی ایک آنکھ سے ہمیں گھور گھور کر دیکھ رہا تھا ۔ اس کے چوڑے چپٹے مہیب چہرے کو لمبی گنجان ڈاڑھی گھیرے ہوئے تھی ۔ اس کی نظروں کے اتار چڑھاؤ، بکھرے ہوئے بالوں، بیہودہ حرکتوں سے اس کی متلون مزاجی اور بے وقوفی ٹپک رہی تھی ۔ اسے مدے کہتے تھے ۔ سب سے اخیر مغلم نامی ایک مضبوط، بلند قد، نسوانی شکل نوجوان بے پروائی سے لیٹ رہا تھا ۔ کانوں میں چاندی کے گوشوارے، گلے میں ہیکل اس کے خود آرا امزاج کا پتہ دے رہے تھے ۔ اس کا بشاش چہرہ اور مسکراتی ہوئی لبیں اس کی عاشق مزاجی اور دلیری کا ثبوت دے رہی تھیں ۔ ہمارے مقابل گوری رنگت کا ایک تیس سالہ گربہ چشم، کوتاہ قامت اور بیدار ہوش گرگ دراز ہو رہا تھا ۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں لحظہ بہ لحظہ پھرتی تھیں اور اس کی بے قرار نگاہوں اور پر اضطرار اعضا کو ایک جگہ آرام نہیں تھا ۔ اس کی آنکھوں سے قزاقی اور شرارت کی چنگاریاں نکل رہی تھیں ۔ اس کا نام گل قدم تھا ۔

یہ سب رائفلوں اور خنجروں سے مسلح تھے اور سب کے گلے میں ایک ایک چرمی کیس لٹک رہا تھا جس میں تبرک اور حفاظت کے طور پر پنج سورہ وغیرہ کی ایک ایک جلد پڑی تھی تاکہ سفاکی کے کام میں وہ اس سے طلب ہمت کریں ۔

......

اس موقعے پر ہم تھوڑی سی فراریوں کے حالات پر روشنی ڈالتے ہیں ۔ گاؤں میں ہمارے پہنچتے ہی مدامیر تو خوست چلا گیا تھا ۔ گل قدم بھی ایک دو روز ٹھہر کر رخصت ہو گیا تھا ۔ باقی چار فراریوں کے ہاں باری باری ہماری روٹی کا انتظام ہوتا، اور مدامیر اور گل قدم کی باری بھی آپس میں تقسیم کر لی گئی تھی ۔ جو کچھ وہ خود کھاتے وہی ہمیں دیتے، بلکہ اپنے ساتھ ہی کھلاتے ۔ عموماً مکی کی خشک روٹی ہوتی ۔ کبھی کبھار چھاچھ کا پیالہ دسترخوان کی نعمت سمجھا جاتا، اور اسی ایک پیالے سے ہم باری باری ایک گھونٹ لے کر نوالے کو حلق سے اتار لیتے ۔ کبھی گڑ کو پانی میں گھول کر تھوڑے سے گھی میں تڑکا لیا جاتا ۔ اسے "گڑیبا" یعنی گڑ اور آب کہتے اور یہ بھی زینت دسترخوان سمجھا جاتا ۔ سالن کے نام سے وہ لوگ ناآشنا تھے ۔ مرچ اور ہلدی کبھی کسی نے دیکھی نہ تھی ۔ کبھی

جو کی روٹی پر اکتفا کرنا پڑتا۔ یہ بہت سخت ہوتی۔ اور کبھی کبھی، جب نصیب یاور ہوتے، تو گندم کی نہایت لذیذ خمیر شدہ روٹی بھی مل جاتی۔ چند ایک دفعہ شروع میں چاول بھی ہمارے ہاں پکے تھے۔ ہمارے گاؤں کے ارد گرد شہتوت کے درخت تھے۔ جب تک وہ پھل دیتے رہے فراری خود بھی اسی پر بسر کرتے اور ہمیں بھی روٹی کے بجائے وہی دیتے۔

ایک روز میں نے ذکر کیا کہ میری عمر تئیس سال کی ہے تو ایک آدمی بڑا حیران ہو کر پوچھنے لگا کہ تم اپنی عمر کا حساب کیسے رکھتے ہو؟ میں نے جواب دیا کہ ہماری پیدائش کا روز لکھا ہوا ہوتا ہے۔ تو وہ تعجب سے پوچھنے لگا کہ تم ہر روز لکھ لیتے ہو کہ آج ایک روز گزر گیا، آج دو روز گزر گئے؟

ایک روز لالہ سندر لال سے میں نے ذکر کیا کہ دھوبی کے پاس میرے کپڑے تھے، وہ بھی ضائع گئے تو ایک نے بڑی حیرانی کے ساتھ دریافت کیا کہ بابو تمھارے ان کپڑوں کے علاوہ اور بھی پہننے کے کپڑے ہیں؟

تاریخوں اور دنوں کا حساب انھیں بالکل معلوم نہ تھا۔ کئی اشخاص کو دنوں کے نام تک نہ آتے۔ جمعے کا دن دریافت کرنے کی مجھے بڑی تکلیف ہوتی کیوں کہ میں خود شمار بھول جاتا۔ اور ان کو تو جمعے سے کچھ سروکار ہی نہ تھا۔ ہمارے دو چھاتے بھی ان کو غنیمت میں ملے تھے۔ ایک تو خونے کے اور دوسرا مغلم کے حصے میں آیا تھا۔ مغلم اکثر دھوپ میں تانے پڑا رہتا، صرف اس خیال سے کہ میرے پاس چھاتا ہے۔ اور بارش میں تو خاص کر خونے اور مغلم چھاتے لے کر باہر چارپائی پر بیٹھے رہتے اور بڑے فخر کی نگاہ سے دوسروں کی طرف دیکھتے رہتے۔

....

آج ستائیس سال کی مدت طویل کے بعد بھی ان لمحات کی یاد سے بدن کانپ اٹھتا ہے۔ خوست کی پہاڑیوں کے درمیان خوں خوار قزاقوں کے مسکنوں میں دو قیدی ایک سنسان رات کی تاریکی میں بھاگنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ انھوں نے نہایت خاموشی سے اپنی زنجیریں ایک پاؤں سے کھول کر دوسری پنڈلی کے گرد لپیٹ لی ہیں۔ ایک قیدی چارپائی سے لٹک کر نیچے آتا ہے اور دونوں قیدی نہایت احتیاط اور موت کی سی خاموشی کے ساتھ کروٹیں لیتے ہوئے روانہ ہونے لگتے ہیں۔ چاروں طرف موذیوں کی چارپائیاں بچھی ہیں اور ہر طرف خوں خوار کتے آزاد پھر رہے ہیں۔ یہ سارا منظر سامنے آکر میرا تخیل خونے کو جگا دیتا ہے۔ وہ چارپائی سے دونوں قیدیوں کو پہلو بہ پہلو اس حالت میں دیکھ کر بجلی کی تیزی کے ساتھ بیٹھ جاتا ہے اور قیدیوں پر ہاتھ ڈال کر کڑکتی ہوئی آواز میں پوچھتا ہے، "بابو کہاں جاتا ہے؟" اس آواز کے ساتھ ہی ایلادار اور دیگر فراری آن کی آن میں اٹھ بیٹھتے ہیں.... میرا تخیل ان تمام ایسی ایذاؤں، عذابوں اور تکلیفوں کو ایک ایک کر کے ان موذیوں کے ہاتھوں ان قیدیوں پر گزارتا ہے جن کی ایجاد ایک خوں خواری اور قزاقی میں پلا ہوا

دماغ نہایت انتقامانہ جوش میں کر سکتا ہے ۔ مظلوم چاہتے ہیں کہ کسی طرح ان کی زندگی کا یک لخت خاتمہ ہو جائے اور موذی ان کی موت کو التوا میں رکھنا چاہتے ہیں تاکہ انتقام کی پیاس کو پوری طرح بجھا سکیں ۔ غرض ان چند لمحات کا تصور جب کہ ہم دونوں زنجیریں کھولے پہلو بہ پہلو کروٹیں لیتے ہوئے چلنے لگے تھے میرے خون میں سنسنی پیدا کرتا ہے اور میرے یہ جذبات آخری دم تک ایسے ہی رہیں گے ۔

......

ایک روز لالہ صاحب اور میں مغلم والے چھپر میں کچھ سرگوشی کر رہے تھے ۔ باہر مغربی دیوار کے ساتھ فراری آبیٹھے اور باتیں کرنے لگے ۔ ہم بھی سننے کے لیے خاموش ہو گئے ۔ باہر سے آواز آئی:

"سندر لال، کوئی گیت گاؤ ۔"

لالہ صاحب: "مجھے گیت تو کوئی نہیں آتا ۔"

آواز (درشتی سے): "دیوث، بہانہ نہ بناؤ ۔ حکم کی تعمیل کرو ۔"

لالہ صاحب نے اپنے مرغوب پنجابی دہرے شروع کر دیے ۔

آواز: "اونچی سر میں گاؤ، ہاں ذرا اور اونچی ۔ بس، اب ٹھیک ہے ۔"

لالہ صاحب گانے لگے تو وہ اپنی باتوں میں پھر مشغول ہو گئے ۔ کچھ دیر بعد لالہ صاحب سمجھے کہ ڈیوٹی ہو چکی ۔ خاموش ہو گئے ۔ آواز آئی:

"چپ کیوں ہو گیا؟"

لالہ صاحب: "تم اپنی باتوں میں لگ گئے ہو اس لیے میں نے سمجھا تعمیل ہو گئی ۔"

آواز: "احمق، تمھیں اس سے کیا کہ ہم باتوں میں لگ گئے ۔ تم اپنا اسی آواز سے گاتے رہو ۔"

چنانچہ لالہ صاحب پھر گانا شروع ہو گئے ۔

آواز: "سر کو اور اونچا کرو ۔ ہاں، اب ٹھیک ہے ۔"

لالہ صاحب کے گراموفون کو چابی دے کر فراری پھر گفتگو میں مشغول ہو گئے ۔ اصل میں ان کا مطلب یہ تھا کہ ہم ان کی گفتگو کو نہ سن سکیں، اس لیے انھوں نے یہ سہل لیکن عجیب طریقہ اختیار کیا ۔ اب لالہ صاحب کے اس طرح بیہودہ اور مجبوری گانے سے مجھے ہنسی آئی ۔ لالہ صاحب مجھے کوستے، غصے کا منھ بناتے لیکن میری ہنسی نہ تھمتی ۔ لالہ صاحب نے تنگ آکر فراریوں کو مغلظات گالی شروع کر دیں ۔ اس ادا نے میرے لیے ایک اور لطف پیدا کیا اور مجھے ہنسی اور زیادہ آئی ۔ جب تک فراریوں کی مجلس رہی لالہ جی کو برابر تانیں اڑانی پڑیں اور حلق بیٹھ گیا ۔ جب محفل برخاست ہونے لگی تو انھوں نے یہ گراموفون بھی بند کر دیا ۔

......

کتاب کو ختم کرنے سے پہلے میں ان "مذہبی دیوانوں" کے اخلاق کے چند ایسے پہلوؤں پر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں جن کے بغیر ان "رسوائے عالم" "ڈاکوؤں کی تصویر نامکمل رہ جائے گی۔

سرحد آزاد کا پٹھان اپنے وطن کی آزادی کو جان و مال سے بھی زیادہ عزیز رکھتا ہے اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے اس کے سخت ترین دشمنوں کو بھی انکار نہیں۔ دنیا میں جو طاقت اس عزیز ترین متاع کو اس سے چھیننا چاہتی ہے اس کو نہایت نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور نبرد آزما ہو کر اسے صفحہ ہستی سے مٹا دینا اپنا پیدائشی حق سمجھتا ہے۔

آزاد پٹھان اپنے باپ دادا سے سنتا اور دیکھتا چلا آرہا ہے کہ کس طرح انگریزی فتوحات کا سیلاب اس کے ارد گرد کے علاقے میں اس کے بھائی بندوں کی گردنوں میں طوق غلامی پہناتا چلا آرہا ہے۔ یہ سیلاب اس کے دروازے تک پہنچ چکا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ عنقریب اس کے متاع آزادی کو بھی خس و خاشاک کی طرح بہالے جائے گا۔ وہ اپنے علاقے کے اندر پختہ سڑکوں کے جال، توپوں اور مشین گنوں سے آراستہ قلعوں کی تعمیر، رسل و رسائل کے مستحکم انتظامات کی موجودگی، ہوائی جہازوں کی پرواز، ٹینکوں اور مسلح کاروں کی نقل و حرکت کو اپنے وطن کی آزادی کے جگر میں گھنپا ہوا خنجر خیال کرتا ہے اور اس خنجر کو نکال دینے کے لیے ہر وقت جد و جہد میں مشغول رہتا ہے۔

انگریزوں کو وہ باعزت دشمن سمجھتا ہے۔ کالے کوسوں کی مسافت سے آکر اتنی بڑی سلطنت کو ایسی خوش اسلوبی سے سنبھالے رکھنا اس کے دل کو انگریز کی عزت کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ وہ شہنشاہیت کی جوع الارض سے بھی ناواقف نہیں۔ انگریزوں کے اپنی طاقت کے بل اس کے ملک کو فتح کرنے پر وہ ان کو معذور سمجھتا ہے.... لیکن سرکار انگلشیہ کے ہندوستانی ملازموں اور مقبوضہ علاقے کے ہندوؤں کو وہ نہایت حقارت اور نفرت کی نظر سے دیکھتا ہے.....

اپنے علاقے کے ہندوؤں کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت اس نے اپنے ذمے لے رکھی ہے اور اس کے علاقے میں ہندوؤں کو مختلف اقوام میں آمد و رفت اور خرید و فروخت کی وہ آزادی حاصل ہے جو کبھی اسے اپنے لیے خواب میں بھی میسر نہ آئی ہو۔ ہندو پر آنچ آنے سے پہلے وہ اپنی جان قربان کر دے گا.....

... سرکاری ملازمین سے خواہ وہ ہندو ہوں خواہ مسلمان، وہ بے حد کینہ رکھتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ سرکار انگلشیہ جو تجاویز اس کو مفتوح کرنے کے لیے وقتاً فوقتاً کرتی ہے ان کو عملی جامہ پہنانے کے لیے یہ مزدور بہ طور مہلک ہتھیاروں کے استعمال کیے جاتے ہیں جو صرف دنیاوی طمع کے لیے اپنے ضمیر کی آواز کے خلاف اس کی محبوب ترین چیز اس سے چھیننے کے لیے آلۂ کار بنے ہوئے ہیں۔ اس لیے وہ ان کی جان کا بھی سخت ترین دشمن ہے اور مقبوضہ علاقے کے ہندو اور

سرکاری ملازمین کو وہ تقریباً ایک ہی زمرے میں شمار کرتا ہے۔

آزاد پٹھان اپنے علاقے میں قوت لایموت حاصل کرنے سے قاصر ہے اور فطرتاً بہادر ہونے کی وجہ سے وہ کسی ایسے adventure یا پرخطر مہم کو اختیار کرنا چاہتا ہے جس میں اس کی بہادری کی آزمائش بھی ہو اور اسے خزانہ بھی مل جائے۔ عموماً ایک ہی مہم اس کے پیش نظر ہوتی ہے۔ یعنی مقبوضہ علاقوں میں جائے اور کسی مال دار ساہو کار کا گھر بار لوٹ لائے یا کسی متمول ہندو یا کسی سرکاری ملازم کو شکار کر لائے۔ اگر کامیاب ہو گیا تو عمر عیش سے بسر کرے گا، اور اگر مارا گیا تو شہید کہلائے گا۔

جس خاص پہلو پر میں روشنی ڈالنا چاہتا ہوں وہ اس "مذہبی دیوانے" کی "مذہبی رواداری" ہے جو ہم نے اس کی قید میں رہ کر دیکھی.... میرے علاوہ اس گاؤں میں چھ دیگر قیدی تھے جو سب کے سب ہندو تھے۔ فراریوں نے ان کو مذہبی رسوم کے مطابق عبادت کرنے کی پوری اجازت دی ہوئی تھی اور انھوں نے ان کے طریق عبادت کی قولاً یا فعلاً کبھی تحقیر نہ کی۔ ان قیدیوں کی چوٹیاں تھیں، جنجو تھے، کبھی کسی فراری نے استہزا ان کو چھوا تک نہیں۔ کبھی کوئی چیز خلاف مذہب کھانے کو یا پینے کو نہیں دی، نہ ہی کوئی ایسی چیز کھانے کو دی جسے وہ خود گندہ یا پلید سمجھتے ہوں۔

.... ہمارے ہمسایہ گاؤں کٹیلے میں ایک برہمن کو پکڑ لائے تھے جس نے مسلمانوں کے ہاتھ کا پکا کھانے سے انکار کر دیا تھا اور کچھ دن چنے بھون کر چباتا رہا.... وہ لوگ متردد تھے کہ کسی طرح اس برہمن کے حسب منشا کھانے کا بندوبست ہو جائے۔ اگر وہ چاہتے تو زبردستی اسے سب کچھ کھلا سکتے تھے لیکن انھوں نے ایسا نہ کیا بلکہ جب افغانستان کا ہندو وہاں پہنچا تو اس سے انھوں نے اس کے کھانے کا بندوبست کیا۔

ہمارے گاؤں کے ایک قیدی نے غالباً امتحاناً فراریوں پر اپنا مذہب تبدیل کرنے کی خواہش ظاہر کی لیکن ان "مذہبی دیوانوں" نے اس کو صاف جواب دیا کہ تمھارا یہاں مسلمان ہونا کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ اگر تم ایسا ارادہ رکھتے ہو تو آزاد ہو کر اپنے وطن میں جا کر مسلمان ہونا۔

(۵)

"اسم اعظم" (کاظم)

["اسم اعظم" حضرت علی علیہ السلام کی سوانح عمری ہے۔ مصنف اپنا نام صرف "کاظم" لکھتے تھے۔ ان کا پورا نام میر کاظم علی زیدی تھا اور لکھنو میں "کاظم پترول" کے نام سے مشہور تھے (پترول انسپکٹر کے مساوی ایک عہدہ ہوتا تھا)، عقائد کے لحاظ سے اتنے آزاد خیال تھے کہ بے دین سمجھے جاتے تھے۔ کئی کتابوں اور کتابچوں کے مصنف ہیں، لیکن "اسم اعظم" ان کی بہترین

تصنیف ہے ۔ کاظم کو اردو کے نثرنگاروں اور انشاپردازوں کی صف اول میں جگہ ملنا چاہیے تھی ۔ لیکن ان کے ساتھ بھی ہم نے وہی سلوک کیا جو " قید یاغستان " کے محمد اکرم کے ساتھ کیا ۔ نپے تلے اور کم لفظوں میں زیادہ مفہوم کو پوری قوت اور اثر آفرینی کے ساتھ ادا کر دینا ، تقلیل الفاظ کے باوجود انشائیت کو اور انشائیت کے باوجود معروضیت کو قائم رکھنا کاظم کی وہ خصوصیت ہے جس میں ان کے مدمقابل کم ملیں گے ۔ فعل استعمال کیے بغیر کئی کئی فقرے لکھتے چلے جانا ، پھر ایک ہی فعل لاکر سب فقروں کو سمیٹ لینا آسان نہیں ، لیکن کاظم کا یہی عمومی اسلوب ہے ۔ حضرت علیؑ کی گفتگو ، لشکروں کی یلغار ، میدان جنگ کی ہلچل کے بیان میں یہ اسلوب اپنے جوہر کھولتا ہے ۔ " اسم اعظم " کے چند مختصر اقتباس دیکھیے اور حیرت کیجیے کہ ادبی دنیا میں میر کاظم علی کو اتنی شہرت بھی نہ ملی جتنی فلمی دنیا میں ان کے بھتیجے میر حسن علی عرف مجن کمار کو ملی ۔]

○

بچپنے میں اوسط اندام ، شوخ چہرہ ، رنگ گورا ، رخسار پر گوشت ، خندہ رو ، آنکھیں ابھری ، سیاہ پتلی ، تندرست و توانا تھے ، اور بڑھے تو صناع قدرت نے قامت موزوں کو زیادہ طول نہیں دیا مگر پیشانی بلند ، بشرہ ہوش مند ، ابرو کشیدہ ، کھڑا نقشہ ، گردن قوی ، بدن سڈول ، سینہ چوڑا ، ہڈی چکلی ، جوڑ بند مضبوط ہو گئے ۔ سن تمیز کو پہنچے تو ابھری آنکھیں حیا سے نیچی رکھتے ، قوی گردن انکسار سے جھکی رہتی ۔ بھرپور جوان ہوئے تو چہرہ دل کش اور تمکین ہو گیا ۔ تیوروں پر شجاعانہ ادا آگئی جو لفظوں میں ادا نہیں ہو سکتی ۔ اچھا خاصا سن آچکا تو ہجوم افکار اور آئے دن کی بغاوتوں کی یورش ، میدان جنگ کی دھوپ سے رنگ تاؤ کھا کر کندنی ، مصحف رخ کتابی ہو گیا ، مگر متفکر چہرے پر رعب ، روئے روشن پر تقدس ، صورت زیبا پر متانت بڑھ گئی ۔ اعضا اور قوی ہو گئے ۔ مونچھیں لمبی ، لبیں ترشی ، مژگاں دراز ، آنکھیں غلافی ہو گئیں ۔ نظر اٹھا کر کسی سے بات کرتے تو مخاطب کی نگاہ نیچی ہو جاتی ۔

حضرت علیؑ مع لشکر ظفر پیکر کربلا ، ساباط ، مدائن ہوتے ہوئے راہ میں کسریٰ پرویز ، نوشیروان عادل کے پرانے نشان ، وحشتناک منظر ، ڈرانے ویرانے ، گری پڑی عمارتیں ، ٹوٹے پھوٹے قلعے ، سنسان قبرستان ، خاموش آتش کدے ، شاہی عمارتوں کے کھنڈر ، امرا وزرا کے منہدم مکانات ، اجڑے باغ ، سوکھی نہریں ، پھٹے گنبد ، گرے منارے ، لٹی بہار ، مٹی رونق چشم عبرت سے

دیکھتے، زبان سے آیہ **فاعتبروا یااولی الابصار** پڑھتے۔ بہر سیر میں رونق افزا ہوئے۔

ابن ملجم حضرت علیؑ کی تاک میں گھومتا رہا۔ قطامہ سے تین آدمی مدد کو لیے۔ تلوار کو زہر میں بجھایا۔ ۱۹/ رمضان کو رات رہے سے مسجد میں آلیٹا۔ ترک کے بعد نماز صبح کے لیے حضرت علی مسجد میں تشریف لائے۔ ابن ملجم کو ہوشیار کیا اور محراب مسجد میں پہنچ کر نماز نافلہ شروع کی۔ ابن ملجم پاکھے کی آڑ میں قتل علیؑ کی نیت باندھ کر کھڑا ہو رہا۔ پہلی رکعت کے دوسرے سجدے میں حضرت علیؑ کے فرق مبارک پر تلوار ماری۔ یہ تلوار اتفاق سے خندق والے گھاؤ پر پڑی، دماغ کی ضرب اور اثر سم سے حضرت علیؑ بے ہوش ہو کر خون میں لوٹنے لگے۔ ابن ملجم بھاگا۔ فوراً خبر مشہور ہو گئی۔ دوست دشمن سبھی دوڑ پڑے، تمام مسجد اہل کوفہ سے بھر گئی۔ بنی ہاشم مسجد سے حضرت علیؑ کو مکان اٹھالے گئے۔ ذرا ہوش آیا۔ فرمایا "افسوس کہ دور دراز و وحشتناک سفر درپیش ہے، زاد راہ کچھ نہیں رکھتا۔" .....

آخر وقت وقفۂ موت نے دیا۔ اہل کوفہ عیادت کو آئے تھے، گرد بزرگان قبائل کا مجمع دیکھا، فرمایا "پوچھ لو جو پوچھنا ہو۔" ہستی کا منظر، موت کا سماں پیش نظر تھا۔ ارشاد کیا، "اے نظام قدرت کو عقل کی آنکھوں سے دیکھنے والو! یہ دنیا دار الامتحان، حیرت کی جگہ، عبرت کا مقام ہے۔ اس کے اوائل میں رنج و تعب، آخر میں فنا ہے۔ حلال کے تصرف میں حساب کا سامنا، حرام کے ارتکاب میں عذاب سے سابقہ ہے۔ اس کا غنی مفتون، اس کا محتاج محزون ہے۔ جس نے پہچان لیا اس کی آنکھیں کھل گئیں، جس کی نگاہیں اس کی زیب و زینت میں اٹکیں وہ اندھا ہوا۔ کل تک میں تم پر حکمراں تھا، آج عبرت ہوں، کچھ دیر میں رخصت ہو جاؤں گا۔"

..... پھر امامت امام حسنؑ کو تفویض فرمائی۔ اپنے غسل و کفن کی وصیت کی، نمود جنازہ اور اظہار قبر کی ممانعت کی۔ نقاہت نے روکا تو کلمہ شہادتین پڑھ کر خاموش ہو گئے۔ زہر کی تاثیر اور زخم کی تکلیف ضبط کی طاقت سے بہت زیادہ تھی۔ دو دن، ایک رات اسی کرب و بے چینی میں کاٹے، اکیسویں رمضان کی شب کو روح نے مفارقت کی۔ پانچ برس نو ماہ خلافت کی زحمتیں اٹھائیں، پچاس برس سر کو ہاتھوں پر لیے جہد بالا سلام میں گزاری، ترسٹھ برس کے سن میں شہادت پائی۔ فرزندوں نے غسل دیا۔ رسول اللہ کے کفن سے بچے ہوئے پارچے کا خلعت پہنایا۔ امام حسنؑ نے نماز پڑھائی۔ شب کی اندوہ ناک تاریکی میں بنی ہاشم اور مخصوص صحابہ جنازہ اٹھا کر وصیتی مقام پر صبح ہوتے ہوتے دفن کر آئے۔

○ ○ ○

عشق نامہ

۱۔ عجب نشہ ہے سرشار رہنا چاہتا ہوں

۲۔ اُس سے بچھڑ کے بابِ ہنر بند کر دیا

۳۔ آجا کبھی ہم گوشہ نشیناں کے لئے بھی

۴۔ توڑ دی اُس نے وہ زنجیر ہی دلداری کی

۵۔ ہم سے وہ جانِ سخن ربطِ نوا چاہتی ہے

۶۔ عجب نہیں وہ سمجھ لے یہ استعارۂ شام

۷۔ اس نے کیا دیکھا کہ ہر صحرا چمن لگنے لگا

۸۔ مرے وجود کا جنگل ہرا بھرا ہو جائے

۹۔ جاں سے گزرے بھی تو دریا سے گزاریں گے تمہیں

۱۰۔ تشنہ رکھا ہے نہ سرشار کیا ہے اُس نے

۱۱۔ چراغِ خانۂ افسردگاں جلائے بھی

۱۲۔ یہ درد رات مرے بے خبر کے نام تمام

عرفان صدیقی

(۱)

عجیب نشہ ہے ہشیار رہنا چاہتا ہوں
میں اُس کے خواب میں بیدار رہنا چاہتا ہوں

کمندِ بازوئے جاناں مجھے رہائی نہ دے
ابھی میں تیرا گرفتار رہنا چاہتا ہوں

یہ موجِ تازہ مری تشنگی کا وہم سہی
میں اس سراب میں سرشار رہنا چاہتا ہوں

سیاہ چشم، مری وحشتوں پہ طنز نہ کر
میں قاتلوں سے خبردار رہنا چاہتا ہوں

یہ درد ہی مرا چارہ ہے، تم کو کیا معلوم
ہٹاؤ ہاتھ، میں بیمار رہنا چاہتا ہوں

اِدھر سے گزرے گی شاید وہ شاہ بانوئے شہر
یہ سوچ کر سرِ بازار رہنا چاہتا ہوں

ہَوا گلاب کو چھو کر گزرتی رہتی ہے
سو میں بھی اتنا گنہگار رہنا چاہتا ہوں

(۲)

اُس سے بچھڑ کے بابِ ہنر بند کر دیا
ہم جس میں جی رہے تھے وہ گھر بند کر دیا

شاید خبر نہیں ہے غزالانِ شہر کو
اب ہم نے جنگلوں کا سفر بند کر دیا

اپنے لہو کے شور سے تنگ آ چکا ہوں میں
کس نے اسے بدن میں نظر بند کر دیا

اب ڈھونڈ اور قدر شناسانِ رنگ و بُو
ہم نے یہ کام اے گلِ تر بند کر دیا

اک اسمِ جاں پہ ڈال کے خاکِ فراموشی
اندھے صدف میں ہم نے گُہر بند کر دیا

(۳)

آجا کبھی ہم گوشہ نشیناں کے لئے بھی — شانہ ہو کوئی دیدۂ گریاں کے لئے بھی
یہ جو ہُئے تنگ آب ہمیں راس نہ آ جائے — موقع ہے ابھی ابرِ گریزاں کے لئے بھی
کیا سیر ہے جاناں یہ ترا پیرہنِ تنگ — تن چاہیئے پیراہنِ جاناں کے لئے بھی
سب صرف نہ کر موسمِ گل پر دلِ ناداں — کچھ گرمیِ جاں شامِ زمستاں کے لئے بھی
شہروں سے نکل کر ترے دیوانے کہاں جائیں — کم پڑنے لگے دشت، غزالاں کے لئے بھی

اب یوں ہے کہ ہنگامۂ محفل میں ہیں خاموش
مشہور تھے جو ہُوئے بیاباں کے لئے بھی

(۴)

توڑ دی اُس نے وہ زنجیر ہی دلداری کی — اور تشہیر کرو اپنی گرفتاری کی
ہم تو صحرا ہوئے جاتے تھے کہ اُس نے آکر — شہر آباد کیا، نہرِ صبا جاری کی
ہم بھی کیا شے ہیں طبیعت ملی سیارہ شکار — اور تقدیر ملی آہوئے تاتاری کی
اتنا سادہ ہے مرا مایۂ خوبی کہ مجھے — اب تو عادت نہ رہی آئنہ برداری کی
میرے گم گشتہ غزالوں کا پتا پوچھتا ہے — فکر رکھتا ہے مسیحا مری بیماری کی

اُس کے لہجے میں کوئی چیز تو شامل تھی کہ آج
دل پہ اُس حرفِ عنایت نے گراں باری کی

(۵)

ہم سے وہ جانِ سخن ربطِ نوا چاہتی ہے
چاند ہے اور چراغوں سے ضیا چاہتی ہے

اُس کو رہتا ہے ہمیشہ مری وحشت کا خیال
میرے گُم گشتہ غزالوں کا پتا چاہتی ہے

ہم نے اتنا اُسے چاہا ہے کہ وہ دل کی مُراد
خود کو زنجیرِ محبّت سے رہا چاہتی ہے

چاہتی ہے کہ کہیں مجھ کو بہا کر لے جائے
تم سے بڑھ کر تو مجھے موجِ فنا چاہتی ہے

روح کو روح سے ملنے نہیں دیتا ہے بدن
خیر، یہ بیچ کی دیوار گرا چاہتی ہے

ہم پرندوں سے زیادہ تو نہیں ہیں آزاد
گھر کو چلتے ہیں کہ اب شام ہُوا چاہتی ہے

ہم نے ان لفظوں کے پیچھے ہی چھپایا ہے تجھے
اور انھیں سے تری تصویر بنا چاہتی ہے

(۶)

عجب نہیں وہ سمجھ لے یہ استعارۂ شام
کہ آج دیر سے نکلا مرا ستارۂ شام

یہ کون میرے بدن میں طلوع ہونے لگا
ابھی لہو کو ملا بھی نہیں اشارۂ شام

چھپا نظر سے جو میرا ہلالِ ماہِ وصال
اتر گیا مرے سینے میں ابر پارۂ شام

سمٹتی دھوپ نیا روپ دے گئی تجھ کو
پنہا دیا ترے کانوں میں گوشوارۂ شام

ہر آفتاب کو آخر غروب ہونا ہے
سو ہم بھی ڈوب رہے ہیں سرِ کنارۂ شام

(۷)

اُس نے کیا دیکھا کہ ہر صحرا چمن لگنے لگا
کتنا اچھا اپنا من اپنا بدن لگنے لگا

جنگلوں سے کون سا جھونکا لگا لایا اسے
دل کہ جگنو تھا، چراغِ انجمن لگنے لگا

اُس کے لکھے لفظ پھولوں کی طرح کھلتے رہے
روز اِن آنکھوں میں بازارِ سمن لگنے لگا

اوّل اوّل اُس سے کچھ حرف و نوا کرتے تھے ہم
رفتہ رفتہ رائگاں کارِ سخن لگنے لگا

جب قریب آیا تو ہم خود سے جدا ہونے لگے
وہ حجابِ درمیانِ جان و تن لگنے لگا

ہم کہاں کے یوسفِ ثانی تھے لیکن اُس کا ہاتھ
ایک شب ہم کو بلائے پیرہن لگنے لگا

تیرے وحشی نے گرفتاری سے بچنے کے لئے
رم کیا اتنا کہ آہوئے ختن لگنے لگا

ہم بڑے اہلِ خرد بنتے تھے یہ کیا ہو گیا
عقل کا ہر مشورہ دیوانہ پن لگنے لگا

کر گیا روشن ہمیں پھر سے کوئی بدرِ منیر
ہم تو سمجھے کہ سورج کو گہن لگنے لگا

(۸)

مرے وجود کا جنگل ہرا بھرا ہو جائے
وہ رُت بھی آئے کہ اس کا بدن گھٹا ہو جائے

وہ مجھ کو حرف و نوا سے زیادہ جانتا ہے
میں کچھ نہ بولوں اور اُس سے مکالمہ ہو جائے

عجب ہے میرے ستارہ ادا کی ہم سفری
وہ ساتھ ہو تو بیاباں میں رتجگا ہو جائے

مجھے وہ لفظ جو لکھے تو کوئی اور لگے
سخن کرے کبھی مجھ سے تو دوسرا ہو جائے

وہ خوش بدن ہے نویدِ بہار میرے لئے
میں اُس کو چھو لوں تو سب کچھ نیا نیا ہو جائے

(۹)

جاں سے گزرے بھی تو دریا سے گزاریں گے تمہیں
ساتھ مت چھوڑنا ہم پار اُتاریں گے تمہیں

تم سنو یا نہ سنو ہاتھ بڑھاؤ نہ بڑھاؤ
ڈوبتے ڈوبتے اک بار پکاریں گے تمہیں

دل پہ آتا ہی نہیں فصلِ طرب میں کوئی پھول
جان، اِس شاخِ شجر پر تو نہ واریں گے تمہیں

کھیل یہ ہے کہ کسے کون سوا چاہتا ہے
جیت جاؤ گے تو جاں نذر گزاریں گے تمہیں

روپ ہی اور ہے جب سے تمہیں چاہا ہم نے
اور چاہیں گے تمہیں، اور سنواریں گے تمہیں

عشق میں اور تو دعویٰ نہیں کرتے لیکن
کم سے کم معرکۂ جاں میں نہ ہاریں گے تمہیں

(۱۰)

تشنہ رکھا ہے نہ سرشار کیا ہے اُس نے
میں نے پوچھا ہے تو اقرار کیا ہے اُس نے

گر گئی قیمتِ شمشاد قداں آنکھوں میں
شہر کو مصر کا بازار کیا ہے اُس نے

وہ یہاں ایک نئے گھر کی بنا ڈالے گا
خانۂ درد کو مسمار کیا ہے اُس نے

دیکھ لیتا ہے تو کھِلتے چلے جاتے ہیں گلاب
میری مٹّی کو خوش آثار کیا ہے اُس نے

حرف میں جا گھنی جاتی ہے مرے دل کی مراد
دھیرے دھیرے مجھے بیدار کیا ہے اُس نے

دوسرا کوئی اس آئینے میں دکھلائی نہ دے
دل کو اپنے لئے تیار کیا ہے اُس نے

میرے اندر رکا بدن شیوۂ رم بھول گیا
کیسے وحشی کو گرفتار کیا ہے اُس نے

اب سحر تک تو جلوں گا کوئی آئے کہ نہ آئے
مجھ کو روشن سرِ دیوار کیا ہے اُس نے

میں بہرحال اسی حلقۂ زنجیر میں ہوں
یوں تو آزاد کئی بار کیا ہے اُس نے

(۱۱)

چراغِ خانۂ افسردگاں جلائے بھی
اگر وہ سنگ نہیں ہے تو مسکرائے بھی

وہ چاند ہے تو افق پر مرے طلوع بھی ہو
ستارہ ہے تو مری شام جگمگائے بھی

وہ پھول ہے تو مری شاخِ جاں بھی مہکائے
اگر ہوا ہے تو میرے بدن تک آئے بھی

سخن سرا ہے تو مجھ سے مکالمہ بھی کرے
گلہ سُنے بھی اور اپنی غزل سنائے بھی

وہ شعلہ ہے تو مجھے راکھ بھی کرے اک بار
اگر دیا ہے تو کچھ اپنی لَو بڑھائے بھی

(۱۲)

یہ دردِ رات مرے بے خبر کے نام تمام
اُسی چراغِ جہانِ دگر کے نام تمام

کبھی جو زحمتِ کارِ رفو نہیں کرتا
ہمارے زخم اُسی چارہ گر کے نام تمام

وہ ایک خواب سہی سایۂ سراب سہی
یہ عمر بھر کی تھکن اک شجر کے نام تمام

کسی نے بند کیا ہم پہ اپنے نام کا رزق
سو ہم بھی بھول گئے خشک و تر کے نام تمام

یہ ربطِ حرف و حکایت اُسے قبول نہیں
تو اب ہمارے یہ خط نامہ بر کے نام تمام

یہ پھول جس نے کھلائے ہمارے پت جھڑ میں
اُسی کے موسمِ برگ و ثمر کے نام تمام

اُس ایک نام نے بخشا ہے جو خزانۂ درد
وہ ہم نے وقف کیا بحر و بر کے نام تمام

ضیاؔ جالندھری

راحتوں سے رنج چھوٹے، سُکھ بھی دوبھر ہو گئے
اعتبار اُٹھّا تو پھول الفاظ نشتر ہو گئے
گھر ہیں سب بے گھر تھے مگر جب دل کے دروازے کھلے
جن خرابوں میں بھی جا بیٹھے وہی گھر ہو گئے
اک عجب طاقت ہے انجانے غموں کے خوف میں
اس طرح چمٹے بہم ذرّے کہ پتھّر ہو گئے
عشرتِ ترکِ تعلق کا بھرم کھل جائے گا
لب میں گر لرزش ہوئی مژگاں اگر تر ہو گئے
ہم نہیں تھے، ہم نہیں ہوں گے تو یہ ہونا ہے کیا
وہم ہیں یا خواب، کیا ہیں، جو نہ ہو کر ہو گئے
پتّے شاکی ہیں شجر سے، کوئی بتلاؤ انہیں
کیا ستم اس دو رُخی رت میں شجر پر ہو گئے
تم کہاں تھے جب جلائے جا رہے تھے برگ و بار
پوچھتے ہو ہم سے کیوں یہ باغ بنجر ہو گئے
آنکھیں ان کی برق تھیں، آوازیں ان کی رعد تھیں
ہاتھ مجبوروں کے جب اٹھے تو خنجر ہو گئے
جن کے غم پر روئے تھے اب ان سے ڈرتے ہیں ضیاؔ
یوں ہوا بدلی ستم دیدہ ستمگر ہو گئے

ضیا جالندھری

وہ سمجھتا ہے جو انجام تگ و تاز کا ہے
جو مرا غم تھا وہی اب مرے ہمراز کا ہے
مَیں نے جو دیکھا ہے کس طرح دکھاؤں ان کو
جن کی آنکھوں پہ اجارہ ہوس و آز کا ہے
راکھ کر دے گا جلا کر مجھے شعلے کی طرح
دل میں کھلتا ہوا یہ پھول کس انداز کا ہے
جس کے اظہار سے ہوں سینوں میں خورشید طلوع
منتظر رات کا سناٹا اس آواز کا ہے
ہاتھ اندھیروں میں اُبھرتے ہیں چراغوں کی طرح
وقت یہ بے بسئ طنطنہ و ناز کا ہے
جانے کب ان پہ عقابوں کی نظر پڑ جائے
اک پھریرا سا ہواؤں میں بہ پرِ تاز کا ہے
مجھ سے ذرّے کو ملے نیّرِ تاباں کی ضیا
یہ تلطف بھی اسی صاحبِ اعجاز کا ہے

عرفان صدیقی

میں جب تازہ تر تھا تو اکثر تصوّر میں عکسِ رخِ دیگراں کھینچتا تھا
شبیہیں بناتا تھا اور ان کے اطراف نقش و نگارِ گماں کھینچتا تھا

کسی شہرِ فردائے امن و اماں کی کرن اپنی جانب بلاتی تھی مجھ کو
اور اپنی طرف ایک خیمے میں روشن چراغِ شبِ درمیاں کھینچتا تھا

عجب سلسلہ تھا وہ جنگ آزما خاک پر جاں بہ لب چھوڑ جاتے تھے مجھ کو
پسِ معرکہ ایک دستِ کرم میرے سینے سے نوکِ سناں کھینچتا تھا

یہی شخص جو اب جہانِ مکافات میں قاتلوں سے اماں چاہتا ہے
کبھی پھینکتا تھا کمند آہوؤں پر کبھی طائروں پر کماں کھینچتا تھا

وصالِ بتاں کے لیے سوزِ جاں، عشق کا امتحاں کچھ ضروری نہیں ہے،
سو اب جا کے مجھ پر کھلا ہے کہ میں اتنے رنج و محن رائگاں کھینچتا تھا

زبیر شفائی

غزلیں

لہو کو راکھ کیا راکھ کو شرارہ کیا
تمام رات یہ سود و زیاں گوارہ کیا

مجھے بدن کے لئے روح کی ضرورت تھی
ہجومِ شہر نے تیری طرف اشارہ کیا

سوادِ جاں میں تھے گلہائے رنگ رنگ بہت
مگر زمیں پہ لا کر تجھے ستارہ کیا

وہ موئے تن نہیں سو سو ہزار آنکھیں ہیں
بیان ختم ہوا ترکِ استعارہ کیا

چہار سمت سے یلغار تھی اندھیروں کی
سکوتِ شب نے مجھے اور پارہ پارہ کیا

بقدرِ ذوق دریچہ کھلا تھا میرے لئے
تمام ممکنہ اسرار کا نظارہ کیا

لہو میں تھی کہیں محفوظ نامیہ قوت
لہو نے ہی متشکل مجھے دوبارہ کیا

یہ کیسی شعاعیں مرے کمرے میں در آئیں
پرچھائیاں دیوار سے نیچے اتر آئیں

سرگرمِ تعاقب رہے آنکھوں کے لئے خواب
نیندیں ہی مجھے رات کے پچھلے پہر آئیں

یہ جھومتا سبزہ یہ پُراسرار شبِ ماہ
پانی میں چٹانیں متحرک نظر آئیں

رنگوں میں شرابور تھا برسات کا موسم
دل ہی نہیں آنکھیں بھی دھڑکتی نظر آئیں

وہ کشتیاں کاغذ کی جو لرزاں تھیں ہوا میں
سب کو مگر اس پار سے اُس پار کر آئیں

وہ پیکرِ متقابلش زبیر ادھر ادھر ادھر
کس آگ میں یہ انگلیاں بارود بھر آئیں

مظفر حنفی

غزل

تتلی ہو کہ جگنو ہو ، سبک آئے سبک جائے
اے شدّتِ احساس مری سانس نہ رک جائے

کچھ یوں ہی چراغاں کا سماں تھا مرے گھر میں
کہتے ہوئے ڈرتا ہوں ترا گھر بھی نہ پھنک جائے

پھر اپنی تباہی کا سبب عرض کروں گا
رکتے ہوئے بھرنے سے بھی کہہ دیجئے ، رک جائے

اگتی ہے نئی راہ مرے نقشِ قدم سے
آندھی ہے تو رک جائے بگولا ہے تو جھک جائے

اے موت بنانے دے ابھی چاند ستارے
جب گرد اڑائی ہے تو یہ قرض بھی چک جائے

سلیم شہزاد

غزل

موسم بدل رہا ہے تو گھر سے نکل کے دیکھ
اے ناشگفتہ، شاخِ شجر سے نکل کے دیکھ

شوقِ برہنہ پائی میں کانٹوں پہ چل کے دیکھ
سودا ہے تیرا نام تو سر سے نکل کے دیکھ

کیا ہے، ہجومِ شہر میں، آوارگی سے پوچھ
نا آگہی میں کیا ہے، خبر سے نکل کے دیکھ

کن ظلمتوں میں ڈوب رہے ہیں شرر تمام
آہنگِ رقصِ شمس و قمر سے نکل کے دیکھ

سورج کے ہوتے کیوں یہ اندھیروں کا ہے نزول
آبِ گہر، محیطِ گہر سے نکل کے دیکھ

شاید کسی دریچے میں روشن ہو کوئی شمع
شہرِ گماں کی راہ گزر سے نکل کے دیکھ

دامن بڑھا کے میری طرف، سرپھری ہوا
کہتی ہے: رنگ رنگ بھنور سے نکل کے دیکھ

صغریٰ عالم

غزل

شاکی اور نہ شکوہ سنانے والی ہیں
تیری رضا میں اپنا لٹانے والی ہیں

دل ہی دل میں تجھ کو سجانے والی ہیں
مٹی مٹی درد چھپانے والی ہیں

گلشن گلشن رعب جمانے والا تو
پلکوں پلکوں پھول کھلانے والی ہیں

لمحہ لمحہ مجھ کو تو ہی پرکھے ہے
صدیاں صدیاں تجھ سے نبھانے والی ہیں

تعبیروں کے پرزے کرنے والا تو
خوابوں کی فہرست بنانے والی ہیں

سات سمندر الفت کے سب تیرے ہیں
قطرہ قطرہ عجز سنانے والی ہیں

اقلیم خزانے سب کچھ تیرے نام ہیں
کھوٹے سکے، عید منانے والی ہیں

عمروں عمروں مجھ سے تغافل تیرا ہے
سانسوں سانسوں تجھ کو منانے والی ہیں

پردہ پردہ عرش بریں تک چھپ ہے تو
تو ہی تو ہے، بول سنانے والی ہیں

ضیا جالندھری

کچرا

بسنتی ہمارے یہاں صبح کے وقت آتی
ڈیوڑھی میں، دالان میں اور آنگن میں جھاڑو لگاتی
وہ باورچی خانے سے اور گھر کے ہر کونے کھدرے سے کچرا اُٹھاتی
گئے روز کے ردّی کاغذ الگ جمع کرتی
تپائی سے، کرسی سے اور میز سے گرد اور گندگی جھاڑتی اور پونچھتی
غسلخانے کو دھوتی تو چینی کی ایک ایک اینٹ آئینے کی طرح چمکاتی
پہر بھر اسی طرح گھر کی صفائی میں مصروف رہتی

پھر اس کام سے تھک کے خوشبخت کی چارپائی کے پاس
آلتی پالتی مار کر فرش پر بیٹھ جاتی
تفکّر بہ چشم اپنے دُکھ سُکھ کا میزان کرتی
تبسّم بہ لب اپنے خوابوں میں امکان کے رنگ بھرتی
اُسے فکرِ فردا ستاتی
مگر اس کے ہونٹوں پہ بیتے دنوں کی شکایت نہ آتی
جو پوچھو تو کہتی کہ جو ہو چکا ہو چکا
اب اُسے یاد کرتے سے کیا فائدہ
وہ کہتی کہ آج اور آتے دنوں کی
پریشانیاں کوئی کم تو نہیں ہیں

کہ پچھلے دُکھوں کی دُکاں بھی لگا ئیں
وہ گذرے ہوئے وقت کو کل کا کچرا سمجھتی

کبھی ایسے لگتا کہ جیسے اُسے
موتیے اور گیندے کی پژمردہ کلیوں میں گوندھا گیا ہے
کبھی وہ کسی پیڑ کی کھردری چھال کا ڈھیر لگتی

وہ جاتے ہوئے گھر کے چھوٹے بڑوں کو
نئے دن کی تحویل میں چھوڑ جاتی
وہ جاتی تو محسوس ہوتا کہ جیسے وہ افسردہ کل کو
درخشندہ امروز میں منتقل کر گئی ہے

بسنتی کئی دن نہ آئی
تو سب اہلِ خانہ کو تشویش تھی
اس کے ہاتھوں کا محتاج گھر سونا سونا سا تھا
اب سُنا ہے کہ کچھ روز پہلے
بسنتی کے گھر اور محلّے کے روتے ہوئے لوگ
اُسے کل کے کچرے کے مانند اُٹھا لے گئے

اور اب یوں ہے جیسے
ہمارے دلوں میں بھی کچرے کے انبار ہیں
ایسے انبار کوئی بھی جن کو اُٹھاتا نہیں

صلاح الدین محمود

ساتھی، اساتھی

تم غیر تھیں
سو غیر ہی رہیں ،
مجھ کو ، ستاروں کے لمس سے بھرے
ایک دالان سے
جل دے کر
اس تمہارے آسمان کے تلے
لایا گیا تھا
کہ جہاں ، ہمیشہ سے ، تمہاری چتون
اپنے آسمان کی گرفت میں تھی ،
ہمارے بے ساختہ اور کوئلے جسموں نے
ایک دوسرے کو ساخت دی تھی
مگر تم غیر تھیں سو غیر ہی رہیں ،
ہم نے پاتال کی گہرائی میں مل کر
بیج کی چٹخن سُنی تھی
مگر تم غیر تھیں سو غیر ہی رہیں
اور آج ، اس چٹخن کی گونج کی طرح
تن آور شجر
اپنی اپنی وادیوں کے ڈھلانوں پر
اپنے اپنے جنگل سہارے کھڑے ہیں

کہ جن کی مخفی سمتوں میں
چہار آسمان کے پرند
سدا کی جانب ہر دم اُڑتے ہیں،
وہ اپنے چاند، اپنے سورج اور اپنے آسمان
اپنی شاخوں میں جنم دیتے ہیں
کہ جن شاخوں کے تلے، میں، کبھی کبھی
اس آبِ رواں کا کنارہ پاتا ہوں
کہ جو میرے آسمان کے لمس میں
سدا سے بہتا تھا،
کبھی کبھی
دوسرے کنارے پر بسنے والی
مخلوق کی آواز
اس آبِ رواں کے گھونٹ میں
سُنتا ہوں
اور ان ستاروں کا گمان پاتا ہوں
کہ جن کی موجودگی سے بھرے دالان میں
ایک سیتل اندھیرے
میری ماں نے
مجھ کو یہ جنم دیا تھا،
ان شاخوں کی چھدری چھاؤں میں
کبھی کبھی
وہ چپہ بھر پاتا ہوں
کہ جس کی خبر میں
میری پہلی چیخ
آج بھی دفن ہے،
مگر تم غیر تھیں، غیر ہی رہیں
اپنے ان مٹ بچپن کی جائز و ناجائز
وفاداریوں میں مبتلا
غیر تھیں سو غیر ہی رہیں،
ہماری آنکھیں
ایک دوسرے میں بہہ گئیں
مگر اس بہاؤ میں آسمان نہ سموئے
کیونکہ شائد
تم غیر نہ تھیں
بلکہ تمہارے بچپن کے آسمان کے تلے
میں غیر تھا

ادا جعفری

سانحہ ایک نہیں

مری موت تو روزمرّہ کا اک واقعہ ہے
کبھی انفرادی کبھی اجتماعی
سو تم اپنا دل کیوں دُکھاؤ
یہ دھرتی مرے خون سے آج رنگین سہی
مگر اگلے موسم، کسی اگلے موسم میں
بارش کی بوچھار خود ہی
مری رہگزاروں کا منھ دھونے آجائے گی
جو دُکھ ہے تو یہ ہے کہ اب کے برس ——
—— بلکہ برسوں ہوئے
چاند نے اپنا چہرہ مرے آسماں کو دکھایا
نہ سورج کا رتھ اس طرف ہو کے گزرا
نہ بستی میں اجلا بچھونا بچھایا
نہ دل کے کواڑوں پہ دستک کی آواز آئی
نہ آنکھوں میں تصویر ہی کوئی باقی رہی
نہ جانے کہاں کوئی دیوار حائل ہوئی
دعا بے یقینی سے گھائل ہوئی
اندھیروں سے ٹکرا کے مرتے رہے
اور گرتے رہے ہم
اکیلے نہ تھے اور اکیلے رہے ہم
جو کچھ دھند چھٹتی
ہم اپنوں کے چہرے تو پہچان لیتے !

عارف ایّوبی

لمحۂ موجود

رات خوب صورت رات ـــــــ
آسمانوں پر اور زمین پر
تاریکی پھیلی ہوئی اور ہم
اپنے دل میں موسیقی کا طوفان لئے
اڑے چلے جا رہے ہیں خوابوں کی دنیا میں
سمندر کا شور ہمیں لوریاں دیتا ہے
ہوا پنکھا جھلتی ہے
اور میں اور تم
اُڑے چلے جا رہے ہیں
ہوا تمہارے ریشمی بال اڑاتی ہے
اور میرے رخسار چومتی ہے
اور تم ـــــــ
اپنی آنکھوں میں مجھے دیکھ رہی ہو،
اور پھر میری گردن میں اپنی بانہوں کا ہار پہنا دیتی ہو
رات نے ہمیں سیاہ لبادے میں لپیٹ رکھا ہے
تمہیں اور مجھے
میں تمہارے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیتا ہوں اور پھر
جیسے جوانی کی شراب پی کر گانے لگتا ہوں:
زمین سے اوپر، تاروں بھرے آسمان تلے

بہتے چلو، بہتے چلو،
موت سے دور زندگی سے قریب
بہتے چلو، بہتے چلو،
اور ستاروں کا قافلہ اور چاند
ہمارے جلو میں چلتے ہیں،
ہم یادوں کے ویرانے پیچھے چھوڑ آئے ہیں،
اور ہمارے سامنے نہ مستقبل ہے نہ پیچھے ماضی
بلکہ آج ہے لافانی آج
اور میں تمہارے قریب آنے لگتا ہوں
میرے ہونٹ تمہارے ہونٹوں سے مل جاتے ہیں،
میرا سینہ تمہارے سینے سے لگ جاتا ہے،
اور ستارے چاند اور زمین ہماری محبت کا یہ منظر
دیکھنے کے لیے گردش روک دیتے ہیں،
اور سمندر کا پانی اچھل کود کر ہمیں مبارک باد دیتا ہے
اور تارے ٹوٹ کر تمہاری زلفوں میں اٹک جاتے ہیں،
رات خوب صورت رات
ہمیں اپنی آغوش میں لے لیتی ہے
اور تم مجھ میں گم ہو جاتی ہو،
اور ہم بہنے لگتے ہیں
خلاؤں میں، خوابوں کی دنیا میں
اپنے ہونٹ میرے ہونٹوں سے مت جدا کرو
مجھے اپنے سینے سے لگائے رکھو
اور لافانی ہو جاؤ!

جمال اُویسی

میں، میرا تابوت اور سانپ

گرد اڑتی رہی مقبرہ پہ مرے

میں تھا سویا ہوا بے خبر، بے الم

سانپ ڈستا رہا ہر بشر کے قدم

راہرو سے الجھتا رہا عمر بھر

کوئی گزرا نہ ڈر سے، یہ مدت ہوئی

سانپ نے ترک اپنا وطیرہ کیا

اور مری آنکھ میں گھس گیا اسطرح

جیسے روزِ ازل ہی مری آنکھ میں

ایک پرچھائیں مارِ سیہ کی بنی

دائیں پُتلی میں کنڈلی جمائے ہوئے

اُس کی پرچھائیں رہتی ہے پیشِ نظر

اور مرے مقبرے پر طویل و سیہ

ایک نقشہ اُبھر آیا ہے پُر خطر

کوئی ہمت نہیں کرتا پاس آنے کی

کوئی مجھ کو جگاتا نہیں خواب سے

میں ہوں لیٹا ہوا اپنے تابوت میں

گرد اُڑتی رہے

گرد اُڑتی رہے

گرد اُڑتی رہے

جمال اُویسی

ایک نظم

.....اور میں ایک دن
ساری چیزوں کو
ڈی کوڈ کر دوں گا ـــــ
نظروں کے سامنے کی نیلاہٹ
پانیوں پر چمکتی ہوئی سفیدی
درختوں اور پودوں کو
گدگداتی ہوئی سرسراہٹ ،
شام کی شفق چادر
اور ـــــ
آغوش میں لپیٹنے والی سیاہی
میرے ذہن کے اگلے کسی حصّہ میں
ہمیشہ کے لئے
بے شناخت ہو جائیں گی ....

اندر موہن کیف

رُباعیات

(۱) تاریخ :۔

ہر واقعہ مصلحت میں تولتی ہے
ذہنوں سے تعصّب کو کریدا تو کھلا
انصاف سے کب سچ کی گرہ کھولتی ہے
تاریخ سرِعام جھوٹ بولتی ہے

(۲) وقت :۔

یہ وقت کا جادو ہے کہ احساس کا فن
جب زندگی بربادِ خزاں ہوتی ہے
سُونا بھی ہے آباد بھی دل کا آنگن
کچھ اور مہک جاتا ہے یادوں کا چمن

(۳) فطرت :۔

انسان کی فطرت میں ہیں کتنے الجھاؤ
گھٹ جاتی ہے بانٹنے سے غم کی شدّت
غم ہو کہ خوشی الگ ہے دونوں کا سبھاؤ
بڑھتی ہے خوشی اور اگر بانٹتے جاؤ

(۴) معمّہ :۔

اک حشر سا دن رات بپا ہے مجھ میں
دیتا ہے مجھے سچ کی دُہائی بھی وہی
حیراں ہوں یہ کون چھپا ہے مجھ میں
اور جھوٹ بھی خود بول رہا ہے مجھ میں

اِندر موہن کیف

مختصر نظمیں

رات :-

رات سرہانے بیٹھ کے تنہا
سر دُھنتی ہے
جب دیکھو حالات کے ستّ نوجے*
کھولے کر
چنتا کے کنکر چُنتی ہے۔

دن :-

دن کوئی نٹ کھٹ سا بالک،
چوٹ لگے تو ہنستے ہنستے سہہ جاتا ہے۔
شام ہوئی تو
تھکا تھکا سا بیٹھ کے پہروں،
اک اک چوٹ کو سہلاتا ہے۔

*ستّ نوجہ: مختلف قسم کے ملے جُلے اناج
اکثر سات قسم کے اناج کو کہتے ہیں۔

دوہے

(۱)

اَمبر سایا باپ کا دھرتی ماں کا روپ
آنچل جیسی چاندنی ممتا جیسی دھوپ

(۲)

سوکھی آنکھیں دیکھتیں ہر منظر ویران
آنسو بھر کر دیکھئے رنگوں بھری کمان

(۳)

اک موتی تھالے گئے چتر سمے کے چور
خالی سیپ میں رہ گیا طوفانوں کا شور

(۴)

کایا چنچل کامنی دن دن بدلے روپ
گھٹتا سورج دیکھتی چھت پر بیٹھی دھوپ

معراج رعنا

گم گشتہ صدا

دن کے ہنگامے میں
گم ہو گئی جب وہ مجھ سے
چھوٹے بچوں کی طرح ،
پھوٹ کے رویا شب بھر۔
ہونٹ کے لمس کی
گرمی سے اچانک میری
بند آنکھیں جو کھلیں
رات کے ڈھلتے ، ڈھلتے
میں نے دیکھا
کہ سرہانے ، میرے تکئے کے قریب
اپنے ہونٹوں پہ سجائے ہوئے مسکان کے پھول
سبز ملبوس میں لپٹی ہوئی
گم گشتہ صدا بیٹھی تھی
میرے جینے کی ادا بیٹھی تھی

شاہد کلیم

ستارہ اور میں

وہ ستارہ
ٹوٹ کر کھو جائے گا سونے خلا میں
اور میں بھی ٹوٹ کر کھو جاؤں گا
قبر کی گم صم فضا میں
ٹوٹنے کا
اور کھونے کا عمل ایک جیسا ہے مگر
میرے اس کے درمیاں یہ فرق ہے
ظلمت شب میں ــــــــ
وہ اک روشن دیا
اور میں
ایک اندھا آئینہ

"مجہول نگر کا قصہ" کا بقیہ :۔

لیکن ۔۔۔۔ اس رات کا حاضر بہر ملفوظ کرتے ہوئے سید محمد اشرف کو کچھ جگنو دکھائی دیے ہیں جن کے دم قدم سے تاریکی منکشف بھی ہوتی ہے اور چاک بھی (راجو، منو بھیا، ریل میں سوار نانا کا دکھی نواسا) ۔۔۔۔ کچھ ایسے لوگ نظر آئے ہیں جو حاضر کے بحران اور اپنی اصلیت کو پہچان رہے ہیں (ڈاکٹر وقار، میاں، قدیم معبد کا بوڑھا، امیر میاں، منو بھیا کے اہل خانہ، کپتان پولیس) اور باہر و باطن کی آگہی سے زائیدہ اک دعا سینے میں کروٹیں لیتی محسوس کی ہے جو ابھی آواز نہیں بن پائی ہے ("۔۔۔۔ منو بھیا اور ان کے ساتھیوں کی ٹانگوں سے کبھی چٹ چٹ کی آوازیں نہ آئیں۔")

اس قطعے میں زبان و بیان کی جو ہنر مندیاں بروئے کار آئی ہیں وہ سید محمد اشرف کو افسانہ سازی کی اس پر وقار روش پر تو لے آئی ہیں جہاں فسوں خیز حجابات کی تخلیق: ابھری حقیقت کو ہمہ جہت افسانوی حقیقت، عہد حاضر کو غیر منقسم زمانہ اور خیال کو قوت فکر بنا دیتی ہے۔ "آدمی"، "روگ"، "دوسرا کنارہ" اور "قربانی کا جانور" جیسے افسانے یقین پیدا کرتے ہیں کہ اس راہ میں سید محمد اشرف کے لیے بھی ۔۔۔۔ آصف فرخی جیسی ۔۔۔۔ وہ بے ساختہ سی حجاب سازی کی منزل دور نہیں جہاں حجاب، چہرے میں کھب کر، چہرہ و حجاب کا فرق مٹا دیتا ہے۔

اس قطعے کے ابیات میں لکھے قصے کو پڑھنے سے یہ ہوتا ہے کہ ہم اپنی دنیا کے متعلق ۔۔۔۔ اپنے دوستوں کے متعلق ۔۔۔۔ اپنے گرد پھیلے ہزاروں افراد کے متعلق ۔۔۔۔ اور پھر اپنے متعلق ۔۔۔۔ سعی کر سکتے ہیں۔ سوچنے کی، "اپنے دکھوں کو خود اپنے آپ" (ص: ۱۷۰) پہچاننے کی، یہ سمجھنے کی کہ کیوں آج کل ہر طرف ۔۔۔۔ یعنی ہر علاقے میں ۔۔۔۔ مطلب یہ کہ سب لوگوں میں ۔۔۔۔ "اس سالے پاگل ہاتھی نے سب گڑبڑ کر دی۔" (ص: ۲۴۱) ۔۔۔۔ اور دعا کر سکتے ہیں کہ منو بھیا اور ان کے ساتھیوں کی ٹانگوں سے کبھی چٹ چٹ کی آوازیں نہ آئیں۔

"کلام میراجی ...." کا بقیہ :۔

میں نے بڑی محبت اور صدق و خلوص سے کہی ہیں۔ میں ان کی ادبی اہمیت کا قائل ہوں اور یہ بھی عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ کالم نگار سید انتظار حسین کی پیشہ ورانہ ضرورتوں اور مجبوریوں سے بھی خوب واقف ہوں کہ انھوں نے مجھے ان سے خود آگاہ فرمایا تھا۔ کچھ باتیں جو میں نے نہیں کہی تھیں، سید صاحب نے کالم کو دل چسپ بنانے کے لیے جائزے میں شامل فرما دیں کالم کی ضرورت کے مطابق۔

اب یہ بحث میری حد تک یہاں ختم ہو جاتی ہے۔

حمید نسیم

۶/ ستمبر ۱۹۹۵ء

o o o

خصوصی مطالعہ

ایک نئی پنچ تنتر

"آپ چنتا نہ کریں حضور بالکل صحیح آدمی مارا جارہا ہے۔"
(لکڑ بگھا رو دیا)

"ابوالفضل صدیقی اور سید رفیق حسین کے جنگلوں سے نکل کر ایک پگڈنڈی سید محمد اشرف کے ہولناک جانورستان تک آن پہنچی ہے، جس میں انسان اور لکڑ بگھے اور پاگل ہاتھی متبادل حیثیتیں رکھتے ہیں۔

مصنف کا ایک کردار سوال کرتا ہے۔ "ہماری زندگی میں وہ کون سی کجی آگئی ہے جس کی وجہ سے معمولات نے اپنی راستی چھوڑ دی؟" یہ قومی اور اجتماعی کرائسس کا ادب ہے اور سید محمد اشرف "صاحب توفیق ہیں" جنھوں نے "خیمے جلا کر صحرا روشن کیا ہے۔" (منظر)۔ وہ دہشت، پراسراریت اور علائم تخلیق کر سکتے ہیں اور زمین داری کے خاتمے اور قصبات کی اقتصادی بدحالی اور ہجرت کے پامال مضامین بھی سلیقے سے پیش کرتے ہیں۔ "ڈار سے بچھڑے" ان کا مشہور افسانہ ہے۔

"دوسرے کنارے پر" راوی جو چند روز کے لیے سرحد پار گیا ہے اقدار کے شدید اختلافات کے باوجود خوش ہے کہ کم از کم "ہمارے رسم و رواج، تہوار، ہماری عیدیں اور روزے تو مشترک ہیں۔" "تب ایک ننھی لڑکی اسے بے حد خلوص اور اصرار سے روزہ کشائی کی تقریب کے لیے مدعو کرتی ہے۔" ورنہ آپ اپنے گھر جاکر یہ بھی نہ بتلا پائیں گے کہ روزہ کشائی کیا ہوتی ہے۔"

یہ ایک بڑے ہی گہرے کرائسس کا ادب ہے اور مصنف نے "دکھوں کے ڈھیر پر بیٹھ کر دکھ کی نگاہوں سے دیکھ کا تماشا کیا ہے۔" (منظر)

اس صدی کے اختتام پر ایک سفاک، بے حس، بے علم جرائم پیشہ دنیا ظہور میں آچکی ہے۔ انسانوں کی کایا کلپ ہو رہی ہے۔ جب بھی اس نئی دنیا کی پنچ تنتر لکھی گئی۔ سید محمد اشرف کی چند کہانیاں اس میں ضرور جگہ پائیں گی۔"

قرۃ العین حیدر

نئی دہلی ۔ ۲۳/ فروری ۹۴ء

"زوال کی ایک پہچان یہ بھی ہوتی ہے کہ بڑے الفاظ کے معنی چھوٹے ہوجاتے ہیں۔لفظ "جدید" کے معنی بھی پیشہ ور حرف فروشوں نے پینسٹھ پینسٹھ برس کے بوڑھے اور کم مایہ افسانہ نویسوں کے لیے استعمال کرکے چھوٹے کردیے۔ بمہل کردیے۔اس مجموعے کا مصنف نہ سکہ بند جدید ہے نہ لکیر کا فقیر ترقی پسند۔یہ ایک کھرا اور اہم اور معتبر افسانہ نگار ہے۔نہ تو اس نے علامتوں کی جلیبیوں کے تھال پر نگاہ کی اور نہ "تنہائی" کی پھٹی پنڈلی پر باندھ کر بھولے بھالے قارئین کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی حماقت۔اس نے اپنے ارد گرد موجود ہنستی روتی زندگی کے سرخ و سفید و سیاہ رنگوں سے اپنا نگارخانہ سجایا اور آپ کے سامنے پیش کردیا ہے۔

آج سے بہت پہلے علی گڑھ کی افسانوی محفلوں میں سید محمد اشرف نے "چکر" اور "ڈار سے بچھڑے" جیسی فکر انگیز اور خوب صورت کہانیاں پڑھ کر اساتذہ سے بھی تعریفیں وصول کیں۔مجھے گمان ہو گیا تھا کہ آج کے افسانے کو ایک منفرد دستخط میسر آگیا۔اشرف نے یہ مجموعہ مرتب کرکے میرے گمان کو یقین میں تبدیل کردیا۔

سید محمد اشرف کی جانوروں سے متعلق کہانیوں پر میں نے کچھ معصوم حضرات و خواتین کی کج کج آرائیاں پڑھی بھی ہیں اور سنی بھی ہیں۔یعنی ان کہانیوں پر ابوالفضل صدیقی اور رفیق حسین کی کہانیوں کا اتنا اثر ہے کہ کہیں کہیں وہ ان کا چربہ معلوم ہونے لگتی ہیں۔میرا خیال ہے کہ ان حضرات اور خواتین نے یا تو صدیقی اور حسین کو نہیں پڑھا یا اشرف کو سمجھنے میں بخل سے کام لیا۔صدیقی کی زبان قدیم اور ثقیل ہے۔جزئیات کی کھتونی اور تفصیلات کا کھلیان ان کی خصوصیات بھی ہیں اور کمزوری بھی۔نہ صرف یہ بلکہ صدیقی وہ سب کچھ لکھ ڈالتے ہیں جو نہیں لکھنا چاہیے۔صرف ایک مثال صدیقی کے یہاں بھی "روگ" پر کہانی ہے اور اشرف کے یہاں بھی "روگ" پر افسانہ ہے۔صدیقی کی کہانی کا "روگ" بہرحال شکار کرلیا جاتا ہے جب کہ اشرف کا "روگ" ٹھیک سے دکھلائی بھی نہیں دیتا لیکن افسانے میں موجود تمام انسانوں کے حواس پر حاوی ہوجاتا ہے۔۔۔۔۔رفیق حسین کی طول طویل کہانیوں میں جانور آخر تک محض جانور رہتا ہے۔جب کہ اشرف کے جانور انسانوں پر اس طرح غالب آتے ہیں کہ انسان جانور معلوم ہونے لگتے ہیں۔ایک مثال "لکڑبگھا رویا" کی آخری سطریں میں ملاحظہ فرمائیے:

"کپتان پولیس نے سپاہی سے پوچھا۔"کیا مرتے دم وہ (پولیس کا مقتول) رو رہا تھا؟"
ہاں سرکار وہ (لکڑ بگھا) رو رہا تھا۔مرتے مرتے رو رہا تھا۔گاؤں والے کہہ رہے تھے کہ جنگلی جانوروں کو انھوں نے کبھی روتے نہیں دیکھا۔"

صدیقی اور حسین اس انجام کا تصور بھی نہیں کرسکتے۔دونوں بزرگ افسانہ نگار یہ تو جانتے ہیں کہ کیا لکھنا ہے لیکن یہ نہیں جانتے کہ کیا نہیں لکھنا ہے۔افسانہ چاول پر "قل ہو اللہ" لکھنے کا فن ہے۔یہ صرف بڑا افسانہ نگار جانتا ہے کہ اسے کیا نہیں لکھنا ہے۔بڑا اور اچھا افسانہ محض افسانہ نہیں ہوتا بلکہ فکر اور دانش کی دولت سے بھی مالا مال ہوتا ہے۔افسانہ نگار کو زبان پر اگر قدرت نہیں تو مہارت یقیناً حاصل ہونا چاہیے۔اشرف کو یہ مہارت حاصل ہو چکی ہے۔

"ہماری زندگی میں وہ کون سی کجی آگئی ہے کہ معمولات نے اپنی راستی چھوڑ دی۔" (منظر)
"ہم عصر زندگی کی زہرناکیوں اور ستم آرائیوں کے ساتھ تاریخ و تہذیب کے خزینوں سے لعل و جواہر ڈھونڈ کر اپنے افسانوں میں جگمگاہٹ پیدا کرنے والے افسانہ نگار کا مستقبل روشن اور منور ہے۔"

قاضی عبدالستار، جون ۱۹۹۳۔ علی گڑھ

سید محمد اشرف

نمبردار کا نیلا

(۱)

ہوا بالکل خاموش تھی اور ارہر کے اس لمبے چوڑے کھیت کو گھیرے میں لیے پچاس ساٹھ آدمیوں کی موجودگی کے باوجود غضب کا سناٹا تھا۔ پاگل نیلا اسی کھیت میں کسی جگہ موجود تھا۔ لاٹھیاں، ڈنڈے اور سانٹھیں تھامے وہ سارے آدمی پنجوں کے بل چل رہے تھے اور پھونک پھونک کر قدم اٹھا رہے تھے۔ اگر کھڑی فصل میں سے نمودار ہو کر اپنے نکیلے سینگ پر رکھ کر ریلتا ہوا، پٹخیاں دیتا ہوا، کھروں سے کھوندتا ہوا لہولہان کرتا ہوا وہ بھاگے تو کیا ہوگا۔ یہی سوچ ہر آدمی کے کانوں میں دھڑکن بن کر دھک دھک کر رہی تھی۔

اچانک ہوا چلی، ارہر کے پودوں کی شاخیں آپس میں ٹکرا کر بجیں اور ہر آدمی کو وہ آواز نیلے کی بھگدڑ کی طرح محسوس ہوئی اور ہر آدمی کے منھ سے ڈری ڈری سی چیخ نکل پڑی۔ جب کسی کے پاس بھی پودوں کو چیرتا ہوا نیلا نہیں نکلا تو سب کی جان میں جان آئی۔ طے یہ ہوا تھا کہ سب کے سب گھیرا بندی اس طرح کریں گے کہ ایک آدمی سے دوسرے آدمی کا فاصلہ ایک لاٹھی کی لمبائی سے زیادہ نہ ہو تاکہ اگر نیلا اچانک اندر سے حملہ کرے تو ہر آدمی کے پاس ایک لاٹھی کے فاصلہ پر کم از کم دو بچانے والے موجود ہوں۔ دائرے میں چلتے چلتے اگر ایک دوسرے کے درمیان فاصلہ زیادہ ہو جاتا تو دل دھڑکنے لگا اور فوراً رفتار کچھ تیز کر کے یا دھیمی کر کے فاصلہ ایک لاٹھی کے برابر کر لیتے جیسے عید کی نماز میں کن انکھیوں سے تکبیریں درست کی جاتی ہیں۔ گرمی اور خوف کے مارے سب کے ہاتھ لاٹھیوں پر پسینے لگے تھے۔ نتھو چچا نے کھوج دیکھ کر بتایا تھا کہ کھیت میں جانے کے کھوج تو ہیں، باہر نکلنے کے نہیں۔ یعنی نیلا یقیناً کھیت کے اندر ہے۔ نیلا یا تو بیٹھا تھا یا ساکت کھڑا تھا۔ لیکن وہ اپنی دم کو اتنی دیر تک بے حرکت نہیں رکھ سکتا۔ دم ہلتی تو کسی ارہر کے پودے سے ضرور ٹکراتی۔ ٹکراتی تو آواز نہ ہوتی۔ لیکن کھیت کے اندر کوئی آواز نہیں تھی۔ اس کا مطلب وہ کھیت کے اندر ایک ایسا محفوظ گوشہ تلاش کر کے بیٹھا ہے جہاں فصل ماری گئی ہے اور پودے برائے نام ہیں۔ کھیت میں فصل کہاں کہاں ماری گئی ہے یہ بات نمبردار اودل سنگھ اور ان کے نوکروں کو معلوم تھی۔ لیکن وہ کسی بھی سوال کا صحیح، براہ راست اور فطری جواب نہیں دے رہے تھے۔ وہ صحیح جواب اس لیے بھی نہیں دے رہے تھے کہ وہ اس مہم میں براہ راست فریق بن کر سامنے آنا نہیں چاہ رہے تھے۔ بستی کی آبادی کے دباؤ میں وہ بمشکل اس

بات پر راضی ہوئے تھے کہ ہانکا کر کے نیلا نکال کر اسے صرف اتنا مارا جائے کہ وہ باڑے میں بند کیا جاسکے ۔ پچاس ساٹھ جوانوں کی تعداد کافی تھی ۔ اگر وہ فصل کے اندر داخل ہونے کی اجازت دے دیتے ۔ طریقہ بھی یہی ہوتا ہے کہ جنگلی جانور اگر کسی فصل کے اندر چھپا ہوا ہو تو چاروں طرف سے گھیر کر کے کچھ لوگوں کو فصل کے اندر داخل کر دیتے ہیں شور مچا مچا کر جانور کو باہر نکلنے پر مجبور کر دیتے ہیں اور جانور باہر نکلتے ہی داب لیا جاتا ہے ۔ ٹھاکر اودل سنگھ کا خیال تھا کہ اس طرح فصل کے اندر داخل ہونے سے فصل برباد ہوگی اور ساتھ ہی ساتھ تلسی کے پودے بھی پیروں تلے روندے جائیں گے جن سے ان کی بے حرمتی ہوگی ۔ لوگوں نے پوچھا ارہر کے کھیت میں تلسی کے پودے کہاں سے آئے ۔ ٹھاکر نے جواب دیا کہ یہ دراصل تلسی کا ہی کھیت تھا ۔ ارہر تو کسی مجبوری کی وجہ سے اگانی پڑی ۔ لوگوں نے کہا کہ اتنے بڑے کھیت میں تلسی کی کاشت کے کیا معنی ۔ تلسی تو گملوں میں بھی گائی جاسکتی ہے کہ اس کا مصرف ہی کتنا ہے ۔ کبھی کبھی نزلے زکام میں پتیاں ابال کر پی لیں یا کبھی کبھی پوجا کر لی ۔ ٹھاکر اودل سنگھ نے جواب دیا کہ تلسی کی فصل کا صرف اتنا ہی کام نہیں ہے ۔ جب تسلی بڑھتی ہے تو اس کی پتیوں میں سورج کی تیز چمک سے ایک خاص مادہ پیدا ہوتا ہے ۔ اس مادے میں ایک خوش بو ہوتی ہے ۔ ہوا چلے تو وہ خوش بو دور دور تک جاتی ہے ۔ جہاں جہاں تک وہ خوش بو پہنچتی ہے وہاں وہاں تک دیگر فصلوں کو نقصان پہنچانے والے کیڑوں کو مار دیتی ہے ۔ لوگوں نے کہا ہم نے تو ایسا نہیں سنا ۔ نمبردار اودل سنگھ نے کہا کہ اس کے ذمہ دار وہ نہیں ہیں ۔ تب لوگوں نے کہا مگر تلسی کے پودے نظر تو نہیں آرہے ۔ ٹھاکر اودل سنگھ نے جواب دیا ممکن ہے اندر ہوں ۔ اندر جاکر میرے علاوہ تو کسی نے دیکھا نہیں ہے لوگوں نے کہا زیادہ تر تو ارہر کے پودے ہی ہیں بلکہ ہماری نظر میں تو صرف ارہر کے ہی پودے ہیں ۔ ٹھاکر اودل سنگھ نے کڑک دار آواز میں کہا نظر دھوکا بھی کھا سکتی ہے ۔ اگر اسی دھوکے میں ارہر کی فصل کے ساتھ تلسی کے پودے بھی کچل گئے تو ذمہ دار کون ہوگا ۔ ۔ ۔ ۔ ؟ بولو ذمہ دار کون ہوگا ۔ ۔ ۔ ۔ ؟ بولو چپ کیوں ہوگئے ۔ سب ایک دوسرے کا منھ دیکھنے لگے اور آہستہ آہستہ سب نے خو کو یقین دلایا کہ ارہر کے بڑے کھیت میں یقیناً زیادہ تر تلسی کے ہی پودے ہیں اور تلسی کے پودے کچل جائیں تو شراپ لگے گا ۔ دراصل اندر جانے کا خطرہ بھی کوئی مول لینا نہیں چاہ رہا تھا ۔ اندر جانے کا مطلب تھا نیلے سے پہلا ، براہ راست اور دو بدو مقابلہ ، جہاں بھاگنے کی بھی جگہ کا امکان نہیں تھا ۔ وہ لوگ دائرے میں چلتے رہے ۔ پسیجی ہوئی لاٹھیاں تھامے ۔ برابر کا فاصلہ رکھتے ہوئے ۔ اپنی سانسوں کی آواز کو سنتے ہوئے ۔ کھیت کی موہوم سی موہوم آواز پر کان رکھے ہوئے ۔

ہوا چلی شاخیں ایک دوسرے سے ٹکرائیں ۔ پورے کھیت میں ہوا کے بہاؤ کے رخ پر آوازوں کا ریلا آگے بڑھا ۔ ان آوازوں کو لوگوں نے پھر نیلے کی بھگدڑ سمجھا ۔ پھر سب کے منھ سے

ڈری ڈری چیخیں نکلیں۔ ایک دوسرے کو چیختا سن کر لوگوں کی چیخیں اور طویل ہو گئیں۔

ایک نسبتاً کم گھنے حصے میں ساکت منوں وزنی گوشت کا سیاہ تودا کنوتیاں ملائے کھڑا تھا۔ دم تیزی سے بے آواز گردش کر رہی تھی۔ ہری خوراک کے پودوں کے ادھر چاروں طرف دیر سے پھلپل سنائی دے رہی تھی۔ مگر کھیت کے اندر کوئی آواز نہیں تھی۔ کھیت محفوظ تھا۔ ہوا کے جھونکوں سے پودے بجتے تو وہ آواز اس کی مانوس آواز تھی۔ لیکن ان آوازوں کے بعد اچانک آدمی بھی چیخے تھے۔ اور ایسا دوسری بار ہوا تھا۔ اس بار ابھی تک چیخیں تھمی نہیں تھی۔ اسے لگا جیسے یہ چیخیں چاروں طرف سے بلند ہو رہی ہیں۔ اسے لگا گھیرا تنگ ہو رہا ہے۔ اسے لگا لوگ اس کے بالکل نزدیک ہو گئے ہیں۔ اس کی دم نے تیزی سے گردش کاٹی۔ اگلے کھر مٹی میں مارے۔

باہر لوگوں نے محسوس کیا۔ ان کی ابھی ابھی چیخیں جیسے ہی بند ہوئیں، اندر کھیت میں زوردار آوازیں پیدا ہوئی ہیں۔ اڑڑ۔۔۔۔ بھرڑڑر۔۔۔۔ اڑڑر بھرڑرر۔۔۔۔ گرتا ہوا نیلا ارہر کے مضبوط پودوں سے ٹکراتا ہوا پوری رفتار سے ایک طرف برآمد ہوا۔۔۔۔ ڈری ڈری چیخیں بلند ہوئیں۔ کچھ لوگوں کے ہاتھوں سے لاٹھیاں چھوٹ گئیں۔ کچھ اندھا دھند دوسری طرف بھاگے۔ کچھ نے ہمت کر کے لاٹھیاں بلند کر کے وار کیے۔ خون میں لہولہان سیاہ نیلا کھیتوں، فصلوں کو پار کرتا ہوا سیدھا آبادی کی طرف دوڑا۔

(۲)

ٹھاکر اودل سنگھ نے نیلے کو اس کے بچپن سے پالا تھا۔ اس کے پالنے کی وجہ بھی عجیب و غریب تھی اور اس پر ابھی تک بھید کے پردے پڑے ہیں۔ اودل سنگھ بیک وقت دیہات، قصبے اور شہر کے باشندے تھے۔ تینوں جگہ ان کے مکانات تھے۔ گاؤں میں آبائی کھیت تھے اور حکومت قصبے میں چیرمینی اور شہر میں تجارت۔ وہ حکومت، تجارت اور سیاست تینوں کو برابر کا وقت اور اہمیت دیتے تھے۔ گاؤں میں گڑھی تھی قصبے میں حویلی تھی اور شہر میں کوٹھی۔۔۔۔ ایک دن گاؤں کی گڑھی میں چوری ہو گئی۔ ۵۰ تولے سونا، ۲۰ سیر چاندی کے برتن اور ۱۰ ہزار روپے کے علاوہ گروی گانٹھ کے ۴۰۔ ۳۰ سونے کے عدد بھی گئے۔ وہ قصبے سے اپنی جیپ میں طوفانی رفتار سے گاؤں پہنچے اور گڑھی کے دیہاتی پہرے داروں کے سرپہ اتنے جوتے بجوائے کہ ڈاکٹر معائنے کی ضرورت پیش آ گئی۔ ان لگوں نے روتے روتے اعتراف کیا کہ رات دوسرے گاؤں کی بارات میں کچھ لوگ آئے تھے انھوں نے ہمارے ساتھ بیٹھ کر بیڑیاں پیں اور ہمیں اپنی سگریٹیں پلائیں۔ سگریٹیں پی کر ہم بے ہوش ہو گئے۔ گڑھی کے پچھے پہرے کے کتے مردہ پائے گئے ان کے منھ سے نیلا نیلا پانی رس رہا تھا۔ انھیں گوشت کے پارچوں میں کچلا دیا گیا تھا۔ جس دیہات سے بارات آئی تھی وہاں دوش دی گئی تو بارات کے گھرانے نے ان سگریٹ پلانے والوں سے اپنی لاعلمی کا اظہار

کیا بتایا کہ ہم تو ان کو گھراتی سمجھے تھے۔ خیال کیا تھا کہ لڑکی والوں کے دور کے رشتہ دور ہیں جو کسی اور بستی سے بیاہ کے نیوتے میں آئے ہیں۔ ٹھاکر اودل سنگھ دانت پیس کر رہ گئے۔ وہ رات کا بے چینی سے انتظار کرنے لگے۔ جب رات ہوئی اور دیہات میں رات شام کے بعد ہو جاتی ہے۔ تو انھوں نے گڑھی کے دروازے بند کرا کے تیسرے دالان کے پیچھے والے کوٹھے میں جاکر اوپر جانے والی سیڑھیوں میں سیڑھی نمبر تین کے پٹیا ہٹا کر معائنہ کیا اور اطمینان کیا کہ ڈالڈا کے تینوں ڈبوں میں وہ سارے سونے کے زیور ویسے کے ویسے ہی موجود ہیں جو ادھار لینے والوں نے ضمانت کے طور پر رکھوائے تھے اور جو سود ادا نہ کرنے کے تاوان میں ڈوب گئے تھے اور ٹھاکر اودل سنگھ کی دولت کے سمندر میں ابھر آئے تھے۔ وہ لگ بھگ ۱۱ سیر سونے کے زیور تھے۔ اس خزانے کو شہر کی کوٹھی میں رکھنے کا مطلب تھا انکم ٹیکس والوں کے خوف سے خود کو بے خواب رکھنا۔ قصبے کی حویلی میں جو خفیہ جگہ بنوائی تھی اور جسے بنانے والے راج مستری کے کپڑے تعمیر کے دوسرے دن نہر کنارے پائے گئے تھے، وہ اس نقدی کے لیے ہی ناکافی تھی جو ٹھاکر اودل سنگھ نے شہر کے کولڈ اسٹور اور قصبے کی چیئرمینی سے پیدا کی تھی۔ کولڈ اسٹور میں ۹۰ فیصد آلو ان کا خریدا ہوا تھا۔ لیکن حساب کی کتابوں میں اس کا اندراج دیہات کے کسانوں کے نام ہوتا تھا۔ ایک بار انکم ٹیکس افسر نے ان کسانوں کو نوٹس بھیج کر شہر کے آفس میں بلا کر چیلنج بھی کی تھی۔ کسانوں نے سارے اندراجات اپنے نام میں قبول کیے۔ یہ سارے کسان وہ تھے جو ٹھاکر اودل سنگھ کی گڑھی سے برسات اور سردیوں میں اپنے گھر کے زیور رکھ کر قرضہ اٹھاتے تھے۔ جس دن کسانوں کے بیانات ہوئے تھے اس سے دو دن پہلے ٹھاکر صاحب شہر کے وکیل کو لے کر گڑھی میں آئے تھے اور ان سارے کسانوں کو آنگن میں بٹھا کر سوال جواب کی تیاری کرادی تھی اور لال اور نیلی رسیدوں والی کتابیں دکھا کر ان سے پوچھا تھا:

"کیا تم یہ رسیدیں پہچانتے ہو۔۔۔؟"

"نہیں۔۔۔۔" سب نے ایک آواز ہو کر کہا تھا۔

شہر کا وکیل ٹھاکر صاحب کا چہرا دیکھنے لگا اور جلدی جلدی سگریٹ پینے لگا۔ ٹھاکر صاحب نے دانت پیس کر سمجھایا کہ تم سب ان کتابوں کو پہچانتے ہو کیوں کہ ان پر تمہارے انگوٹھوں کے نشان ہیں۔ پھر انھوں نے سب کے انگوٹھوں کے نشان لگوائے۔

انکم ٹیکس دفتر میں کسانوں نے بیک آواز بتایا کہ "اب ہم ان کتابوں کو پہچانتے ہیں اور کولڈ اسٹور میں سارا آلو ہمارا ہی ہے اور ان کتابوں کو تلپٹی کہتے ہیں۔ اور ان پر ہمارے انگوٹھوں کے نشان ہیں۔"

انکم ٹیکس آفیسر یہ سن کر چکرایا۔ اس نے اپنے انسپکٹر کو دوسرے کمرے سے بلایا۔ انسپکٹر نے اسے پھر سمجھایا کہ سر میں خود کئی دنوں تک کسان کا بھیس بنا کر کولڈ اسٹور کے آس پاس گھوما

ہوں۔یہ سارا آلو کولڈ اسٹور کے مالک کا ہے۔ یہ کسان تیار کیے ہوئے ہیں۔"

آفیسر نے اپنے چیمبر میں آکر سب کا بیان کاغذ پر درج کیا۔ سب نے ایک ہی بات دہرائی کہ ہم کسان ہیں۔آلو پیدا کرتے ہیں۔ فصل پر آلو سستا ہوتا ہے تو ہم اسے کولڈ اسٹور میں رکھ دیتے ہیں۔ کولڈ اسٹور سے فصل کے بعد والے زمانے میں نکال کر یہ آلو اچھے داموں میں بیچ دیا جاتا ہے۔ سرخ نیلی تلبیٹی پر ہمارے ہی انگوٹھے کے نشان ہیں۔"

ان کے چہروں پر کوئی زیادہ جھوٹ بھی نہیں برس رہا تھا۔ انھوں نے ایک ایک لفظ صحیح کہا تھا۔ صرف درمیان میں ایک جملہ اور بھی جوڑا جاسکتا تھا کہ صاحب فصل پر آلو پیدا ہوتے ہی ہم سے اونے پونے خرید لیتے ہیں کہ اس وقت ہمیں ان کا بیاج ادا کرنا ہوتا ہے۔

افسر نے ان کے چہروں کو پڑھا اور کارروائی مکمل کر کے اطمینان کی سانس لی کہ کیس ختم کرنے سے پہلے ساری ضروری کارروائیاں مکمل ہو گئی تھیں۔ کیس پڑھنا، شک کرنا، شک دور کرنے کے لیے نوٹس بھیج کر گواہوں کو بلانا، ان کے بیانات کا اندراج کرنا اور پھر فیصلہ سنا دینا۔ ٹھاکر صاحب نے آفس سے نکلتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر کر سے جھکتے ہوئے "صاحب" کا شکریہ ادا کیا اور اظہار افسوس کیا کہ آپ کو اس کیس میں خواہ مخواہ محنت کرنا پڑی اور اتنے لوگوں کے بیانات درج کرنا پڑے۔ صاحب نے خاکساری کے ساتھ ان کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ "یہ تو ہمارا فرض تھا۔"

ٹھاکر صاحب چوری کے بعد کئی دن تک گاؤں میں آتے رہے۔ وہ روز شام کو گڑھی کی بیٹھک میں بیٹھ کر دانت پیستے رہتے اور ان نوکروں کو ماں بہن کی سناتے رہتے جنھوں نے چوروں کے ہاتھوں نشے کی سگریٹیں پی تھیں۔

ایک دن ایسے ہی بیٹھے تھے کہ باہر شور ہوا۔ نکل کر دیکھا تو گڑھی کی چار دیواری میں ایک مادہ نیل گائے دو بچوں کے ساتھ ہانپتی ہوئی ادھر سے ادھر، ادھر سے ادھر وحشت کے عالم میں دوڑ رہی ہے اور دھول اڑا رہی ہے۔ گیہوں کے کھیت کٹنے کے بعد کھیت میدان ہو گئے تھے اور چھپنے کی جگہ نہیں بچی تھی۔ کتوں نے رگید ا ہوگا اور بے چاری بچوں کی کم رفتاری سے مجبور ہو کر گاؤں کی سمت بھاگ پڑی ہوگی۔ مادہ تو ٹوٹی ہوئی چار دیواری پھلانگ کر بھاگ کھڑی ہوئی۔ آگے جاکر رک کر مڑ کر بچوں کی طرف دیکھا۔ دم تیزی سے ہلائی پھر چار دیواری کی طرف بھاگ کر واپس آئی کہ کتوں نے پھر رگیدا۔ مجبوراً اسے کھیتوں کی طرف بھاگنا پڑا۔ بچوں کو، بھورے بھورے، بڑی بڑی آنکھوں والے، بڑے کتے کی جسامت کے، بچوں کو پکڑ کر نیم کے درخت سے باندھ دیا گیا۔ ان میں کا ایک نیم کے درخت سے بندھا بندھا تیزی سے درخت کا طواف کرتا اور جب رسی درخت سے لپٹ جاتی اور گردن میں بل پڑنے لگتے اور آنکھیں ابلنے لگتیں۔ تو پھر مخالف سمت میں دائرے کاٹنے لگتا۔ اس نے درخت سے سر ٹکرا ٹکرا کر لہو لہان کر لیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد

جب سورج غروب ہو رہا تھا تو وہ زمین پر گر کر تیز تیز سانس لینے لگا۔ خون کی الٹی ہوئی اور تھوڑی دیر بعد وہ ٹھنڈا ہو گیا۔ دوسرے بچے کی ٹانگیں باندھ دی گئی تھیں اور اسے نیم کے تنے سے سر ٹکرانے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔

اتنے میں گاؤں کے لوگ آپہنچے۔ ایک بوڑھے نے تاسف کے ساتھ کہا "ہائے رے دیا گوماتا کا بدھ ہوئے گیا۔" ٹھاکر کی آنکھیں یہ سن کر چمکنے لگیں۔ انھوں نے بوڑھے کو ڈانٹ کر چپ کرایا اور بتایا کہ اگر ان جانوروں کو پکڑا نہیں گیا تو یہ گاؤں کے غریب کسانوں کے گھروں میں گھس کر ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر ننھے ننھے بچوں کو اپنے پیروں سے کچل ڈالتے۔ گاؤں والوں نے اوپر والے کا شکر ادا کیا کہ آج ٹھاکر اودل سنگھ کی وجہ سے ان کے معصوم بچوں کی جان بچ گئی۔

ٹھاکر اودل سنگھ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ مرنے والا جانور کا بچہ کتنا جری اور قوی تھا۔ نیم کے تنے پر بچے کے سر کی مار کے نشان دیکھ کر انھوں نے فیصلہ کیا جو بچہ بچ گیا ہے اسے وہ پالیں گے۔ کیوں کہ اول تو یہ گوماتا ہوتا ہے، دوسرے یہ کہ یہ بڑا ہو کر اجنبیوں کو اپنے سینگوں سے لہولہان کر کے انھیں اپنے گھروں سے کچل سکتا ہے۔ تیسرے یہ کہ اسے کھلانے پلانے کا کوئی خاص خرچہ نہیں ہوگا کبھی کبھی اپنے کھیتوں کا چارا بھی کھالیا کرے گا۔ چوتھے یہ گوشت کے پارچے شوق سے نہیں کھاتا۔

ٹھاکر صاحب نے اسے اس انداز سے پالا کہ آدھا وقت وہ قصبے میں رہتا اور آدھا وقت گاؤں میں کاٹتا۔ گاؤں کی گڑھی اور قصبے کی حویلی میں ۵ میل کا ہی تو فاصلہ تھا۔ وہ اسے نیلا کہہ کر پکارتے تھے اور لوگ اسے ٹھاکر کا نیلا کہہ کر بلاتے تھے۔

شروع شروع میں بہت دقتیں پیش آئیں۔ اول تو یہ کہ وہ وحشی تھا۔ کسی طرح بندھنے پر راضی نہیں ہوتا تھا۔ پہلے اسے بھوکا رکھا گیا۔ بھوک نے اس کی وحشت کو کم کیا۔ پھر اسے خوب پیٹ بھر کر ضرورت سے زیادہ غذا دی گئی تب خوش خوری نے اس کی وحشت کو بظاہر ختم کر دیا۔ گاؤں اور قصبہ والے اسے تفریح کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ ٹھاکر اودل سنگھ اسے ہمیشہ باندھ کر رکھتے تھے۔ وہ ہرا چارا ناشتے میں کھاتا تھا۔ موٹے ناج کی سانی لنچ میں اور ڈنر میں ثابت ناج اور گڑ کبھی کبھی سوپ کے طور پر اس کے منھ میں کھوکھلے بانس کا نالکا ڈال کر سرسوں کا خالص تیل پلایا جاتا۔ دو سال میں اس کا سینہ پر گوشت، بدن سڈول اور سینگ ہلالی ہو گئے۔ ماتھے پر سفید بھنوری کے بال جگہ بنانے لگے۔ ایک دن ٹھاکر صاحب نے محسوس کیا کہ نیلا اب اتنا بڑا اور طاقت ور ہو گیا ہے کہ رسی کی بندش کو صرف عادت کے طور پر فرماں برداری میں قبول کرتا ہے ورنہ چاہے تو ایک ہی زقند میں رسی اور رسی کے دوسرے سرے پر کھڑے بھوندو کسان کو لے کر اڑ جائے۔

اگر رسی سے آزاد کر دوں تو کیا بھاگ جائے گا؟ انھوں نے سوچا اور کچھ یاد کر کے

مسکرائے۔ رات میں گڑھی کے آنگن میں لیٹ کر انھوں نے پچھلے سال کا چیئرمینی کا الیکشن یاد کیا۔ ان کی موافقت کے ۷ لوگ ممبری کا چناؤ جیتے تھے اور مخالف امیدوار کی موافقت کے ۸ ممبران فتح یاب ہوئے تھے۔ ان ۱۵ ممبران کو چیئرمین کا انتخاب کرنا تھا۔ پچھلے ۲۰ برس سے وہ بلا شرکت غیرے چیئرمینی کے تنہا امیدوار ہوتے آئے تھے۔ ممبروں کے ذریعے چناؤ محض رسمی خانہ پری ہوتا تھا۔ مگر اب زمانہ بدل رہا تھا۔ کچھ عجیب عجیب سے نعرے سننے میں آتے تھے کہ "ٹھاکر ہی کیوں بارم بار ---- نہیں چلے گا اک پریوار" یا "ٹھاکر کو ہے ہٹانا ---- ہم کو بھی آزمانا ----"

ابھی چیئرمینی کے چناؤ میں پانچ دن باقی تھے۔ مخالف کیمپ آٹھ امیدواروں کے ساتھ جیتا تھا اس لیے چناؤ سے پہلے ہی جشن منا رہا تھا۔ جشن کی آوازیں کانوں میں آتیں تو ٹھاکر کے تن بدن میں آگ لگ جاتی۔ وہ حویلی کی چھت پر کھری چارپائی پر لیٹے لیٹے رات گزار دیتے۔ چناؤ سے تین دن پہلے جھمن چمار ممبر غائب ہوگیا۔ پولس میں گمشدگی کی رپورٹ لکھائی۔ یہ رپورٹ ٹھاکر صاحب نے لکھوائی تھی۔ ان کا بیان تھا کہ جھمن اندر ہی اندر ان کا موافق تھا۔ مخالف امیدوار محمود صاحب اس بات کو جان گئے تھے۔ انھوں نے اسے اغوا کرا کے اسے مروا ڈالا ہے۔ محمود صاحب کی طرف سے بھی رپورٹ ہوئی۔ اس کا لب لباب بھی وہی تھا۔ پولس نے تفتیش تیز کر دی یعنی دونوں امیدواروں کو قرقی کی دھمکی دے کر دونوں سے کہا گیا کہ چناؤ کے دن تک مقتول کو ہر حال میں حاضر کرنا پڑے گا۔ دونوں امیدواروں نے پولس سے وعدہ کیا۔ دن میں ٹھاکر صاحب قصبے کی حویلی میں پولس کے سب انسپکٹر انچارج کو کھانے کی میز پر تفتیش کراتے اور رات کو ۱۲ بجے کے بعد گاؤں پہنچ کر گڑھی کے تہہ خانے میں جھمن کو ڈنڈے پر کپڑا لپیٹ کر پٹواتے۔ چناؤ سے ایک دن پہلے انھوں نے جھمن کو سمجھایا کہ "ہمارا ساتھ دینے میں تمھارا جو فائدہ ہے اسے تم سمجھ نہیں پا رہے ہو۔ ایک تو یہ کہ تمھیں چیئرمین بننے کے بعد صفائی کا ممبر انچارج بنا دوں گا۔ صفائی کے عملے کی آسامیاں تم اپنی مرضی سے بھرنا۔ قصبے میں نل لگوانے کا کام بھی تمھارے ہی سپرد ہوگا۔ ۱۰۰ نل منظور ہوتے ہیں کم از کم ۱۵ ضرور لگوانا ہوں گے۔ روزانہ سڑک کی نالیوں پر چونا ڈلوانے کا ایک بجٹ ہوتا ہے۔ اس پیسے کو تم دھرم کے کام میں لگا سکتے ہو جیسے اپنی بیٹی کی شادی کا کھانا اور کپڑے وغیرہ۔ کیوں کہ روزانہ چونا ڈلوانے سے نالیوں میں چونے کی لگدی جم جائے گی جس کی وجہ سے مزید گندگی کا خطرہ ہے۔"

انھوں نے اسے یہ بھی سمجھایا کہ شہر کے کچھ غنڈے اس کی لڑکی کو اغوا کر کے اپنے کام میں لانا چاہتے تھے جن کو ٹھاکر نے بڑی مشکل سے روکا ہے اور ان غنڈوں کو اچھی طرح سمجھا دیا گیا ہے کہ جھمن ہمارا آدمی ہے۔ آدمی کیا ہمارا بھائی ہے۔ ہمارا موافق ہے ہمیں ووٹ دینے جا رہا ہے۔

انھوں نے باتوں ہی باتوں میں یہ بھی سمجھایا کہ ان شہری غنڈوں نے یہ کام صرف ان کے کہنے کی وجہ سے نہیں کیا اور وہ یہ دھمکی دے گئے ہیں کہ اگر جھمن ٹھیک سے راضی نہیں ہوتا تو

اس کا گلا کاٹ کر اس کے کپڑے خون میں بھگو کر محمود صاحب کے گھر کے پچھواڑے کھنڈر میں ڈلوادو۔ یہ سن کر جھمن نے اپنے گلے پر ہاتھ پھیر کر دیکھا۔ سلامت پایا تو ٹھاکر صاحب کا ہاتھ جوڑ کر شکریہ ادا کیا۔

گڑھی کے خنک آنگن میں لیٹے لیٹے ٹھاکر صاحب نے پچھلے موسم کی اس رات کو یاد کیا اور اس یاد میں مزہ محسوس کیا کہ کیسے انھوں نے اچانک ایک فیصلہ کیا تھا۔ وہ جھمن سے اچانک آواز بدل کر بولے تھے "جھمن تو کیا سمجھتا ہے کہ میں تجھے اپنی چیئرمینی کے لیے اٹھا کر لایا ہوں، نہیں نہیں بالکل نہیں۔ ایسا وچار بھی من میں مت لانا۔۔۔۔۔ نہیں تو شاید اب بھی یہی سوچ رہا ہے ۔۔۔۔"

جھمن چپ چاپ کھڑا ہولے ہولے کانپتا رہا۔

ٹھاکر نے چہرے پر ایک خاص طرح کا سادھو سنتوں والا تیج پیدا کیا اور بھاری مصنوعی آواز میں بولے۔

"چلو جھمن تمھیں تمھارے گھر چھوڑ آئیں۔ کل جسے دل چاہے ووٹ دینا۔" وہ حیران کھڑا انھیں دیکھتا رہا۔ ٹھاکر نے اس کی ٹانگوں سے رسی کھولی پھر ہاتھوں کی رسیاں کھولیں۔ اس کی آنکھوں پر انگوچھا باندھا اور اسی عالم میں گاؤں سے لاکر قصبے کی عید گاہ کے پیچھے جاکر جیپ سے اتارا اور انگوچھا کھول کر اسی کی چمچماتی آنکھوں میں میں دیکھنے لگے۔ دیکھتے رہے یہاں تک کہ وہ بھی انھیں دیکھنے کے قابل ہو گیا۔ اس نے آج تین دن اور تین راتوں کے بعد اپنے پیروں اور ہاتھوں کو آزاد پایا تھا۔ اس نے آنکھیں مل کر ٹھاکر کا چہرا دیکھا۔ اسے ٹھاکر کے چہرے کے چاروں طرف ایک ہالا سا نظر آیا جیسے رام لیلا کی تصویروں میں ہوتا ہے۔ ٹھاکر جو ابھی تک اس کا ایک ہاتھ پکڑے ہوئے تھے، سوچ رہے تھے کہ یہ ہاتھ چھوڑ دوں یا پکڑے رہوں۔ اس سے کچھ بولوں کہ کچھ نہ بولوں۔ جھمن نے اس ہاتھ کی پروا نہیں کی۔ اسے اپنی جان بچنے کی اتنی خوشی ہو رہی تھی کہ اسے خیال ہی نہیں تھا کہ اس کا ہاتھ ابھی تک ٹھاکر کی گرفت میں ہے۔

پو پھٹنے والی تھی بیر کے درختوں میں تیتر بولا۔ نیک شگون لے کر ٹھاکر نے جھمن کی سوکھی کلائیوں میں قدرے اطمینان سے دوڑتے خون کی رفتار کو محسوس کیا اور ہاتھ کو آزاد ہونے کا جو واحد فائدہ جھمن کی سمجھ میں آیا وہ یہ کہ اب اطمینان سے جھک کر دونوں ہاتھ جوڑ سکتا تھا، اس نے یہی کیا۔

الیکشن میں ٹھاکر کو ووٹ دینے کے بعد اس نے تھانے میں یہ بیان دیا کہ وہ دل کے اندر سے ہمیشہ سے ٹھاکر صاحب کا موافق رہا ہے۔ محمود صاحب کے ڈر سے وہ دلی بھاگ گیا تھا اور وہیں نظام الدین اسٹیشن پر تین دن تین راتیں گزار کر آیا ہے۔ پولیس سب انسپکٹر نے فائیل رپورٹ کی اور حاشیے میں ٹھاکر صاحب کے تعاون کا جلی حروف میں ذکر کیا جو اب چیئرمین بھی تھے۔

صرف ایک سال پرانی یاد میں بھی اتنا مزہ آسکتا ہے، یہ سوچ کر ٹھاکر کو اور لطف آیا۔ کھیتوں کی طرف سے ہوائیں لوریاں دیتی ہوئی آئیں۔ پہرے کے نوکروں کو گالیاں دے کر انھوں نے ہوشیار کیا، بندھے ہوئے نیلے کو ایک نظر پیار اور ایک نظر اختیار کے ساتھ دیکھا اور سو گئے۔ صبح اٹھ کر انھوں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ آسمان پر نگاہ پھینک کر دیکھا کہ پو پھٹنے میں کتنی دیر ہے۔ جب میلا میلا اجالا اتنا روشن ہو گیا جتنا پچھلے سال جھمن کا ہاتھ چھوڑتے وقت تھا تو انھوں نے کان لگا کر کوشش کی کہ کسی بیر کے باغ میں تیتر بول جائے، نہیں بولا۔ البتہ کوئی ٹیٹری زور سے چیخی۔ اسی کو تیتر کی آواز پر محمول کر کے انھوں نے آگے بڑھ کر نیم کے درخت سے بندھے نیلے کو رسی سے آزاد کر دیا۔ وہ رسی کھل جانے کے بعد بھی ویسے ہی کھڑا رہا، بلا تک نہیں۔

ٹھاکر صاحب نے زور سے آواز دے کر اپنے چھوٹے بیٹے اونکار کو بلایا۔ اس کی آنکھوں میں رات کی شراب کا خمار تھا، نیلے کو آزاد دیکھ کر اس کا خمار ٹوٹا۔ اس نے حیرت سے اپنے باپ کو دیکھا۔ باپ نے چہرے پر کسی غیر ضروری تاؤ کو لائے بغیر مضبوط آواز میں دھیمے دھیمے کہا۔

"ایسے ہی جھمن کو رام کیا تھا پتے سال ----"

(۳)

نیلے نے یکایک اپنی زندگی میں ایک خوش گوار تبدیلی محسوس کی۔ اسے محسوس ہوا کہ گردن میں جو موٹی سی چیز چبھتی رہتی تھی وہ دور ہو گئی ہے۔ اور اب چلنے میں کوئی رکاوٹ نہیں محسوس ہوتی۔ پہلے تو یہ ہوتا تھا کہ اگر کبھی تیز چلنے کا دل چاہے تو رسی پکڑنے والے کا بوجھ بھی گھسیٹنا پڑتا تھا۔ اب سب کچھ کتنا ہلکا پھلکا ہو گیا ہے۔ اس تبدیلی کی وجہ سے جبلی طور پر اسے ایک خدشہ لاحق ہوا کہ اور باتیں بھی تو تبدیل نہیں ہو گئیں۔ لیکن جب صبح ہرا چارا، دوپہر کو سانی اور رات کو ناج اور گڑ ملا تو اس نے طبیعت میں بہت چونچالی محسوس کی۔ وہ گڑھی کے چاروں کونوں میں گھومتا پھرا۔ ایک بار دروازے سے نکل کر باہر بھی گیا۔ گاؤں والے اسے کھلا دیکھ کر چونکے۔ کچھ بعد کے کچھ اس کی آزادی کے خیال سے خوش ہوئے۔ نیلا تھوڑی دیر بعد واپس گڑھی میں آ گیا اور نیم کے درخت کے نیچے آکر کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد اسے اندر ہی اندر گردن پر تناؤ محسوس ہوا۔ دراصل جب دھوپ اس جگہ آجاتی تھی تو وہ اٹھ کر لمبی رسی گھسیٹتا ہوا درخت کے سائے والے حصے میں چلا جاتا تھا۔ اس وقت بھی اس پر دھوپ آگئی تھی۔ روزانہ اسی گھڑی اسے اٹھ کر رسی کی گرفت کے سہارے سائے میں جانا ہوتا تھا۔ اس لیے اسے دھوپ اور رسی کا تناؤ ساتھ ساتھ محسوس ہوا۔ لیکن جب وہ سائے کے حصے کی طرف بڑھا تو اس پر انکشاف ہوا کہ آج رسی کا تناؤ گردن پر نہیں تھا۔ وہ اگلے دونوں پیر زمین پر مار کر اگلے دھڑ سے اٹھا اور نیم کے تنے پر اپنے سر سے ایک سبک سی ٹکر ماری۔ یہ آزادی کے رقص کی پہلی تال تھی۔

ٹھاکر صاحب نے آہستہ آہستہ اسے کچھ افراد سے مانوس کر دیا جس کا لامحالہ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ دیگر افراد کو تھوڑا تھوڑا ساغیر سمجھنے لگا۔ قصبے میں جس صبح انھیں یہ خبر ملی کہ رات نیلے نے گڑھی کی دیوار پھلانگ کر شیشم کی سوٹ چرا کر بھاگنے والے شامو کی کمر توڑ دی ہے تو مارے خوشی کے حویلی میں ناچے پھرے۔ گاؤں پہنچے اور نیلے کے منھ میں کھو کھلا بانس ڈال کر اپنے ہاتھ سے ایک سیر تیل پلایا۔ تیل پی کر وہ اچھلنے لگا۔ ٹھاکر نے بیٹھک میں آکر گاؤں کے ہجوم کو دیکھا جو نیلے کی شکایت لے کر آیا تھا اور صرف ایک ہی بات کہی۔

"رات کے دو بجے شامو گڑھی میں کیا پوجا کرنے آیا تھا۔ بولو۔ جواب دو، چپ کیوں ہو ----"

ظاہر ہے کہ اس بات کا جواب کون دیتا کہ رات کو دو بجے واقعی پوجا کی کوئی مناسب وقت نہیں ہوتا۔

"یہ گئو ماتا کا اوتار ہے۔ دشٹ لوگوں کا ٹھیک ٹھیک پر بندھ رکھے گا۔" ہجوم اٹھ کر چل دیا۔ کچھ بڈھوں نے گڑھی سے نکلتے وقت کن انکھیوں سے نیلے کو دیکھا جو اگلے پیر زمین پر مار مار کر دھول اڑا رہا تھا۔ کچھ لوگوں نے ہاتھ جوڑ کر اوتار کو پرنام کیا۔

گڑھی میں رکھے زیورات کی حفاظت کے اس انوکھے انتظام سے ٹھاکر کا رواں رواں خوش ہو گیا ---- نیلا کبھی کبھی قصبے کی حویلی میں بھی رات گزارتا تھا۔ ٹھاکر نے یہ بھی سوچ سمجھ کر کیا تھا تاکہ قصبے اور دیہات دونوں پر نیلے کی یکساں دہشت قائم رہے۔ نیلا ابھی پٹھا تھا۔ مکمل بالغ نہیں ہوا تھا اس لیے مستی میں نہیں آتا تھا۔ اس لے وہ ان کے ساتھ کتے کی طرح رہتا تھا ---- ساتھ ساتھ ---- وفادار ---- آگے پیچھے ---- دائیں بائیں ----

دیہات کی کھیتی باڑی گردی گانٹھ کا کام سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا۔ نیلے کی وجہ سے چوروں سے بھی خوب حفاظت تھی۔ اسی طرح قصبے کی حویلی میں کبھی کبھی رات گزارنے کی وجہ سے وہاں بھی چوروں کا خطرہ نہیں رہا۔ اب تو کبھی کبھی ایسا بھی ہونے لگا کہ چور تو چور جو لوگ حویلی یا گڑھی میں اپنا حق لینے آتے جیسے گیہوں کاٹنے والے اپنی مزدوری کا گٹھا یا چھت پر مٹی ڈلنے والے مزدور اپنے حصے کا اناج تو ان پر بھی نیلا دوڑ پڑتا تھا۔ وہ لوگ ٹھاکر سے منت سماجت کرتے، نیلے کی کارکردگی کی مبالغے کے ساتھ تعریف کرتے تب ٹھاکر خوش ہو کر انھیں ان کا حق دیتے۔

دیہات اور قصبے کی طرف سے جب فراغت محسوس ہوئی تو ٹھاکر نے شہر کی تجارت میں توجہ بڑھائی۔ دیہات والی چوری کے سانحے کے بعد ادھر وقت نہیں دے پائے تھے۔ شہر کی تجارت بھی زوروں پر چلنے لگی۔

ویسے تو نیلا زیادہ تر کام معمول کے مطابق کرتا تھا یعنی دیہات میں رہتا کسی بھی کھیت میں دو چار منھ مار دیتا کہ جانور یہ تفریق نہیں کر سکتے کہ یہ تیرا ہے یہ میرا ہے۔ کبھی کبھی گڑھی سے تالاب کی طرف جاتے ہوئے اگر گلی تنگ ہے تو وہ راستے میں ملنے والے افراد کے درمیان سینگوں سے راستہ بنالیتا۔۔۔۔ یہ بات بھی ہر فرد بشر آسانی کے ساتھ سمجھ سکتا ہے کہ سینگوں کے بجائے اگر کھروں سے راستہ بناتا تو اس میں لوگوں کو زیادہ زخم آتے۔ کبھی کبھی یوں ہی دولتی بھی چلادیتا جس سے ان لوگوں کے کپڑے اور کپڑوں کے نیچے ذرا کھال وغیرہ بھی پھٹ جاتی معلوم نہیں کیوں لوگ باگ بیچ راستے میں چلنا اپنا پیدائشی حق سمجھتے ہیں۔

اسی طرح جب وہ قصبے میں ہوتا تو کبھی کبھی پڑوس کے کسی بھی گھر میں گھس پڑتا اور مٹی کے برتن وغیرہ توڑ کر شاداں واپس آتا۔۔۔۔

ٹھاکر نے شکایت کے جواب میں، ہمیشہ ہی کہا کہ نیلے نے آج تک کسی کے تانبے پیتل کے برتن نہیں توڑے، ہمیشہ مٹی کے توڑے۔ ٹھاکر چاہتے تھے کہ لوگ نیلے کی اسی حسن تفریق کی داد دیں۔ رفتہ رفتہ لوگ اس سے بیزار ہونے لگے۔ خصوصاً دیہات میں لوگ اپنے کمزور کواڑوں میں بھی بند رکھتے۔

قصبے میں بھی نیلے کو دور سے دیکھتے ہی اہم چیزیں چھپالی جاتیں اور دروازے اگر کھلے ہوں تو بند کر لیے جاتے۔ ٹھاکر نے لوگوں کی اس بیزاری کو بہت برا سمجھا۔ انھیں اکثر خیال آتا کہ وہ کیسے لوگوں کے درمیان زندگی گزار رہے ہیں، جن میں ذرا بھی حسن مزاح نہیں۔۔۔۔ ذرا بھی چونچالی نہیں۔۔۔۔

ایک دن گلفام کو بخرا شام کو روتا ہوا قصبے کی حویلی پر آیا اور بیٹھک میں ٹھاکر کے پیر پکڑ لیے۔ اس نے احوال بیان کیا کہ وہ خوانچہ لگا کر امرود بیچ رہا تھا کہ بغیر کسی اشتعال کے نیلے نے آکر پہلے تو اس کے پانچ عدد امرود کھائے۔ جب اس نے نیلے کو دھکا دیا تو نیلے نے باقی امرودوں کو کچل دیا۔ جب اسے اس حرکت سے روکا گیا تو اس نے گلفام کے اوپر دو پیروں سے حملہ کر دیا جس سے اس کا بازو زخمی ہو گیا اور قمیض پھٹ گئی۔۔۔۔۔ وہ اس کا ہرجانہ چاہتا ہے۔

ٹھاکر نے اس کی بات توجہ سے سنی۔ بلکہ کئی بار واقعات کو بیچ بیچ میں روک روک کر نئے سرے سے سنا۔ اس درمیان انھوں نے نوکر بھیج کر کچھ پاس پڑوس کے کچھ بازار کے آدمی بلوالیے۔ جب سب آکر گھیرا ڈال کر بیٹھ گئے اور گلفام نے ساتویں دفعہ واقعہ بیان کر لیا تو ٹھاکر نے اس سے ایک عجیب شانِ بے نیازی کے ساتھ پوچھا۔۔۔۔

"آج کا بتہ بازاری کا پیسہ بھرا تھا؟"

"نہیں سرکار۔ خوانچہ بڑھا کر ٹھیکے دار کو دیتا۔ شام کو دیتا۔"

"بتہ بازاری کا مطلب ہوتا ہے بازار میں بیچنے کے عوض اس سرکاری جگہ کا روزانہ کا

کرایہ ۔ اتنا تو تم جانتے ہو گے ؟"

"ہاں سرکار ۔"

"اگر تم نے اس وقت تک ہتہ بازاری کا پیسہ نہیں بھرا تو اس کا مطلب صبح سے شام تک تم غیر قانونی انداز میں بیٹھے ۔ بولو ، جواب دو ۔"

گلفام چپ رہا ۔ یہ نکتہ اس کی سمجھ میں عام حالات میں بھی نہیں آتا نہ کہ اس زخمی حالت میں جب کہ اس کے امرودوں کا نقصان بھی ہو چکا تھا ۔

"بولو ۔ ۔ ۔ ۔ بھائی کچھ تو بولو ۔ ۔ ۔ ۔ میں تمھیں پورا موقع دیتا ہوں ۔ میں ان لوگوں میں نہیں جو دولت اور کرسی کے نشے میں غریب کو بولنے بھی نہیں دیتے اور اپنی ہی کیے جاتے ہیں ۔"

یہ کہہ کر انھوں نے بیٹھے ہوئے تمام افراد کے چہرے پر آئے نئے قسم کے تاثرات کا معائنہ کرنا ضروری خیال کیا ۔ تاثرات کچھ کچھ حسب منشا تھے ۔ تجربے نے انھیں بتایا تھا کہ کبھی کبھی کچھ دیر خاموش رہنا ، بولنے کے مقابلے میں زیادہ فائدہ مند ہوتا ہے ۔ وہ چپ ہو گئے ۔ بلکہ خاکساری کے انداز میں سر بھی نیچے جھکا لیا ۔ پھر تھوڑی دیر بعد انھوں نے دھیمے سے فیصلہ کن انداز میں کہا ۔ ۔ ۔ ۔

"آج تم نے ہتہ بازاری کی چوری کی ۔"

پھر کچھ دیر خاموش رہ کر انھوں نے اس سے بھی زیادہ دھیمی لیکن مضبوط آواز میں سوال کیا ۔

"تمھارے کتنے امرود کھائے ۔ دس ، آٹھ ، چار یا پانچ ۔ تم اس بات کو سات دفعہ دہرا چکے ہو ۔ میں اپنے کانوں سے چھ بار سن چکا ہوں جب سے یہ پندرہ لوگ یہاں بیٹھے ہیں تم کئی بار اپنے امرودوں کی تعداد بدل چکے ہو ۔ بولو کتنے امرود کھائے ۔ سات بار یا چھے بار ۔ ان پندرہ لوگوں کے سامنے جواب دو ۔ میں تمھیں ۹ مرتبہ موقع دے چکا ہوں ۔ بولو ۔ ۔ ۔ ۔ سچ کہ جھوٹ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جواب دو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

گلفام بولا:

"نیلے نے میرے پندرہ امرود یا سات امرود یا شاید نو امرود یا میرے خیال میں دو امرود کھائے تھے ۔"

سب ٹھٹھا مار کر ہنسنے لگے ۔ گلفام ان کی طرف بے بس نظروں سے دیکھتا رہا ۔

"آپ لوگوں نے دیکھا یہ کتنی بار امرودوں کی گنتی بدل چکا ہے اب اس کی کس بات کا یقین کریں خاص طور سے اس حالت میں کہ آج اس نے ہتہ بازاری ٹیکس کی چوری بھی کی ۔"

"سرکار ! نیلے نے میرے ہاتھ پر لات چلائی اور خون ناخون کر دیا ۔" گلفام سسکنے لگا ۔

ٹھاکر نے تمام افراد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ۔

"آپ دھرم ایمان سے بولنا۔ ہمارا نیلا جو ہاتھی کے برابر ہے اگر اس لونڈے کو لات مار تا تو کیا یہ زندہ بچ سکتا تھا۔۔۔ کیا اس کے پاس کوئی ثبوت ہے کہ نیلے نے اس کو لات ماری۔ جب کہ خود یہ اس بات کا اقرار کر رہا ہے کہ اس نے بغیر کسی اشتعال کے نیلے کو دو مرتبہ دھکا دیا۔۔۔"

"سرکار! جب اس نے میرے امرود کھائے تب دھکا دیا تھا۔"

"کون سے امرود جن کی صحیح گنتی بھی تم ان پنچوں کے سامنے نہیں بتا پائے ہو۔۔۔"

کیوں کہ اب وہ ۱۵ آدمی پنچ تھے اس لیے ان کا منصف مزاج ہو کر سنجیدگی کے ساتھ فیصلہ کرنا ضروری تھا۔ ان میں سے چند ایک چہرے پر ججوں جیسی سنجیدگی اور کرختگی بھی آگئی تھی۔

فرداً فرداً ان پندرہ آدمیوں نے گلفام سے مختلف نوعیت کے پندرہ پندرہ سوالات پوچھے۔ گلفام نے ہر سوال کا جواب نہایت غلط دیا یعنی ان پنچوں نے کچھ ایسا ہی محسوس کیا۔ اس دوران ٹھاکر بالکل چپ رہے۔ اب کے بولنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں رہ گئی تھی۔ وہ اب اگر بولتے بھی تھے تو چاروں طرف سے سوالات کے نرغے میں گرفتار گلفام کی طرف داری میں ہی کوئی جملہ ادا کرتے۔ ان کی اس غیر جانبداری بلکہ خود مخالفانہ رویے نے پنچوں پر بہت اچھا اثر مرتب کیا۔ سب گلفام کو ملامت کرنے لگے۔ جب مجلس برخواست ہوئی تو سنجوں کا فیصلہ یہ تھا کہ گلفام باغوں سے امرود چرا کر بیچتا ہے اور اس پر یہ دھاندلی بھی کرتا ہے کہ ہتہ بازاری کا ٹکس ادا نہیں کرتا۔ آج اس نے ایک مزید سینہ زوری کرنے کی کوشش کی ایک معصوم گئو سمان پشو پر حملے کا الزام لگایا جو بیچارہ شام کے وقت ٹہلنے کے لیے بازار کی سڑک پر بائیں کنارے کی طرف دب کر ٹریفک کے اصول کے مطابق چل رہا تھا۔۔۔ یقیناً گلفام نے مزہ لینے کے لیے، جیسا کہ اس طرح کے اوباش لڑکے کرتے ہیں، اس بے زبان جانور پر دو یا پانچ یا سات یا نو دفعہ کچے سخت امرود مارے جس سے ممکن ہے جانور کو چوٹ آئی ہو۔۔۔ گلفام ۱۰۰، اٹھا بیٹھی کرے اور ٹھاکر صاحب سے معافی مانگے۔۔۔۔

گلفام نے ۱۰۰ مرتبہ اٹھا بیٹھی کرنا چاہی تو ٹھاکر نے اٹھانوے پر پہنچ کر اسے روک دیا۔۔۔ اور پنچوں کی طرف دیکھ کہا۔۔۔

"اب بس کیجیے۔ اتنی ہی کافی ہے۔ میرا دل بہت نرم ہے۔"

ان کے لہجے میں آنسو دیکھ کر لوگوں نے گلفام کو روکا۔ جب گلفام اپنا ٹوٹا ہوا خوانچہ اور باقی ماندہ امرود لے کر آنکھوں میں آنسو بھرے حویلی سے باہر نکلا تو دروازے پر نیلا کھڑا زمین پر پاؤں مار رہا تھا۔ پنچوں نے اسے للکار کر کہا۔۔۔

"ارے اب اس بے زبان کو امرود تو کھلا دے ہتیارے۔۔۔"

"ہتیارے نے خوانچہ زمین پر رکھ کر آنسو خشک کیے اور امرود دونوں ہاتھوں میں بھر کر بے زبان جانور کے سامنے پیش کیے

(۴)

جب دولت، سیاست اور اقتدار تینوں حاصل ہوں تو بگڑی بات بنانے میں زیادہ محنت نہیں کرنا پڑتی۔۔۔۔ ایک دن ٹھاکر اسی فلسفے پر غور کر رہے تھے تو ان پر ایک عجیب و غریب انکشاف ہوا کہ جب سے وہ دیہات اور قصبے کی دولت کی حفاظت سے بے فکر ہوئے ہیں، سیاست اور تجارت میں خوب وقت دینے لگے ہیں اور ان کی توجہ اور وقت دینے کی وجہ سے سیاست اور تجارت پہلے سے کئی گنا ترقی پر ہیں یعنی ان سب ترقیوں کے پیچھے اس نیلے کا ہاتھ ہے۔ انھیں یہ بات مضحکہ خیز محسوس ہوئی۔ مگر وہ جتنا غور کرتے اسی نتیجے پر پہنچتے ان کی حالیہ ترقی میں نیلے کا بہت عمل دخل ہے۔ یہ بات بڑی حد تک صحیح تھی، دیہات اور قصبے دونوں میں لوگ ٹھاکر صاحب سے زیادہ نیلے سے خوف کھانے لگے تھے۔ لوگ جانتے تھے کہ ٹھاکر صاحب اگر براہ راست کسی کو کوئی گزند پہنچائیں گے تو اس کی تو داد فریاد ہے لیکن نیلے کی کسی حرکت کی داد فریاد اس لیے نہیں ہے کہ اس کی حمایت میں ٹھاکر صاحب کے علاوہ بہت سے غیر جانبدار لوگ بھی شامل ہو جاتے تھے۔ کوئی نیلے کو برا کہہ کر خواہ مخواہ شراپ بھی نہیں لینا چاہتا تھا کیوں کہ ٹھاکر صاحب نے مختلف لوک کتھاؤں سے یہ ثابت کر دیا تھا کہ نیلا بھی گائے ماتا کے بہت ہی قریبی عزیزوں میں ہوتا ہے یعنی تقریباً کزن جیسا۔۔۔۔۔ انھوں نے کزن کا ہندوستانی ترجمہ کر کے بھی بتایا تھا۔

آہستہ آہستہ صورت حال کچھ یوں ہو گئی کہ لوگ نیلے سے مضروب بھی ہوتے وہ بھی اس بات کا کھلم کھلا اعتراف نہیں کرتے مبادا انھیں کی کوئی غلطی سامنے آجائے۔۔۔۔ صورت حال کو اس حد تک پہنچانے کے لیے کئی واقعات عالم ظہور میں پیش آئے۔۔۔۔ جن میں کچھ دیہات میں وقوع پذیر ہوئے اور کچھ واقعات کے لیے قدرت نے قصبے کا انتخاب کیا۔۔۔۔

(۵)

دیہات میں گوجی کے ٹھیک سامنے نھنو کمار کی بیوہ اپنی دو جوان بیٹیوں کے ساتھ رہتی تھی۔ نھنو کمہار کا پچھلے دنوں عارضہ دق میں انتقال ہو گیا تھا۔ صبح تین بجے اٹھ کر تینوں ماں بیٹیاں گدھوں کو لے کر نکل پڑتیں اور دور دور کے تالابوں کی مٹی کھود کر گدھوں پر لاد لاد کر صبح منھ اندھیرے واپس آجاتیں۔ پھر گارا تیار کرتیں۔ کمہار کی جوان بیٹیاں پنڈلیوں تک گارے میں کھڑی، لہنگا ذرا ذرا سا اڑسے ہوئے پھاوڑے سے گارے کو نرم کرتی رہتیں۔ ماں چاک پر بیٹھی برتن ڈھالتی رہتی۔ چار پانچ دن کی محنت کے نتیجے میں جب اتنے برتن بن جاتے کہ بھٹی سلگا کر پکائے جاسکیں تو اپلوں کو بنیاد بنا کر پولے پولے ہاتھوں سے کچے کچے برتنوں کو اس انداز سے سجایا

جاتا کہ ان کے بیچ سانس کی جگہ باقی رہے تاکہ آگ کی گرمی کی لہریں درمیان سے گزر کر تمام برتنوں تک پہنچ سکیں۔

ٹھاکر کے چھوٹے بیٹے اونکار کو کمہار کی بڑی بیٹی کے برتن بہت پسند تھے۔ مگر وہ اونکار کو ہاتھ لگاما تو ایک طرف نظر بھر کر دیکھنے بھی نہیں دیتی تھی، پلو سے چھپائے رکھتی تھی۔ اونکار اکثر گڑھی کی چار دیواری کے دروازے میں مونڈھا ڈال کر بیٹھ جاتا اور دس قدم دور گارے میں ابھرتے ڈوبتے کمہار کی لونڈیوں کے پیروں کو تاکتا رہتا۔ سانولے پاؤں اور اجلے تلوے گارے میں ڈوبتے اور ابھرتے اسی رفتار سے اونکار کا بھی ڈوبتا اور ابھرتا۔۔۔ وہ بیٹھا دیکھتا رہتا کہ لڑکیاں اس کی طرف سے منھ پھیر کر گارے کو اپنے پیروں سے دبا دبا کر نرم کر رہی ہیں۔ وہ وہیں بیٹھا بیٹھا گارے کی طرح نرم ہوتا جاتا اور اپنے اندر مختلف شکلوں کے برتنوں کو ڈھلتا ہوا محسوس کرتا رہتا۔

ایک دن اس نے دیکھا کہ بڑکی نے گارے کی چھینٹوں سے بچنے کے لیے اپنے لہنگے کو تھوڑا سا اونچا کر کے نیفے میں اڑس لیا ہے۔ وہ پنڈلیوں سے ذرا اوپر تک کھل گئی تھی۔ اونکار اس کا بدن پیچھے سے دیکھ رہا تھا۔ میلے میلے الجھے بالوں کے نیچے چمکتی ہوئی سانولی گردن، گردن کے نیچے دبلی پتلی سڈول کمان کی طرح کھنچی ہوئی کمر۔ پشت کے نیچے گارے کو ٹھمکی دیتے پیروں کی دھمک سے ہلتے ہوئے کولھے، پیوند لگا لہنگا اور گھٹنوں کی پشت کا پنڈلی کا سب سے اوپر کا حصہ جو موٹی کھنچی ہوئی رگوں کے بیچ ایک ابھار کی طرح کی واضح تھا اور جس میں اونکار کھڑے ہو کر اپنی شکل دیکھ سکتا تھا۔۔۔۔۔

اونکار کو معلوم تھا کہ اس کی شادی پڑوس کے گاؤں میں طے ہو چکی ہے۔ لڑکا بھی ذات کا کمہار ہے اور انٹر کا امتحان دے رہا ہے۔ اونکار کسی بھی قیمت پر بڑکی کو شادی سے پہلے ایک رات کے لیے حاصل کرنا چاہتا تھا۔ پرتاپ نے اسے اشاروں اشاروں میں منع بھی کیا تھا کہ اس میں پتاجی کی عزت کا سوال ہے لیکن اونکار پر روزانہ گارے کی ٹھمکی کا جادو چڑھ چکا تھا۔ آج اس نے پہلی بار بڑکی کی ٹانگوں کو اتنا کھلا ہوا دیکھا تھا۔۔۔۔ اس نے موٹر سائیکل اٹھائی اور قصبے میں جا کر راکیش کو پوری بات بتائی۔ ٹھاکر اودل سنگھ آج شہر گئے ہوئے تھے۔ دونوں نے شام تک بیٹھ کر حویلی میں شراب پی اور رات گئے موٹر سائیکل پر ایک اور ہم مشرب رمیش کو بٹھا کر واپس آئے۔ موٹر سائیکل ایک ایکھ کے کھیت میں چھپا دی۔ جاڑا بہت تیز تھا اور کہرا بھی تھا۔ جگہ جگہ گاؤں کا دھواں کہرے میں مل کر گاڑھا ہو کر ہوا میں معلق کچھ کچھ ٹھوس ہو گیا تھا۔ گاؤں سو چکا تھا۔ لیکن گاؤں کے سونے کا مطلب خاموشی نہیں ہوتا۔ چھپر تلے بندھی بھینسیں ایک دوسرے سے بدن رگڑتی رہتی ہیں۔ استادہ گائیں سوتے سوتے آنکھ کھول کر ڈکرانے لگتی ہیں اور بے خواب کتے ایک دوسرے پر غرا غرا کر بے ضرر جھپٹیں کرتے رہتے ہیں۔

پہلے تو یہ تینوں چپ چاپ گڑھی میں داخل ہوئے۔ چار دیواری کے پاس ہی بیٹھا سپلا جگالی کر رہا تھا، دیکھ کر کھڑا ہو گیا اور سینگ آگے کر کے، سر نیچا کر کے پینترے بدلنے لگا۔ اونکار نے دھیرے سے بیٹی بجا کر، پاس جا کر اسے تھپکی دی۔ دونوں کو اندر لایا۔ پرتاپ بھی شہر گیا ہوا تھا۔ اس کے کمرے میں اونکار کے دوستوں نے جھانکا۔ ہلکی چاندنی میں کھڑکی کے قتلے ایک جوان عورت کے بدن پر پڑ رہے تھے۔

"یہ کون مال ہے ؟" رمیش نے اونکار سے پوچھا۔

"چپ سالے۔ بھابھی ہے۔"

"ہو ہو ہو ہو۔۔۔۔" راکیش اور رمیش بے ڈھنگے پن سے شرمندہ شرمندہ ہنس رہے تھے۔

تینوں نے اونکار کے کمرے میں بیٹھ کر منصوبے کو آخری شکل دی۔ تھوڑی دیر بعد رمیش نیلے سے بچتا ہوا گڑھی کے دروازے سے باہر نکلا اور کمہار کی بیوہ کے جھونپڑے میں کمہار کی بیوہ کے چند گدھے بندھے خاموش کھڑے تھے۔ جھونپڑے کے پاس آکر رمیش نے آواز دی۔

"مائی او مائی۔۔۔۔!!"

"کو ہے" اندر سے آواز آئی اور چاندی کے ہلکے زیور بجنے لگے۔ لڑکیاں بھی اٹھ گئی تھیں۔ تینوں نے ایک ساتھ آکر بانس کا ٹٹر ہٹایا۔

"میں لکھنا ہوں۔ کھلیل پور سے آیا ہوں۔ تمھارے ہووے والے جمائی پر ڈاکوؤں نے حملہ کر دوَ ہے۔ تمھیں بلایو ہے۔"

"ہے ری دیا" کہہ کر تینوں رونے لگیں۔ بڑی بیٹی نے احتیاط کی کہ آواز زور سے نہ نکلے۔ لکھن نے مشورہ دیا کہ ماں اور چھوٹی بیٹی چلی چلیں۔ بڑی کی سگائی ہو چکی ہے اس کا اس گاؤں میں، خاص طور سے اس گھر میں جانا ٹھیک نہ ہو گا۔

بڑی بیٹی کو اکیلے جھونپڑے میں چھوڑنا بھی ٹھیک نہیں ہو گا۔ لکھن نے مشورہ دیا کہ گڑھی میں بڑی بہو کے پاس چھوڑ دیا جائے۔

بڑی بہو نے اندر کا دروازہ کھول کر پہلے تو واقعے پر افسوس کا اظہار کیا پھر بڑکی کو اپنے کمرے میں بلا کر زمین پر بچھونا دے کر لیٹنے کو کہا۔

کمہار کی بیوہ اور چھوٹی بیٹی لکھن کے ساتھ گاؤں کی حد سے نکل گئے۔

سیاست داں باپ کے بیٹے کا منصوبہ بڑا چپست درست تھا۔ لکھن نے گاؤں سے باہر جا کر ان دونوں ماں بیٹی کو گھونسے مار مار کر بے قابو کیا۔ اور سرد رات تلے آموں کے ایک اجاڑ باغ میں جس کی نشان دہی اونکار نے کر دی تھی، ٹیوب ویل کے کمرے میں رسی سے باندھ کر منھ میں کپڑا ٹھونس کر ڈال دیا۔ چلتے چلتے اس دل میں رحم آیا اور بہت سا پیال اٹھا کر دونوں پر ڈال دیا۔

لکھن اب دوبارہ رمیش بن چکا تھا۔ اس نے گڑھی کے دروازے کے پاس آکر آوازیں

دیں اونکار اپنے کمرے سے زور سے چلاتا ہوا نکلا آتا ہوں کون ؟"
میلے کی بہترین کارکردگی کی وجہ سے پہرے کے نوکر اپنی مڑھیا میں پیال اوڑھے سو رہے تھے۔
بھابھی نے گھبرا کر کھڑکی پر آکر پوچھا۔ کون ہے اونکار۔"
"دیکھتا ہوں بھابھی۔"
دروازے پر آکر اس نے دھیمی آواز میں رمیش کی پوری کارکردگی کا احوال سنا اور بھابھی کے کمرے کی کھڑکی کے پاس آکر بولا۔
" برابر کے گاؤں سے ایک آدمی آیا ہے وہاں پتاجی کے دوست یادو ناساب پر کسی نے حملہ کر دیا ہے۔ مجھے بلایا ہے۔"
"جاؤ، بندوق لے جانا۔"
تینوں گاؤں سے باہر آکر کچھ دیر تک ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرتے رہے۔ بوتل کھول کر ایک ایک گلاس شراب اور پی اور آخری مرحلے کی طرف بڑھے۔ ان کا رخ گوحی کی طرف تھا۔۔۔
صدر دروازے کے بجائے ٹوٹی ہوئی دیوار سے داخل ہوئے اونکار چھپا رہا۔ دونوں نے آگے بڑھ کر آواز دی۔
" اونکار، او اونکار بھائی ۔۔۔۔ "بھابھی گھبرائی آنکھیں ملتی ہوئی ساڑی برابر کرتی ہوئی اٹھی ۔۔۔۔ کھڑکی پہ آکر پوچھا۔۔۔۔ "کون ہو ؟" یادو ناساب پر حملہ ہوا ہے۔ اونکار بھائی کو بلایا ہے۔"
"ابھی ابھی تو اونکار وہیں گئے ہیں۔ گاؤں سے نکلے ہی ہوں گے۔"
" اچھا تم ہم چلتے ہیں۔ آپ کے گھر میں ٹارچ ہوگی ۔۔۔۔ بیٹری ؟ ہماری ٹارچ راستے میں گر پڑی۔ دگڑے پر بہت پانی ہے۔ موٹر سائیکل پھنس جائے گی ۔۔۔۔"
"ہوں ۔۔۔۔ ابھی لاتی ہوں ۔۔۔۔!"
اندر بڑکی جو سب سن رہی تھی بھابھی سے لپٹ گئی ۔۔۔۔ "موہے ڈر لگ رؤاے۔"
" ڈرو مت ۔۔۔۔ کبھی کبھی اچانک چاروں طرف سے مصیبت آجاتی ہے ۔۔۔۔" بھابھی نے ۔ت دلاسا دیا۔ اس نے دروازہ کھول کر ہاتھ بڑھا کر ٹارچ دینا چاہی۔ رمیش نے بھابھی کے ہاتھ کے بجائے کندھے کو پکڑ کر جھٹکے سے کھینچا اور اس سے پہلے کہ وہ چیخ سکے، منھ پر دوسرا ہاتھ رکھ کر ۔ ۔ داخل ہو کر پلنگ پر گرا کر بے قابو کر لیا۔ بھابھی پلنگ پر ٹانگیں مارتی رہی۔ بڑکی منھ پھا ۔ے اس منظر کو دیکھ رہی تھی کہ راکیش نے آگے بڑھ کر اس کے منھ پر ہاتھ رکھ دیا اور ادھر کے ۔ ان بودھوں کے گھٹے کی طرح باندھ کر ڈال دیا۔ بھابھی مضبوط بدن والی نئی عمر کی عورت

تھی ابھی پچھلے ہی سال شادی ہوئی تھی۔ اسے قابو میں کرنے میں زیادہ وقت لگا کیوں کہ ایک ہاتھ سے منھ دبائے رکھنا بھی ضروری تھا۔۔۔۔ اس درمیان اونکار اندھیرے میں کھڑے نیلے کو تھپکیاں دیتا رہا۔۔۔۔ رمیش نے بھابھی کو باندھ کر منھ میں کپڑا ٹھونس دیا۔ رمیش کی سانس بھی اکھڑ گئی تھی۔ کچھ تو طاقت آزمانے کی وجہ سے اور کچھ بھابھی کے گرم گداز بدن کو دیر تک جکڑے رہنے کی وجہ سے۔ راکیش نے بڑکی کو کندھے پر اناج کی بوری کی طرح ڈالا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ بھابھی بھی آنکھیں پھاڑے سارا منظر دیکھتی رہی۔

لالٹین بجھ گئی تھی۔ چاندنی جالی دار کھڑکی سے چھن چھن کر آرہی تھی۔ بھابھی نے دیکھا کہ اسے بے قابو کرنے والا ابھی تک کھڑا اسے غور سے دیکھ رہا ہے اور ہولے ہولے ہانپ رہا ہے۔ وہ پیش آنے والے واقعے سے بے چین ہو کر بندھے بندھے تڑپنے لگی۔ اس کی ساڑی گھٹنوں سے اوپر سرک آئی تھی اور مدھم چاندنی میں اس کی پنڈلیاں دیوالی کی موٹی موٹی موم بتیوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ ہانپنے کی وجہ سے سینہ تیزی سے اوپر نیچے ہو رہا تھا۔ رمیش نے کھڑے کھڑے کچھ سوچا۔ کھڑکی سے جھانک کر راکیش نے سرگوشی میں باہر سے چلایا۔۔۔۔ "ابے جلدی کر۔۔۔۔ کیا کر رہا ہے۔۔۔۔؟"

"آرہا ہوں بے!" یہ کہہ کر اس نے یاد کیا کہ دو تین گھنٹے پہلے ہی اس نے اس بندھی ہوئی عورت کو "مال" کہا تھا۔۔۔۔ وہ اس پر جھکا اور اسے جھپٹتا تا دیکھتا رہا۔ کھڑکی سے ہوا کا ایک جھونکا آیا جس نے نشے کو کچھ ہلکا کیا۔

وہ واپسی کے لیے مڑا۔۔۔۔ پھر کچھ سوچ کر پلٹا اور یہ سوچ کر کہ یہ عورت اس کی بدمعاشیوں کے یار اونکار کی بھابھی ہے، اس نے ہاتھ بڑھا کر ساڑی پیروں تک سرکا دی اور نشے کے عالم میں بھی اس بات کا پورا خیال رکھا کہ ساڑی نیچے سرکاتے وقت اس کا ہاتھ گھٹنوں سے پیروں تک مسلسل عورت کے بدن سے رگڑ تا ہوا نیچے تک آسکے۔ اسی انداز سے اس نے اوپر کا پلو بھی سینے پر برابر کیا۔ دروازے سے نکل کر وہ مسکرایا کہ پورا مال نہ سہی کچھ اٹھنیاں چونیاں تو بین ہی لیں۔

رات بہت اندھیری تھی۔ باہر نکل کر تینوں کمہار کے گھر تک آئے اور اونکار بڑکی کو لے کر اس کے جھونپڑے میں گھس گیا اور دونوں باہر اندھیرے میں چھپ کر پہرہ دیتے رہے۔ رمیش دھیمی دھیمی آواز میں راکیش کو اپنی تازہ فتوحات کا واقعہ سناتا رہا جسے سن کر راکیش "دھت دھت" کرتا رہا۔ لیکن جیسے ہی رمیش خاموش ہوتا، راکیش اس کا چہرا دیکھنے لگتا۔۔۔۔۔۔ "پھر کیا ہوا؟"

اونکار نے زمین پر پڑے پیال پر بڑکی کو ڈال دیا اور اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی اور اپنے سر سے مڑا سا کھول لیا۔۔۔۔ اندر اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ اس نے ماچس جلا کر لونڈیا کا بدن غور

سے دیکھا۔ اسے کچھ مایوسی سی ہوئی۔ دور سے یہ جتنی جاندار نظر آتی تھی اتنی تگڑی نہیں تھی۔ اس نے ماچس دوبارہ جلائی اور اس کے سانولے پیروں اور اجلے تلوؤں کو دیکھا۔ پاؤں سانولے تھے اور تلوے اجلے تھے، لیکن ایڑیوں میں مٹی اور پانی کے مسلسل برتاؤ کی وجہ سے دراریں سی پڑ گئی تھیں۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر اندھیرے میں رانیں ٹٹولیں۔ وہ اتنی سخت نہیں تھیں۔ جتنی وہ سمجھ رہا تھا۔ بڑکی رانوں پر ہاتھ لگنے کی وجہ سے بھڑکنے لگی۔ آنکھوں پر پٹی اور منہ میں کپڑا ہونے کی وجہ سے چہرے کی ہئیت عجیب سی ہو گئی تھی۔ لیکن اتنی بدہئیت نہیں کہ اونکار کا جوش ٹھنڈا پڑ جائے ------ وہ بدن پر ہاتھ پڑتے ہی مچھلی کی طرح تڑپتی تھی۔ اونکار نے معاینے کے آخری مرحلے کے طور پر لونڈیا کی گردن کی جڑ سے نیچے کی طرف ہاتھ پھیر کر دیکھا۔ سینے کے ابھار معمولی تھے ---- اس کے ہاتھ پیڑو کے اوپر چپٹا نما پسلیوں کے ڈھانچے پر آکر رک گئے۔ وہ ایک ایک پسلی کو انگلی سے چھو چھو کر محسوس کرتا رہا اور لونڈیا کے دبلے پن پر افسوس کرتا رہا۔ بڑکی کا بدن گرم تھا اور سانسیں تیز تھیں اس لیے اونکار بالکل بیزار نہیں ہو پایا لیکن اتنی محنت، منصوبوں اور جان جوکھم کے بعد ملنے والے انعام کو اس نے اپنے حق سے کچھ نہیں بلکہ خاصا کم محسوس کیا۔ وہ بڑکی سے اس کا بدلہ لینے لگا اور بہت دیر تک اپنے حساب نت نئے طریقوں سے اسے برتتا رہا۔

چھپر کا ٹٹر لگا کر وہ تینوں کھیتوں تک آئے جہاں ایکھ میں موٹر سائیکل چھپا کر رکھی تھی۔ رمیش کو رخصت کیا اور اندازہ کرنے لگا کہ اپنے گاؤں سے ماں باپ کے گاؤں جانے اور وہاں سے آنے میں زیادہ سے زیادہ کتنی دیر لگ سکتی ہے، اتنا ہی وقت گزار کر وہ گڑھی پہنچنا چاہتا تھا جہاں بھابھی بندھی ہوئی اس کا انتظار کر رہی ہوگی۔

گڑھی میں آکر بھابھی کے کمرے میں پہنچ کر بھابھی کو اس حالت میں دیکھ کر اس نے وہ ساری حرکات کیں جو ایسے موقع پر اسے کرنا چاہیے تھیں۔

بھابھی منھ کا کپڑا نکلتے ہی رونے لگیں۔ جب اس نے پوری بات بتا کر بھی رونا جاری رکھا تو اونکار کو شک ہوا کہ رمیش نے بھابھی کے ساتھ کوئی بدتمیزی تو نہیں کی ہے۔ بھابھی کی گردن کے نیچے اسے نیل کا نشان نظر آیا۔ اس کا سارا نشہ اتر گیا۔ پھر اس نے کرید کرید کر ڈاکوؤں کی حرکتوں کے بارے میں پوچھا۔ بھابھی اسے بڑی مشکل سے یقین دلا پائی کہ اس کی عزت پر آنچ نہیں آپائی۔

اونکار نے بھابھی کو بتایا کہ یہ سب منصوبہ بند سازش تھی یادو ماصاب پر کوئی حملہ نہیں ہوا تھا۔ ان کے گاؤں پہنچنے سے پہلے ہی وہ آدمی راستے میں کسی کام کا بہانہ کر کے دوسرے راستے پر ہو لیا تھا۔ میں بھی ان کے گاؤں تک نہیں گیا تھا، گاؤں کے باہر ہی ماصاب کی خیریت مل گئی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ کوئی اور چکر ہے۔ وہیں سے بھاگا بھاگا آ رہا ہوں۔

اونکار نے محسوس کیا کہ وہ اگر چاہے تو جاسوسی اپنیاس لکھ سکتا ہے۔ لیکن بھابھی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔۔۔
"وہ لوگ بڑکی کو بھی اٹھالے گئے۔ سامنے والی لڑکی کو۔"
"آخر وہ کون لوگ تھے اور انھوں نے ایسی ہمت کیوں کی؟ گھر میں چوری بھی نہیں ہوئی ---کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔" اونکار نے سر پر ہاتھ رکھ کر بھابھی کے سامنے نوٹنکی کی۔
صبح سب سے پہلے کمہار کی بیوہ اور چھوٹی بیٹی گاؤں میں داخل ہوئی جنھیں رگھو بیر باغ والے نے ٹیوب ویل کے کمرے سے آزاد کیا تھا۔۔۔ ان دونوں نے آکر بڑکی کو جھونپڑے میں پاکر اوپر والے کا شکر ادا کیا۔
بھابھی نے تینوں کو بلاکر پوچھا۔۔۔"یہ سب کیا چکر تھا؟" تینوں نے آنکھیں پھاڑے بھابھی کو دیکھتی رہیں۔۔۔
۹ بجے تک پولیس رپورٹ کردی گئی۔ رپورٹ اونکار نے کی تھی کہ بڑکی کے ہونے والے پتی کے کچھ دوستوں نے یہ سب حرکت کی ہے تاکہ اس کا پتی شادی سے پہلے ہی اس کا استعمال کرسکے۔ واقعات کے تانے بانے اس طرح بٹھائے گئے کہ کیس خاصہ اجان دار لگنے لگا۔ کم از کم چوکی کے دیوان کا تو یہی خیال تھا۔ اونکار نے موٹر اسائیکل کی چوری کی رپورٹ بھی لکھائی۔ موٹر سائیکل رمیش اور راکیش کی مدد سے پھر ایک گنے کے کھیت میں چھپائی گئی جو تیسرے دن سویرے برآمد ہو گئی۔ بڑکی کا میڈیکل ہوا جس میں طرح طرح کی ایذا رسانی کے بعد عصمت دری ثابت ہوئی۔ کمہار کی چھوٹی بیٹی کا بھی میڈیکل ہوا لیکن اس کی رپورٹ ٹھیک آئی جس پر گاؤں والوں نے ڈاکٹروں کی ملی بھگت کا الزام لگایا۔۔۔
بڑکی کا ہونے والا پتی کالج سے آتے وقت گرفتار ہوا۔ حوالات سے ہی اس نے اعلان کردیا کہ اس کی سگائی اب ٹوٹی سمجھی جائے۔ وہ میڈیکل رپورٹ کے بارے میں سن چکا تھا۔ البتہ وہ چھوٹی لڑکی سے شادی کرسکتا ہے، اس نے اپنے ماں باپ کو یہی کہہ کر ڈھارس دی۔۔۔ اس کے ماں باپ نے اس کا پیغام کمہار کی بیوہ تک پہنچایا۔
کمہار کی بیوہ کے چھپر کے اندر بڑکی بیٹھی کچھ سوچ رہی تھی۔ برابر میں اس کی بہن چھٹکی انٹرپاس دولہا کے خیال میں مگن، سامنے کھڑے گدھوں کو دیکھ رہی تھی۔ ماں کچے برتنوں کو احتیاط سے اٹھا اٹھا کر ایک دوسرے پر جمارہی تھی۔ سامنے گڑھی کے دروازے سے گڑھی کا صحن نظر آرہا تھا جہاں نیلا کھڑا ہوا اپنے کانوں کی نوکوں کو ہوا کی سمت میں ٹیون کر رہا تھا۔۔۔ بڑکی اچانک سوچتے سوچتے ہنسنے لگی۔ اس کی بہن نے اسے اچنبھے سے دیکھا۔۔۔"کیوں ہنسی بڑکی۔؟"
"بس ایسے ہی۔۔۔"
"بتانا۔۔۔"

"میں سوچ رہی تھی میری سہاگ رات اپنے ہی گھر میں ہو گئی۔۔۔۔"

بڑکی یہ کہہ کر پھر ہنسی۔۔۔۔ چھٹکی یہ سن کر خاموش ہو گئی۔ سامنے جیپ آکر رکی اور نمبر دار اودل سنگھ اترے۔ تیر کی طرح سیدھے اندر گئے۔ کمرے کے باہر کھڑے ہو کر کھڑکی کے راستے بہو سے تسلی کے کچھ جملے کہے۔ اونکار کو بلاکر حالات کا براہ راست علم حاصل کیا اور پہرے کے نوکروں کو بلاکر جوتے لگوائے۔ جوتے کھاکر انھوں نے اقرار کیا کہ وہ اس رات اس لیے سو رہے تھے کہ جب سے نیلا بڑا ہوا ہے وہ گڑھی میں چور تو چور پڑوسیوں تک کو نہیں آنے دیتا۔ اسی لیے انھیں کوئی ڈر نہیں تھا کہ نیلے کے ہوتے ہوئے کوئی ایسی ہمت کر سکے گا۔۔۔۔

شہر سے قصبے اور قصبے سے دیہات تک آنے میں اودل سنگھ نے صرف اسی بات پر غور کیا تھا کہ علاقے میں کس کی اتنی مجال ہوئی کہ ان کی گڑھی میں داخل ہوکر ان کی بہو کو باندھ کر پناہ لینے والی لڑکی کو اٹھا سکتا ہے۔ اس بات پر انھوں نے غور ہی نہیں کیا تھا کہ نیلے کے ہوتے ہوئے یہ واقعہ پیش آیا ہے۔ یہ احساس ہوتے ہی انھوں نے خود کو اندر سے بہت کمزور محسوس کیا۔ کیا نیلا چوکی داری کے کام میں نکما ہو گیا؟ کیا واقعی یہ نکما ہو گیا؟ انھوں نے باہر آکر نیلے کے پاس کھڑے ہو کر اسے بغور دیکھا۔ وہ ان کا ہاتھ چاٹنے لگا۔ آج اودل سنگھ کو اس پر پیار نہیں آیا۔ اس کی زبان کے کانٹے ان کے ہاتھ میں چبھے۔ انھوں نے اس کا منھ پکڑ کر ایک طرف کر دیا اور اندر آکر دالان میں خاموش لیٹ گئے۔۔۔۔

اس کا مطلب ہے اب کوئی بھی گڑھی یا حویلی میں داخل ہو کر کچھ بھی کر سکتا ہے؟ اس کا مطلب میں اب پھر گڑھی اور حویلی کی حفاظت کی پابندی میں پھنس جاؤں گا؟ اس کا مطلب اس نیلے کو پالنا بیکار گیا۔۔۔۔؟

اونکار باپ کو خاموش دیکھ کر ان کے پاس آگیا اور مونڈھے پر بیٹھ گیا۔۔۔۔

"یہ کام کمہار کے جمائی کا نہیں ہو سکتا۔۔۔۔" انھوں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

اونکار سمجھا باپ سوال کر رہا ہے۔ اس نے سمجھاتے ہوئے کہا۔۔۔ "پتاجی! ہو نہ ہو اس کے کسی ناتے دار کا کام ہے۔ وہاں اتنی رات کو کمہار کے گھر آکر کوئی انت جگہ کا آدمی ایسی ہمت نہیں کر سکتا۔۔۔۔"

"تم نے رپورٹ کیوں لکھائی۔ میرے آنے کی راہ تو دیکھتے؟"

اونکار چپ رہا۔

"رپورٹ سے بدنامی بھی تو ہوئی۔"

"بدنامی تو نہیں۔۔۔۔ بھابھی کو کسی نے کچھ۔۔۔۔ مطلب غنڈوں نے کچھ نہیں کیا۔۔۔ حالاں کہ وہ ان کی گردن کے نیچے ایک موٹا سا نیل کا نشان دیکھ چکا تھا۔

"بہو کی بات نہیں گدھے۔ اصل بات یہ ہے کہ لوگ اب گڑھی میں گھسنے سے

ڈریں گے نہیں۔۔۔۔ میں ہوتا تو نہ رپورٹ ہوتی نہ بڑکی کا رشتہ ٹوٹتا۔۔۔۔"

"پھر غنڈوں کا پتہ کیسے چلتا۔۔۔۔"

"اب چل گیا کیا؟" انھوں نے غرا کر پوچھا۔ تھوڑی دیر بعد اونکار اٹھ گیا۔ اودل سنگھ بے چینی سے کروٹیں بدلتے رہے۔ اچھی خاصی ٹھنڈ پڑ رہی تھی۔ بہو نے رضائی لاکر پائنتی رکھ دی تھی مگر انھوں نے اوڑھی نہیں۔

باہر آکر دیکھا تو نیلا زمین پر بیٹھا، بھوسے کا ایک چھوٹا سا ڈھیر لگ رہا تھا۔ انھیں نیلے سے اچانک بیزاری سی محسوس ہوئی۔

گڑھی کے دروازے میں بڑکی داخل ہوئی اور سیدھی بہو کے پاس چلی گئی۔

تھوڑی دیر بعد بہو گھونگھٹ کاڑھ کر بڑکی کا ہاتھ پکڑ کر ان کے پاس آئی۔۔۔۔ "یہ کہتی ہے کہ جس آدمی نے اس کی ماں کو جھوٹے حادثے کی خبر دی تھی وہی آدمی گڑھی میں بھی آیا تھا۔ یہ اس کو آواز سے پہچانتی ہے اور جب وہ مجھے باندھ رہا تھا تو اس نے اس کی صورت بھی دیکھی تھی۔

"کیا اسی نے اس کی عزت لوٹی!"

"نہیں۔۔۔۔۔۔ وہ کوئی اور تھا۔۔۔۔۔۔۔" بہو نے دھیرے سے جواب دیا۔ "اس کا قد کاٹھی؟"

بڑکی نے نظر نیچے کر کے اس آدمی کا حلیہ بتایا اور بتایا کہ اس کے ماتھے پر گھاؤ کے دو نشان تھے۔ بہو نے بھی سر ہلا کر اس کی تصدیق کی۔

"تو نے اس آدمی کو بھی دیکھا جس نے تیرے ساتھ چھیڑخانی کی تھی۔۔۔۔؟" اودل سنگھ نے گاؤں کی لڑکی سے ذرا نرم الفاظ استعمال کیے۔۔۔۔

"نہیں بابوجی۔ میری آنکھوں پر پٹی تھی۔" وہ آہستہ آہستہ سسکنے لگی۔ بہو اسے لے کر اپنے کوٹھے میں چلی گئی۔

ٹھاکر اودل سنگھ کسی گہری سوچ میں پڑ گئے۔ انھیں رہ رہ کر نیلے کے نکمے پن پر تاؤ آرہا تھا۔

شام کو سورج ڈوبنے کے بعد وہ قصبے کی طرف چلے گئے۔ حویلی میں بھی انھیں ٹھیک سے نیند نہیں آئی۔ صبح ہوتے ہی انھوں نے تھانے دار صاحب کو ناشتے پر بلایا۔ اسے آنے میں دیر ہوئی تو ان سے صبر نہیں ہو سکا۔ املی کے درخت کے نیچے ایک میز اور تین کرسیاں پڑی تھیں۔ تھانے دار نے اٹھ کر ان کا استقبال کیا اور پھر ان رجسٹروں کو غور سے پڑھنے لگا جس میں پڑھنے کے لیے کوئی نئی چیز نہیں تھی۔ کیوں کہ سارے اندراجات اس نے اپنے ہاتھ سے کیے تھے۔ تھوڑی دیر مصروف رہنے کے بعد اس نے بڑی لگاوٹ سے پوچھا۔۔۔۔

"نمبردارجی۔ کیا پیوگے چائے یا کافی ۔۔۔۔"

"اماں چھوڑیے چائے کافی آپ ناشتے پر نہیں آئے۔"

تھانے دار نے علاقے کے چوروں، ڈاکوؤں اور غنڈوں کو ماں کی ایک ہی گالی میں بندھتے ہوئے انھیں بتایا کہ پولیس کو کچھ کاغذی کام بھی کرنا پڑتا ہے۔

انھوں نے رازداری کے انداز میں تھانے دار کو بتایا کہ جو غنڈے گڑھی میں داخل ہوئے تھے ان میں ایک کے ماتھے پر زخموں کے دو نشانات تھے۔ وہ کل ملاکر تین تھے لیکن گڑھی میں صرف دو آئے تھے حالاں کہ اصلی کام تیسرے نے کیا تھا۔

تھانے دار نے کچھ پرانے رجسٹر نکالے۔ بڑے منشی جی کو بلاکر سرگوشیاں کیں۔ ایک دو سپاہیوں کو ہم راز بنایا۔۔۔۔

"آپ شام کو تکلیف کرو تو میں ایسے تین چار لوگوں کو حاضر کر سکتا ہوں۔"

شام کو جب وہ دوبارہ تھانے میں آئے تو اس وقت بجلی چلی گئی تھی۔ بڑی بڑی دو لالٹینیں جل رہی تھیں اور ان لالٹینوں کی روشنی میں تین لونڈے ڈنڈے کھار ہے تھے۔ تھانے دار نے انھیں بتایا کہ "یہ گلفام کو بجڑے کا بڑا بھائی ہے جمعراتی۔ یہ رام چندر تیلی کا داماد ہے للو اور یہ ہے کلو پہلوان کا لونڈا اونو د۔۔۔۔ اب آپ پہچانیے۔"

نمبردار اودل سنگھ شش و پنج میں پڑ گئے تھے۔ تھانے کے پھاٹک پر لونڈوں کے عزیز رشتے دار آکر جمع ہو گئے تھے۔ ان میں کچھ لوگ قصبے کے مقامی وکیلوں کو لے کر آئے تھے۔ تھانیدار صاحب نے وکیل حضرات کو کرسیاں پیش کیں۔

اتنے میں حویلی سے نوکر نے آکر اودل سنگھ سے کہا کہ انھیں ترنت حویلی میں بلایا گیا ہے۔

وہ فوراً جیپ میں بیٹھ کر حویلی پہنچے۔ وہاں بھی بجلی نہیں تھی۔ بڑے پھاٹک میں داخل ہو کر جیسے ہی صحن میں آئے ایک آدمی نے اندھیرے سے نکل کر ان کے پیر پکڑ لیے۔ وہ اس کی شکل نہیں دیکھ سکے۔

"کون ہے۔۔۔۔؟ ابے کون ہے۔۔۔۔؟ کیا بات ہے کیا میاں مر گئی۔۔۔۔؟"

"ایسے ہی سمجھو بابوجی۔ صبح سے پولیس دو دفعہ دوش دے چکی ہے۔"

وہ ان کا پیر پکڑے پکڑے دالان تک آیا جہاں لالٹین جل رہی تھی۔ اودل سنگھ بھی ڈیڑھ ٹانگ سے چلتے ہوئے آئے اور لالٹین کی روشنی میں دیکھا کہ جو آدمی ان کے پیر پکڑے ہوئے تھا اسکے ماتھے پر گھاؤ کے دو نشان واضح تھے۔

تھوڑی دیر بعد وہ تھانے میں پہنچے اور انھوں نے گلفام کے بڑے بھائی جمعراتی کی نشان دہی کی کیوں کہ وہ امرودوں والے واقعے کے بعد اودل سنگھ کے پورے خاندان کا دشمن ہو گیا

تھا۔ باقی دونوں کو چھوڑ دیا گیا۔ جمعراتی کے وکیل محمد عمر نے جمعراتی کو کونے میں لے جاکر سمجھایا "وہ جرم قبول کرلے تاکہ حوالات کی مار سے بچ سکے۔ ضمانت ہو جائے گی۔" پورا معاملہ دو ہزار میں طے ہوا۔

ٹھاکر اودل سنگھ قصبے میں نہیں رکے۔ ان کے چہرے پہ سرخی چھلک آئی تھی۔ جیسے کئی گلاس بھر کے تاڑی پی لی ہو۔ وہ دگڑے پر تیزی سے جیپ چلاتے ہوئے گاؤں پہنچے۔ رات ہو چکی تھی۔ گڑھی کا دروازہ نوکروں نے کھولا۔ سامنے سے نوکر ہٹے تو ان کے پیچھے نیلا کھڑا تھا۔ اودل سنگھ نوکروں کو گالیاں دیتے ہوئے نیلے سے لپٹ گئے۔ وہ ان کی گردن کو اپنی کانٹوں والی زبان سے چاٹتا رہا جو اس وقت اودل سنگھ کو پھولوں کی پنکھڑی کی طرح نرم لگ رہی تھی۔۔۔۔

اونکار کو جگایا۔ اسے کوٹھے میں بلایا۔ جب اونکار آدھے گھنٹے بعد باہر نکلا تو پہرے کے نوکروں نے اسے قریب سے دیکھا۔ اس کے گال پر انگلیوں کے پانچ نشان بہت واضح تھے۔ مگر وہ چہرے سے خوش اور مطمئن لگ رہا تھا، بلکہ ایک نوکر نے اسے آہستہ آہستہ ہنستے ہوئے بھی سنا۔ اونکار کے سینے پر ایک ہلکا سا بوجھ تھا تو گال کے ایک چانٹے میں اتر گیا تھا۔۔۔۔

صبح اٹھ کر اودل سنگھ نے آدھ سیر کھوئے کے پھیکے پیڑے بنا بنا کر نیلے منھ میں ڈالے اور آدھا سیر سرسوں کا خالص تیل پلایا۔ پیڑے کھاکر اور تیل پی کر وہ اچھلنے لگا اور پھر چلا تو ایسے چلا کہ عام طور پر نیلے اس طرح نہیں چلتے۔۔۔۔

گاؤں کے پرائمری پاٹھ شالا کے بوڑھے ہیڈ ماسٹر نے جو باقی تین ماسٹروں کا کام بھی خود دیکھتے تھے، اس بات پر حیرت کی کہ نیلا کھویا کھاتا ہے اور سرسوں کا تیل پیتا ہے۔۔۔۔

"اس پر کارکی کھاد سے جنگل کا جانور اندر سے بگڑ جاتا ہے۔۔۔۔۔"

ٹھاکر اودل سنگھ نے ان کی بات سنی ان سنی کر کے جیپ اسٹارٹ کی اور ڈیزل کا دھواں ہیڈ ماسٹر کے چہرے پر دیر تک ناچتا رہا۔۔۔۔

(۶)

نیلا! ۔۔۔۔ اور زیادہ تگڑا ہو گیا تھا۔ پورا دھڑ سیاہ ہو چکا تھا اور سینگ موٹے ہو گئے تھے۔ اب وہ آزادی کے ساتھ بغیر کسی کی مدد کے گاؤں سے قصبے اور قصبے سے گاؤں تک آپ ہی آپ چلا جاتا تھا۔ راستے میں فصل کے اندر سے ہو کر آنے میں اسے خاص لطف ملتا تھا۔ فصل بڑی ہو تو زیادہ نقصان نہیں ہوتا تھا لیکن اگر چھوٹے چھوٹے پودے ہوتے تو نیلے کے کھروں کی پوری پگ ڈنڈی بن جاتی اور اس حصہ کی فصل بری طرف ماری جاتی۔۔۔۔

کسانوں نے ایک آدھا بار دبی زبان سے شکایت کی۔ اودل سنگھ ان کی تالیف قلب کے لیے کہہ دیتے کہ میں اسے سمجھا دوں گا۔ جس وقت وہ یہ کہتے انھیں احساس نہیں ہوتا کہ وہ ایک

جانور کے بارے میں ایسا کہہ رہے ہیں۔ مزے کی بات تو یہ تھی کہ جو لوگ یہ سنتے انھیں بھی احساس نہیں ہوتا کہ یہ بات ایک جانور کو بارے میں کہی جارہی ہے۔

دیوالی انھوں نے اپنے خاندان کے ساتھ شہر میں منائی۔ دیوالی کے دوسرے دن رات کو وہ سب اپنی کوٹھی میں بیٹھے تھے۔ ہلکا ہلکا جاڑا تھا لیکن بالکل اندھیری تھی۔ آسمان پر چھوٹے مدھم تارے چمک رہے تھے۔ کوٹھی کے گیٹ پر کچھ آہٹ ہوئی۔ نوکر نے پاس جاکر دیکھا اور پوچھا۔۔۔۔

"کون ۔۔۔۔؟ کون ہے؟"

باہر سے ایسی آواز آئی جیسے کوئی تیز تیز سانسیں لے رہا ہو۔ نوکر ڈر گیا۔ بھاگ کر اندر آیا۔ ہانپتے ہوئے بولا۔۔۔۔

"باہر کوئی ہے ۔۔۔۔ آواز کا جواب نہیں دے رہا ہے ۔۔۔۔"

سب کے چہروں پر ہلکا ہلکا ہراس پھیل گیا۔ اودل سنگھ اپنے دونوں بیٹوں، بندوقوں اور ٹارچوں کے ساتھ گیٹ پر آئے۔ بندوق کندھے پر رکھ کر گیٹ کھلوایا۔ اندھیرے میں کوئی تیز تیز سانسیں لے رہا تھا۔ ٹارچ جلائی۔ گھنے اندھیرے میں ٹارچ کی مریل روشنی کا دائرہ اس پر پڑا جس کا رنگ سیاہ تھا اور جس کے سینگ موٹے تھے۔

"ارے ۔۔۔۔" سب کو بے حد حیرت ہوئی۔

ٹھاکر اودل سنگھ کسی سوچ میں پڑ گئے۔ نیلے کو شہر کا راستہ تو بتایا ہی نہیں گیا تھا۔ یہ اپنے آپ کیسے آگیا۔؟ پھر بھی انھیں دل ہی دل میں بہت خوشی محسوس ہوئی جیسے نیلے کا یہ کارنامہ ان کی ذاتی کارکردگی ہو۔۔۔

"اس کا اس طرح آنا ٹھیک نہیں ہے۔" پرتاپ بولا "شہر میں نقصان کرے گا تو مشکل ہو جائے گی۔۔۔۔"

"کوئی بات نہیں اسے سمجھا دیں گے۔" اودل سنگھ خوشی سے بولے۔

اونکار نے بھی نیلے کی پیٹھ تھپتھائی۔

رات بھر نیلا لان کے پھولوں کو کھوندتا رہا اور منی پلانٹ کی بیلوں کو کھاتا رہا۔

صبح سب سے پہلے مالی نے یہ نقشہ دیکھا اور زور زور سے نیلے کو گالیاں دینے لگا۔ اودل سنگھ آنکھیں ملتے باہر آئے اور پھولوں اور بیلوں کا حشر اور مالی کو غصے میں دیکھ کر ہنسنے لگے۔ اونکار بھی ان پیچھے کھڑا ہنس رہا تھا۔ بڑکی کے واقعے بعد وہ باپ کی زیادہ چمچہ گیری کرنے لگا تھا۔ بڑی مشکل سے نیلا قصبے لایا گیا اور پھر قصبے سے دیہات پہنچایا گیا۔

ہیڈ ماصاب نے جب یہ واقعہ سنا تو انھوں نے بتایا کہ "جب پراکرتی کے خلاف کھان پان ہوتا ہے تو پیچھے کی آکرتی بگڑ جاتی ہے اور کچھ ایسی بھی شکتیاں پیدا ہو جاتی ہیں جو جانور میں پیدائشی

طور نہیں ہوتیں۔۔۔۔"

معلوم نہیں یہ بات کہاں تک صحیح تھی لیکن اتنا ضرور تھا کہ نیلے سے اب مویشی بھی ڈرنے لگے تھے، سانی کھاتے بیل اسے دیکھ کر رسیاں تڑانے لگتے اور تھان پر بندھے گھوڑے اسے پاس آتا دیکھ کر بجائے اس کے کہ اگلے پیر اٹھا کر حملہ کریں، پچھلے پیر اٹھا اٹھا کر کودنے لگتے تھے۔ گودھی کے سامنے بندھے کمہار کے گدھے تو اسے دیکھتے ہی ایک دوسرے کے پیٹ کے نیچے گھسنے لگتے تھے۔ وہ ان سب سے بے نیاز اینڈتا، بررتا اپنے راستے چلتا رہتا۔ اپنے راستے چلنے سے مراد یہ کہ پڑوس کے گھروں میں گھس کر برتن بھانڈے توڑتا، پاٹھ شالا میں جا کر ہیڈ ماصاب کی کرسی الٹ دیتا اور ننھے ننھے بچوں کو سینگوں سے ریلتا دھکیلتا رہتا۔۔۔۔ وہ اب تک آٹھ بچوں کو زخمی کر چکا تھا۔ ٹھاکر نے ان بچوں کے والدین کو بھری پنچایت میں سمجھایا کہ یہی آٹھ بچے نیلے کو پتھر مار مار کر پریشان کرتے ہیں۔ ورنہ ڈیڑھ سو بچوں میں صرف انھیں آٹھ کو کیوں پسند کرتا۔۔۔۔ باقی بچوں کے والدین نے اپنے اپنے نیک بچوں کا خیال کر کے اطمینان کا سانس لیا اور ان آٹھ بچوں کے والدین کو دیر تک سمجھاتے رہے کہ بے زبان پشو کو چھیڑنا کتنی بری بات ہے۔

نیلے نے ایک دن صبح ہی صبح ہرا چارا کھا کر سرسوں کا تیل پیا۔ ٹھاکر نے آج اسے مونگ پھلی کے دانے بھی دو مٹھی بھر کے کھلائے۔ نیلا اچھلتا ہوا گودھی کے دروازے کے باہر گیا۔ تھوڑی دیر میں شور اٹھا کہ نیلے نے کھیتوں میں گیہوں کی نرائی کرتی بھکیو کی جوان بہو کی آنتیں ایک ہی ٹکر میں باہر نکال دی ہیں۔ ٹھاکر جیپ میں بھکیو کی بہو کو ڈال کر فوراً شہر کے اسپتال پہنچے۔ آپریشن کرا کے دو ہفتے بعد جب گاؤں لائے تو گاؤں والوں نے تیسرے دن پنچایت کا نیوتا دیا۔

اودل سنگھ بھی پنچایت میں موجود تھے۔ پچھلے دو دنوں سے وہ گاؤں کے واحد مندر کے پجاری کے پاس رات کو دیر تک بیٹھے رہے تھے۔

پنچایت میں پنچوں کے پاس ٹھاکر بھی کرسی پر جمے بیٹھے رہے لیکن انھوں نے سر جھکا رکھا تھا۔ بھکیو کے لونڈے نے بڑی تیز آواز میں نیلے کی شکایت کی تھی اور پنچوں سے کہا تھا کہ اسے جنگل میں چھوڑنے کا ترنت پربندھ کیا جائے۔

اودل سنگھ کچھ دنوں سے محسوس کر رہے تھے کہ کچھ برادریاں ان سے خاص طور پر بہت جلنے لگی ہیں۔ بھکیو کی برادری بھی ان میں سے ہی تھی۔ لیکن اس وقت وہ چپ رہے۔ مندر کے پجاری بھی آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ انھیں دیکھ کر پنچوں نے اور کئی لوگوں نے کھڑے ہو کر ڈنڈوت کی اور پجاری جی کو برگد کے گھیرے میں بڑے مونڈھے پر بٹھایا۔

سرپنچ ادھیکاری لال کو اودل سنگھ نے ہی سرپنچ بنوایا تھا۔ وہ اس وقت بڑے شش و پنج میں تھا۔ فیصلہ کرنے سے پہلے اس نے پنچوں سے کچھ مشورہ کیا۔ پھر تھوڑی شرمندگی اور کھسیاہٹ کے ساتھ اس نے اودے سنگھ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔۔۔۔ "نمبردار آپ تو جانتے ہی ہیں، ہم

سب لوگ آپ کے جانور سے کتنا پیار کرتے ہیں۔ پر اب اس کا کچھ پر بندھ کرنا آپ بھی ضروری سمجھتے ہوں گے کیوں کہ پچھلے مہینے اس نے اسکول کے آٹھ بچے زخمی کیے اور بھیکو کی بہو کا پیٹ پھاڑ دیا۔۔۔۔آپ اس بارے میں کیا وچار رکھتے ہیں۔۔۔۔؟"

وہ اگہن کا آسمان تھا اور اگہن کا آسمان نیلا ہوتا ہے۔ وہ ایسا موسم تھا کہ جاڑا تیز ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اس لیے اس موسم میں جاڑا تیز ہونا شروع ہو گیا تھا۔ وہ سب بڑے برگد کے نیچے بیٹھے تھے کیوں کہ اتنی بڑی پنچایت کے لیے گھر چھوٹا پڑتا تھا۔ برگد پر بہت سے پرندے بیٹھے تھے اور بہت شور مچا رہے تھے کیوں کہ پرندے برگد پر بہت شور مچاتے ہیں۔ ٹھاکر خاموش تھے کیوں کہ انھیں معلوم تھا کہ کبھی کبھی خاموش رہنا بولنے سے زیادہ چیختا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ وہ سر جھکائے بیٹھے تھے کیوں کہ اس پوز کے بھی کچھ خاص فائدے ہیں۔ اس وقت اچانک پنچوں نے بولنا بند کر دیا۔۔۔۔سارے میں سناٹا چھا گیا۔۔۔۔

جب اودل سنگھ نے محسوس کر لیا کہ اب سناٹا اتنا گہرا ہو گیا ہے کہ ایک دھیما سا بول بھی اسے کتر کے پھینک دے تو انھوں نے مضبوط اور دکھی لہجے میں فیصلہ کن انداز میں کہا۔۔۔۔

"میں تو صرف پشو کی سیوا کرنا اپنا دھرم سمجھتا تھا۔ پر آپ لوگ اگر آدیش دو تو میں اسے ابھی ابھی گولی مار دوں۔۔۔۔" وہ رک کر بڑی زور سے چلائے۔۔۔۔"رام دین۔۔۔۔! بندوق اٹھا کر لا۔۔۔۔ایل جی کے چار کارتوس بھی۔۔۔۔" پوری پنچایت کانپ اٹھی۔ پنچوں کے سر اپنی اپنی گود میں چلے گئے۔۔۔۔اس سے پہلے کہ سناٹا پھر چھا جائے ایک کڑک دار آواز ابھری۔۔۔۔

"کیا بکتا ہے مورکھ۔۔۔۔گئو بدھ کا شراپ گاؤں پر ڈالے گا۔۔۔۔"

یہ پجاری کی آواز تھی جو مونڈھے سے کھڑے ہو کر غصے سے کانپ رہے تھے۔ انھوں نے سمرتیوں سے ثابت کیا کہ نیلا بھی دراصل گئو ماتا کے خاندان کا جانور ہے۔ اس کی ٹانگیں، اس کے کھر، اس کے سینگ سب ویسے ہی ہوتے ہیں جیسے گائے کے۔۔۔۔انھوں نے بتایا کہ اگر گئو بدھ ہوا تو گاؤں میں پہلے تو ہیضے کی وبا آئے گی جو خاص طور سے گود کے بچوں کو چن چن کر لے جائے گی۔ (ماؤں نے ننھے ننھے بچوں کو سینے سے لپٹا لیا) پھر تیز موسلادھار بارش ہو گی اور کھیتوں کے پودے جڑ سمیت نکل کر اسی سیلاب میں بہہ جائیں گے۔ (مردوں نے اچک اچک کر اپنے کھیتوں کی اور دیکھا) پھر آندھیاں آئیں گی اور درخت یعنی برگد جیسے بڑے ورکش بھی اپنی جٹاؤں کو سمیٹ کر دھرتی سے نکل کر زمین پر بچھ جائیں گے۔ (پوری پنچایت نے سہمے سہمے انداز سے برگد کے درخت کی طرف دیکھا) پھر رات کو بے تال آئیں گے اور گئو بدھ کرانے والوں کے گلے میں دانت گاڑ کر سارا رکت پی جائیں گے۔ (پوری پنچایت نے اپنی گردن پر ہاتھ پھیر کر ہاتھوں کو دیکھا۔ خون کا نشان نہ دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا)۔۔۔۔اب بولو کون کرائے گا گئو بدھ۔ اودل سنگھ! آخر تو سارے گاؤں پر یہ آفت کیوں ڈالنا چاہتا ہے۔۔۔۔بول؟"

نمبردار اودل سنگھ نے ہاتھ جوڑ کر بنتی کی ---- "مہاراج! میں پنچوں کے آدیش کا سیوک ہوں۔ میں گاؤں بھر کی بات سے الگ نہیں جا سکتا۔"

مہاراج جو اب تک مجمع کو پڑھ چکے تھے چیخ کر بولے۔

"گاؤں میں کون ہے جو نیلاے کو مارنے کی بات کہہ رہا ہے؟"

سناٹا چھا گیا۔

"مارنے کی بات نہیں مہاراج جی ----ہم کہتے ہیں کہ اسے جنگل میں چھوڑ دیا جائے ----" بھنگو کا لونڈا کھڑا ہو کر کمنایا۔

"جنگل میں چھوڑ دیا جائے؟یہاں جنگل کہاں ہیں۔ میدان ہی میدان ہیں۔ اگر کسی مُسلّے نے پلے پلائے نیلے کو گولی مار دی تو بدھ کی ذمہ داری گاؤں پر سے ہٹ جائے گی کیا؟ بولو ---- جواب دو ----؟"

ٹھاکر اودل سنگھ سر جھکائے حساب لگاتے رہے کہ پجاری جی نہ صرف یہ کہ مشورے کے مطابق خیالات دہرا رہے ہیں بلکہ تقریباً انھیں الفاظ میں جن کی ریہرسل پچھلی دو راتوں سے ہو رہی تھی۔

"میدان میں کتنے جنگلی نیلے بھاگتے رہتے ہیں کبھی اس کھیت میں کبھی اس کھیت میں۔ کبھی اس کا گیہوں چکھا کبھی اس کی ارہر پر منھ مارا ---- ان میں سے کسی کو تم نے مارا؟ جواب دو؟"

"للکار تو دیتے ہیں ---- بھگا تو دیتے ہیں ----" بھنگو کا لونڈا آسانی سے ہار نہیں مان رہا تھا۔ حالاں کہ زور ٹوٹ رہا تھا ----

"تو اسے بھی للکار دیا کرو ---- یہ تو انسانوں میں پلا ہے۔ للکار فوراً سمجھ لے گا ----"

نیلا گوٹھی کے دروازے سے منھ نکالے پنچایت کا منظر دیکھ رہا تھا۔ پجاری نے اسے ایک نظر دیکھ کر رام لیلا والے انداز میں کہا ----

"بے زبان پشو نے دور سے منشیوں کو دیکھا اور اپنے بارے میں ان کی زبان سے بدھ کی بات سن کر ایشور سے کہا کہ ہے بھگون میں کہاں آ پھنسا ہوں؟ ہے بھگون میں کہاں آ پھنسا ہوں۔ ہے بھگون میں کہاں آ پھنسا ہوں ----؟"

پوری پنچایت نے کھڑے ہو کر گوٹھی کے دروازے سے سر نکالے نیلے کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اس بات کا پورا یقین کیا کہ نیلے نے ابھی ابھی آسمان کی طرف دیکھ کر ایشور سے یہی بات کہی ہے۔ سب کے من بھاری ہو گئے اور سر لٹک کر سینے پر آ گئے۔

اودل سنگھ نے دل ہی دل میں پجاری کو داد دی کہ یہ آخری ٹکڑا مشورے کے مطابق نہ ہونے کے باوجود بڑا اثر دار تھا ----

پنچوں نے تھوڑی دیر بعد اپنا فیصلہ سنایا۔۔۔۔

"سبھی لوگوں سے بنتی ہے کہ نیل گائے کو کچھ نہ کچھ کھلاتے رہنا چاہیے۔ جب بھی وہ ان کے پاس سے گزرے تو اسے کچھ کھانے کو دے دیں۔ اگر وہ سینگ سامنے کر کے آئے تو اسے للکار کر ایک طرف ہٹ جائیں۔۔۔۔ گئو بدھ کے بارے میں کوئی بات دھیان میں نہ لائیں اس سے شراپ لگتا ہے۔۔۔۔"

پنچایت جب چھٹی تو سبھی لوگ اودل سنگھ کے شکر گزار تھے جنھوں نے آج نیلے کو گولی نہ مار کر سارے گاؤں کو مختلف آفتوں سے بچالیا تھا۔۔۔۔ ٹھاکر سر جھکائے سب کا دھنیہ واد خاکساری کے انداز میں قبول کرتے رہے۔ بھنگیو کا لونڈا جب پنچایت سے اٹھا تو اس کا دل مطمئن نہیں تھا مگر وہ بے بس تھا۔۔۔۔ اسے لگا جیسے اندر ہی اندر کوئی نم لکیر دماغ سے آنکھوں تک کھینچ گئی ہے۔ وہ آہستہ آہستہ اٹھ کر اپنے گھر کی طرف چلا جہاں اس کی بیوی پیٹ پر پٹیاں باندھے چارپائی پر پڑی کراہ رہی تھی۔۔۔۔ اس نے سر اٹھا کر گردن موڑ کر اسے دیکھنا چاہا تو پیٹ کے ٹانکوں میں بجلی سے دوڑ گئی۔ اس کا سر دھم سے چارپائی پر آرہا اور وہ ہولے سسک سسک کر کانپنے لگی مگر اس حالت میں بھی اس نے محسوس کیا کہ اس کے پتی کی چال سے ایسا لگ رہا ہے جیسے پنچایت سے واپسی پر خلیفہ حجام نے اس کے پتی کو کسی چھپر تلے گرا کر بدھیا کر دیا ہو۔

(۷)

نیلے کی قصبے والی واردات زیادہ گمبھیر تھی۔۔۔۔

اس واردات کا تعلق بھی دیہات سے ہی تھا بلکہ شاید جنگل سے تھا یا ممکن ہے دونوں سے ہو۔۔۔۔ ایک دن جب سورج کچھ اوپر چڑھ آیا تھا اور ہوا میں گرمی آچکی تھی تو نیلے نے گڑھی سے نکل کر کھیتوں کا رخ کیا۔ کھیت ویران پڑے تھے۔ گیہوں کاٹ کر دائیں چلا کر اور تھریسر کی مدد سے بوروں میں بند ہو کر کھلیانوں میں آچکا تھا۔ کھیتوں کے پاس پہنچ کر نیلے نے زمین پر منھ مارا۔ گیہوں کے سوکھے پودے، جو ادھر ادھر پڑے رہ گئے تھے بہت بے مزہ محسوس ہوئے۔ اس نے بیزاری کے ساتھ سامنے میدان کی طرف دیکھا۔ سامنے اس کے ہم جنس کھڑے تھے۔ اس نے انھیں پہلی بار نہیں دیکھا تھا۔ ایک دفعہ دو موسم پہلے وہ دو تین گھنٹوں کے لیے ان میں رہ بھی آیا تھا۔ لیکن ان کی وحشت کا ساتھ نہیں دے پایا تھا۔ داڑھی والے سیاہ نیلے نے اسے دیکھ کر سینگ آگے کر کے پینترہ بھی بدلا تھا۔ مگر وہ اس سے محفوظ فاصلے پر کھڑا رہا تھا۔ بھوری ماداؤں نے اسے پہلے حیرت، پھر خوشی پھر شوق کی نظروں سے دیکھا تھا۔ اس نے بھی ان میں کشش محسوس کی تھی۔ اچانک پیچھے سے کھیت والوں نے چلا چلا کر روندنا شروع کر دیا تھا۔ داڑھی والا سیاہ نیلا زمین پر اچھلا تھا اور ماداؤں کے پیچھے تیزی سے دوڑنے لگا تھا جو اس سے بھی پہلے کان ہلا ہلا کر دم گھما گھما کر

خطرے کا اعلان کر کے بھاگ چکی تھیں۔ نیلا اضطراری طور پر ان کے پیچھے بھاگا تھا وہ پوری طاقت سے دوڑ رہا تھا مگر ان کا ساتھ نہیں دے پا رہا تھا۔ اسے اتنا دوڑنے کی عادت بھی نہیں تھی۔ دراصل اسے دوڑنے کی ہی عادت نہیں رہ گئی تھی۔ دوڑنے کی عادت ختم ہو جائے تو بدن کی چربی جلتی نہیں، گانٹھ بن کر رگ پٹھوں میں سما جاتی ہے اور بھاگنا تو ایک طرف چلنے میں بھی رکاوٹ پیدا کرتی ہے۔ اتنی باریکیاں وہ شاید نہیں سمجھ پایا تھا لیکن اتنا وہ یقیناً سمجھ گیا تھا کہ ان بھوری، دبلی اور چلبلی ماداؤں اور سیاہ داڑھی والے کے ساتھ ساتھ دوڑنا اس کے بس کی بات نہیں۔۔۔

وہ ایک کھیت میں اچانک رک گیا دوڑتے ہوئے لونڈے اس کے پاس جا کر اسے پہچان کر اپنے ساتھی گڑھی میں لے آئے جہاں اودل سنگھ اس کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ اودل سنگھ نے اسے گڑ کھلایا اور سرسوں کا تیل پلایا تب گانٹھوں کا درد کم ہوا۔ اس دن کے بعد سے اس نے متعدد بار اپنے ہم جنسوں کو دیکھا لیکن کبھی یہ خواہش نہیں ہوئی کہ ان کے پیچھے بھاگے۔ البتہ دل چاہتا تھا کہ دو تین بھوری مادائیں اس کے ساتھ بھی گڑھی اور حویلی میں ہوتیں تو کتنا اچھا ہوتا۔

آج وہ ایک ٹک ان کی طرف دیکھتا چلا جا رہا تھا۔۔۔ داڑھی والا کالا اور مادائیں اس کی طرف منھ کر کے ساکت کھڑے تھے۔ وہ گڑھی اور دیہات سے بہت دور، کھیتوں کو پار کر کے میدانوں میں آگیا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ غیر ارادی طور پر ان کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ ان سے تین چار کھیت دور تھا کہ اچانک رک گیا۔ ان ہم جنسوں کے پیچھے کوئی آدمی ہاتھ میں ایک لمبی چیز اٹھائے چپکے چپکے ببول دیل کی گول میں چھپتا چھپتا آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔ نیلا چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔ وہ آدمیوں کے درمیان پلا تھا، اسے آدمیوں سے کوئی خوف محسوس نہیں ہوتا تھا۔ مادائیں ایک ایک قدم کر کے اس کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ کالا داڑھی والا سب سے پیچھے رہ گیا تھا۔ اچانک وہ آدمی سیدھا کھڑا اور لمبی سی چیز کالے داڑھی والے کی طرف کر کے زوردار دھماکہ کیا۔ کالا داڑھی والا، بھوری مادائیں اور خود وہ، سب کے سب زمین سے ایک ایک ہاتھ اوپر اچھلے۔ کالا داڑھی والا وہیں گر پڑا اور اگلی ٹانگوں سے اٹھنے کی کوشش کی کہ ایک اور دھماکا ہوا اور وہ زمین پر گردن ڈال کر ڈکرانے لگا۔ بھوری مادائیں کنوتیاں بدل کر دم گھماتی ہوئی تیزی سے بھاگیں اور حد نظر تک دوڑتی چلی گئیں، کھو گئیں۔۔۔۔ اس نے دیکھا کہ کالی داڑھی والے کے بدن سے لال لال خون نکل کر زمین میں جذب ہو رہا ہے۔ وہ یہ منظر دیکھ کر گھبرا گیا۔ وہیں اضطراری طور پر زمین پر پیر مارنے لگا۔ دو چار آدمی اس پہلے والے آدمی کے پاس بھاگتے ہوئے آئے اور جیپ لا کر داڑھی والے کو اس میں ڈال کر دھول اڑاتے چلے گئے۔ جس وقت وہ اسے جیپ میں ڈال رہے تھے تو اس کی تھوتھنی اور پچھلی ٹانگیں زمین سے ٹکرا ٹکرا کر گھسٹ رہی تھیں اور وہ آہستہ آہستہ ڈکر ڈکر کر ٹھنڈا ہو رہا تھا۔۔۔ اس کی بے بسی کا یہ منظر دیکھ کر نیلا گھبرا کر پیچھے منھ کر کے جو بھاگا تو گڑھی میں آکر رکا اور پھر ٹھاکر اودل سنگھ کی چارپائی کے پاس کھڑے ہو کر خود کو دوبارہ محفوظ خیال

کر کے اینٹھنے لگا۔

دوسرے دن اودل سنگھ نے اونکار کو بتایا کہ لپٹن کمپنی والے گورے نے کل میدان میں سے ایک نیلا مارا جس پر فیکٹری کے لوگوں نے بہت لے دے کی۔ بڑی مشکل سے پولیس کو دے دلا کر معاملہ ٹالا گیا۔ اس دن کے بعد سے اس نے کبھی جنگل میں ماداؤں کے پاس جانے کی خواہش تک نہیں کی۔ کسی کسی وقت وہ کھوئی خواہش اس کے سر سے شروع ہو کر ریڑھ کی ہڈی سے ہوتی ہوئی اس کی ٹانگوں کے درمیان پہنچتی تھی تو اسے کالے داڑھی والے کی گھسٹتی ہوئی ٹانگیں اور تھرتھری ہوئی تھوتھنی یاد آجاتی۔۔۔۔ وہ سنسناہٹ ٹانگوں کے بیچ سے ریڑھ کی ہڈی سے گزرتی ہوئی واپس سر میں چلی جاتی۔ ٹھاکر اودل سنگھ، قصبے کی واردات والے دن محمود صاحب کی بیٹی کی شادی کے نیوتے میں گئے ہوئے تھے۔ نیلا بھی ان کے ساتھ ہولیا تھا۔ محمود صاحب کی حویلی کے پاس میدان میں بڑا سا رنگین شامیانہ لگا تھا اور چاروں طرف موٹریں اور یکے کھڑے تھے۔ شاید پورے قصبے کی دعوت تھی۔ نمبردار جیپ پر تھے اور آہستہ آہستہ چلا رہے تھے۔ کیوں کہ نیلا بھی ان کے ساتھ ساتھ دلکی میں چل رہا تھا۔۔۔۔ شامیانے کے باہر محمود صاحب نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ نمبردار نے ہاتھ جوڑ کر مبارک باد دی۔ تھوڑی دیر بعد بڑے قاضی صاحب نے خطبہ پڑھا کر ایجاب و قبول کرایا۔ دولہا نے اٹھ کر سہرے سے منھ نکال کر سب کو سلام کیا۔۔۔۔ مبارک بادیوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ ٹھاکر صاحب نے مرغ کا سالن اور دوسروں کی نظر بچا کر بڑے سے کباب کھائے۔ انھیں باراتیوں کے ساتھ ہی بٹھادیا گیا تھا حالاں کہ وہ منع کرتے رہے کہ میں تو لڑکی والا ہوں۔ رخصت ہوتے وقت انھوں نے بٹوے سے ۱۰۱ روپے نکال کر محمود صاحب کو مخاطب کر کے پیش کیے اور ہاتھ جوڑ دیے۔۔۔۔ محمود صاحب نے "اس کی کیا ضرورت تھی" کہہ کر لفافہ شیروانی کی جیب میں رکھا۔ ایک نوجوان باراتی سہرا پڑھ رہا تھا۔ ٹھاکر صاحب نے دیکھا کہ محمود صاحب کا بڑا لڑکا شامیانے کے باہر کھڑے نیلے کو گڑ کھلا رہا تھا۔ وہ اس تواضع سے خوش ہوئے۔ واپسی کی اجازت لے کر وہ رخصت ہوئے۔ نیلا ان کے پیچھے پیچھے چلا۔ بارات کے بہت سے لوگ بھی نیلا کو دیکھنے کی چاہ میں شامیانے سے باہر آگئے تھے۔ ٹھاکر صاحب فخر کے ساتھ جیپ میں بیٹھے۔ نیلا دلکی چلنے لگا۔ راستے میں ایک موڑ کاٹ کر انھوں نے پیچھے مڑکر دیکھا، نیلا رک گیا تھا اور کانجی ہاؤس کے پاس طویلے میں لنیک گائے کو ہری ہوتا دیکھ رہا تھا۔ اچانک وہ اپنی جگہ سے اچھلا اور تیزی سے بھاگتا ہوا جیپ سے بھی آگے نکل گیا اور راستے میں ملنے والے ہر خوانچے کو کھدیڑتا، ہر آدمی کو ریلتا، ہر دوکان کو سینگوں سے دھکیلتا حویلی کی طرف بھاگا۔ راستے میں اس نے اڈے کی مسجد سے نکلتے ہوئے بڈھے ملاجی پر کاری وار کیا۔ وہ جاکر سامنے کی پکی دوکان کے چبوترے سے ٹکرائے اور سر کی چوٹ کھا کر وہیں تڑپ تڑپ کر ٹھنڈے ہونے لگے۔ ٹھاکر تیزی سے حویلی میں آئے اور جیپ کھڑی کر کے دوبارہ واپس آئے جہاں سینکڑوں آدمیوں کا ہجوم اکٹھا ہو چکا تھا۔ کیوں

کہ اس دن محمود صاحب کی لڑکی کی شادی تھی اور محمود صاحب ٹھاکر اودل سنگھ کے پرانے مخالف تھے اور کیوں کہ نیلے کے شکار ہونے والے ملاجی تھے اور کیوں کہ قصبے میں بہت دن سے کچھ ہوا بھی نہیں تھا اس لیے معاملہ اتنی جلدی مذہبی رنگ میں رنگا کہ اودل سنگھ نمبردار کو کسی تیاری کا موقع ہی نہیں ملا۔۔۔۔

محمود صاحب کے باراتی بھی بازار میں آگئے تھے۔ ان کے سامنے محمود صاحب نے سبکی محسوس کی کہ قصبے میں ان کے ہوتے ہوئے اودل سنگھ کا نیلا ایک مسلمان وہ بھی مسجد کے مؤذن کو یوں مار جائے۔۔۔۔ تھوڑی دیر بعد نعرے لگنا شروع ہو گئے۔۔۔۔ "جان کا بدلہ جان سے، خون کا بدلہ خون سے۔۔۔۔" وغیرہ اب ادھر بھی بھیڑ کی تیاری ہوئی۔ اونکار نے راکیش اور رمیش کو ساتوں محلوں میں دوڑایا۔۔۔۔ بھیڑ چیرتا ہوا، ڈنڈا ہلاتا ہوا تھانے کا انچارج وردی پہنے آیا اور ملاجی کو جیپ میں لدوا کر شہر کے اسپتال بھیج دیا گیا۔ بھیڑ جذبات میں بے قابو ہو رہی تھی۔ تھانے دار نے مشورہ دیا کہ تھانے چلے چلیے آپ کے لیے اور میرے لیے وہی زیادہ محفوظ جگہ ہے۔ ٹھاکر اودل سنگھ جب تھانے تک بحفاظت آگئے اور تھانیدار کے دائیں طرف والی کرسی پر محمود صاحب کے مقابل بیٹھ گئے تو ان کے ذہن کی پیڑی نے دوبارہ کام کرنا شروع کیا۔۔۔۔ محمود صاحب کا اصرار تھا کہ فوراً دفعہ ۳۰۲ کی رپورٹ لکھی جائے۔ ٹھاکر خاموش بیٹھے کچھ سوچتے رہے۔ کبھی کبھی منھ اٹھا کر تھانے کے پھاٹک کے باہر کھڑی بھیڑ کو بھی دیکھ لیتے۔ آہستہ آہستہ ان کے آدمی بھی بھیڑ کا حصہ بنتے جا رہے تھے۔ پھر انھوں نے پرتاپ اور اونکار کو دیکھا جو اپنے ہم عمر لونڈوں کے ساتھ ایک الگ گوشے میں کھڑے تھے۔۔۔۔ پھر انھوں نے تھانہ انچارج کو دیکھا جو ابھی ابھی تبدیل ہو کر آیا تھا اور وائرلس پر ایس پی سے کہہ رہا تھا کہ پولیس ہیڈ کوارٹر سے کچھ کمک بھیج دی جائے۔ حالات بے قابو ہو سکتے ہیں۔۔۔۔ پھر انھوں نے محمود صاحب کو دیکھا جن کی جیب میں ان کے ۵۰۱ روپے ابھی بھی پڑے ہوں گے۔ پھر انھوں نے سوچا کہ رام دین اتنی دیر میں نیلے کو دیہات کی گڑھی میں جا کر چھوڑ آیا ہو گا۔ پھر انھوں نے باآواز بلند محمود صاحب سے کہا۔۔۔۔

"محمود میاں۔۔۔۔ میرے دونوں لڑکے بھی یہیں ہیں آپ بھی ذرا اپنے صاحب زادے کو بلا لیجیے تاکہ آپ کو یہ شکایت نہ رہے کہ میرے بیٹوں کو تو میرے ساتھ تھانے میں آنے دیا گیا اور آپ کو محروم رکھا گیا۔۔۔۔"

محمود صاحب اس سخاوت کا مطلب نہیں سمجھے لیکن انھوں نے جلدی جلدی آوازیں دے کر بیٹے کو تھانے میں بھیجنے کے لیے کچھ لوگوں کو ہدایتیں دیں۔ ان کا بڑا بیٹا بھیڑ میں ہی موجود تھا، آکر ان کے پاس خاموش کھڑا ہو گیا۔۔۔۔

ٹھاکر صاحب نے انچارج کے کان کے پاس جا کر کچھ سرگوشی کی۔ انچارج کا منھ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ ٹھاکر صاحب نے اس کے منھ کو دیکھ کر اطمینان کی سانس لی۔ اب ان کے

چہرے پر ان کا پرانا اعتماد لوٹ آیا تھا۔ کیوں کہ تھانہ انچارج کا منھ ابھی بھی اتنا کھلا ہوا تھا کہ اندر سے پان میں رنگی داڑھیں صاف نظر آرہی تھیں۔۔۔۔

"محمود میاں!" ٹھاکر صاحب نرمی سے بولے۔۔۔۔ "آج آپ کی بیٹی کی شادی ہے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ آپ کی تقریب میں کوئی بدمزگی ہو۔۔۔۔"

محمود میاں اور ان کا بیٹا دونوں اس جملے کا مطلب نہیں سمجھے۔ ٹھاکر نے ان کی اس نافہمی کا لطف لیا اور ایک ایک لفظ چبا چبا کر بولے۔۔۔۔ "آج آپ نے شادی میں بلا کر مجھ سے اپنا سیاسی بدلہ لینے کے لیے، مجھے بدنام کرنے کے لیے میرے نیلے کو دھتورا کھلوایا۔۔۔۔آپ کے بیٹے نے اپنے ہاتھ سے دھتورا کھلایا۔ سینکڑوں آدمی اس بات کے گواہ ہیں۔ کیوں میاں تم نے نیلے کو کچھ کھلایا تھا کہ نہیں۔۔۔۔؟"

محمود صاحب کا بیٹا حیران رہ گیا۔۔۔۔

"میں نے تو گڑ کھلایا تھا۔۔۔۔"

"کون یقین کرے گا کہ آپ میرے جانور سے اتنی محبت کر سکتے ہیں۔ آپ تو اس وقت میری عزت کے دشمن ہو رہے ہیں۔"

بازی پلٹتی دیکھ کر محمود میاں کا رنگ فق ہو گیا۔ لیکن انھوں نے پڑھے لکھوں والا ایک پینترا چلا۔۔۔۔

"نیلے کا میڈیکل چیک اپ کروا کر دیکھیں گے۔۔۔۔"

ٹھاکر صاحب ان کا ہاتھ پکڑ کر ایک کونے میں لے گئے۔ بھیڑ خاموش کھڑی دیکھتی رہی۔ انچارج وائرلس پر ملاجی کی خیریت معلوم کرتا رہا۔۔۔۔

ٹھاکر صاحب نے محمود صاحب سے بڑے رازدارانہ لہجے میں کہا۔۔۔۔ "نیلا گڑھی پہنچ چکا ہے اور اب تک اسے برائے نام ہی سہی لیکن اتنا دھتورا کھلایا جا چکا ہوگا کہ میڈیکل رپورٹ میں آجائے۔ کوئی اس بات کا یقین نہیں کرے گا کہ میں نے اسے دھتورا کھلایا ہے کیوں کہ قصبے کی آدھی آبادی اور آپ کی پوری بارات نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ آپ کے صاحب زادے نے اسے گڑ میں ملا ملا کر خوب دھتورا کھلایا۔۔۔۔ اب جیسا آپ بہتر سمجھیں میں تو بہرحال آپ کا شبھ چنتک ہوں۔ میں نہیں چاہوں گا کہ جس بہن کی آج رخصتی ہو رہی ہے اس کے بھائی کو حوالات میں بٹھا کر سوالات کیے جائیں۔۔۔۔"

محمود میاں کی سمجھ کام نہیں کر رہی تھی۔ آج بہت عمدہ موقع ہاتھ سے نکلا جا رہا تھا۔ بیٹے کو کیا ضرورت پڑی تھی کہ اس کم بخت نیلے کو گڑ کھلائے اور وہ بھی سب کے سامنے کھلائے!!

ٹھاکر صاحب کرسی کی پشت سے پوری پیٹھ لگائے اطمینان کے ساتھ تنے بیٹھے تھے۔۔۔۔ اس طرح بیٹھ کر جو بات کہی جائے اس میں بڑا وزن پیدا ہو جاتا ہے۔

انچارج نے موقع کو بڑی جلدی پڑھا اور محمود صاحب سے کہا۔ "۳۰۲ کی رپورٹ تب تک نہیں لکھی جاسکتی جب تک موت واقع نہ ہو جائے ۔۔۔۔ ۳۰۷ کی رپورٹ لکھی جاسکتی ہے لیکن کون لکھوائے گا۔۔۔؟ میں اپنی طرف سے کیس کو تبھی درج کروں گا جب مجھے یہ علم ہو جائے کہ مارنے والا کون تھا اور اس کی ولدیت کیا تھی۔۔۔۔ ٹھاکر صاحب تو کہتے ہیں کہ اس نیلے سے ان کا اتنا ہی سمبندھ ہے کہ وہ ان کی گڑھی میں حویلی میں آجاتا ہے تو وہ اسے کھانا دے دیتے ہیں۔ وہ اسے اپنا پالتو ماننے کو تیار نہیں ہیں۔۔۔۔"

"یہ سچ بھی ہے۔۔۔۔" ٹھاکر اودل سنگھ مضبوط لہجے میں بولے۔ "تو اس کی گردن میں میرا پٹا ہے نہ اسے پالنے کا کوئی نمبری لائسینس میرے پاس ہے۔۔۔۔!!"

"تو اسے گولی سے اڑا دیجیے۔۔۔۔!" محمود صاحب کا بیٹا جوش میں چلایا۔

"ضرور اڑا دیجیے لیکن قصبے کی آدھی آبادی آپ کی دشمن ہو جائے گی کہ یہ گئو ہتیا ہوگی۔ میری طرف سے کوئی انکار نہیں ہے لیکن آپ کو اپنا سمجھ کر کہہ رہا ہوں۔۔۔۔" ٹھاکر صاحب اب ماہر شہسوار کی طرح دلکی چل رہے تھے۔

اب انچارج نے اپنی باری سنبھالی۔۔۔۔

"اہم بات یہ ہے کہ ملاجی کی اصل چوٹ سر کی چوٹ ہے جو دوکان کے چبوترے سے ٹکرانے کی وجہ سے لگی۔ پیٹھ پر تو نیلے کا معمولی دھکا لگا تھا۔۔۔۔"

"کیا وہ جان بوجھ کر دوکان کے چبوترے سے ٹکرائے تھے۔۔۔۔" محمود صاحب کا لڑکا بولا۔

"نہیں۔۔۔۔" انچارج رسائی سے گویا ہوا۔ "لیکن فوجداری عدالت میں اس قسم کی باریکیاں بہت اہم رول ادا کرتی ہیں۔۔۔۔ پھر نیلے پر مقدمہ کیسے چلایا جاسکتا ہے جب کہ ٹھاکر صاحب اسے اپنا پالتو ماننے پر راضی ہی نہیں ہیں۔۔۔۔"

"واہ۔۔۔۔ گڑھی اور حویلی کی حفاظت کرے تو پالتو اور کہیں غلط حرکت کر جائے تو غیر۔۔۔۔" محمود صاحب کا لڑکا بہت طیش میں تھا۔

ٹھاکر صاحب مسکراتے رہے۔ اس درمیان اپنے بیٹوں اور ان کے ساتھیوں کی مدد سے وہ مجمع میں یہ شوشہ چھوڑ چکے تھے کہ نیلے کو دھتورا کھلا کر وقتی طور پر پاگل کرنے والا کوئی اور نہیں ان کے قریبی مخالف محمود صاحب کا بیٹا ہے جو اپنے جرم کا اقرار انچارج تھانہ کے سامنے کر چکا ہے۔ مجمع کے تیور بھی بدلتے جارہے تھے۔ جوش و خروش اچانک کم ہونا شروع ہو گیا تھا۔۔۔

"پھر ایک اہم بات اور۔۔۔۔" انچارج نے قانون کی کتاب کا ایک سبق یاد کر کے بتایا "اگر ٹھاکر صاحب آپ کے حوالے نیلا کو کر بھی دیں تو آپ اس کو مار نہیں سکتے۔۔۔۔ ایک تو عوامی رائے آپ کے خلاف ہوگی کیوں کہ یہ گئو پریوار کا مانا جاتا ہے۔ لیکن میں اس سلسلے میں کچھ

کہنا نہیں چاہتا کیوں کہ میں تو سرکاری ملازم ہوں صرف قانون کی بات سمجھ سکتا ہوں اور سمجھا سکتا ہوں۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ آپ اسے یوں بھی نہیں مار سکتے کہ قانون مجریہ ۱۹۷۲ء کے مطابق اسے مارنا جرم قابلِ دست اندازیِ پولیس ہے اور اس کی سزا۔۔۔۔" وہ چپ ہو گیا اس سے زیادہ بولنا ضروری بھی نہیں تھا کہ محمود صاحب اب رازداری کے لہجے میں ٹھاکر صاحب سے مشورہ کر رہے تھے کہ اگر ملاجی بچ جائیں تو ٹھاکر صاحب کو کیا خدمت کرنا چاہیے اور خدا نخواستہ کام آجائیں تو ان کی بیوہ کو کیا دینا چاہیے۔

انچارج نے پھاٹک پر جاکر پہلے تو سب کو یہ بتایا کہ ایسے موقعوں پر بدلے اور انتقام سے زیادہ اس بات کی پروا کرنی چاہیے کہ مضروب کو جلد از جلد اسپتال لے جایا جائے۔ آپ میں سے کسی نے یہ کام کیا؟ ان کو اسپتال تک لے جانا تو بڑی بات اٹھاکر پانی ہی پلا دیا ہوتا۔۔۔۔" مجمع کو سانپ سونگھ گیا۔۔۔۔

دھارمک رنگ دینے سے پہلے اچھی طرح سوچ لینا چاہیے کہ اس کا انجام فساد بھی ہو سکتا ہے جس میں دسیوں بے گناہ مارے جا سکتے ہیں۔" مجمع کو دوسرا سانپ سونگھ گیا۔۔۔۔

پھر اس نے دیسی گالیوں اور بدیسی کرمنل کوڈ کی مدد سے مجمع کو بتایا کہ مجمع کا ہر آدمی کم از کم دو تین دفعات کی زد میں ہے۔۔۔۔ جب وہ سارے سانپ سنگھوا چکا تو آکر اپنی کرسی پر یوں اکڑ کر بیٹھ گیا جیسے تھانہ انچارج کو بیٹھنا چاہیے۔

جب وائرلس پر ملاجی کی موت کی اطلاع ملی تب اس نے پوز میں قدرے فرق لانا مناسب سمجھا۔۔۔

اس درمیان مجمع چھٹ چکا تھا۔۔۔۔ وہ رات ٹھاکر صاحب نے حویلی میں نہیں گڑھی میں گزاری۔۔۔۔

ملاجی کے خاندان کو ٹھاکر اودل سنگھ نے خاطر خواہ تاوان دیا اور محمود صاحب نے مشورہ دیا کہ اس روپے کو خاموشی سے لے کر کام میں لے آؤ ورنہ مسلمانوں کو معلوم ہو گیا تو تمھاری عزت بھی خاک میں مل جائے گی۔

انھوں نے سمجھایا:

" اور ویسے بھی اس واردات میں ٹھاکر اودل سنگھ کا کیا قصور ہے۔ دراصل نیلا ان کا پالتو جانور تو ہے نہیں۔ اس کا مطلب وہ وحشی ہے۔ وہ وحشی اس لیے کہ ٹھاکر صاحب نے اس کے گلے میں اپنا پٹا تو ڈالا نہیں ہے۔ تو اگر وہ وحشی ہے تو وحشت کبھی بھی بھڑک سکتی ہے اور کیوں کہ وحشت کبھی بھی بھڑک سکتی ہے تو اس میں جانور کا کیا قصور کیوں کہ ایک اعتبار سے جانور ایک الگ چیز ہے اور اس کی وحشت ایک الگ چیز اس لیے کہ جانور پر وحشت ہمیشہ طاری رہتی نہیں۔ کبھی کبھی آتی ہے۔ تو جو چیز کبھی کبھی آتی ہے اس کے لیے جانور بھی مستقل مجرم نہیں

گر دانا جاسکتا۔ تو جانور اگر وحشت سے الگ ایک چیز ہے تو اسے جانور پہلے سمجھنا چاہیے اور وحشی بعد میں۔ تو اگر وہ پہلے ایک جانور ہے اور وحشی بعد میں تو اس صورت میں فیصلہ اس کی جانور والی حیثیت سے کرنا چاہیے نہ کہ وحشت والی حیثیت سے۔ اگر وحشت والی حیثیت سے فیصلہ کرنا ہے تو صرف حالت وحشت کے وقت ہی وہ فیصلہ مناسب جانا جائے گا نہ کہ ہر حالت میں اور کیوں کہ وہ اس وقت وحشت والی حالت میں تو ہے نہیں صرف جانور والی حالت میں ہے تو اس صورت میں ---۔ ملاجی کے خاندان والے راضی ہوگئے۔

محمود صاحب نے خود ہی اندر ہی اندر ناز کیا کہ وہ بھی اگر کوشش کریں تو ٹھاکر اودل سنگھ کے انداز میں خاصی دیر تک گفتگو کر سکتے ہیں یعنی ایسی گفتگو جس میں جھوٹ کبھی بھی نہیں ہوتا یعنی ہر لفظ سچا ہوتا ہے لفظ کے معنیٰ بھی سچے ہوتے ہیں اور ان لفظوں میں جو لفظ ملا کر بولے جاتے ہیں وہ بھی سچے ہوتے ہیں اور ان لفظوں کے اور ان کے علاوہ جو دوسرے الفاظ استعمال ہوتے ہیں ان الفاظ کے معنیٰ بھی سچے ہوتے ہیں۔ بلکہ ان معنیٰ میں جس خیال کی آمیزش اور آمیزش میں جو ایک قسم کی معنوی حقیقت ہوتی ہے اور حقیقت میں جو اصلیت ----

(۷)

ایک عرصے سے شہر کی منڈی کا مزاج بدل رہا تھا اس مزاج کا اثر قصبے اور دیہات پر پڑنا بھی لازمی تھا۔ آہستہ آہستہ غیر محسوس طریقے پر تبدیلی آرہی تھی۔ لیکن حالیہ دنوں میں کچھ تبدیلیاں اچانک اور واضح طور سے سامنے آنے لگی تھیں۔

ٹھاکر اودل سنگھ تبدیلی کو بہت جلد قبول کرتے تھے۔ دیہات میں سب سے پہلے RR21 اور K-68 گیہوں بیج کے طور پر انھوں نے ہی استعمال کیا تھا۔ یوریا کھاد سب سے پہلے انھوں نے ہی اپنے کھیتوں میں استعمال کی ---- تھریسر اور ٹریکٹر تو ضلع میں سب سے پہلے ان کے یہاں آیا تھا ---- کس چیز پر کتنی رعایت ملتی ہے انھیں از بر رہتا تھا ---- کس شہر میں کیا کیا نئی چیزیں استعمال ہو رہی ہیں انھیں سب سے پہلے معلوم ہو جاتا تھا ---- وہ ترقی کرنے اور پیسہ کمانے کے ہر ہنر سے واقف تھے۔ بس پیسے کا صحیح استعمال ایک ایسا باب تھا۔ جس میں وہ زیادہ دل چسپی نہیں لیتے تھے۔ وہ اقتدار اور پیسے کو ایک دوسرے کا حامی و مددگار سمجھتے تھے۔ ان کا ایمان تھا کہ ان میں کوئی بھی چیز ایک دوسرے کے بغیر نہیں حاصل کی جا سکتی۔ اقتدار کیوں کہ چھو کر محسوس کی جانے والی چیز نہیں (اور اس بات کا انھیں بہت افسوس تھا) اس لیے وہ اس کے بدل یعنی پیسے کو بہت حفاظت سے جمع کرتے تھے۔ اور اسی لیے نفسیاتی طور پر وہ نیلے کی ضرورت کے محتاج تھے۔ یہ سچ ہے کہ اس کی وجہ سے بدنامی بھی بہت ہوئی لیکن وہ ساری بدنامیاں پیسے سے دھوئی جا سکتی تھیں۔ اور دھوئی جاتی رہی تھیں اور پیسے کی حفاظت میں نیلے کا بڑا حصہ تھا۔ کبھی

کبھی تو وہ بہت سنجیدگی سے یہ بات سوچتے کہ ان جیسے صاحب دولت اور صاحب اقتدار کے پاس اس قسم کا ایک ہتھیار ہے تو اس میں کوئی برائی نہیں کہ کچھ فتنے اسی لیے پالے جاتے ہیں کہ وہ برے وقت میں ساتھ دیں یا اچھے وقت کو اور بہتر بنائیں۔۔۔۔

مال اور اقتدار کی اس بھاگم بھاگ آنکھ مچولی میں وہ کچھ معمولی چیزیں نظر انداز بھی کر گئے تھے جیسے اپنی خانگی زندگی، ذاتی سکون اور ضمیر وغیرہ۔

جب سے منڈی کے مزاج میں اچانک تبدیلیاں آئی تھیں وہ دن رات اپنی دیہاتی آراضی کی معیشت اور قصبے کی کاروباری زندگی کو شہر کی نئی تبدیلیوں سے ہم آہنگ کرنے میں لگے رہتے تھے۔۔۔۔ انھیں اتنا اطمینان ہر حال میں رہتا تھا کہ اگر ان کی آنکھیں بند ہو جائیں تو ان کے وارث موجود ہیں جو ان کے اقتدار اور تمول دونوں کو بہت سبک دستی کے ساتھ خود تک منتقل کر لیں گے۔۔۔۔ جہاں تک اپنی زندگی کا معاملہ تھا وہ مطمئن تھے کہ جب سے نیلا پالا ہے ان کی گڑھی اور حویلی کے علاقے میں دہشت پھیل گئی ہے اور کوئی ان کی دولت اور اقتدار کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔۔۔۔

ٹھاکر اودل سنگھ شہر کی منڈی کی تبدیلیوں سے اپنی معیشت کو ہم آہنگ کرنے اور قصبے کی سیاست میں خود کو مستحکم کرنے اور دیہات کی آراضی سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش میں مستقل لگے رہتے۔ ان کے بیٹے بھی ان کے مددگار تھے حالاں کہ یہ اور بات ہے کہ ان کا مزاج اور عادتیں ٹھاکر کے مزاج اور عادتوں سے قدرے مختلف تھیں۔ خود دونوں بیٹوں کا مزاج ایک دوسرے سے بہت مختلف تھا۔۔۔۔ بڑا پرتاپ اپنی بیوی کے ساتھ مگن، دیہات کے لوگوں سے زیادہ مصروف رہتا ہے۔ اسے اندازہ تھا کہ ان کے خاندان کی ساکھ کی اصلی بنیاد دیہات کی آراضی ہے۔

چھوٹا اونکار دیہات، قصبے اور شہر تینوں میں دل چسپی لیتا تھا اور نتیجتاً کسی بھی ایک جگہ لگ کر کام نہیں کر پاتا تھا۔۔۔۔ باپ کا زیادہ منظور نظر وہی تھا۔۔۔۔ زندگی کے دوسرے مظاہر میں بھی اس کی دل چسپی زیادہ تھی۔ حالاں کہ پچھلے سال اس کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی تھی اور بیوی بھی بڑی خوب صورت اور چلبلی ملی تھی لیکن وہ قدرت کی دیگر نعمتوں کا منکر نہیں بننا چاہتا تھا۔۔۔۔

(۸)

ادھر کچھ دنوں سے گاؤں کے ایک حصے نے محسوس کیا کہ ان کو ان کا پورا حق بھی نہیں ملتا۔۔۔۔ نہر کا بمباسب کی مشترکہ ملکیت تھا لیکن اس کی زیادہ تر نالیاں ٹھاکر کے اپنے کھیتوں میں یا اس کی موافقت والوں کے کھیتوں میں کھلتی تھیں۔ پرانی پیڑھی بمبے کی ان نالیوں کو بمبے کی تعمیر کا ایک جز سمجھتی تھی لیکن جب سے لونڈے جوان ہوئے تھے کہنے لگے تھے کہ بمبے میں نئی

نالیاں بھی بنائی جا سکتی ہیں اور یہ کہ کچھ پرانی نالیوں کو بند بھی کیا جا سکتا ہے کہ ان کی وجہ سے کبھی کبھی پانی بہت برباد ہو جاتا ہے۔۔۔۔ وہ اکثر اس قسم کی شکایت لے کر ٹھاکر کے پاس آتے تو گڑھی کے دروازے پر کھڑا نیلا سینگ آگے کر کے انھیں روک دیتا۔۔۔۔ وہ الٹے قدموں واپس تو چلے جاتے لیکن دل ہی دل میں آگے کے منصوبے بناتے ہوئے واپس جاتے۔

ضلع پریشد سے کوئی اسکیم اگر گاؤں کے لیے پاس ہوتی تو اس کا فائدہ بھی ان گھرانوں کو ہی ملتا جو ٹھاکر کے زیادہ قریب تھے۔ ٹھاکر نے سیاست کے طور پر اپنے گھر سے دور گاؤں کی سرحد پر بنے دو ایک گھرانوں کو بھی مراعات کا حصہ دار بنا رکھا تھا تاکہ گرام پنچایت میں کوئی یہ شکایت نہ کر سکے کہ ٹھاکر صرف ان گھرانوں کو فائدہ پہنچاتا ہے جن کی دیواریں اس کی گڑھی سے ملی ہوئی ہیں۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ وہ سرحدی گھرانے بھی اس کی حمایت کا دم بھرتے رہتے اور گاؤں میں ایک طرح کا توازن قائم رہتا۔ یہ اور بات ہے کہ یہ توازن اکثر ٹھاکر کے ہی حق میں جاتا تھا۔ گاؤں کی حد تک ٹھاکر کی کوشش بھی یہی رہتی کہ توازن اس کے اور اس کے حمایت والوں کے ہی حق میں رہے۔ متاثرہ افراد کا سامنا ٹھاکر سے ہو ہی نہیں پاتا تھا کہ گڑھی کے دروازے پر نیلا انھیں روک دیتا تھا۔ غیر فطری غذا کھا کھا کر نیلے کی جبلت میں بھی کچھ حیرت انگیز تبدیلیاں ایسی آگئی تھیں کہ وہ کبھی کبھی خود بخود گڑھی سے نکل کر ان متاثرہ افراد کے گوشے میں پہنچ کر ان کے گھروں میں گھس کر توڑ پھوڑ مچلتا اور بچوں اور عورتوں کو کھوندتا ہوا، اینڈتا ہوا واپس آجاتا۔۔۔۔ ٹھاکر کی شبہ پجاری کی موافقت اور قانون کے ڈر کی وجہ سے کوئی اسے براہِ راست گزند نہیں پہنچا پاتا تھا۔

قصبے میں۔۔۔۔ جو ٹھاکر کی سیاست کا مرکز تھا، کم و بیش یہی حالت تھی۔ البتہ شہر کے حکام کبھی کبھی ٹھاکر کو تنبیہہ کر دیتے تھے۔ شہر کے حکام بھی صرف اسی حد تک تنبیہہ کرتے تھے کہ جس حد تک وہ ضروری سمجھتے تھے تاکہ دوسرے قصبے والے زیادہ الارٹ نہ ہو جائیں۔۔۔۔

زندگی بہت خاطر خواہ توازن کے ساتھ چل رہی تھی۔۔۔۔ گڑھی میں پرتاپ کی بیوی نے بچوں کی ہنڈیا پکوائی۔ محلے پڑوس کے لوگوں کو بھی بلایا۔ کمہار کی بیوہ پچھلے موسم میں اپنے پتی کے پاس جا چکی تھی۔ چھٹکی بیاہ کر اپنی بڑی بہن کے منگیتر کے گھر جا چکی تھی۔ بڑکی اب اپنے خاندان میں اکیلی تھی۔ برتن بنانے کا کام اکیلے اس کے بس کا نہیں رہ گیا تھا۔۔۔۔ میڈیکل رپورٹ کے بعد جب اپنا منگیتر ہی انکاری ہو گیا تو اس سے اور کون شادی کرتا۔ وہ راضی بہ رضا زندگی گزار رہی تھی۔ گدھے بیچ کر اس کا پیسہ بڑی بہو کے پاس جمع کرا کے وہ گڑھی میں ہی چھوٹا موٹا کام کر کے وقت گزار لیتی تھی اور کبھی جھونپڑے میں اور کبھی بہو کے پائنتی سو جاتی تھی۔ اس کا منگیتر یعنی بہنوئی مقدمے سے بری ہو گیا تھا۔ کیوں کہ ٹھاکر صاحب نے پولس کے کیس داخل کرنے سے پہلے ذاتی استغاثہ دائر کر دیا تھا اور پھر عدم پیروی میں اپنا کیس خارج کرا لیا تھا۔۔۔۔

ٹھاکر صاحب جانتے تھے کہ اس قسم کے فضول مقدموں کو جیت کر بھی کوئی فائدہ نہیں ہے۔

نئی بہو زیادہ چھوا چھوت نہیں مانتی تھی۔ بڑکی کو خوب اچھی طرح نہا کر آنے کی ہدایت کی تھی اور جب وہ آئی تو اسے پوریاں بیلنے کو بٹھا دیا۔ بڑکی عزت افزائی پر خوش ہو کر جھوم جھوم کر پوریاں بیلنے لگی۔ اونکار بھی سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ پرتاپ کے بچے وہیں رسوئی میں جمے بیٹھے ہنڈ کلیا پکنے کا انتظار کر رہے تھے۔ اونکار کو محسوس ہوا کہ بڑکی اس رات کے مقابلے میں اب کچھ تگڑی ہو گئی ہے۔ وہ اونکار کے اس احساس سے بے خبر جھوم جھوم کر پوریاں بیلتی رہی۔ ظاہر ہے جب وہ جھوم جھوم کر پوریاں بیلے گی تو پورا بدن جھولے گا۔ جب پورا بدن جھولے گا تو وہ حصے بھی جھومینگے جن کے بارے میں اونکار زیادہ متفکر تھا۔ بھائی کے بیٹے کو پیار کرنے کے بہانے اونکار نے جھک کر اس کی کرتی پر نظر جمائی اور اگلی پوری بیلنے کا انتظار کرنے لگا۔ بڑکی کو ہلکا سا احساس ہوا کہ اونکار بابو بہت قریب آ گئے ہیں۔ مگر وہ چپ رہی۔ جیسے ہی وہ بیلتے بیلتے آگے جھکی، اونکار نے بچے کو چومنے کے بہانے اپنا سر آگے کر دیا اور اس دفعہ کامیاب تھا اس نے اپنی فکر کو دو بڑے بڑے میدے کے پیڑوں کی شکل میں مجسم دیکھ لیا تھا لیکن اس بھی زیادہ اہم ایک اور بات ہوئی جس کا اونکار کو وہم و گمان بھی نہیں تھا۔۔۔۔

جس کا بدن برتتے وقت اس نے آنکھ پر پٹی باندھ دی تھی اگر ناک پر بھی باندھی ہوتی تو بڑکی اونکار کی سانس کی مہک محسوس کر کے آج چونکنا نہ ہوئی ہوتی۔ اس نے زندگی میں صرف ایک مرد کی سانس کی مہک سونگھی تھی اس لیے اپنا مجرم پہچاننے میں اسے کوئی دقت نہیں ہوئی۔ اب اُسے معلوم تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ اس نے دھیرے دھیرے اپنے آپ کو اور آگے جھکا دیا اور اونکار کا چہرہ دیکھے بغیر اسے اندازہ ہو گیا کہ اس وقت اونکار کے دل کی کیا حالت ہو گی اس طرح اس نے اونکار کی سانسوں کی مہک کی دوبارہ تصدیق کی۔ اس نے اس رات جھونپڑے کی اذیتوں کو یاد کیا تو اسے ابکائی سی آ گئی۔۔۔۔ وہ تیزی سے پوریاں بیلتی رہی۔۔۔۔ کسی کے آنے کی آہٹ ہوئی تو اونکار بچے کو لیے لیے رسوئی کے دوسرے کونے میں جا کر بچوں جیسی باتیں کرنے لگا۔ آنے والی بڑی بھابھی تھی۔ وہ پوریاں بیلتی رہی اور بڑی بھابھی کے چہرے کو دیکھتی رہی۔

رات کو اس نے بڑی بھابھی کے سر میں خوب طبیعت سے تیل لگایا۔ اس کی پیٹھ پر مالش کی۔ پھر ان کی ٹانگوں کو گود میں رکھ کر دیر تک ان کی پنڈلیاں دباتی رہی۔ جب بھابھی بدن دبواتے تھک گئی تو بولی۔۔۔۔

"اب سو جا بڑکی۔"

بڑکی آہستہ آہستہ رونے لگی۔

"کیا ہوا۔" بھابھی نے اچنبھے سے پوچھا۔

بڑکی نے ان کے دونوں پیر ہاتھوں میں تھامے اور ان پر اپنا سر رکھ کر بولی۔۔۔۔ "میرد

یوں اونکار بابو نے لوٹوائے۔"

وہ زمین پر اور بڑی بھابھی چارپائی پر لیٹی پچھلے موسموں کی وہ خوفناک رات یاد کرتی رہیں۔ اونکار کے دوست نے جہاں جہاں نیل ڈالے تھے ان پر ہاتھ پھیر کر بڑی بھابھی نے دانت پیستے ہوئے رات کاٹی۔۔۔۔

دوسرے دن بڑکی اپنی بہن سے ملنے اس کے گاؤں چلی گئی اور دو تین دن بعد واپس آکر اپنے کام میں لگ گئی۔ وہ اندر سے آتے جاتے نیلے کو کچھ نہ کچھ کھلا دیتی۔ نیلا بھی اسے دیکھ کر اگر بیٹھا ہوتا تو اٹھ کر اس کے پاس آکر اس کا ہاتھ چاٹنے لگتا تھا۔۔۔۔

ایک رات جب کہرا بہت شدید تھا اور گاؤں کے دھوئیں میں مل کر بہت گاڑھا اور ٹھوس ہو گیا تھا اور ہوائیں تیز تھیں اور جاڑا شدید تھا تو گوٹھی کی ٹوٹی ہوئی دیوار سے دو سائے بغیر آواز کے اندر کودے اور سیدھے اونکار کے کوٹھے میں پہنچے۔ اونکار کے پلنگ کے پاس پہنچ کر اس نے، جو زیادہ تگڑا تھا، اونکار کے منھ پر ہاتھ رکھ کر گردن دبائی اور گوٹھی کی طرح باندھ لیا۔۔۔۔ دوسرے نے اونکار کی سوتی ہوئی بیوی کو، جو چونکی تک نہیں تھی، اس انداز سے بے قابو کیا کہ اس کا ایک ہاتھ تو تکیے کے ذریعے اس کا منھ دبائے ہوئے تھا اور دوسرا ہاتھ چاقو تھامے تھا جس کی چمک اونکار کی بیوی کو اندھیرے کے باوجود نظر آرہی تھی۔ وہ گھگیانے سی لگی مگر آواز تکیے کی دبازت میں گھٹ کر رہ گئی۔ پھر اس نے اطمینان سے اسے اچھی باندھا اور منھ میں کپڑا ٹھونس دیا۔ تگڑا آدمی بڑی گٹھری کو لے کر گوٹھی کے دروازے سے نکل گیا۔ دوسرا آدمی چھوٹی گٹھری کو لے کر سامنے کمہار کے جھونپڑے میں گیا اور اونکار کی بیوی کو پیال پر ڈال کر، آنکھوں پر پٹی باندھ کر اپنے چہرے کا ڈھاٹا کھول کر پورا سبق یاد کیا جو اس کی سابقہ منگیتر اور حالیہ سالی نے اس کے گھر آکر اسے پورا ماجرا بتا کر یاد کرایا تھا۔۔۔۔

بڑکی اس درمیان نیلے کو کھوئے کے پھیکے پھیکے پیڑے کھلاتی رہی اور سرسوں کا خالص تیل پلاتی رہی۔ اور پچھلوں سے اندازہ کرتی رہی کہ اب کیا ہو رہا ہوگا۔۔۔۔

اگلی صبح بہت سی تازہ خبروں کے ساتھ طلوع ہوئی۔ پہلی خبر تو یہ تھی کہ اونکار گھر سے غائب تھا اور اس کے کپڑے نہر کے کنارے پائے گئے تھے۔

دوسری خبر یہ تھی کہ اونکار کی بیوی کو کوئی زبردستی اٹھا کر لے جانے کی کوشش کر رہا تھا مگر وہ جان بچا کر بھاگ آئی۔ یہ خبر تو بالکل سچ تھی کیوں کہ کسی نے اسے اٹھا کر لے جانے کی کوشش تو کی تھی یہ اور بات ہے کہ وہ کامیاب بھی ہوا تھا۔ خبر کا دوسرا حصہ بھی سچ تھا کہ وہ اپنی جان بچا کر بھاگ آئی کہ بہر حال اس کی جان تو بچ ہی گئی تھی۔۔۔۔

تیسری خبر یہ تھی کہ جب ٹھاکر نے اپنے بہرے کے نوکروں پر جوتے پڑوائے تو اس دفعہ انھوں نے کوئی اعتراف نہیں بلکہ صرف یہ واقعہ بیان کیا کہ بڑکی کے ہاتھ سے رات کو کھانا

اور گڑولے کر، کھانا اور گڑ کھا کر وہ لوگ لیٹ گئے تھے اور معمول سے زیادہ دیر تک جاگتے رہے تھے کہ گڑ میں بہت کڑواہٹ تھی جیسی کہ پرانے گڑ میں پیدا ہو جاتی ہے اور پھر بے خبر سو گئے تھے جیسا کہ روز سوتے تھے۔ کیوں کہ اب نیلے کی موجودگی میں انھیں چوکیداری کرنے کی زیادہ ضرورت نہیں تھی۔

چوتھی خبر یہ تھی کہ چھنکی کا پتی گڑھی کے پیچھے مردہ پایا گیا۔ اس کے سینے پر چاقوؤں کے کئی گھاؤ تھے۔ بعد میں میڈیکل رپورٹ نے بتایا کہ موت چاقو کے زخموں اور زیادہ خون نکل جانے کی وجہ سے ہوئی۔ ساتھ ہی ساتھ معدے میں دھتورے کے بیج بھی پائے گئے۔

پانچویں خبر یہ تھی کہ بڑکی اپنے جھونپڑے میں مردہ پائی گئی بعد میں میڈیکل رپورٹ سے پتہ چلا کہ اس کے معدے میں دھتورے کے بیج پائے گئے۔ اس کے بدن پر چوٹ کا کوئی نشان نہیں تھا۔۔۔۔

ایک معمولی خبر یہ بھی تھی کہ بھیکو کا لونڈا اچانک پاگل ہو گیا ہے اور بار بار ڈوبتے ہوئے آدمی کی نقلیں کرتا ہے اور ہنستا ہے۔۔۔۔

ایک ضمنی خبر یہ بھی تھی کہ بڑی بہو نے پرتاپ سے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ یا تو وہ اسے میکے بھیج دے یا پھر اس کے ساتھ آکر گڑھی میں رہے۔ اس ضمنی خبر میں ایک ضمنی ٹکڑا یہ بھی تھا کہ بڑی بہو کو اب نیلے سے بہت ڈر لگنے لگا ہے۔

علاقے کی پولیس نے اس متعدی قتل کیس میں بہت جی جان سے محنت کر کے تفتیش کی اور ایک ہفتے کے اندر اندر ایک ایک واقعہ کی چول سے چول بٹھا دی۔

کمہار کی چھوٹی لڑکی چھنکی کے خلاف چارج شیٹ داخل ہوئی جس کا لب لباب یہ تھا کہ چھنکی بھیکو کے بیٹے کی آشنا تھی۔ ان دونوں کو نامناسب حالت میں دیکھ کر چھنکی کے شوہر پر پاگل پن کا دورہ پڑ گیا۔ اس نے انتقاماً گڑھی میں جاکر کسی بہانے سے بڑکی کو بلایا اور کسی نہ کسی طرح راضی کر کے پہرے داروں کو دھتورا اور پھر بڑکی کو دھتورا کھلا کر خود بھی دھتورا کھا کر بری نیت سے بڑکی کو اس کے جھونپڑے میں لے گیا لیکن اس درمیان اونکار کی آنکھ کھل گئی اس نے باہر آکر جھونپڑے کے پاس جاکر چھنکی کے شوہر کو للکارا۔ چھنکی کے شوہر نے اونکار پر قابو پالیا اور راز کھلنے کے ڈر سے اس کی گٹھڑی بنا کر نہر میں ڈبو دیا۔ نہر کی پٹڑی پر بھیکو کے بیٹے نے یہ ڈوبنے والا منظر دیکھا اور ہوش و حواس کھو بیٹھا اور دوسرے گاؤں جاکر چھنکی کو بلا لایا۔ چھنکی نے جب یہ سنا کہ اس کا شوہر بڑکی کی عزت لوٹنا چاہتا تھا تو وہ غصے میں گاؤں آئی اور اس نے اپنے دھتورے کے نشے میں مدہوش شوہر کو اونکار کی بیوی کو اٹھا کر لاتے اور پھر اسے جان بچا کر بھاگتے دیکھا تو یہ سوچ کر طیش میں آگئی اور سوچا کہ تھوڑی دیر پہلے اس نے میری بہن کی عزت لوٹنا چاہی اور اب ایک معصوم انسان کا قتل کر کے اس کی بیوی کی عزت لوٹنا چاہتا ہے، یہ سوچ کر تیہے میں آکر اس

نے دھتورے کے نشے میں مدہوش شوہر کو چاقو سے مار مار کر ختم کر دیا اور اور بھاگ کر اپنے گاؤں پہنچ گئی۔ بھیکو کا بیٹا یہ دو قتل دیکھ کر پاگل ہو گیا۔ شہادت کے طور پر چھنکی کے گاؤں کے کچھ لوگوں کا نام دیا گیا تھا جو اس بات کے چشم دید گواہ تھے کہ پچھلے دو روز سے بھیکو کا بیٹا چھنکی اور اس کے شوہر سے ملنے آرہا تھا۔۔۔۔

چھنکی نے زنانہ حوالات کی سلاخوں سے سر نکال کر سوچا کہ وہ تو کہیں آئی نہ گئی، اس نے اپنے پتی کا خون کیوں اور کیسے کر دیا۔ میں نے تو بھیکو کو بڑکی کے ساتھ تین دن پہلے اپنے گاؤں آتے دیکھا تھا تو پوچھنے پر بڑکی نے بتایا کہ بھیکو اپنی پتنی کو چھوڑ کر اس سے شادی کرنا چاہتا ہے اسی لیے چھنکی کے پتی کے پاس روز مشورہ کرنے آتے ہیں۔ میں چوکے میں بیٹھی ان تینوں کے لیے کچوریاں بناتی رہتی اور یہ تینوں باہری کوٹھے میں سر جوڑے بیٹھے بیاہ کی بات کرتے رہتے۔ جاتے وقت بڑکی میرے پتی کو بلا گئی تھی کہ وہ آکر اس کے گاؤں میں بھیکو کے بھائیوں سے بیاہ کی بات کر لے۔ وہ اپنا دیہاتی دماغ لڑاتی رہی۔

بھیکو کے گھر جانے کے بجائے میرا پتی بڑکی کے جھونپڑے پر پہنچا ہو گا۔ وہاں اسے اکیلا دیکھ کر اس کی نیت خراب ہو گئی ہوگی۔ پہلے تو سگائی اسی سے ہوئی تھی نا۔ بڑکی بھی اب تک میرے پتی کو میٹھی میٹھی نظروں سے دیکھتی تھی۔ میرا پتی بھی اکثر لڑائی میں الاہنا دیتا تھا کہ اس سے اچھا تو میرا بڑکی سے بیاہ ہوا ہوتا۔

بھیکو کے گھر بیاہ کی بات کرنے جب دونوں نہیں پہنچے ہوں گے تو بھیکو کا بیٹا ان کی تلاش میں جھونپڑے پر آیا ہو گا۔ جھونپڑے میں دونوں کو ایک ساتھ لیٹا دیکھ کر وہ اونکار بابو کو بلا لایا ہو گا۔ بڑکی کا گرم گرم بچھونا چھوڑنے کے غصے میں میرے پتی نے اونکار کو مار کر نہر میں ڈبو دیا ہو گا۔ بھیکو کا بیٹا یہ دیکھ کر پورا پاگل ہو گیا ہو گا۔ واپسی میں میرا پتی پھر بڑکی کے جھونپڑے پر گیا ہو گا۔ اتنے میں گڑھی سے اونکار کی بیوی نے آکر میرے پتی کو چاقو سے گود دیا ہو گا۔ بڑکی یہ سب دیکھ کر دھتورا کھا کر مر گئی۔ اگر وہ بڑکی کے ساتھ سونے کا ایسا ہی شوقین تھا تو اس کا جو انجام ہوا وہ اچھا ہی ہوا۔ یہ سوچ کر اسے کچھ اطمینان سا ہوا کہ اچانک اسے اپنا اور بڑکی کا بچپن اور لڑکپن اور شروع جوانی کا ساتھ یاد آیا۔ پھر اپنے مرے ہوئے پتی کا گٹھا ہوا مضبوط شریر یاد آیا۔ پھر اسے یاد آیا کا اس کا پتی شہر سے اس کے لیے ہمیشہ پیڑے لاتا تھا اور پیڑے کھا کر گرم گرم دودھ پی کر وہ دونوں چھت پر سونے چلے جاتے تھے۔ اچانک اسے اپنے شوہر کے قاتل اونکار کی بیوی سے شدید نفرت محسوس ہوئی۔ سلاخوں کے باہر آہٹ ہوئی۔ پولیس کی زنانی نے آکر اس سے پانی کے لیے پوچھا۔ اس نے اپنی آنکھوں سے بہتا گدلا گدلا پانی پونچھا اور ہاتھ کے اشارے سے پانی کو منع کیا۔

باہر سسرجی نے بہرے کے نوکروں کو ابھی ابھی پٹوایا ہے۔ جٹھانی صبح سے روتے روتے ابھی چپ ہو کر جیٹھ جی کے ساتھ اپنے کمرے میں گئی ہیں۔ نیلا سسرجی کے پاس کھڑا دم کو چکر دے رہا ہے۔

وہ کون تھا جو مجھے باندھ کر جھونپڑے میں لے گیا تھا۔ اور پھر میری آنکھوں پر پٹی باندھ کر کس بری طرح میرے بدن کی درگت بنائی تھی۔ پھر رک رک کر سوچ سوچ کر کیسے اس نے میرے شریر کی بے عزتی کی تھی۔ پھر کیسے میرے جسم کو بناڈھکے وہ جھونپڑے سے نکل کر بھاگا تھا۔ میں کئی گھنٹوں کی کوشش کے بعد رسی کھول کر آنکھوں کی پٹی ہٹا کر خود کو گڑھی کے اندر لے گئی تھی، جہاں دروازے پر نیلا چپ چاپ کھڑا مجھے اپنے کمرے میں جاتے دیکھتا رہا تھا۔ کسی کو خبر نہیں ہو پائی کہ اس رات میری عزت لٹی تھی۔

وہ کون تھا!! چھنکی کا پتی یا بھکیو کا لڑکا؟ وہ بھکیو کا لڑکا ہی ہوگا۔ کیوں کہ اس کی پتنی کو نیلے نے زخمی کیا تھا اور سسرجی نے آخر تک غلطی نہیں مانی تھی۔ اس نے اس طرح اپنا انتقام لیا۔ پھر آخر اونکار کو چھنکی کے پتی نے کیوں نہر میں ڈبویا؟ اس نے اس کا کیا بگاڑا تھا۔ پھر بڑکی دھتورا کھا کر کیوں مر گئی؟ وہ تو جٹھانی کے کمرے میں سوئی ہوئی تھی۔ وہاں سے کب نکل کر آگئی تھی۔ جٹھانی کو خبر بھی نہیں ہو سکی۔ کیا بڑکی نے جٹھانی کو بھی سونے سے پہلے تھوڑا سا دھتورا کھلا دیا تھا؟ یہ چھنکی کا میاں اور بڑکی اس واقعے میں کہاں سے آگئے اور یہ دونوں مر کیوں گئے؟ ان دونوں کو کس نے مارا؟

اچانک اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ یقیناً ایسا ہوا ہوگا کہ چھنکی رات کو آکر گڑھی کے پیچھے اپنے پتی اور بڑکی کو بری حالت میں دیکھا ہوگا دھتورے کے نشے میں چور اپنے پتی کو چاقو سے مارنے میں اسے کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ البتہ بڑکی کو بڑی بہن سمجھ کر معاف کر دیا ہوگا۔ مگر بڑکی شرمندگی سے بچنے کے لیے دھتورا کھا کر جھونپڑے میں آکر سو گئی ہوگی۔ مگر اونکار کو چھنکی کے پتی کو نہر میں کیوں ڈبویا۔۔۔۔

باہر کچھ شور سنائی دیا۔ اس نے کھڑکی کے باہر جھانکا۔ گڑھی کے دروازے کے باہر بھکیو کا بیٹا زمین پر پڑا ڈوبتے ہوئے آدمی کی نقل کر کے گھٹی گھٹی آواز میں چلا رہا تھا۔ اس نے کھڑکی زور سے بند کی اور پلنگ پر اوندھی لیٹ کر سسکنے لگی۔

(۱۰)

بڑی بہو نے لیٹے لیٹے کروٹ بدلی۔ اب رات ہو گئی تھی۔ پرتاپ چت لیٹا چھت کی کڑیاں گن رہا تھا۔ اس نے ظاہر کیا جیسے وہ سو رہی ہے۔ ویسے بھی پچھلے کئی دنوں سے سونے اور جاگنے میں کوئی فرق نہیں محسوس ہوتا تھا۔ کھڑکی کے باہر آنگن میں سسرجی ابھی تک ٹہل رہے

تھے۔ بڑی بہو کی سمجھ میں جہاں کچھ اور باتیں نہیں آئی تھیں۔ وہیں یہ بات بھی دھند لکے میں تھی کہ کیا واقعی چھوٹی بہو بچ راستے سے عزت بچا کر بھاگ آئی تھی۔۔۔۔ کیا اس کے شریر پر نیل نہیں پڑے۔ کیا اس کا پنڈا کوراہی ہے۔ اس احساس سے ہی اسے تکلیف ہو رہی تھی۔ جب جب وہ یہ سوچتی اسے سانس سینے میں گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگتا۔ ہو سکتا ہے وہ اپنی لاج بچانے کے لیے جھوٹ بول رہی ہو۔ یقیناً یہی بات ہے ورنہ ایسے ٹانگیں پھینک پھینک کر کیوں چل رہی تھی ۔۔۔۔ اس نے پھر کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا۔ کھڑکی کے بالکل نزدیک ایک سایہ کھڑا تھا۔ وہ چیخنے ہی والی تھی کہ اسے نیلے کی سانسیں سنائی دیں۔ نیلا کھڑکی کے پاس تھوتھنی کیے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔۔۔۔

"اٹھیے اٹھیے ۔۔۔۔" وہ تیز سرگوشیوں میں پرتاپ سے مخاطب ہوئی ۔۔۔۔ "کیا بات ہے کیا ہوا ۔۔۔" پرتاپ پلنگ پر بیٹھ گیا۔

"کچھ نہیں ۔۔۔۔ مجھے نیلے سے ڈر لگتا ہے ۔۔۔۔ کھڑکی کے پاس کھڑا ہے۔" وہ بیٹھی تھر تھر کانپتی رہی ۔۔۔۔

(۱۱)

ٹھاکر اودل سنگھ نے ٹہلتے ٹہلتے رک کر اپنی سانسیں درست کیں ۔۔۔۔ آنگن میں پڑی چار پائی پر بیٹھ کر انھوں نے یاد کیا کہ اونکار بچپن سے ہی کتنا ضدی تھا۔ میلے میں جاتا تو ہر اچھی چیز کے لیے پسر جاتا۔ مٹی کی ڈھیر ساری گڑیاں، شیر، بھالو، غبارے، رنگ ین کاغذ کی پتنگیں اور جانے کیا کیا الا بلا گود میں اٹھائے لے آتا اور پھر تھوڑی دیر میں ہر چیز توڑ پھوڑ کر برابر کر دیتا۔ چیز حاصل ہونے کے بعد اس کے لیے بے قیمت اور بے وقعت ہو جاتی تھی۔ آج وہ سینکڑوں من پانی کے نیچے دبا ہوا ہوگا۔ مچھلیوں نے بدن پر گوشت کا ریشہ بھی نہ چھوڑا ہوگا۔ کرنی کا پھل تو ملتا ہی ہے مگر اسی جنم میں اسے کیوں مل گیا، اس کا انھیں افسوس تھا۔ انھوں نے آسمان کی طرف دکھی نظروں سے دیکھا کیوں کہ اس جنم میں تو وہ اس کے باپ تھے۔ انھوں نے سر اٹھا کر پھر آسمان کی طرف دیکھا۔ ایک طرف سے ماہوٹ کی بدلیاں بڑھتی چلی آرہی تھیں اور تارے ان بدلیوں میں آہستہ آہستہ کھوتے جارہے تھے۔ بادلوں کی وجہ سے سردی کچھ کم لگ رہی تھی۔ پہرے کے نوکر گودھی کے دروازے پر ان کی طرف پیٹھ کیے بیڑی پی رہے تھے۔ نیلا بڑے بیٹے کے کمرے کی کھڑکی کے پاس کھڑکی میں جھانک رہا تھا۔ چھوٹی بہو اپنے مائیکے والوں کے ساتھ اپنے کمرے میں لیٹ چکی تھی اور اس کے کمرے کی روشنی دھیمی ہو چکی تھی ۔۔۔۔

اونکار ان کے سامنے کھڑا تھا ۔۔۔۔۔ اونکار ان سے پیسے مانگ رہا تھا ۔۔۔۔ وہ اونکار کو پیسے دے رہے تھے۔ اونکار نے ان سے شہر جا کر سینما دیکھنے کی آگیا چاہی انھوں نے اجازت دے دی۔ اونکار چلا گیا۔ اونکار پھر آگیا ۔۔۔۔ اتنی مدت میں کچھ بڑا ہو گیا تھا۔ انھوں نے اونکار سے کہا کہ

چیرمینی کا الیکشن جیتنا آسان کام نہیں ہوتا۔ کچھ تگڑے پٹھے بھی ساتھ میں ہونا چاہیے۔ کبھی کبھی ووٹوں والا بکسہ بھی اٹھانا پڑتا ہے۔ اونکار موٹر سائیکل پر گیا اور ٹریکٹر کی ٹرالی میں تگڑے تگڑے پٹھوں کو بٹھاکر لے آیا ---- یہ نریش ہے، یہ سلطانہ ہے، یہ رمیش ہے (اور اس کے چہرے پر گھاؤ کے دو نشان تھے) یہ بلا ہے یہ بہاری ہے ---- پھر وہ الیکشن جیت گئے تھے ----

"اونکار ---- بیٹا! اسکول کے پاس والے پلاٹ پر اگر کل ایپیڈ کرجینتی کا سماروہ ہو گیا تو یہ پلاٹ ہمیشہ کے لیے ہمارے ہاتھ سے چلا جائے گا۔ ہم کسی کو وہاں سماروہ منانے سے روک بھی نہیں سکتے۔ بس آج کی رات ہمارے پاس ہے۔" یہ بات انھوں نے قصبے کی حویلی میں بیٹھ کر کہی تھی۔

اونکار نے ایک لمحے کے لیے سوچا ---- موٹر سائیکل پر بیٹھ کر دیہات جاکر ٹریکٹر لایا ---- اپنے ساتھ چار پٹھے لیے ---- راج مستریوں کے محلے میں جاکر بندو معمار کے چاروں نوجوان لونڈوں کو بٹھایا ---- ٹریکٹر پر گاؤں سے بیس کسان پکڑ کر بٹھالایا تھا ---- بھٹے کے مالک لالہ دیریندر کو جگاکر ان کے بھٹے پر لے گیا ٹریکٹر کی ٹرالی میں بھٹے کی اینٹوں کے چار چکر لگوائے ---- اتنی دیر میں نیویں کھودی جاچکی تھیں ---- مٹی کا گارا بن چکا تھا ---- پو پھٹتے پھٹتے دیواریں اتنی اونچی اٹھ گئیں کہ گاؤں کے کسان ایک دوسرے کو گھوڑا بناکر ان پر چڑھ کر دیوار پر بیٹھے معماروں کو گاروں کے پرات اور اینٹیں پکڑا رہے تھے ---- حویلی سے رات ہی رات کچھ پرانے کواڑ قبضوں سمیت نکلواکر نئے پلاٹ کی بے چھت کی عمارت میں نصب کرائے ---- جب اڈے کی مسجد کا بڈھا ملا اذان دے رہا تھا تو اس وقت نئی عمارت کے اندر فرش چورس کرکے اینٹیں بچھائی جاچکی تھیں۔ جب صبح ہوئی تو ایپیڈکر جینتی والوں نے منہ پھاڑ پھاڑ کر سر پر ہاتھ رکھ کر اس عمارت کو دیکھا تھا ---- اونکار نے بھور بھئے مجھے جگاکر کسانوں کی شراب اور معماروں کے جوڑے کے پیسے لیے تھے ----

"تونے بڑکی کو کیوں بگاڑا مورکھ! اپنا ہی گاؤں محلہ ملا تھا تجھے؟" یہ کہہ کر نمبردار نے ایک کرارا طمانچہ اونکار کے منہ پر مارا اور دیکھا کہ ان کی موٹی موٹی انگلیاں اس کے سرخ گالوں پر واضح طور سے ابھر آئی ہیں ---- وہ چپ چاپ سر جھکائے کھڑا رہا ----

"دور ہوجا میرے سامنے سے ----" وہ چلا گیا تھا۔ انھوں نے سنا تھا وہ دروازے سے نکلتے وقت کھسیایا ہوا تھا۔ مگر اس کے منہ سے دھیمی دھیمی ہنسی کی آواز نکل رہی تھی۔ اس کے اس طرح شرمندہ ہونے اور بڑے جرم کی چھوٹی سزا ملنے کی خوشی اور ہنسی پر انھیں روٹھا روٹھا پیار آیا تھا ----

انھوں نے آسمان کی طرف پھر دیکھا اور واپس آتے ہوئے سوچا کہ اونکار اب کہاں ہے۔ وہ تو ان بادلوں کے پرے جاچکا ہے یا ہو سکتا ہے ابھی تک اس کی آتما نہر کے کنارے جھاڑیوں میں

بھٹک رہی ہو۔ انھیں اپنے سینے میں ایک بھاری دھسک محسوس ہوئی۔ انھوں نے اس بے چینی کے عالم میں آنکھیں بند کر کے سوچا کہ یہ سیاست، دولت، اقتدار پرتاپ کے بس کی بات نہیں وہ تو میری زندگی میں ہی ان چیزوں کی حفاظت مشکل سے کر پائے گا۔ اس سوچ نے ان کی بے چینی کو اور گہرا کر دیا۔

برابر میں کچھ آہٹ سی ہوئی۔ انھوں نے آنکھیں کھول کر دیکھا سامنے اونکار کھڑا تھا۔۔۔۔ وہ سیاہ رنگ کا تھا۔ اس کی لمبی سی تھوتھنی تھی اور موٹے موٹے آدھے چندرما کے آکار کے سینگ تھے۔ وہ اٹھے اور نیلے کی گردن سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر روئے۔۔۔۔

ان کے رونے کی آوازیں سن کر پہرے کے نوکر بھاگے ہوئے ان کے پاس آئے جنھیں گالیاں دے کر پھر ان کی جگہ بھیج دیا گیا۔ ٹھاکر اودل سنگھ کی عقل کام نہیں کر رہی تھی کہ اونکار کا قتل کس نے کیا؟ اس کا قتل چھنگی کے پتی نے کیا تو چھنگی کے پتی کو کس نے مارا؟ پھر بڑکی کو دھتورا کھلاکر کس نے ختم کیا؟ بڑکی کو تو معلوم بھی نہیں تھا کہ اس کی عزت کس نے لوٹی تھی۔ بھیکو کے لونڈے کا اس معاملے سے کیا تعلق ہے؟ انھوں نے تھانہ انچارج سے بھی گھنٹوں ان معاملات پر گفتگو کی تھی۔ تھانہ انچارج بھی کہتا تھا کہ اونکار کا قتل انھیں مقتولین میں سے کسی نے کیا ہوگا لیکن اب ملزم کی پکڑ نہ ہونے کی وجہ سے چھنگی کو ہی چارج شیٹ کرنا مناسب ہے، کیوں کہ کیس چاروں طرف سے چوکس بیٹھ رہا ہے۔ وہ دیر تک تانے بانے سلجھاتے رہے مگر کوئی سرا ہاتھ نہیں آیا۔۔۔۔ نیلا زمین پر بیٹھا بیٹھا اونگھنے لگا تھا۔۔۔۔

(۱۲)

جب دھرتی پر ہل چلتا ہے تو اس کے سینے پر ایک گہری مانگ پڑ جاتی ہے لیکن ہل کے دوسرے ہی پھیرے میں اس مانگ میں مٹی بھر جاتی ہے۔ زندگی کے زخموں کو وقت بھی اسی طرح بھرتا رہتا ہے۔ شب و روز کا ہل چلتا رہتا ہے اور دکھوں کی گہری لکیریں معاملات کی مٹی سے بھرتی رہتی ہیں۔ یہ انتظام نہ ہو تو زندگی کے کھیت میں فصلیں اگنا ہی بند ہو جائیں۔۔۔۔ چیئرمینی کے اگلے الیکشن کی تیاری میں ٹھاکر اودل سنگھ کا دکھ آہستہ آہستہ کم ہونے لگا۔ عدالت نے عینی شاہد نہ ہونے کی وجہ سے چھنگی کو رہا کر دیا تھا۔ اب وہ چھوٹ کر اپنے پرانے جھونپڑے میں لیپ پوت کر رہنے لگی تھی۔ بھیکو کا بیٹا تین سال پاگل خانے میں رہ کر آگیا تھا۔ اس نے کھیتی کا کام کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ کھیتوں کے پار میدانوں میں نہر کے پاس چھدری چھدری بیلوں کے سائے جوالنسے کی سبز اور کانٹے دار جھاڑیوں میں بیٹھا ایک ٹک آسمان کو دیکھتا رہتا تھا۔ اس کی بیوی نے اس کی بہت خدمت کی مگر اب وہ مایوس ہو گئی تھی۔ وہ جب بھی بھیکو کے بیٹے سے کوئی سوال کرتی بھیکو کے بیٹے پر دورہ پڑ جاتا اور ڈوبتے ہوئے آدمی کی نقلیں کرتے کرتے بے حال ہو جاتا۔ بیوی وقت بے وقت کھیتوں کی طرف نکل جاتی اور اندھیرا ہونے کے بعد واپس آتی تب بھی اسے کوئی

اعتراض نہیں ہوتا۔

ٹھاکر اودل سنگھ ایک بار پھر الیکشن جیت گئے۔ جیت والی رات حویلی میں جشن منایا گیا۔ نمبردار اودل سنگھ نے مٹھی بھر بادام نیلے کے منھ میں ڈالے جسے وہ مزے لے لے کر چباتا رہا۔ اچانک انھیں اونکار یاد آیا۔ انھوں نے ایک مٹھی بادام اس کے منھ میں اور ڈالے۔ دو مٹھی باداموں کا اثر تیسرے دن ظاہر ہوا، رات کو وہ حویلی کے پھاٹک سے نکلا۔ سیدھا اس جگہ پہنچا جہاں اس نے کچھ سال پہلے گائے بہری ہونے کا سہاما منظر دیکھا تھا۔ طویلے میں خاک اڑ رہی تھی۔ وہ کھڑا اپنے پاؤں پٹختا رہا۔ برابر میں کانجی ہاؤس تھا۔ کانجی ہاؤس کے بوسیدہ ٹین کے دروازے کی جھری سے اس نے دیکھا کہ اندر کچھ مریل اور دو چار گائے، بیل اور بجار کھڑے ہیں۔ سینگوں کی ایک ہی ٹکر سے اس نے ٹین کا دروازہ توڑ دیا۔ سارے مویشی کانجی ہاؤس سے نکل کر جہاں سینگ سمایا بھاگ لیے۔ تھوڑی دور پر بھینسوں کا طویلہ تھا وہاں پہنچ کر اس نے بھینسوں کو اپنے سینگوں سے ریلنا شروع کر دیا، بھینسیں رسیاں تڑا تڑا کر بھاگیں اور قصبے کی سرحد کے پاس کھیتوں میں گھس گئیں۔ نیلا ادھر سے فارغ ہوا تو پینٹھ جانے والے راستے جو جو مکان ملے ان کے اندر گھس کر سوتے ہوئے آدمیوں کو چارپائیوں پر ہی کھوند ڈالا۔ پکار مچی تو محلے کے لوگ دوڑے ہوئے آئے۔ کچھ زخمیوں کی مرہم پٹی کرانے اسپتال لے گئے۔ باقی لاٹھیاں لے کر اس کی تلاش میں نکل پڑے جس نے یہ سب کیا تھا۔۔۔ نیلے نے آدمیوں کی پکار سنی تو اندھیرے میں ہی اس نے راستہ کاٹا اور بیریوں میں ہوتا ہوا کھیتوں میں اترا اور کھیتوں کھیتوں ہوتا ہوا کہیں گم ہو گیا۔۔۔

ٹھاکر صاحب کی حویلی پر بہت ہجوم تھا۔۔۔ ٹھاکر صاحب نے محسوس کیا کہ اس ہجوم میں سارے لوگ ان کے مخالف نہیں ہیں۔ یہ حقیقت بھی تھی کہ قصبے کے اکثر لوگ ٹھاکر صاحب کو پسند کرتے تھے کہ ٹھاکر صاحب چاہے جا معاملے میں اکثر ان کا ساتھ بھی دیتے تھے۔ لیکن نیلے کے برس ہا برس کے ہنگاموں اور بربادیوں سے تنگ آکر وہ ہم نوا لوگ بھی ٹھاکر صاحب سے تو نہیں لیکن نیلے سے ضرور نفرت کرنے لگے تھے۔ ٹھاکر صاحب نے مجمع کو یقین دلایا کہ وہ آج ہی اس کا انتظام کریں گے اور اس سلسلے میں میونسپل بورڈ کے آفس میں ایک ہنگامی میٹنگ طلب کی گئی۔

آفس کھچا کھچ بھرا تھا۔ سارے ممبران حاضر تھے۔ محمود صاحب پرانی چوٹیں بھولے نہیں تھے۔ آج پھر ایک موقع تھا۔ اس دفعہ انھوں نے اچھی تیاری کی تھی۔ رات ہی رات خفیہ طور پر وہ ضلع کلکٹر سے بھی بات کر آئے تھے۔

میٹنگ بہت شور شرابے میں شروع ہوئی تھی۔ مخالف ممبران اودھم مچانے میں پیش پیش تھے۔

محمود صاحب نے سارے ممبران کے چہروں کا جائزہ لیا اور اندازہ کیا کہ ٹھاکر صاحب کے مواقف ممبران بھی آج کم سے کم نیلے کے معاملے میں تقریباً ہم نوا ہیں۔۔۔ اس احساس نے ان

کے اندر ایک نئی طاقت بھردی۔

بھائیو! میں پہلے بھی ٹھاکر صاحب کو کئی بار اس وحشی جانور کے سلسلے میں آگاہ کرچکا ہوں بلکہ میں نے تو اسی وقت منع کیا تھا انھوں نے اسے پالنا شروع کیا تھا۔ مگر یہ میری بات نہیں مانے۔ انھوں نے اسے بادام کھلا کھلاکر پاگل سانڈ بنادیا ہے۔ شہری انسانوں کا اس طرح کے جانور پالنے کا شوق غیر فطری ہے۔ اس نیلے نے فصلیں برباد کی ہیں، غریبوں کے گھروں کے برتن اور چولھے توڑے ہیں، ننھے ننھے بچوں کو کچلا ہے، بوڑھے آدمی کا خون کیا ہے، طویلے کی بھینسوں کو مار مار کر بھگایا ہے، کانجی ہاؤس کے مویشیوں کو آزاد کیا ہے۔ ماؤں بہنوں کی ---- ماؤں بہنوں کی (انھوں نے الیکشن کی تقریر پر دل ہی دل میں لعنت بھیجی اور ایک مناسب جملہ ڈھونڈا) ماؤں بہنوں کی راتوں کی نیند حرام کردی ہے۔ کون ہے جو آج اس قصبے میں چین کی نیند سوسکتا ہے۔ بولیے کون ہے ----؟؟

"کوئی نہیں۔ کوئی نہیں۔" ممبران نے جوش و خروش کے ساتھ جواب دیا۔ "نہیں ایک شخص ہے جو آرام سے سوتا ہے اور چین سے آرام کرتا ہے ----" یہ کہہ کر انھوں نے اس جملہ کا تاثر جاننے کے لیے سب کے چہروں کی طرف دیکھا۔ سب کی آنکھیں سوال تھیں۔

"وہ شخص ہے ٹھاکر اودل سنگھ جو ہمارے چیئرمین ہیں۔"

"ٹھاکر اودل سنگھ ---- مردہ باد" ---- ممبران چلائے۔

"انھیں اس بات کی پروا نہیں کہ اس نیلے نے کتنے نقصانات کیے۔ مالی اور جسمانی اور جانی۔" محمود صاحب خاطر خواہ اثر دیکھ کر آگے بڑھے۔

ٹھاکر اودل سنگھ دل ہی دل میں تاؤ کھاتے رہے۔ آخر میں انھوں نے کڑے دل سے ایک فیصلہ کیا اور پوچھا ----

"میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ لوگ کیا چاہتے ہیں ---"

محمود صاحب نے جواب دیا --- "ہم چاہتے ہیں کہ قصبے کو اس آفت سے نجات دلائی جائے۔"

"مگر کیسے؟" ٹھاکر صاحب انھیں اپنی راہ پر لانا چاہتے تھے۔

"جان سے ختم کرکے اور کیسے ----" محمود صاحب گرجے۔

ٹھاکر صاحب یہی سننا چاہتے تھے۔

"ٹھیک ہے۔" ٹھاکر صاحب نے نرمی لیکن مضبوطی سے کہا --- "آپ جانتے ہیں کہ یہ گئو ہتیا ہوگی۔"

محمود صاحب نے اندازہ کیا کہ کچھ ممبران یہ بات سن کر ٹھنڈے پڑ گئے تھے۔

دوسری بات یہ کہ قانون مجریہ ۱۹۷۲ کے تحت اسے مارا نہیں جاسکتا۔ اس کی سخت سزا ہے۔" ٹھاکر صاحب نے تھانہ انچارج کی گفتگو یاد کرکے یہ جملہ بولا۔

جب انھوں نے اندازہ کر لیا کہ اب ممبران راہ راست پر آگئے ہیں تو انھوں نے کہا۔۔۔ "کیا آپ لوگ قسم کھا کر کہہ سکتے ہیں کہ پچھلی رات کو جو کچھ ہوا وہ سب نیلے نے ہی کیا ہے اور کانجی ہاؤس کے بیلوں، طویلے کی بھینسوں نے کچھ نہیں کیا۔؟ نیلا بدنام ہو گیا تو کیا سارے الزامات اسی کے سر جائیں گے۔ بد بھلا بدنام برا۔۔۔" انھوں نے محاورے کا سہارا لیا۔

"لیکن وہ بیل اور بھینس بھی تو نیلے کی وجہ سے ہی مشتعل ہوئے۔" محمود صاحب نے دور کی کوڑی لی۔

"تو کیا مشتعل کرنے والا ہی سارا مجرم ہے، اشتعال میں آنے والا بالکل معصوم ہے۔" ٹھاکر صاحب گرجے۔ پھر انھوں نے ایک وکیل ممبر سے کہا۔۔۔

"وکیل صاحب آپ بتائیے مشتعل ہونے ولے اور مشتعل کرنے والے کی سزائیں کیا مختلف ہیں؟"

ممبر وکیل صاحب کیوں کہ ٹھاکر صاحب کی پارٹی کے آدمی تھے لیکن ساتھ ہی ساتھ وکیل بھی تھے اور پیشے کی لاج رکھنا بھی ضروری تھی اس لیے ان کا جواب بہت مدلل اور ٹھوس تھا۔۔۔

"دراصل اشتعال میں آنا ایک ایسا فعل ہے جس کی جڑیں انسانی لاشعور میں دور تک پیوست ہوتی ہیں۔ اگر لاشعور کا وہ حصہ ذرہ برابر بھی مجرمانہ مادہ رکھتا ہے تو اشتعال میں آنے کے لیے ایک ہلکی سی تحریک بھی کافی ہوتی ہے لیکن مشتعل کرنے والے کو بھی بے قصور نہیں کہہ سکتے اور سچ پوچھیے تو قصور وار بھی اس اس وقت تک نہیں کہہ سکتے جب تک کہ اس امر کی تحقیق نہ ہو جائے کہ مشتعل کرنے والے نے مشتعل ہونے والے کے ساتھ وہ کون سا فعل کیا جس کی وجہ سے مشتعل ہونے والا مشتعل ہوا۔ معاملہ ہذا میں نیلے نے صرف اتنا کیا کہ کانجی ہاؤس کے دروازے سے اپنی پیٹھ رگڑی کیوں کہ جانوروں کو پیٹھ رگڑنے کی عادت ہوتی ہے۔ تو اس دھمک سے پرانا دروازہ ٹوٹ گیا اور دوسرے جانور جو موقع کا انتظار کرتے رہتے ہیں، آزاد ہو گئے اور پھر انھوں نے من مانی کی۔ کیوں کہ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ نیلے نے ان کو ترغیب دے کر فصلیں برباد کرائیں۔ لہٰذا یہ امر تحقیق و تفتیش طلب ہے کہ نیلے کا پچھلی رات کی بربادی میں ذاتی طور سے کتنا حصہ ہے اور حصہ ہے بھی یا نہیں۔"

اس مدلل تقریر کو ابھی ممبران سن کر ٹھیک سے سمجھ بھی نہیں پائے تھے کہ ٹھاکر صاحب نے ایک حسب منشا فیصلہ سنایا۔۔۔

"بھائیو! نیلے کو تلاش کرنے کی مہم ابھی سے شروع کی جاتی ہے۔ میں تھانے میں بھی بات کروں گا۔ کچھ رضاکارانہ ٹکڑیاں بھی بننا ضروری ہیں کہ ہر کام میونسپل بورڈ نہیں کر سکتا۔ نیلے کو گرفت میں لے کر اس بات کا اندازہ کیا جائے گا کہ آگے کیا کارروائی ہو۔۔۔ آج کی میٹنگ برخاست۔۔۔"

محمود صاحب نے آج کی میٹنگ کے فیصلے کو اپنی کامیابی سمجھا۔ انھوں نے اپنے ممبروں اور موافقین کے ذریعے قصبے بھر میں یہ شہرت کرا دی کہ نیلا پاگل ہوگیا ہے اور اسے انسانی خون کی چاٹ لگ گئی ہے۔

جس نے بھی سنا دہشت زدہ رہ گیا۔ دہشت کی بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ نیلا چھپا ہوا تھا اور چھپی ہوئی چیز عیاں چیز کے مقابلے میں زیادہ خطرناک محسوس ہوتی ہے۔ لوگوں نے دیواروں پر نیلے کو پکڑلانے پر انعام دینے کے اشتہار لگا دیے۔ نیلے کو پکڑنے کی تیاریاں زور و شور سے ہونے لگیں----

ضلع کلکٹر نے، جو صبح ہی اپنا نمائندہ بھیج کر ٹھاکر صاحب کو تنبیہہ کر چکا تھا، شام کو ٹھاکر صاحب کو ضلع آفس میں بلایا۔۔۔ ٹھاکر صاحب بادل ناخواستہ پہنچے۔ حالاں کہ اندر ہی اندر خوش بھی تھے کہ آج کلکٹر سے بات کرنے کا موقع ملے گا۔ شہر میں کلکٹر کے آفس میں داخل ہوئے تو وہ بڑی سی میز کے پیچھے سنجیدگی کے ساتھ بیٹھا نظر آیا----- بیٹھے بیٹھے اس نے ٹھاکر صاحب سے پوچھا----

" اودل سنگھ جی! نیلے نے بہت تباہیاں مچا رکھی ہیں، روزانہ کوئی نہ کوئی شکایت آجاتی ہے۔ اب اس کا انتظام کرنا ضروری ہوگیا ہے۔ آپ نے کیا سوچا ہے ---- میرے اوپر رائے عامہ کا بہت زبردست دباؤ ہے۔ دوسرے قصبے والے بھی شکایت کر رہے ہیں کہ ٹھاکر کے نیلے کی وجہ سے گاؤں اور قصبے میں بہت بربادی ہورہی ہے۔ میں نے سنا ہے کہ وہ کبھی کبھی دوسرے قصبوں اور خود شہر میں بھی آجاتا ہے---"

ٹھاکر اودل سنگھ خاموش رہے----

" سنا ہے آپ کہتے ہیں کہ اس کو اگر مار دیا جائے تو لوگ گئو ہتیا سمجھ کر جذباتی ہوجائیں گے۔ مجھے آپ سے ایسی بچکانہ باتوں کی امید نہیں تھی۔ ہم سب کو پڑھے لکھوں جیسی بات کرنا چاہیے----"

ٹھاکر صاحب بولے ---- " پڑھے لکھوں کے سامنے پڑھے لکھوں جیسی باتیں ہوتی ہیں دیہات اور قصبے میں لوگ ان پڑھ ہیں۔ انھیں آپ سے زیادہ میں جانتا ہوں----"

" پھر بھی ----" کلکٹر بولا ---- " پھر بھی میں اسے صحیح نہیں مانتا کہ بربادی پھیلانے والے ایک وحشی جانور کو جسے آپ نے پال رکھا ہے، صرف اس وجہ سے نہیں مروایا جاسکتا کہ ان پڑھ اسے گئو ہتیا سمجھیں گے یا دھرم کا اپمان سمجھیں گے----"

ٹھاکر صاحب نے ایک اور پینترا چلا۔۔۔

" اصل میں بات یہ ہے صاحب کہ آپ تو مجھ سے زیادہ جانتے ہیں کہ نیلے کو مارنا قانون مجریہ ۱۹۷۲ کے تحت جرم ہے۔"

"مگر اس کا علاج ہے---" کلکٹر بولے----"میں فارسٹ آفیسر سے بات کر کے چیف وائلڈ لائف آفیسر سے اسے پاگل ڈکلیر کرا کے مروا سکتا ہوں---"

"مگر یہ تو زیادتی ہوگی کہ نیلا پاگل تو نہیں ہے۔"

"لیکن حرکتیں تو پاگلوں والی ہی کر رہا ہے۔"

"میں اس کا علاج کر رہا ہوں صاحب! آج ہی سے نیلے کو پکڑوانے کی تیاریاں کر لی ہیں۔ آپ مجھے ایک موقع دیجیے۔"

کلکٹر نے بادل ناخواستہ انھیں موقع دے دیا----

سورج غروب ہونے کے بعد جب وہ قصبے میں داخل ہوئے تو قصبے میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ لوگوں نے گھروں کے دروازے بند کر کے رکھے تھے اور گلیوں میں پولیس والے ٹہل رہے تھے۔ رضاکار ٹکڑیاں کھیتوں اور جنگلوں میں نیلے کی تلاش میں نکل گئی تھیں۔

ٹکڑی نمبر (۱) نے بھادوں کی سیاہ رات میں قصبے کے باہر والے بیر کے باغ اور کھیتوں کی پگڈنڈی پر کسی کو کھڑا دیکھا----اشارے سے بتایا----سب لوگ خاموش ہو گئے۔ لاٹھیاں مضبوطی سے پکڑے پکڑے اس کی طرف آہستہ آہستہ بڑھے اور بیس گز دور سے اس پر ٹارچ پھینکی۔ تین سیل کی ٹارچ کی روشنی میں دیکھا گیا کہ نیلا دھندلکے میں کھڑا ہے۔ ٹارچ فوراً بند کر لی گئی۔ اس ٹکڑی میں پانچ لوگ تھے۔ قریشیوں کا لونڈا یعقوب جو ایک ہی سانس میں کبڈی ٹیم کے کسی تگڑے پٹھے کو چھو کر سامنے والی لکیر پر ہاتھ مار کر آجاتا تھا، آج ہاتھ میں موٹی سی لاٹھی سنبھالے ہوئے تھے۔ اس کا پڑوسی منشی فضائی کا بڑا بیٹا ہاتھ میں اسٹک لیے ہوئے تھا وہ قصبے کے انٹر کالج کی ہاکی ٹیم کا کپتان تھا۔ اسی محلے کے شیخ جلی سمیع انوار کے ہاتھ میں تین سیل کی جیپ ٹارچ تھی۔ وہ خود کو ٹکڑی نمبر (۱) کا لیڈر تصور کیے ہوئے تھا۔ ان کے پیچھے شکر والوں کا لونڈا گلشن والی بال تھا جو والی بال کھیلتے ہوئے اتنا اونچا اچھل کر والی مارتا تھا کہ کبھی کبھی جال کے دوسری طرف مخالف ٹیم کے پالے میں جا گرتا تھا۔ پانچویں تھے بوڑھے نتھو چچا جو اپنی جوانی میں خرگوش اور تیتر میدان میں دوڑا کر، تھکا کر زمین پر بٹھا لیتے تھے اور ان کے چاروں طرف چکر لگا کر لحہ بہ لحہ قریب ہوتے ہوتے اچانک ڈھیلے یا ڈنڈے سے خرگوش یا تیتر کو زخمی کر کے پکڑ لیتے تھے۔ یہ ٹیم ہر لحاظ سے نیلے کو قابو میں کرنے کے لیے آئیڈیل تھی۔

نتھو چچا نے اشارے سے سب کو کچھ دیر خاموش رہنے کو کہا تاکہ نیلا ان کی طرف سے بے گمان ہو جائے اور پھر آہستہ آہستہ گھیرا ڈال کر اسے لاٹھی اور اسٹک کی مدد سے قابو میں کر لیں۔ بوڑھے نتھو چچا کے ان خاموش مشوروں سے سمیع انوار کو اپنی تین سیل کی ٹارچ اور لیڈری کی بے عزتی محسوس ہوئی۔ اس نے نتھو چچا کو پیچھے دھکیل کر باقی لوگوں کو اشارے سے پلان سمجھایا کہ اب نیلے کو موقع مت دو۔ چاروں طرف سے گھیر کر ایک دم حملہ بول منصوبے پر عمل ہوا۔ نیلے کو

چاروں طرف سے خاموشی سے گھیر کر ایک ساتھ حملہ ہوا۔ لاٹھی اور اسٹک اچٹ کر مارنے والوں کے ہاتھوں سے ٹکرا کر فضا میں لہرانے لگیں۔

وہ بیری کا ایک موٹا درخت تھا۔۔۔۔

ٹکڑی نمبر (۲) نے آموں کے باغوں میں نیلے کو ڈھونڈنے کا پلان بنایا تھا۔ آموں کے گھنے باغ میں جیسے ہی سب لوگ داخل ہوئے تو باغ کے اندر چھپ چھپ کر تا ہوا کوئی بھاگا۔ بارش سے باغ میں کیچڑ ہو گئی تھی۔ ٹارچ کی روشنی میں سب نے واضح طور پر دیکھا کہ وہ نیلا ہی تھا۔ مگر وہ ایک بھورا پٹھا تھا جس کے ابھی سینگ بھی پوری طرح نہیں نکلے تھے۔

ٹکڑی نمبر (۳) نے قصبے کی مشرقی سرحد کے کھنڈروں میں تلاش کا بیڑا اٹھایا۔۔۔ کھنڈر میں داخل ہوتے ہی سب نے محسوس کیا کہ کھنڈر میں کوئی ذی روح ہے۔ سب کے دل زور زور سے دھڑکنے لگے۔ ہمت کر کے آگے بڑھے۔ ملبے پر چڑھ کر کھنڈر کے آخری سرے تک دیکھا تو وہاں ایک سایہ نظر آیا۔ اگر ٹارچ کی روشنی وہیں سے ڈال دی تو وہ بھاگ سکتا ہے، یہی سوچ کر لوگ خاموشی سے ملبے کے نیچے اتر آئے اور پورا چکر کاٹ کر دھیمے دھیمے اس ٹوٹی ہوئی دیوار کے نیچے پہنچ گئے جس کی آڑ میں نیلا کھڑا تھا۔۔۔۔

دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ ٹوٹی ہوئی دیوار سے ہاتھ نکال کر ٹارچ جلائی وہ رام دین تیلی کی دیوی کے نام پر چھوڑی ہوئی بوڑھی گائے تھی۔۔۔۔

البتہ ٹکڑی نمبر (۴) نے جب بڑے پوکھر کے کنارے کی جھاڑیوں میں کھڑے نیلے کو چاروں طرف سے گھیر کر لاٹھیوں سے اچھی طرح پیٹ کر زمین پر لٹا دیا اور روشنی میں اس کی چوٹوں کا جائزہ لینے کے لیے جب لالٹین جلائی تو معلوم ہوا وہ لڈن تانگے والے کا لنگڑا گھوڑا تھا جو اب اپنے لنگڑے پن کی معذوری سے چھٹکارا پانے کی منزل کے بہت پاس پہنچ چکا تھا۔۔۔۔

البتہ قصبے کے اندر پولیس والوں نے نیلے کے دھوکے میں جن پالتو جانوروں کو مارا اس میں ان کا یعنی پولیس والوں کا کوئی قصور نہیں تھا کیوں کہ ان پالتو جانوروں اور نیلے میں بہت چیزیں مشترک تھیں۔ مثلاً تبخاتی کی بھینس اس لیے ماری گئی کہ اس کا قد نیلے کے قد سے ملتا جلتا تھا۔ جمن تمال والے کا بیل اس لیے زد میں آیا کہ اس کی اونچائی نیلے کی اونچائی کے برابر تھی۔ گنگا تیلی کا بھینسا اس لیے نشانہ بنا کہ اس میں اور نیلے میں یہ قدر مشترک تھی کہ دونوں کے دو دو کان تھے۔

ٹھاکر اودل سنگھ اتنی سرگرمی کے ساتھ نیلے کی تلاش کی مہم کو دیکھ کر خوف زدہ ہو گئے۔ وہ حویلی میں آئے جیپ میں بیٹھ کر سیدھے دیہات پہنچے اور گڑھی کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے۔ انھیں نیلا بہت یاد آ رہا تھا۔ گڑھی میں پہنچ کر انھیں خاص طور سے نیلے کی ساری باتیں یاد آ جاتی تھیں۔ آنگن میں پڑی چارپائی پر لیٹ کر انھوں نے آنکھیں بند کر لیں۔ انھوں نے سوتے جاگتے کی کیفیت میں دیکھا کہ نیلا ان کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا ہے اور ان کا ہاتھ چاٹ رہا ہے۔ آہٹ

پہ آنکھیں کھول دیں وہ خواب نہیں تھا۔۔۔۔ نیلا واقعی ان کا ہاتھ چاٹ رہا تھا۔ انھوں نے اسے غور سے دیکھا۔ اس کے سینگ اور کھر پر تازہ لہو کے نشان تھے۔ انھوں نے گھبرا کر معائنہ کیا کہ خون دوسروں کا ہے یا نیلے کے بدن سے نکلا ہے۔ مارچ سے دیکھ کر انھوں نے اوپر والے کا شکر ادا کیا۔ خون دوسروں کا ہی تھا۔۔۔۔

(۱۳)

نیلا وقت اس گڑھی میں تھا۔ حالاں کہ درحقیقت وہ اس وقت قصبے میں تھا۔ وہ آموں اور امرودوں اور بیروں اور جامنوں کے ہر باغ میں تھا۔ قصبے کا ہر فرد سمجھ رہا تھا کہ نیلا کہیں اور نہیں خود اس کے دروازے سے لگا کھڑا ہے۔ بس ذرا دروازہ کھلا اور۔۔۔۔

(۱۴)

نمبردار اودل سنگھ فیصلہ لینے میں دیر نہیں کرتے تھے البتہ فیصلہ سنانے میں عجلت سے کام نہیں لیتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ فیصلہ کرنا اور فیصلہ سنانا دو مختلف عمل ہیں اور دونوں کو ایک دوسرے میں الجھانا مناسب بات نہیں ہے۔ وہ جانتے تھے کہ فیصلہ جلد لینا عقل مندوں کا شیوہ ہے لیکن فیصلہ ظاہر کرنے میں جلدی کرنا احمقوں کا کام ہے۔ انھوں نے نیلے کے انجام سے متعلق آخری فیصلہ تو نہیں لیا لیکن اتنا ضروری سوچ لیا کہ فی الوقت کیا کرنا چاہیے۔ نیلے کے بارے میں آخری فیصلہ لینے کے لیے انھوں نے اپنے آپ سے وقت مانگا جو انھوں نے اپنے آپ کو فوراً دے دیا۔ وہ لوگوں کا ردِ عمل جاننا چاہتے تھے۔ کہ گڑھی کے باہر گاؤں والے، پنچ، اسکول کا ہیڈ ماسٹر اور مندر کا پجاری نیلے کے بارے میں کیا رائے رکھتا ہے۔ انھیں اس بات کی بھی فکر تھی کہ قصبے میں حویلی والے اور حویلی کے باہر دیگر افراد نیلے سے کس حد تک بدظن ہیں اور کس حد تک خائف ہیں۔ میونسپل بورڈ کے مواقف اور مخالف ممبران کے جوش کا اب کیا حال ہے۔ ضلع کلکٹر شہر میں بیٹھا کن خطوط پر سوچ رہا ہے، اس بات کی فکر کی آنچ بھی ان کے ذہن کے کسی اجاڑ گوشے میں دھیمے دھیمے سلگ رہی تھی۔۔۔۔

نیلے کے انجام کے بارے میں وہ آخری فیصلہ لے سکتے تھے لیکن انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ فیصلہ نہیں لیں گے۔ پہلے اس معاملے کے ہر پہلو کا باریکی اور گہرائی سے جائزہ لیں گے۔ لیکن باریکی اور گہرائی سے جائزہ لینے کے لیے وقت کی ضرورت تھی۔ نیلے کو کسی غیر نے دیکھ لیا تو وقت ملنا مشکل ہو جائے گا۔۔۔۔ تبھی انھوں نے ایک فیصلہ کیا۔۔۔۔

بڑے کی کھڑکی کے پاس جاکر آواز دی۔۔۔۔

"پرتاپ۔۔۔۔ او پرتاپ۔۔۔۔ باہر آؤ بیٹا۔۔۔۔!"

ان کی آواز سن کر اندر کمرے میں اچانک چوڑیاں کھنکیں۔ وہ کھڑکی سے دور ہٹ آئے

تھوڑی دیر بعد پرتاپ باہر آگیا۔۔۔۔

"نیلا ہماری گوڑھی میں آگیا ہے۔" انھوں نے بغیر کسی جذبے کے یہ جملہ ادا کیا۔ دوسروں کا ردِ عمل جاننے کی ابتدا وہ گھر سے ہی کرنا چاہتے تھے۔ پرتاپ کا منھ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ بنیادی طور سے اچھا آدمی تھا۔

"باپو! اب اس کا گزارا یہاں نہیں ہوگا۔ گاؤں والے، قصبے والے یہاں تک کہ شہر کا کلکٹر بھی، سب کے سب اس کے دشمن ہو گئے ہیں۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ کوئی غلط بھی نہیں ہے۔ اس نے بہت تباہی مچا رکھی ہے۔" پرتاپ نے گوڑھی کے آنگن میں اندھیرے میں کھڑے نیلے کو دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے یہ بات کہی۔

"لیکن یہ ہمارے کتنے کام آیا ہے اور ابھی بھی کتنے کام آسکتا ہے۔" نمبردار نے اس کی طویل گفتگو کا مختصر سا جواب اس انداز سے دیا کہ ان کا جواب ایک سوال بن کر پرتاپ کی آنکھوں کے سامنے آنکھرا سا بن کر ملاچنے لگا۔

وہ سوچ سوچ کر رک رک کر بولا۔۔۔۔

"باپو۔۔۔۔ یہ گوڑھی اور حویلی کی حفاظت کرتا ہے تاکہ ہمارا دھن دولت اور راج بنا رہے۔ لیکن اتنی بربادی کر دیتا ہے کہ ہمیں اس دھن دولت اور راج کو بھوگنے کا وقت بھی نہیں مل پاتا۔ ہرے کا ذکر سنتے ہیں کہ آج نیلے نے اس کا کھیت اجاڑ دیا۔ کل نیلے نے اس کا کھلیان بگاڑ دیا۔ ابھی وہ ننھے بچوں کو کچل کر آیا ہے۔ اب وہ بڈھے بے قصوروں کو مارنے جا رہا ہے۔ کبھی اپنے ہی جیسے مویشیوں کو لہولہان کر رہا ہے، کبھی چھوٹی چھوٹی بکریوں پر کھڑا آرا رہا ہے۔ ہمیں اپنی چیزوں کی حفاظت کے لیے اس جنگلی کی مدد نہیں لینا چاہیے۔ ہم خود چوکنا سویا کریں گے۔۔۔۔"

"تم مورکھ ہو پرتاپ! اس کا مطلب تم اس وچار کے آدمی ہو کر گوڑھی میں یا حویلی میں پہلے چور کو آنے کی چھوٹ دے دو۔ جب وہ آجائے تو چونک کر اسے پکڑ لو۔ ارے مورکھ! کوشش یہ ہونا چاہیے اور یہی کوشش میں نے کی تھی کہ ایسا نقشہ بن جائے کہ کوئی گوڑھی اور حویلی میں گھسنے کا خیال بھی من میں نہ لائے۔۔۔"

پرتاپ چپ ہو گیا۔ وہ زیادہ دیر تک اپنے باپ سے بحث نہیں کر پاتا تھا۔ "میں نے سوچا ہے۔" انھوں نے پرتاپ کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر کہا اور وہ جانتے کہ جب وہ پرتاپ کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر کوئی بات کہتے ہیں تو وہ ہم نوائی کرنے لگتا ہے۔۔۔۔۔ "نیلے کو کچھ دن کے لیے مندر والے ارہر کے گھنے کھیت میں چھپا دیتے ہیں۔ پھر اندازہ کرتے ہیں کہ لوگوں کا اس کے بارے میں کیا وچار بن رہا ہے۔۔۔۔"

انھوں نے صرف پرتاپ اور گوڑھی کے دونوں پہرے دار نوکروں کو اپنا ہم راز

بنایا۔۔۔۔

گہرا سا ہو گیا تھا۔ دونوں پہرے دار نیلے کو گڑ اور بادام کھلاتے ہوئے آہستہ آہستہ رات کے پھیلے سناٹے میں گڑھی سے باہر لے گئے اس کے زخموں پر ہلدی تھوپ دی گئی تھی جس سے بدن کیسریا ہو گیا تھا۔ تنگ گلیوں سے نکال کر آموں کے باغوں کے برابر سے ہوتے ہوئے مندر والے ادہر کے گھنے کھیت کے پاس پہنچے۔ ایک اسے لیے کھڑا رہا۔۔۔۔ دوسرا اندر جاکر کھیت کے بیچوں بیچ پودھے کاٹ کر جگہ بنانے لگا۔ پھر دھیرے دھیرے نیلے کو کھیت میں داخل کر کے اس جگہ پہنچے۔ نیلا اس کھیت سے مانوس تھا۔ اکثر وہاں آیا کرتا تھا۔ اس نے فی الوقت کوئی مزاحمت نہیں کی۔ اندر ایک موٹا سا کھونٹا ہاتھ بھر زمین میں گاڑ کر نیلے کی گردن میں رسان کے ساتھ رسی باندھ دی۔ رسی لمبی تھی۔ اتنی لمبی کہ نیلا آسانی سے چل پھر سکتا تھا۔۔۔۔ دوسرے پھیرے میں بہت سا چارا، بہت سا موٹا اناج اور بہت سا گڑ اور بادام لاکر اس کے پاس رکھ دیے گئے۔ ناند میں اوپر تک پانی بھر کر ناند وہیں مٹی میں جما دی گئی۔

واپسی میں سایوں کی طرح رینگتے ہوئے دونوں پہرے دار گڑھی میں پہنچے اور نمبر دار کو نیلے کے اس کچے انتظام کی پکی خبر دی۔ نمبردار اودل سنگھ نے جو اتنی دیر سے سانس روکے بیٹھے تھے، ایک بڑی سی اطمینان بھری سانس باہر چھوڑی۔ "اب تم باہر جاکر اطمینان سے سو جاؤ۔۔۔ "بہو سے کچھ نہ کہنا۔۔۔۔" انھوں نے ایسے یقین سے کہا گویا شوہر لوگ بیویوں سے راز چھپا پاتے ہوں۔۔۔۔۔ ویسے بھی بڑی بہو نے کھڑکی کی اوٹ سے منظر کا آدھا حصہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔۔۔۔

نمبردار صبح اٹھے تو سب سے پہلے گاؤں کا ایک چکر لگایا۔ لوگ حیران بھی ہوئے اور خوش بھی کہ آج بہت دنوں بعد نمبردار کو گاؤں پر ٹوٹ کر پیار آیا ہے اور وہ بھی ہر گلی پر۔۔۔۔

عورتوں نے انھیں دیکھ کر گھونگھٹ کاڑھ لیے اور مردوں نے ان کے پاس اکٹھا ہو کر نیلے کے بارے میں سوالات شروع کر دیے۔۔۔۔ "کیا ہوا نمبردار جی نیلا ملا کہ نہیں۔۔۔۔!"

"بھئی کوشش تو جاری ہے۔ ایک ذرا سے جانور کو ڈھونڈنے کے لیے قصبے میں بیسیوں پولیس والے اور قصبے والے رات دن ایک کیے ہوئے ہیں۔" انھوں نے گول گول بات کی۔

لیکن ان کی اس گول گول بات میں بھی کچھ لوگوں نے اچھے خاصے چوکور مطلب نکال لیے۔ دراصل ذرا سے جانور اور بیسیوں پولیس والے اور قصبے والے لوگوں کی کوشش والا جملہ۔ نمبردار اودل سنگھ کا سوچا سمجھا جملہ۔ اس بات کا متقاضی تھا کہ لوگ کم از کم ان کے سامنے ہمدردی کا اظہار کریں۔۔۔۔

"کئی دن سے دیکھا نہیں تو کچھ عجیب عجیب سا لگتا ہے۔" ان کے ایک پڑوسی نے سنبھل سنبھل کر جملہ بولا۔۔۔۔

لیکن اس جملے سے راستہ کھل گیا تھا۔ ان کے تمام ہم نوا بھیڑ میں اپنی جگہ کھڑے کھڑے ان کی طرف ہو گئے تھے۔

"جانے غریب کو اس بیچارا ابھی ملا کہ نہیں۔۔۔" دوسرے نے تاسف بھرے لہجے میں اپنے خدشے اظہار کیا۔

"پچھلے کئی مہینوں سے وہ بالکل چپ چاپ ہو گیا تھا۔ چلتے چلتے رک جاتا تھا۔۔۔" تیسرے نے انکشاف کیا۔

اس انکشاف پر نمبردار کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ مگر موقع کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے انھوں نے اپنا منہ جلدی سے بند کر لیا اور سوچا ٹھیک ہی کہتا ہو گا۔ دراصل یہ بات سچ بھی تھی۔ نیلا چلتے چلتے رک جاتا تھا اور رک کر اس شخص پر حملہ کرتا تھا جو سب سے نزدیک ہو۔۔۔۔

۔۔۔ چوتھے نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔۔۔ "ابھی پندرہ دن پہلے میں کھیت سے ہل چلا کر واپس آرہا تھا تو دیکھا نمبردار کا نیلا مندر کے سامنے کھڑا ہے۔ جیسے ہی سورج دیوتا ڈوبے نمبردار کے نیلے نے مندر کی طرف منہ کر کے ڈنڈوت کی اور دونوں کھر جوڑ دیے۔۔۔"

باقی لوگوں کے چہرے پر عقیدت کی روشنی جگمگ جگمگ کرنے لگی۔

ٹھاکر نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اندازہ کیا کہ جن جن کے گھروں کے برتن نیلے نے توڑے تھے، جن کے بچوں کو کچلا تھا اور جن جن پر حملہ کیا تھا وہ ان لوگوں کی ہم نوائی نہیں کر رہے ہیں۔ خاموشی سے ایک بے بس خاموش نگاہی سے ایک دوسرے کا منھ تک رہے ہیں۔

ان کے ہم نوا ان کے ساتھ چلے، باقی لوگ پیچھے رہ گئے تھے۔ انھوں نے واضح سنا وہ نمبردار اور نیلے دونوں کو سرگوشیوں میں گالیاں دے رہے تھے۔

راستے میں مندر کے پاس رک کر انھوں نے ہاتھ جوڑے۔ پجاری جی باہر نکل آئے۔ انھوں نے اپنے ساتھ کے لوگوں کو سنانے کے لیے پجاری جی سے پوچھا۔۔۔ "قصبے میں اٹھکیلیاں کر کے نیلا بھاگا تھا، آپ نے ادھر تو نہیں دیکھا۔۔۔"

"نہیں بیٹا۔۔۔ پھر کچھ رک کر انھوں نے جملے کو آگے بڑھایا۔۔۔" ہو سکتا ہے، پاپیوں کی بستی سے کچھ دنوں کے لیے کچھ دور چلا گیا ہو۔" نمبردار نے سوچا، ساتھ والے دیہاتی خود کو "پاپی" نہ سمجھیں۔ انھوں نے اپنے جملے میں اس کی وضاحت کر دی۔:

"ہاں مہاراج! قصبے والے ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ گئے ہیں، دراصل وہ مجھ سے دشمنی نکالنا چاہتے ہیں۔" وہ یہ کہہ کر چلنے لگے۔

"تو چنتا نہ کر نمبردار۔ انت میں اچھائی کی برائی پر جیت ہوتی ہے۔۔۔" پجاری جی نے نمبردار کو چلتے چلتے آشیرواد دیا۔

نمبردار سب کو ساتھ لے کر آگے بڑھ لیے تھے۔ کچھ یاد آیا، رکے اور گھوم کر دیکھا۔ پجاری

جی وہیں کھڑے تھے۔ انھیں لگا جیسے پجاری جی کچھ کہنا چاہتے ہیں مگر ساتھ کے آدمیوں کی وجہ سے کچھ سنکوچ میں ہیں۔۔۔۔

نمبردار کو کچھ یاد آیا۔۔۔۔

"ارے مہاراج ادھر میں بہت کام کاج میں لگا رہا۔۔۔ دھیان نہیں رہا۔ مندر کے گیہوں، گڑ اور کپڑے ابھی نہیں پہنچا پایا ہوں۔ آج ہی شام کو آدمی دے جائے گا۔"

مہاراج نے اطمینان کی سانس لے کر پھر آشیرواد دیا۔ اس بار انھوں نے ہاتھ اٹھا کر بڑا والا آشیرواد دیا تھا۔۔۔۔

بس اس ہیڈ ماسٹر کے بچے کے خیالات اور معلوم ہو جائیں۔ انھوں نے امرائی کے پاس کر جھکے شکستہ اسکول کو دیکھ کر سوچا۔۔۔۔

ہیڈ ماسٹر سے ان کے تعلقات عجیب نوعیت کے تھے۔ ضلع کلکٹر اور شہر کے پڑھے لکھوں کو دکھانے کے لیے گاؤں میں اسکول ہونا ضروری تھا اس لیے اسکول تھا۔ اسکول کا خرچہ گرام پنچایت اٹھاتی تھی۔ جس میں ساری بات نمبردار کی چلتی تھی۔ لیکن ہیڈ ماسٹر نمبردار اودل سنگھ کی جا بے جا خوشامد نہیں کرتا تھا۔۔۔۔ ظاہر ہے کہ یہ حرکت ایک معقول حرکت نہیں کہی جا سکتی۔۔۔۔ نمبردار کو دیہات کے بچوں کی تعلیم بہت اکھرتی تھی۔ انھیں معلوم تھا کہ وہ سارے لونڈے جنھوں نے اس اسکول میں تعلیم پائی تھی ان سے اتنے خوش نہیں رہتے تھے جتنے وہ لونڈے جنھوں نے تعلیم نہیں پائی تھی۔ انھوں نے خفیہ طریقے سے اس بات کی بھی ٹوہ لگائی تھی کہ کہیں یہ ہیڈ ماسٹر بچوں کو تعلیم دینے کے بہانے، نمبردار کی برائیاں تو نہیں کرتا۔ اس جاسوسی کے نتیجے میں انھیں براہ راست مثبت جواب نہیں ملا البتہ ٹوہ لینے والوں نے نمبردار کو یہ ضرور بتایا تھا کہ آج کل اسکول کی جو کتابیں چھپتی ہیں ان میں خواہ مخواہ ایسی باتیں ہوتی ہیں جن کو پڑھ کر لونڈے لوگوں کو نمبردار کا خیال آجاتا ہوگا۔ مثلاً مہابھارت کا وہ حصہ کتاب میں ہونا کیا ضروری ہے جس میں کنس کا ذکر بہت نفرت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اس طرح رامائین کا پاٹھ راون کے ذکر کے بغیر بھی ہو سکتا ہے۔ انھوں نے تاریخ کی کتابوں پر بھی مدلل اعتراضات کیے اور کہا کہ ہیڈ ماسٹر جان بوجھ کر ان حصوں کو بہت تفصیل کے ساتھ دانت پیس پیس کر پڑھاتا ہے جن حصوں میں، ہٹلر، مسولینی وغیرہ کا ذکر آتا ہے۔ ان لوگوں کی نظروں سے معاشیات کی کتابوں کے وہ مخدوش حصے بھی نہیں بچ سکے جن کو پڑھ کر لونڈے خود کو سب کے برابر سمجھنے لگے ہیں۔ ادب کے وہ حصے بھی مناسب نہیں تھے جن میں غریبی سے نفرت اور انقلاب کی ضرورت وغیرہ پر زور دیا گیا تھا۔۔۔۔

نمبردار نے نصاب سے متعلق اصلاحات کی ان تجویزوں کو ہیڈ ماسٹر کے سامنے رکھا تھا۔ ہیڈ ماسٹر یہ سن کر حیران رہ گیا تھا۔ پھر ہنسنے لگا تھا۔ اس کی حیرانی تو کسی حد تک اودل سنگھ کی سمجھ

میں آئی تھی مگر اس ہنسی کو انھوں نے بدتمیزی پر محمول کیا تھا۔۔۔۔

"آپ جانتے ہیں کہ آپ اس اسکول میں کس کی وجہ سے ہیڈ ماسٹر ہیں۔ میری وجہ سے مجھے؟"

تب ہیڈ ماسٹر نے دھیمی دھیمی آواز میں ان کو بتایا۔

"اول تو یہ کہ میں ہیڈ ماسٹر نہیں صرف ماسٹر ہوں کیوں کہ میرے علاوہ اسکول میں کوئی ماسٹر نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ میں بچوں کو تعلیم دیتا ہوں اور اس کے بدلے میں گرام پنچایت مجھے مہینہ مہینہ یا کبھی تین تین مہینے بعد تنخواہ دیتی ہے۔ تیسرے یہ کہ اتنی کم تنخواہ میں تین ماسٹروں کا کام اس دیہات میں میرے علاوہ کون کرے گا؟"

نمبردار کو سچائی کے اس قسم کے براہ راست اور بے تکلف اظہار سے بڑی الجھن سی ہوتی تھی۔

"اگر میں گرام پنچایت سے کہلوا کر آپ کو نکلوادوں تو۔۔۔۔" تو، کہنے کے لیے جتنا منھ کھولنا ضروری ہوتا ہے انھوں نے اس سے زیادہ کھولا اور دیر تک کھولے رکھا۔

"تو یہ ہوگا کہ گاؤں میں آپ کی تھو تھو ہوگی اور جب یہ بات قصبے تک پہنچے گی تو اگلے الیکشن میں آپ کے خلاف یہ بھی ایک نکتہ استعمال کیا جائے گا۔۔۔"

نمبردار نے اپنا بڑا سا کھلا ہوا منھ جلدی سے بند کر لیا۔ کیوں کہ وہاں تک نمبردار اودل سنگھ کی عقل نہیں گئی تھی اس لیے وہ ہیڈ ماسٹر کی اس اطلاع سے نروس ہو گئے تھے۔ تب انھوں نے پینترہ بدل کر کہا تھا۔۔۔۔

"میں نے تو ہیڈ ماسٹر صاحب آپ کی گہرائی جاننے کے لیے اتنی باتیں کیں۔ آپ کا رہنا اور یہاں رہ کر بچوں کو تعلیم دینا گاؤں کی شوبھا بڑھاتا ہے بلکہ آپ مجھے یہ کہنے دیجیے کہ یہ گاؤں آپ اور آپ کے اسکول کے بغیر ادھورا ادھورا سا لگتا ہے۔ اب آپ جا سکتے ہیں۔"

ہیڈ ماسٹر اپنی چرخ چوں سائیکل پر بیٹھ کر اسکول کی طرف بڑھ گیا تھا۔

انھیں ماسٹر کا ایک جملہ اور یاد آیا۔۔۔۔

"جنگلی جانور کو گڑ بادام کھلا کر اور سرسوں کا تیل پلا کر نمبردار نے اس کی بدھی بھرشٹ کر دی ہے۔ یہ پراکرتی کے خلاف ہے۔"

آج وہ اسی ہیڈ ماسٹر کے پاس اسی نیلے کے بارے میں اس کی تازہ رائے جاننے کے لیے نکلے تھے۔

ہیڈ ماسٹر اسکول میں بیٹھا بچوں کو سبق پڑھا رہا تھا۔

نمبردار ایک یاد سے بہت بچتے تھے۔ یاد آتے ہی خود کو ادھر ادھر بہکا لیتے تھے۔ مگر آج انھیں اس ہیڈ ماسٹر سے وہ عجیب و غریب پر اسرار ملاقات پھر یاد آئی۔ یہ جب کی بات ہے جب بڑکی کی عزت لوٹی گئی تھی۔ اس پر اسرار ملاقات سے کچھ دن پہلے کمہار کی بیوہ اور بڑکی اور چھٹکی اسکول کی

چھٹی کے بعد اسکول کے باہر نیم کے درخت کے نیچے ماسٹر صاحب کا انتظار کیا تھا۔ جب وہ اسکول بند کرکے وہاں سے گزرے تو کمہارن نے ان کے پاؤں پکڑ کر رو رو کر کہا تھا کہ نمبردار کا نیلا روزانہ ان کے محنت سے بنائے ہوئے برتن توڑ دیتا ہے۔ وہ آج شکایات لے کر ٹھاکر کے پاس گئیں تو ٹھاکر نے ہنس کر ان سے کہا کہ برتن توڑتا ہے، مٹی تو نہیں کھاجاتا ہے۔ اسی مٹی کو پھر سے گوندھ گاندھ کر برتن بنالیا کرو اس میں اتنی پریشانی کی کون سی بات ہے جو مجھے کلیئو کے وقت پریشان کررہی ہو۔

ہیڈ ماسٹر نے ان تینوں کو ڈھارس دی اور گڑھی میں جاکر نمبردار کو سمجھایا۔ نمبردار نے تو ہنس کے ٹال دیا مگر اونکار کا چہرہ سرخ ہوگیا جو وہیں کھڑا سب کچھ سن رہا تھا۔

گڑھی کے دروازے پر تینوں عورتیں کھڑی ماسٹر کا انتظار کررہی تھیں۔ جب ماسٹر بڑے دروازے سے نکل رہا تھا تو اس نے اونکار کو غصے کی حالت میں کمہارن اور اس کی بیٹیوں سے بات کرتے دیکھا۔ وہ ان تینوں کو ننگی ننگی گالیاں دے رہا تھا جن کو آج اتنی ہمت ہوگئی کہ وہ پنچایتی اسکول کے ماسٹر کو ان کے باپ کے پاس نیلے کی شکایت لے کر بھیجیں۔ ماسٹر کو آتا دیکھ کر اس نے نسبتاً شائستہ لہجے میں ان دوٹکوں لونڈیوں کو کپڑے اتارنے والی نظروں سے دیکھ کر کہا تھا:

"اوپر والے کا شکر کرو کہ ابھی نیلے نے ہی برتن توڑے ہیں۔ میں نے تو ابھی برتنوں کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔" وہ جاہل عورتیں کیا سمجھتیں مگر ماسٹر کا ماتھا ٹھنک گیا۔ وہ وہیں کا وہیں کھڑا رہ گیا۔

جب بڑکی کا جھونپڑے والا واقعہ ہوگیا تو ایک رات ٹھاکر جیپ میں سوار گاؤں کی گڑھی تک آئے اور اتر کر تھکے تھکے قدموں سے جب گڑھی کے دروازے پر پہنچے تو دھندلکے میں انھیں ایک شخص رضائی اوڑھے کھڑا دکھائی دیا۔ وہ آدمی دھیمے دھیمے رو رہا تھا۔ انھیں اس پراسرار شخص سے ڈر محسوس ہوا۔ وہ پہرے داروں کو آواز دینے ہی والے تھے کہ اس شخص نے رضائی سے منھ نکال لیا۔ اس کی بوڑھی آنکھیں سرخ تھیں اور گیلی تھیں۔ اس نے رندھی رندھی آواز میں ٹھاکر سے کہا۔۔۔ "نمبردار جی! بڑکی کی عزت معلوم ہے کس نے کس نے۔۔۔؟" ٹھاکر نے مری مری آواز میں پوچھا۔ انھیں اس سوال کے جواب اور ہیڈ ماسٹر کے اس پراسرار روپ سے ڈر لگ رہا تھا۔۔۔

"اس نے۔ ادھر دیکھو۔" ٹھاکر نے اس کی انگلی کے اشارے پر نظریں دوڑائیں سامنے اندھیرے میں نیلا کھڑا تھا۔ ہیڈ ماسٹر انھیں حیران دیکھ کر ہنسا تھا اور پھر اندھیری گلی میں غایب ہوگیا تھا۔۔۔۔ ٹھاکر جلدی سے اس یاد کو اپنے ذہن سے جھٹکا۔ نمبردار اور ان کے ساتھ والوں کو دیکھ کر اس نے جلدی جلدی سبق ختم کرایا اور سیڑھیاں اتر کر نیچے آیا اور سلام کرکے خاموش کھڑا ہوگیا۔۔۔۔۔ پھر بولا۔

"میرا دل چاہتا ہے کہ آپ میرے ساتھ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چل کر بیٹھیں۔۔۔"
نمبردار کو اس معمولی گزارش میں ایک طرح کی علامتی قسم کی گستاخی نظر آئی۔۔۔۔

"نہیں نہیں ہیڈ ماسٹر صاحب۔۔۔۔ بس بہت دن سے آپ کو دیکھا نہیں تھا، سوچا آپ سے سلام دعا کر لیں۔۔ ہم لوگ ادھر نیلے کی تلاش کر رہے ہیں۔ آپ نے تو نہیں دیکھا؟" نمبردار نے یہ کہہ کر ماسٹر کے چہرے کو گہری نگاہوں سے کریدا اور اپنے ذہن کی داد دی کہ کیسے انھوں نے سمجھ لیا کہ ہیڈ ماسٹر کے سیڑھیاں چڑھا کر اوپر لے جانے والے جملے مطلب تھا کہ نمبردار بھی اس کی شاگردی اختیار کر کے علم کی بلندیاں چڑھ کر اس کی اونچائی تک پہنچ جائیں۔ انھوں نے ایک بار پھر اپنی عقل کو داد دی اور ایک بار پھر ہیڈ ماسٹر کے چہرے کو اپنی نظروں سے کریدا کیوں کہ ہیڈ ماسٹر کے چہرے پر شیو بڑھا ہوا تھا اس لیے وہ اس کے چہرے کو اپنی نظروں کی مدد سے زیادہ نہیں کرید پائے۔۔۔۔

"نہیں ادھر تو نہیں دیکھا لیکن میں نے آپ کو پہلے ہی سمجھایا تھا کہ ایسے وحشی جانور کو اگر پالنا ہی ضروری ہے تو وہی کھان پان دیں جو اسے جنگل میں ملتا ہے اور اسے انسانوں کی صحبت سے دور رکھیں ورنہ اس کا وہ فطری ڈر ختم ہو جاتا ہے جو ہر جانور کو انسان سے محسوس ہوتا ہے۔"

نمبردار کو اندازہ ہو گیا کہ ہیڈ ماسٹر کی نیلے کے بارے میں تازہ رائے کیا ہے۔ ہیڈ ماسٹر کی تازہ رائے ہیڈ ماسٹر کی باسی رائے سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھی۔ اب نمبردار نے اسے علم کے وار سے گھائل کرنا مناسب سمجھا۔۔۔۔

"ہیڈ ماصاب میرے بہت سے دوست ہیں۔ آسام سے لے کر گجرات اور ہمالہ سے لے کر تمل ناڈو تک۔ آسام والے نے قاضی رنگا سے ایک نیلا پکڑ کر پالا، گجرات والے نے گیر کے جنگل سے نیلا لا کر اپنے ساتھ رکھا۔۔۔ ترائی والے دوست نے دودھوا کے جنگل سے نیلا حاصل کیا اور تمل ناڈو والے نے باندی پور کے جنگل سے پکڑ کر اپنا پالتو بنایا۔ مگر آپ کو میرے ہی نیلے میں ساری برائیاں نظر آتی ہیں۔۔۔۔"

"نمبردار! آپ سچ سچ بتانا کیا آپ کے دوستوں نے جو نیلے پالے وہ بڑے ہو کر قیمتی غذائیں کھا کر جنگل میں دوڑنے کی محنت اٹھائے بغیر چارا کھا کر، کیا مست نہیں ہوئے۔ کیا بربادی نہیں مچائی۔۔۔۔؟"

نمبردار نے اس بات کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا۔ وہ خود اپنے نیلے میں اتنی بری طرح الجھے رہتے تھے کہ انھیں اپنے دوستوں کے نیلوں کا زیادہ دھیان ہی نہیں آتا تھا۔۔۔۔

انھوں نے بات بدلنے کی خاطر پوچھا۔۔۔۔

"اچھا تو ماسٹر صاحب آپ ہی بتاؤ اب کیا کیا جائے۔"

"پہلے تو آپ نیلا ڈھونڈیے وہ جہاں بھی جائے گا آفت مچائے گا۔ اس کی عادتیں خراب

ہو چکی ہیں۔ اسے ڈھونڈ کر اپنے پاس باندھ کر رکھیے اور آہستہ آہستہ اس کی بری عادتیں چھڑوائیے۔ اس کی غذا بدلیے۔ اسے پھر سے اس کی فطری غذا پر لائیے۔ حالاں کہ اس میں پریشانی تو ہوگی مگر یہ تو اب کرنا ہی پڑے گا۔ جب وہ اپنی غذا کا عادی ہو جائے تو اس کو میدانوں میں چھوڑئیے۔ اس بیچ اس کی چربی بھی کچھ کم ہو چکی ہوگی۔ اور چربی کم ہونے سے وہ میدان دوڑنے میں تکلیف نہیں محسوس کرے گا۔ میدانوں میں بھاگ دوڑ کر کے جب اسے اپنی جنگل کی غذا ملے گی اور اسے اپنے ساتھی ملیں گے اور مادائیں ملیں تو اس کا جنون ختم ہو جائے گا اور پھر اپنی فطری زندگی کا عادی ہو جائے گا۔۔۔۔"

"لیکن میری گڑھی اور حویلی کا کیا ہوگا۔" ٹھاکر کے منھ سے نکل پڑا۔"

"اس کا کیا مطلب؟"

ٹھاکر کو اندازہ ہو گیا کہ ان کے منھ سے حماقت کی بات نکل گئی یعنی صحیح بات نکل گئی۔ فوراً پہلو بدل کر بولے۔۔۔۔

"مطلب گڑھی اور حویلی میں اسے دیکھنے کی عادت پڑ گئی ہے۔ وہ نظر نہیں آئے گا تو کتنا برا لگے گا۔"

"نمبردار جی! گڑھی اور حویلی میں اپنے بیٹے اور بہو اور پوتے پوتی اور گاؤں والوں اور قصبے والوں کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوا کیجیے اور انھیں میں اپنی تفریح کا سامان پیدا کیجیے۔ انھیں میں آپ کی زندگی ہے اور انھیں سے آپ کی زندگی ہے۔ بھگوان کے لیے اب اپنا شوق ختم کیجیے۔ آپ کا یہ شوق اس جانور کو بھی بھاری پڑ رہا ہے اور گاؤں اور قصبے والوں کو بھی، گڑھی اور حویلی میں بھی بربادی مچی ہوئی ہے۔ آج جا کر آپ من لگا کر سوچیے کہ کیا کارن ہے جس کی وجہ سے آپ کو نیلے کی چاہ ہے۔ جب وہ کارن سمجھ میں آجائے تو اس کارن کی جڑ کاٹ کر پھینک دیجیے۔"

نمبردار اودل سنگھ جب واپس آئے تو بظاہر وہ اپنے ساتھ والوں سے ہیڈ ماسٹر کی حماقت آمیز باتوں پر ہنس ہنس کر جملے کس رہے تھے لیکن اندر انھیں محسوس ہو رہا تھا کہ جاہل ہیڈ ماسٹر نے ان کی دکھتی نبض پر انگلی رکھ دی ہے۔

گڑھی میں واپس آکر وہ چھت پر چڑھ گئے اور وہاں انھوں نے دور مندر کے کھیت میں کھڑے نیلے کو محسوس کیا اور اس بات سے مطمئن ہوئے کہ سردیوں کا زمانہ ہے ورنہ گرمی ہوتی تو نیلا اتنی دیر تک کھیت کی گرمی کی تاب نہیں لا پاتا۔ وہیں کھڑے کھڑے انھوں نے نیلے سے پیدا ہونے والی دہشت کو محسوس کیا اور اس دہشت کے سائے میں قطرہ قطرہ بڑھتی دولت اور انچ انچ بڑھتے اقتدار اور اختیار کا لقمہ لقمہ ہضم کیا اور جب وہ سیڑھیوں سے نیچے اتر رہے تو ایک طرف تو ان کا ذہن کہہ رہا تھا کہ نیلے سے چھٹکارا حاصل کر لو اور دوسری طرف کوئی چپکے چپکے کہہ رہا تھا کہ یہ ممکن نہیں ہے۔ انھوں نے کان لگا کر سنا تو یہ دوسری آواز ان کے سینے کے بائیں طرف سے آئی۔

تھی۔

جب وہ آنگن میں آکر مونڈھے پر بیٹھے تو چراغ جل چکے تھے۔ باہر سے بہرے دار دوڑتے ہوئے آئے اور انھیں اطلاع دی کہ نیلا ارہر کے کھیت میں سے رسی تڑا کر بھاگ لیا ہے۔

ان کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ ایسا نہ ہو کہ وہ قصبے میں پہنچ جائے۔ اب کوئی بربادی ہوئی تو بڑی بدنامی ہوگی۔

وہ جیپ پر بیٹھ کر ہوا کی رفتار سے قصبے کی طرف روانہ ہوئے۔ پرتاپ روکتا ہی رہ گیا۔۔۔۔

قصبے کی گلیوں میں اسٹریٹ لائٹ کی مدھم روشنی تھی۔ لیکن انسان نہیں تھے۔ سب اپنے اپنے گھروں میں کنڈی لگائے بیٹھے تھے۔ چوراہوں پر پولس والے کھڑے سیٹیاں بجا رہے تھے اور آوارہ کتے خلاف معمول اتنی جلد بازار سونا دیکھ کر منحوس آواز میں رونے لگے تھے۔

نیلا قصبے میں کسی بھی گھر کے پاس کھڑا مل سکتا ہے۔ یا ہو سکتا ہے قصبے کے باہر کھیت یا کسی اجڑے ہوئے باغ میں کھڑا ہو۔ حویلی تک جانے والی سڑک کے ایک موڑ پر جیسے ہی وہ مڑے انھیں ایک سایہ سا نظر آیا۔ خوف کی ایک ٹھنڈی لہر ان کی گدی سے ہوتی ہوئی پوری پیٹھ پر پھیل گئی۔۔۔ یہ نیلے کا ہی سایہ ہوگا کہ انسان تو سارے اسی کے ڈر سے گھروں میں بند بیٹھے ہیں۔

حویلی کے صحن میں جا کر انھوں نے نیلے کو ہر طرف تلاش کیا وہ کہیں نہیں ملا۔ بجلی چلی گئی تھی اور رات بالکل تاریک تھی۔ وہ بیٹھک میں اکیلے بیٹھے سوچتے رہے اور ڈرتے رہے۔ رات کے بارہ بجے کے بعد کسی وقت ان کی آنکھ لگ گئی۔ اچانک پورے قصبے میں چیخ پکار کی لپٹیں اٹھنے لگیں۔ حویلی کے نوکروں میں بھی بھگدڑ مچ گئی۔۔۔۔

وہ جلدی سے اٹھے اور کھڑکی سے باہر جھانکا۔ اندھیرے میں کوئی جانور تیز تیز سانس لیتا ہوا بھاگا جا رہا تھا۔ وہ اندازہ نہیں کر پائے کہ وہ کدھر گیا۔ اچانک پھر ایک جانور مخالف سمت سے بھاگتا ہوا آیا اور دوڑتا چلا گیا۔

انھوں نے سامنے کی گلی کی طرف نگاہ اٹھائی، وہاں بھی ایک سیاہ سایہ کھڑا تھا۔ انسانوں کا شور اور پولیس کی سیٹیوں کی آوازیں ابھی بھی تھمی نہیں تھیں۔ انھوں نے گلی کی طرف پھر دیکھا۔ اب وہ سایہ وہاں نہیں تھا۔۔۔۔

(۱۳)

اس رات ایک ساتھ ۱۲ وارداتیں ہوئیں۔ قصبے کے کونے والے محلے کے ایک ہی خاندان کے تین گھروں کے دروازے ٹوٹے ہوئے پائے گئے۔ بزریا کی پانچ دوکانوں کے شٹر ٹیڑھے ہو گئے تھے اور اندر کی جنس دوکانوں میں چاروں طرف بکھری ہوئی ملی تھی۔ تین پولیس والوں پر پیچھے سے کسی جانور نے اندھیرے میں حملہ کیا جو بڑے نالے کی پلیا پر بیٹھے اونگھ رہے

تھے۔ میونسپل بورڈ میٹنگ ہال کا دروازہ توڑ کر پندرہ کرسیوں کو سینٹھے کے قلم کی طرح ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا تھا۔ جو وارداتیں پکی زمین پر ہوئی تھیں وہاں جانور کے کھروں کے نشان پائے گئے تھے۔۔۔۔

میونسپل بورڈ کے آفس میں ضلع کلکٹر متفکر بیٹھا تھا۔ ٹھاکر اودل سنگھ اور محمود صاحب اس کے دائیں بائیں بیٹھے تھے۔ قصبے کا دورہ کر کے ایس پی صاحب جیپ سے اترے، ان کے ساتھ ہی قصبہ انچارج کو دیکھا۔ ہال میں آکر ایس پی صاحب ایک کرسی کھینچ کر کلکٹر صاحب کے برابر بیٹھ گئے۔ قصبہ انچارج سامنے آکر اٹینشن کھڑا ہو گیا۔

"آرام سے۔" ایس پی نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ وہ آرام سے ہو گیا۔ "آپ نے نتیجہ دیکھ لیا۔۔۔" کلکٹر نے خاموشی توڑی۔

نمبردار چپ بیٹھے رہے۔ محمود صاحب نے بھی سر جھکا لیا۔ اودل سنگھ کی بدنامی اور بے عزتی اتنی واضح تھی کہ محمود صاحب کی مزید کمک کی ضرورت نہیں تھی۔۔۔۔

"مگر یہ ساری وارداتیں ایک ہی نیلے کی کارستانی نہیں ہیں۔" ایس پی نے انکشاف کیا۔

"آپ کا مطلب ہے کہ کئی نیلے ہیں۔" کلکٹر صاحب نے پوچھا۔

"نہیں، یہ یقین سے نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن پولیس والوں کا بیان تھا کہ ان پر جو حملہ ہوا اس میں ایک سے زیادہ جانور ملوث تھے۔" ایس پی کے اس جملے سے نمبردار اودل سنگھ کے بدن میں کچھ جان پڑی۔

"یہ کیا معاملہ ہے۔ کچھ اندازہ؟"

"قصبہ انچارج سے بات چیت کے دوران اندازہ ہوا کہ کچھ روز پہلے کانجی ہاؤس سے نیلے نے جن بجاروں کو آزاد کرایا تھا وہ اس کے ملزم ہو سکتے ہیں۔ کئی دنوں کے بھوکے پیاسے بجار رات کو اپنی اپنی پناہ گاہوں سے نکلے ہوں گے اور پانی پینے نالے پر آئے ہوں گے۔ وہاں سپاہی بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ پانی کے حصول میں مزاحم سمجھ کر حملہ بول دیا ہوگا۔۔۔۔"

"کیا نیلے اور بجار کے کھر کے نشان میں فرق محسوس ہو سکتا ہے۔" کلکٹر صاحب نے پوچھا۔

"جی ہاں سرکار!" قصبہ انچارج بولا۔ "مگر ہوا اتنی چلی کہ ان کے کھر آدھے ہیں آدھے غائب۔ اب پہچان مشکل ہے۔"

نیلے کے کھر کی پہچان والی بات سن کر نمبردار اودل سنگھ نے بازی پلٹتی محسوس کی فوراً بولے۔ اور کیوں کہ اس بار پہلی مرتبہ بولے تھے اس لیے بات دھیان سے سنی گئی۔

"صاحب! بزرریا کی دو کانیں توڑ کر سامان کون اٹھالے گیا۔ یہ حرکت جانور نہیں کر سکتا۔"

اس بات کو سن کر ایس پی اور تھانہ انچارج نے سر جھکا لیا۔ تھانہ انچارج کا لمبوترا چہرا اس

کے سینے پر ٹک گیا اور دیر تک وہیں ٹکا رہا۔

کلکٹر نے مسوری کی تربیت کے دوران بڑی نادر و نایاب باتیں سیکھیں تھیں اس لیے وہ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔

"اصل معاملے سے توجہ نہیں ہٹنا چاہیے۔ جب جڑ کا علاج ہو جائے گا تو باقی باتیں خود بخود درست ہو جائیں گی۔ اس پورے فتنے فساد کی بنیاد ہے دراصل ٹھاکر صاحب کا نیلا، جو اب پاگل ہو چکا ہے۔ اس وقت اسی کے بارے میں گفتگو کرنا چاہیے اب آپ بتائیے ٹھاکر صاحب کہ آپ کا فیصلہ کیا ہے؟"

"جس میں سب کی بھلائی ہو۔" ٹھاکر دل کڑا کر کے بولے۔

"اگر وہ ہاتھ آ جائے تو اس کا کیا کیا جائے۔" کلکٹر نے ان کی آنکھوں میں جھانک کر پوچھا۔

"میرے حوالے کر دیا جائے۔ میں اسے دوبارہ جنگل کی عادت ڈال دوں گا پھر اس کا پاگل پن ختم ہو جائے گا۔ ٹھاکر اودل سنگھ نے ہیڈ ماسٹر والا سبق یاد کرنے کی کوشش کی۔

"آپ کے حوالے کر دیا جائے تاکہ وہ پھر آزاد ہو کر تباہی مچائے۔" کلکٹر نے استہزا کے انداز میں کہا۔

ٹھاکر صاحب کا دل دھک سے رہ گیا۔ کیا کلکٹر کو معلوم ہے کہ وہ میرے ہاتھ آ کر نکل چکا ہے۔ پھر انھوں نے خود کو تسلی دی کہ کلکٹر نے یہ بات یوں ہی رواروی میں کہہ دی ہے۔

"سنیئے جناب! رائے عامہ کا زبردست دباؤ ہے۔ دیگر قصبوں والوں نے بھی شکایت کی ہے کہ نیلا ان کے یہاں بھی تباہی مچا رہا ہے۔ کل نیلا شہر میں بھی دیکھا گیا ہے۔ اب یہ معاملہ مقامی نہیں رہا۔ لیکن نیلا کیوں کہ آپ سے وابستہ ہے اور اس کا مقام واردات خاص طور پر یہ قصبہ ہے اس لیے کہ آپ دونوں حضرات قصبے کے معزز شہری کی حیثیت سے اس کاغذ پر دستخط کیجیے کہ نیلے کی وحشیانہ سرگرمیوں کی وجہ سے نیلے کو مارنا مناسب ہوگا۔ یہ درخواست وائلڈ لائف افسر کے نام ہے۔ میں ان سے اجازت نامہ پیشگی حاصل کر چکا ہوں۔ یہ دیکھیے ---- " انھوں نے کون کی جیب سے سرکاری مہر والا ایک کاغذ دکھایا۔

" محمود صاحب نے تیزی سے اور ٹھاکر صاحب نے مرے مرے ہاتھوں سے کلکٹر کے دیے ہوئے کاغذ پر دستخط کیے۔ محمود صاحب نے شکر ادا کیا کہ کلکٹر اور ایس۔ پی کسی نے بھی میونسپل بورڈ کے آفس کی توڑ پھوڑ کے بارے میں کسی رائے کا اظہار نہیں کیا تھا۔

ٹھاکر اودل سنگھ نے دستخط کرنے کے بعد سوچا کہ یہ مرحلہ ختم ہو تو وہ جلد از جلد گڑھی اور حویلی کی ساری دولت نکال کر شہر کے اس بینک میں رکھ دیں گے جہاں پچھلے ہفتے ہی ایسے لاکر تقسیم ہونا شروع ہوئے ہیں جن کو حاصل کرنے کے لیے نام کا اندراج نہیں کرنا پڑتا بلکہ کوڈ نمبر دے دیا جاتا ہے۔

"مگر ایک بات سمجھ میں نہیں آئی کہ جانور واردات کر کے چھپ کہاں گئے ہیں۔۔۔۔" ایس پی صاحب بولے۔

"میں کچھ کہوں گا تو کہا جائے گا کہ میں نیلے کی حمایت میں بول رہا ہوں۔آپ یقین کیجیے میں نے رات کو چیخ پکار کے بعد اپنی کھڑکی سے تین نیلے اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے۔" ٹھاکر نے رات کا منظر یاد کیا اور جھرجھری لے کر بولے۔

"کیا وہ نیلے ہی تھے۔" ایس پی نے پوچھا۔

"نہیں۔۔۔۔ لیکن وہ جانور یقیناً تھے۔" ٹھاکر نے جواب دیا۔

"ممکن ہے ٹھاکر صاحب کا نیلا جنگل سے اور وحشی نیلوں کو لگا لایا ہو جو اس کے بدن کی موٹی چربی دیکھ کر لالچ میں آ گئے ہوں۔" کلکٹر نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔

"ممکن ہے قصبے کے عام جانوروں نے نیلے کی وحشت کی شہرت کا فائدہ اٹھایا ہو۔" ایس پی نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔

"لیکن یہ سب کچھ بہت خطرناک اور پراسرار ہے۔" محمود صاحب نے کہا۔ وہ چاہتے تھے کہ گفتگو نیلے اور دیگر جانور سے ہی متعلق رہے۔ میونسپل بورڈ آفس کی توڑ پھوڑ کا ذکر نہ آپائے۔

"لیکن بنیاد وہ نیلا ہی ہے۔" کلکٹر نے کہا لیکن دل ہی دل میں سوچا کہ دور دراز کی ساری بستیوں سے بہ بادیوں کی خبریں آ رہی ہیں ان سب کا سبب تو یہ اکیلا نیلا نہیں ہو سکتا۔ تمام علاقوں میں کل ملا کر کتنے پالتو نیلے ہیں؟" وہ اگر ختم بھی ہو جائے تو اس کے ساتھ کے نیلے اور کانجی ہاؤس کے بچاروں کا بھی انتظام کرنا ہوگا۔" ایس پی نے ان کا دھیان بٹایا۔

"ارے پہلے اس ایک نیلے کو ہی قابو میں کیجیے کپتان صاحب۔" کلکٹر نے فکر مند مسکراہٹ کے ساتھ کہا جس میں کچھ کچھ طنز کی چمک بھی تھی۔

اس جملے کے بعد سب نے اپنے اپنے سر جھکا لیے تھے۔ خود کلکٹر صاحب کا سر بھی اٹھا ہوا نہیں تھا۔

دور آفس سے ملحق پارک کی سیڑھیوں پر کچھ شور سا ہوا۔ گڑھی کا پہرے دار ہانپتا کانپتا روتا چلاتا بھاگا چلا آ رہا تھا۔

آفس میں گھس کر اس نے نمبردار کے پیر پکڑ کر کہا۔۔۔۔

"نمبردار جی۔۔۔۔ نیلا گڑھی میں آ گیا ہے۔ بڑی بہو کے کرتے ٹکریں مار رہا ہے۔ پرتاپ بھیا اور بچے بھی کمرے ہی میں ہیں۔

باہر سے کلکٹر کا باڈی گارڈ ہانپتا ہوا اندر داخل ہوا۔۔۔۔

"شہر سے وائرلیس میسج آیا ہے کہ وہاں وہی واردات ہو گئی ہے۔"

کلکٹر اور ایس۔پی شہر روانہ ہونے سے پہلے تھانہ انچارج کو نیلا مارنے کا اجازت نامہ اور

ضروری ہدایتیں دے گئے۔ وہ جیپ پر چڑھتے چڑھتے وعدہ کر گئے کہ آدھے گھنٹے کے اندر اندر پولیس کی مزید ٹکڑیاں بھیج دیں گے۔۔۔۔

ٹھاکر صاحب کے سینے میں پنکھے چل رہے تھے اور آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا رہا تھا۔ وہ کانپتے ہوئے قدموں سے جیپ پر چڑھے اور چند ہی منٹوں میں لیکن اپنے حساب سے کئی گھنٹوں میں دیہات پہنچ پائے۔ گڑھی کے سامنے چھنکی کا جھونپڑا چڑیا کے گھونسلے کی طرح اٹھا اٹھا پڑا تھا۔ گاؤں کے سب لوگ دہشت زدہ اپنے اپنے گھروں میں بند تھے۔ جھونپڑے کے باہر چھنکی کی کھوندی ہوئی لاش پڑی تھی۔ بچے کمرے میں بند تھے۔ اور پرتاپ اور بڑی بہو گڑھی کے دروازے کی سلاخوں سے لگے کھڑے کانپ رہے تھے۔ نیلے کا دور دور تک نام و نشان نہیں تھا۔۔۔

"وہ ہمارے دروازے پر ٹکریں مار مار کر لہولہان ہو گیا تھا۔ دروازہ بہت مضبوط تھا، ٹوٹا نہیں۔ وہ گڑھی میں چاروں طرف بھاگ بھاگ کر کسی کی تلاش کر رہا تھا۔ شاید آپ کو ہی تلاش کر رہا تھا۔ شاید آپ کو ہی تلاش کر رہا تھا۔ چاروں طرف سے اس پر یورش ہے بس آپ کو ہی اپنی پناہ سمجھتا ہے۔۔۔۔" پرتاپ نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان بتایا۔۔۔

"جیسے ہی وہ گڑھی سے باہر نکلا ہم نے کمرے سے نکل کر گڑھی کا دروازہ بند کر لیا۔ وہ چھنکی کے جھونپڑے کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔" بڑی بہو کچھ کہتے کہتے رک گئی۔۔۔۔

پھر اس نے ڈر سے کانپتے ہوئے شرم سے آنکھیں جھکائے ہوئے بتایا۔۔۔۔ "اپنے جھونپڑے میں چھنکی ہر مہینے کپڑے کے چیتھڑے اڑس دیتی تھی۔ جیسے ہی وہ اس دفعہ کے چیتھڑے اڑس کر مڑی نیلا پیچھے کھڑا تھا۔ وہ چیخ کر جھونپڑے میں گھس گئی۔ اور ٹٹر بند کر لیا۔ نیلے نے گردن اٹھا کر ان چیتھڑوں کو سونگھا اور انھیں سونگھتے ہی دو پیروں پر کھڑے ہو کر دیوانوں کی طرح زمین پر لوٹنے لگا۔۔۔" بڑی بہو بیان کرتے کرتے تھک گئی تھی۔

تب پرتاپ نے واقعہ بیان کرنا شروع کیا۔۔۔۔ "پھر وہ اٹھا اور پیروں پر کھڑا ہو کر کسی ان دیکھے انسان سے لڑنے لگا جیسے کسی پر قابو پانا چاہتا ہو۔۔۔ پھر اس نے چھنکی کی چیخیں سنیں۔ اس نے سینگوں کے ایک ہی ریلے میں ٹٹر توڑ دیا اور اگلی ٹانگیں اٹھا اٹھا کر چھنکی کو کھوندنا شروع کر دیا۔ جب وہ بے دم ہو کر گر پڑی تو نیلے نے چھپر کا تنکا تنکا الگ کر دیا۔۔۔" پرتاپ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے جو مسلسل بہہ رہے تھے مگر بیان کے زور میں وہ انھیں پونچھنا بھی بھول گیا۔۔۔

انچارج نے چھنکی کی لاش کا پنچ نامہ کرایا اور شہر روانہ کر دیا۔۔۔۔ انچارج نے ٹھاکر صاحب کے پاس آکر سرگوشی کی۔۔۔۔ "وہ آپ ہی کی چاہ میں ہے۔ شاید آپ کے قابو آسکے۔ ویسے تو اب اسے مارنے کا اجازت نامہ بھی میرے پاس موجود ہے۔۔۔۔"

کھیتوں کی طرف سے ہیڈ ماسٹر دوڑتے ہوئے آئے اور بتایا کہ انھوں نے ابھی ابھی نیلے

کو مندر والے کھیت میں گھستے دیکھا ہے۔

پولیس کی کئی جیپیں رکیں۔ شہر سے کمک آگئی تھی۔

ٹھاکر اودل سنگھ نے سوچا، اس بچ نیلے کو اپنی غذا کہیں نہیں ملی ہوگی اسی لیے وہ مندر والے ارہر کے کھیت میں چلا گیا ہے۔ وہاں اب بھی ناج گڑ اور بادام رکھے ہوں گے اور ناند میں پانی بھی بھرا ہو گا۔۔۔ اور وہاں کوئی آدمی بھی نہیں ہو گا۔۔۔۔

تھانہ انچارج نے گالیاں دے دے کر گاؤں کے مردوں کو ان کے گھروں سے نکالا۔۔۔ سب اس بات پر راضی ہو پائے کہ ارہر کے کھیت تک ٹھاکر اودل سنگھ بھی جائیں گے۔۔۔

"کیا میں اسے مرتا ہوا دیکھ سکوں گا۔۔۔۔ ؟" ٹھاکر اودل سنگھ نے اپنے دل سے پوچھا۔۔۔ ان کے دل نے جواب دیا کہ شہر میں نئے طریقے کے لاکر آگئے ہیں۔ انھوں نے کھیت پر جانے کی حامی بھرلی۔۔۔۔

تھانہ انچارج نے سپاہیوں کو گاؤں کے چاروں طرف بندوقیں لے کر کھڑا کردیا اور مختلف ہدایتیں دے کر سب کے مورچے درست کرائے۔

لاٹھی، ڈنڈا، سانٹھا جو جس کے ہاتھ آیا لے کر ارہر کے کھیت کی طرف چلا۔۔۔۔

"تم دونوں بچوں کو لے کر اپنے کمرے میں بند ہو جاؤ مگر گڑھی کا دروازہ کھلا رکھنا۔۔۔۔ شاید وہ بھاگ کر ادھر ہی آئے۔ اگر وہ گڑھی میں آیا تو میں دروازہ بند کر کے رام کر لوں گا۔۔۔۔" ٹھاکر صاحب نے پرتاپ اور بڑی بہو کو ہدایت کی۔

(۱۴)

بانکا ہونے کے بعد ارہر کے کھیت سے نکلتے ہی تھو تھنی اور سر پر لاٹھیاں اور ڈنڈے لگاتار پڑے۔ سیاہ بدن پر جگہ جگہ خون ابل رہا تھا وہ بھاگا۔ اس کی ایک آنکھ بھی زخمی ہو گئی تھی اسی لیے وہ ٹیڑھا ٹیڑھا بھاگ رہا تھا۔۔۔۔ ٹھاکر اودل سنگھ اسے گاؤں کی طرف بھاگتا دیکھ کر پوکھر والے راستے سے تیزی کے ساتھ گڑھی کی طرف بڑھے۔ لاٹھیاں لیے ہجوم لمبے والے راستے سے اس کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔۔۔۔ نیلے نے چہرے سے بہتے ہوئے خون کی چادر کے پیچھے سے کچھ اجنبی شکلوں کو گاؤں کی سرحد پر دیکھا۔ اس نے کالا کالا اور گڑھی کے پیچھے والے راستے یعنی ٹوٹی ہوئی دیوار سے داخل ہوا اور گڑھی کے صحن میں آگیا۔ پرتاپ اور بڑی بہو بچوں کو کمرے کے اندر کر کے خود باہر کھڑے تھے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ ٹوٹی ہوئی دیوار کے رستے سے آجائے گا۔ دونوں بجلی کی سی تیزی سے کمرے کی طرف بھاگے جس کے دروازے میں بچے کھڑے دیوانوں کی طرح چیخ رہے تھے۔ بڑی بہو کا پیر ساڑی میں اٹکا اور وہ لڑکھڑا گئی۔ پیچھے سے آتا ہوا پرتاپ اس سے ٹکرایا اور رک گیا۔ بہو کمرے کے اندر داخل ہو چکی تھی اور پرتاپ نیلے کے سینگوں سے الجھا ہوا تھا۔ بڑی بہو اضطراری طور پر کمرے سے باہر آئی تو بچے بھی ماں سے لپٹ کر باہر آگئے۔ وہ گھوم کر

بچوں کو پکڑ کر کمرے میں بھاگی۔ مڑی تو دیکھا کہ نیلا اپنی پچھلی ٹانگوں پہ کھڑا ہوا اگلے کھروں سے پرتاپ کا سر پاش پاش کر چکا ہے۔ جب دھول کچھ کم ہوئی تو بڑی بہو نے حیران حیران خالی خالی آنکھوں سے دیکھا کہ پرتاپ زمین پر پرانے لحاف کی طرح ادھڑا ادھڑا پڑا ہے اور نیلا خون کی دھاریوں کے پیچھے سے اپنی آنکھوں کو پٹ پٹ کھول رہا ہے۔ بند کر رہا ہے اور پرتاپ کی لاش کے چاروں طرف ٹکراتا، اٹھتا، لڑکھڑاتا ہوا چکر لگا رہا ہے اور گڑھی کے دروازے سے نمبردار اور دل سنگھ دیوانوں کی طرح چیختے چلاتے داخل ہو رہے ہیں۔

اسے بہت دھندلا دھندلا سا نظر آ رہا تھا۔ ایک آنکھ شاید بالکل ختم ہو گئی تھی اور دوسری سر سے بہنے والے خون سے لتھڑی ہوئی تھی۔

نیلے نے خون سے لتھڑی آنکھیں پٹپٹائیں، اتنے زور سے سانس بھری کہ اس حصے کی مٹی اڑنے لگی، گردن کو جھٹکا دیا، دُم کو گردش دی اور سینگوں کو آگے کر کے پوری طاقت سے اس آدمی سے ٹکرا کر دیوار تک رَوندتا چلا گیا۔ جب دیوار سے اس آدمی کا سر ٹکرا گیا تو سینگوں کو گھونپ گھونپ کر اس کی آنتیں نکال کر اپنے کھروں سے کھوندتا رہا اور پھر وہاں کسی کو نہ پاکر ٹوٹی ہوئی دیوار کے راستے کو یاد کے سہارے تلاش کرتا ہوا گڑھی سے باہر نکل گیا۔۔۔۔

بڑی بہو اپنے بچوں کو لے کر چپ چاپ کمرے سے باہر نکلی اور پرتاپ اور بابوجی کی لاشوں کے درمیان کھڑے ہو کر بچوں کو مضبوطی سے پکڑا اور آسمان کی طرف دیکھا۔۔۔۔

پولیس کی ٹکڑیاں اور گاؤں کا مجمع گڑھی کے دروازے پر اکٹھا ہو گیا تھا۔ انھیں علم نہیں تھا کہ اندر کیا ہوا۔ انھیں یہ بھی علم نہیں تھا کہ نیلا پیچھے والے راستے سے نکل کر، تالاب پار کرتا ہوا، خون کی چپچپاہٹ سے بند ہوتی آنکھیں دھوتا ہوا زخمی حالت میں کدھر بھاگا ہے۔

پھر سب کو اس بات کی خبر ہوئی کہ زخمی، اندھا اور پاگل نیلا غائب ہو گیا ہے۔

تھانے دار نے تھکے تھکے ہاتھوں سے رائیفل خالی کی اور سوچا کہ کیوں کہ وہ زخمی ہے اس لیے کہیں بھی مر سکتا ہے۔

گڑھی کے کچے صحن پہ ننگے پاؤں کھڑی بڑی بہو نے دونوں بچوں کے ہاتھ مضبوطی سے تھامے، آنکھیں بند کیے دل کڑا کر کے سوچا کہ کیوں کہ وہ اندھا ہے اس لیے اب کسی کو بھی نہیں پہچان سکتا۔

بوڑھے ہیڈ ماسٹر نے دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھوں کو چھپایا اور سوچا کہ وہ پاگل ہے اس لیے کبھی بھی حملہ کر سکتا ہے۔ اور کیوں کہ وہ غائب ہے اس لیے کسی بھی گلی کو پار کرتے ہوئے، کسی بھی کھیت کی طرف جاتے ہوئے اور کسی بھی راستے پہ چلتے ہوئے اچانک بالکل بالکل سامنے بالکل قریب کھڑا نظر آ سکتا ہے۔ سینگ آگے کیے، سر نیوڑھائے اور اگلے کھر فضا میں بلند کیے۔

(بقیہ صفحہ ۳۸۲ پر)

سید محمد اشرف

لکڑ بگھا ہنسا

کھڑکی کے نیم تاریک شیشوں کے پرے بچی کھچی رات تیز اور سرد ہواؤں کے ساتھ بہتی رہی۔ کمرے کے اندر بہت حبس تھا اور نیلے بلب کی مدھم روشنی بہت ہیبتناک اور پر اسرار محسوس ہو رہی تھی۔ منّو بھیا کے علاوہ سب لوگ اپنے اپنے بستروں میں پڑے جاگ رہے تھے۔ سب کو معلوم تھا کہ منّو بھیا کے علاوہ سب لوگ جاگ رہے ہیں لیکن ایک جانے بوجھے خوف کی بنا پر کوئی اس بات کا اظہار نہیں کر رہا تھا کہ اسے معلوم ہے کہ دوسرے لوگ جاگ رہے ہیں اور یوں جاگنے والا ہر شخص تنہا نہ ہوتے ہوئے بھی خود کو سب سے دور محسوس کر رہا تھا۔

سب کے دل بہت زور زور سے دھڑک رہے تھے اور لگ رہا تھا جیسے کوئی چیز نرخرے پر رینگ رہی ہو۔

تبھی بڑی آپی نے سانس روکے روکے بہت پر اسرار آواز میں امی سے پوچھا۔۔۔

"کیا منو بھیا کو لکڑ بگھا د کھانے کے لیے چڑیا گھر لے جانا ضروری ہے امی؟"

سب نے ایک جھرجھری سی محسوس کی بڑی آپی کی آواز کی گونج دوسرے ہی لمحے نیلی تاریکیوں میں ڈوب گئی تھی۔ لیکن ان کے سوال کے بعد جتنے پل گزرے وہ جاگنے والوں کے دلوں کی تیز تیز دھڑکنوں کو گنتے رہے۔

امی نے پہلو بدل کر گھوم کر اس طرف دیکھا جدھر سے آواز آئی تھی اور انھیں احساس ہوا کہ کمرے کے حبس میں مزید اضافہ ہو گیا ہے، باہر کی ہوائیں کچھ اور تیز اور گمبھیر ہو گئیں۔ انھوں نے بڑی آپی کی سہمی سہمی آنکھوں میں غور سے جھانکا اور کھو کھلی آواز میں کہا۔

"ہاں۔۔۔ اور کیا جنگل لے جاؤں گی منو کو لکڑ بگھا دکھانے۔۔۔"

"جنگل نہیں امی۔۔۔ امی۔۔۔ آپ جاگ رہی ہیں نا؟ آپ کو کچھ سنائی دے رہا ہے؟"

بڑی آپی بھرائی ہوئی آواز میں بولیں۔

"سو جاؤ بیٹیا۔ تم نیند میں ہو جو ایسے سوال کر رہی ہو۔ چلو سو جاؤ۔ رات بہت بیت گئی ہے۔"

پاپا، بھائی جان اور چھوٹی آپی، جو خاموش پڑے جاگ رہے تھے، جانتے تھے کہ بڑی آپی نے یہ سوال نیند میں نہیں کیا ہے۔ خود امی کو معلوم تھا کہ ایسے سوال نیند میں نہیں، ہوش کے عالم میں کیے جاتے ہیں لیکن کسی نے بڑی آپی کے سوال کی ہمت افزائی اس ڈر سے نہیں کی کہ کہیں امی صحیح جواب نہ دے دیں کہ جاگنے والوں میں صحیح جواب سننے کی ہمت کسی میں نہیں تھی۔ خود

بڑی اپی سوال کرنے کے بعد سانس روکے دعا کرتی رہیں کہ امی خاموش رہیں۔

باہر ہوا نے سانس بھری اور اچانک سب کے لاشعور میں پھر وہی بھیانک آواز گونجی۔

چٹ چٹ۔۔۔۔چٹ چٹ۔۔۔۔چٹ چٹ۔

اس آواز کو محسوس کرتے ہی سب کے دل اتنی شدت سے دھڑکے جیسے سینے سے نکل پڑیں گے۔ ایسا لگا جیسے نیم تاریک کمرے میں کوئی سایہ ڈول رہا ہے۔ سانس روکے بدن سکوڑے تمام جاگنے والے صبح ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ امی نے پہلو بدل کر منو بھیا کو لپٹا لیا تاکہ خود ان کا خوف کم ہو اور پھر سوچا کہ یہ سب منو بھیا کی وجہ سے ہوا۔

ادھر دس پندرہ دن سے ریلوے لائن کے اس پار دیہات میں ایک لکڑ بگھا لاگو ہو گیا تھا۔ ہر دوسرے تیسرے ایک آدھ واردات کی خبر ملتی۔ منو بھیا کو جب معلوم ہوا کہ لکڑ بگھا چھوٹے بچوں کا گوشت بہت شوق سے کھاتا ہے تو لکڑ بگھا ان کے وجود پر اپنے پورے وجود کے ساتھ حاوی ہو گیا۔ انھوں نے کبھی لکڑ بگھا دیکھا تھا نہ اس کی تصویر۔ بچپن ہی سے بس اس کا نام سن رکھا تھا۔ جب بھی اس کا نام سنتے تو اس کے ساتھ کسی معصوم بچے کی لاش کا ذکر ہوتا تھا۔ اسی لیے وہ اس ان دیکھے دشمن سے بہت خوف زدہ تھے۔ آج شام کو انھوں نے پھر یہ خبر سنی تھی کہ ریلوے لائن کے پار لکڑ بگھا ایک بچے کو اٹھالے گیا ہے۔ یہ خبر سنتے ہی ان کے چہرے پر سفیدی دوڑ گئی تھی۔ شام کو وہ گھر سے باہر نہیں نکلے۔ آنگن سے ڈرائنگ روم تک وہ سہمے سہمے، ڈرے ڈرے، خاموش گھومتے رہے۔ رات کو بھائی جان کے دوست اختر بھائی نے ان کا ڈر دور کرنے کے لیے انھیں ڈھارس دی کہ وہ لکڑ بگھے سے اس سلسلے میں گفتگو کریں گے کہ وہ اس علاقے میں نہ آئے۔ گیارہ بارہ برس کے منّو بھیا میں اتنی ہمت بھی نہ ہوئی کہ پوچھیں کہ کیا لکڑ بگھا ہماری آپ کی طرح باتیں کر لیتا ہے لیکن یہ تصور کر کے ان کے خوف میں مزید اضافہ ہو گیا تھا کہ لکڑ بگھا باتیں بھی کر لیتا ہے۔ انھیں لکڑ بگھا ایک عجیب و غریب سی چیز محسوس ہوئی۔ لکڑ بگھے کی صحیح جسامت کا بھی انھیں اندازہ نہیں تھا۔ ان کے دوست لوگوں نے انھیں بتایا تھا کہ لکڑ بگھا دیوار کے برابر اونچا ہوتا ہے تبھی تو دیوار پھلانگ کر بچوں کو اٹھالے جاتا ہے۔

پاپا اور امی نے بتایا تھا کہ لکڑ بگھا کتے کے برابر ایک وحشی جانور ہوتا ہے۔ بھائی جان، بڑی اپی اور چھوٹی اپی نے اس کی جسامت کے بارے میں زیادہ وضاحت اس لیے نہیں کی کہ انھوں نے خود کبھی لکڑ بگھا نہیں دیکھا تھا۔

رات کو سوتے وقت منو بھیا نے کرکٹ کا بلا اور ماچس گدے کے نیچے چھپا کر رکھ لیے۔ انھوں نے چوتھے درجے میں پڑھا تھا کہ جنگلی جانور آگ سے ڈرتے ہیں۔

شام سے ہی لکڑ بگھے سے متعلق ان کے چھوٹے سے ذہن میں عجیب و غریب بھیانک خاکے بن رہے تھے تو رات کو جب وہ سونے کے لیے لیٹے تو ان خاکوں نے مل جل کر ایک نہایت

خوفناک صورت اختیار کر لی۔

بھائی جان نے اٹھ کر تمام دروازوں کی کنڈیاں دیکھیں، کھڑکیوں کی سٹکنیاں بند کیں پڑوس میں آواز دے کر ہوشیار رہنے کی تلقین کی اور آکر بتایا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے، ایک آدھ دن میں لکڑ بگھا پکڑا جائے گا یا مار اجائے گا، پڑوس میں بھی لکڑ بگھے کی وجہ سے کافی دہشت تھی۔ لوگ شام ہی سے دروازہ بند کر کے گھروں میں قید ہو جاتے تھے۔ اور دھیان رکھتے تھے کہ چھوٹے بچے نظر کے سامنے ہی رہیں۔ ان مکانوں میں زیادہ خطرہ محسوس کیا جا رہا تھا جو ریلوے لائن کے پاس بسے ہوئے تھے۔ منو بھیا کا گھر بھی ریلوے لائن کے بالکل قریب تھا۔

منو بھیا اپنا سہما چہرہ لیے امی سے لپٹ کر سو گئے تو پاپا نے ایک بار پھر دروازوں کے پاس جا کر آہٹ لی، کنڈیوں کو دیکھا اور آکر پلنگ پر لیٹ گئے۔

باہر دسمبر کی سرد رات تھی اور ہوائیں بہت تیز تھیں کہ اچانک منو بھیا کی چیخ سنائی دی اور سارا گھر جاگ پڑا جس کے بعد سے اب تک کوئی نہیں سو پایا تھا اور اس درمیان حالات کی تفصیل یہ ہے کہ امی نے گھبرا کر پوچھا تھا۔

"کیا بات ہے منو بھیا۔۔۔۔ کیا ہوا۔۔۔۔ کیوں چیخے؟"

"امی۔۔۔۔ امی۔۔۔۔" منو بھیا نے ان کے بدن میں اپنا سر چھپا لیا۔

"کیا ہوا بتاؤ۔ جلدی بتاؤ بیٹے۔" پاپا نے گھبرا کر پوچھا۔

"امی۔۔۔۔ لکڑ بگھا۔۔۔۔ میرے پاس کھڑا تھا، مجھے اس نے جھک کر سونگھا۔"

"نہیں منو بھیا تم نے خواب دیکھا ہو گا۔"

پاپا، بھائی جان، بڑی اپی، چھوٹی اپی سب کے سب امی کے پلنگ کے پاس آکر کھڑے ہو گئے۔ منو بھیا کے چہرے کا سارا خون جیسے غائب ہو گیا تھا۔ آنکھیں خوف کے مارے پھٹی پڑ رہی تھیں اور ہونٹ بالکل خشک ہو گئے تھے۔

"نہیں امی۔۔۔۔ میں نے دیکھا وہ دیوار اتنا اونچا تھا۔ اپنی لمبی گردن جھکا کر اس نے مجھے سونگھا اور بڑے بڑے سینگ چبھو دیے۔"

سب کی نیند اسی آنکھیں جھپکنے لگیں۔ تب پاپا نے کہا۔

"بیٹے منو۔۔۔۔ لکڑ بگھا دیوار کے برابر نہیں کتے جیسا ہوتا ہے اور اس کے سینگ کب ہوتے ہیں۔ تم نے خواب دیکھا تھا۔ کلمہ پڑھ کر سویا کرو بیٹا۔"

"کلمہ پڑھا تھا پاپا اور الحمد بھی۔"

منو بھیا نے امی کی گود میں سر رکھ کر رونا شروع کر دیا۔

سب کو عجیب سی دشواری کا احساس ہو رہا تھا کہ منو بھیا کو کیسے یقین دلایا جائے کہ لکڑ بگھے نے نہیں اس کے خوف نے انھیں ڈرایا ہے۔ تبھی امی نے کہا تھا۔

"بیٹا منو میں تمھیں بتاتی ہوں کہ لکڑ بگھا کیسا ہوتا ہے تاکہ تمھارے دل سے اس کا خوف نکل جائے۔"

سب اپنے اپنے بستروں میں لیٹ گئے اور امی کی بات پر ہوں ہاں کرنے لگے تاکہ منو بھیا کو اطمینان رہے کہ سب جاگ رہے ہیں۔ کھڑکیاں اور دروازے ہوا کے زور سے ہولے ہولے بج رہے تھے جن کی آوازیں ماحول کو اور زیادہ دہشتناک بنا رہی تھیں۔ سب کے بدن میں خوف کی لہریں سی دوڑ رہی تھیں۔ منو بھیا دھیمے دھیمے سسکتے رہے۔ اور اب امی نے جاگتے ہوئے لوگوں کے درمیان نیلے بلب کی روشنی میں عجیب سی آواز میں کہنا شروع کیا۔

"منو بھیا! یہ جو لکڑ بگھا۔۔۔۔ سن رہے تم؟ یہ جو لکڑ بگھا ہوتا ہے نا۔۔۔۔ یہ کتے جیسا ایک جانور ہوتا ہے لیکن کتوں کے درمیان کھڑا کر دو تو آسانی سے پہچان لوگے۔ یہ بہت حاسد اور خون خوار جانور ہوتا ہے بیٹا۔۔۔۔ لیکن بہادر نہیں ہوتا۔"

بھائی جان نے ایک لمبی سی ہوں کر کے تائید کی تھی۔ سب کان لگائے امی کو سنتے رہے۔

"یہ ہمیشہ سادہ دل اور معصوم بچوں پر ہی حملہ کرتا ہے۔ مکاری سے پیچھا کرتا ہے۔۔۔۔ آہٹ ہونے پر پیچھے مڑ کر دیکھو تو لگے جیسے کوئی وفادار کتا چلا آرہا ہو۔ سر جھکائے آہستہ آہستہ۔۔۔۔ لیکن جیسے ہی موقع آتا ہے تو ذرا نگاہ چوکی اور۔۔۔۔ اور یہ اوپر لیکا۔"

اتنا کہنے کے بعد خود امی نے محسوس کیا کہ ان کی آواز کچھ اجنبی سی ہو گئی ہے۔ منو بھیا نے محسوس کیا کہ باقی لوگ خاموش ہو گئے ہیں لیکن جاگ رہے ہیں۔

"امی۔۔۔۔ اس سے بچنے کی کوئی ترکیب ہوتی ہے؟" منو بھیا نے ہولے سے پوچھا۔

"اس سے بچنے کے لیے بس احتیاط سب سے بڑی شرط ہوتی ہے بیٹا۔ رات دیر تک گئے باہر نہیں رہنا چاہیے۔ اگر کسی جھاڑی کی طرف جانا ہو تو بچاؤ کے لیے کوئی دھار دار ہتھیار ہونا چاہیے۔ اور سب سے بڑی بات تو یہ۔۔۔۔ اور سب سے بڑی بات تو یہ کہ اندھیرا یا دھندلکا ہو تو کسی کتے جیسی چیز کو کتا نہیں سمجھنا چاہیے۔"

سب نے بستروں میں لیٹے لیٹے اپنے بدن سکوڑ لیے اور سانس روک کر امی کی بات پر غور کیا۔

"دھندلکے میں کسی کتے جیسی چیز کو کتا نہیں سمجھنا چاہیے۔۔۔۔ تم اس کا مقابلہ کرکٹ کے بلّے اور ماچس سے کرنا چاہتے ہو۔۔۔۔ بیوقوف کہیں کے۔۔۔۔ ایک معصوم بچے نے ایک دفعہ ایسا ہی کیا تھا۔ جب لکڑ بگھا آیا تو وہ بچہ کچھ نہ کر سکا۔ اس نے بچے کو دبوچا اور گردن چیر کر سارا خون پی لیا۔ اور پنجے گاڑ کر آنتیں نکال لیں اور۔۔۔۔ تمام گوشت ادھیڑ ادھیڑ کر کھا لیا۔"

"امی۔۔۔۔ امی۔۔۔۔" منو بھیا نے ان کی کمر مضبوطی سے پکڑ لی۔

"ڈرو مت۔ میں تمھیں سارے خطرات سے آگاہ کرنا چاہتی ہوں تاکہ کبھی دھوکا نہ

اٹھاؤ۔" امی نے بھاری آواز میں کہا۔

کھڑکیوں کے شیشوں کے باہر کہرا دھوئیں کی طرح سلگ رہا تھا۔ ہوائیں رات کی تاریکیوں سے کچھ کہتی ہوئی گزر گئیں۔ اندر حبس زدہ کمرے میں پڑے ہوئے سب لوگ امی کو سنتے رہے۔ امی نے اسی آواز میں کہا۔

"بیٹا! تمھیں اتنی تفصیل سے اس لیے بتارہی ہوں کہ یہ لکڑ بگھا جو ہوتا ہے نا یہ شیر کی طرح بہادر تو ہوتا نہیں کہ سامنے سے حملہ کرے۔ نہایت کمینہ جانور ہوتا ہے۔ ہمیشہ پیچھے سے لپٹ پڑتا ہے۔ یہ جانتا ہے کہ لوگ اسے کتا سمجھیں گے اسی لیے دھوکے ہی دھوکے میں بالکل قریب پہنچ جاتا ہے اور چپ چاپ موقعے کا انتظار کرتا ہے بس ذرا آنکھ بچی۔۔۔۔ بس ذرا آنکھ بچی۔۔۔۔ اور۔۔۔۔ اور۔۔۔۔"

سب کے دل کی دھڑکنیں کمرے میں گونجنے لگیں۔

"بس ایک پہچان ہوتی ہے۔" امی نے کہنا شروع کیا۔

"ہاں بس ایک پہچان ہوتی ہے۔ جب یہ چلتا ہے تو چٹ چٹ کی آوازیں آتی ہیں۔ لیکن لوگ باگ یہ آوازیں اپنی چال کے شور میں سن نہیں پاتے۔ اس لیے ضروری ہے کہ راستے میں جب تم دیکھو کہ کوئی چیز تمھارے پیچھے چاپ چاپ لگی ہے اور کتے کی طرح معصوم اور وفادار بنی پیچھے چلی آرہی ہے تو اس وقت۔۔۔۔ رک کر غور سے سنو کہ اس کے پیروں سے چٹ چٹ کی آوازیں تو نہیں آرہی ہیں۔ لیکن منو بیٹے لوگ خود اپنی چال کے شور میں یہ آوازیں سن ہی نہیں پاتے۔ اور۔۔۔۔"

پاپا، بھائی جان، بڑی اپی، چھوٹی اپی، سب کو اپنی سانسیں سینے میں گھٹتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ سب کو بہت واضح انداز میں محسوس ہوا کہ جیسے باہر ابھی ابھی چٹ چٹ کی آواز ہوئی ہو۔

"امی۔۔۔۔ ہمیں لکڑ بگھا دکھائیے گا۔؟"

منو بھیا نے غنودہ ہوتے ہوئے فرمائش کی تھی۔ "ہاں۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔ اب کے لکھنو چلیں گے تو چڑیا گھر میں دیکھ لینا۔ اب سو جاؤ بیٹے، رات بہت بیت گئی ہے۔"

امی خاموش ہو گئی تھیں۔ منو بھیا سو چکے تھے لیکن سب کے کانوں میں امی کی آواز ابھی تک گونج رہی تھی۔

دھند لکے میں بالکل کتے جیسا نظر آتا ہے۔۔۔۔ وفادار بنا ہوا مکار پیچھے پیچھے چلتا ہے۔ بالکل قریب آجاتا ہے، خبر بھی نہیں ہوتی کہ وہ آگیا اور پھر ذرا موقع ملا۔۔۔۔ اور یہ جھپٹا۔ بڑا حاسد اور چالاک ہوتا ہے۔۔۔۔ بہت چالاک۔۔۔۔ کبھی سامنے سے حملہ نہیں کرتا۔

بس خود کو وفادار کتا ظاہر کرتا ہوا بالکل قریب آجاتا ہے۔۔۔۔ بالکل قریب۔۔۔۔ بالکل قریب۔۔۔۔ بس ذرا موقع ملا اور جھپٹا۔۔۔۔

سب جاگنے والے مدھم نیلی تاریکی میں آنکھیں کھولے سوچ رہے تھے کہ وہ ہوں ہاں کرنا کیوں بھول گئے ہیں ؟ گھٹی ہوئی فضا میں سب یہی سوچتے رہے کہ اچانک ایسا محسوس ہوا جیسے کمرہ روشن ہو گیا ہو۔ تبھی بڑی اپی کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ انھیں لگا جیسے ان پر ابھی ابھی انکشاف ہوا ہو کہ سب لوگوں کی سراسیمگی اور خوف کا کیا سبب تھا۔ انھوں نے گردن موڑ کر اندازہ کیا کہ منو بھیا کے علاوہ سب لوگ جاگ رہے ہیں لیکن کوئی ظاہر نہیں کر رہا ہے وہ جاگ رہا ہے۔ بے نیلی روشنی نے ماحول میں ایک عجیب سی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ کھڑکیوں کے پٹ آہستہ آہستہ بج رہے تھے۔

اسی وقت بڑی اپی نے سانس روکے روکے بہت پر اسرار انداز میں پوچھا تھا۔۔۔۔

"کیا منو بھیا کو لکڑ بگھاد کھانے کے لیے چڑیا گھر لے جانا ضروری ہے امی ؟"

اس وقت سب جاگنے والوں کو احساس ہوا کہ یہی سوال ان کے ذہنوں میں بھی تھا۔ یہ سوال ذہنوں میں کیوں آیا۔

سب کو اندازہ ہوا کہ یہ سوال تو ذہنوں میں آنا ہی تھا۔ تبھی امی نے بڑی اپی کو سونے کی ہدایت کی تھی اور تبھی سب کے لاشعور میں چٹ چٹ ۔۔۔ کی آوازیں گونجنے لگی تھیں یہ آوازیں کھڑکیوں کے باہر سے نہیں آرہی تھیں۔

رات بیتی اور دن کی ہل چل شروع ہوئی اور سب لوگ اپنے اپنے پلنگ سے اٹھے تو محسوس ہوا کہ رات کی باتیں ابھی تک دماغ پر اسی طرح حاوی ہیں۔ جب سب لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہوئے تو ایک عجیب بات محسوس کی گئی۔ انھیں بار بار ایسا لگتا جیسے کہیں سے ایک پر اسرار آواز آرہی ہے۔ چٹ چٹ ۔۔۔۔ چٹ چٹ ۔۔۔۔ جیسے کہیں قریب میں لکڑ بگھا چل رہا ہو۔ پاپا اور بھائی جان اپنے اپنے کام پر گئے تو انھیں بار بار یہ آواز مختلف مقامات پر سننے کو ملی۔ رات کے سارے واقعات ان کی آنکھوں میں تازہ ہو جاتے۔ کام کرتے کرتے جیسے ہی وہ آواز ذہن میں آتی، ہاتھ روک کر گھبرا کر پیچھے پلٹ پڑتے لیکن پیچھے اپنا کوئی عزیز دوست کھڑا نظر آتا۔ وہ سر جھٹک کر ان آوازوں سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کرنے لگتے۔

وفادار کتے کی طرح پیچھے لگا رہتا ہے ۔۔۔۔ جہاں موقع ملا ۔۔۔۔ جھپٹ پڑا ۔۔۔۔ سامنے سے حملہ نہیں کرتا۔ بڑا حاسد اور مکار جانور ہوتا ہے ۔۔۔۔

بڑی اپی اور چھوٹی اپی پڑھنے کے لیے کلاس میں گئیں۔ کلاس کے بعد جب ان کی سہیلیاں ان سے بہت ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھیں تو اس وقت دونوں نے ہی دہشتناک پر اسرار آواز سنی۔

چٹ چٹ ۔۔۔۔ چٹ چٹ ۔۔۔۔

ہراساں ہو کر انھوں نے ایک دوسرے کو دیکھا لیکن کچھ کہا نہیں۔ کیا کہتیں ؟

شام کو گھر میں جب سب لوگ جمع ہوئے تو ہر چیز معمول کے مطابق تھی لیکن آج سب نے آپس میں ایک عجیب رشتہ محسوس کیا جیسے جنرل وارڈ میں اپنے ساتھ کے بیماروں کو دیکھ کر ایک ذاتی سا تعلق محسوس ہوتا ہے کہ یہ بھی ہماری طرح معذور ہیں اور ہماری ہی طرح بے بس ہیں لیکن اپنے منھ سے کسی نے کوئی ایسی بات نہیں کہی جس سے دوسروں کو ذرا سا بھی شبہہ ہوتا کہ دن کس سوچ میں گزرا ہے۔

سب ایک دوسرے سے خود کو چھپا رہے تھے جیسے انسان نہ ہوں کوئی بھید ہوں۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد وہی چٹ چٹ کی آواز سب کے ذہنوں میں چٹخنے لگتی۔

پاپا کے دوست خواجہ صاحب پاپا کو بزنس کے متعلق ایک بہت اہم مشورہ دے کر جا رہے تھے تو اس وقت ڈرائنگ روم کے باہر اندھیرا مسلط ہو چکا تھا۔ اسی وقت پاپا کو محسوس ہوا کہ خواجہ صاحب کے پیروں سے وہی آوازیں آ رہی ہیں۔ جاتے جاتے جب خواجہ صاحب نے مڑ کر پاپا سے یہ کہا کہ اس کام کو ان کے مشورے کے مطابق کرنے میں پاپا کو بہت زیادہ فائدہ ہوگا تو معلوم نہیں کیوں پاپا کو یہ محسوس ہوا کہ خواجہ صاحب کی آنکھیں بالکل سرخ ہو گئی ہیں اور ان سے درندگی ٹپک رہی ہے ---- جیسے ---- جیسے ----

پاپا نے خود کو بستر پر گرا دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد بھائی جان کے دوست اختر بھائی آگئے۔ منو بھیا بہت دیر تک ان سے اس بارے میں گفتگو کرتے رہے کہ بڑا چاقو کتنے روپے تک میں آجائے گا۔ پھر بھائی جان نے اشارے سے منو بھیا کو اندر بھیجا اور اختر بھائی کو کسی بات پر مشورہ دینے لگے۔ اختر بھائی بھی بہت دیر تک انھیں کسی بات پر سمجھاتے رہے۔

چھوٹی آپی جو پانی لا رہی تھیں دونوں کی باتیں سن کر رک گئیں۔ اچانک کسی بات پر بھائی جان نے اختر بھائی کے پیچھے کھڑے ہو کر جھک کر ان کے کان کے پاس اپنا منھ لا کر کہا----

"تم اگر یہ کام شروع کر دو تم تمہارا بہت فائدہ ہے میں اس سلسلے میں تمہارا بھرپور ساتھ دوں گا۔ آخر دوست ہی دوست کے کام آتا ہے کیوں ہے نا"

اختر بھائی ان کا چہرہ نہیں دیکھ پائے ورنہ دیکھتے کہ بھائی جان کی آنکھیں بہت وحشی ہو گئی تھیں اور ان کی باچھوں سے نکیلے دانت باہر نکل پڑے تھے۔

جب اختر بھائی رخصت ہو گئے اور بھائی جان گھر کے اندر واپس آ رہے تھے تو چھوٹی آپی نے چلا کر کہا----

"لکڑ بگھا---- لکڑ بگھا----"

"کہاں ہے؟" بھائی جان پردہ اٹھا کر اندر آئے اور چھوٹی آپی کو گھور کر دیکھا۔

"معلوم نہیں ---- باہر ڈرائنگ روم سے کیا آپ آ رہے تھے؟ میں نے ابھی ابھی چٹ

چٹ کی آوازیں سنی ہیں۔ کیا وہ آپ کے پیروں سے نکل رہی تھیں؟"

"معلوم نہیں۔۔۔۔" بھائی جان نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"معلوم نہیں۔۔۔۔ لیکن خدا جانے کیوں آج اپنے کئی دوستوں کی ٹانگوں سے ایسی ہی آوازیں سنائی دیں۔ ابھی ابھی جب اختر گیا تب بھی معلوم نہیں میرا وہم ہے یا۔۔۔۔ یا شاید۔۔۔۔

"بھائی جان! کیا آپ کو بھی۔۔۔۔ کیا آپ بھی۔۔۔۔" چھوٹی اپی سراسیمہ ہو گئی تھیں۔۔۔۔

"چپ رہو۔۔۔۔ چپ رہو۔ اس موضوع پر بات مت کرو۔۔۔۔"

منو بھیا کے ضد کرنے پر پاپا اور بھائی جان نے کئی مرتبہ اٹھ کر دروازوں کو دیکھا اور جب سب لوگ سونے کے لیے لیٹ گئے تو منو بھیا کے علاوہ سب نے کچھ سوچا۔ اپنی دنیا کے متعلق سوچا۔ اپنے دوستوں کے متعلق سوچا۔ اپنے گرد پھیلے ہزاروں افراد کے متعلق سوچا۔ اور پھر۔۔۔۔ اپنے متعلق سوچا۔۔۔۔

کھڑکیوں کے باہر سرد ہواؤں کے بھاری بھاری جھونکے سائیں سائیں کی لے پر بہہ رہے تھے۔ سائیں سائیں کی ان آوازوں کی منڈلی کے ساتھ سب کے ذہن اپنے اور دوسروں کے عمل کا احاطہ کرتے ہوئے جب دور تک چلے گئے اور سب کو اپنی اپنی وہ باتیں بھی یاد آگئیں جو ماضی کے اجاڑ کھنڈروں کے بلوں میں ناگنوں کی طرح چھپ گئی تھیں تو انھیں اپنے نرخرے پر کوئی چیز رینگتی ہوئی محسوس ہوئی اپنے آپ سے بے یقینی کی اس کیفیت میں انھوں نے دیکھا کہ کھڑکیوں کے باہر کہرے سے پرے دور دور تک ایک جنگل پھیلا ہوا ہے جس میں کتوں جیسے بہت سے جانور ادھر ادھر گھوم رہے ہیں۔ منو بھیا نے سوتے میں بہت زور سے پہلو بدلا اور ان کی آواز سے سب کمرے کے اندر واپس آگئے۔ سب کے دل زور زور سے دھڑکنے لگے۔ انھیں ایسا لگا جیسے دیوار پر ٹنگے کلاک نے ابھی ابھی بولنا شروع کیا ہے۔ ٹک ٹک۔۔۔۔ ٹک ٹک۔۔۔۔

کلاک کی ٹک ٹک، باہر ہواؤں کے سائیں سائیں کے بہتے ہوئے شور کے نیچے پھیلے ہوئے اس جنگل کی آواز اور سینے سے ٹکراتی ہوئی دل کی دھڑکنیں آپس میں مدغم ہو گئیں۔ اور اس وحشی آواز میں بدل گئیں۔

چٹ چٹ۔۔۔۔ چٹ چٹ۔۔۔۔ اور سب نے محسوس کیا کہ کھڑکیوں کے باہر بھی ایک جنگل ہے اور کھڑکیوں کے اندر بھی ایک جنگل ہے۔ کمرے کی دیواروں کے بیچ جنگل میں لیٹے لیٹے سب نے پچھلی رات یاد کی۔۔۔۔ "کتے کی طرح خاموشی سے پیچھے لگا رہتا ہے۔۔۔۔" امی نے کہا تھا۔

"موقع ملتے ہی جھپٹ پڑتا ہے، پنجوں سے آنتیں باہر نکال لیتا ہے، گردن پر چڑھ کر خون پی جاتا ہے۔ دانتوں سے گوشت ادھیڑ ڈالتا ہے۔۔۔۔" امی نے کہا تھا۔

سب سوچتے رہے ---- اپنی اپنی زندگی پڑھتے رہے ---- پڑھتے رہے ---- سب جاگ رہے تھے اور سب کو معلوم تھا کہ دوسرے بھی جاگ رہے ہیں۔

دور چوکیداروں کی سیٹیاں گونج رہی تھیں اور منحوس رات کھڑکیوں کے باہر سر سرا رہی تھی۔

اور پھر صبح جب پاپا سب سے پہلے سو کر اٹھے تو ایک عجیب سی بات ہوئی، انھیں ایسا لگا جیسے ان کی ٹانگوں سے چٹ چٹ کی آوازیں آرہی ہیں۔ وہ ٹھٹھک کر کھڑے ہوگئے۔ چلے تو وہی آواز پھر سنائی دی۔ رک کر انھوں نے امی کی طرف دیکھا جو کھڑی ہوئی اپنے پیروں کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ "کیا تمھیں بھی ----؟" پاپا کے منھ سے بس اتنا ہی نکلا۔ "ہاں ----" امی نے ان کی طرف دیکھ کر روہانسی آواز میں جواب دیا۔ پاپا نے انھیں بہت غور سے دیکھا اور وہ دونوں ایک دوسرے کو دیر تک دیکھتے رہے۔ تھوڑی دیر بعد بڑی آپی نے سہمے سہمے لہجے میں آکر امی کو بتایا کہ انھیں اپنی ٹانگوں سے چٹ چٹ کی آوازیں سنائی دے رہی ہیں۔ امی نے پاپا کی طرف بے بس نظروں سے دیکھا اور بڑی آپی کو دلاسا دیا ----

"بیٹی یہ تمھارا وہم ہے، اصل میں بات یہ ہے کہ منو بھیا کی وجہ سے کل سے، ہمارے دماغ پر لکڑ بگھا سوار ہو گیا ہے ---- اور کوئی بات نہیں ہے بیٹی ----"

"اور کوئی بات نہیں ہے امی؟" چھوٹی آپی جو پاس آکر کھڑی ہو گئی تھیں، گھور کر امی کی طرف دیکھ کر بولیں۔

"ہاں اور کوئی بات نہیں ہے بیٹی۔ اور کوئی بات نہیں ----" امی کے بجائے پاپا نے منھ پھیر کر جواب دیا۔

چھوٹی آپی نے کچھ بتانے کے لیے منھ کھولا ہی تھا کہ بھائی جان اپنے بستر سے اٹھے اور دو قدم چل کر رک گئے اور اپنے پیروں کی طرف یوں دیکھنے لگے جیسے کچھ سننے کی کوشش کر رہے ہوں۔ پھر چلے، پھر رک کر کچھ سننے کی کوشش کرنے لگے۔ سب نے بھائی جان کی طرف دیکھا اور پھر ایک دوسرے کو دیکھا اور وہ خاموشی سے ان میں آکر مل گئے۔

اتنے میں ملازم باہر سے دوڑتا ہوا اندر آیا اور پھولتی ہوئی سانسوں کے درمیان اس نے اطلاع دی کہ رات پڑوس کے گاؤں میں وہ لکڑ بگھا ---- پکڑ لیا گیا اور اب اسے باندھ کر گاؤں والے شہر کی طرف لا رہے ہیں۔ وہ لوگ اب یہاں تھوڑی ہی دیر میں پہنچنے والے ہیں۔

خلاف توقع سب کے چہروں پر حیرت یا خوشی کی علامتیں غائب دیکھ کر وہ سٹپٹا گیا اور واپس چلا گیا۔

سب خاموش کھڑے ایک اور چیز کا انتظار کر رہے تھے۔ ڈرے ڈرے سب انتظار کرتے رہے۔ اور آخر میں جب منو بھیا جاگے تو وہ انتظار ٹوٹا۔ منو بھیا لپک کر ان کی طرف بڑھے اور نیند

میں ڈوبے ہوئے بے چین لہجے میں پوچھا۔۔۔۔
"آپ لوگ اس طرح کیوں کھڑے ہیں، کیا لکڑ بگھا آیا تھا؟"
"نہیں بیٹے وہ لکڑ بگھا پکڑ لیا گیا۔ اب اس لکڑ بگھے سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔"
یہ کہہ کر پاپا منو بھیا کو اندر والے کمرے میں لے گئے اور بہت سی معافیاں دے کر ان سے بہت ڈرتے ڈرتے پوچھا۔۔۔۔ "منو بھیا! جب تم چلتے ہو تو تمھاری ٹانگوں سے چٹ چٹ کی آوازیں تو نہیں آتیں۔۔۔۔"
منو بھیا حیران سے کھڑے رہے۔ "جلدی بتاؤ۔۔۔۔ چٹ چٹ کی آوازیں تو نہیں آتیں۔۔۔۔ہیں بیٹے، جلدی بولو۔۔۔"
پاپا گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھ رہے تھے۔
"نہیں پاپا۔۔۔۔آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں۔۔۔۔ میں کوئی لکڑ بگھا ہوں کیا؟" منو بھیا نے جواب دیا۔
اتنے میں باہر کچھ شور ہوا۔ سب لوگ لپک کر کھڑکی پر کھڑے ہو گئے، باہر جھانک کر دیکھا تو۔۔۔۔ سینکڑوں دیہاتیوں کی بھیڑ کے درمیان وہ چلا آرہا تھا۔ اس کے منھ پر مسیکا بندھا ہوا تھا اور چاروں ٹانگوں میں زنجیریں پڑی ہوئی تھیں۔ اس کی آنکھیں بالکل سرخ نظر آرہی تھیں اور وہ اندر ہی اندر دانتوں سے چمڑے کے سیکے کو پھاڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جسم پر موٹی موٹی دھاریاں پڑی ہوئی تھیں اور اگلے پنجے خون سے لتھڑے ہوئے تھے۔
معلوم نہیں کیوں پاپا، امی، بھائی جان، بڑی اپی، اور چھوٹی اپی سب نے ایک دوسرے کی آنکھ بچا کر اپنے اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ دیر تک دیکھتے رہے۔ اب لکڑ بگھا کھڑکی کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ اس کی ٹانگوں سے چٹ چٹ کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ پیچھے گاؤں والے لاٹھیاں اور بلم لیے چل رہے تھے اور بھیڑ کے قدموں سے دھول اڑ رہی تھی۔ اچانک کھڑکی کے بالکل سامنے آکر وہ رک گیا۔ چٹ چٹ کی آواز رک گئی۔ اس کے پیچھے چلنے والے لوگ ٹھٹھک گئے۔ دھول آہستہ آہستہ زمین پر بیٹھ گئی۔ کھڑکی سے جھانکتے ہوئے تمام گھر والوں نے سانسیں روک لیں۔ منو بھیا امی کی ٹانگوں سے لپٹ گئے۔ باہر کی بھیڑ ایک دم خاموش ہو گئی۔ لکڑ بگھے نے کھڑکی کی طرف دیکھا۔ ایک لمحے تک ایسے ہی دیکھتا رہا۔ پھر اچانک لکڑ بگھا بہت زور سے کھل کھلا کر ہنسا۔۔۔۔ لوگ سمجھے شاید مسیکا پھاڑنے کی کوشش میں یہ آواز نکلی ہے۔ کسی دیہاتی نے پیچھے سے اس کی کمر پر زوردار لاٹھی کا وار کیا اور نفرت سے بولا۔۔۔۔ "سالا کتے جیسا بن کر پاس آجاتا ہے اور داؤں لگتے ہی لپٹ پڑتا ہے۔۔۔۔"
لکڑ بگھے نے لاٹھی کھا کر یہ جملہ سنا اور اس کی طرف دیکھا۔ لاٹھی کی ضرب کی شدت سے اس کی آنکھیں بھیچ گئی تھیں۔۔۔۔

بھیگی بھیگی آنکھوں سے اس نے کھڑکی سے جھانکتے ہوئے سب گھر والوں کو باری باری دیکھا۔ اور ایک بار پھر بہت زور سے کھل کھلا کر ہنسا اور چٹ چٹ کرتا بھیڑ کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ لکڑ بگھے کے ساتھ کی بھیڑ ابھی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوئی تھی کہ تھوڑی دیر کے بعد پاپا کھڑکی کے پاس آئے تو ابھی بھیڑ کے قدموں سے اڑی ہوئی دھول فضا میں چھائی ہوئی تھی اور دھول کے پرے منو بھیا اپنے ہم عمر بچوں کے ساتھ زور زور سے باتیں کرتے اسکول جا رہے تھے۔

پاپا کو محسوس ہوا جیسے ابھی ابھی منو بھیا رکے ہوں اور اپنی ٹانگوں کی طرف دیکھ کر کچھ سننے کی کوشش کی ہو۔ پاپا نے آنکھیں بند کر کے خدا سے دعا کی کہ منو بھیا اور ان کے ساتھیوں کی ٹانگوں سے کبھی چٹ چٹ کی آوازیں نہ آئیں۔

منو بھیا اور ان کے ساتھی جب نگاہوں سے اوجھل ہو گئے تو پاپا نے کھڑکی کی سلاخیں پکڑ کر ریلوے لائن کے پار دور دور تک پھیلی ہوئی دنیا کو بہت دیر تک دیکھا اور بہت دیر تک سوچا جب وہ واپس مڑے تو سب گھر والے گردنیں نیچے ڈالے خاموش بیٹھے تھے۔ سب اپنی ذات سے اتنے مایوس اور اداس لگ رہے تھے جیسے کسی وبا کے پھیلنے کی خبر سن لی ہو۔ سب ایک دوسرے کو نیچے ہی نیچے شرمندہ نگاہوں سے دیکھتے رہے۔ امی نے ایک لمبی سانس لی۔ سب اٹھ کھڑے ہوئے اور پھر سب کی چٹ چٹ کرتی ہوئی ٹانگیں اپنے اپنے کام میں مصروف ہو گئیں۔۔۔

"دوسرا کنارہ" کا بقیہ:۔

"آپ کسی کو یہ بھی نہیں بتا پائیں گے کہ روزہ کشائی کیا ہوتی ہے۔"

تاریک سمندر میں دور سے ایک پر شور بھیانک موج راستہ بناتی ہوئی آئی اور میرے قدموں کے پاس آکر اس قدر زور سے ٹکرائی کہ میرا پورا وجود ہل کر رہ گیا۔ اور مجھے میرا ساحل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا جس پر ہم اور وہ دونوں کھڑے تھے۔

وہ کہہ رہی تھی:

"ایسا ہوتا ہے بھائی کہ جب کوئی بچہ پہلا روزہ رکھتا ہے تو سب کو خبر کر دی جاتی ہے اور اس دن بہت سے مہمان۔۔۔"

میں نے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا اور اس کی نیلی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا۔ وہ سب کچھ سچ سمجھ کر کہہ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں کہیں بھی جھوٹ نہیں تھا۔ یقین ہی یقین تھا۔

اور اب میں صرف ایک ہی کام کر سکتا تھا جو میں نے کیا۔ میں نے اس کے اڑتے ہوئے بالوں کو برابر کیا اس کے روشن چہرے کو اپنے ہاتھوں میں لے کر اس کی پیشانی کو ہولے سے چوما اور چپ چاپ اداس ہو گیا۔

اس بار مجھے حیرت نہیں ہوئی تھی۔ حیرت سے اتنے بڑے زخم کا علاج ممکن بھی نہیں تھا۔

○ ○ ○

سید محمد اشرف

دوسرا کنارہ

بحر عرب کے شمال میں غروب ہوتے سورج کی زرد روشنی میں رنگی سمندر کی سنہری موجیں کراچی کے کلفٹن ساحل سے ٹکرائیں، سفید جھاگ خاکستری پتھروں پر پھیلے بکھرے اور پانی ہو گئے۔

اس وقت غروب کا وقت نہ ہوتا اور کرنوں کا رنگ بھی زرد نہ ہوتا تو بھی ادھر سے آنے والی موجوں کا رنگ سنہرا ہی ہوتا۔ سونے جیسا سنہرا رنگ۔ کیوں کہ بحر عرب میں کلفٹن کی طرف جو پانی آتا ہے وہ اب سنہرا ہی ہوتا ہے۔

ایسا میں نے سوچا۔

اور اس سوچ میں چھپے حسد کو محسوس کر کے میں شاید شرمندہ ہوا۔ اور کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھا۔

اس نے آتی جاتی لہروں پہ سے نگاہیں واپس کھینچیں اور گھنے سیاہ بالوں کے نیچے سے اس کی نیلی نیلی آنکھوں نے مجھے غور سے دیکھا۔ کہیں یہ میری سوچ نہ پڑھ لے، اس خوف نے مجھے جھوٹ موٹ بے خوف کر دیا۔ تب میں نے بھی اسے غور سے دیکھا۔ وہ سبز رنگ کا ڈھیلا ڈھالا لبادہ پہنے تھی۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"کیا تم کوہ قاف والی سبز پری ہو؟"

اس نے میری طرف حیرت بھری آنکھوں سے دیکھا اور کھل کھلا کر ہنسی اور کہا:

"نہیں ---- میں کراچی شہر میں کشمیر روڈ پر رہتی ہوں۔ میرا نام عظمیٰ ہے اور میں آٹھویں کلاس میں پڑھتی ہوں۔"

یہ سب کہہ کر وہ اس طرح مسکرائی جس طرح ان چھوٹی چھوٹی ہنسی خوشی کی باتوں پر مسکرایا جاتا ہے اور تب میں نے سوچا کہ یہ سبز پری اتنی بچی بھی نہیں کہ ان چھوٹے چھوٹے مذاقوں کو نہ سمجھ سکے اور اتنی بڑی بھی نہیں کہ میں اس سے ایسے مذاق نہ کر سکوں۔

تب میں نے بہت اعتماد کے ساتھ اس سے پوچھا:

"اے لڑکی! اگر تم سبز پری نہیں ہو تو اس قدر اچھی کیوں لگتی ہو؟"

تب اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور مسکرا کر بولی۔

"ہمارے یہاں سب ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ہم آپ کو سب سے ملوائیں گے۔ آپ نے ہمارے پاپا کو نہیں دیکھا، ان کے ماتھے پر تو لگتا ہے جیسے روشنی پھوٹ رہی ہو۔"

میں نے پوچھا:

"ہمارے یہاں تو دیوتاؤں کے ماتھے سے روشنی پھوٹتی ہے۔ کیا تمھارے پاپا دیوتا ہیں؟"

"نہیں بھائی، ہمارے یہاں دیوتا لوگ نہیں ہوتے۔ یہ تو آپ کی طرف ہوتے ہیں۔"

وہ جھنجلائی بھی اور مسکرائی بھی۔ پھر کہا:

"پاپا پرسوں ملتان سے واپس ہوں گے تب دیکھ لیجیے گا۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہوئی اور میں نے سمندر میں واپس جاتی ایک موج کو دیکھ کر سوچا۔

جب میں ہندوستان سے چلا تھا تو اپنے عزیزوں کے بارے میں خصوصاً نوجوانوں اور بچوں کے بارے میں کوئی واضح تصور ذہن میں نہیں تھا۔ بس یہ اندازہ تھا کہ جب میں اپنے عزیزوں کے بیچ پہنچوں گا تو سارے بچے مجھے گھیر کر بیٹھ جائیں گے، سارے نوجوان میرے قریب آکر کھڑے ہو جائیں گے اور سارے بزرگ مجھے گلے لگا کر پوچھیں گے کہ جنھیں ہم اب سے بہت برس پہلے چھوڑ آئے تھے وہ اب کیسے ہیں اور ہیں بھی یا ماضی کے کھنڈر میں کہیں دب گئے۔ اور وہ جو اس محلے میں ---- اور نوجوان مجھ سے دریافت کریں گے کہ وہاں آپ کے ہاں لوگ اتنا لڑائی جھگڑا کیوں کرتے ہیں اور کیا آپ لوگوں کو یونیورسٹیوں میں آسانی کے ساتھ داخلے مل جاتے ہیں اور کیا آپ لوگوں کو نوکری حاصل کرنے میں بہت پریشانی اٹھانی پڑتی ہے ---- اور کیا آپ -----

اور بچے سوال کریں گے کہ یہ جو ہم لوگ تصویروں میں تاج محل اور قطب مینار دیکھتے ہیں تو کیا آپ نے ان کو سچ مچ دیکھا ہے۔ بمبئی آپ کے یہاں سے کتنی دور ہے اور کیا آپ نے امیتابھ بچن کی کوئی شوٹنگ دیکھی ہے اور کیا آپ ----

سبز پری کی آواز نے مجھے واپس ساحل پر بلالیا۔ اس نے ہولے سے رازداری لہجے میں بہت اپنائیت کے ساتھ مجھ سے پوچھا۔

"اب آپ ہمیشہ کے لیے آگئے ہیں۔ واپس تو نہیں جانا ہے نا؟"

اس سوال پر مجھے تعجب ہوا۔

"بی بی میں پندرہ دن بعد واپس چلا جاؤں گا۔ مجھے ملازمت پر جانا ہے۔ گھر پہنچتے ہی۔"

"ارے!" اس کے منھ سے بس اتنا ہی نکلا۔

میں نے اس کے چہرے پر دوڑتے حیرت کے رنگ کو بہت واضح انداز میں محسوس کیا۔ وہ پلکیں جھپک جھپک کر مجھے دیکھ رہی تھی۔

لیکن ارشد بھائی نے تو یہاں آتے ہی پاسپورٹ پھاڑ دیا تھا اور اب وہ دوبئی میں ہیں اور قیصر بھائی ---- اور ----

"نہیں۔ میں واپس جاؤں گا۔"

اس کے چھوٹے سے ذہن نے میرے چہرے کو پڑھنے کی کوشش کی لیکن کیوں کہ میں چالاک تھا اس لیے وہ ناکام رہی۔ پھر وہ اچانک بولی جیسے اسے کوئی کھویا ہوا ہتھیار مل گیا ہو:

"ہم نے اس دن ریڈیو پر سنا تھا کہ وہاں بہت سے۔۔۔۔ ہزاروں کی تعداد میں بے گناہ ۔۔۔۔ اور منگل کے روز ٹی وی پر بتایا تھا کہ ۔۔۔۔ کیا نام ہے اس شہر کا۔ اسے چھوڑیے پاپا اخبار میں پڑھ کر بتا رہے تھے کہ ۔۔۔۔ اور سب کو چھوڑیے ہم نے خود جب گانے سننے کے لیے آل انڈیا ریڈیو لگایا تو خبریں آرہی تھیں کہ کہیں یہ پھر۔۔۔۔

میں نے اس کے منھ پر ہاتھ رکھ دیا۔

اس نے میرا ہاتھ ہٹا کر کہا:

"کیا آپ کے علاوہ سبھی لوگ جھوٹ بولتے ہیں؟"

تب میں نے سوچا کہ کچھ غیر اہم لمحے بھی کس قدر خوں خوار ہوتے ہیں اور تبھی میں نے یہ بھی سوچا کہ میں ٹیلی ویژن، ریڈیو، اخبار اور درسی کتابوں کے مقابلے میں کس درجہ کمزور انسان ہوں۔

تو کیوں کہ میں جواب نہیں دے سکتا تھا اس لیے خاموش رہا اور کیوں کہ میں خاموش تھا اس لیے سیاہ ہوتے سمندر میں دوڑتی سفید موجوں کو دیکھتا رہا۔

مجھے خاموش دیکھ کر وہ بھی چپ ہو گئی تھی۔ پھر وہ اس طرح بولی جیسے میرا دھیان بٹا رہی ہو:

"بھائی! ہندوستان واپس جا کر آپ سب کو بتائیے گا کہ یہاں آپ نے کتنی طرح کی کاریں دیکھیں۔ ہم لوگ کلفٹن جس کار سے آئے ہیں یہ مزڈا ہے اور دوسری ہوتی ہے ٹوئے ٹا۔ لمبی والی ہوتی ہے امپالا۔ اور سب سے مہنگی ہوتی ہے مرسی ڈیز۔ مرسی ڈیز کئی سائز میں ہوتی ہے۔ اس میں چھ دروازے تک ہوتے ہیں۔ ہم آپ کو ساری کاریں دکھائیں گے۔ ہمارے یہاں سارے رشتے داروں کے پاس ہیں۔ پاپا کے سب دوستوں کے پاس دو دو موٹریں ہیں خوب بڑی بڑی۔ آپ کے ہاں تو ایسی کاریں بھی نہیں ہوتی ہوں گی، ہیں نا؟"

مجھے پھر تعجب ہوا۔ میں خاموش رہا۔ بس اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس نے میرے بہت پاس آکر کہا:

"بھائی!"

میں چپ چاپ اس کی آنکھوں میں جھانکتا رہا۔

"او بھائی۔ آپ چپ کیوں ہو گئے۔ کیا آپ کو اپنے امی بابا یاد آرہے ہیں، بتائیے نا کیا آپ کو اپنے امی بابا یاد آرہے ہیں؟"

میں نے اس کے بھولے بھالے چہرے کو دیکھا۔ سمندر کو دیکھا، تاریک ہوتے آسمان کو

دیکھا اور پھر مڑ کر ریگستان سندھ کو عبور کیا اور پنجاب کی ہری بھری کھیتیوں کو پار کرکے گنگا جمنا کے دوآبے میں پہنچا اور آم کے گھنے باغات میں سوئے ہوئے اپنے خاموش قصبے کو دیکھا جہاں پندرہ دن بعد میں واپس پہنچ جاؤں گا۔ اسٹیشن سے اتر کر کچے راستے پر آؤں گا تو کائی زدہ گنبد دور سے نظر آجائیں گے۔ درگاہ شریف کے بعد بڑا سا پھاٹک آئے گا۔ پھاٹک میں داخل ہوتے ہی ایک چوک نظر آئے گا، اس چوک میں اونچی کرسی کا ایک بڑا سا حویلی نما مکان ہو گا جس کے صدر دروازے سے گزر کر جب میں ڈیوڑھی پار کروں گا تو وسیع صحن کے بعد اونچی شکستہ محرابوں کے دالان میں وہ کھڑا نظر آئے گا جس کے ماتھے سے مجھے روشنی پھوٹتی محسوس ہوتی ہے۔ میری بستی میں آج کل مان سون کی گھمسان ہوگی۔ میرا بابا دالان کے در میں کھڑا الحمد شریف پڑھ پڑھ کر آسمان پہ پھونک رہا ہو گا۔ مان سون کو اپنی بستی میں بسیرے کی دعوت دے رہا ہو گا۔ تاکہ کھیتوں میں کھیتوں کا سونا اگے اور کھلیانوں میں کھلیانوں کے موتی برسیں۔

سبز پری نے میرے بابا کا نام لیا تو مجھے وہ یاد آگئے۔ کسی اور چیز کا نام لیتی تو مجھے وہ چیز یاد آجاتی کیوں کہ اس وقت میرے ذہن کی لگام اس کے ہاتھوں میں تھی۔

میں نے یہ سوچ کر خود کو تسلی دی کہ ریڈیو سن کر، اخبار اور ٹیلی ویژن دیکھ کر اور درسی کتابیں پڑھ پڑھ کر اب بچے بھی یہ تفریق کرنے لگے ہیں کہ آپ کے یہاں ایسا ہوتا ہے اور ہمارے یہاں ویسا ہوتا ہے۔ لیکن ۔۔۔۔ ابھی ایک چیز بچی ہے۔ ہماری خوشیاں اور غم تو ایک ہی جیسے ہیں، ہمارے تہوار اور تقریبات تو یکساں ہیں۔ خوش ہونے کے ڈھنگ تو وہی ہیں یا کم از کم یہ احساس تو ہے ہی کہ ہمارے ریت رواج سب مشترک ہیں۔

سبز پری نے میرے ذہن کی لگام موڑ دی۔

"شام کو یہاں سب تفریح کرنے نکل آتے ہیں، کاریں اٹھائیں اور زن سے کلفٹن پہ آگئے۔ شام کے بعد سمندر تو ٹھیک سے نظر آتا نہیں اس لیے سمندر کی باؤنڈری پہ آکے کار تو روک دیتے ہیں لیکن ہیڈ لائٹس جلائے رکھتے ہیں جن کی روشنی میں سمندر کا پانی دور تک جھل مل جھل مل کرتا ہے۔

مجھے پھر حیرت ہوئی اور میں نے پھر مڑ کر اپنے بابا کو دیکھا۔ عشا کی نماز کے بعد وہ بڑا بلب بند کر دیتے ہیں اور چھوٹا بلب جلا دیتے ہیں۔ پھر اپنے پلنگ پر لیٹے دیر تک ریڈیو سے خبریں سنتے رہتے ہیں اور دیر تک جانے کیا کیا سوچتے رہتے ہیں۔ پھر آیۃ الکرسی پڑھ کر دستک دیتے ہیں اور اس امان دینے والے سے امان مانگتے ہیں جس نے دوستوں کو رفاقتیں اور دشمنوں کو عداوتیں دی ہیں اور پھر اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے بے خواب نیند سونے کے لیے لیٹ جاتے ہیں کہ صبح اٹھ کر پھر دن بھر دھوپ سے لڑنا ہو گا۔ پیچھے سے کسی کار کا ہارن بولا اور کوئی مزدا یا ٹوئے ٹا یا امپالا یا مرسی ڈیز آکر رک گئی لیکن ہیڈ لائٹس روشن رہیں۔ ہم دونوں کے طویل سائے پر شور سمندر کے

تاریک سمندر میں دور تک پھیل گئے اور بہتے ہوئے پانی میں کانپنے لگے۔
پیچھے پھر کوئی کار آکر رکی اور اس کی ہیڈ لائٹس کی دو موٹی موٹی متوازی لکیریں سمندر میں داخل ہو گئیں اور پانی پر دو روشن راستے نظر آنے لگے۔
سبز پری خوشی سے جھوم اٹھی۔
"دیکھیے بھائی دیکھیے۔ ابھی جو کار آکر رکی اس کی روشنی میں پانی دیکھیے کیسا جھل مل جھل مل کر رہا ہے۔
"سبز پری" میں نے اسے ہولے سے پکارا لیکن مجھے اپنی آواز اجنبی لگی اس لیے میں چپ ہو گیا اور اس سے نہیں کہہ سکا کہ سبز پری دوسرے کی کار کی روشنی میں سنہرے پانی کی جھل مل جھل مل تو دیکھ رہی ہو لیکن ذرا ساہٹ کر دیکھو اس تاریک پر شور سمندر میں تمھارے اور میرے سائے کیسے کانپ رہے ہیں کیسے لرز رہے ہیں۔
جانے کیوں مجھے سبز پری کی خوشی پر حیرت ہو رہی تھی۔ شاید یہ حیرت ہی میرے زخم کا علاج تھی۔
"آپ تو بالکل خاموش ہو گئے بھائی۔ پرسوں۔۔۔آپ سن رہے ہیں نا۔ پرسوں سیما کی روزہ کشائی ہے۔ آپ ضرور آئیے گا آپ کو تو ضرور ہی ضرور آنا ہے۔ ورنہ۔۔۔۔"
یہ کہہ کر وہ چپ ہو گئی۔ ہم فصیل پر کھڑے تھے اور تیز سمندری ہواؤں سے ہمارے لباس بے قابو ہو رہے تھے۔
اپنے سبز لباس کو سنبھالتی ہوئی وہ بہت اچھی لگی اور میں نے یہ کہہ کر دل کو ڈھارس دی کہ میں نے ٹھیک ہی سوچا تھا ابھی ہم میں اور تم میں بہت کچھ مشترک ہے۔ ہمارے ریت رواج ہمارے طریقے ہماری رسمیں' ہماری عیدیں، ہمارے روزے۔۔۔۔ اچھی لڑکی میں روزہ کشائی میں ضرور آؤں گا۔ ہاں ابھی ایک ساحل باقی ہے جس پر ہم تم دونوں کھڑے ہو سکتے ہیں۔
وہ بالوں کو سنبھالتی ہوئی میرے نزدیک آئی اور بچھانے والے انداز میں بڑی محبت کے ساتھ مجھ سے بولی:
"جمعہ کے دن روزہ کشائی میں آپ آئیے گا ضرور ورنہ جب آپ اپنے گھر واپس جائیں گے تو کسی کو یہ بھی نہیں بتا پائیں گے کہ۔۔۔۔"
تیز ہوا کا ایک بھیگا ہوا جھونکا ہمارے پاس سے گزرا۔ اس کے بال اڑنے لگے۔ وہ بال سنبھالنے لگی اور جملہ پورا نہیں کر سکی۔
میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔
"ہاں ہاں بولو۔ میں کیا نہیں بتا پاؤں گا سبز پری؟"
تب اس نے بے حد اعتماد اور یقین کے ساتھ کہا۔

(بقیہ صفحہ ۳۵۶ پر)

سید محمد اشرف

کعبے کا ہرن

امام مصلّے پر بیٹھا۔ مکبر نے تکبیر شروع کی۔

اللہ اکبر اللہ اکبر

تکبیر کا آہنگ آہستہ آہستہ بلند ہو رہا تھا۔

حیَّ علی الصّلوٰۃ۔ حیَّ علی الصّلوٰۃ

نمازی، جو دو زانو بیٹھے تھے اٹھ کھڑے ہوئے۔ امیر میاں بھی اٹھے۔ اٹھتے اٹھتے انھیں خیال آیا کہ ابھی تو اس نماز کے بعد ایک اور نماز بھی پڑھنا ہے۔ اس نماز کا دھیان آتے ہی انھیں ایسا محسوس ہوا جیسے ان کے چہرے پر ایک دم بہت سے بال اگ آئے ہوں صف کی ایڑیوں سے ایڑیاں ملانے کے لیے انھوں نے نیچے دیکھا تو جھرجھری آگئی۔ ریشم کا کمر بند پاجامے سے نکلا ہوا تھا اور پنڈلیوں کو چھو رہا تھا۔

کیا میں کمر بند اندر کر لوں؟ ---- انھوں نے سوچا ----

امام نے اللہ اکبر کہہ کر نیت باندھ لی۔ امیر میاں نے نیت باندھنے سے قبل ہی "سبحٰنک اللھمّ ---- یاد کرنے کی کوشش کی حالاں کہ وہ نیت کے بعد پڑھا جاتا ہے۔

امیر میاں نے سوچا کہ وہ سب کچھ دماغ سے محو ہو جائے جسے یاد کر کے انھیں ابھی جھرجھری سی آئی تھی۔ انھوں نے ایک لمحے کو آنکھیں بند کر کے "سبحٰنک اللھمّ ----" یاد کرنے کی کوشش کی ---- اور آنکھیں بند کرتے ہی اسی لمحے میں انھوں نے کل صبح سے لے کر آج صبح تک کے سارے منظر دیکھ لیے۔

"ندائے ملت" کی آخری سطریں پڑھ کر انھوں نے اخبار گھٹنوں پر رکھ لیا۔ عینک اتار کر آنکھوں کا پانی کرتے کی آستینوں سے پونچھا۔ فضا میں ایک شکرہ ایک چھوٹی سی چڑیا کو دبوچنے کی فکر کر رہا تھا۔

یہی حال آج اپنی قوم کا ہے۔ عینک کو ناک پر اچھی طرح جما کر انھوں نے قوم کی بد حالی کے متعلق سوچا۔

اگر سوچتے نہیں تو آج دوستوں میں گفتگو کیا کرتے اور اگر گفتگو نہیں کرتے تو وہ ساکھ کیسے قائم رہتی جو زمین داری ختم ہو جانے کے بعد انھوں نے شہر میں آکر جمائی تھی۔ اس لیے وہ سوچ رہے تھے اور آج ہی نہیں وہ روز سوچتے ہیں۔ ۲۵ سال سے سوچ رہے ہیں اور روزانہ اپنے دوستوں میں بیٹھ کر اپنے اسی سوچنے کی داد لیتے ہیں۔ باہری کمرے میں جسے انھوں نے دیوان خانے

کا نام دے رکھا ہے، بیٹھ کر جب وہ حقے کے دھویں کے ساتھ کوئی زبردست نکتہ بیان کرتے ہیں اور دوستوں کی داد سمیٹتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہندوستان کے تمام مسلمانوں کے بے تاج بادشاہ وہی ہیں اور اس وقت انھیں ایسا لگتا ہے جیسے شرعی داڑھی والے بہت سے نورانی چہرے ان کی آواز پر لبیک کہہ رہے ہیں۔

امیر میاں بہت ہوشیار آدمی تھے۔ زمین داری کے زمانے میں وہ دنیا کی تمام اونچ نیچ دیکھ چکے تھے۔ وہ زمانہ سازی کے فن جانتے تھے۔ اگر اس فن سے ناواقف ہوتے تو شاید زمین داری ختم ہو جانے کے بعد گاؤں چھوڑ کر شہر سے جوجھنے نہ آتے۔ وہ جانتے تھے کہ اگر باقی زندگی گاؤں میں بسر کی تو ان کے لڑکے بڑے ہو کر یا تو مرغ بازی کریں گے یا گاؤں کی لڑکیوں کو چھیڑیں گے۔ اس کے علاوہ انھوں نے یہ بھی سوچا کہ ابھی تو سیر کی آمدنی آتی ہے لیکن جب یہ لڑکے بڑے ہوں گے تو یہی آمدنی چار جگہ تقسیم ہو جائے گی اور سب کے حصے میں دھیلا دھیلا آئے گا۔ اور تبھی انھوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ شہر جا کر بیٹوں کو اعلیٰ تعلیم دلائیں گے۔ شہر جانے کا دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ سیاست پر اچھی نظر رہے گی جس کا انھیں شروع ہی سے شوق تھا اور ۴۷ء میں اسی شوق کی بدولت انھوں نے اپنے حسب توفیق خوب نقصان بھی اٹھایا تھا۔ شہر میں آکر انھوں نے مکان بھی مسلمانوں کے گھروں کے درمیان لیا تھا۔ حالاں کہ محلہ ہندوؤں کا تھا لیکن ان کے مکان کی تمام دیواریں مسلمانوں کے مکانوں کی دیواروں سے ملی ہوئی تھیں۔ اسی سے بڑی تقویت رہتی تھی۔

آج بھی وہ حسب معمول اخبار پڑھ کر گفتگو کرنے کے لیے تانے بانے سلجھا رہے تھے کہ چھوٹے لڑکے نے آکر کہا۔

"ابا۔۔۔ لوگ باہر آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔"

"اچھا بیٹا۔۔۔ کہہ دو آتے ہیں۔ آج کالج نہیں جاؤ گے؟"

باورچی خانے کی طرف منھ کر کے انھوں نے حسب معمول بیگم سے چائے اور حقے کے لیے کہا۔ اور شیروانی چڑھا کر، ٹوپی لگا کر باہر کمرے میں آگئے۔ کمرے میں بیٹھے تمام لوگ تعظیم کے لیے مونڈھوں اور کرسیوں پر ایک ایک مٹھی اوپر اٹھے اور سلاموں کا تبادلہ کرتے ہوئے بیٹھ گئے۔ چائے اور حقہ آگیا۔ چائے کی چسکیوں اور حقے کی گڑگڑ میں باتیں پھدکنے لگیں۔ اسلامیہ مکتب کے چندے کی باتیں، چوک والی مسجد کی مرمت کی باتیں، انجمن ترقی قوم کی تشکیل کی باتیں۔۔۔

دروازہ کھلا اور ماجد میاں ہڑبڑائے ہوئے اندر داخل ہوئے۔

"کیا بات ہے ماجد میاں، آپ اتنے پریشان اور سراسیمگی کا شکار کیوں نظر آرہے ہیں۔"

امیر میاں نے اخباری زبان میں ان کا مزاج پوچھا۔

"آپ براہ کرم ایک گلاس پانی پلائیں تو بندہ کچھ عرض کرنے کی ہمت کرے۔"

پانی پی کر ماجد میاں نے رومال سے چہرے کا پسینہ پوچھا اور رومال شیروانی کی ادھڑی

ہوئی جیب میں رکھ کر چہرے کے تیور کو اس طرح سے سجایا کہ کمرے میں بیٹھے ہر فرد کی نگاہ انھیں پر جم گئی۔

"آپ کو کچھ معلوم ہے شیخ صاحب" ماجد میاں نے پر اسرار انداز میں ڈرامہ پیدا کیا۔

"کیا ---- کوئی خاص بات" امیر میاں نے گردن ترچھی کر کے کچھ اس انداز سے کہا جیسے جو بات انھیں معلوم نہیں ہوگی وہ یقیناً غیر اہم ہوگی۔

"آپ کے پڑوس میں ایک قتل ہو گیا اور آپ بے خبر ہیں" ماجد میاں نے ایک ایک لفظ چباچبا کر ادا کیا۔

"کیا ---- بہ خدا ---- ارے نہیں ---- سچ فرمایئے۔ واللہ" حاضرین کی پیالیوں سے چائے اور منھ سے بے ترتیب جملے ایک ساتھ اچھلے۔

"جی ہاں جناب عالی ---- ابھی ابھی اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آرہا ہوں۔ لاش کی شناخت نہیں ہو سکی ہے لیکن لاش کے ہاتھ میں اسٹیل کا کڑا ہے۔ نوجوان لڑکے کی لاش معلوم ہوتی ہے، میں نے تو دور سے دیکھا۔"

کمرے کی بوجھل فضا میں پھر ماجد میاں کی آواز گونجی۔

"لاش کسی ہندو لڑکے کی معلوم ہوتی ہے، اگر ایسا ہے تو بڑا خطرہ ہے۔ باہر لوگ عجیب عجیب باتیں کر رہے ہیں۔"

"کیا خطرہ ---- کیسی باتیں؟" چائے کی پیالیاں ہونٹوں تک آتے آتے رک گئیں۔

"بس یہ سمجھ لیجیے کہ اگر ہندو لڑکے کی لاش ہے تو فساد تیار ہے۔ کیوں کہ بالکل آپ کے پڑوس میں اور مسلمانوں کے گھروں کے درمیان قتل ہوا ہے۔"

بہت دیر تک حقے کے انگارے چٹختے رہے اور چائے ٹھنڈی ہوتی رہی۔ خاموشی کمرے میں چپ چاپ رینگتی رہی۔ اور اسی خاموشی اور دہشتناک ماحول میں سب نے سنا کہ باہر تھوڑی دور پر اسی حادثے کے متعلق باتیں ہو رہی ہیں۔

تبھی امیر میاں نے سوچا، یہی وقت ہے جب میں اپنی شخصیت اور مضبوط کر سکتا ہوں۔

"اس میں پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔ لاش یقیناً کسی ہندو کی ہی ہوگی۔ خدا نہ کرے کہ اپنی قوم کا کوئی فرد کم ہوا ہو۔ ہم لوگ اب یہاں رہ ہی کتنے گئے ہیں اور جہاں تک فساد کا تعلق ہے جھگڑے سے نہیں ڈرتے۔ ایک ایک دس دس کے لیے کافی ہوگا۔" لیکن امیر میاں نے محسوس کیا کہ یہ کہتے ہوئے ان کا لہجہ بالکل اسی حقے کی طرح سرد تھا جس کے لاتعداد کش لینے کے باوجود ماجد میاں اب تک اس کی چنگاریوں کو جگا نہیں پائے تھے۔

سب نے محسوس کیا ہر آدمی کے چہرے پر ایک ان جانا خوف سلگ رہا ہے۔ امیر میاں نے سوچا جب تک یہ لوگ رہیں گے محفوظ رہوں گا۔ لیکن لوگ آہستہ آہستہ رخصت ہونے لگے۔

ان میں انھیں روکنے کی ہمت نہیں تھی۔ یہ لوگ کیا سوچیں گے اگر میں انھیں روکوں گا۔ وہ یہی سوچتے رہے۔ جب آخری دوست بھی چلا گیا تو انھوں نے باہری کمرے کا دروازہ مضبوطی سے بند کیا اور اندر آکر بیوی سے کہا۔

"پچھواڑے والے دروازے میں تالا لگا دو ساری کھڑکیاں کنڈی لگا کر بند کر دو اور لڑکوں کی سلامتی کے واسطے دعائیں مانگو۔ فساد کسی وقت بھی شروع ہو سکتا ہے۔"

اور جب انھوں نے بیوی کو مکمل تفصیل بتائی تو بے چاری کھانا پکانا بھول گئیں اور جانماز بچھا کر سجدے میں گر پڑیں۔

شام تک انھوں نے جیسے وقت کا مادہ خود ہی محسوس کر سکتے تھے۔ ہر آواز پر انھیں ایسا لگتا تھا جیسے ان کے بیٹوں کو کسی نے کالج سے واپسی میں قتل کر دیا ہو اور کوئی انھیں یہ خبر سنانے بھاگا چلا آرہا ہو۔ دروازے پر دستک ہوئی اور وہ دل سنبھال کر اٹھے۔ کسی بھی بری خبر کو سننے کے لیے خود کو تیار کیا اور دروازہ کھول دیا۔ سامنے ان کے چاروں لڑکے کھڑے تھے۔

"ابا۔۔۔۔آپ کو معلوم ہے؟" ۔۔۔۔

"ہاں ہاں۔۔۔۔ تم لوگ اپنی ماں کے پاس جاؤ، وہ بہت گھبرا رہی ہیں۔"

اس کا مطلب ابھی لاش کی شناخت نہیں ہوئی ہے۔ ورنہ لڑکے اتنی آسانی سے گھر نہیں پہنچ سکتے تھے۔ اب اتنا وقت نہیں رہا کہ گاؤں واپس جایا جاسکے۔ آخری ریل بھی نکل چکی ہوگی۔

شام اندھیری ہوتی جارہی تھی اور انھیں ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ سورج اب کبھی نہیں نکلے گا۔ انھوں نے اندازہ لگایا کہ محلے میں ان کے خاندان سمیت سو مسلمان ہوں گے جب کہ ہندوؤں کے گھروں کی تعداد دو سو سے زیادہ ہے۔ ان کے چاروں لڑکے ماں کے پاس بیٹھے انھیں دلاسے دے رہے تھے۔ حالاں کہ سب جانتے تھے کہ صورت حال کیا ہے۔ رات پوری طرح امڈ آئی تھی اور فساد کا خوف مکمل طور سے مسلط ہو چکا تھا۔ آہٹ ہونے پر کئی دفعہ وہ بڑے دروازے کی درازوں سے جھانک کر دیکھ چکے تھے۔ باہر سارے تاریک سائے انھیں فسادی لگ رہے تھے۔ دس بونے دس بجے کے قریب باہر کچھ ہل چل سنائی دی۔ کچھ لوگ گالیاں بکتے، قہقہے لگاتے گزر رہے تھے۔ ان کا دل بہت دیر تک دھڑکتا رہا۔ بڑے بیٹے نے بتایا "لوگ سنیما دیکھ کر واپس آرہے ہیں، کوئی خطرے کی بات نہیں۔ آپ گھبرائیں نہیں۔"

"ہاں ہاں۔ ظاہر ہے۔ گھبراتا کون ہے۔ تم لوگ اپنی ماں کے پاس رہو۔ اور دیکھو خبردار جو کوئی کھڑکی یا دروازہ کھولا" وہ نہیں چاہتے تھے کہ لڑکوں پر ان کا بھرم ٹوٹ جائے۔ رات بیتی جارہی تھی اور تمام فسادات یاد آرہے تھے۔ تقسیم ہند کا فساد ان کے دماغ میں کچوے کی طرح بلبلا رہا تھا اور اس کے علاوہ ہزاروں چھوٹے بڑے واقعات انھیں یاد آرہے تھے جو ان تک اخباروں اور ریڈیو کے ذریعے پہنچے تھے۔ وہ سب کچھ یاد کرتے رہے اور ان کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوتے

رہے۔ باری باری انھوں نے ایک بار پھر سارے دروازے اور کھڑکیاں دیکھ ڈالیں۔ باہری کھڑکی کی ایک سلاخ نکل گئی تھی اور اتنا بڑا خلا ہو گیا تھا کہ ایک آدمی اس میں سے نکل جائے۔ انھوں نے فوراً چاروں لڑکوں کو بلایا اور ایک چارپائی اس انداز سے کھڑی کر کے لگادی کہ وہ خلا بند ہو گیا۔

ابھی شناخت نہیں ہوئی ہوگی ورنہ اب تک فساد شروع ہو گیا ہوتا۔

انھوں نے دعا مانگی "اے خدا صبح تک شناخت نہ ہو پائے، میں کل ہی بیوی بچوں کو لے کر گاؤں چلا جاؤں گا۔ وہاں میری بہت ضرورت ہے اور جب فساد کی آگ ٹھنڈی ہو جائے گی تو واپس آجاؤں گا۔ میں دو نفل نماز شکرانہ پڑھوں گا اگر لاش ہندو کی نہیں ہوئی تو۔"

کسی نے کھانا نہیں کھایا۔ سب کے سب ایک پلنگ پر بیٹھے فساد کا انتظار کر رہے تھے۔ فساد کا کیا اپنی موت کا انتظار کر رہے تھے۔ ۱۰۰ مسلمان اور ۲۰۰ ہندو گھروں کا کوئی مقابلہ تھا کیا۔ امیر میاں اتنے سراسیمہ تھے کہ شیروانی اتار نا تک بھول گئے تھے۔ جب بہت گرمی محسوس ہوئی تو بڑی بد سلیقگی سے شیروانی اتار پھینک دی۔ اسلامیہ مکتب کے چندے کی کاپیاں اور مسجد کے حساب کے پرچے گر پڑے۔ سارے کاغذات زمین پر پڑے ہوا میں کھیلتے رہے۔

یکایک باہری کمرے میں بڑے زور کی آواز آئی۔ سب کے دل کچھ دیر کو دھڑکنا بھول گئے۔ سب ویسے ہی پلنگ پر بیٹھے رہے۔ بت بنے چپ چاپ۔ ۲۰۰ ہندو گھروں کا کون مقابلہ کرتا۔ لیکن جب ایک بلی باہری کمرے سے باہر نکلی تو سب خاموش بیٹھے اسے دیکھتے رہے۔ اور چہروں سے شرمندگی پسینہ بن کر ٹپکتی رہی اور امیر میاں دھیان بٹانے کے لیے فارسی کا وہ شعر بلند آواز میں پڑھنے لگے جس میں بلی کی بے وفائی کا بیان تھا۔

معلوم نہیں کہ کتنی صدیوں کے بعد صبح ہوئی۔ امیر میاں نے سوچا شاید فسادی صبح ہونے کا ہی انتظار کر رہے تھے۔ ورنہ اب تک شناخت تو ہو چکی ہوگی۔ فسادیوں نے معاملہ صبح پر چھوڑ دیا ہوگا۔ سورج بالکل اسی طرح نکلا جیسے روز نکلتا ہے۔

"آج تم لوگ کالج نہیں جاؤ گے اور نہ کوئی دودھ لینے باہر جائے گا۔ کوئی دروازہ جب تک میں نہ کہوں نہیں کھلے گا سمجھے؟" اور ہاں تم بھی آج آفس مت جانا" انھوں نے بڑے لڑکے کو تنبیہہ کی۔

"باہر بالکل خاموشی تھی، جیسے کسی حادثے کا پیش خیمہ ہو۔ ۸ بجے کے قریب یکایک دروازے پر بڑے زور کی دستک ہوئی۔ انھوں نے بڑی یاسیت کے ساتھ لڑکوں کی طرف دیکھا اور چاروں کو لے کر دروازے پر پہنچے۔ دروازے پر جا کر بھرائی ہوئی آواز میں انھوں نے پوچھا۔

"کون ہے؟"

"میں ہوں شیخ صاحب۔ دروازہ کھولیے۔"

"ماجد میاں" انھوں نے سرگوشی کے انداز میں بیٹوں کو بتایا۔ ماجد میاں کے بال بچے تو ہیں نہیں۔ انھیں کسی بات کا ڈر نہیں۔ دروازہ کھول کر انھوں نے ماجد میاں کو پھرتی سے اندر کیا اور جلدی سے دروازہ بند کر کے ان کی طرف مڑے۔ مڑتے وقت انھوں نے پوری کوشش کی کہ ماجد میاں پر ان کی دہشت کا اظہار نہ ہوسکے۔ "سب خیریت ہے ماجد میاں؟"

انھیں معلوم تھا کہ ماجد میاں اس وقت ان کے گھر پناہ لینے آئے ہوں گے اور یہ خبر سنانے آئے ہوں گے کہ فسادی اب مشکل سے فرلانگ بھر کے فاصلے پر ہیں۔

"سب خدا کا شکر ہے آپ کی دعا ہے۔ میں گزر رہا تھا سوچا آپ کو اطلاع دے دوں کہ لاش کی شناخت ہو چکی ہے اور وہ لاش مسلمان لڑکے کی ہے۔ کوئی رقابت کا چکر تھا۔ مگر یہ دروازے کیوں بند کر رکھے تھے آپ نے۔" ماجد میاں نے ایک ساتھ بہت سی باتیں کہہ ڈالیں۔

"کیا بھئی۔ سچ کہیے گا، واللہ کسی مسلمان کی لاش تھی؟ یعنی ہندو کی لاش نہیں تھی۔ واہ واہ خوب سنائی آپ نے آکر ـ ـ ـ ـ ارے وہ دروازے کی بھی خوب کہی آپ نے۔ بات یہ ہوئی کہ آج ہم لوگ بری طرح سوئے، ابھی ابھی جاگے ہیں بس۔ جب آپ آئے، بس یقین کیجیے آپ آئے جبھی جاگے۔"

"ارے بھئی بیگم۔ آج چائے کے ساتھ ذرا حلوا بھی بھیج دینا۔ بھئی ماجد میاں آئے ہیں۔"

اور اس دن وہ اپنے باہر کے کمرے میں جسے انھوں نے دیوان خانے کا نام دے رکھا تھا بیٹھے اپنے دوستوں سے کہہ رہے تھے۔

"آج اپنی قوم کا ایک فرد اور کم ہو گیا۔ ہم لوگ تعزیتی جلسہ کریں گے اور مرحوم کے لیے دعائے مغفرت کریں گے۔"

امیر میاں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ اب امام "سورہ فاتحہ" بھی شروع کر چکا تھا۔ امیر میاں نے بہت بے بسی کے ساتھ "سبحٰنک اللّٰھم ـ ـ ـ ـ" یاد کرنے کی کوشش کی لیکن دماغ نے پھر راستہ بدل لیا، انھیں بہت شدت کے ساتھ یاد آیا کہ ابھی اس نماز کے بعد وہ نماز بھی پڑھنا ہے خدا کا شکر ادا کرنا ہے کہ لاش مسلمان کی نکلی۔

نیچے نظر گئی تو ریشم کا کمر بند ویسا کا ویسا ہی پنڈلیوں کو چھوتا ہوا جھول رہا تھا۔ انھیں اپنے چہرے پر پھر بڑے بڑے بال لگتے ہوئے محسوس ہوئے۔ انھیں ایسا لگا جیسے وہ مسجد میں ننگے کھڑے ہیں بالکل ننگے۔

○ ○ ○

سید محمد اشرف

روگ

(R O G U E)

سورج ڈوبے دیر ہو چکی تھی یا شاید ابھی ابھی ڈوبا تھا کہ سڑک کے داہنی طرف گھوم کر جنگل جانے والے ڈھلان دار راستے پر ویگن آہستہ سے اتری اور پورا موڑ کاٹ کر ابھی انجن نے رفتار بھی نہیں پکڑی تھی کہ گاڑی کی پلیا کے پاس اوور کوٹ پہنے کھڑی اس عورت نے ہاتھ سے گاڑی روکنے کا اشارہ کیا جس کے دوسرے ہاتھ میں ایک نو عمر لڑکے کا سیدھا ہاتھ تھا۔

اضطراری طور پر ندیم نے بریک لگائے۔ گاڑی ایک جھٹکے سے رکی اور اس حصے میں اتنی دھول اڑی کہ عورت کی پنڈلیاں اور لڑکے کے گھٹنے کچھ دیر تک گرد میں چھپے رہے۔

دھول زمین پر بیٹھنے اور انجن کی گھڑ گھڑاہٹ کے خاموش ہونے تک کے وقفے کے درمیان ندیم نے گاڑی کے اندر تین جملے سنے اور شرمندہ ہوا۔

ڈاکٹر وقار نے سیٹ پر رکھی رائفل ہاتھ میں لے کر کچھ تیز لہجے لیکن سمجھانے والے انداز میں کہا تھا۔

"گاڑی کاہے روک دی۔ یار! ڈی۔ ایف۔ او۔ صاحب وہاں رینجری میں انتظار کرتے کرتے سوکھ گئے ہوں گے۔ ویسے ہی لیٹ ہو گئے ہیں۔"

آصف نے کھڑکی کا شیشہ کھسکا کر باہر کھڑی عورت اور بچے کو دیکھ کر پھر اندر منھ کر کے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

"پاگل ہاتھی کے شکار کو چلے ہیں اور عورت کو دیکھتے ہی ہیرو بن جاتے ہیں۔"

راشد نے کچھ سوچتے ہوئے خواہ مخواہ تشویش والے انداز میں کہا تھا۔

"پوچھا تو جائے نیچے اتر کر۔ کون ہے؟ کیا چاہتی ہے؟"

ندیم نے دروازہ ایک جھٹکے کے ساتھ کھولا۔۔۔۔ باہر دسمبر کی ہوا تھی۔ وہ نیچے اتر کر عورت کے پاس پہنچا۔

"ارے ظالم۔ دروازہ تو بند کر جاتا۔ اب کے بڑی ٹھنڈ ہے۔ لگتا ہے پھر کہیں برف پڑ رہی ہے۔"

ڈاکٹر وقار خود سے مخاطب تھے۔

ندیم نے واپس آکر سیٹ پر بیٹھ کر دروازہ بند کیا اور مڑ کر اندر والوں کو مخاطب کرنا

چاہتا ہی تھا کہ اسے کچھ دھیان آیا، اس نے دروازہ پھر کھول دیا۔

راشد نے دیکھا کہ عورت کے چہرے پر دروازہ بند ہونے سے جو کھنچاؤ پیدا ہوا تھا وہ آہستہ آہستہ چھٹ گیا اور چہرہ بشاش ہو گیا۔

"اصل میں ----اس عورت کے پاس دس ہزار روپے ہیں۔" ندیم یہ کہہ کر چپ ہو گیا جیسے اسے احساس ہو گیا ہو کہ بغیر تمہید کے یہ جملہ کچھ ناموزوں سا تھا۔

"یہ کیا بات ہوئی؟ کس کے روپے ہیں؟ بلکہ اتنے روپے کیوں ہیں اس عورت کے پاس ----وہ بھی جنگل کے راستے میں ----"

ندیم نے ڈاکٹر وقار کی بات کاٹی اور کچھ خود اعتمادی کے انداز میں ایک ساتھ بول گیا۔

"برولی گاؤں میں کتھے کے تاجر ہیں نا اگروال ان کے یہاں سے یہ روپیہ لائی ہیں۔ کینیڈا سے آئی ہوئی ہیں۔ رہنے والی لکھنو کی ہیں۔ اگروال کو یہ روپیہ انھوں نے کینیڈا میں ہی دیا تھا کہ جب یہ ہندوستان آئیں تو وہ انھیں واپس کر دے۔ ان کو آج ہی رات تک لکھنو پہنچنا ہے۔ ان کے ساتھ جو بچہ ہے وہ ان کا بھانجا ہے۔ اس کا نام راجو ہے۔ آج بسوں کی اسٹرائک ہے، یہ بات ان کو گاؤں سے رخصت ہونے کے بعد معلوم ہوئی۔ واپس گاؤں جانا نہیں چاہتیں کیوں کہ پورے گاؤں میں ایک بھی گھر----"

کچھ کہتے کہتے رک گیا کہ اسے ابھی ابھی ڈاکٹر صاحب کے کمپاؤنڈر رمیش کی موجودگی کا احساس ہوا تھا جو اپنی ایک نالی بندوق پکڑے سب سے پچھلی سیٹ پر خاموش بیٹھا تھا۔

کبھی کبھی پوری صورت حال ایک ساتھ سمجھ میں آجاتی ہے۔

"رینجری تک لیے چلتے ہیں، وہاں سے ڈی۔ ایف۔ او صاحب کے ساتھ بہرائچ تک بھیج دیں گے۔ بلکہ ان سے کہیں گے کہ بہرائچ کے بس اسٹینڈ تک چھوڑ دیں۔" ڈاکٹر وقار اس طرح بولے جیسے اپنی تجویز پر تائید چاہتے ہوں۔

گاڑی رکنے سے اب تک جو تناؤ پیدا ہوا تھا وہ اس جملے سے ٹوٹ گیا اور سب مطمئن نظر آنے لگے۔

ڈاکٹر وقار اپنی رائفل اٹھائے پیچھے کی سیٹ پر جاکر آصف کے ساتھ بیٹھ گئے۔

ندیم نے ایک ہاتھ سے اسٹیرنگ پکڑ کر دوسرے سے کھلے ہوئے دراوزے کا اندرونی ہینڈل پکڑا اور چہرہ باہر نکال کر عورت کو پکارا۔

"آجائیے۔ آپ کھڑی کیوں ہیں۔ ہم لوگ اصل میں اندر جگہ کر رہے تھے۔" اس کے اس جھوٹ پر سب لوگ دل ہی دل میں مطمئن ہوے۔

اس نے دوسری طرف کا دروازہ کھول دیا۔ عورت نے پہلے بچے کو چڑھایا اور پھر بورڈ پر جوتے رکھ کر ایک جھٹکے میں اوپر چڑھ گئی۔ وہ فل بوٹ پہنے ہوئے تھی۔ گاڑی پر چڑھنے سے

لے کر سیٹ پر بیٹھنے تک کے وقفے میں سب نے اسے غور سے دیکھ لیا۔ جس وقت وہ سڑک کے کنارے ذرا دور کھڑی تھی اس وقت گردن موڑ کر اسے دیکھنا معیوب سا لگ رہا تھا۔

وہ نکلتے ہوئے قد کی ایک جوان اور دل کش عورت تھی۔ اس کے رخساروں کی کھال کے کھنچاؤ اور چہرے کی نرم نرم چمک دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ شاداب پھل کثرت سے کھاتی رہی ہے۔ ایسا صرف ندیم نے سوچا تھا۔ ممکن ہے اس سے ملتی جلتی بات اوروں نے بھی سوچی ہو۔

عورت نے اپنے اوور کوٹ کی جیب پر آہستہ سے ہاتھ رکھ کر کچھ محسوس کیا اور بچے کو کندھے سے پکڑ کر اپنے نزدیک لا کر بغیر چہرہ موڑے سب کو دھیمے سے "تھینک یو" کہا۔

پھر دوسرے ہی لمحے کچھ سوچ کر کہا۔ "آپ سب کا بہت بہت شکریہ۔"

سڑک کے دونوں طرف کھیت تھے۔ اب اتنا اندھیرا پھیل گیا تھا کہ یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ کون سی فصل بوئی ہوئی ہے۔

سامنے سڑک پر جنگل کی چوکی کا بیریر تھا۔

چوکی کے سامنے جا کر گاڑی دھیمی ہوئی ہی تھی کہ ملگجی وردی پہنے چوکی والے نے گاڑی کے سامنے آ کر ہیڈلائٹس کی روشنی سے آنکھوں کو بچانے کے لیے ہاتھ آگے کیا اور ٹیڑھا چہرہ کر کے گاڑی کو پہچانا اور بیریر اونچا کر دیا۔ چوکی پار کر کے گاڑی ابھی تھوڑی ہی دور بڑھی ہو گی کہ آصف نے کہا۔

"ندیم ایک منٹ کو روکنا ذرا۔۔۔۔ بس تھوڑا سا۔"

"وہی حرکت۔۔۔۔ وہی خوش بو والی بات نا؟" ڈاکٹر وقار نے پوچھا۔

"ہاں۔" آصف نے دھیرے سے جواب دیا۔

گاڑی رکی تو آصف کے ساتھ ڈاکٹر وقار بھی نیچے اترے۔ اور اس وقت جب دروازہ کھلا تھا تو باہر سے جو ہوا اندر آئی تھی وہ کسی اور سیارے کی ہوا تھی۔ گاڑی جنگل کے اندر داخل ہو چکی تھی۔

آصف اور ڈاکٹر وقار دیر تک گاڑی سے ٹیک لگائے تیز تیز سانسیں کھینچتے رہے۔ ندیم نے بھی اپنا دروازہ کھول لیا تھا۔ اس نے سامنے پھیلے جنگل کی طرف ناک کر کے تیزی سے گہری گہری سانسیں لیں اور جنگل کی خوش بو کو بہت استغراق کے ساتھ محسوس کرنے کی کوشش کی۔ اس نے سوچا اس خوش بو میں ساگون کے ہاتھی کے کان جیسے بڑے بڑے پتوں کی مہک، ساکھو کے تنے کی چھال کی تیز بو، جنگل کی طرح طرح کی گھاسوں کی مہکار اور جنگل میں بسنے والی سیکڑوں اقسام کی مخلوق کی جلد اور بالوں کی حیوانی بو شامل ہے۔ اور کیوں کہ اس وقت اندھیرا ہے اور آنکھیں اپنا کام نہیں کر پا رہی ہیں اس لیے جنگل صرف ناک کے ذریعے شامہ کے سہارے اندر ہی اندر اترتا چلا جا رہا ہے اور سامنے چاروں طرف پھیلے جنگل میں کھڑا یہ گہرا سناٹا وجود کو کبھی کبھی کیسا بے

معنی اور کبھی کبھی کیسا بامعنی بنادیتا ہے۔ اور جنگل کے اندھیرے سناٹے کو جب کسی پرندے کی خوابیدہ چہکار یا کسی چرندے کے چرنے یا بھاگنے کی آوز یا کسی درندے کی غراہٹ توڑتی ہے تو لگتا ہے اتنے حصے میں اجالا پھیل گیا ہو۔ کبھی کبھی آواز روشنی بن جاتی ہے۔

بچے نے ان سب کو پہلے بے تعلقی پھر تعلق کے ساتھ، پھر نہایت غور سے دیکھنا شروع کیا۔

ندیم نے سوچا جیسے آواز کبھی کبھی روشنی بن جاتی ہے تو کیا روشنی بھی کبھی کبھی آواز بن سکتی ہے۔ وہ اس بے ربط بات کو کسی منطقی نتیجے تک لے جانا چاہتا تھا کہ اتنے میں ڈاکٹر وقار نے دروازہ بند کیا اور خود کو سیٹ پر گرا کر اعلان کرنے والے انداز میں کہا۔

"اماں کتنا خوب صورت اور پر سکون جنگل تھا۔ اس سالے پاگل ہاتھی نے سب گڑبڑ کردی۔"

پاگل ہاتھی کے نام پر عورت اور بچے کے بیٹھنے کے انداز میں کچھ تبدیلی آئی۔

"کتنا مزہ آتا تھا وقار بھائی جب ہم لوگ کئی کئی دن تک جنگل میں آکر رہتے تھے۔ کسی بھی طرف چلے جاؤ کوئی جو کھم نہیں۔ پچھلے موسم میں ہم لوگ چاندنی رات یں رینجری سے لے کر گیروا ندی تک پیدل پیدل گئے تھے اور وہاں ریت پر لیٹے گھڑیال دیکھے تھے۔ کتنا مزہ آیا تھا۔ راستے میں گلدار بھی ملا تھا، بلکہ دو گلدار ملے تھے۔" راشد نے یاد دلایا۔

"اب تو سورج منڈے بعد جنگل میں داخل تک نہیں ہو سکتے۔" پیچھے سے رمیش نے ٹکڑا لگایا۔

ندیم نے دروازہ بند کر کے گاڑی اسٹارٹ کی تو اس نے دیکھا کہ بچہ عورت سے لپٹ کر اس کے پہلو میں چھپ رہا ہے اور شاہد رو رہا ہے۔

"کیا بات ہے؟" اس نے بچے سے پوچھا۔ لیکن عورت کی طرف دیکھا۔

"یہ ہاتھی والی بات سے ڈر گیا ہے۔" اس نے بچے کو مضبوطی سے پکڑ کر اپنی طرف کرتے ہوئے کہا۔ "مطلب پاگل ہاتھی کا نام سن کر۔ یہ کیا معاملہ ہے۔ کیا یہاں کوئی ہاتھی روگ ہو گیا ہے۔"

"ہاں! پچھلے عرصے سے جنگل میں ایک روگ ہو گیا ہے۔ ہم لوگ اسی کو مارنے جا رہے ہیں۔"

اب بچہ عورت کی کمر مضبوطی سے پکڑے مگر چہرہ گھمائے ندیم کی بات سن رہا تھا۔ رینجری تک پہنچتے پہنچتے ندیم عورت کو بتا چکا تھا کہ روگ اب تک بہت سی معصوم جانیں لے چکا ہے اور یہ کہ اس روگ کا ایک دانت ٹوٹا ہوا ہے اور یہ کہ اس ہاتھی کے پیٹ پر ایک دیہاتی کی بندوق کی گولی کے زخم کا نشان ہے۔ اور یہ کہ اس ضلع کے جنگلات کے افسر نے چیف وائلڈ لائف وارڈن

کے پاس رپورٹ بھیج کر اس ہاتھی کو روگ ڈکلیر کرایا ہے اور ڈاکٹر وقار اور آصف کو اس روگ کو مارنے کا اجازت نامہ ملا ہے اور یہ کہ پہلے تو اکا دکا واقعات ہی ہوتے تھے لیکن آہستہ آہستہ اس ہاتھی کی من مانیاں بڑھتی گئیں۔ پھر لوگوں نے احتجاج کیے، گرام سبھا سے بات بلاک کی سطح پر آئی، پھر ضلع کی سطح پر پھر صوبائی اسمبلی میں یہ معاملہ اٹھایا گیا لیکن جنگل اور جنگل کے جانوروں کا تعلق مرکزی حکومت سے بھی ہوتا ہے اس لیے مرکزی پارلیامنٹ میں بھی اس معاملے پر کئی مرتبہ زبردست بحث مباحثہ ہوا۔ عورت کے پوچھنے پر ندیم نے یہ بھی بتایا کہ شروع شروع میں اس ہاتھی کو ختم نہ کرنے کی ایک وجہ شاید یہ بھی تھی کہ اتنے ہاتھیوں میں روگ کی شناخت نہیں ہو پا رہی تھی۔ ویسے بھی سرکاری کاموں میں اکثر تاخیر ہو جاتی ہے کیوں کہ دفتری نظام کچھ ایسا ہوتا ہے کہ اتنے بڑے علاقے کو۔۔۔۔"

کیوں کہ رینجری دور تھی اور وقت کافی تھا اور عورت دل کش تھی اس لیے ندیم نے اس بات پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی کہ حکومت کے اپنے وسائل کسی حد تک محدود ہوتے ہیں، خاص طور پر اس قسم کے ہنگامی حالات میں۔ اس لیے حکومت کبھی کبھی سہولت کے پیش نظر ذاتی اداروں یا افراد سے رابطہ قائم کر کے کچھ ذمہ داریاں ان کے سپرد کر دیتی ہے۔ مثلاً اس وقت بھی ہاتھی کو مارنے کا جو اصل اجازت نامہ ہے وہ خود ڈی۔ ایف۔ او۔ صاحب۔ کے نام ہے مگر ڈی۔ ایف۔ او۔ صاحب سرکاری افسر ہیں۔ زیادہ قابل اعتبار نہیں۔ تمام بڑے افسران بلکہ حکومت کے کچھ ارکان بھی اس بات سے واقف ہیں کہ دراصل اجازت نامہ ڈاکٹر وقار اور آصف بھائی کے نام ہے۔ ڈی۔ ایف۔ او صاحب کا نام تو محض خانہ پری کے واسطے ہے۔

عورت نے اس بیچ ندیم کو مخاطب کر کے لیکن سب کو مطلع کرنے والے انداز میں بتایا تھا کہ وہ پچھلے دس سال سے کینیڈا میں ہے جہاں اس کا شوہر ڈاکٹر ہے اور یہ کہ وہ ہر دو سال بعد آکر لکھنؤ میں اپنے والدین سے مل لیتی ہے اور یہ کہ جب وہ پہلی مرتبہ کینیڈا گئی تھی تو اس وقت راجو صرف ایک سال کا تھا اور یہ کہ اس وقت راجو چھٹے کلاس میں پڑھتا ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ وہ لکھنؤ سے بردلی ضلع بہرائچ اکیلے بھی آسکتی تھی لیکن والدین نے اتنی دور اکیلے بھیجنا معیوب جانا اور حفاظت کے لیے اس مرد کو ساتھ کر دیا۔ مرد کہتے وقت اس نے اپنے بھانجے کو محبت سے دیکھا تھا اور مسکرائی تھی۔ راجو بھی ہاتھی کے ذکر سے پیدا ہونے والے خوف کے باوجود مسکرایا تھا بلکہ شاید کچھ شرمایا بھی تھا۔ عورت نے یہ بھی بتایا کہ والدین نے بہت سختی سے تاکید کر دی تھی کہ ہر حالت میں مغرب کے وقت تک واپس ہو جانا کیوں کہ اس پورے علاقے میں آج کل۔۔۔۔"

اتنا کہہ کر اسے خاموش ہونا پڑا کیوں کہ اس کی ان باتوں کو سنتے ہی ڈاکٹر وقار زور زور سے رمیش کا نام لے لے کر اس سے کوئی بے ربط سی بات کرنے لگے تھے۔

اس درمیان رمیش نے اس بات کا اقرار کیا کہ جب سے ترائی کے علاقے میں سکون ختم

ہوا ہے وہ بھی خوف زدہ ہے اور رات کو ہائی وے کے سفر سے بچتا ہے کیوں کہ پچھلے اتوار پیلی بھیت میں پورن پور کے پاس ایک بس روک کر ۔ ۔ ۔ ۔

عورت بیچ بیچ میں بچے کو دھیمے دھیمے کچھ سمجھاتی جارہی تھی۔ ندیم نے عورت کا کام ہلکا کرنے کے لیے راجو کو اپنے اعتماد لینے کی کوشش کی اور اس بات کو محسوس کر کے خوش ہوا کہ راجو جیسے جیسے اس کے اعتماد میں آتا جارہا ہے وہ عورت خوش اور مطمئن ہوتی جارہی ہے۔ یہ سوچ کر ندیم اور زیادہ جوش و خروش سے بچے کے ساتھ باتیں کرنے لگا۔

اس نے بچے کو بتایا۔

"اس خطرناک ہاتھی کو مارنے کے لیے کئی رائفلوں کی ضرورت بھی پڑ سکتی ہے۔"

"آپ کے پاس کتنے رائفلیں ہیں؟"

"ایک رائفل ہے مگر دو بندوقیں بھی ہیں لیکن بندوق کے کارتوس کا ہاتھی پر زیادہ اثر نہیں ہوتا۔ اس کے لیے بڑے بور کا رائفل چاہیے۔"

"رائفل الگ الگ طرح کے ہوتے ہیں؟" بچے نے پوچھا تھا۔

"ہاں۔ رائفل کی گولی کے وزن اور رفتار کے حساب سے رائفل کی الگ الگ قسمیں ہوتی ہیں۔ جیسے تھرٹی اسپرنگ فیلڈ، تین سو پندرہ، کاربائن۔"

راشد نے پیچھے بیٹھے بیٹھے محسوس کیا کہ ندیم باتیں تو بچے سے کر رہا ہے لیکن سنا رہا ہے عورت کو۔ شاید اپنی معلومات کا رعب ڈال رہا ہے۔

ندیم بتا رہا تھا۔

"ہمارے پاس جو رائفل ہاتھی کو مارنے کے واسطے ہے وہ تین سو پچھتر میگنم۔ اس کی گولی کے وزن اور رفتار کے تناسب کا دنیا میں کوئی جواب نہیں ہے۔"

"تناسب کیا؟" بچے نے پوچھا تھا۔

"تناسب یعنی کے ریشو۔"

"ریشو تو ارتھ میٹکس میں ہوتا ہے۔" بچہ بولا تھا۔

"وہی والا ریشو اور چیزوں میں بھی ہوتا ہے بھائی۔" ندیم سمجھانے میں ناکام ہوا تو جھنجھلانے لگا۔

"اور اگر جیسے رائفل ہاتھی پر چلائیں اور اسی وقت رائفل خراب ہو جائے تو؟ ۔ ۔ ۔ ۔" بچے نے سوال کیا۔

"شبھ شبھ بولو یار۔" آصف نے مداخلت کی۔

"ایسے موقع پر ہم لوگ بندوق سے فائر کر کے ہاتھی کو بھگا سکتے ہیں۔" ندیم نے بتایا۔

"اگر وہ نہ بھاگے تو؟"

"تو بہت سی آگ جلا کر اسے دفان کر سکتے ہیں۔"

"وہ آگ سے ڈرتا ہے؟" بچے نے پوچھا۔

"وہ رات میں روشنی سے ڈرتا ہے۔" ندیم کے بجائے راشد نے جواب دیا تھا۔

"آپ کے پاس آگ کے لیے کچھ ہے۔" بچے نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ یہ موجود ہے۔" ڈاکٹر وقار نے مسکراتے ہوئے ماچس دکھائی اور سگریٹ نکال کر سلگائی۔

یہ جواب سن کر راجو دیر تک ماچس کو دیکھتا رہا۔

باتوں باتوں میں عورت نے ندیم کو یہ بھی بتایا کہ لکھنو میں اس کے والدین نے یہ بھی سمجھا دیا تھا کہ یہ علاقہ بہت پس ماندہ ہے، قدم قدم پر چور لٹیرے بھی ملتے ہیں اس لیے تم رات نہ کرنا۔ تمھارے پاس رقم ہوگی۔

یہ سن کر ندیم کو سبکی کا احساس ہوا۔ تب اس نے ڈرائیونگ کرتے کرتے اپنی یاد داشت کو کھنگالا اور انگریزی میگزینوں کے سرسری مطالعے کی یادوں کو جمع کر کے عورت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"ہم لوگ اکثر کینیڈا میں بسے اپنے ہم وطنوں کے خیال سے فکر مند رہتے ہیں کہ وہاں سر منڈے لوگوں نے ایشیا والوں کو بہت پریشان اور ذلیل کر رکھا ہے۔"

ذلیل کے لفظ پر اس نے ضرورت سے زیادہ زور دیا تھا۔ عورت نے ندیم کی چالاکی کو سمجھ کر لیکن موقع کی نزاکت کو جانتے ہوئے بھولے بھولے ذکر کرنے والے انداز میں کہا تھا۔

"اس طرح کے گروہ لندن وغیرہ میں زیادہ ہیں۔ کینیڈا میں دوسری طرح کے مسائل ہیں۔" وہ دیر تک ان مسائل کا ذکر کرتی رہی۔

ندیم کو اپنے ناقص مطالعے پر کچھ دیر تک شرمندگی محسوس ہوئی۔ تب اس نے موضوع بدلا اور بتانے لگا کہ جنگل میں روگ ہو جانے سے کیسے کیسے نقصانات ہوتے ہیں۔ اول تو یہ کہ جنگل کے تمام نارمل کام رک جاتے ہیں۔ جنگل کی پکی روڈ بنانے والے مزدور علاقہ چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں۔ پتوں کی صفائی والی عورتیں جنگل میں آنا بند کر دیتی ہیں۔ جنگلات کی گھاس کے ٹھیکے اٹھنا بند ہو جاتے ہیں کہ کون اپنی جان جوکھم میں ڈال کر گھاس کٹوائے گا۔ شہد کے ٹھیکے دار کام چھوڑ دیتے ہیں۔ جنگلات کے افسران اس عرصے میں جنگل کی لکڑی چوری کرنے والوں کو مدعو نہیں کر پاتے۔ اور تم اور ہم لوگ پوچننگ تک نہیں کر پاتے کہ کب کس درخت کے پیچھے سے یا اونچی اونچی گھاس یا جھاڑی کے پیچھے سے آنکھیں سرخ کیے سونڈ اٹھائے چنگھاڑتا ہوا روگ نہ نکل پڑے اور کچل کر رکھ دے۔

رینجری پہنچنے سے کچھ دور پہلے ہیڈلائٹس اس لکڑی کے کھمبے پر پڑیں جس پر ایک پٹی لگی تھی جس پر ہندی میں لکھا تھا۔

ہوشیار! یہ ہاتھیوں کے گزرنے کا راستہ ہے

راجو نے بھی اسے پڑھا اور کھسک کر عورت کے پہلو میں گھس گیا۔

اچانک ندیم نے ہیڈلائٹس بند کر کے گاڑی روک دی۔ گاڑی ایک جھٹکے سے رکی اور سب کا توازن بگڑ گیا۔ گاڑی رکنے سے جنگل کا سناٹا واضح ہو گیا تھا۔

"سامنے ہاتھی سڑک پار کر رہے ہیں۔" ندیم نے دھیمے سے کہا۔

سب نے سانس روکے روکے دور سڑک پر بھدے بھدے سیاہ دھبوں کو پولے پولے قدموں سے سڑک پار کرتے دیکھا۔ گاڑی کے باہر اور اندر سناٹا چھایا رہا۔

کچھ دیر بعد ندیم نے گاڑی اسٹارٹ کی اور بہت تیز رفتاری سے چلاتا ہوا نشان گاڑا رینجری تک لایا۔ گاڑی روک کر اس نے عورت کو دیکھا، پھر سہمے ہوئے بچے کو دیکھا۔ اور گاڑی سے اترنے سے پہلے بچے کو مخاطب کر کے بتایا کہ روگ غول میں نہیں ہوتا۔ غول کے ہاتھی عموماً بے ضرر ہوتے ہیں۔ روگ سب سے الگ تھلگ ہوتا ہے۔

رینجری میں الاؤ جلتا اور کئی لوگوں کو تاپتا دیکھ کر راجو کے چہرے کا پیلا پن دور ہوا۔ اس نے اترتے اترتے پوچھا۔

"کئی پاگل ہاتھی جمع ہو جائیں تو غول نہیں بن جائے گا کیا؟"

عجیب بے تکی باتیں کرتا ہے۔ ندیم نے گاڑی سے اتر کر دروازہ بند کرتے ہوئے سوچا۔

رینجر صاحب پوری وردی پہنے سب سے ہاتھ ملا رہے تھے۔

"آپ کا بچہ ہے؟" انھوں نے ندیم سے پوچھا۔

"نہیں یار! یہ لوگ بردلی میں ملے تھے۔" اس نے پورا معاملہ سمجھایا۔

"تب تو بڑی دقت ہو گی۔ ڈی ایف۔ او صاحب تو موتی پور والے راستے سے نیپال نکل گئے ہیں۔ وہاں کسٹم چوکی پر اپنا ایک آدمی پکڑا گیا ہے۔"

یہ سن کر عورت کے چہرے پر بے چارگی دوڑ گئی۔ وہ ایک ایک کا منھ دیکھنے لگی۔

"میں وائرلیس بھیج کر لکھنو سوچتا بھیج دوں کہ آپ کے گھر خیریت بتا دیں؟"

"لیکن ان کے جانے کا مسئلہ کیسے طے ہو گا؟" ڈاکٹر وقار نے پوچھا۔

ندیم نے عورت کے پاس آکر کہا۔

"آپ رینجری پر رینجر صاحب کے گھر آرام کریں۔ ان کی بیوی بہت اچھی ہیں۔ ہم سب کو بھائی مانتی ہیں۔"

عورت شش و پنج میں تھی کہ رینجر صاحب نے مطلع کیا کہ ان کی فیملی دو دن ہوئے میکے

چلی گئی کیوں کہ رو گ کی وجہ سے پورے جنگل میں دہشت پھیلی ہوئی ہے۔ بچوں کے ماما آکر اپنی بیٹی اور نواسوں کو لے گئے۔

اس وقت کا منظر یہ تھا کہ لوہے کے تار کی باڑھ میں گھری رینجری کی سرخ پرانی عمارتوں کے درمیان الاؤ کے پاس رینجری کا پورا اسٹاف، دو موٹر سائکلیں، اسٹیشن ویگن اور، بہرائچ سے آئے شکاری اور وہ عورت اور وہ بچہ ----۔ سب کے سب الاؤ کی روشنی میں ہیولوں کی طرح لگ رہے تھے۔ الاؤ کی آگ تیز ہوتی تو ان سب کی پرچھائیاں بڑھ جاتیں۔ الاؤ کی آگ مدھم پڑتی تو پرچھائیں سمٹ جاتیں۔ رینجری کے چاروں طرف پھیلا جنگل، ساگون اور ساکھو اور شیشم کے اونچے اور مضبوط اور تناور درختوں کا جنگل دبیز کہرے کے نیچے بالکل خاموش کھڑا تھا۔ اس جنگل میں نزدیک یا دور بہت سے حیوان یا تو اونگھ رہے ہوں گے یا خاموش لیکن تیزی سے چگ رہے ہوں گے یا چر رہے ہوں گے یا پانی پی رہے ہوں گے یا غول میں کھڑے ہوں گے یا اپنی ماداؤں کو اپنے سینگوں سے چھو رہے ہوں گے یا اپنے بچوں کے بدنوں کو چاٹ رہے ہوں گے یا اپنے شکار پر حملہ کر رہے ہوں گے یا بھوکے پیٹ جنگل کے ایک حصے سے دوسرے حصے میں بھاگ بھاگ کر اپنی خوراک یا اپنا شکار تلاش کر رہے ہوں گے۔

عورت بہت بے بسی سے سب کو دیکھ رہی تھی، اسے محسوس ہوا اس کی آنکھوں سے آنسو نکلنے ہی والے ہیں۔

"ہم لوگ لیٹ ہو رہے ہیں۔" ڈاکٹر وقار نے خاموشی کو توڑا----۔ "کیا آج کی کوئی خبر ہے؟"

"جی ہاں" رینجر صاحب آگے بڑھے۔ "آج موتی پور بلاک میں پرانے گیسٹ ہاؤس والے جنگل میں ساگوان کے ۱۹۵۵ پلاٹ کے آس پاس پگ مارک دیکھے گئے ہیں۔"

"آج تو آپ شیر کے شکار کی زبان بول رہے ہیں۔" آصف مسکراتے ہوئے بولے۔

"نہیں جی۔ بات ایسی ہے کہ سب لوگ بہت ڈرے ہوئے ہیں۔ اسے سامنے دیکھ لیں تو وہیں ٹھور دم نکل جائے۔ رینجری چھوڑ چھوڑ کر سب کے پریوار چلے گئے ہیں۔ جس دن سے رینجری میں گھس کر اس نے چوکی دار کو کچل کر مارا اسی دن سے یہ حالت ہوئی ہے۔ آج تو آپ لوگ اس کا بنس ہی مٹا کر جانا۔"

"اللہ مالک ہے۔" ڈاکٹر وقار بولے۔

"پھر کیا سوچا بھائی؟" ڈاکٹر وقار نے ندیم اور عورت کے پاس آکر پوچھا۔

ندیم خاموش کھڑا راجو کو ماچس سے ایک چھوٹا سا الاؤ جلاتے دیکھتا رہا۔

عورت نے دھیرے سے لیکن اعتماد کے ساتھ کہا۔

"آپ میرے گھر وائرلیس سے انفارم کرا دیجیے اور مجھے بھی گاڑی میں لے چلیے۔ یہاں

ریجنری میں مت چھوڑیے گا۔"

"آپ سوچ لیں۔آپ کے ساتھ بچہ ہے۔آپ لوگ روگ کو دیکھ کر ڈر نہ جائیں۔"

"اب جو ہو گا سو ہو گا۔مجھے جنگلی جانوروں سے ڈر نہیں لگتا۔میں۔۔۔۔ہم لوگ شادی کے بعد افریقہ کے جنگل میں۔۔۔۔زمبابوے میں شکار۔۔۔۔۔ہنی مون پر گئے تھے۔۔۔۔پرمٹ لے کر گئے تھے۔۔۔۔میں نے خود ایک بائسن مارا تھا۔"

ندیم کو یہ سن کر حیرت ہوئی اور اطمینان بھی۔

"مگر راجو۔۔۔۔"ندیم بولا۔

"میرے پاس چپکا بیٹھا رہے گا۔"عورت نے جواب دیا۔

ویگن میں مزید پٹرول ڈالا گیا۔الاؤ کے چاروں طرف بیٹھ کر سینڈوچ کھائے گئے،چائے پی گئی،سگریٹیں سلگائی گئیں۔باتھ روم جایا گیا۔رائفل اور بندوقیں ایک بار پھر چیک کی گئیں۔

"اسٹریٹیجی وہی رہے گی کہ اگر قریب سے موقع دیتا ہے تب تو فائر ہو گا ورنہ بندوقوں سے فائر کر کے بھگادیں گے کیوں کہ اوچھا ہاتھ پڑا تو وہ زخمی ہو کر کچھ بھی کر سکتا ہے۔"ڈاکٹر وقار آصف،راشد اور ندیم کو سمجھا رہے تھے۔

ریجنری کا اسٹاف اور رمیش کپڑے سے ویگن کے شیشوں کو رگڑ رگڑ کر صاف کر رہے تھے جن پر کہرا جم گیا تھا۔سردی اتنی شدید تھی کہ دو تین منٹ بعد پھر کہرا جم جاتا تھا۔

"سرچ لائٹ چیک کر لی ہے نا؟"ڈاکٹر وقار نے پوچھا۔

"جی ہاں،"رمیش نے کپڑا نچوڑتے ہوئے جواب دیا۔

"یہ کہرا پریشانی پیدا کرے گا۔گاڑی کے شیشے بند ہوں گے تو اندر بھی نمی جمے گی۔"ڈاکٹر وقار نے اندیشے کا اظہار کیا۔

"اب اس کا تو کوئی علاج ہی نہیں ہے۔آج ہی کم بخت اتنا جاڑا اور کہرا پڑنا تھا۔"ندیم نے بڑبڑاتے ہوئے جواب دیا۔

ریجنری کی طرف اندر آنے والی کچی سڑک پر دور ایک لائٹ نظر آئی اور پھر موٹر سائیکل کا دھیما دھیما گھن گھن کرتا شور۔۔۔۔موٹر سائیکل قریب آکر رک گئی اور اس پر سے دو آدمی ہڑبڑائے ہوئے نیچے اترے۔ان میں ایک کے ہاتھ میں بندوق تھی۔

"رینجر صاحب کون ہیں؟"جس کے ہاتھ میں بندوق نہیں تھی اس نے پوچھا۔

"میں ہوں۔"رینجر صاحب گھبرائے ہوئے ان کی طرف بڑھے۔۔۔۔الاؤ کے پاس کھڑے ہونے سے ان کا ماتھا پسینے سے بھیگ گیا تھا،وہ بہت مضطرب نظر آرہے تھے۔

"کیا روگ نے پھر کہیں۔۔۔۔؟"

"جی نہیں۔۔۔۔بجنور سے سوچتا آئی ہے کہ جس ریل کے ڈبے میں آپ کے سسر اور

فیملی ---- "وہ دھیمے دھیمے سرگوشیاں کرنے لگے۔
رینجر صاحب اپنے بچوں کا نام لے لے کر چیخ مار مار کر رونے لگے۔
ڈاکٹر وقار نے انھیں ڈانٹنے کے انداز میں سمجھاتے ہوئے مصنوعی غصے کے لہجے میں کہا۔
"پوری بات تو سن لیں کیا کوئی کیجولٹی ہوئی ہے ----- "
"پوری بات فون پر صاف صاف سنائی نہیں دی۔ بہت دھیمے دھیمے کٹ کٹ کر آواز آرہی تھی۔" ان میں سے معمر شخص بولا۔
"کیا چور ڈاکوؤں والا معاملہ ہے؟" عورت نے ندیم کے پاس آکر گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔
"معلوم نہیں۔ بتار ہے ہیں فون پر آواز صاف نہیں آرہی تھی۔"
"ادھر تو آج کل وہ والے جھگڑے بھی بہت چل رہے ہیں۔" آصف نے دھیمے سے کہا۔
"ہو سکتا ہے ترائی والا معاملہ ہو۔" راشد نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔
"ترائی تو وہاں سے دور ہے یار۔" ندیم بولا۔
"ترائی دور ہے لیکن اصل جگہ تو پاس ہے۔"
"ویسے ہی نامک ٹوئیاں مارنے سے فائدہ! تم لوگ باتیں بہت کرتے ہو۔" اچانک ڈاکٹر وقار کا لہجہ بہت خوفناک ہو گیا تھا۔ سب ان کی طرف حیرت سے دیکھنے لگے۔
اپنے لہجے پر قابو پاتے ہوئے انھوں نے کہا۔
"آپ موٹر سائیکل پر روانہ ہو جائیں۔ اور پہلے بہرائچ جاکر بجنور فون کریں تب سفر کا ارادہ کریں۔ اسٹاف میں سے کسی کو ساتھ لے جائیے۔ موٹر سائیکل خود چلائیے گا۔"
رینجر صاحب کے جانے کے بعد سب لوگ بہت دیر تک خاموش رہے، البتہ لکڑی کا کوئی کوئی ٹکڑا الاؤ میں چٹختا تو سناٹا ٹوٹ جاتا۔
"اصل میں بات یہ ہے۔" ڈاکٹر وقار نے الاؤ کی طرف منھ کر کے ہاتھ تاپتے ہوئے کہا۔
"کہ آج کل ہر طرف ----- یعنی ہر علاقے میں ---- مطلب یہ کہ سب لوگوں میں ---- "
پھر کچھ دیر کی خاموشی کے بعد انھوں نے کہا۔
"اب جس کام سے آئے ہیں اس کی بسم اللہ کی جانی چاہیے۔ چلیے گاڑی میں بیٹھیے۔"
ندیم کے ساتھ آگے ڈاکٹر وقار بیٹھے۔ پیچھے کی سیٹ پر آصف، عورت، راجو اور راشد اور سب سے پچھلی سیٹ پر رمیش اپنی بندوق لے کر بیٹھ گیا۔
راشد نے محسوس کیا کہ عورت بار بار کن انکھیوں سے رمیش اور اس کی بندوق کو دیکھ رہی ہے۔ راشد کچھ سوچ کر مسکرایا لیکن مسکراہٹ کی لکیر ابھی باچھوں تک بھی نہیں گئی تھی کہ راشد کے ماتھے پر لکیریں پڑ گئیں۔ وہ بھی آنکھ بچاکر رمیش اور اس کی بندوق کو دیکھنے لگا۔

جس وقت رینجر صاحب کی بیوی بچوں پر حملے کی اطلاع دی جارہی تھی اس وقت رمیش کا چہرہ کیسا سرخ ہو گیا تھا، آصف نے سوچا۔

پھر کچھ یاد آیا کہ اسی وقت رینجری کے اسٹاف میں سے کسی شخص نے رمیش سے سرگوشی کی تھی کہ بجنور کے علاقے میں آج کل وہ والے جھگڑے بھی تو چل رہے ہیں۔ یہ بات رینجری کے اسٹاف کے کسی شخص نے کہی تھی کہ ندیم نے یا دونوں نے۔ ؟ یا دونوں نے نہیں کہی تھی، صرف میں نے ہی ایسا سوچا تھا۔ یا میں نے ایسا کہا تھا۔ آصف کے ذہن نے کام کرنا بند کر دیا۔ گاڑی اسٹارٹ ہوئی۔

ڈاکٹر وقار نے میگزین میں گولیاں ڈالیں، بولٹ کھینچ کر برابر کیا اور رائفل تیار کر کے چوکس بیٹھ گئے۔

آصف نے اپنی بندوق میں گولی والے کارتوس لگائے اور کھڑکی سے لگ کر بیٹھ گیا۔

راشد نے سرچ لائٹ کا ہینڈل کس کے پکڑا اور آنکھیں ونڈ اسکرین پر گاڑ دیں۔

عورت نے اپنے اوور کوٹ کے بند کو کسا اور راجو کو اپنے پہلو میں چمٹا لیا۔

رمیش نے ایک نالی میں کارتوس بھرا اور کھڑکی کے پاس جم کر بیٹھ گیا۔

"آپ لوگ اب آواز نہ نکالیے گا۔ ہاتھی کے کان بہت تیز ہوتے ہیں۔" ڈاکٹر وقار دھیمے سے بولے۔

"ابھی تو وہ اسپاٹ دور ہے۔" ندیم نے کہا۔

"پھر بھی خاموش رہنے میں کیا ہرج ہے۔"

ندیم نے ڈیش بورڈ کپڑا نکال کر اندر سے شیشہ صاف کیا۔ لیکن باہر بھی کہرا جما ہوا تھا۔ اس نے وائپر آن کیا۔ وائپر کا بلیڈ پورے شیشے پر تیزی سے چلا تب معلوم ہوا کہ شیشے کی اندرونی سطح پر بھی نمی ہے۔ باہر سب کچھ دھندلا دھندلا نظر آرہا تھا۔۔۔۔ صرف ہیڈ لائٹس کی دونوں شعاعیں واضح تھیں۔

"گاڑی کے شیشے کھول دیں تو اندر کی نمی چھٹ جائے۔" ندیم نے کہا۔

"یہ ٹھیک نہیں ہو گا۔ مطلب یہ اس وقت خطرناک ہے۔" ڈاکٹر وقار دھیرے سے بولے۔

"پھر تو اندر ایسے ہی کہرا جمارہے گا۔ باہر کا کچھ بھی صاف نظر نہیں آئے گا۔" راشد نے تشویش کے ساتھ کہا۔

"مجبوری ہے۔" ڈاکٹر وقار نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

آصف نے اندر بیٹھے بیٹھے پوری گاڑی میں نظر دوڑائی اور کہا۔

"سائڈ اور پیچھے کے شیشے سے تو کچھ بھی نظر نہیں آرہا۔"

"ادھر تو باہر کی طرف روشنی بھی نہیں ہے، مطلب ہیڈ لائٹس۔" راشد نے کہا۔
"جیسے جیسے گیرواندی قریب آئے گی کہرا اور جمے گا۔" ندیم بڑبڑایا۔
"تم وائپر آن رکھنا ندیم۔" ڈاکٹر وقار نے ہدایت دی۔"
"وائپر آن رکھوں تو بیٹری کم زور ہو جائے گی۔" ندیم بڑبڑایا۔
گاڑی دھیرے دھیرے چل رہی تھی اور ہیڈ لائٹس کی دھندلی روشنی میں کہرے کے دھوئیں کے مرغولے چکر کھا رہے تھے۔ اور دھندلی روشنی اور کہرے کے مرغولوں کے آگے سڑک کے دونوں طرف پھیلے جنگلوں میں کوئی بھی شے صاف نہیں نظر آرہی تھی۔
"سامنے کیا چھلّل جا رہا ہے؟" ندیم نے سڑک پر نظر جما کر ڈاکٹر وقار سے پوچھا۔
انھوں نے غور سے دیکھا اور بتایا۔
"خرگوش ہے یار۔ کہرے میں سب چیزیں ہیولا سی لگتی ہیں، اپنے سے کئی گنا زیادہ۔"
گاڑی کی آواز سن کر خرگوش رک گیا تھا۔ اس کی آنکھوں پر گاڑی کی روشنی پڑی تو اس کے سر پر دو نیلے بلب روشن ہو گئے۔
"ارے۔۔۔۔ اس کی آنکھیں کیسی چمک رہی ہیں۔" راجو چلّایا۔
"چپ رہو۔۔۔۔ چپ۔" ڈاکٹر وقار نے اسے ڈانٹا۔ پھر پچھے ہاتھ بڑھا کر اس کا شانہ تھپ تھپایا۔
تب اس وقت رمیش کو محسوس ہوا کہ راجو کے علاوہ گاڑی میں بیٹھے ہر شخص نے اسے عجیب نظروں سے دیکھا تھا۔ اس نے باری باری سب کو دیکھا۔
تب راجو کے علاوہ سب کو محسوس ہوا کہ رمیش سب کی طرف ایک عجیب انداز سے دیکھ رہا ہے۔ گاڑی میں اندھیرا تھا لیکن آنکھیں اتنے اندھیرے سے مانوس ہو چکی تھیں۔
راجو کے علاوہ سب کے سب ایک عجیب سی بے چینی محسوس کر رہے تھے۔
راجو نے چہرہ اٹھا کر دھیمے سے پوچھا۔
"ایں آنٹی۔۔۔۔ درونہ جی کے بیوی بچوں کو کس نے مارا؟"
ندیم نے بریک لگا دیے۔ گاڑی ایک جھٹکے سے رکی۔ ندیم نے لائٹ بجھا دیں۔
"سامنے روگ کھڑا ہے۔" اس کے منھ سے اور کچھ نہیں نکلا۔
خوف کی ٹھنڈی ٹھنڈی لہریں سب کی پشت اور شانوں اور کمر کے پاس لہرائیں۔
"کس طرف ہے؟" ڈاکٹر وقار نے رائفل کی سیفٹی "آن" پر کرتے ہوئے اتنے آہستہ سے پوچھا کہ انھیں یقین نہیں ہوا کہ ندیم نے ان کی آواز سنی ہوگی۔
"سڑک کی داہنی سمت سے شاید بائیں طرف آرہا تھا۔ یا شاید سامنے سے دائیں یا بائیں سائڈ میں آرہا تھا۔" ندیم نے بتایا۔

"ندیم لائٹس ــــــ نظر کیسے آئے گا۔" ڈاکٹر وقار نے کہا۔
ندیم لائٹ آن کرنے ہی والا تھا کہ رمیش نے بے چینی کے ساتھ کہا۔
"پچھلے کی طرف ہے، بالکل گاڑی کے پاس۔"
سب نے پیچھے مڑکر دیکھا۔ تاریک سڑک پر کچھ تھا۔
آصف نے اچانک اپنا ہاتھ بڑھاکر ڈاکٹر وقار کا شانہ دبایا ــــــ
"ادھر ہے، میری طرف کی کھڑکی کے پاس ــــــ بالکل قریب۔"
سب نے اس کھڑکی کے پار دیکھا تو وہاں دھند میں کوئی دھبّہ سا کھڑا محسوس ہوا۔ سب کے دلوں کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔
"میری کھڑکی پر اس نے ابھی باہر سے سونڈ رکھی تھی۔" راشد نے سرگوشی میں بتایا۔
راشد کی طرف والی کھڑکی کے باہر کوئی لمبی سی شے بل کھاتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔
ندیم نے سب کو چپ رہنے کا اشارہ کیا اور بتایا۔
"میری طرف والا روگ تو ابھی بھی وہیں کھڑا ہے شاید۔"
"کیا تمھیں بالکل صاف نظر آرہا ہے۔ نشانہ لے کر فائر کر سکتے ہو؟" ڈاکٹر وقار نے پوچھا۔
"بالکل صاف تو نہیں۔ شیشہ بہت دھندلا ہے۔ شیشہ گرا دوں؟"
"ہرگز نہیں ــــــ بالکل نہیں۔ شیشہ گرتے ہی اسے ہماری سانسیں تک صاف سنائی دیں گی۔"
عورت نے بچے کے چہرے کی طرف دیکھا جو دہشت سے سفید پڑ گیا تھا۔ وہ پہلو میں گھسا گردن گھما گھما کر چاروں طرف کے شیشوں کے پار دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔
عورت نے آنکھیں بند کر کے اپنے چہرے کے ٹھنڈے پسینے پر ہاتھ پھیرا اور اوور کوٹ پر ہاتھ خشک کیا۔
"وہ آہستہ آہستہ ادھر ہی بڑھ رہا ہے۔" رمیش نے ڈرے ڈرے لہجے میں کہا۔ وہ شیشے سے ناک چپکائے مسلسل ویسے ہی بیٹھا ہوا تھا۔
آصف اور راشد نے بھی اپنے شیشوں کے پار دیکھتے ہوئے یہی بات بتائی۔
ڈاکٹر وقار خوف، شش و پنج اور اضطراب کی ملی جلی کیفیت میں بولے۔
"یہ دیکھو کہ کس کا دانت ٹوٹا ہوا ہے۔ اصلی روگ وہی ہے۔ اور خطرناک بھی صرف وہی ہے۔"
سب نے اندھیرے میں آنکھیں گڑا گڑا کر دیکھا اور بتایا کہ ان کی طرف والے شیشے کے پاس جو ہاتھی ہے اس کا دانت ٹوٹا ہوا الگ رہا ہے۔"
"کیا کئی روگ ہیں۔" ڈاکٹر وقار جیسے خود سے بولے۔ انھوں نے عورت کی جانب سوالیہ

انداز میں دیکھا جس نے ابھی ابھی ڈرتے ڈرتے باہر جھانکا تھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئی تھیں۔ ڈاکٹر وقار کو اپنے شیشے پر باہر سے ایک دھمک سی محسوس ہوئی یا شاید دل زور سے دھڑکا تھا یا شاید رائفل کا کندہ جوتے سے ٹکرایا تھا۔ انھوں نے شیشے کے باہر گاڑھے اندھیرے میں جھانکا۔

اندھیرے میں محسوس ہوا کہ اس کی آنکھیں سرخ تھیں، ایک دانت ٹوٹا ہوا تھا اور سونڈ اوپر اٹھی ہوئی لہرا رہی تھی۔

انھوں نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔

"فائر نہیں ہوگا۔ ہم اتنے ایک ساتھ نہیں مار سکتے۔ ہماری گاڑی چاروں طرف سے رو گوں میں گھری ہوئی ہے جب تک شیشے بند ہیں، عافیت ہے کہ آواز باہر نہیں جا رہی ہے، ورنہ اب تک یہ ہم سب کو کب کے کچل چکے ہوتے۔"

"تو اب کیا کریں۔" ندیم نے بیٹھی بیٹھی کم زور آواز میں پوچھا۔

سب کو ایک عجیب طرف کے خوف، بے بسی اور شرمندگی کا احساس ہو رہا تھا۔

"ہم لوگ۔۔۔۔ صبح ہونے کا انتظار کر سکتے ہیں۔" عورت نے پھنسی پھنسی آواز میں دھیمے سے کہا۔

سب کے سب اس بات سے مطمئن ہو گئے تھے اگر اسی وقت بچے نے جیب سے نکال کر ایک چیز ہاتھ میں نہ لے لی ہوتی اور پھر بے ہوش نہ ہو گیا ہوتا۔۔۔۔

ندیم نے کسی سے آنکھیں ملائے بغیر گھوم کر ہاتھ بڑھا کر مٹھی کھولی۔ اس چیز کو دیکھا۔ ایک لمحے تک کچھ سوچا اور پھر مٹھی ویسے ہی بند کر کے مڑا اور باقی سب کی طرف سر جھکا کر خاموش بیٹھ گیا۔

○ ○ ○

"نمبردار کا نیلا" کا بقیہ:-

لیکن کسی کو بھی یہ سوچنے کی سکت نہیں تھی کہ نیلا گاؤں میں ہی ہے یا گاؤں کے پاس کسی کھیت میں چھپا ہوا ہے یا گاؤں کی سرحد سے دور قصبے تک پہنچ گیا ہے یا قصبے سے بھی آگے خون کے چھینٹے اڑاتا شہر کی طرف بھاگ رہا ہے یا اس سے بھی آگے۔۔۔۔!!!

○ ○ ○

شمس الحق عثمانی

مجہول نگر کا قصہ

کتاب "ڈار سے بچھڑے" کا تخلیق کار: سید محمد اشرف، عصر حاضر کے اسی قصے کا راوی ہے جو میرے ظاہر و باطن میں بھی برپا ہے۔ افرادِ قصّہ کے دور قریب جاتے آتے چہرے، میرے بھی جانے انجانے جذبوں کی پرچھائیوں سے واضح اور مبہم ہیں --- اور ان کے احساسات کی پھیلتی سمٹتی لہروں کے پراسرار منفرد و مرکب رنگ، اپنے میرے دیدہ و نادیدہ نقوش کو برصغیر کی زمین اور ذہن کے کینوس پر یوں ابھارتے ہیں کہ ان کی عیاں و مخفی: بیگانگی، خوف اور مجہولیت کے گہری سیاہ لکیروں کا ہمہ جہت پھیلاؤ اور گھناؤنا پن عصر حاضر کو اپنے آپ میں لتھیڑ لیتا ہے۔ انسانی وجود کے باہر و باطن میں سرسراتی لکیروں کی کراہت اور اپنے دور کے افراد کی پور پور میں ہونکتے خلا کی ہیبت خیز گونج کو لفظا کر، یہ راوی چاہتا ہے کہ عہد حاضر کی معذور فہم اس "نقش ظاہر" (رومی) کے وسیلے سے سوچ بچار سکے کہ یہ قصہ آخر کیوں پیش آرہا ہے؟ --- اور جب صاحبان بصیرت جان چکے کہ "لکھے پڑھے کچھ ہوت نہ ---- " (پہپی بلگرامی) تو پھر قصے لکھنے کا پر زیاں عمل کس لیے؟

آئندہ سطور میں درج اقتباس ایک کتاب کے پہلے افسانے "آدمی" کا آغاز ہے اور اقتباس دو آخری افسانے "روگ" کا اختتامی حصہ۔ یہ گویا کتاب کا "مطلع" اور "مقطع" ہیں، یہ جن افراد کی کیفیت بیان کر رہے ہیں انھیں راوی نے بھلے ہی سرفراز، انوار، رمیش، آصف، راشد، وقار، عورت، ندیم اور بچہ کہا ہو --- اور یہ بھلے ہی ایک شہر کے کمرے اور جنگل میں کھڑی ایک وین میں بیٹھے ہوں مگر یہ سب اک ایسے خوف کی گرفت میں ہیں جس کا حقیقی منبع و مخرج ان ہی جیسے دو پیروں پر چلنے والے افراد ہیں۔

==== ایک ====

"کھڑکی کے نیچے انھیں گزرتا ہوا دیکھتا رہا۔ پھر یکایک کھڑکی زور سے بند کی۔ مڑکر پنکھے کا بٹن آن کیا۔ پھر پنکھے کا بٹن آف کیا۔ میز کے پاس کرسی پر ٹک کر دھیمے سے بولا۔

"آج تو کل سے بھی زیادہ ہیں۔ روز بڑھتے ہی جارہے ہیں۔"

سرفراز نے ہتھیلیوں پر سے سر اٹھایا اور انوار کو دیکھا۔ "تم نے تو دہی دن دیکھا ہے نا! میں تو بہت دن سے دیکھ رہا ہوں۔ کھڑکی بند رکھوں تو گھٹن ہوتی ہے، کھول دوں تو دل اور

زیادہ گھبراتا ہے۔ لگتا ہے جیسے سب ادھری آرہے ہیں۔" سرفراز چپ ہو گیا۔
پھر ایک لمحے کے بعد بولا۔
"آج تم سے اتنے برسوں کے بعد ملاقات ہوئی تھی تو دل کتنا خوش تھا کہ پھر یہ لوگ ----"

"میں نے تمھیں سفر کا واقعہ بھی تو بتایا تھا۔ میں بھی صرف دو ہی دن سے تھوڑے ہی دیکھ رہا ہوں۔ ادھر گاؤں میں بھی آج کل یہی عالم ہے۔ کچھ اندازہ ہی نہیں ہو پاتا کہ کیا ہو گا۔"
(ص: ۱۱)

==== دو ====

"وہ آہستہ آہستہ ادھری بڑھ رہا ہے۔" رمیش نے ڈرے ڈرے لہجے میں کہا۔۔۔
آصف اور راشد نے بھی اپنے اپنے شیشوں کے پار دیکھتے ہوئے یہی بات بتائی۔
ڈاکٹر وقار خوف، ششش و پنج اور اضطراب کی ملی جلی کیفیت میں بولے:
"یہ دیکھو کہ کس کا دانت ٹوٹا ہوا ہے۔ اصلی روگ وہی ہے۔ اور خطرناک بھی صرف وہی ہے۔"
سب نے اندھیرے میں آنکھیں گڑا گڑا کر دیکھا اور بتایا کہ ان کی طرف والے شیشے کے پاس جو ہاتھی ہے اس کا دانت ٹوٹا ہوا لگ رہا ہے۔
"کیا کئی روگ ہیں۔" ڈاکٹر وقار جیسے خود سے بولے۔ انھوں نے عورت کی جانب سوالیہ انداز میں دیکھا جس نے ابھی ابھی ڈرتے ڈرتے باہر جھانکا تھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئی تھیں۔ ڈاکٹر وقار کو اپنے شیشے پر باہر سے ایک دھمک سی محسوس ہوئی یا شاید دل زور سے دھڑکا تھا یا شاید رائفل کا کندہ جوتے سے ٹکرایا تھا۔ انھوں نے شیشے کے باہر گاڑھے اندھیرے میں جھانکا۔
اندھیرے میں محسوس ہوا کہ اس کی آنکھیں سرخ تھیں، ایک دانت ٹوٹا ہوا تھا اور سونڈ اوپر اٹھی ہوئی لہرا رہی تھی۔
انھوں نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا:
"فایر نہیں ہو گا۔ ہم اتنے ایک ساتھ نہیں مار سکتے۔ ہماری گاڑی چاروں طرف سے روگوں میں گھری ہوئی ہے۔ جب تک شیشے بند ہیں، عافیت ہے کہ آواز باہر نہیں جا رہی، ورنہ اب تک یہ ہم سب کو کب کے کچل چکے ہوتے۔"
"تو اب کیا کریں۔" ندیم نے بیٹھی بیٹھی کمزور آواز میں پوچھا۔
سب کو ایک عجیب طرح کے خوف، بے بسی اور شرمندگی کا احساس ہو رہا تھا۔

ہم لوگ صبح ہونے کا انتظار کر سکتے ہیں۔ عورت نے پھنسی پھنسی آواز میں دھیمے سے کہا

سب کے سب اس بات سے مطمئن ہو گئے تھے اگر اسی وقت بچے نے جیب سے نکال کر ایک چیز ہاتھ میں نہ لے لی ہوتی اور پھر بے ہوش نہ ہو گیا ہوتا۔۔۔

ندیم نے کسی سے آنکھیں ملائے بغیر گھوم کر ہاتھ بڑھا کر بچے کی مٹھی کھولی۔ اس چیز کو دیکھا۔ ایک لمحے تک کچھ سوچا اور پھر مٹھی ویسے ہی بند کر کے مڑا اور باقی سب کی طرف سر جھکا کر خاموش بیٹھ گیا۔" (ص: ۲۵۴ تا ۲۵۵)

"مطلع" کا راست بیانیہ بتا رہا ہے کہ شہر میں واقع کرے کی کھڑکی سے نظر آتے افراد کا یہ عالم شہری میں نہیں گاؤں میں بھی ایسا ہی ہے۔ اسی باعث جھلا کر، انور نے کھڑکی زور سے بند کی ہے، اس کا ہاتھ پنکھے کا بٹن آف آن کرتے وقت، عمل کے درست و نادرست کی تمیز کھو چکا ہے اور اس کے ہم نشین سرفراز کے حواس یہ نوٹ کرنے سے معذور ہو گئے ہیں کہ پنکھا بند ہو چکا ہے ۔۔۔ اور علامتی اسلوب کا حامل "مطلع" بتا رہا ہے کہ تاریک جنگل میں رکی وین کے افراد اک ایسے اجتماعی خوف کے اسیر ہو گئے ہیں جو انھیں بند شیشوں کے ادھر محیط اندھیرے کو، بے شمار ہاتھیوں کی شکل میں دکھا رہا ہے۔

برسوں بعد ملنے والے دوست نے بتایا:

"سرفراز! تمھاری خالہ کی بیٹی کی شادی ہے۔ خالہ نے بلا کر کہا کہ سرفراز تو ہمیں بالکل بھول گیا۔ تم اس سے جا کر کہو کہ خالہ اور خالو اسے دیکھنے کو بہت بے تاب ہیں۔ اسے شادی میں ضرور آنا ہے۔" (ص: ۱۵)

"شادی کب ہے؟"

"پرسوں بارات آئے گی۔"

ارے ان حالات میں تاریخ کیوں رکھ دی خالہ نے۔ تم نے دیکھا نہیں، کیسے دیوانے ہو رہے ہیں سب، لال بھبھو کا چہرے لیے ٹرکوں اور ٹریکٹروں پر جلوس نکال رہے ہیں۔ ہاتھوں میں ہتھیار اور کیسے نفرت انگیز نعرے۔۔۔۔" (ص: ۱۶)

حالات کی پیدا کردہ کیفیت میں گھرے سرکاری افسر سرفراز نے بیوی بچوں کو شہری میں چھوڑا اور اپنی کار سے اس گاؤں کے لیے روانہ ہوا جہاں اس نے خالہ کے گھر رہ کر تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ گاؤں سے کچھ دور قصبے میں واقع کالج میں پڑھنے جاتا تھا۔ سرفراز کی کار تقریباً ڈھائی تین سو کلو میٹر سفر کے بعد، سورج ڈھلے، قصبے کے قریب پہنچی۔

==== تین ====

" راستے میں نہر کے پل پر اچانک کچھ لوگوں نے گاڑی کے سامنے آکر گاڑی روکنے کا اشارہ کیا ۔ دونوں کے دل بیٹھ گئے ۔ کیوں کہ بچاؤ کے لیے ان کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا ۔ سامنے پل پر ٹرک اور ٹریکٹروں کا جلوس آرہا تھا ۔ لوگ دیوانہ وار نعرے لگا رہے تھے اور ایک عجیب جذبے کے ساتھ آگے بڑھتے چلے آرہے تھے ۔

دونوں کے ذہنوں نے کام کرنا بند کردیا ۔ دونوں گاڑی میں بیٹھے رہے ۔ جلوس برابر سے گزرتا رہا ۔ گاڑی رکوانے والے وہیں کھڑے کھڑے نعروں کا جواب دیتے رہے ۔ سرفراز نے آیتہ الکرسی یاد کی ۔

جلوس گزر گیا تو وہ لوگ بھی زور زور سے کچھ باتیں کرتے جلوس کے ساتھ بڑھ گئے ۔

سرفراز سخت ذہنی دباؤ میں تھا ۔ اس لیے گاڑی فوراً اسٹارٹ نہیں کر سکا ۔ دونوں بیٹھے ایک دوسرے کا ڈر محسوس کرتے رہے ۔

سرفراز نے گاڑی اسٹارٹ کی تو انوار بولا:

کھلے عام سڑک پر اکاد کا آدمیوں سے کچھ نہیں کہتے ۔ اکاد کا آدمیوں سے نپٹنے کے لیے شہر شہر گاؤں گاؤں لوگوں کو تیار کیا گیا ہے ۔ پچھلے جمعے کو جب احمد نہر کی پٹری سے باغ کی طرف مڑا تو اچانک کسی نے پیچھے سے ۔ ۔ ۔ ۔ "

سرفراز کے بدن میں سر سے پاؤں تک سنسنی دوڑ گئی ، وہ خالی ذہن کے ساتھ گاڑی چلاتا رہا ۔ ۔ ۔

جب وہ نہر کی پٹری پر مڑے تو سورج ڈوب رہا تھا ۔ سرفراز کو اپنا بچپن یاد آگیا ۔ تب اسے یہ خاموش نہر ، سنسان پٹری سائیں سائیں کرتے باغ کتنے بھیانک لگتے تھے ۔ " (ص: ۱۶ تا ۱۷)

ان دنوں انوار یہ کہہ کر اس کی ہمت بڑھاتا تھا:

" تم ڈرنا مت سرفراز ۔ نہر کی پٹری پار کرو گے تو باغ میں داخل ہونے پر کوئی نہ کوئی آدمی مل ہی جائے گا ۔ " (ص: ۱۲)

==== چار ====

" وہ روزانہ اسی بھروسے پہ کالج سے گھر آنے کی ہمت کر رہا تھا کہ شاید آج بھی آدمی مل جائے ۔ اگر یہ آسرا نہ ہوتا تو وہ روپیٹ کر کالج سے نام کٹا کر اپنے گاؤں واپس جا چکا ہوتا ۔

لیکن آدمی روزانہ نہیں ملتا ۔ ایک دن کالج سے نکلتے نکلتے دیر ہو گئی ۔ ۔ ۔ اس نے سورج کی طرف دیکھا جو آج قصبے میں ہی زرد ہو گیا تھا ۔ ۔ ۔ نہر کی پٹری پر مڑتے ہی اس نے اپنے بدن میں یہ سوچ کر سنسنی محسوس کی کہ اب تو باغ سے آدمی بھی چلا گیا ہوگا ۔ اس نے ماتھے کا پسینہ پونچھا ۔ ۔

سورج ڈوبے دیر ہو چکی تھی اور باغ کے درخت دھیمی آواز میں شام کی سرگوشیاں شروع کر چکے تھے۔ وہ باغ میں داخل ہوا۔ آگے بوڑھے فجری کے پاس سے گزرتے ہوئے اس کا دل زور سے دھڑکا۔ یہی جنات بابا کا اصلی گھر ہے۔

داہنی سمت سے آواز آئی۔

"آج بہت دیر کی بیٹیا۔"

ارے۔۔۔۔ آدمی موجود ہے۔ اسے اتنی خوشی اس دن بھی نہیں ہوئی تھی جس دن انگلش والے ماسٹر صاحب نے "مائی کاؤ" لکھنے پر اسے "ویری گڈ" دیا تھا۔ اس نے آدمی کی طرف نگاہیں اٹھائیں وہ جھونپڑی کے قریب درختوں کے پاس کہرے میں کھڑا تھا۔ اس نے غور سے دیکھا۔ اس کا پھاوڑا اس کے ہاتھ میں تھا جسے وہ زمین پہ ٹکائے ہوئے تھا۔ دوسرے ہاتھ سے وہ انگوچھے کو کانوں پہ برابر کر رہا تھا۔ کہرے میں لپٹا، دھوتی کرتا انگوچھا پہنے یہ آدمی اسے حضرت خضر علیہ السلام کا نوکر لگا۔

"آدمی سلام۔" وہ چہک کر بولا۔

"جیتے رہو بیٹیا۔ پٹواری ساب کو ہماری رام رام کہنا۔ اندھیرا مت کیا کرو۔"

(ص: ۱۴ تا ۱۵)

==== پانچ ====

"اس نے اچانک گاڑی کے بریک لگائے۔ ہیڈ لائٹ کی روشنی میں ایک بڑا سا بندر ہتھیلیاں زمین پر ٹیکے ان کی طرف دیکھ کر خر خر کر رہا تھا۔ دونوں مسکرائے۔ بندر بھاگ کر درخت پر چڑھ گیا۔ اوپر کسی گدھ نے پہلو بدلا تو پھڑپھڑاہٹ کی آواز ہوئی۔ سرفراز نے سوچا: پہلے اس پھڑپھڑاہٹ سے کتنا ڈر لگتا تھا۔

"تو یہ احمد دکان دار والا معاملہ کب ہوا تھا؟

"آج چار دن ہو گئے۔"

"ارے۔۔۔۔" سرفراز کی ہتھیلیاں اسٹیرنگ وہیل پر نم ہو گئیں۔

"کیا ہوا؟" انوار نے پوچھا۔ حالاں کہ اسے معلوم تھا کہ کیا ہوا۔۔۔۔

پٹڑی سے اترتے ہی باغ سامنے آگیا۔

سرفراز نے گاڑی بیک کر کے لگادی اور باغ کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔

کہرے میں لپٹا باغ بہت دن بعد دیکھا تھا۔ آج اسے باغ سے کوئی خوف محسوس نہیں ہوا لیکن ایک عجیب سا سناٹا دونوں کے اندر خاموشی سے اتر آیا تھا جو باتیں کرنے کے باوجود ٹوٹ نہیں رہا تھا۔" (ص: ۱۷ تا ۱۸)

خاموش نہر، سنسان پٹڑی، سائیں سائیں کرتا باغ اور درختوں پر گدھوں کی پھڑپھڑاہٹ

سے ابھرنے والا خوف اگر لڑکپن میں محسوس ہو تو لڑکپن کے ساتھ ہی رخصت ہو جاتا ہے اور لپنے پیچھے، متاثر لبوں کے لیے ایسی مسکراہٹیں اور دل کے لیے ایسی یادیں چھوڑ جاتا ہے جو برسوں برسوں بعد بھی لطافتوں اور لذتوں ہی کے ساتھ ابھرتی ہیں۔ اس کے برعکس، لڑکپن کے اسباب خوف پختہ عمر کے لمحہ، حاضر میں لال بھبھو کا چہروں، ہاتھوں میں بلند ہتھیاروں، نفرت انگیز نعروں اور ایک عجیب جذبے کے ساتھ آگے بڑھتے لوگوں کی دہشت خیزی کے تسلسل میں دکھائی دیے ہیں تو ایسا خوف پیدا کر رہے ہیں جو افراد کے رگ و ریشے میں برس ہا برس باقی رہنے اور پنپنے بڑھنے کے لیے کمیں گاہ بنا رہا ہے۔ ایسے خوف کا ہر دورہ متاثرین کے لبوں پر زہر خند اور دلوں پر لہو رنگ غبار کی نئی تہیں چھوڑ جاتا ہے۔ وہ تہیں، چہروں اور چیزوں کے معانی بدل کر انھیں دہشت و فنا کا منبع و مخزج بنا دیتی ہیں۔

==== چھ ====

"دونوں جب جنات بابا والے پرانے درخت کے پاس سے گزر رہے تھے تو سرفراز نے اچانک رک کر انوار کا ہاتھ اتنے زور سے دبایا کہ دکھن ہڈیوں تک پہنچ گئی۔

انوار نے سرفراز کی طرف دیکھا۔ سرفراز نے آنکھ کے اشارے سے باغ کی بڑی مینڈھ کی طرف اشارہ کیا۔ انوار کو کچھ نظر نہیں آیا۔ اندھیرے میں وہ اس جگہ کا تعین بھی نہیں کر پایا جہاں سرفراز نے اشارہ کیا تھا۔

سرفراز نے اس بار اور بھی زیادہ زور سے ہاتھ دبایا اور اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑے پکڑے واپس مڑا اور کھینچنے والے انداز میں دوڑتا، گرتا، سنبھلتا باغ سے باہر نکلا۔ گاڑی میں انوار کو دھکیل کر گاڑی اسٹارٹ کی اور فل اسپیڈ پر نہر کی پٹری پر چڑھا کر پل پار کر کے پکی سڑک پر آ گیا سرفراز شدید کھنچاؤ کے عالم میں گاڑی چلا رہا تھا۔ اس کا چہرہ ہولے ہولے کانپ رہا تھا اور پورا بدن پسینے میں شرابور ہو چکا تھا۔

"اب دور نکل آئے ہیں۔ بتاؤ تو سہی کیا بات تھی؟" سرفراز نے گاڑی روک دی۔

"باغ کی مینڈھ پر درختوں کے درمیان ایک آدمی جھکا کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی ہتھیار تھا جسے وہ زمین پر ٹکائے ہوئے تھا۔" (ص: ۱۸)

جس طرح افسانہ "آدمی" میں سرفراز کے متاثرہ حواس اور باغ پر حاوی اندھیرے نے ماضی قریب کے حضرت خضر علیہ السلام کے نوکر کو عہد حاضر کا قابیل صفت آدمی اور اس کے پھاوڑے کو قابیلی آلہ بنا دیا ہے اسی طرح افسانہ "ردگ" کے اختتام پر جنگل میں رکی ویگن کے ساتوں سواروں کے مختل حواس، ان کے گرد محیط اندھیرے کو بے شمار پاگل ہاتھیوں کی شکل دے رہے ہیں۔ ان کے حواس کی انتہائی کیفیت کے اسباب میں افسانہ نگار بتا چکا ہے کہ کینڈا سے

لکھنو آئی ہوئی عورت ، جب بردلی ضلع بہرائچ کے لیے روانہ ہو رہی تھی تو اس کے والدین نے بہت سخت تاکید کی تھی کہ "ہر حالت میں مغرب کے وقت تک واپس ہو جانا کیوں کہ اس علاقے میں آج کل......... " (ص: ۲۴۳) اور خود کو نفسیاتی تسلی کا بہانہ فراہم کرتے ہوئے ، بیٹی کی "حفاظت کے لیے "اس کے دس گیارہ برس کے بھانجے کو ساتھ کر دیا تھا۔ ڈاکٹر وقار کے کمپاؤنڈر رمیش نے بتایا تھا کہ "..... جب سے ترائی کے علاقے میں سکون ختم ہوا ہے وہ بھی خوف زدہ ہے اور رات کو ہائی وے کے سفر سے بچتا ہے کیوں کہ پچھلے اتوار پیلی بھیت میں پورن پور کے پاس کے ایک بس روک کر.......... "(ص: ۲۴۳) ------ اور جب یہ سب لوگ رنجری میں تھے تو ان کے حواس کو اس شدید کیفیت کی راہ پر ڈالنے کی تازہ ترین اور واضح ترین وجہ وہ ایک مبہم خبر بنی جس کی ترسیل کے لیے دو موٹر سائیکل سوار ، بہرائچ سے چل کر وہاں آئے تھے۔ انھوں نے رنجر صاحب سے کہا تھا:

==== سات ====

"..... بجنور سے سوچنا آئی ہے کہ جس ریل کے ڈبے میں آپ کے سسر اور فیملی..... " وہ دھیمے دھیمے سرگوشیاں کرنے لگے۔

رنجر صاحب اپنے بچوں کا نام لے لے کر چیخ مار مار کر رونے لگے.....

"کیا چور ڈاکوؤں والا معاملہ ہے ؟ " عورت نے ندیم کے پاس آکر گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"معلوم نہیں۔ بتا رہے ہیں فون پر آواز صاف نہیں آرہی تھی۔

"ادھر تو آج کل وہ والے جھگڑے بھی بہت چل رہے ہیں۔ "آصف نے دھیمے سے کہا۔

"ہو سکتا ہے ترائی والا معاملہ ہو۔ "راشد نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"ترائی تو وہاں سے دور ہے یار۔ "ندیم بولا۔

"ترائی دور ہے لیکن اصل جگہ تو پاس ہے۔ "...

"اصل میں بات یہ ہے۔ "ڈاکٹر وقار نے الاؤ کی طرف منہ کر کے ہاتھ تاپتے ہوئے کہا۔ " "کہ آج کل ہر طرف......... یعنی ہر علاقے میں..... مطلب یہ کہ سب لوگوں میں...... "(ص: ۲۴۹ تا ۲۵۰)

یوں ، ان سب کے ذہن و دل میں نہ جانے کب کب سے رچتا بستا خوف اور خلجان ، اندرونی تہوں سے ابھرا ابھر کر ان کے حواس کو اپنی گرفت میں لینے لگا تھا ------ تو تب ---- افسانہ نگار نے انھیں منزل مقصود تک لے جانے کے لیے ویگن میں سوار کرایا تھا۔

==== آٹھ ====

"ندیم کے ساتھ آگے ڈاکٹر وقار بیٹھے۔ پیچھے کی سیٹ پر آصف، عورت، راجو اور راشد اور سب سے پچھلی سیٹ پر رمیش اپنی بندوق لے کر بیٹھ گیا۔

راشد نے محسوس کیا کہ عورت بار بار کن انکھیوں سے رمیش اور اس کی بندوق کو دیکھ رہی ہے۔ راشد کچھ سوچ کر مسکرایا لیکن مسکراہٹ کی لکیر ابھی باچھوں تک بھی نہیں گئی تھی کہ راشد کے ماتھے پر لکیریں پڑ گئیں۔ وہ بھی آنکھ بچا کر رمیش اور اس کی بندوق کو دیکھنے لگا۔

جس وقت رنجر صاحب کے بیوی بچوں پر حملے کی اطلاع دی جارہی تھی اس وقت رمیش کا چہرہ کیسا سرخ ہو گیا تھا، آصف نے سوچا۔

پھر کچھ یاد آیا کہ اسی وقت رنجری کے اسٹاف میں سے کسی شخص نے رمیش سے سرگوشی کی تھی بجنور کے علاقے میں آج کل وہ والے جھگڑے بھی تو چل رہے ہیں۔ یہ بات رنجری کے اسٹاف کے کسی شخص نے کہی تھی کہ ندیم نے یا دونوں نے؟ یا دونوں نے نہیں کہی تھی، صرف میں نے ہی ایسا سوچا تھا۔ یا میں نے ایسا کہا تھا۔ آصف کے ذہن نے کام کرنا بند کر دیا... (ص: ۲۵۰تا۲۵۱)

بجنور سے موصولہ خبر کے ابہام اور خبر لانے والوں کی سرگوشیوں کی مدد سے افسانہ نگار نے ان ویگن سواروں کے ذہن و دل میں اترتی اس بے گانگی کو قاری کا احساس بنانے کی کوشش کی ہے جو بر صغیر کے باشندوں کو، بے شمار کوائف کے باعث، ایک بار پھر اپنی گرفت میں لے رہی ہے۔

مبہم خبر کو "عام چور ڈاکوؤں والا معاملہ" سمجھنے والی غیر مقیم ہندوستانی عورت کے ذہن میں جب اپنے والدین کی "سخت تاکید" کے ساتھ "وہ والے جھگڑے"، "ترائی والا معاملہ" اور "اصل جگہ" کے کنائے بھی آمیز ہو گئے اور اس نے، الاؤ کی طرف منہ کیے ڈاکٹر وقار کی زبان سے یہ بظاہر نامکمل مگر ایک جامع خاکہ بنانے والے، جملے سنے "کہ آج کل ہر طرف......... یعنی ہر علاقے میں..... مطلب یہ کہ سب لوگوں میں...... "۔۔۔۔ تو وہ ویگن میں سوار ہونے کے بعد "بار بار کن انکھیوں سے رمیش اور اس کی بندوق کو" دیکھنے لگی۔

عورت کو رمیش کے رمیش ہونے کی خبر ڈاکٹر وقار نے اس وقت دی تھی جب وہ اور اس کا بھانجا راجو، ان کی ویگن میں لفٹ لے کر بیٹھے تھے۔ اس وقت گویا ڈاکٹر وقار کو اپنا وقار ہونا اور ندیم، آصف اور راشد کا ندیم، آصف اور راشد ہونا، کچھ ناکافی اور مجہول و پر ضرر محسوس ہوا تھا۔ تب ہی تو وہ اپنے اور ساتھیوں کے وجود کو بامعنی و بے ضرر ثابت کرنے کے لیے "زور زور سے رمیش کا نام لے لے کر اس سے کوئی بے ربط سی بات کرنے لگے تھے۔" (ص: ۲۴۳)

یہ محسوس کرتے ہوئے کہ عورت بار بار کن انکھیوں سے رمیش اور اس کی بندوق کو دیکھ رہی ہے، راشد نے کچھ سوچا اور اپنی سوچ میں پایا کہ رمیش کی ہم مذہب عورت کا یہ عمل اتنا

ہی فطری اور بر حق ہے جتنا اس جیسی کسی صورت میں اپنے ہم مذہب کو ساتھ پاکر خود اس کا ایسا ہی عمل ہو سکتا ہے لیکن اس سوچ کی راستی اور اس میں عورت اور اپنی مماثلت سے پیدا شدہ طمانیت "ابھی باچھوں تک بھی نہیں گئی تھی" کہ رمیش کے رمیش اور بندوق بہ دست رمیش ہونے کی حقیقت نے، اس طمانیت کو کہیں بیچ ہی میں فنا کر دیا اور اس کی جگہ ماتھے پر باطنی خلجان و تشویش کی لکیریں نمودار ہو گئیں۔ گویا بندوق بہ دست رمیش اس وقت عورت کے لیے ایک ڈھارس اور راشد کے لیے تشویش و خلجان کا سبب ہے، لیکن رمیش کیوں کہ ڈاکٹر وقار کا معاون کار اور اس وقت شکاری پارٹی کا ساتھی ہے اس وجہ سے راشد اسے اور اس کی بندوق کو "آنکھ بچاکر" دیکھ رہا ہے۔

افسانہ نگار نے موصولہ خبر کے ابہام اور ویگن میں رمیش کی موجودگی کے ذریعے ایک اور فرد یعنی آصف کی ذہنی کیفیت کو بھی منعکس کیا ہے۔ جب راشد "آنکھ بچاکر" رمیش کو دیکھ رہا تھا تو آصف نے سوچا: جس وقت رینجر صاحب کے بیوی بچوں پر حملے کی اطلاع دی جا رہی تھی اس وقت رمیش کا چہرہ کیسا سرخ ہو گیا تھا۔ (اقتباس: آٹھ) رمیش کے سرخ چہرے کی یاد کا یہ بیان بھلے ہی راشد اور عورت کے احساسات کے بعد ہوا ہو لیکن، ان سطور کے بعد، آصف کے ذہن کی جو کیفیت واضح کی گئی ہے اسے پڑھ کر لگتا ہے کہ رمیش کا سرخ چہرہ اسی ساعت سے آصف کے ذہن میں دہک رہا ہے جب رینجر کے کنبے پر حملے کی خبر آئی تھی۔ تب سے اب تک کے عرصے میں رمیش کا چہرہ، آصف کے ذہن کو اس قدر مختل کر چکا ہے کہ اسے یہ بھی یاد نہیں کہ بجنور کے علاقے میں چل رہے جھگڑوں کی بات خود اسی نے "دھیمے سے" (اقتباس: سات) کہی تھی۔ اس کا ذہنی اختلال اس بات کو کبھی رینجری اسٹاف کے کسی شخص سے منسوب کر رہا ہے تو کبھی ندیم سے، کبھی دونوں ہی سے اور کبھی اپنی زبان سے ادا شدہ بات کی بے آواز سوچ سے۔

رمیش، راشد، عورت، آصف، ندیم اور وقار کے باطن میں برپا کیفیات کی نقش گری سے افسانہ نگار اپنے قاری پر اس باطنی حقیقت کا انکشاف کر رہا ہے کہ موصولہ خبر کے ابہام، خبر لانے والوں کی دھیمی دھیمی سرگوشیوں اور رینجری میں ہوئی اشاروں کنایوں پر مبنی باتوں کے زخموں نے جذبوں اور احساسات کے تار چھیڑ چھیڑ کر ویگن کے سب سواروں کو حیوانوں کی جنگل نامی بستی سے وہاں پہنچا دیا ہے جہاں انسانوں کو آباد کہا جاتا ہے۔۔۔۔ لیکن وہاں "آج کل ہر طرف .... یعنی ہر علاقے میں...... مطلب یہ کہ سب لوگوں میں......" بیگانگی، خوف اور مجہولیت کا جنگل اُمڈ آیا ہے۔

انوار، سرفراز اور ویگن سواروں پر محیط اندھیروں کی چادر، اس کتاب کے دیگر سترہ میں سے کم از کم دس اور افسانوں کے افراد کا ذہن و دل اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہے۔۔۔ گویا بیگانگی، خوف اور مجہولیت کی جس کیفیت کو کتاب کا "مطلع" اور "مقطع" منعکس کر رہے ہیں اس

کی لہریں دیگر کم و بیش دس افسانوں میں بھی کار فرما ہیں ۔۔۔ اور یوں ان لہروں نے "مطلع" اور "مقطع" کو باہم مربوط کرتے ہوئے ایسا "قطعہ" خلق کیا ہے جس میں، بالخصوص ہندوستانی اقلیت سے منسوب اور بالعموم پورے برصغیر میں زندگی سے دوچار، افراد کا ظاہر و باطن ملفوظ ہو گیا ہے۔

==== نو ====

"شام اندھیری ہوتی جا رہی تھی اور انھیں ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ سورج اب کبھی نہیں نکلے گا ۔ انھوں نے اندازہ لگایا کہ محلے میں ان کے خاندان سمیت سو مسلمان ہوں گے جب کہ ہندوؤں کے گھروں کی تعداد دو سو سے زیادہ ہے ۔ ان کے چاروں لڑکے ماں کے پاس بیٹھے انھیں دلاسے دے رہے تھے ۔ حالاں کہ سب جانتے تھے کہ صورت حال کیا ہے ۔ رات پوری طرح امنڈ آئی تھی اور فساد کا خوف مکمل طور سے مسلط ہو چکا تھا ۔ آہٹ ہونے پر کئی دفعہ وہ بڑے دروازے کی درازوں سے جھانک کر دیکھ چکے تھے ۔ باہر سارے تاریک سائے انھیں فسادی لگ رہے تھے ۔ دس پونے دس بجے کے قریب باہر کچھ ہل چل سنائی دی ۔ کچھ لوگ گالیاں بکتے، قہقہے لگاتے گزر رہے تھے ۔ ان کا دل بہت دیر تک دھڑکتا رہا ۔ بڑے بیٹے نے بتایا "لوگ سنیما دیکھ کر واپس آرہے ہیں، کوئی خطرے کی بات نہیں ۔ آپ گھبرائیں نہیں ۔"

"ہاں ہاں ۔ ظاہر ہے ۔ گھبراتا کون ہے ۔ تم لوگ اپنی ماں کے پاس رہو ۔ اور دیکھو خبر دار جو کوئی کھڑکی دروازہ کھولا ۔" وہ نہیں چاہتے تھے کہ لڑکوں پر ان کا بھرم ٹوٹ جائے ۔ رات بیتی جا رہی تھی اور تمام فسادات یاد آرہے تھے ۔ تقسیم ہند کا فساد ان کے دماغ میں کیچوے کی طرح بلبلا رہا تھا اور اس کے علاوہ ہزاروں چھوٹے بڑے واقعات انھیں یاد آرہے تھے جو ان تک اخباروں اور ریڈیو کے ذریعے پہنچے تھے وہ سب کچھ یاد کرتے رہے اور ان کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوتے رہے ۔ باری باری انھوں نے ایک بار پھر سارے دروازے اور کھڑکیاں دیکھ ڈالیں ۔ باہری کھڑکی کی ایک سلاخ نکل گئی تھی اور اتنا بڑا خلا ہو گیا تھا کہ ایک آدمی اس میں سے نکل جائے ۔ انھوں نے فوراً چاروں لڑکوں کو بلایا اور ایک چارپائی اس انداز میں کھڑی کر کے لگا دی کہ وہ خلا بند ہو گیا ۔

ابھی شناخت نہیں ہوئی ہوگی ورنہ اب تک فساد شروع ہو گیا ہوتا ۔

انھوں نے دعا مانگی "اے خدا صبح تک شناخت نہ ہو پائے، میں کل ہی بیوی بچوں کو لے کر گاؤں چلا جاؤں گا ۔ وہاں میری بہت ضرورت ہے اور جب فساد کی آگ ٹھنڈی ہو جائے گی تو واپس آجاؤں گا ۔ میں دو نفل نماز شکرانہ پڑھوں گا اگر لاش ہندو کی نہیں ہوئی تو ۔" (ص: ۶۱ تا ۶۲)

یہ ظاہری و باطنی احوال امیر میاں کا ہے جو افسانہ "کعبے کا ہرن" میں مرکزی کردار ہے ۔

اس احوال کا پس منظر یہ ہے کہ امیر میاں کا پڑوسی اور ان کے دیوان خانے کا ہم نشست ، ماجد میاں ، ایک صبح آکر بتاتا ہے کہ پڑوس میں ایک قتل ہو گیا ہے ۔ "لاش کی شناخت نہیں ہو سکی ہے لیکن لاش کے ہاتھ میں اسٹیل کا کڑا ہے ۔ "(ص: ۶۰) ۔

اندھیری ہوتی شام میں سورج کے آئندہ طلوع سے قطعاً نا امید ، امیر میاں اپنے چاروں بیٹوں اور بیوی کو بھی اپنی ہدایات کے ہاتھوں ان اندھیروں میں کھینچے لے رہے ہیں جو تقسیم ہند کے فساد اور پھر اخباروں اور ریڈیو کے ذریعے معلوم شدہ ہزاروں چھوٹے بڑے واقعات کے سبب ان کے باطن میں گھر کرتے کرتے .... ہر رگ و ریشے میں لمبی رات بن گئے ہیں اک کڑی گہری مہیب رات ۔۔ جو آج لاش کے ہاتھ میں پڑے اسٹیل کے کڑے کی ہیبت بن کر ، باہر بھی اس قدر حاوی ہو گئی ہے کہ گلی کے سائے امیر میاں کو فسادی لگ رہے ہیں ۔ اور دیوان خانے کے حاضرین میں بہ آواز بلند یہ دعا کرنے والے امیر میاں کہ "خدا نہ کرے کہ اپنی قوم کا کوئی فرد کم ہوا ہو ۔ " (ص: ۶۰) اپنے باہر محیط رات میں امکانی شدت سے سہم کر دل ہی دل میں نذر مانتے ہیں کہ "میں دو نفل نماز شکرانہ پڑھوں گا اگر لاش ہندو کی نہیں ہوئی تو ۔ " (اقتباس: نو) ۔۔۔ اور نہیں جانتے کہ یہ نذر ، باہر کی رات باطن تک پھیل جانے کے باعث وجود پذیر ہوئی ہے ۔

==== دس ====

"معلوم نہیں کے صدیوں کے بعد صبح ہوئی ۔ امیر میاں نے سوچا شاید فسادی صبح ہونے کا ہی انتظار کر رہے تھے ۔ ورنہ اب تک شناخت تو ہو چکی ہو گی ...

باہر بالکل خاموشی تھی ، جیسے کسی حادثے کا پیش خیمہ ہو ۔ ۸ بجے کے قریب یکایک دروازے پر بڑے زور کی دستک ہوئی ۔ انھوں نے بڑی یاسیت کے ساتھ لڑکوں کی طرف دیکھا اور چاروں کو لے کر دروازے پر پہنچے ۔ دروازے پر جا کر بھرائی ہوئی آواز میں انھوں نے پوچھا ۔ "کون ہے ؟ "

"میں ہوں شیخ صاحب ۔ دروازہ کھولیے ۔ "

"ماجد میاں " انھوں نے سرگوشی کے انداز میں بیٹوں کو بتایا ۔ ماجد میاں کے بال بچے تو ہیں نہیں ۔ انھیں کسی بات کا ڈر نہیں ۔ دروازہ کھول کر انھوں نے ماجد میاں کو پھرتی سے اندر کیا اور جلدی سے دروازہ بند کر کے ان کی طرف مڑے ۔ مڑتے وقت انھوں نے پوری کوشش کی کہ ماجد میاں پر ان کی دہشت کا اظہار نہ ہو سکے ۔

"سب خیریت ہے ماجد میاں ؟ "

"سب خدا کا شکر ہے آپ کی دعا ہے ۔ میں گزر رہا تھا سوچا آپ کو اطلاع دے دوں کہ لاش کی شناخت ہو چکی ہے اور وہ لاش مسلمان لڑکے کی ہے ۔ کوئی رقابت کا چکر تھا ۔ مگر یہ

دروازے کیوں بند کر رکھے تھے آپ نے۔" ماجد میاں نے ایک ساتھ بہت سی باتیں کہہ ڈالیں۔

"کیا بھئی - سچ کہیے گا، واللہ کسی مسلمان کی لاش تھی؟ یعنی ہندو کی لاش نہیں تھی - واہ واہ خوب سنائی آپ نے آکر ------ ارے وہ دروازے کی بھی خوب کہی آپ نے - بات یہ ہوئی کہ آج ہم لوگ بری طرح سوئے، ابھی ابھی جاگے ہیں بس - جب آپ آئے، بس یقین کیجیے کہ آپ آئے جب ہی جاگے -"

"ارے بھئی بیگم - آج چائے کے ساتھ ذرا حلوہ بھی بھیج دینا - بھئی ماجد میاں آئے ہیں -"

اور اس دن وہ اپنے باہر کے کمرے میں جسے انھوں نے دیوان خانے کا نام دے رکھا تھا بیٹھے اپنے دوستوں سے کہہ رہے تھے:

"آج اپنی قوم کا ایک فرد اور کم ہو گیا - ہم لوگ تعزیتی جلسہ کریں گے اور مرحوم کے لیے دعائے مغفرت کریں گے -"

امیر میاں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں - اب امام "سورہ فاتحہ" بھی شروع کر چکا تھا - امیر میاں نے بہت بے بسی کے ساتھ "سبحنک اللھم -----" یاد کرنے کی کوشش کی لیکن دماغ نے پھر راستہ بدل لیا، انھیں بہت شدت کے ساتھ یاد آیا کہ ابھی اس نماز کے بعد وہ نماز بھی پڑھنا ہے خدا کا شکر ادا کرنا ہے کہ لاش مسلمان کی نکلی -

نیچے نظر گئی تو ریشم کا کر بند ویسا کا ویسا ہی پنڈلیوں کو چھوتا ہوا جھول رہا تھا - انھیں اپنے چہرے پر پھر بڑے بڑے بال اگتے ہوئے محسوس ہوئے - انھیں ایسا لگا جیسے وہ مسجد میں ننگے کھڑے ہیں بالکل ننگے -" (ص: ۶۳ تا ۶۴)

"بہت ہوشیار" اور "زمانہ سازی کے فن" (ص: ۵۸) سے واقف امیر میاں بد باطن جس مجہولیت کے اسیر ہیں اس کی ایک جہت کی وضاحت، اقتباس دس کا وہ حصہ کر رہا ہے جو "کیا بھئی سچ ----" سے شروع ہو کر "------ دعائے مغفرت کریں گے -" پر ختم ہوا ہے - ظاہر ہے کہ یہ جملے اسی مجہولیت کو ڈھانپنے کے لیے ادا ہوئے ہیں جسے امیر میاں اپنے حاضر باشوں کی نظر سے چھپانے کے لیے ان پر اپنی اخباری فہم و فراست کی دھاک بھی جماتے ہیں اور اسی کے اخفا کے لیے "مرتے وقت انھوں نے پوری کوشش کی کہ ماجد میاں پر ان کی دہشت کا اظہار نہ ہو سکے - "کیوں کہ کل ہی جب وہ بیٹھک میں کہہ رہے تھے کہ ہم "جھگڑے سے نہیں ڈرتے - ایک ایک دس دس کے لیے کافی ہو گا -" (ص: ۶۰) تو ماجد میاں وہاں موجود تھے - امیر میاں اپنی اس مجہولیت کو ایک حد تک سمجھتے ہیں - اسی باعث کل کی گفتگو میں خود کو نڈر ثابت کرتے وقت ان کا لہجہ بالکل "سرد تھا اور آج وہ ماجد میاں سے آنکھ ملاتے ہوئے کترا رہے ہیں - آج وہ اچھی طرح سمجھ گئے ہیں کہ گذشتہ رات میں ذہن و دل پر جو کچھ بیتی ہے وہ ان کے کھوکھلے پن کی گونج تھی لیکن وہ اس کے اخفا پر تب بھی قادر تھے اور اب بھی ہیں --- مگر اقتباس دس کے آخری دو پارے، افسانے کے دو

اولین پاروں سے مربوط ہو کر، امیر میاں کی مجہولیت کا جو رخ کھول رہے ہیں اس کی پردہ داری کی کوئی کوشش بھی ممکن نہیں کیوں کہ اس رخ کا سامنا خود امیر میاں کی ذات کو ہے۔

افسانے کے آغاز میں، امیر میاں کو، جماعت کی صف میں شامل ہوتے وقت خیال آیا تھا کہ "ابھی تو اس نماز کے بعد ایک اور نماز بھی پڑھنا ہے۔" (ص: ۵۷) اس "ایک اور نماز" کی لرزہ خیزی نے ہی امیر میاں کو مجہولیت کے اس رخ سے دوچار کیا ہے جس کے روبہ رو وہ اتنے بے وجود ہو گئے ہیں کہ خانہ، خدا میں حاضر ہوتے ہوئے بھی بے حضور ہیں، نماز میں ثناءِ خداوندی کا محل قرات اور پھر اس کی لفظیات بھی ان کے ذہن سے ساقط ہو گئی ہیں اور وہ اتنے ضعیف العمل ہو گئے ہیں کہ پاجامے سے نکلے اور پنڈلیوں کو چھوتے کمر بند کے بارے میں بس سوچ ہی پا رہے ہیں کہ "کیا میں کمر بند اندر کر لوں؟" (ص: ۵۷) وہ اس وقت اپنے ان ہم جنسوں اور ہم مذہبوں کے ساتھ صف بستہ بھی ہیں جن کے گھروں کے درمیان مکان ہونے سے انھیں "بڑی تقویت رہتی تھی (ص: ۵۸) اور ان کی ہم نشینی میں وہ محسوس کرتے رہے ہیں کہ زمین داری بھلے ہی جاتی رہی ہو مگر "ہندوستان کے تمام مسلمانوں کے بے تاج بادشاہ وہی ہیں۔" (ص: ۵۸) --- مگر --- جب انھوں نے "اپنی قوم" کی عافیت کے لیے دعا کی تو ان کا لہجہ "سرد" (ص: ۵۸) تھا اور جب پچھلی رات وہ اپنے ہی زائیدہ خوف کے فساد میں مبتلا تھے تو سوچ رہے تھے کہ "میں کل ہی بیوی بچوں کو لے کر گاؤں چلا جاؤں گا۔ وہاں میری بہت ضرورت ہے۔" (اقتباس: نو) امیر میاں کی اسی عافیت کوشی اور منافعت کی کوکھ سے اس نذر نے جنم لیا ہے جو در اصل اپنے ہم مذہبوں سے بالواسطہ بیر پر مبنی ہے اور جس کی ادائیگی کا خیال یہ حقیقت کھول رہا ہے کہ وہ اپنے ہم جنسوں کے ساتھ رہنے، بسنے اور صف بستہ ہونے کے باوجود، ان میں سے نہیں۔ کیوں کہ ان کی ہوشیاری پر مبنی قرابت داری اور ہم دردی اپنے ہی ہم مذہب پڑوسیوں سے باطنی بیگانگی کا خاتمہ نہیں کر سکی، تب ہی تو وہ گاؤں جانا چاہتے تھے --- اسی منافقت کے باعث ان کا دماغ نماز میں بھی راستہ بدل رہا ہے اور اسی باطنی منافقت کی پاداش میں ان کا ظاہر بھی بدلنے لگا ہے --- اور وہ ایسی غیر اشرف مخلوق بن گئے ہیں جس کے چہرے پر بڑے بڑے بال اگتے ہیں اور جو بے لباس رہتی ہے۔

مصنف کی خلق کردہ صورتِ حال میں افراد قصہ کی کیفیات مرحلہ وار شدید سے شدید تر ہوتے ہوتے اس عروج کو جا چھوتی ہیں جہاں ان کی مخفی مجہولیت کا نقش برہنہ روبہ رو آکر سوچ میں ڈال دیتا ہے کہ یہ نہ جانے کب سے اور کیسے کیسے پردوں میں ڈھکی چھپی اندر اندر پل پل کر بڑھ بڑھ کر افراد کو اپنا لقمہ بنا رہی تھی؟ یہاں تک کہ آج کل ہر طرف ---- یعنی ہر علاقے میں ---- مطلب یہ کہ سب لوگوں میں ---- پنپتی یہ دیمک سی ہمارے وجود کو چاٹے لے رہی ہے ---- نہیں معلوم کہ کب اور کس کیفیت کی انتہائی شدت، ہم لوگوں میں سے بھی کس کے اشرف خد و خال کا چھلکا پار کر کے، ہم اپنا باطن سے باہر تک کا تسلط ثابت کر دے۔

"آدمی" اور "روگ" کے افراد سب لوگوں میں پھیلتی باہمی بیگانگی کی تاریکیاں منعکس کر رہے ہیں ---- "کعبے کا ہرن" میں امیر میاں ان "آہوان کعبہ" (میر تقی میر) کے نمائندے ہیں جنھیں اپنائیت کے طفیل میں پر لطف گھاؤ سہنے کی ارفع تر سیرابی کے بجائے تحفظ پسندی کا ادھورا پن، وجود کی حقیقی معنویت سے ناشناسی، زیادہ عزیز ہے ---- اور ---- "لکڑ بگھا ہنسا" میں (منو بھیا کے علاوہ) تمام لوگ: پاپا، امی، بڑی اپی، چھوٹی اپی، بھائی جان، اسی قبیلے کے افراد ہیں جس کی گزند نے امیر میاں کے باہر باطن دونوں مسخ کر دیے۔

==== گیارہ ====

"کھڑکی کے نیم تاریک شیشوں کے پرے بچی کھچی رات تیز اور سرد ہواؤں کے ساتھ بہتی رہی۔ کمرے کے اندر بہت حبس تھا اور نیلے بلب کی مدھم روشنی بہت ہیبت ناک اور پر اسرار محسوس ہو رہی تھی۔ منو بھیا کے علاوہ سب لوگ اپنے اپنے بستروں میں پڑے جاگ رہے تھے۔ سب کو معلوم تھا کہ منو بھیا کے علاوہ سب لوگ جاگ رہے ہیں لیکن ایک جانے بوجھے خوف کی بنا پر کوئی اس بات کا اظہار نہیں کر رہا تھا کہ اسے معلوم ہے کہ دوسرے لوگ جاگ رہے ہیں اور یوں جاگنے والا ہر شخص تنہا نہ ہوتے ہوئے خود کو سب سے دور محسوس کر رہا تھا۔

سب کے دل زور زور سے دھڑک رہے تھے اور لگ رہا تھا جیسے کوئی چیز نرخرے پر رینگ رہی ہو۔

تبھی بڑی اپی نے سانس روکے روکے بہت پر اسرار آواز میں امی سے پوچھا:

"کیا منو بھیا کو لکڑ بگھا دکھانے کے لیے چڑیا گھر لے جانا ضروری ہے امی؟"

سب نے ایک جھرجھری سی محسوس کی۔ بڑی اپی کی آواز کی گونج دوسرے ہی لمحے نیلی تاریکیوں میں ڈوب گئی تھی۔ لیکن ان کے سوال کے بعد جتنے پل گزرے وہ جاگنے والوں کے دلوں کی تیز تیز دھڑکنوں کو گنتے رہے۔

امی نے پہلو بدل کر گھوم کر اسی طرف دیکھا جدھر سے آواز آئی تھی اور انھیں احساس ہوا کہ کمرے کے حبس میں مزید اضافہ ہو گیا ہے، باہر کی ہوائیں کچھ اور تیز اور گمبھیر ہو گئیں۔ انھوں نے بڑی اپی کی کبھی کبھی آنکھوں میں غور سے جھانکا اور کھو کھلی آواز میں کہا:

"ہاں ---- اور کیا جنگل لے جاؤں گی منو کو لکڑ بگھا دکھانے ----"

"جنگل نہیں امی ---- امی ---- آپ جاگ رہی ہیں نا؟ آپ کو کچھ سنائی دے رہا ہے؟"

بڑی اپی بھرائی ہوئی آواز میں بولیں۔

"سو جاؤ بیٹا۔ تم نیند میں ہو جو ایسے سوال کر رہی ہو۔ چلو سو جاؤ، رات بہت بیت گئی ہے۔"

پاپا، بھائی جان اور چھوٹی اپی، جو خاموش پڑے جاگ رہے تھے۔ جانتے تھے کہ بڑی اپی نے یہ سوال نیند میں نہیں کیا ہے۔ خود امی کو معلوم تھا کہ ایسے سوال نیند میں نہیں ہوش کے عالم میں کیے جاتے ہیں لیکن کسی نے بڑی اپی کے سوال کی ہمت افزائی اس ڈر سے نہیں کہ کہیں امی صحیح جواب نہ دے دیں کہ جاگنے والوں میں یہ صحیح جواب سننے کی ہمت کسی میں نہیں تھی۔ خود بڑی اپی سوال کرنے کے بعد سانس روکے دعا کرتی رہیں کہ امی خاموش رہیں۔

باہر ہوا نے سانس بھری اور اچانک سب کے لاشعور میں پھر وہی بھیانک آواز گونجی چٹ چٹ۔۔۔۔چٹ چٹ۔۔۔۔چٹ چٹ۔

اس آواز کو محسوس کرتے ہی سب کے دل اتنی شدت سے دھڑکے جیسے سینے سے نکل پڑیں گے۔ ایسا لگا جیسے نیم تاریک کمرے میں کوئی سایہ ڈول رہا ہے۔ سانس روکے، بدن سکوڑے تمام جاگنے والے صبح ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ امی نے پہلو بدل کر منو بھیا کو لپٹا لیا تاکہ خود ان کا خوف کم ہو اور پھر سوچا کہ یہ سب منو بھیا کی وجہ سے ہوا۔" (ص: ۳۱ تا ۳۲)

یہ سب منو بھیا کی وجہ سے یوں ہوا:

جب ریلوے لائن کے اس پار دیہات میں ایک لکڑ بگھا لاگو ہو گیا اور ہر دوسرے تیسرے ایک آدھ واردات کی خبر ملنے لگی تو ان مکانوں میں زیادہ خطرہ محسوس کیا جانے لگا جو ریلوے لائن کے پاس بسے ہوئے تھے۔ گیارہ بارہ برس کے منو بھیا کا گھر بھی ریلوے لائن کے بالکل قریب ہے۔ منو بھیا کو معلوم ہوا کہ لکڑ بگھا چھوٹے بچوں کا گوشت بہت شوق سے کھاتا ہے۔ آج شام منو بھیا نے پھر یہ خبر سنی تھی کہ ریلوے لائن پار کر کے لکڑ بگھا ایک بچے کو اٹھا کر لے گیا۔ یہ خبر سن کر ان کے چہرے پر سفیدی دوڑ گئی، وہ شام کو گھر سے باہر نہیں نکلے، گھر کے اندر ہی سہمے سہمے، ڈرے ڈرے خاموش گھومتے رہے۔ منو بھیا کو جب بھائی جان کے دوست اختر نے ڈھارس دی کہ وہ لکڑ بگھے سے گفتگو کرے گا کہ وہ اس علاقے میں نہ آئے تو یہ تصور کر کے منو بھیا کے خوف میں مزید اضافہ ہو گیا کہ لکڑ بگھا باتیں بھی کر لیتا ہے۔ منو بھیا کو اپنے دوست لوگوں سے معلوم ہوا تھا کہ لکڑ بگھا دیوار کے برابر اونچا ہوتا ہے، تبھی تو دیوار پھلانگ کر بچوں کو اٹھا لے جاتا ہے۔ منو بھیا رات کو سونے لیٹے تو ان خاکوں نے مل جل کر ذہن میں ایک نہایت خوفناک صورت اختیار کر لی۔ منو بھیا نے لکڑ بگھے کو خواب میں دیکھا، وہ دیوار اتنا اونچا تھا، اس نے اپنی لمبی گردن جھکا کر انھیں سونگھا اور اپنے بڑے بڑے سینگ ان کے چبھو دیے۔ یہ خواب دیکھ کر منو بھیا کی چیخ نکل گئی۔ چیخ سے سارا گھر جاگ پڑا۔ منو بھیا کو دیکھنے کے لیے سب گھر والے ان کے پلنگ کے پاس آ گئے۔ منو بھیا کے چہرے کا سارا خون جیسے غائب ہو گیا تھا، آنکھیں خوف کے مارے پھٹی پڑ رہی تھیں اور ہونٹ بالکل خشک ہو گئے تھے۔۔۔ اور تب منو بھیا کے دل سے لکڑ بگھے کا خوف نکالنے کے لیے ان کی امی نے بتایا کہ لکڑ بگھا کیسا ہوتا ہے۔ (الخ)

یہ سب منو بھیا کی وجہ سے اس طرح ہوا:

جب ان کی امی یہ بتانے والی تھیں کہ لکڑ بگھا کیسا ہوتا ہے تو گذشتہ دس پندرہ روز کے دوران اطراف کی آبادی کی طرح اس گھر کے تمام لوگوں کے دلوں میں بھی لکڑ بگھے کا خوف پوری طرح جاگزیں ہو چکا تھا۔ خوف کے گرفتار لوگ دس پندرہ روز سے سرِ شام ہی دروازے بند کر کے گھروں میں قید ہو جاتے تھے۔ تمام لوگ دھیان رکھتے تھے کہ چھوٹے بچے نظر کے سامنے ہی رہیں۔ منو بھیا کے گھر والے سونے کے لیے لیٹنے لگے تھے تو دس پندرہ روز سے طاری خوف کے باعث بھائی جان نے اٹھ کر تمام دروازوں کی کنڈیاں دیکھی تھیں، کھڑکیوں کی سٹکنیاں بند کی تھیں اور آواز دے کر اپنے ہم خوف پڑوسیوں کو ہوشیار رہنے کی تلقین کی تھی۔ کچھ دیر بعد، خوف کے مارے پاپا نے ایک بار پھر دروازوں کے پاس جا کر آہٹ لی تھی اور کنڈیوں کو دیکھا تھا۔

دس پندرہ روز سے جاری خوف کی تہوں میں لپٹے لوگ ہر لحاظ سے بند کمرے کے بستروں میں دبک کر نیند میں ڈوب گئے۔ "باہر دسمبر کی سرد رات تھی اور ہوائیں بہت تیز تھیں کہ اچانک منو بھیا کی چیخ سنائی دی اور سارا گھر جاگ پڑا۔" (ص: ۳۴) پاپا، بھائی جان، بڑی اپی، چھوٹی اپی، سب کے سب پلنگ کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے۔ دس پندرہ روز سے اطراف و جوانب میں پھیلے خوف کو روز بہ روز، دم بہ دم، اپنے باطن میں جذب کرتے لوگوں نے منو بھیا کے خد و خال میں گویا اپنے آپ کو دیکھا ان کے چہرے میں سب کے چہروں کا سارا خون جیسے غائب ہو گیا تھا، ان کی آنکھوں میں سب کی آنکھیں پھٹی پڑ رہی تھیں اور ان کے ہونٹوں میں سب کے ہونٹ بالکل خشک ہو گئے تھے۔

یوں منو بھیا کے تن بدن کی معرفت سب لوگوں نے اپنے باطن میں پاؤں پھیلاتے، خون چوستے ہزار پائے کے اثرات اپنی آنکھوں دیکھ لیے ــــ تو باہر باطن کے منظر کھلے اور سب لوگوں کے جملہ حواس، شدت کے اس عروج کو چھونے لگے جہاں باہر کا باطن اور باطن کا باہر، ایک دوسرے میں آر پار نظر آتے ہیں ــــ ایسے میں ــــ امی نے منو بھیا کے دل سے لکڑ بگھے کا خوف نکالنے کے لیے بتایا کہ وہ کیسا ہوتا ہے تو جملہ حواس کی شدتوں سے دوچار سب لوگوں نے صاف صاف جان لیا کہ اپنی شکل اور عمل میں لکڑ بگھا کیسا ہوتا ہے۔

==== بارہ ====

"ــــ یہ لکڑ بگھا جو ہوتا ہے نا، یہ شیر کی طرح بہادر تو ہوتا نہیں کہ سامنے سے حملہ کرے۔ نہایت کمینہ جانور ہوتا ہے۔ ہمیشہ پیچھے سے لپٹ پڑتا ہے۔ یہ جانتا ہے کہ لوگ اسے کتا سمجھیں گے، اسی لیے دھوکے ہی دھوکے میں بالکل قریب پہنچ جاتا ہے اور چپ چاپ موقعے کا انتظار کرتا ہے، بس ذرا آنکھ بچی ــــ بس ذرا آنکھ بچی ــــ اور ــــ اور ــــ"

ہاں بس ایک پہچان ہوتی ہے ۔ جب یہ چلتا ہے تو چٹ چٹ کی آوازیں آتی ہیں ۔ لیکن لوگ باگ یہ آوازیں اپنی چال کے شور میں سن نہیں پاتے ۔ اس لیے ضروری ہے کہ راستے میں جب تم دیکھو کہ کوئی چیز تمھارے پیچھے چپ چاپ لگی ہے اور کتے کی طرح معصوم اور وفادار بنی پیچھے چلی آرہی ہے تو اس وقت ۔۔۔۔ رک کر غور سے سنو کہ اس کے پیروں سے چٹ چٹ کی آوازیں تو نہیں آرہی ہیں ۔ لیکن منو بیٹے لوگ خود اپنی چال کے شور میں یہ آوازیں سن ہی نہیں پاتے ۔ اور ۔۔۔۔ " (ص: ۳۶ تا ۳۷)

امی بتارہی تھیں ، منو بھیا کو ۔۔۔۔ اور سب اپنے اپنے بستروں پر لیٹے ہوں ہاں کررہے تھے تاکہ منو بھیا کو اطمینان رہے کہ سب جاگ رہے ہیں ۔ امی کی بات کے لگ بھگ آخری مرحلے میں ، منو بھیا نے غنودہ ہوتے ہوئے فرمائش کی تھی:

==== تیرہ ====

"امی ۔۔۔۔ ہمیں لکڑ بگھا دکھائیے گا؟"

" ۔۔۔۔ ہاں ۔۔۔۔ ہاں ۔۔۔۔ اب کے لکھنو چلیں گے تو چڑیا گھر میں دیکھ لینا ۔ اب سو جاؤ بیٹے ، رات بہت بیت گئی ہے ۔"

سب جاگنے والے مدھم نیلی تاریکی میں آنکھیں کھولے سوچ رہے تھے کہ وہ ہوں ہاں کرنا کیوں بھول گئے ہیں ؟ گھٹی ہوئی فضا میں سب یہی سوچتے رہے کہ اچانک ایسا محسوس ہوا جیسے کمرہ روشن ہو گیا ہو ۔ تبھی بڑی اپی کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا ۔ انھیں لگا جیسے ان پر ابھی ابھی انکشاف ہوا ہو کہ سب لوگوں کی سراسیمگی اور خوف کا کیا سبب تھا ۔ انھوں نے گردن موڑ کر اندازہ کیا کہ منو بھیا کے علاوہ سب لوگ جاگ رہے ہیں لیکن کوئی ظاہر نہیں کر رہا کہ وہ جاگ رہا ہے ۔۔۔۔ (ص: ۳۷)

دس پندرہ روز سے طاری خوف کے باعث ، عروج پر پہنچی ہوئی شدت احساس نے روشنی کا جھماکا بن کر اس رات کو لاشعور کی بیداری کے لمحے میں منقلب کر دیا ۔۔۔۔ یہ سب ، منو بھیا کی فرمائش کی وجہ سے ہوا ۔

اگلی صبح ان سب لوگوں پر شعور کا سورج طلوع ہوا:

اپنے کاموں میں مصروفیت کے دوران انھیں بار بار ایسا لگا " جیسے کہیں سے ایک پر اسرار آواز آرہی ہے ۔ چٹ چٹ ۔۔۔۔ چٹ چٹ ۔۔۔۔ چٹ چٹ ۔۔۔۔ " جیسے کہیں قریب میں لکڑ بگھا چل رہا ہو ۔ پاپا اور بھائی جان اپنے اپنے کام پر گئے تو انھیں بار بار یہ آواز مختلف مقامات پر سننے کو ملی ۔۔۔۔ ہاتھ روک کر گھبرا کر پیچھے پلٹ پڑتے لیکن اپنے پیچھے اپنا کوئی عزیز دوست کھڑا نظر آتا ۔۔۔۔ " (ص: ۳۸) کالج میں بڑی اپی اور چھوٹی اپی کی سہیلیاں ان سے بہت ہنس ہنس کر باتیں

گزر رہی تھیں تو اس وقت دونوں نے وہی دہشتناک پر اسرار آواز سنی۔" (ص: ۳۸) پاپا کو اپنے دوست خواجہ صاحب کے پیروں سے وہی آوازیں آتی محسوس ہوئیں (ص: ۳۹) بھائی جان ڈرائنگ روم میں اپنے دوست اختر کو کسی بات پر مشورہ دے رہے تھے تو چھوٹی اپی نے دیکھا کہ بھائی جان کی آنکھیں بہت وحشی ہو گئی تھیں اور ان کی باچھوں سے نکیلے دانت باہر نکل پڑے تھے۔ (ص: ۴۰) اور جب وہ ڈرائنگ روم سے گھر میں آرہے تھے تو چھوٹی اپی نے چٹ چٹ کی آوازیں بھی سنیں۔ بھائی جان نے بتایا کہ انھیں "آج اپنے کئی دوستوں کی ٹانگوں سے ایسی ہی آوازیں سنائی دیں۔ ابھی ابھی جب اختر گیا تب بھی ----" (ص: ۴۰)

" ---- اور جب سب لوگ سونے کے لیے لیٹ گئے تو منو بھیا کے علاوہ سب نے سوچا۔ اپنی دنیا کے متعلق سوچا۔ اپنے دوستوں کے بارے میں سوچا۔ اپنے گرد پھیلے ہزاروں افراد کے متعلق سوچا۔ اور پھر ---- اپنے متعلق سوچا ----" (ص: ۴۰)

اس سوچ بھری رات کے طفیل ان سب پر انکشاف ذات کا سورج طلوع ہوا۔

صبح سب سے پہلے پاپا کو ایسا لگا جیسے ان کی ٹانگوں سے چٹ چٹ کی آوازیں آرہی ہیں۔ پھر امی، بڑی اپی، چھوٹی اپی اور بھائی جان کو بھی ایسا ہی لگا۔ اسی دوران خبر ملی کہ رات پڑوس کے گاؤں میں وہ لکڑ بگھا پکڑ لیا گیا اور اب اسے گاؤں والے شہر کی طرف لا رہے ہیں۔ جب منو بھیا جاگے تو پاپا انھیں " اندر والے کمرے میں لے گئے اور بہت سی ٹافیاں دے کر ان سے ڈرتے ڈرتے پوچھا ---- " منو بھیا جب تم چلتے ہو تو تمھاری ٹانگوں سے چٹ چٹ کی آوازیں تو نہیں آتیں ----؟"

" نہیں پاپا ---- آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں ---- میں کوئی لکڑ بگھا ہوں کیا؟" منو بھیا نے جواب دیا۔" (ص: ۴۳)

سیکڑوں دیہاتیوں کی بھیڑ زنجیروں میں بندھے ہوئے لکڑ بگھے کو لیے ہوئے ان کی کھڑکی کے سامنے سے گزری تو لکڑ بگھے نے کھڑکی کی طرف دیکھا۔ ایک لمحے تک ایسے ہی دیکھتا رہا۔ پھر اچانک لکڑ بگھا بہت زور سے کھل کھلا کر ہنسا ----" (ص: ۴۳) اور جب ایک دیہاتی نے اس کی کمر پر لاٹھی ماری تو " بھیگی بھیگی آنکھوں سے اس نے کھڑکی سے جھانکتے ہوئے سب گھر والوں کو باری باری دیکھا۔ اور ایک بار پھر بہت زور سے کھل کھلا کر ہنسا اور چٹ چٹ کرتا بھیڑ کے ساتھ آگے بڑھ گیا ---- تھوڑی دیر کے بعد پاپا کھڑکی کے پاس آئے تو ابھی بھیڑ کے قدموں سے اڑی ہوئی دھول فضا میں چھائی ہوئی تھی اور دھول کے پرے منو بھیا اپنے ہم عمر بچوں کے ساتھ زور زور سے باتیں کرتے اسکول جا رہے تھے۔" (ص: ۴۴)

اور ---- یہ بھی منو بھیا ہی کی وجہ سے ہوا:

" ---- پاپا نے آنکھیں بند کر کے خدا سے دعا کی کہ منو بھیا اور ان کے ساتھیوں کی

مانگوں سے کبھی چٹ چٹ کی آوازیں نہ آئیں ----۔ جب وہ واپس مڑے تو سب گھر والے گردنیں نیچے ڈالے خاموش بیٹھے تھے۔ سب اپنی ذات سے لتنے مایوس اور اداس لگ رہے تھے جیسے کسی وبا کے پھیلنے کی خبر سن لی ہو۔ سب ایک دوسرے کو نیچے ہی نیچے شرمندہ نگاہوں سے دیکھتے رہے ----۔" (ص: ۴۴)

اس گھر کے باشندوں کی طرح، افسانہ "روگ" کے اختتام پر ویگن کے تمام سوار بھی سر جھکائے خاموش بیٹھے ہیں۔ انھیں لگ رہا ہے کہ ہماری گاڑی چاروں طرف سے روگوں میں گھر گئی ہے اور یہ لوگ بھی ایسے لگ رہے ہیں جیسے کسی وبا کی خبر سن لی ہو۔ امیر میاں کو اپنے غیر اشرف مخلوق بننے کا احساس ہوا ہے اور یہاں سب گھر والوں پر منکشف ہوا ہے کہ ہم میں دراصل لکڑ بگھا سانس لے رہا ہے۔ "روگ" میں راجو نامی بچے کو ویسا خوف لاحق نہیں جیسا کہ دیگر لوگ اپنے ہم سفروں سے محسوس کرنے لگے ہیں اور یہاں صرف منو بھیا کی مانگیں چٹ چٹ کی آوازوں سے پاک ہیں۔ جس طرح منو بھیا کی وجہ سے سب گھر اور باہر والوں کی منافقت سے پردے اٹھے ہیں اسی طرح "لکڑ بگھا چپ ہو گیا" میں ریل کے مختلف العمر مسافروں کی خود غرضیاں ایک بچے کی وجہ سے سامنے آئی ہیں۔ جس طرح افسانہ "منظر" کے نو عمر حامد میاں کو اس سے پہلے کی پیڑھی نے زندہ حواس کی وراثت اور زندگی کا خاطر خواہ تجربہ منتقل نہیں کیا، اسی طرح "دوسرا کنارہ" کی نو عمر عظمیٰ کو اس کے، نری مادیت و ظاہر داری کے قدموں پر چلتے، معاشرے نے آبائی یگانگت و موانست کا سبق نہیں پڑھایا۔

یعنی ----۔ اس قطعے کے مشمولات کا مجموعی تاثر یہ بصیرت عطا کر رہا ہے کہ عہد حاضر کے بر صغیر میں سرحدوں کے ادھر ادھر، کہیں اقلیت تو کہیں اکثریت میں شمار ہونے والے افراد کی بڑی تعداد، اک ایسے ظاہر و باطن میں گذر اوقات کر رہی ہے جو ----۔ بہ وجوہ ----۔ اپنی ڈار سے بچھڑا، کٹا پھٹا، آدھا، ادھورا اور ہیبت خیز تاریکیوں سے بھرا ہے اور یہ، تعداد میں اپنے سے زیادہ افراد کے اس ظاہر و باطن کا اثر قبول کر رہی ہے جو صد ہا برس کی لامرکزیت کے باعث: نری مادیت، منافقت اور اغراض پرستی کی بھول بھلیوں میں مبتلا ہے ----۔ کیوں کہ یہ اب خود بھی لامرکز سی ہو چلی ہے۔

مذکورہ حال میں غلطاں ظاہر و باطن کو، اس قطعہ کے خالق ذہن نے اسی فکری و ثقافتی ورثے کے پس منظر میں دیکھا اور سمجھا ہے جو انتظار حسین، نیر مسعود، عرفان صدیقی ("آب گم" والے) مشتاق احمد یوسفی اور محمد صلاح الدین پرویز جیسے فن کاروں کی بھی قوت بنا ہے۔

ناصر کاظمی نے میر صاحب کے زمانے کو ایک رات سے تعبیر کرتے ہوئے لکھا ہے:

یہ رات ہمارے زمانے کی رات سے آملی ہے ----۔ اسی قطعہ کے ابیات سے گذر گذر کر اور ویسے بھی کئی لحاظ سے محسوس ہوتا ہے کہ یہ رات ہنوز جاری بھی ہے اور ساری بھی ----۔

(بقیہ صفحہ ۲۷۴ پر)

شمس الحق عثمانی

جہاں ابھی رات ہے

۔۔۔ اور اب ۔۔۔ میں اس نگر کے دکھ خوف کا قصہ خواں ہوں جہاں ابھی رات ہے ۔۔۔ اور آگے سمندر ۔

جہاں ابھی رات ہے ، وہاں ، ہم ۔۔۔
وہاں ابھی لوگ
آرزوؤں کے نردبانوں پر چل رہے ہیں
قدم قدم پر پھسل رہے ہیں
کہ جیسے صحرا سمندروں میں پھسل رہا ہو!
جہاں ابھی رات ہے
ہوا کے سوا کوئی پردہ در نہیں ہے ۔۔۔

("جہاں ابھی رات ہے ۔۔۔" ن ۔ م ۔ راشد)

" وہی شہر اور رہ رہ کر اٹھنے والا اندیشہ کہ اب کی بار دلی اجڑ نہ جائے ۔ محرم کا چاند ہو گیا ہے ۔

یہ شہر ہے اور میں ہوں ۔

دونوں اندھیرے میں ہیں ۔ میری بالکنی سے جہاں تک دکھائی دیتا ہے ، شہر ہے اور شہر اندھیرے میں ہے ۔ جہاں تک دکھائی دے سکتا ہے ، میں اسے دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں ۔ میری کوشش ناکام رہتی ہے ۔ ساتویں منزل کی بالکنی سے میں اسے سیال اندھیرے میں ڈوبتے ہوئے دیکھ رہا ہوں اور جو میں دیکھ رہا ہوں ، اسے وہ پرچھائیں بنا کر میری طرف واپس کر رہا ہے ۔

وہ پرچھائیں کچھ نہیں ہے ۔

جہاں میں کھڑا ہوں وہاں سے کچھ دکھائی نہیں دے رہا ۔ دیکھنے کے لیے کچھ نہیں ۔ اندھیرا ہے اور اندھیرا ۔ ایک دبیز چادر ہے جس کی تہہ کھل گئی ہے اور ہوا کے دوش پر شہر کو ڈھانپنے کے لیے اتری چلی آرہی ہے ۔ میں قیاس کرتا ہوں : یہاں عمارتیں ہونا چاہیے تھیں ۔ وہاں اندھیرے میں دھبے ہیں جن کی شکلیں واضح ہونا چاہیئیں : مستطیل ، محراب دار ، بلند و بالا ۔ وہاں کچھ نہیں ہے ۔ اور اس طرف مکان ۔ بیچ میں سڑک اور دونوں طرف ترتیب وار مکان ۔ اور لوگ اس شہر کے لوگ ۔ دکھائی دینے کے لیے کچھ نہیں ۔

بالکنی کے جنگلے پر اپنی گرفت مضبوط کر لیتا ہوں۔ گہرا ہوتا ہوا اندھیرا سارے شہر کو اپنے اندر سمیٹ نہیں سکتا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے ایسا لگتا ہے کہ سارا شہر چرا لیا گیا ہے اور یہ گلیاں، بازار، عمارتیں، چوک دوبارہ کسی عجائب گھر کے شوکیس میں ترتیب وار نمودار ہوں گے اور "موئن جوڈرو: مردوں کا ٹیلہ" اس پر تختی نصب ہو چکی ہوگی۔ میں بالکنی میں کھڑا دیکھتا رہ جاؤں گا۔"

(افسانہ: "دستبو" از آصف فرخی)

جون ۱۹۹۵ء میں موصولہ آصف فرخی کے افسانوں کے مجموعے "شہر بیتی" --- اگست ۱۹۹۵ء میں دہلی سے مطبوعہ انتظار حسین کے ناول "آگے سمندر ہے" --- اور نومبر ۱۹۹۵ء میں "شہر ماجرا" نامی (زیر طبع) مجموعے سے آصف فرخی کے چار افسانوں نے، ایڈیٹ بوکس اور اخبارات کے وسیلے سے آنکھوں کانوں کی راہ ذہن و دل میں اترتی اس رات کے دکھ خوف پر مہر تصدیق لگادی جو میر و ناصر کے بعد انتظار حسین اور آصف فرخی کے زمانے سے آملی ہے --- اور گہرے دکھ خوف کی لہروں پر میرے برصغیر میں یہاں سے وہاں تک سنسنا رہی ہے۔

===== الف =====

ویسے مجّو بھائی کا اندیشہ صحیح نکلا۔ حالات واقعی کچھ زیادہ ہی بگڑ گئے اور دن ڈھلتے ڈھلتے کرفیو لگ گیا۔ اب مجو بھائی نے ایک نیا سوال کھڑا کر دیا۔ "آج کی رات مشکل ہے۔"

"وہ کیوں؟"

"خطرہ ہے۔"

"کس بات کا؟"

"حملے کا۔"

"حملے کا؟ کس کے حملے کا۔"

"یار بحث مت کیا کرو۔ تمھیں تو کچھ پتہ ہے نہیں۔ میں نے کچھ سونگھا ہے تب کہہ رہا ہوں۔"

"اچھا پھر ہم کیا کر سکتے ہیں۔"

"رات کو سونا نہیں ہے۔ میرا خیال ہے آج رات پورا علاقہ جاگے گا۔ بہت خطرہ ہے۔"

"اچھا یہ بات ہے تو جاگ لیں گے۔"

"ہاں یار رت جگا کریں گے۔ چائے ملتی رہے، پھر جاگنا کون سا مشکل کام ہے۔" پھر نعمت خاں کو آواز دی۔ "نعمت خاں۔"

نعمت لپک کر آیا۔ "ہاں جی۔"

"رات بہرہ دینا ہے۔ تمھیں پتہ ہے نا، کرفیو لگ گیا ہے۔ حالات بہت خراب ہیں۔"

"ہاں جی۔"

"چائے کا انتظام ہے نا؟"

"ہاں جی، وہ تو ہے۔"

یہ بھی خوب ہوا کہ مجو بھائی نے خود ہی رت جگے کا شوشہ چھوڑا اور خود ہی سویرے سے چادر تان کر سو گئے۔ تو وہ سنار ہے تھے اور پہرے داری کا سارا بوجھ میرے کاندھوں پر آپڑا تھا۔

(آگے سمندر ہے، ص: ۱۸۱ تا ۱۸۲)

ناول کے راوی جواد اور اس کے شریک خانہ مجید عرف مجو بھائی کے مابین یہ مکالمہ تیرھویں باب کے وسط میں ہو رہا ہے۔ آئندہ سطور میں اس باب کا باقی حصہ بالترتیب اور من وعن اسی طرح حروف ابجد کے زیر عنوان نقل ہوگا کیوں کہ ۳۱۹ صفحات پر مشتمل ناول کے یہ بہ مشکل سواسات صفحے، ناول کے تقریباً تمام گذشتہ و آئندہ ابواب کا خاکہ بن گئے ہیں۔ (نہیں معلوم کہ یہ خاکہ انتظار حسین کی شعوری کوشش کا نتیجہ ہے یا ان میں رچے بسے افسانہ نگار کی بالادستی کا مظاہرہ، وہی بالادستی جس نے "بستی" اور "تذکرہ" کی طرح اس ناول کے بڑے حصے کو انتظار حسین کے افسانوں میں برتے گئے طرز ہائے بیان اور احساسات کی بازگشت بنا دیا ہے۔)

ناول کے اقتباس الف میں مجو بھائی کے اندیشے اور اس کے صحیح ہونے کا بیان واضح کر رہا ہے کہ یہ دونوں کردار ایک ایسے گھر کے مکین ہیں جس کے گرد بسا شہر اس کے باشندوں کے لیے اندیشہ خیز بن گیا ہے۔

===== ایک =====

--- خلل پیدا ہونا شروع ہوا اور پیدا ہوتا ہی چلا گیا۔ میرا مطلب ہے پورے شہر کی زندگی میں۔ وہ جو اس شہر میں ایک امی جمی تھی وہ اچانک ہی غائب ہو گئی۔ ڈاکے، اغوا، قتل کی وارداتیں، بم دھماکے، اچانک نقاب پوش نمودار ہوتے۔ بھرے بازار میں گولیاں چلاتے۔ ایک یہاں گرا پڑا ہے، دوسرا وہاں تڑپ رہا ہے۔ گرم جسم دیکھتے دیکھتے ٹھنڈے پڑ جاتے۔ بازار میں بھگدڑ مچ جاتی ہے۔ پھر سناٹا۔ اور پھر اچانک ٹائر جلنا شروع ہو جاتے۔ ٹائروں کے جلتے جلتے کوئی بس زد میں آجاتی اور منٹوں میں جل کر خاکستر ہو جاتی۔ دکانیں کھلتے کھلتے پھر بند ہو جاتیں اور کرفیو لگ جاتا۔ کرفیو آج یہاں کل وہاں۔ مجو بھائی گھر سے نکلتے نکلتے اچانک فون کی آواز پر ٹھٹکتے۔ فون سننے کے بعد جانے کا پروگرام ملتوی کرتے اور آرام کرسی پر نیم دراز ہو جاتے۔

"مجو بھائی، آپ کو تو اس وقت مشاعرہ میں جانا تھا۔"

"ہاں جانا تو تھا، مگر اس علاقے میں کرفیو لگ گیا۔ بھائی لوگوں نے ہمارا رستہ کھوٹا کر دیا۔"

مجو بھائی کا رستہ آئے دن کھوٹا ہونے لگا۔ کرفیو آج اس علاقے میں کل اس علاقے میں۔ اور مجو بھائی کرفیو کا ذکر اس سادگی سے کرتے جیسے بے وقت بارش ہو جائے اور شریف آدمی کا سیر کا پروگرام ملتوی ہو جائے۔ (ص: ۳۶ تا ۳۷)

====== دو ======

رفیق صاحب جاری تھے کہ بیگم رفیق گھبرائی ہوئی آئیں۔ "کیا بیٹھے باتیں ملکا رہے ہو۔ کچھ بسنت کی بھی خبر ہے۔ باہر پھر دہ کم بخت ماری گولیاں چلنی شروع ہو گئی ہیں۔"

"یہ کوئی نئی خبر لائی ہو۔ یہ تو یہاں کا روز مرہ ہے۔ میں سمجھا کہ کوئی نئی پریشانی آن ٹوٹی۔"

"ہاں، ہمارے لیے تو یہ نئی بات نہیں ہے۔ ہم تو جہنم میں رہتے ہیں۔ ہمارے مقدر میں تو یہی لکھا ہے۔ مگر یہ جو ہمارے دو شریف مہمان آئے بیٹھے ہیں میں ان کے خیال سے پریشان ہو رہی ہوں۔"

"بیگم۔ تم سمجھ رہی ہو کہ یہ کہیں جنت سے آرہے ہیں۔ یہ بھی جہنم ہی سے چل کر آرہے ہیں۔ اتنا ہی تو فرق پڑا ہے کہ اپنے جہنم کو چھوڑ کر ہمارے جہنم میں آج انھوں نے قدم رنجہ فرمایا ہے۔" (ص: ۲۲۲)

====== تین ======

"ارے بہو، کیاں پوچھو ہو۔ سارا رستہ اس طرح کٹا ہے کہ جان حلق میں اٹکی ہوئی تھی۔ جالندھر کے اسٹیشن پہ دیکھا تھا۔ کیسے بھوت سے کھڑے تھے۔ ایک کلموئے نے بندوق ایسے پکڑی ہوئی تھی کہ نال سیدھی میری طرف۔ میں تو ہول گئی کہ اب آئی گولی۔ بس میں نے آیتہ الکرسی پڑھنی شروع کر دی۔ اللہ کے کلام میں بڑی برکت ہے۔ فوراً ہی ریل چل پڑی۔ میں نے کہا، اللہ تیرا شکر ہے۔"

"اماں! اب گولی کی بات مت کرو، پاکستان آگیا ہے۔ یاں تمھیں کوئی بندوق نہیں دکھائے گا۔"

"شکر ہے خوف کی سرزمین سے ہم نکل آئے ہیں۔" ایک سفید ریش بزرگ بڑبڑاتے ہیں پھر کلمہ کا ورد کرنے لگتے ہیں۔

"عجب حالات تھے، نہ جان محفوظ نہ عزت محفوظ۔"
"شکر ہے کہ ہم جانیں اور عزت بچا کر لے آئے ہیں۔"
"بس اللہ پاکستان کو اپنی حفظ وامان میں رکھے۔"
"آمین!"
"ارے میا، میرا تو دل ابھی تک کانپ رہا ہے۔"
"اماں، اب آپ کا دل کیوں کانپ رہا ہے اب تو پاکستان آگیا ہے۔ یہاں آپ کو کس بات کا کھٹکا ہے۔"
"بڑی بی!" کسی نے بلند آواز سے کہا۔ "پاکستان دار الامان ہے۔" (ص: ۲۵۹)
دار الامان میں اندیشوں کے صحیح نکلنے کا تسلسل مجّو بھائی اور رفیق کو اس ذہنی کیفیت تک لے آیا ہے جس میں گولیاں چلنا ایک روزمرّہ اور ایک گھر سے دوسرے گھر جانا بس ایک سے دوسرے جہنم میں پہنچ جانا ہی محسوس ہوتا ہے۔ گویا برسوں پہلے جان اور عزت کو بچانے کے لیے ایک سرزمین سے کوچ کر جانے والوں کے قدموں تلے کی زمین اب پھر ویسی ہی گرم ہے۔۔۔ مگر اب آگے سمندر ہے۔۔۔ بھوت سے کلموئے بندوق والوں کے بجائے کلاشنکوف بردار نقاب پوش ہیں کہ بھرے پرے بازاروں میں اچانک نمودار ہو کر گولیاں چلاتے ہیں تو دیکھتے دیکھتے کتنے ہی گرم جسم ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں۔ بھگدڑ مچتی ہے۔۔۔ مگر آگے سمندر ہے۔
راوی کو بے نام حملہ آوروں کے خطرے سے آگاہ کرنے والا مجید، جلد ہی پھیلنے والی پرخوف رات کی جگار کو اس باعث (چھلوں بھرا) رت جگا کہہ رہا ہے کہ اب اس کے شہر پر اکثر و بیش تر ایسی ہی راتیں ڈیرا کرتی ہیں۔ ایسی راتوں کے شہر میں سویرے ہی سے چادر تان کر سو رہنا یا چھلوں بھرا رت جگا منانا، افراد شہر کی اک مخصوص نفسیات اور ذہنی سطح کا پیمانہ ہے۔

===== چار =====

"۔۔۔ انھوں نے قدم رنجہ فرمایا ہے۔"
وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر بے چارے اگر یاں پھنس گئے تو پھر کیا ہوگا۔"
"کوئی فکر کی بات نہیں ہے۔ تمھیں صرف چائے سے تواضع کرنی ہے۔ کھانے کا اہتمام مشاعرے والوں نے کر رکھا ہے۔"
"مشاعرہ؟" بیگم رفیق نے کچھ تعجب کچھ غصے سے کہا "یہ کون بخت مارے ہیں۔ گولیوں کی اس بوچھاڑ میں مشاعرہ کریں گے۔"
رفیق صاحب اپنی طرف سے یہ ظاہر کر رہے تھے کہ اس واقعہ سے وہ بالکل پریشان نہیں ہیں اور یہ کہ مہمانوں کو بھی پریشان ہونے کی مطلق ضرورت نہیں ہے۔ مگر میں اپنی پریشانی کو

نہیں چھپا پار ہا تھا۔ میں تو اصل میں سوچ کر گھر سے نکلا تھا کہ مجو بھائی کو وہاں اتار دوں گا، رفیق صاحب سے تھوڑی گپ شپ کروں گا اور مشاعرے سے پہلے پہلے کھسک لوں گا۔ اب مجھے لگ رہا تھا کہ میں تو پھنس گیا۔ رفیق صاحب نے میری پریشانی کو تاڑ لیا۔ بولے "ارے جواد صاحب، آپ خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہیں۔ یہ تو یہاں کا روٹین ہے۔ دو ہی اس کوچے کے جوانوں کے مشغلے ہیں، فائرنگ اور مشاعرہ۔ اور آج وہ لمبی فائرنگ کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ آخر انھیں مشاعرے میں بھی تو جانا ہے۔" (ص: ۲۲۲ تا ۲۲۳)

پر خوف راتوں میں بھی سویرے ہی سے چادر تان لینے والے مجید، گولیاں چلنے کی خبر سے کوئی پریشانی محسوس نہ کرنے والے رفیق اور فائرنگ سے فارغ ہو کر مشاعرہ برپا کرنے والے حال مست جوانوں کے برخلاف ـــ جواد کا ذہن، پیش نظر احوال کو ماضی قریب سے منسلک کر کے دیکھ رہا ہے:

===== ب =====

ـــ مگر خیر مجھے کون سی نیند آرہی تھی۔ نیند کا تو ان گھڑیوں میں میرے یہاں کوسوں پتہ نہیں تھا۔ کتاب کتنی دیر تک پڑھتا رہتا۔ تھک کر کتاب ایک طرف رکھی۔ انگڑائی لے کر اٹھا اور بالکونی میں جا کھڑا ہوا۔ عجب منظر تھا۔ وہ سڑک جو رات بھر چلتی تھی اور جہاں تہاں پان سگریٹ اور چائے کی دکانیں کھلی رہنے سے جاگ باگ رہتی تھی یہاں سے وہاں تک خالی تھی اور خاموش۔ اتنے ہنگامے کے بعد اتنی خاموشی۔ میں حیران بھی ہوا اور خوف زدہ بھی۔ ویسے رات کی خاموشی بہ نفسہ میرے لیے کوئی نیا تجربہ نہیں تھی۔ اس شہر کی زندگی سے بہت پہلے میں اس تجربے سے گزر چکا تھا۔ بلکہ یہ تجربہ تو میرے بچپن کی یادوں کا حصہ ہے۔ میں نے اس زمانے میں آنکھ کھولی تھی جب ابھی بجلی نہیں آئی تھی۔ میرا مطلب ہے کہ ہماری اس چھوٹی سی بستی میں بجلی اس وقت تک نہیں پہنچی تھی۔ رات وہاں کتنی جلدی شروع ہو جاتی تھی اور کتنی لمبی اور کالی ہوتی تھی۔ کالی رات کا سناٹا گہرا ہوتا ہے۔ دھرم شالا کے اس پار سے آتی ہوئی گیدڑوں کی آوازیں اس سناٹے کو توڑتی نہیں تھیں، اور گہرائی پیدا کر دیتی تھیں۔

اس کے بعد جو سناٹا میرے تجربے کا حصہ بنا وہ ۱۹۴۷ء کے آس پاس کے زمانے کا ہے۔ اب میں شہری مخلوق بن چکا تھا۔ تعلیم کی تقریب سے مجھے شہر میں آکر رہنا ہی تھا۔ اور شہروں کا نقشہ ان دنوں عجب تھا۔ اچھی بھلی گہما گہمی ہے۔ دکانیں کھلی ہیں۔ خریداروں کے جمگھٹے، دل لگی بازوں کے قہقہے، خوانچہ والوں کی بولیاں، یکایک پر اسرار طور پر کوئی خبر، کوئی افواہ بازار کے اس نکڑ سے اس نکڑ تک بجلی کی تیزی سے پھیلتی چلی جاتی۔ اسی تیزی سے دکانیں بند ہوتی چلی جاتیں۔ شٹر دھاڑ دھاڑ گر رہے ہیں۔ دروازے دھڑا دھڑ بند ہو رہے ہیں۔ دکان دار دکانیں بند کر کے،

خریدار سودا سمیٹ کے بھاگے چلے جارہے ہیں۔ دم کے دم میں بازار بند، سڑکیں خالی، فضا سنسان؛ جیسے وہ افواہ نہیں تھی، کوہ ندا سے آواز سنائی دی تھی۔ (ص: ۱۸۲ تا ۱۸۳)

جواد کے زندہ حواس اور غیر عمومی طرزِ فکر کا یہ خاکہ، باور کراتا ہے کہ وہ شہر میں برپا حالات کو دیگر افراد کے مقابلے وسیع تر تناظر میں دیکھنے سمجھنے کا اہل ہے ـــ اور مجید چادر تانے سنا رہا ہے۔ یکساں حالات اور ایک ہی چھت کے نیچے گزران کرتے ان دو رویوں کے بعد، اقتباس پانچ میں مرزا دلاور بیگ کی باتوں سے اندازہ ہوگا کہ جواد اور مرزا میں بھلے ہی عمر کا تفاوت ہو لیکن (مرزا کی خواہش مرگ سے قطع نظر) یہ دونوں افراد قصہ طرزِ احساس کی یکساں سطح پر زندہ ہیں۔

===== پانچ =====

"ـــ اس شہر میں اب ہم جیسوں کا گزارہ نہیں۔ جو کچھ ہو رہا ہے اسے دیکھنے کے لیے کہاں سے جگر لائیں۔ میاں، اب ہم مرنا چاہتے ہیں۔ کوئی یقین نہیں کرتا۔ سمجھتے ہیں بڑھاپے میں چل بچل ہو گیا ہے۔ نہیں میاں نہیں۔ میں بقائمی ہوش و حواس کہہ رہا ہوں ـــ اب دنیا کا جو حال ہے اسے دیکھنے کی تاب نہیں ہے۔ تو بھیا، اب ہم واقعی مرنا چاہتے ہیں۔"

"کیسی باتیں کرتے ہیں آپ مرزا صاحب۔" میں نے یوں ہی رسماً ایک فقرہ کہہ دیا۔

"لو تم بھی اعتبار نہیں کرتے۔ نہیں میاں نہیں۔ میں صحیح کہہ رہا ہوں۔ مگر موت اپنے اختیار میں نہیں ہے۔ ایک وہ تھے کہ جب دیکھا دنیا رہنے کے قابل نہیں رہی اعلان کر دیا کہ ہم جا رہے ہیں۔ اور چلے گئے۔ تکیے پر سر رکھا اور آنکھیں موند لیں۔ مرید سمجھ رہے ہیں کہ سو گئے۔ یہ خبر ہی نہیں کہ اب وہ ابدی نیند میں ہیں۔ سبحان اللہ کیا اختیاری موت ہے۔ ایک ہم ہیں۔ موت کے کوچے میں بسر کرتے ہیں۔ مگر مرتے نہیں۔ یقین جانناان گنہ گار آنکھوں سے روز دو چار دو چار کو ٹھنڈا ہوتے دیکھتے ہیں۔ مگر کوئی گولی ادھر نہیں آتی۔ میاں ہوتا کیا ہے۔ گھر سے نکلتے ہیں تو گلی والے بتاتے ہیں کہ بس ابھی گولی چلنی بند ہوئی ہے۔ جب گھوم پھر کر گھر آجاتے ہیں تو خبر ملتی ہے کہ گولی چلنی شروع ہو گئی ہے۔ اور میاں کل کی سنو۔ میں تو مسجد ہی میں جاکر نماز پڑھتا ہوں۔ کل مغرب کا ناغہ ہو گیا۔ اور کل ہی مسجد میں بم پھٹ گیا۔ ہماری محرومی پہ غور کرو مسجد میں مرتے تو شہادت کی موت میسر آتی۔ مگر کیسے میسر آتی۔ قدرت کو جو منظور نہیں تھا۔ پتہ نہیں کس طرح ہماری آئی لکھی ہے۔ پالنے والے، عزت کے ساتھ ہمیں لے جائیو۔"

میں خاموشی سے سنتا رہا۔ بولنے کی بالکل خواہش نہیں ہو رہی تھی۔ پھر بھی تھوڑی سی دل جوئی کے نقطۂ نظر سے میں نے کہا "مرزا صاحب، آخر جینے سے اتنی بھی بیزاری کیا۔"

"ٹھیک کہتے ہو میاں۔ زندگی تو عطیہ خداوندی ہے۔ جتنی لے کے آئے ہو اسے صبر شکر کے ساتھ بسر کرو۔ شاد یا ناشاد، بسر تو کرنی ہے۔ مگر میاں، ہم اپنے اندیشوں کو کہاں لے جائیں۔

آخر قدرت ہمیں کیا دیکھنے کے لیے زندہ رکھنا چاہتی ہے۔" رکے، پھر بولے "جواد میاں، ہماری دلّی کہنے کو بائیس خواجہ کی چوکھٹ، مگر سات دفعہ اجڑی ہے۔ اور سات دفعہ بسی ہے۔ چھٹی بار کا اجڑنا ہمارے پرکھوں نے دیکھا تھا۔ ساتویں بار کا اجڑنا ہم نے دیکھا۔ ہاں دیکھا اور سہا۔ ہم نے اماں بی کی اماں سے سنا تھا کہ جب غدر پڑا تھا تو بارہ بارہ کوس تک چراغ جلتا دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اور دلی بس شہر بے چراغ۔ کہتے بلی کی ریل پیل۔ آدمی کی صورت دکھائی نہیں دیتی تھی۔ ہم سنتے تھے اور حیران ہوتے تھے۔ ۴۷ء میں اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ میاں میں محلہ کو اچھا بھلا چھوڑ کر ذرا چاندنی چوک تک گیا تھا۔ جامع مسجد کے پاس سے گزرا۔ بازار جما ہوا تھا۔ سیڑھیوں پہ ویسا ہی ہجوم۔ بس ذرا درہمی سی تھی۔ مگر میں نے اس وقت اس پہ دھیان نہیں دیا۔ چاندنی چوک میں قدم رکھا ہی تھا کہ بھگدڑ پڑ گئی۔ پوچھتا ہوں کہ یہ کیسی بھگدڑ ہے پر کوئی بتاتا ہی نہیں۔ خیر میں الٹے پیروں واپس ہو لیا۔ جامع مسجد کے پاس سے جو گزرتا ہوں تو میاں یقین جانو بالکل سناٹا۔ نہ دکان دار، نہ خریدار، نہ امام، نہ نمازی۔ ہاں بالائی سیڑھی پر ایک پنجرا پڑا رہ گیا تھا جس میں ایک تیتر بری طرح پھڑپھڑا رہا تھا اور شور مچا رہا تھا۔ مجھے اس پہ ترس تو آیا مگر ایسے میں وہاں رکنا اپنی جان کو خطرے میں ڈالنا تھا۔ میں آگے بڑھ لیا۔ مگر میاں مجھ سے رہا نہ گیا۔ پلٹا، لپک کر سیڑھیاں چڑھا اور واں پہ جاکے پنجرے کی کھڑکی کھول دی۔ تیتر ایک دم سے نکلا اور پھر سے اڑ گیا۔ میں شتابی سے نیچے اترا اور گھر کی طرف چلا۔ محلہ میں قدم رکھا تو وہاں تو قیامت اٹھی ہوئی تھی۔ لوگ گھر چھوڑ چھوڑ بھاگ رہے تھے۔ میں نے ایک ایک سے ت پوچھا۔ جواب دینے کا کسے ہوش تھا۔ ایک بھلے ہمسائے نے بھاگتے بھاگتے کہا، مرزا صاحب حملہ ہونے والا ہے۔ بس نکل چلو۔ میں قدم مارتا اپنے گھر پہنچا۔ اہل خانہ سے کہا کہ بی چلو اٹھو۔ دلی سے ہمارا دانہ پانی اٹھ گیا۔ اب یاں جینے کا دھرم نہیں رہا۔ وہ بولیں، اے ہے کون سی قیامت اٹھ کھڑی ہوئی۔ ہم جدی پشتی یاں پہ بیٹھے ہیں۔ اٹھاؤ چولھا تھوڑا ہی ہیں کہ کپڑے جھاڑے اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے کہا کہ اے نیک بخت، قیامت ہی تو اٹھ کھڑی ہوئی ہے۔ اور دم کے دم میں پانی سر سے اونچا ہو گیا۔ تو اس بی بی نے زمین پکڑی تھی اور میں غل مچا رہا تھا کہ کپڑے جھاڑو اور نکل چلو۔" رکے، بولے "سو میاں، ایسا وقت دیکھا ہے، ہم نے۔ خدا ایسا وقت دشمن کو نہ دکھائے۔ پر میاں، ہم نے تو دیکھا اور بھوگا۔"

"بجا فرمایا آپ نے۔ وہ ایسا ہی وقت تھا۔" (ص: ۲۹۷ تا ۲۹۹)

دار الامان کے آشوب و خوف میں مجید چادر تانے سنا تا ہے تو مرزا دلاور بیگ کفن میں منھ ڈھانپنا چاہتا ہے لیکن جواد اپنے اس خیال کے باوجود کہ "کہیں مجھ پر مرزا صاحب ہی کا تو سایہ نہیں پڑ گیا۔" (ص: ۳۰۰) جسمانی نقاہت اور خواب آور دواؤں کے زیر اثر "بولنے کی بالکل خواہش" نہ ہوتے ہوئے بھی مرزا کی مرگ طلبی پر لب کشائی کر رہا ہے اور افواہ کی گزند سے خاموشی میں لپٹے شہر کو دیکھ کر خیال کرتا ہے کہ "وہ افواہ نہیں تھی، کوہ ندا سے آواز سنائی دی

تھی۔ " تو اندازہ ہوتا ہے کہ جواد اور مجید و مرزا کے درمیان بس تجربے کی یکساں شکل ہی مشترک ہے، تجربے کے رد عمل اور اس سے زائیدہ ذکاوت میں جواد اپنے ہم نفسوں سے بہت مختلف ہے

ویسا ہی سناٹا مگر ایک نئی دہشت کے ساتھ۔ ہر عہد اپنا سناٹا، اپنی دہشت اور رہاں اپنا تشدد اپنے ساتھ لاتا ہے۔ اندھیرے کے ساتھ سناٹے کا رنگ اور ہوتا ہے۔ مگر یہاں کھمبے اپنی روشنیوں کے ساتھ سب اپنی اپنی جگہ سلامت تھے۔ سڑک پر روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ مگر کسی وجود کا دور دور پتہ نہیں تھا۔ یا اللہ اس راہ پر امنڈی ہوئی خلقت دم کے دم میں کس کھوہ میں جا چھپی۔ بھگدڑ، دھکم پیل، دھوں دھاں، ہائے وائے، سب غائب، نہ کوئی نعرہ نہ کوئی چیخ، نہ بند ہوتے دروازوں اور گرتے شٹروں کا شور۔ بجلی کی روشنی میں خالی اور خاموش سڑک۔ بس جہاں تہاں پڑے ہوئے ادھ جلے ٹائر، اینٹ، پتھر اور وہ بس جو جل پھنک کر کالی کھڑنک بن گئی تھی۔ آدم کے نام بس وہ سپاہی جو روشن چوراہے کے بیچوں بیچ کلاشنکوف سے مسلح ساکت کھڑا تھا۔ کتنی دیر تک میں اسے دیکھا کیا۔ حیران کہ وہ جیتا جاگتا آدمی ہے یا آدمی کا پتلا جو یہاں کھڑا کر دیا گیا ہے۔ تب وہ ورطہ حیرت میں غرق ہوا۔ دہشت سے پتا پانی ہوا۔ ناگاہ ایک مرد بزرگ سامنے سے آتا دکھائی دیا۔ لپک کر قریب گیا اور یوں عرض پرداز ہوا کہ اے صاحب کچھ بتائیے کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ آنکھ کا دھوکا ہے کہ یہ کوئی قریہ بلا ہے۔ جب میں نے اس بستی میں قدم رکھا تو کٹورا بجتا تھا، کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ کوچوں میں چہل پہل تھی، رونق چہار طرف تھی۔ بالا خانے روشن تھے، مہہ وشوں کے ٹھمکے تھے، طبلے تال کھنکتے تھے۔ نظر باز البلے گیلے پھرتے تھے۔ بالا نشینوں سے نگاہ بازیاں کرتے تھے۔ اب جو دیکھتا ہوں تو رونقیں غائب، ہو کا عالم، چار سو دہشت کا ڈیرا ہے۔ ویرانی کا بسیرا ہے۔ کچھ نہیں کھلتا کہ یہ ماجرا کیا ہے۔ دبدا میں ہوں کہ کیا کروں، کدھر جاؤں۔ یہ سن اس بزرگ نے اسے سر سے پیر تک دیکھا اس رنگ سے کہ ایک آنکھ ہنستی تھی، دوسری آنکھ روتی تھی۔ پھر بصد افسوس یوں کہاں کہ اے نوجوان، مجھے تیری جوانی پہ رحم آتا ہے۔ ارے کم بخت اب یہ شہر قریہ بلا ہے۔ کس ستم گر نے تجھے یہ رستہ دکھایا ہے، مشکل میں تجھے پھنسایا ہے۔ میری مان، شتابی سے یاں سے نکل جا۔ بزرگ کا یہ کلام سن وہ رو دیا اور بولا کہ تقدیر نے یہ دن دکھایا ہے۔ فلک نے مجھے مشکل میں پھنسایا ہے۔ مگر اب راہ فرار کیسے اختیار کروں کہ یہ بات غیرت سے دور ہے، بندہ اس امر میں مجبور ہے۔ (ص: ۱۸۳ تا ۱۸۴)

===== چھپے =====

گھر میں قدم رکھا ہی تھا کہ رفیق صاحب آن وارد ہوئے۔ "ارے جواد صاحب، آپ آگئے۔" وہ مجھے دیکھ کر حیران ہوئے۔ "میں سمجھ رہا تھا کہ آپ لمبا وقت گزار کر آئیں گے۔"

"سن رہے ہو جواد میاں، رفیق صاحب کیا کہہ رہے ہیں۔ وہی جو میں کہہ رہا تھا۔" اور پھر مجو بھائی رفیق صاحب سے مخاطب ہوئے۔ "رفیق صاحب اگر آپ کہتے ہیں تو ہم مانے لیتے ہیں۔ ویسے مجھے یوں لگ رہا ہے کہ جواد میاں ابھی واپس نہیں آئے ہیں۔"

رفیق صاحب نے ایک قہقہہ لگایا۔ "مگر مجو بھائی، اس میں جواد صاحب کی کیا تخصیص ہے۔ ہم نے تو اپنے کراچی کے ہر دوست کا معاملہ یہی دیکھا ہے۔ واپس آجاتے ہیں مگر پتہ چلتا ہے کہ حضرت ابھی واپس نہیں آئے۔"

میں بات کو ٹال گیا تھا مگر پھر اچانک مجھے جھرجھری آئی۔ میں نے کہا "آپ دونوں حضرات ممکن ہے ٹھیک ہی کہہ رہے ہوں کہ میں ابھی واپس نہیں آیا ہوں۔ مگر میرا احساس دوسرا ہے۔ میں واپس تو آگیا ہوں۔ مگر لگتا یہ ہے کہ جس شہر سے گیا تھا یہ وہ شہر نہیں ہے۔ کوئی اور ہی شہر ہے۔"

"کاش یہ کوئی اور شہر ہوتا۔" رفیق صاحب نے ٹکڑا لگایا۔

"پتہ نہیں۔" میں نے کہا "مجھے لگتا ہے کہ میں کسی اور شہر میں آگیا ہوں۔ جیسے کوئی داستانی شہر ہو۔"

"اور جیسے تم حاتم طائی ہو۔" مجو بھائی نے ٹکڑا لگایا جسے رفیق صاحب کے قہقہے نے مزید دھار دار بنا دیا۔

میں بس سمجھو کہ جل بھن کر کباب ہو گیا۔ فوراً جواب دیا "میں تو خیر حاتم طائی نہیں ہوں۔ کیسے بن سکتا ہوں۔ ایسے کردار اس عہد کے نصیبے میں کہاں ہیں۔ یہ شہر البتہ شہر ندا بن چکا ہے۔"

رفیق صاحب ہنستے ہنستے سنجیدہ ہو گئے۔ "جواد صاحب، یہ بات آپ نے بہت صحیح کہی۔" چپ ہوئے پھر سوچتے ہوئے بولے "ہم سب ہی اپنی اپنی باری کا انتظار کر رہے ہیں جانے کب کوہ ندا سے کس کی پکار آجائے۔" (ص: ۱۷۲ تا ۱۷۳)

اقتباس دو، چار اور چھے میں رفیق کا رویہ، اقتباس ج کے اس مرد بزرگ میں جھلک رہا ہے جس کی ایک آنکھ ہنستی تھی، دوسری آنکھ روتی تھی اور جواد میں وہی غیرت موج زن ہے جو مرد بزرگ سے سوالی جوان کو راہ فرار اختیار کرنے سے روکتی ہے۔ مرد بزرگ کی ایک آنکھ کے ہنسنے کے اسباب میں سے کوئی سبب، رفیق کی آنکھ کو بھی حاصل ہے۔ وہ غالباً اسی کے بل بوتے پر اپنے اس شہر بلا میں "رہنے کے لیے "ایک خاص" سلیقہ" (ص: ۲۲۰) اور طرز عمل (ص: ۴۳ تا ۴۵) وضع کر چکا ہے۔ رفیق کے مخصوص طرز فکر و عمل کی ایک جہت جالاں کہ توصیف میں بھی جھلکتی ہے (ص: ۴۶ تا ۴۷) مگر رفیق کے برخلاف توصیف کی دونوں ہی آنکھیں بے آب ہو چکی ہیں:

===== سات =====

"جواد بھائی، معاف کیجیے آپ میرٹھ کیا لینے گئے تھے؟"

"جی؟" میں نے حیران ہو کر توصیف کو دیکھا۔ مجھے احساس ہوا کہ بیوروکریسی کا پرزہ یا اختری باجی کے لفظوں میں ضلع کا حاکم بننے کے بعد توصیف کا لہجہ کچھ بدل گیا ہے، اور شاید انداز نظر بھی۔

"دیکھیے جواد بھائی، اس روز ہم نے آپ کو نوچندی کے پراٹھے بھی کھلوا دیے اور خیر نگر کے سیخ کباب بھی۔ اور ہم جیسے خاک سار بھی یہیں ہیں۔ ادھر رہ کیا گیا۔"

"بس تمھارے خیرل بھائی اور ان کی بلی۔" مجو بھائی نے ٹکڑا لگایا۔

توصیف نے ایک پرتکلف قہقہہ لگایا۔ پھر بولا "میں ایک دفعہ گیا تھا میرٹھ۔ کوٹھے کا باجی کسی زمانے میں بہت ذکر کیا کرتی تھیں۔ وہاں الو بول رہا تھا۔ کچھ بڈھے ٹھڈے دکھائی دیے۔ لگتا تھا کہ پچھلی صدی کے لوگ ہیں۔ خیرل بھائی اپنی بیٹھک میں ٹوٹر دٹوں بیٹھے تھے۔ بہت پتلا حال تھا موصوف کا۔ مجھے ان پہ بہت رحم آیا۔ پاکستان آجاتے تو ان کا کچھ نہ کچھ بند و بست ہو ہی جاتا۔"

"کیسے آجاتا۔" اختری باجی بولیں "عقل پہ جو پتھر پڑے ہوئے تھے۔ رشتہ داری تو خیر ہماری دور کی تھی۔ مگر محلہ داری کا رشتہ تو تھا۔ اماں نے بہت سمجھایا تھا کہ بیٹا خیرل یاں اب کیا رکھا ہے۔ یاں رہ کے کیا جوتیاں گانٹھو گے۔ پاکستان چلے چلو۔ مگر اس کے تو دماغ میں فتور تھا۔ نہیں مانا۔ اپنی تقدیر پھوڑ لی، ماں باپ نے کن مصیبتوں سے پڑھایا لکھایا تھا۔ سب اکارت گیا۔"

"مجو بھائی، میں تو دو دن میں وہاں بور ہو گیا۔ ایک تو میں اپنے ان بزرگوں کے ہاتھ رومِ سے بہت تنگ تھا۔ کمال ہے، وہاں کھڈیاں اب تک چل رہی ہیں۔"

"رحم آتا ہے ان لوگوں پہ۔" اختری باجی نے توصیف کے بیان میں اپنی طرف سے اضافہ کیا۔ "اب واں رکھا کیا ہے۔ رونق تو سچی بات ہے ہمارے دم سے تھی۔ اب واں کون ہے۔ ایرے غیرے ہی رہ گئے ہیں۔ تیلی، تنبولی، بھٹیارے، گھسیارے یا خیرل جیسے نکھٹو۔ میں تو سچی بات ہے خالو کے مرنے پہ خالہ اماں کے منھ سے چلی گئی تھی۔ چار دن میں بولا گئی۔ چالیسواں کرتے ہی واں سے نکل کھڑی ہوئی۔"

اور مجو بھائی کس مزے سے ان کی ہاں میں ہاں ملا رہے تھے۔

"مجو بھائی۔" لبھو بھابی کہنے لگیں "ہم بڑا بول نہیں بولتے۔ مگر سچی بات تو کہنی ہی پڑتی ہے۔ نگوڑے لکھنؤ کی ناک تو ہمارا خاندان تھا۔ ہمارے آنے کے بعد تو واں خاک اڑتی ہے۔"

"عالی جاہ۔" سید آقا حسن کہنے لگے "اب تو اس دیار کو یاد کرنے کو بھی جی نہیں چاہتا۔ ہمارا غریب خانہ، میاں یقین جاننا، پورا محل تھا۔ اب اس کے نام ایک کھنڈر کھڑا ہے۔ تو قبلہ

آپ منصفی کریں، کس واسطے سے اب ہم اس اجڑے دیار کو یاد کریں۔" (ص: ۲۰۴ تا ۲۰۵)
یہ گفتگو بتا رہی ہے کہ صرف توصیف ہی نہیں بلکہ اس کی بہن اختری، مجو بھائی، بشّو بھابی اور سید آغا حسن بھی اسی ذہنی نوعیت کا اظہار ہیں جو افراد کی دونوں ہی آنکھوں کو بے آب کر دیتا ہے۔۔۔۔ توصیف کا سوال "۔۔۔آپ میرٹھ کیا لینے گئے تھے؟" اس سفر کی جانب اشارہ ہے جس سے جواد کچھ ہی روز پہلے واپس آیا ہے اور جس کے بارے میں مجید کا کہنا ہے کہ "یہ آدھ چھوٹا سفر" (ص: ۱۸۹) ۔۔۔ جب کہ جواد کا یہ سفر (اختری کی نظر میں قابل مطعون) خیرل بھائی اور (اپنے ماں باپ کی نظر میں قابل مطعون) شکور نامی نوجوان سے ملاقات کا وسیلہ بنا ہے۔

====== آٹھ ======

خیرل بھائی چپ رہے۔ پھر بولے "میاں جواد، بات یہ ہے کہ جب ہم میرٹھ کالج میں پڑھتے تھے تب یہ احساس نہیں ہوا تھا۔ مگر لکچرار بننے کے بعد عجب سا احساس ہونے لگا کہ ارے یہاں تو ہندو بہت ہیں۔ بس ہم اکھڑ گئے۔"

"مگر اس کے بعد علی گڑھ میں تو آپ کا دل لگنا چاہیے تھا۔"

"ہاں چاہیے تو یہی تھا۔" خیرل بھائی سوچتے ہوئے بولے "ویسے بھی علی گڑھ میں بھی تو آخر ہم پڑھے ہیں۔ لیکن عجب بات ہے کہ ان دنوں بالکل پتہ نہیں چلا۔ اب ہم وہاں گئے تو احساس ہوا کہ یہاں تو مسلمان بہت ہیں۔ جدھر نظر اٹھاؤ ادھر مسلمان۔ میاں جواد سچ جاننا، ہمیں خفقان ہونے لگا۔ بس ہم وہاں سے اکھڑ لیے۔"

"اور پھر میرٹھ میں آکر بیٹھ گئے۔" میرے منھ سے یوں ہی نکل گیا۔

"ہاں میرٹھ میں اپنے ٹھئے پر۔ مگر اب تم کہہ رہے ہو کہ میرٹھ بدل گیا ہے۔ تو پھر تو اچھا ہی ہوا کہ اپنے ٹھئے پر بیٹھ کر پھر ہم گھر سے نکلے ہی نہیں۔" (ص: ۱۵۲)

"مگر خیرل بھائی" میں نے موقعہ سے فائدہ اٹھا کر پوچھ ہی لیا "آپ کا کبھی جی نہیں چاہا کہ پاکستان کا ایک پھیرا لگایا جائے۔"

"میرا؟" انھوں نے مجھے گھور کر دیکھا "نہیں۔"

"آخر، خیرل بھائی، آپ پاکستان سے بے تعلق تو نہیں تھے۔ تحریک میں تو آپ بہت پیش پیش تھے۔"

خیرل بھائی چپ رہے۔ پھر بولے "ہاں ٹھیک ہے۔ مگر اس وقت وہ کوئی ملک نہیں تھا، ایک خواب تھا۔" پھر آہستہ سے بولے "خواب جب تک خواب رہے اس میں بہت سحر ہوتا ہے ۔۔۔ مگر" عین اسی وقت ان کی بلی جسے انھوں نے میری خاطر رخصت کر دیا تھا، آن کودی۔ خیرل بھائی نے اسے پچکارا۔ پھر وہ اسے پچکارنے میں ایسے محو ہوئے کہ اپنی ادھوری بات کو پورا کرنے

کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی (ص: ۱۵۴)

خیرل بھائی اپنے زمانے میں یعنی ابھی جب وہ ایک سینئر طالب علم کی حیثیت سے زندگی گزار رہے تھے تو ہم سب نوجوانوں کے قبلہ و کعبہ بنے ہوئے تھے۔ میرے تو آئیڈیل تھے۔ اکیلے میرے تھوڑا ہی۔ کتنے طالب علموں نے، پڑھے لکھے نوجوانوں نے انھیں اپنا آئیڈیل بنا رکھا تھا۔ کھدر پوش مگر سج دھج میں منفرد۔ یار اکٹھے ہیں اور خیرل بھائی رواں ہیں اور اب جیسے ٹھنٹھ پہ الو۔ صندلی نہ ہوتی تو اکیلے تھے۔ بھائی بہن، بھانجے بھتیجے سب پاکستان میں۔ اچھے عہدوں پہ فائز، آل اولاد کے ساتھ خوش و خرم۔ ادھر میرٹھ کی اس پتلی گلی میں بھائیں بھائیں کرتا جہان ایسا مکان، زنان خانے میں بیوہ بہن کا اکیلا دم، مردانے میں خیرل بھائی، ہمدم و دم ساز ایک بلی، زندگی بھی خوب رنگ دکھاتی ہے۔ ایک وقت میں کیسا میلہ لگتا ہے۔ گمان ہوتا ہے کہ میلہ سدا جما رہے گا۔ مگر دیکھتے دیکھتے زمانہ کس طرح رنگ بدلتا ہے۔ میلہ در ہم بر ہم یاروں چہیتوں کی ٹکڑی تتر بتر۔ گہما گہمی ختم۔ چاروں طرف ہو حق۔ کوئی ایک دم مٹروں ٹوں ٹھٹے پہ نکارہ جاتا ہے۔ کہیں بعد میں پتہ چلتا ہے کہ بس وہی سچا تھا۔ (ص: ۱۹۶)

===== نو =====

"میں نے پہلے ہی کہا تھا۔" خالو جان نے بھی بالآخر زبان کھولی۔ "کہ اسے کالج میں داخل مت کراؤ۔ وہاں تو ہندو گردی مچی ہوئی ہے۔ یہ بھی ویسا ہی ہو جائے گا۔ سو وہی ہوا۔ پتہ ہے پچھلے ہفتے کیا ہوا۔ پاکستانی ٹیم جیتی تو ہمارے پڑوسی ہیں مرزا عزت بیگ۔ گلی کے لونڈے ان کے پیچھے پڑ گئے۔ انھوں نے ان کے کہے پر لڈو خرید کے ایک ایک لڈو سے ان کا منھ بند کیا۔ صاحب زادے کو دیا تو کیا فرماتے ہیں کہ مرزا صاحب یہ لڈو پاکستان میں جا کے بانٹیے۔ ہمیں کیوں دے رہے ہیں۔ مرزا صاحب نے مجھ سے شکایت کی تو جواد میاں سچ جاننا میرا سر شرم سے جھک گیا۔"

"بھائی جان، آپ بتائیے میں نے کچھ غلط کیا۔ غیر قوم کی ٹیم جیتی ہے۔ میں کیوں" لڈو کھاؤں۔"

"ارے کم بخت۔" چھوٹی پھوپھو بولیں "یہ تیرا بھیایاں آیا بیٹھا ہے۔ یہ آج غیر قوم ہو گیا۔ تم ایک خاندان کے پوت ہو۔"

"اس سے کیا ہوتا ہے، قومیں تو دو ہیں۔"

"سن رہے ہو جواد میاں۔" خالو جان نے زچ ہو کر مجھ سے اپیل کی۔ "اب تم اس سر پھرے کی منطق کا جواب دو۔"

میں کیا جواب دیتا۔ شکور نے تو خود مجھے چکرا دیا تھا۔ اس پہلو سے تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ (ص: ۱۵۷ تا ۱۵۸)

خیرل بھائی کا میرٹھ کالج سے اس باعث اکھڑ جانا کہ وہاں ہندو بہت تھے اور علی گڑھ سے اس باعث کہ وہاں جدھر نظر اٹھاؤ ادھر مسلمان۔۔۔ (برصغیر کے انتہائی منفرد: حسی، فکری اور تہذیبی مرکب کے لطیف پہلوؤں اور تقاضوں سے نابلد) مجید، توصیف اور اختری جیسی ابھری ذہنی سطح کے لیے تو دماغی فتور ہی ہے کہ اس سطح پر گزر اوقات کرنے والا ذہن، خواب کو اس کی پر حصول تعبیری سے آنکتا ہے۔ بہ ظاہر ٹوٹرروں ٹوں خیرل بھائی کو یہ ذہن قابل رحم قرار دے کر یوں اپنی تاریکی میں دبا دیتا ہے گویا حصول تعبیر سے بے نیاز خواب کا انبساط، انسانی جوہر کی تب و تاب ہے ہی نہیں۔۔۔ مگر حالات اور انسانی رویوں کے لیے وسیع تر تناظر، ایک نہ ایک روز یہ فہم پیدا کرتا ہے کہ خواب اور روپے بھلے ہی رائج الوقت سکوں کی طرح بازار میں چٹ پٹ نہ بھنائے جاسکیں مگر وہ مول سے محروم نہیں ہوتے، یہ تو کہیں بعد میں پتہ چلتا ہے نری زمانہ، حال میں گرفتار فہم و نظر، ان کا اصل مول نہ جان سکی تھی۔

اکتوبر ۱۹۸۰ء میں مطبوعہ "بستی" کا کردار ذاکر (جو "تذکرہ" کے اخلاق اور "آگے سمندر ہے" کے جواد کی افتاد طبع کا نقش اول محسوس ہوتا ہے) اپنے ایک دوست سے کہہ رہا ہے:

===== دس =====

"یار عرفان!"

"ہوں۔"

"بہت دن ہوگئے ہمیں آئے۔"

عرفان نے اسے گھور کے دیکھا۔ "پھر؟"

"پھر کچھ نہیں۔" رکا۔ بولا "تم نے اس سفید سر والے آدمی کی بات کو ہنسی میں اڑا دیا۔ میں اندر سے ہل گیا۔ مجھے سارا پچھلا زمانہ یاد آگیا۔ یار" رک کر بولا "اب تو تیرے بال بھی سفید ہوچکے ہیں۔" اور اس کی نظریں عرفان کی سفید کنپٹی پر جم گئیں۔

"مگر ہمارے بال ہجرت میں نہیں، پاکستان کی دھوپ میں سفید ہوئے ہیں۔"

"پاکستان کی دھوپ!" وہ پھر جیسے خیالوں میں ڈوب گیا ہو "یار! ہم اس شہر کی دھوپ میں کتنا چلے ہیں۔ گرمی کی دوپہروں میں تپتی مال ہوا کرتی تھی اور ہمارے قدم ہوتے تھے۔ ہماری آخری منزل پل کے پار والا پیپل کا پیڑ ہوا کرتا تھا، کتنا گھنا تھا وہ پیڑ اور کتنی ٹھنڈی ہوا کرتی تھی اس کی چھاؤں۔ اب تو وہ پیڑ ہے ہی نہیں۔ سالوں نے کاٹ ڈالا۔"

عرفان نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ مگر اس پر اثر ہونا شروع ہوگیا تھا، جیسے وہ بھی پچھلے دنوں میں سفر کرنے پر مائل ہو۔ "یار عرفان! میں سوچتا ہوں کہ وہ دن ہم پر سخت ضرور تھے مگر اچھے تھے۔"

"ہاں وہ دن اچھے ہی تھے۔"

"وہ دن بھی اور وہ لوگ بھی۔"

"اور اب؟" عرفان نے اسے گھور کے دیکھا۔

"ہاں اور اب۔" آواز اتنی مری ہوئی کہ جیسے ڈھے گیا ہو۔

دیر تک چپ بیٹھے رہے، اپنے اپنے خیالوں میں گم۔ پھر اس نے عرفان کی طرف دیکھا۔ دیکھتا رہا جیسے کچھ کہنا چاہتا ہو مگر جھجک رہا ہو۔

"یار عرفان!"

عرفان نے اس کی طرف دیکھا، مگر وہ چپ تھا۔

"کیا بات ہے۔"

"یار!" رکا، پھر کچھ جھجکتے ہوئے بولا "یار پاکستان ٹھیک بنا تھا؟"

عرفان نے اسے تیز نظروں سے دیکھا "تم پر بھی سلامت کا اثر ہو گیا ہے؟"

"سلامت کا نہیں، یہ تمھارا اثر ہے۔"

"کیسے؟"

"شک کی جب ابتدا ہو جائے تو پھر اس کی کوئی انتہا نہیں ہوتی۔"

عرفان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کسی قدر برہمی سے اسے دیکھا اور چپ سادھ لی، وہ بھی چپ بیٹھا رہا۔

"میں بس ایک بات جانتا ہوں۔" آخر عرفان بولا "غلط لوگوں کے ہاتھوں میں آکر صحیح بات بھی غلط ہو جاتی ہے۔" اور فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ (ص: ۱۱۵ تا ۱۱۶)

===== د =====

"ابے یار، تیرا دماغ چل گیا ہے، مرنے کی نیت ہے کیا۔ گولی پوچھ کر نہیں آتی۔ اندر آجا۔"

مجّو بھائی جاگ پڑے تھے اور لیٹے لیٹے چلا رہے تھے۔ میں بالکونی سے سرک کر واپس کمرے میں آگیا۔ وہاں ٹھہرنے کا اب فائدہ بھی کیا تھا۔ مجّو بھائی کی چیخ و پکار سے سناٹے کا طلسم ٹوٹ چکا تھا۔

"استاد، وہاں کھڑے کیا کر رہے تھے۔"

"بس دیکھ رہا تھا۔"

"دیکھ رہا تھا؟ دیکھنے کو اس وقت وہاں ہے کیا۔ کرفیو لگ گیا ہے۔ اب تو چڑیا کا بچہ بھی سڑک پر نظر نہیں آسکتا۔"

"سناٹا دیکھ رہا تھا۔"

"خوب ۔" مجو بھائی تلخی سے بولے ۔ "تم اس سناٹے کو تماشا سمجھ رہے ہو ۔ گھر میں بیٹھے ہو نا ۔ مجھ سے پوچھو شہر کا کیا حال ہے ۔ شکر کرو کہ اپنی جان بچا کر لے آیا ورنہ تم میری لاش کو اس وقت ڈھونڈھ رہے ہوتے ۔ یار نعمت خاں، جاگ رہا ہے نا تو ۔"

"ہاں جی ۔"

"تو پھر چائے کا ایک دور ہو جائے ۔ کرفیو کی رات چائے کے زور ہی پر کاٹی جا سکتی ہے ۔"

"اچھا جی ۔"

نعمت خاں کے چلے جانے کے بعد تھوڑی دیر تک ہم دونوں ہی چپ رہے ۔ مجو بھائی شاید ابھی نیند کے خمار سے پوری طرح نہیں نکلے تھے ۔ پوری طرح تو چائے کی پیالی ہی انھیں اس خمار سے نکال سکتی تھی ۔ ادھر میرے اندر جو رو چل رہی تھی اس سے میں پوری طرح نہیں نکلا تھا بولا بھی تو اسی رو میں " مجو بھائی، اس شہر میں یہ کیا ہو رہا ہے ۔"

"کیا ہو رہا ہے " مجو بھائی نے لاپرواہی سے کہا ۔

"یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ کیا ہو رہا ہے ۔"

مجو بھائی جیسے نیند کے خمار سے نکل آئے ہوں ۔ مجھے گھور کے دیکھا اور بولے " جو ہو رہا ہے وہ کچھ نیا تو نہیں ہو رہا ۔" رک کے پھر بولے "یار میں نے تم سے ایک بات کہی تھی ۔ تم نے اسے درخور اعتنا نہیں سمجھا ۔"

"وہ کیا بات تھی ؟"

"یہی کہ اس شہر میں رہنا ہے تو سوچنا چھوڑ دو، ورنہ شہر چھوڑ دو ۔ میں کہتا ہوں کہ جو کچھ ہو رہا ہے کیا ہم اسے روک سکتے ہیں ۔ پھر سوچنے اور کڑھنے کا فائدہ ؟"

"وہ تو ٹھیک ہے ۔ مگر میں سوچتا ہوں کہ میں اس شہر میں کیا کر رہا ہوں ۔" (ص: ۱۸۴تا۱۸۵)

" بستی " کے ذاکر اور عرفان کی گفتگو میں سرسراتے ہوئے شک --- کوئی آدھی صدی بعد سمجھ میں آنے والی خیرل بھائی کی راست روی --- اور --- جواد کو چکرا دینے والی نوجوان شکور کی بات کی اصلیت سے آگہی کے بعد، وہ دکھ خوف اور تاسف مزید گہرا ہو جاتا ہے جو مصنف نے ان بہ ظاہر سادہ سے سوالوں میں گوندھا ہوا ہے کہ:

--اس شہر میں یہ کیا ہو رہا ہے ۔

---میں اس شہر میں کیا کر رہا ہوں ۔

---جو کچھ ہو رہا ہے کیا ہم اسے روک سکتے ہیں ۔ پھر سوچنے اور کڑھنے کا فائدہ ؟

دہشت میں گھرے دار الامان کے بیچ، جواد اور مجید کے یہ بہ ظاہر سادے سادے سے

سوال، اس بے بسی اور بے حسی کے "پردہ در" ہیں جو لگ بھگ نصف صدی کا الٹ پھیر دیکھنے کے باوجود کوئی بامعنی قوت اور طرزِ احساس و عمل بننے کے بجائے (توصیف جیسے بے تہوں میں) بھونڈی ظاہرداری اور (مرزا دلاور جیسے بے بسوں میں) خواہش مرگ بن گئی ہے۔

====== ۵ ======

مجو بھائی ہنسے۔ "میں اس شہر میں کیا کر رہا ہوں۔" میرے بیان کو اپنے طنزیہ لہجے میں دہرایا۔ پھر کہنے لگے "تم کہیں اور بھی ہوتے تو کیا کرتے۔ جہاں تم گئے تھے اور جہاں تمھیں کچھ کر دکھانے کا موقعہ ملا تھا وہاں تم نے کیا کیا۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے مگر۔۔۔" پتہ نہیں میں کیا کہنا چاہتا تھا۔

مجو بھائی نے الجھ کر میرا فقرہ پورا ہونے سے پہلے اسے بیچ میں کاٹ دیا۔ "مگر وگر کچھ نہیں۔ ہماری اگر مگر بے اثر ہے۔ سو مت بولو۔ دیکھتے رہو۔ اسی میں خیریت ہے۔"

"اچھا، یہاں خیریت کی کوئی صورت ہے۔ آپ تو ایسے کہہ رہے ہیں جیسے ہم کسی محفوظ گوشے میں بیٹھے ہیں۔ جیسے جو کچھ ہو رہا ہے، ہم سے دور ہوتا رہے گا۔ ہم اپنے گھونسلے میں بچے بیٹھے رہیں گے۔"

"بچنے کا معاملہ تو جواد میاں یہ ہے کہ قسمت والا ہی بچے گا۔ اور اپنی کوشش اور احتیاط سے نہیں بچے گا۔ جو مر رہے ہیں الل ٹپ مر رہے ہیں۔ جو بچے گا اللہ تو کلی بچے گا۔ اور یار مرنے جینے کی ویسے بھی کون سی منطق ہوتی ہے۔ اور ہم لوگ تو یوں ہی ایک مہمل زندگی گزار رہے ہیں۔"

"اگر یہ بات ہے تو آپ مجھے کس خوشی میں احتیاط برتنے کی تلقین فرمارہے تھے۔"

"اماں اپنی طرف سے تو احتیاط برتنی چاہیے۔ آگے جو ہو سو ہو۔ ہونی کو تو نہ تم روک سکتے ہو اور نہ میں روک سکتا ہوں۔" (ص: ۱۸۵ تا ۱۸۶)

====== گیارہ ======

ان ہی دنوں گنیش کے بالپن کا سنگھی نریندر، متھرا سے چل کر ہرج مرج کھینچتا دوارکا پہنچا۔ گنیش اسے گلے ملا اور متھرا کو یاد کرکے رو دیا۔

"گنیش!" نریندر کہنے لگا۔ "تو نے تو یاں پہ آکے اپنے سارے بال سفید کر لیے۔"

"متر، یہ بھی تو دیکھ کہ تب سے اب تک سمے کتنا بیت گیا ہے۔" گنیش نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ سمے کی بات کرتے کرتے بیتا سمے اس کی آنکھوں میں پھر گیا۔ متھرا نگری کی گلیاں، گنئیاں، گودھول، گوپیاں۔ "ہے متر، متھرا نگری کا کیا حال ہے۔؟"

"گنیش!" نریندر اداسی سے بولا۔ "متھرا نگری کا حال مت پوچھ ۔۔۔ وہ نگری رانڈ ہو گئی۔ جن کے دم سے اس کا سہاگ بنا ہوا تھا، وہ اسے چھوڑ گئے۔ اب وہاں نہ موہن کی مرلی باجتی ہے نہ پریم کی بانی گونجتی ہے نہ گوپیوں کے دل دھڑکتے ہیں۔ گلیوں میں دھول اڑتی ہے۔ گوپیاں اداس ہیں، گئیاں دبلی ہو گئی ہیں۔ جانے والے واں کی شوبھا اپنے سنگ لے گئے۔ اب وہ نگری اجاڑ ہے۔"

گنیش یہ سن کر رو دیا۔ نریندر بھی یہ حال سنا کر بہت دکھی ہوا، پھر بولا۔ "تم لوگوں نے متھرا کو چھوڑ کر ہمارے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ تم نے نیا نگر آباد کر لیا۔ نئے نگر میں تم چین کی بنسری بجاتے ہو۔ واں پہ ہم ہونق بنے پھرتے ہیں اور کشٹ کھینچتے ہیں۔"

"متر!" گنیش نے دکھی ہو کر کہا۔ "تجھ سے کس نے کہا کہ یہاں پہ ہم چین کی بنسری بجاتے ہیں۔ ہاں بجاتے تھے، پر اب نہیں۔ سکھ کے دن بیت گئے۔ اب ہم سنکٹ میں ہیں۔ دوارکا میں اس سے اندھکار مچا ہے۔ گلیوں، بازاروں میں سر کٹے گھومتے ہیں۔ بکریاں بھونکتی ہیں، گائیں رینکتی ہیں۔ مندروں سے گیڈروں کی چیخیں سنائی دیتی ہیں۔ ہون استھانوں میں سوئر بیٹھے اور چوہے دوڑتے دکھائی دیتے ہیں۔"

"گنیش! تو یہ کیا کہہ رہا ہے۔ مجھے اپنے کانوں پہ اعتبار نہیں آرہا ہے۔ ہم تو واں بیٹھے یہ سوچا کرتے تھے کہ دوارکا میں شردھا کی ورشا ہوتی ہے۔ شانتی ہے، پریم ہے، سکھ اور آنند ہے۔"

"تھا، پر اب نہیں۔ یاں کے سورما کوروکشیتر میں لڑنے گئے تھے۔ واں پہ وہ آپس میں بٹ گئے اور ایک دوسرے کے خلاف لڑے۔ واں سے وہ پھرے تو کرودھ کی آگ میں جل رہے تھے۔ خون ان کے سر پہ سوار تھا۔ انت کار وہ رنگ لایا۔ انھوں نے شانتی اور پریم کی اس نگری کو کوروکشیتر بنا دیا۔ نریندر، دوارکا اجڑ چکا ہے۔"

"پر متر، یہ تو عجب بات ہے۔ مرغی اپنی جان سے گئی، کھانے والوں کو سواد نہیں آیا۔ متھرا بھی اجڑ گیا اور دوارکا بھی اب سکھ آنند میں نہیں۔" نریندر رکا اور جھجکتے جھجکتے بولا۔ "گنیش! ایک بات پوچھوں؟"

"پوچھ!"

"سری کرشن مہاراج تو بہت بدھی مان ہیں، بہت گیانی ہیں۔ انھوں نے کیا سوچ کر متھرا چھوڑا تھا؟"

"نریندر، تو نے میرے دل کا چور پکڑ لیا۔ یہ پرشن تو مجھے بھی بیکل رکھتا ہے۔"

"شاید!" نریندر رکتے رکتے بولا۔ "شاید انھوں نے اپنی جنم بھومی کو چھوڑ کر ۔۔۔ شاید ۔۔۔"

"صاف صاف کیوں نہیں کہتا کہ اچھا نہیں کیا۔"

" پر اب وہ کیا کہتے ہیں، کیا سوچتے ہیں؟"

" اب کیا وہ کہتے ہیں؟" گنیش کڑوی سی ہنسی ہنسا۔ " اب وہ کیا کہیں گے۔ کہتے کچھ نہیں۔ پر مجھے لگتا ہے کہ وہ خوش نہیں ہیں۔ مرلی تو وہ متھرا ہی میں چھوڑ آئے تھے۔ یاں آکر گدا چکر بھی ان سے چھن گیا۔"

" کیا کہا؟" نریندر اچھل پڑا۔ " گدا چکر چھن گیا، یہ تو کیا کہہ رہا ہے۔ کون مائی کا لال ان سے ان کا گدا چکر چھین سکتا ہے۔"

" کسی مائی کے لال نے نہیں چھینا۔ آکاش سے آیا تھا، آکاش میں چلا گیا۔ پتہ ہے کیا ہوا، بھگوان کا رتھ اپنی آن بان سے چلا جا رہا تھا کہ تین اپسرائیں اوپر سے آئیں۔ انھوں نے رتھ کا جھنڈا اتار لیا۔ ابھی وہ یہ کرتی تھیں کہ بھگوان کے ہاتھ سے گدا چکر نکلا اور آکاش میں جا کے کھو گیا۔"

نریندر سناٹے میں آگیا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کہے۔ گنیش خود ہی بولا، کچھ ڈری ڈری آواز میں۔ " نریندر! یہ اچھے اشارے نہیں ہیں۔ لگتا ہے کہ کچھ ہونے والا ہے۔"

" اتنا کچھ تو ہو گیا، اب اور کیا ہو گا؟"

" لگتا ہے کہ ابھی اور بہت کچھ ہونے والا ہے۔"

" کیا ہونے والا ہے؟"

" یہ تو کوئی گیانی ہی بتائے گا۔۔۔" (ص: ۲۷۳ تا ۲۷۵)

===== و =====

اتنے میں نعمت خاں نے چائے لا کر سامنے رکھ دی۔ اب مجّو بھائی کی جان میں جان آئی۔ پہلے ہی گھونٹ کے ساتھ پھریری لی اور بولے " تم سے بھی زیادہ متفکر اپنے آقا حسن رہتے ہیں۔ جب دیکھو فکر مند۔ شہر کے اندیشے میں دبلے ہوئے چلے جا رہے ہیں۔ مجھ سے پوچھنے لگے، بھائی مجید الحسینی تمھیں آگے کیا نظر آتا ہے۔ میں نے کہا، سمندر، میرا منھ تکنے لگے۔ مجھے کہ مخول کر رہا ہوں۔ کہنے لگے، بھائی مجید الحسینی، میں نے سنجیدگی سے تم سے یہ سوال کیا ہے۔ میں نے کہا، قبلہ اقن صاحب میں نے بھی سنجیدگی ہی سے کہا ہے۔ چپ ہی تو ہو گئے۔"

اور اب میں بھی چپ تھا۔ کیا کہتا، مجو بھائی نے میری بات اس طرح کاٹی کہ اب سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کہوں۔

" مجّو بھائی۔" آخر میں نے زبان کھولی " مجھے اپنی بڑی بھابی کی ایک بات رہ رہ کر یاد آتی ہے۔"

" وہ کیا بات ہے۔"

" ہمارے ایک کزن ہیں پیارے میاں۔ جب ہمارے میاں جان کی آنکھ بند ہو گئی تو

انھوں نے ایک ہماری جدی حویلی کو چھوڑ کر ساری جائیداد اونے پونے بکوادی اور اپنے حصے کی بلکہ اپنے حصے سے زیادہ ایک موٹی رقم لے کر پاکستان آگئے ۔ مگر ساری رقم کھاپی کر اڑادی ۔ پاکستان میں وہ جم نہیں پائے ۔ اس کے بعد ہندوستان گئے تو اپنا احوال بیان کرتے ہوئے کہنے لگے بڑی بھابی ، آپ کی بددعا مجھے لے بیٹھی ۔ بڑی بھابی بولیں ، بھیا ہم نے تو تمھیں کوئی بددعا نہیں دی مگر ہمارے بددعا نہ دینے سے کیا ہوتا ہے ۔ زمین کو اجاڑو گے تو زمین تو کوسے گی ۔ زمین کے کوسے آباد نہیں ہوا کرتے ۔ ۔ ۔ "

"ہاں ، یہ سوچنے والی بات ہے ۔" مجو بھائی اب واقعی سنجیدہ نظر آرہے تھے ۔

" مجو بھائی ، مجھے لگتا ہے کہ اس کا اطلاق خالی پیارے میاں پر نہیں ہوتا ۔ ۔ ۔ اور کسی پر ہو یا نہ ہو مجھ پر ہوتا ہے ۔"

"میں نے تم سے کیا کہا تھا ۔"

"کیا کہا تھا ۔"

" تمھیں یاد ہونا چاہیے ۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ آدمی یا تو سفر نہ کرے ۔ اور کرے تو سفر کو بیچ میں نہ چھوڑے ۔ تم نے سفر کا کشٹ بھی اٹھایا اور اسے پایہ تکمیل تک بھی نہیں پہنچایا ۔ تم سفر کو ادھورا چھوڑ آئے ہو ۔ یہ آدھا چھوٹا سفر تمھیں ستائے گا ۔ اور پیارے میرا خیال ہے کہ اس نے تمھیں ستانا شروع کر دیا ہے ۔"

"شاید ۔"

" شاید نہیں ۔ یقیناً ، پیارے ابھی تو تمھیں اپنی بڑی بھابی کی کہی ہوئی ایک بات یاد آئی ہے ۔ ابھی کسی اور کی کہی ہوئی باتیں بھی یاد آئیں گی ۔" یہ کہتے کہتے مجو بھائی نے جماہی لی ۔ "یار نیند آرہی ہے ۔" (ص: ۱۸۶ تا ۱۸۷)

" کسی اور کی کہی ہوئی باتیں ۔ ۔ ۔ " سے مجید کی مراد ، میمونہ کی باتیں ہیں ۔ جن پر ، اس کے خیال کے مطابق ، خاطر خواہ توجہ نہ دینے کے باعث جواد کا سفر ادھورا رہا ۔ لہٰذا جواد بھی اپنے سفر کی کوئی ایسی بات مجید کے سامنے دہراتا ہے تو وہ اسے اپنے ہی خیال کی تائید تصور کرتا ہے جب کہ جواد کو یاد آنے والی زیادہ تر باتیں اس حقیقت کو مزید نمایاں کرتی ہیں جو خیرل بھائی اور شکور کے رویوں سے اس کے ذہن و دل پر منکشف ہوئی ہے ۔

متھرا سے دوار کا منتقل ہونے والے یادووں کا قصہ دراصل جواد اور اس جیسے جنم بھومی چھوڑنے والوں کا حالیہ احوال ہے ۔ ۔ ۔ صیغہ حال کی عبارت میں زمانہ ماضی کا قصہ ۔ ۔ ۔ جواد کے دوار کا نگر میں بچے اندھکار کی ان شدتوں کو گہرے دکھ اور طنز کے ساتھ نمایاں کر رہا ہے جنھیں نرے حال پہ مرکوز ادھوری نظر اور صرف زمانہ حال کا ایک تہائی صیغہ ، دیکھنے اور بیان کرنے کا اہل نہیں ۔

گنیش اور نریندر کی گفتگو میں بار بار ابھر تا تذبذب اور خوف بھرے لاجواب سوال، اس شوریدہ سناٹے اور جاں سوز استفہام کو کئی گنا شدید بنا رہے ہیں جو دار الامان میں جواد جیسوں کے ذہن اور زبان کا ناسور بن گئے ہیں۔ گنیش اور نریندر کی یہ ملاقات جواد پر ہوئے مذکورہ انکشاف کی معنوی تہیں بھی کھول رہی ہے اور مصنف کی جانب سے اس کی بالواسطہ تائید بھی محسوس ہوتی ہے۔ اس تائید کو کرشن مہاراج کے مہر بہ لب ہونے کا وہ ذکر انتہائی پر قوت بنا رہا ہے جس سے پہلے گنیش کڑوی سی ہنسی ہنسا تھا۔ مزید برآں، متھرا چھوڑ دوار کا بسانے پر شان و شکوہ' قوت و جلال اور روحانیت و مرکزیت کے سماوی علائم سے بھی کرشن مہاراج کے ہاتھ دھو بیٹھنے کا ذکر، اک ایسے خلا کی جانب اشارہ کرتا ہے جو بے آب آنکھوں سے دیکھے ہوئے خوابوں کو پر حصول تعبیر سے آنکنے والے معاشروں کا مقدر ہے۔

===== ز =====

"چائے کے بعد بھی نیند آرہی ہے۔"

"ہاں واقعی تعجب ہے۔ چائے کے زور پر تو میں پوری رات آنکھوں میں کاٹ سکتا ہوں پتہ نہیں آج کیا بات ہے۔ مگر تم تو جاگ رہے ہو نا۔"

"میری تو نیند ہی جیسے غائب ہو گئی ہو۔"

"بس پھر جاگو۔ میں سوتا ہوں۔" یہ کہتے کہتے مجو بھائی جو ابھی تھوڑی دیر پہلے اٹھ کر بیٹھے تھے پھر دراز ہو گئے۔ اور کمال ہے، فوراً ہی خراٹے بھی لینے لگے۔

میری آنکھوں میں نیند دور دور نہیں تھی۔ ذہن میں ایک دھماچوکڑی مچی ہوئی تھی۔ حیرانی اور پریشانی کہ اچھا یہ وہی شہر ہے۔ اتنا بدل گیا۔ شہر اس طرح بھی بدلتے ہیں جیسے کایا کلپ ہو گئی ہو۔ شاد آباد، گہما گہمی، چہل پہل اور پھر جیسے پورا شہر منقلب ہو گیا ہو۔ یہ تو واقعی وہی بات ہو گئی جو میں اس روز مجو بھائی کے جواب میں کہہ رہا تھا۔ اور اچانک ایک وسوسہ میرے اندر پیدا ہوا۔ جیسے آس پاس کہیں کوہ ندا ہے۔ اب تک کہاں چھپا ہوا تھا۔ اب کیسے نمودار ہو گیا۔ سو یوں ہوا کہ جب مہینہ گزرا اور وہ تاریخ آئی تو پھر اسی ساعت وہی کچھ ہوا۔ ہوا حیران کہ آواز کیسی ہے اور کہاں کوہ ندا ہے۔ اب تک کہاں چھپا ہوا تھا۔ اب کیسے نمودار ہو گیا۔ سو یوں ہوا کہ جب مہینہ گزرا اور وہ تاریخ آئی تو پھر اسی ساعت وہی کچھ ہوا۔ وہ حیران کہ آواز کیسی ہے اور کہاں سے آتی ہے۔ لوگ کیوں سراسیمہ ہیں۔ کیوں سب کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا ہے، آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی ہیں اور کیوں جو ہے وہ سارے کام چھوڑ چھاڑ سب کچھ بھول بھال اپنے گھر کی طرف دوڑا جاتا ہے۔ وہ ایسا سوچتا تھا کہ ناگاہ ایک سمت سے ایک جوان آتا دکھائی دیا اس رنگ سے کہ ہچکیاں کھاتا ہے مگر دوڑا چلا جاتا ہے۔ پیچھے اس کے ایک پیرزن گریہ کرتی دوڑ رہی

ہے اور چلا رہی ہے، میرے بیٹے، میرے بیٹے، اس نے چاہا کہ بڑھ کر اس جوان کو دبوچے اور اسے ملامت کرے کہ کیوں اپنی ضعیف ماں کو پریشان کرتا ہے۔ پر وہ جوان اس کی گرفت سے نکلا، مچھلی کی مثال تڑپا اور سمت اس کوہ کے دوڑتا چلا گیا۔ وہ بھی اس کے تعاقب میں اس کے پیچھے چلا۔ مگر دم کے دم میں وہ کوہ کے بیچ جاکر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ تب وہ افسردہ و پژمردہ پلٹا۔ سوچا کہ اس ضعیفہ کو دلاسا دے۔ پر اس نے دیکھا کہ وہ پیرزن اب وہاں نہیں ہے۔ اثر آثار اس دہشت کے مٹ چکے تھے۔ پھر وہی اژدحام، مجمع خاص و عام، بزاری بزاری، زوروں پر دکانداری جوہری، صراف، بزاز، گل فروش، عطر فروش سب چاق و چوبند بیٹھے ہوئے، خریداروں سے منھ مانگی قیمتیں وصول کرتے ہوئے۔ کٹورا بجتا ہے۔ کوچہ طبلہ عطار بنا ہے۔ یہ دیکھ وہ مزید حیران ہوا اور دہشت مزید اس پہ طاری ہوئی۔ یاالٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔ وہ کیا تھا، یہ کیا ہے۔ جوان آنکھوں نے دیکھا اور دیکھ رہی ہیں وہ حقیقت ہے یا توہم کا کارخانہ۔ (ص: ۱۸۷ تا ۱۸۸)

===== بارہ =====

اچانک ایک سمت سے ایک کار نمودار ہوئی اور ہارن دیتی ہوئی تیزی سے دوسری سمت میں چلی گئی۔ بس اس کے ساتھ ہی مجھے احساس ہوا کہ دور کی سڑکوں پر ایک دم سے بہت سے رکشائیں، ٹیکسیاں، بسیں، موٹریں نکل پڑی ہیں اور شور کرتی ہوئی دوڑ رہی ہیں۔ (ص: ۲۸۸)

تو اب صبح اپنے عروج پر تھی۔ اور میں حیران بھی اور خوش بھی کہ ایسے خراب زمانے میں اتنی خوش گوار، اتنی شاد آباد صبح، جیسے شہر کو کچھ ہوا ہی نہیں ہے۔ وہی بھلے دنوں کا جیتا جاگتا شہر اور اس کی جیتی جاگتی صبحیں۔ تو گویا اس شہر کی صبحیں ابھی تک زندہ و سلامت تھیں، ابھی تک گزرے دنوں کی صبحوں کے تسلسل میں چڑھ ڈوب رہی تھیں۔ یہ تو نیک علامت ہے، میں نے سوچا، ابھی تک اس شہر میں چڑیاں اسی طرح منھ اندھیرے چہکنا شروع کر دیتی ہیں، لڑکیاں اپنی اجلی اجلی پوشاکیں پہن کر اپنے اپنے کالجوں کی وین میں لدی پھندی اپنے کالجوں کی طرف جاتی نظر آتی ہیں، بچے گلے میں بیگ ڈالے اپنے اپنے اسکول کے لیے رواں دواں نظر آتے ہیں، کتنے پیدل، باقی ٹولیوں کی ٹولیاں، بسوں، ویگنوں، رکشاؤں، میں لدی پھندی۔ پھر تو اس شہر کی بحالی صحت کی توقع کی جا سکتی ہے۔ یا شاید جیسے میں زندگی اور موت کی کشمکش سے گزر کر، لمبی اذیت سے نکل کر یہاں خوش کھڑا ہوں یہ شہر بھی اپنی اذیت کے دن گزار کر اب شفا پا چکا ہے۔ خیر اگر ایسا نہ بھی ہو، میں نے سوچا، اتنا تو طے ہے کہ اس کی صبحوں کی پاکیزگی پر ابھی کوئی آنچ نہیں آئی ہے۔ یہ نیک فال ہے۔ ایک شہر کی جب تک صبحیں سلامت ہیں اس کی سلامتی کی توقع رکھی جا سکتی ہے۔ دن اور رات کے باقی پہر کسی حال میں ہوں، صبح کے پہر کو بچا کر رکھنا چاہیے۔ خوش گوار صبح کسی

ڈوبتے شہر کا آخری سہارا ہوتی ہے۔ جب صبحیں بھی ڈوب جائیں تو۔۔۔ (ص: ۲۸۸تا۲۸۹)

یہ جواد ہے جو اپنے شہر کے ایک بازار میں ہوئی گولی باری سے شدید زخم کھا کر کافی روز اسپتال میں رہنے کے بعد اپنے گھر لوٹا ہے اور شہر پہ پھیلتی ایک صبح کو اپنی بالکنی سے دیکھ رہا ہے۔ ایسے خراب زمانے میں خوش گوار و شاداب صبح، گویا حاتم طائی کو وہ ندا سے پلٹا ہے تو نہ گریہ کناں پیر زن وہاں ہے نہ اس دہشت کے آثار جس نے شہر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔۔۔ لیکن وہ وسوسہ برقرار ہے کہ آس پاس کہیں کوہ ندا ہے، جب وہ تاریخ آئے گی تو جانے کس کی پکار آجائے۔۔۔ اور یہ بے یقینی بھی کہیں لاشعور میں موجود کہ آیا یہ شہر اپنی اذیت کے دن گزار کر شفا پا چکا ہے؟ اور جانے کب اس ڈوبتے شہر کے دن رات اس کی صبحوں کو بھی اپنی کالک میں لتھیڑ لیں گے؟

خوش گوار صبح کسی ڈوبتے شہر کا آخری سہارا ہوتی ہے مگر لگتا ہے کہ جواد کے ذہن و دل کے کسی گوشے میں اس تنکے کے بھی ڈوب جانے کا اندیشہ پنپ رہا ہے۔ اندیشوں کے بھنور میں گھرے اس شہر کا یہ نقش ظاہر، جس کے آگے سمندر ہے، یہ غور دیکھیں تو کھلتا ہے کہ انتظار حسین کی دیگر تحریروں، بالخصوص افسانوں میں زیر سطح کام کرنے والا گہرا طنز یہاں پوری شدت سے بروئے کار آیا ہے۔ زبان و بیان، خاص طور سے مکالمے، پر انتظار حسین کی ماہرانہ گرفت نے افراد قصہ کی بہ ظاہر سیدھی سادی گفتگو کو ان کے باطن میں گندھی ظاہر داری، بے حسی اور سطحیت کا ایسا محضر نامہ بنا دیا ہے کہ جس میں اس شہر پہ طاری رات اور اجتماعی کھوکھلے پن کی وجوہ صاف پڑھی جا سکتی ہیں۔۔۔ہاں، جب ان وجوہ کا ماخذ ہر طرح صرف وہی لوگ نظر آتے ہیں جو کبھی ہرج مرج کھینچتے وہاں پہنچے تھے، یعنی جنھوں نے ایک نظریے پر اپنے لہو سے صاد کیا تھا، تو یہ سوال اپنا جواب طلب کرتا ہے کہ کیا اس خطے میں پہلے سے بسے دیگر افراد کے طرز عمل میں ایسا کوئی عنصر نہیں جو اس شہر کو شب آلود بنانے میں شامل رہا ہو؟

"آپ کون ہیں؟" وہ عورت اس سے پھر پوچھ رہی تھی۔ وہ چونک گئی۔ جیسے گہری نیند سے ہڑبڑا کر اٹھنے والا ادھر ادھر دیکھتا کہ وہ کہاں ہے، اس نے اپنے چاروں طرف دیکھا: میں کہاں ہوں، کن میں ہوں؟ پھر یہ اندازہ کر کے ڈھارس ہوئی کہ تکلف والی دعوتوں میں خوب پیٹ بھر کر کھا پی چکنے کے بعد کا وہ لمحہ آگیا جب عورتیں ایک دوسرے سے بچوں کی تعداد، شوہر کا مزاج اور اسی طرح کی ذاتی، نجی باتوں کا کرید کرید کر تبادلہ شروع کر دیتی ہیں۔ "آپ کون ہیں؟" وہ عورت اس سے پوچھ رہی تھی۔

اس نے غور سے اس عورت کی طرف دیکھا۔ اب یاد نہیں آیا کہ دفتر کے کن صاحب کی بیگم ہیں یہ، جنھوں نے اس بوتیک سے جوڑا خریدنے کا ذکر کیا تھا اور جن کے دانتوں پر بھی لپ اسٹک کا ہلکا سا رنگ اتر آیا تھا۔

"جی میرے شوہر جی میریس ہیں اور میں کیپری کورن ---" اس نے بہت سنجیدگی سے جواب دیا۔

"ہوں گے جی - میں یہ نہیں پوچھ رہی - میں یہ پوچھ رہی ہوں کہ آپ لوگ ہیں کون؟"

"جی --- میں سمجھی نہیں؟" اس نے گڑبڑا کر کہا۔ اور ساتھ ہی دل میں دھکڑ پکڑ سی ہونے لگی کہ اس سوال کا وہی مطلب نہ ہو جس کا اسے اندیشہ ہو رہا ہے۔

"میں تو جی یہ پوچھ رہی ہوں کہ آپ لوگ ہیں کون؟" عورت نے سوال کو پھر زور دے کر پوچھا۔

وہ اس عورت کا منھ تکے جا رہی تھی۔

"میں یہ پوچھ رہی ہوں کہ آپ لوگ ہندوستانی ہیں ناں؟" عورت نے جیسے سوال کا حل بھی بتا دیا۔

اب کی اس نے تیزی سے جواب دیا۔ "بالکل نہیں۔ میں تو پیدا بھی پاکستان میں ہوئی تھی۔" پھر اسے یاد آیا کہ سہارن پور میں جو خالہ رہ گئی تھیں، ان کے بیٹے ایک دفعہ آئے تھے تو انھوں نے کہا تھا کہ جو لوگ ہمیں کہتے کہ یہاں رہ کر ادھر کے گن گاتے ہو تو میں ان کو بتاؤں گا کہ ہندوستانی کہلانے کا شوق ہے تو وہیں چلے جاؤ، واگھا پار کرتے ہی تمھیں ہر ایک ہندوستانی کہے گا، پھر کہتا ہی رہے گا۔ مگر اس نے کچھ نہیں کہا۔

"پیدا ہوئی ہوں گی، لیکن میرا مطلب ہے کہ آپ لوگ مہاجر ہیں؟" عورت نے سوال کے الفاظ بدل کر پوچھا۔

اس نے ایک بار پھر جواب دیا۔ "میرا مطلب ہے آپ اردو اسپیکنگ ہیں؟" اس عورت نے پھر پوچھا۔

"لیکن اردو تو اس وقت آپ بھی بول رہی ہیں" اس نے تیزی سے جواب دیا۔

"آپ تو برا مان رہی ہیں، آپ سے یہی تو پوچھا تھا کہ آپ لوگ کون ہیں۔ آخر بندے بشر کا پتہ ہوتا ہی ہے --- ناراض نہ ہوں۔ آپ تو میری بات ہی نہیں سن رہی ہیں ---"

(افسانہ: "کون" از آصف فرخی۔ مشمولہ "شہر بیتی" -- ص: ۳۹ تا ۴۱)

انتظار حسین نے اپنے افسانوں کی معنویت میں وسعت اور اثر خیزی میں شدت کے لیے داستانوں، کتھاؤں، جاتکوں، حکایتوں اور ملفوظات وغیرہ کے اسالیب کو اور ان کے کرداروں سے وابستہ صفات، اقدامات اور لفظیات کو اس قدر برتا ہے کہ یہ وسائل بیان ان کے اسلوب کی معروف و نمایاں پہچان بن گئے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اب سے کچھ برس پہلے تک انتظار حسین کے یہ وسائل بیان پر کشش و معنی خیز ہوا کرتے تھے مگر اب یہی وسائل چلے ہوئے

کارتوس کی طرح بے قوت محسوس ہونے لگے ہیں۔ "آگے سمندر ہے" میں ان وسائل کی اکتاہٹ انگیز تکرار سے لگتا ہے کہ ان کے لوبھ میں پڑ کر انتظار حسین کو اپنے قلم کی اس قوت پر یقین نہیں رہا جو (بہ ظاہر) سادہ بیانیہ اور مکالمہ کی صورت میں اپنا جادو جگاتی رہی ہے۔ جیسا کہ عرض کیا گیا، اس ناول میں مکالمے کے ماہرانہ استعمال نے افراد قصہ کی ذہنی کیفیت کو اور راوی کے بہ ظاہر سیدھے سادے بیانیہ نے مرکزی صورت حال کو ان کی پوری پوری شدت سمیت منکشف کیا ہے۔۔۔ مگر اس کے باوجود، لوبھ کے ہاتھوں مجبور مصنف وہ چلے ہوئے کارتوس بھی بے دریغ استعمال کرتا ہے تو ناول کا مرکزی نقطہ ان کے بے جان ڈھیر میں گم ہونے لگتا ہے۔ یہ وسائل، معدودے چند مواقع کے علاوہ، زیادہ تر بے اثر ہی رہے ہیں، ان کے موثر و معنی خیز استعمال کی مثالیں غالباً بس وہی ہیں جو اس مطالعے میں اقتباس کی گئی ہیں۔ ناول نگار، مذکورہ لوبھ میں نہ پڑتا اور مذکورہ بالا "دیگر افراد" کے طرز فکر و عمل کو بھی نشان زد کرتا تو اردو کو اس کمزور ناول کے بہ جائے ایک بلیغ طنزیہ ناول نصیب ہو سکتا تھا۔

○ ○ ○

کالی رات

آصف فرخی

دستنبو

وہی شہر اور رہ رہ کر اٹھنے والا اندیشہ کہ اب کی بار دلی اجڑ نہ جائے۔ محرم کا چاند ہو گیا ہے۔

یہ شہر ہے اور میں ہوں۔

دونوں اندھیرے میں ہیں۔ میری بالکنی سے جہاں تک دکھائی دیتا ہے، شہر ہے اور شہر اندھیرے میں ہے۔ جہاں تک دکھائی دے سکتا ہے، میں اسے دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میری کوشش ناکام رہتی ہے۔ ساتویں منزل کی بالکنی سے میں اسے سیال اندھیرے میں ڈوبتے ہوئے دیکھ رہا ہوں اور جو میں دیکھ رہا ہوں، اسے وہ پرچھائیں بنا کر میری طرف واپس کر رہا ہے۔

وہ پرچھائیں کچھ نہیں ہے۔

جہاں میں کھڑا ہوں وہاں سے کچھ دکھائی نہیں دے رہا ہے۔ دیکھنے کے لیے کچھ نہیں۔ اندھیرا ہے اور اندھیرا۔ ایک دبیز چادر ہے جس کی تہہ کھل گئی ہے اور ہوا کے دوش پر شہر کو ڈھانپنے کے لیے اتری چلی آرہی ہے۔ میں قیاس کرتا ہوں: یہاں عمارتیں ہونا چاہیے تھیں۔ وہاں اندھیرے میں دھبے ہیں جن کی شکلیں واضح ہونا چاہیں: مستطیل، محراب دار، بلند و بالا۔ وہاں کچھ نہیں ہے۔ اور اس طرف مکان۔ بیچ میں سڑک اور دونوں طرف ترتیب وار مکان۔ اور لوگ۔ اس شہر کے لوگ۔ دکھائی دینے کے لیے کچھ نہیں۔

بالکنی کے جنگلے پر اپنی گرفت مضبوط کر لیتا ہوں۔ گہرا ہوتا ہوا اندھیرا سارے شہر کو اپنے اندر سمیٹ نہیں سکتا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے ایسا لگتا ہے کہ سارا شہر چرا لیا گیا ہے اور یہ گلیاں، بازار، عمارتیں، چوک دوبارہ کسی عجائب گھر کے شوکیس میں ترتیب وار نمودار ہوں گے اور "موئن جو ڈرو: مردوں کا ٹیلہ"، اس پر تختی نصب ہو چکی ہو گی۔ میں بالکنی میں کھڑا دیکھتا رہ جاؤں گا۔

شہر کے کچھ آثار نظر تو آئیں۔ میں اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کو کوشش کرتا ہوں۔ بجلی کا بریک ڈاؤن دور دور تک ہوا ہے، میں اندازہ لگاتا ہوں۔ خالی آسمان کے ایک کونے میں پہلی محرم کا پتلا چاند ناخن کی طرح اٹکا ہوا ہے۔

تب اس سناٹے میں ایک چیخ سنائی دیتی ہے۔

درخت کے پتوں میں سرسراہٹ تک نہیں۔ ہوا بالکل بند ہے۔ جس سے گھبرا کر ضمیر اور فاروق اوپر چھت پر آگئے ہیں۔ میں ان کی باتیں صاف سن سکتا ہوں۔ وہ مجھے دیکھ نہیں سکتے۔

اندھیرا بہت ہے۔

"محرم کا چاند نظر آگیا۔ اب مجلسیں شروع.... اچھے خالو کا اس بار بھی زیارت کے لیے جانا رہ گیا...." "یہ ضمیر ہو گا۔

اور یہ فاروق۔ "کیا کریں گے وہاں جا کر؟ ماتم کے بہتیرے موقع ہمیں ملے جا رہے ہیں ...."

"تم تو قائل ہی نہیں ہو۔ بھئی عقیدے کی بات ہوتی ہے۔"

"بجلی پانی تو یہاں بھی بند رہنے لگے ہیں۔ معصومین کا بندوبست آپ کر والیجیے، باقی کربلا ہمیں برپا ہوئی جاتی ہے...."

"کیوں کفر بک رہے ہو...."

"آپ تو خفا ہونے لگے۔ مجھے تو امراؤ جان ادا کا وہ سین یاد آرہا تھا جب لکھنو میں غدر مچا ہوا ہے، سپاہی گھر گھر گھس رہے ہیں اور شہر سے باہر بھاگنے والوں کا تانتا بندھا ہوا ہے، محرم کے دن ہیں اور سوز خوانی شروع ہوتی ہے۔ پھر تو جیسے سارا اسکرین ماتمی رنگ میں ڈوب جاتا ہے.... میرے تو آنسو نکل پڑے یہاں کا سوچ کر...."

اوہ، تم فلم کی بات کر رہے ہو؟"

"تو اور کیا...."

"لیکن یہ آواز کیسی ہے؟ کس سمت سے آرہی ہے؟"

اندھیرے میں ڈوبی گلیوں پر سناٹا طاری ہے۔ وہ والا سناٹا جس کی چبھن سے شک پڑنے لگتا ہے کہ کوئی نہ کوئی دبے پاؤں پیچھے آرہا ہے اور موقع ملتے ہی حملہ کر بیٹھے گا۔

اتھاہ سناٹے کو توڑتی ہوئی وہ چیخ پھر ابھرتی ہے۔

چیخ کے تھم جانے کے بعد سناٹا دوبارہ سے یوں جڑ جاتا ہے جیسے اندھیرے میں دراڑ ہی نہ پڑی ہو۔

میں اب بھی اندھیرے میں تلاش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ کوئی سراغ مل جائے: استعمال کیے ہوئے ہتھیار، چلے ہوئے کارتوس، ٹائروں کے نشان، پولیس کی گاڑیاں، جلی ہوئی عمارتیں، مکانوں اور دیواروں میں گولیوں کی باڑھ سے پڑنے والے شگاف، پٹرول چھڑک کر جلائی گئی بسوں کے ڈھانچے، سڑکوں پر کھڑی کی گئی رکاوٹیں.... کوئی چیز جو بتائے اس شہر پر کیا بیتی۔

اندھیرے کے سوا مجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔

لان میں کرسی ڈالے اچھے خالو اکیلے بیٹھے ہوئے ہیں۔

میں نے سوچا، ان کی مزاج پرسی کرتا چلوں۔ جگت اچھے خالو ہیں!

ان کے سامنے ڈاکہ پڑنے کا کوئی واقعہ مت دہرانا، عین وقت پر فاروق کی تنبیہہ مجھے یاد آئی۔ یہ پرانے شکاریوں کے جیسے ہوگئے ہیں، تم ایک واقعہ سناؤ گے تو یہ دس سنائیں گے۔

فاروق دروازے پر کھڑا ہوا تھا۔

پوچھتے پوچھتے میں رک گیا۔ میں نے اپنے سوال کو نیوٹرل بنا دیا۔

"آج اخبار میں کیا خبریں ہیں اچھے خالو؟" میں نے اخلاقاً پوچھا۔

"میں نے اخبار پڑھنا چھوڑ دیا ہے میاں۔ میں تو ان دنوں خواجہ حسن نظامی والی "دلی کی جاں کنی۔" پڑھ رہا ہوں۔ مجھے تو وہ زیادہ Relevant معلوم ہوتی ہے۔" انھوں نے جواب دیا۔

میں حیران ہو کر ان کا منھ تکنے لگا۔

"بھئی یہ قصہ نہیں واقعہ ہے اور واقعہ یوں ہے...." انھوں نے پھریری لی۔

"آپ نے تو حد کر دی۔" فاروق نے انھیں ٹوک دیا۔ "آپ سے تو کوئی وقت بھی پوچھ لے تو آپ ہندوستان سے شروع کریں گے۔ اور وہ بھی غدر سے...." اس کے لہجے پر تلخی حاوی ہوتی جا رہی تھی۔ "آپ سمجھتے کیوں نہیں کہ یہ سب باتیں آوٹ آف ڈیٹ ہو چکی ہیں۔ یہاں کی بات کیجیے...."

لو بھئی سن سینتالیس تو یہاں کے یہاں چھڑ گیا۔ اب اس ورق کو پلٹ دینا ہی اچھا۔ میں نے بات بدلنے کے لیے پھر اچھے خالو کو چھیڑا۔ "بتائیے بھی، اچھے خالو۔ یہ بتائیے کیا ہو رہا ہے؟"

"فائرنگ اور بھتّا" انھوں نے ٹکڑا سا توڑ کر ہاتھ پر دھ دیا۔ "یہی ہو رہا ہے آج کل شہر میں۔" وہ ابھی تک جلے بھنے بیٹھے تھے۔

"گلی کے ہر مکان سے بھتّا۔ ایک ایک دکان سے بھتّا۔ اور وہ بھی روز کے روز۔ شادی کرنے کا کوئی نام لے تو لڑکی والوں سے الگ اور لڑکے والوں سے الگ بھتّا۔ کل ہمارے ملنے والوں میں میت ہو گئی۔ جنازہ اٹھا بھی نہ تھا کہ قنات اٹھا کر وہی دس بارہ کا ٹولہ اندر گھس آیا اور مرنے والے کے گھر سے چاولوں کی دیگ بھتّے میں لے گئے۔ تو یہ ہو رہا ہے...." جوش میں بولتے بولتے وہ سانس لینے کے لیے رکے۔

"تلنگے" فاروق نے دروازے ہی میں سے تبصرہ کیا۔ "لیکن یہ سب تو ہونا ہی تھا...."

"یہ نوبت آگئی ہے: اب اور کیا دیکھنا باقی رہ گیا ہے؟" اچھے خالو نے اپنی تمام تر توجہ میری جانب مبذول کر لی۔ "پستی کی انتہا ہو گئی ہے۔ اب تو ایک ہی صورت ہے کہ کوئی اٹھے اور سر سید کی اسپرٹ سے کام کرے۔ وہی مشنریوں کی طرح دھن کا پکا ہو اور کام کرے گر اس روٹ

لیول پر۔ کمیونٹی ڈیولپمنٹ کا احساس بیدار کرے، ایجوکیشن اور سائنس میں لوگ آئیں۔ ورنہ جو رہا سہا ہے وہ بھی ہاتھ سے نکل جائے گا.... " وہ کرسی پر بیٹھے ہوئے مجھے بتا رہے تھے اور بس قریب تھا کہ میں اٹھ کھڑا ہوں اور جوش کے عالم میں ان کے ساتھ چل پڑوں۔ وہ تو فاروق بیچ میں بول اٹھا۔

"آپ بھی کہاں کی باتیں کرتے ہیں۔ ایک مرتبہ بندوق ہاتھ میں آگئی تو پھر اسے چھوڑ کر قلم کون پکڑے گا؟ سیدھی انگلیوں سے گھی نہیں نکلتا، ہم نے بہت آزما کے دیکھ لیا۔ اور آج کل اتنا صبر کون کرتا ہے؟ فرسٹریشن تو تھا ہی۔ اوپر سے مجرمانہ ذہنیت بھی آگئی ہے۔ آپ تعلیم کا کہہ رہے ہیں.... پرسوں عابدی صاحب کہہ رہے تھے ان کا لڑکا میٹرک کی انگریزی میں پھر رہ گیا۔ ہیڈ ماسٹر کے کہنے پر اس کی جگہ جو لڑکا امتحان دینے آیا تھا وہ تین ہی سوال حل کر سکا۔ امتحان میں نقل بھی گن پوائنٹ پر ہوتی ہے۔ رد کو تو کہتے ہیں آخر ہمیں بھی تو نوکریاں لینی ہیں۔ بالکل Desperate ہو گئے ہیں۔ ایک دفعہ یہ رویہ پیدا ہو جائے تو پھر پیچھے ہٹنا آسان نہیں.... "

"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہندوستانی مسلمان ہم سے بہتر رہے؟" اچھے خالو نے سوال داغا اور دونوں اسی بحث میں الجھ گئے جو روز شروع ہو جاتی تھی اور بہت جلد ناگوار رخ اختیار کر لیتی تھی۔

ایک بار پھر موضوع بدلنے کے لیے میں نے سوچا، کوئی امید افزا بات کرنی چاہیے۔ "فاروق تمہارا گرین کارڈ کب تک پکا ہو جائے گا؟" میں نے پوچھا۔

"اب دیکھیے۔ امید تو ہے.... " اس نے ٹھنڈا سانس بھر کر کہا۔

"کیوں میاں، کیا تم بھی یہاں سے نکل جانا چاہتے ہو؟ پھر وہیں کے رنگ میں رنگ کر لوٹو گے۔ پھر ہمیں بیک ورڈ سمجھو گے، ہمارا مذاق اڑاؤ گے۔ ہم میر صاحب کی طرح آنسوؤں کی زبانی جواب دیں گے، کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو۔"

"لگتا ہے میر صاحب کو بھی ڈومیسائل کا پرابلم تھا۔" فاروق نے اسی لہجے میں سوال کیا۔ "کیا وہ بھی اربن کے کوٹے میں آئے تھے؟"

"پھر وہی مہابھارت شروع ہو گئی؛ وہی بکھان لے کے بیٹھ گئے؟" اندر سے چھوٹی خالہ کے گلا پھاڑ کر چلانے کی آواز آئی۔ "صبح ہی میں نے کہا تھا، گیس کے چولھے کا انتظام کر لو، عاشورے کے بعد سے پھر مار اکائی ہونے کی خبر ہے.... " وہ چیخ رہی تھیں۔ میں اٹھ کر چلا آیا۔

اندھیرے سے فرق نہیں پڑا کرتا تھا شہر دیکھنے کے لیے۔ یہ زیادہ دن پہلے کی بات نہیں۔ بجلی غائب ہو جاتی تو میں اسی بالکنی پر کھڑا ہو جاتا کیوں کہ یہاں ہوا آتی ہے۔ اچانک اندھیرے میں ڈوب جانے والے شہر کی عمارتوں کے خدوخال اور ہیولے دیکھ کر اندازہ ہو جاتا

. تھا کہ وہ کون سا علاقہ ہے۔ ہر علاقے میں تاریکی کے اپنے شیڈز تھے جن سے اس کو پہچاننا ممکن تھا۔
اور پھر دور کہیں نہ کہیں روشنیوں کی قطار بھی تو جھلملا رہی ہوتی۔
علاقوں کی آوازیں بھی واضح تھیں۔ لیکن اس چیخ کا پتہ نہیں چل رہا کہ کہاں سے آتی ہے۔

ایسا لگتا ہے ابھی کی بات ہو۔ ثمینہ لان میں بیٹھی ہوئی تھی۔ "ہوا کتنی ٹھنڈی ہونے لگی ہے" دن بھر کے حبس کے بعد پہلے جھونکے کو اپنے چہرے پر محسوس کرتے ہوئے اس نے کہا تھا۔
اسے موسم کے بارے میں معلوم نہیں تھا۔
ذرا دیر میں آگ برسنے لگی گی۔

ایک گلی سے دوسری گلی اور دوسری سے پھر تیسری۔ ایک مرتبہ وہ کسی کام سے اس طرف گیا تھا۔ وہ ایک لفظ نہیں بولا، پھر بھی پہچان لیا گیا۔ وہ بچ کر نکل آیا۔ اس کے بعد میرے سامنے آکر بولا، سارا ماجرا مجھے کہہ سنایا:
"میرا اسکوٹر چند قدم دور گیا ہو گا کہ گلی کے کونے پر جمع لڑکوں کی آواز آئی۔
ان کی چبھتی ہوئی نگاہوں کی طرح آواز کا رخ بھی میری جانب تھا۔
"بنادیں پھول اس کے سینے پر؟" پوچھنے والے کی آواز میں اس سوال کے آخر تک آتے آتے سختی آگئی، جس کا جواب ظاہر تھا۔
میرا جرم بھی ظاہر تھا۔ میں ان کے علاقے میں داخل ہو گیا تھا۔
"اس کے؟" جواب دینے والے نے حقارت سے تھوک دیا۔
میری پیٹھ پر چیونٹیاں سی رینگ رہی تھیں۔
انجام کا وقت آگیا، مجھے پتہ چل گیا۔
لیکن گولی چلنے کی جس آواز کی توقع تھی، وہ آواز نہیں آئی۔
اس ایک لمحے میں میری قمیض پسینے کے مارے پیٹھ سے چپک گئی۔ اس جانور کی طرح جسے گرم لوہے سے داغ دیا گیا ہو۔ "اس سے تو بہتر تھا وہ مجھے گولی مار دیتے۔"
یہ الفاظ کہتے ہوئے وہ مکمل طور پر پژمردہ تھا۔

اماں جان کہتی ہیں رات کو سونے سے پہلے آیۃ الکرسی پڑھو اور تالی بجا کر حصار کھینچ دو۔
"اس کی برکت سے گھر چوروں سے محفوظ ہو جاتا ہے۔" وہ بتایا کرتی تھیں۔
"ایک بوڑھی عورت نے یہ سن رکھا تھا۔ اسے کسی کی شادی غمی میں گاؤں سے باہر جانا پڑا۔ چھپر میں ساری عمر کی کمائی چھپار کھی تھی جو جوڑ جوڑ کر جمع کی تھی۔ آیۃ الکرسی یاد نہیں تھی۔ اس نے دل ہی دل میں کہا، آیۃ الکرسی، چھپر اڑسی، چور آسی اندھا ہو سی۔ چور تو تاک میں لگا تھا۔

اس کے جانے کے بعد گھر میں آیا، اندھوں کی طرح ٹٹولتا پھرا۔ کچھ سجھائی نہیں دیا.... ؟

چور اندھے ہیں۔ گولیاں اندھی ہیں۔ اسی لیے اندھا دھند گھروں میں گھس جاتی ہیں۔ ان کے لیے کون سا حصار باندھوں ؟

پھر بھی میرے بچپن کی عادت ہے۔ کمرے کے چاروں کونوں پر پڑھ کر پھونک لیتا ہوں اور اسی گھر کو نہیں، ان مکانات کو بھی جہاں ہم اس سے پہلے رہ چکے ہیں....

سب سے پہلے تو ہم پاکستان چوک پر آکر رہے تھے۔ بوتل والی گلی، کاغذی بازار، آؤٹرم روڈ، دکھنی مسجد مجھے اب بھول گئے ہیں۔ یہ ضرور یاد ہے کہ اس دو کمروں کے فلیٹ میں ہم سوتے کس طرح تھے۔ میری بہن اور ان کے شوہر مسہری پر ایک کمرے میں۔ دوسرے کمرے میں ایک پلنگ پر میں، دوسرے پر میری دوسری بہن۔ نانی جو اس وقت زندہ تھیں، اماں، تیسری بہن اور خالہ امی کا چھوٹا بیٹا فرش پر۔ دونوں چھوٹے بھائی بالکونی میں پلنگ بچھا کر....

ماچس کی ڈبیا میں جیسے پورا گھر سمٹ آیا ہو۔ اس شہر میں، ہمارا پہلا گھر! اس دن یوں ہی میرا جی چاہا کہ پھر اس محلے میں جاؤں۔

آرام باغ، آرام باغ.... " منی بس کے کنڈکٹر نے اسٹاپ کا نام پکارا تو میں چونک پڑا۔

جب میں اس شہر میں نوارد تھا تو یہ نام لوگوں کی زبان پر اس طرح چڑھا نہیں تھا۔ کوئی نہ کوئی کہہ دیتا.... رام باغ۔

کہتے ہیں رام اور سیتا بن باس کے دوران بھٹکتے بھٹکتے یہاں آئے تھے اور جس جگہ انھوں نے آرام کیا تھا، وہاں باغ لگایا گیا تھا۔

ضرور آئے ہوں گے۔ کراچی کا بن باس سے گہرا سمبندھ ہے۔ یہ جلا وطنوں کو آرام دیتا ہے۔ لیکن تھوڑی دیر کے لیے.... پھر ان کے نام بھی بدل کر رکھ دیتا ہے۔

میں بس سے اترنے کے لیے سیڑھی پر قدم رکھ رہا تھا کہ پیچھے سے آنے والی گاڑی تیزی سے گزری، بس کو چھوتی ہوئی۔ چند سیکنڈ کی دیر ہوتی تو میں بس اور گاڑی کے درمیان کچل جاتا۔

میں نے غور سے دیکھا۔ ایک کم عمر لڑکا گاڑی چلا رہا تھا۔ گاڑی چمک دار اور نئی تھی۔

"بس اسی لیے تو کراچی کا یہ حال ہے.... کنڈکٹر نے سر ہلایا۔ میں اتر گیا۔ اس نے گاڑی پر تھپکی دی۔ "ڈبل ہے استاد، جانے دو...."

صبح تیار ہوا بیٹھا رہا۔ دفتر کی گاڑی نہیں آئی۔ اس کا مطلب ہے ہڑتال مکمل ہے، آج کی چھٹی سہی۔ لیکن ایک بار پتلون چڑھا لیا تو آدھی چھٹی یوں ہی غارت ہو گئی۔ "مجھے ابو میاں کا کہنا یاد آیا۔

کپڑے بدلے بغیر بستر پر لیٹ کر میں اخبار دیکھنے لگا۔ پھر یوں ہی اونگھ گیا۔

"اچھے خالو اور چھوٹی خالہ آئے ہیں۔" امی جان نے اندر سے اطلاع دی تو میں جاگا۔
میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں یوں ہی لیٹا رہا۔
"ضمیر بیٹے، اٹھ جاؤ۔ تم ہی سے کہہ رہی ہوں۔" امی جان کمرے کی دہلیز پر کھڑی تھیں۔
"آج سبھی گھر پر ہیں، سوچ رہی ہوں مرغی کا قورمہ پکالوں۔ بیٹے ذرا سامنے سے دو مرغیاں تو لے آؤ۔ دیکھو، اپنے سامنے ذبح کرانا۔ انڈوں پر سے اتری ہوئی مرغیاں نہ ہوں کہ بوٹی گلنے کا نام ہی نہ لے....."
میں انگڑائی لینے لگا۔
"مرغی کہاں سے لائیں گے؟" فاروق نے باہر سے پکارا۔ "آج تو ویڈیو والے کی دکان تک بند ہے۔ کہہ رہا تھا کہ اس کے پاس لڑکے آئے تھے اور پوچھ رہے تھے کہ دکان آپ خود بند کرلیں گے یا ہم مدد کریں؟"
"مرغی تو ہمارے ہاں بھی فریزر میں نہیں رکھی ہوئی۔" چھوٹی خالہ امی جان کو بتانے لگیں۔ "کل شام عبدل کو پیسے دے کر بھیجا تھا۔ وہ نوٹ مٹھی میں دبائے یوں ہی واپس آگیا کہ گلی کے کونے پر چار نوجوان لڑکے کھڑے ہیں، پیلی ٹیکسی رکی ہوئی ہے اور وہ چاروں آپس میں اردو بول رہے ہیں..... یہ تو ڈر کر آگیا کہ کوئی واردات ہونے والی ہے....."
میں اٹھ کر برآمدے میں آگیا۔ اچھے خالو گال کا مسا نوچتے ہوئے کتاب پڑھ رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی آواز لگائی۔ "آؤ ذرا سنو، کیا قیامت کی عبارت لکھی ہے ظالم نے....."
کرسی پر بیٹھتے ہوئے میں نے کوفت کے ساتھ سوچا، حسن نظامی والے "غدر کے افسانوں" سے خدا خدا کر کے ان کا پیچھا چھوٹا تو اب یہ "خطوطِ غالب" لے کر بیٹھ گئے۔
میرے بیٹھنے کا انتظار کیے بغیر انھوں نے ڈھیٔ ہوئی آواز میں پڑھنا شروع کر دیا۔
"انگریز کی قوم میں سے جو ان روسیاہ کالوں کے ہاتھ قتل ہوئے اس میں کوئی میرا امید گاہ تھا اور کوئی میرا شفیق اور کوئی میرا دوست اور کوئی میرا یار اور کوئی میرا شاگرد۔ ہندوستانیوں میں کچھ عزیز، کچھ دوست، کچھ شاگرد، کچھ معشوق، سو وہ سب کے سب خاک میں مل گئے۔ ایک عزیز کا ماتم کتنا سخت ہوتا ہے، جو اتنے عزیزوں کا ماتم دار ہو، اس کو زیست کیوں کر نہ دشوار ہو....."
میں کرسی سے اٹھ گیا۔ میں اٹھ کر دروازے تک آگیا۔
"کہاں جا رہے ہو؟" اچھے خالو نے تعجب سے پوچھا۔
"مرغی ذبح کروانے۔" میں نے جواب دیا۔
"اچھا تو یہ فقرہ تو سنتے جاؤ کہ مرزا نوشہ نے کس قدر حسب حال لکھا ہے: "ایک قلزم خوں کا شناور رہا، نہ کہیں آیا نہ گیا....."
میں باہر آگیا۔

میں اندر آتا ہوں۔ کریڈل پر رسیور اٹھا رکھا ہوا ہے۔ تار والی سائڈ باہر کی طرف ہے۔
"کس کا فون آیا تھا؟" میں پوچھتا ہوں۔
"تمھیں کیسے پتہ؟" وہ بھی پوچھتی ہے۔ "ممانی فہمیدہ کا تھا...."
"خیریت تو ہے؟" میں مزید پوچھتا ہوں۔
"خیریت ہوتی تو فون کیوں کرتیں؟" وہ بھی سوال کرتی ہے۔ "کل رات کسی نے ان کے گھر میں گھسنے کی کوشش کی...."
میں چونک اٹھتا ہوں۔ وہ تفصیل بتاتی ہے۔
"رات کو دیر تک وہ ٹی۔وی۔ دیکھتی رہیں۔ تم جانو ممانی فہمیدہ زی۔ٹی۔وی۔ کی فلم چھوڑنے والی نہیں۔ تو یہ وہ اپنے کمرے میں لیٹی ہوئی تھی۔ صبح اٹھ کر دیکھا تو ویسے تو سب ٹھیک تھا لیکن باہر والے دروازے کی جالی پر نشان تھے۔ جگہ جگہ سے جلائے جانے کے نشان۔ باہر کے رخ پر جلی ہوئی تیلیاں بھی پڑی تھیں۔ تیلیاں اندر کی طرف بھی تھیں۔ جہاں گری تھیں وہاں سے قالین بھی جل گیا تھا۔ کسی نے جلا کر اندر پھینکی ہوں گی۔ جالی اکھاڑنے کی کوشش بھی کی۔ دروازے کی لکڑی پر بھی نشان تھے...."
"خیریت ہو گئی۔ کچھ پتہ بھی چلا؟" میں معلوم کرنا چاہتا ہوں۔
"ایسی باتوں کا آج کل پتہ چلتا ہے؟" وہ سوال کرتی ہے جو میرے سوال کا جواب بھی ہے اس کے بعد میں چپ رہتا ہوں۔

"دور کی بات لگتی تھی۔ ہم تو سمجھے تھے یہاں نہیں ہوگا۔" اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ دو گلاس پانی پینے کے بعد بھی اس کا سانس قابو میں نہیں آیا تھا۔ "ہم نے ان کو ووٹ تو دیے تھے لیکن ادھر ان کا کوئی کارکن نہیں تھا۔ نہ اب تک کوئی ایسی بات ہوئی تھی۔"
"میں بلڈنگ کے باہر نہیں نکل پایا تھا۔ دروازے تک ہی پہنچا ہوں گا کہ ایک دم سے بھد بھد بھاگنے کی آواز آئی۔ دو لڑکے تیزی سے بھاگتے ہوئے آئے۔ میں ان کو شکل سے پہچانتا تھا۔ وہ اسی علاقے کے تھے۔ وہ بھاگ رہے تھے۔ کبھی لفٹ میں داخل ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ کبھی گھروں کے دروازے پیٹ رہے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا ہو رہا ہے۔ اچانک تڑ تڑ گولیاں چلنے لگیں اور بلڈنگ کے دروازے پر بہت سارے لوگ جمع ہو گئے۔ وہ بھی بھاگتے ہوئے آئے تھے۔ ان کے پاس بہت سے ہتھیار تھے۔ وہ دونوں لڑکے زمین پر گرے ہوئے تڑپ رہے تھے لیکن میں اس آدمی کا چہرہ نہیں بھول سکتا جو اس وقت وہاں سے گزر رہا تھا جب گولیاں چلنے لگیں۔ وہ کندھے اچکا رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو: ارے بھئی، مجھے کیوں مار رہے ہو.... لیکن اسے یہ یا کچھ اور کہنے کی مہلت ہی نہیں ملی...."

اندھیرا جیسے امڈا چلا آرہا ہے۔ اندھیرے میں ڈوبے شہر کے خد وخال پہچانے نہیں جاتے۔ اب میں اندازہ نہیں لگا سکتا کہ میں اپنی بالکنی پر کھڑے ہوکر دیکھ رہا ہوں تو اس یکساں سیاہ چادر میں لپٹے ہوئے شہر میں کون سا علاقہ میری کس جانب ہے۔ اور وہ آواز کس طرف سے آئی ہے۔ پچھلی بار جس طرف سے سنائی دی تھی، میں اس جانب منھ کرکے کھڑا ہو جاتا ہوں۔ لیکن میری پیٹھ کے پیچھے سے سنائی دیتی ہے چیخ۔ وہی چیخ۔ بالکل اسی طرح۔

"ہا.. آ.. آ.. آ.. آ..... آآہ....."

آواز صاف ہے۔ میں گھبرا کر اس طرف دیکھتا ہوں۔ چیخ اب پلٹ کر وہیں سے آرہی ہے۔ میں ادھر مڑتا ہوں، چیخ میرے پیچھے سے ابھرتی ہے۔

میں گھبرا کر کبھی ادھر مڑتا ہوں کبھی ادھر۔ میں جدھر بھی مڑتا ہوں میرے پیچھے سے اٹھ رہی ہے چیخ۔

"ہا... آ... آ... آ.. آ....آ.. آہ...."

اندھیرے شہر میں کس طرف سے آرہی ہے یہ چیخ؟ مجھے پتہ نہیں چلتا۔ اندھیرے شہر میں ہر طرف سے آرہی ہے یہ چیخ۔

"پپو کے گولی لگ گئی...."

"گولی لگ گئی؟ پپو کے؟ کون سا پپو؟" اس ایک چھوٹے سے جملے پر کتنے بہت سے سوال شروع ہو گئے۔ لیکن میں ان میں سے کسی ایک سوال کا جواب دینے کے موڈ میں نہیں تھا۔ آخر پپو تو ایک ہی تھا۔ بڑھیا پاپڑ والی کا پپو۔

بچہ سا تھا جب سے اپنی ماں کے ساتھ ہمارے گھر آتا تھا۔ سر پر بڑا سا ٹوکرا رکھے ہر دسویں پندرھویں دن چکر لگاتی تھی۔ گلی کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک ایک ایک مکان پر دستک دیتی ہوئی آتی تھی۔ تھیلیوں میں بند نمک پارے، پاپڑ اور بڑیوں کے دام کھرے کرنے میں بڑی پکی تھی وہ۔ ایک پیسہ کم نہیں کرتی تھی۔ پاپڑ بھی کچھ کم کرارے اور چٹپٹے نہیں ہوتے تھے۔

بہت دور سے، اور نگی سے آتی تھی وہ، کئی بسیں بدلتی ہوئی۔ پھر اس نے آنا کم کر دیا۔ پپو، جمعہ بازار میں اسٹال لگانے لگا ہے، اب زیادہ پاپڑ تیار کرنے پڑتے ہیں۔

"اونہہ، جمعہ بازار سے جو پاپڑ بچ جاتے ہیں وہ ہمارے سر چپکا جاتا ہے۔ آخر کس ماں کی اولاد ہے!" چھوٹی خالہ اس سے مول تول کرتے ہوئے ضرور بڑبڑاتی تھیں۔

جمعہ بازار میں کسی نے ضمیر بھائی کو بتایا۔ پپو اب پاپڑ بڑیاں لے کر نہیں آئے گا۔ اور وہ جو ہمارے گھر میں چھوٹے موٹے محنت مزدوری کے کام کر دیا کرتا تھا، رنگ سفیدی، دھویا دھائی، اب یہ سارے کام ٹلتے جائیں گے۔

بجلی کے تاروں پر بیٹھی چڑیاں بھر امار کے اڑیں۔ میں آواز پر کان لگائے ہوئے تھا۔ تڑ تڑ گولیاں چلنے کی آواز گونج اٹھی۔ میں نے ساتویں منزل کی بالکنی سے جھانک کر دیکھا۔ دکانوں کے شٹر تیزی سے گرائے جارہے تھے، لوگ ادھر ادھر کونے کھدروں میں گھسنے لگے۔ دروازہ بند کر کے میں اندر آگیا۔ سناٹا گہرا ہو گیا پھر جیسے کچے کانٹے پر کھرنڈ آگیا۔ میں نے دروازہ کھول کر دیکھا۔ فائرنگ کرتی ہوئی گاڑیاں گزر چکی تھیں۔ ٹریفک چلنے لگا۔ بجلی کے تار پر ایک چڑیا بیٹھی ہوئی تھی۔

جاوید کو خود ہی اسکول سے پک اپ کر لوں، میں نے فیصلہ کیا۔

دن بھر اتنی فائرنگ ہوئی ہے، پتہ نہیں اسکول وین آئے گی بھی یا نہیں۔ بچے کو آخر کتنے دن اسکول سے چھٹی کرو اکر گھر بٹھائے رکھتا؟ جو ہو گا سو دیکھا جائے گا۔ آج تو ضرور ہی جائے۔ گرمیوں کی چھٹی کا ہوم ورک آج ملے گا۔ میں نے صبح یہ سوچا تھا۔

گیارہ بھی نہیں بجے تھے کہ میں اس کے اسکول کے گیٹ پر کھڑا تھا اور چوکیدار کو سمجھا رہا تھا کہ کلاس فائیو بی کے جاوید ناصر والا ناصر میں ہی ہوں۔

اسکول کی سڑک سے مڑ کر شہید ملت والی ٹرن کاٹنے سے پہلے رینجرز کے موبائل یونٹ نے گاڑی کو رکنے کا اشارہ کیا۔ گاڑی کے بریک میں نے فوراً لگادیے اور اپنا ڈر چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے باہر آگیا۔

وہ مجھ سے کیا کیا پوچھ رہے تھے اور میرے ہونٹ کپکپار ہے تھے۔

"جاؤ.... "انھوں نے کہا اور میں مڑا تو پیٹھ میں سنسناہٹ ہو رہی تھی کہ اب مارا....

"یہ عینک والا ہے اس کو تو جانے دو.... "ان میں سے ایک کی آواز آئی۔

"بابو کو ایسے تو نہ جانے دے.... "کوئی دوسرا اس سے کہہ رہا تھا۔ یا شاید کوئی بھی کسی سے کچھ نہیں کہہ رہا تھا، بس مجھے ایسا لگ رہا تھا۔

سارے ڈر کے باوجود مجھے یہ خیال رہا کہ جاوید گاڑی سے باہر نہ آئے۔ ماتھے سے پسینہ پونچھتا ہوا میں واپس آیا اور گاڑی اسٹارٹ کرنے لگا تو اس نے مجھ سے براہ راست سوال کیا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ وہ پوچھے گا، کیا ہوا؟ کیسے جان چھوٹی؟" ابو یہ وہی ہیں نا جنھوں نے پپو کو مارا تھا؟" اس نے پوچھا۔

میں نے جواب دینے سے گریز کیا۔ میں سامنے دیکھتا رہا۔

"میرے پاس ایک بم ہوتا!" وہ بھی سامنے دیکھ رہا تھا۔ میری طرف نگاہیں کیے بغیر کہہ رہا تھا۔

وہی ذکر لے دے کر وہی باتیں روز روز ۔ سوچتا ہوں اب وہاں نہیں جاؤں گا ۔ لیکن خبریں لیے بغیر چین بھی تو نہیں آتا ۔

میرے پڑوس میں لگتا ہے کبھی کا کانٹا آگیا ہے ۔

اس وقت بھی ضمیر بڑے میاں سے الجھا ہوا تھا ۔

"آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ یہ اسٹیٹ میررازم ہے ؟" وہ سیدھی سیدھی بحث پر اتر آیا تھا ۔

"تو پھر اور کیا ہے ؟" بڑے میاں بھی مان کر نہیں دیتے تھے ۔ "یہ محاصرے ، یہ حملے ، عقوبت خانوں کے ٹھکانے اور شہر میں روز نمودار ہونے والی ایک نہ ایک گم نام لاش جس کے سارے جسم پر تشدد کے نشان ؟ یہ سب کیا ہو رہا ہے ، خدارا یہ کب تک ہوتا رہے گا ؟" بحث کرتے کرتے ان کا گلا رندھ گیا اور آنکھ بھر آئی ۔

"ابھی تو دل کا بخار اس گھیراؤ ، جلاؤ اور پتھراؤ میں نکل رہا ہے لیکن جب یہ طوفان تھمے گا تو اس کے بعد کیا صورت بنے گی ؟ کبھی اس مسئلے پر بھی سوچا آپ لوگوں نے ؟" ضمیر کے لہجے میں بے حد تلخی تھی ۔

"تنگ آمد بجنگ آمد ۔ اب تو آل آؤٹ وار ہو گا ۔" اچھے خالو نے دائیں ہاتھ کی شہادت والی انگلی اٹھا کر خبردار کیا ۔

"تو پھر سرسے قیامت گزرے گی ، اس کے لیے بھی تیار ہو جائیے ۔ اپنی در بدری اور ہلاکت کو آپ لوگ خود دعوت دے رہے ہیں ۔" ضمیر نے کہا اور پیر پٹختا ہوا وہاں سے چلا گیا ۔

"صاحب زادے کی تیغ اپنے ہی لہو میں نیام رہتی ہے ۔" اچھے خالو نے جاتے جاتے ضمیر کے پیچھے پکار کر کہا ۔ "تم سرکاری بیان بھی تو دیکھو ۔ وہ بھی تو اکسا رہے ہیں ۔ کیا اس سے اندازہ نہیں ہو رہا کہ ہوا کا رخ کس طرف ہے ؟ تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں !"

تھوڑی دیر تک کوئی آواز نہیں آئی ۔ اس کے بعد آواز جو آئی وہ چھوٹی خالہ کی تھی ۔ "بس شروع کر دی بحثم بحثا ؟ اےئے میں کہتی ہوں تم لوگ یوں ہی بحث کیے جاؤ گے ؟ آٹے دال کا بھاؤ بھی معلوم ہے ؟ محرم آگیا ، یہ نہیں کہ جا کر دال لے آؤ ۔ کیا اس سال نیاز کے لیے کھچڑا بھی نہیں پکے گا ؟ بازار سے دالیں عنقا ہو گئی ہیں !"

"محرم اب کی بار ٹھیک وقت پر آیا ہے ۔" اچھے خالو کی آواز ابھری ۔ "اور اپنے صحیح مقام پر آیا ہے ۔ اب یہ شہر کربلا ہے جس میں حسینؑ کا کوئی سراغ نہیں ۔"

جواب میں چھوٹی خالہ کی آواز فوراً ہی آئی ، پریشان اور گھبرائی ، سہمی ہوئی آواز ۔ "ہائے ہائے کیا کہہ رہے ہو ۔ کچھ تو لحاظ کرو ، منہ سے ایسی بری بری فالیں مت نکالو ۔ میں نے سنا ہے شہر

کے بعض علاقوں میں لوگوں نے خندقیں کھود لی ہیں۔"

"پہلی خندق۔" اچھے خالو کی آواز آئی۔

وہاں جانے کے بجائے میں ضمیر کے کمرے کی طرف مڑ گیا۔

مجھ سے پہلے چھوٹی خالہ کی آواز وہاں پہنچ گئی۔

"ضمیر بیٹے، دونوں وقت مل رہے ہیں، اس وقت بستر پر نہ پڑے رہو۔ نحوست ہوتی ہے۔ فرشتے بیماروں میں نام لکھ دیں گے!" وہ پکار رہی تھیں۔

"اونہہ، نحوست اور کیا ہوگی.... "ضمیر نے بڑبڑا کر آنکھیں بند کر لیں۔

وہ بستر پر جوتوں سمیت چت پڑا ہوا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ رکھے تھے۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔

"کیا حال ہے ضمیر؟" اس کے سرہانے آکر میں نے آہستہ سے پوچھا۔

"وہی تھکن..... "اس نے انگڑائی لیتے ہوئے جواب دیا۔" سارا بدن مٹی مٹی ہو کر جھڑا جا رہا ہے...."

"کیا بتایا ڈاکٹر نے؟" میں نے پوچھا۔ میں نے اس کو کہیں جاتے ہوئے دیکھا تھا اور میں سمجھ گیا تھا کہ یہ کہاں گیا ہوگا۔

"وہی نیلی پیلی گولیاں، وہی گھسے بندھے مشورے.... سوچا کم کیجیے، خوش رہیے، کھانے پینے پر توجہ دیں، کام میں دل لگائیں.... "اس کے لہجے میں اتنی بے زاری آگئی کہ اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

"ڈاکٹر کے مشورے پر عمل کیجیے، آپ کی طبیعت واقعی خراب.... "میں نے کہنا شروع کیا۔

میرے دیکھتے دیکھتے وہ تیزی سے اٹھ بیٹھا۔ اس کی آنکھیں خون کی طرح سرخ ہو رہی تھیں۔

"یہ بلیک ہول ہے، تم لوگ سمجھتے کیوں نہیں ہو.... مجھے لگتا ہے میری زندگی میں گڑھا پڑ گیا ہے جو میرے تین چار برس اس طرح نگل گیا ہے کہ مجھے پتہ ہی نہیں چلا۔ ختم ہو گئے اتنے سال اور جب ایک بار زندگی سے وقت کا اتنا بڑا ٹکڑا غائب ہو جائے تو پھر کیا ہوتا ہے، مجھے نہیں معلوم.... میرے شہر اور میرے لوگوں کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے، میں اس کا خاموش تماشائی نہیں بن سکتا۔ میں شہر کا درد سہنا چاہتا ہوں، میں اس میں پوری طرح شامل ہونا چاہتا ہوں، لیکن میں الجھ کر رہ گیا ہوں۔ یہ اینٹی میٹر ہے جس نے مجھے کھانا شروع کر دیا ہے۔ خلا میں جو بلیک ہولز ہوتے ہیں ان کا پتہ ہے تم کو؟" میں اسپیس شپ ارتھ پر ہوں اور میرے چاروں طرف بلیک ہول ہیں۔ میرا شہر جل رہا ہے، میرے لوگ مر رہے ہیں۔ اب کوئی کچھ بھی نہیں کر سکتا.... بہت

دیر ہو چکی.... کوئی کچھ بھی نہیں کر سکتا....."
ضمیر کی سسکیاں چکراتے ہوئے سناٹے کی طرح میرے چاروں طرف گونج رہی تھیں اور میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں، کس طرف جاؤں۔

"ڈھیلا پاجامہ ریشم کا کمر بند کہو کہاں گئے تھے؟" مکانوں میں کوئی گا رہا ہے۔ سارے شہر میں گا رہا ہے۔

پھر وہی خواب۔
جم کر رہ گیا ہے میری آنکھوں میں۔ جیسے اس کی بنیادوں میں کسی نے سیمنٹ ڈال دی ہے۔ پتھرا کر رہ گئی ہیں میری آنکھیں۔
میں دیکھ رہا ہوں کہ شہر کے لوگ اپنے اپنے مکانوں کی بتیاں بجھا کر سو چکے ہیں۔
چوک میں ایک لاش بے کفن پڑی ہے۔
یہ میرا شہر ہے۔
وہ لاش دھیرے دھیرے اٹھتی ہے اور ختم ہو کر بھی ختم نہ ہونے والی دہشت میں، اس کا مانوس چہرہ آہستہ آہستہ میرے سامنے آرہا ہے۔
دہشت کیوں نہ ہو؟ اپنی لاش کو دیکھ کر کیا ڈر بھی نہیں لگے گا؟
اور اس لاش کے چاروں طرف خالہ رضیہ سینہ پیٹ پیٹ کر گھوم رہی ہیں، گا رہی ہیں۔
"کہو کہاں گئے تھے؟" ان کا چہرہ اسی طرح ہے جیسے مانگ کٹنے سے پہلے تھا۔ ان کے ساتھ انوار چچا اور ممانی فہمیدہ بھی ہیں جن کے ہونٹ ہل رہے ہیں: کہو کہاں گئے تھے؟ کہوں کہاں گئے تھے؟
وہ گا نہیں رہے۔ وہ چیخ رہے ہیں۔
ان کی چیخیں اتنی بلند ہو جاتی ہیں کہ میری آنکھ کھل جاتی ہے۔
میں ٹھنڈے پسینے میں ڈوبا ہوا ہوں اور بجلی نہیں ہے۔ لتنے اندھیرے میں یہ کون چیخ رہا ہے؟

شام کے بجھتے ہوئے آسمان پر دھوئیں کا بادل ٹھیرا ہوا تھا۔ دن بھر جو گرد اڑتی رہی تھی، ابھی تک فضا پر چھائی ہوئی تھی لیکن دھوپ کی تپش ٹھنڈا گئی تھی۔
سات افراد ہلاک۔ تیس گاڑیاں جلادی گئیں۔ تین لاشیں برآمد۔ پولیس موبائل پر حملہ
.... میں شام کا اخبار پڑھ رہا تھا۔
شام کا سناٹا یک لخت ٹوٹا۔ گولیوں کی بوچھار سے ساری گلی گونج اٹھی۔ میں نے بدحواس ہو کر دیکھا۔ کھڑکی کے شیشے بج رہے تھے۔ کیا حملہ شروع ہو گیا؟

"بھیا یہاں آجائیے" دیوار کے برابر سے فاروق کی آواز آئی۔ "اکیلے سے بہتر رہیں گے۔ مین روڈ کے کونے پر بس جلائی گئی ہے اور اس کے بعد سے جو فائرنگ ہے تو.... ارے، گلی میں مت نکلیے، دیوار سے آئیے، لیکن سر نیچا کر کے...."

اس کے بعد پیچھے پیچھے میں اندر والے کمرے میں آگیا۔

"سڑک کے رخ پر گولیاں لگنے کا خطرہ ہے۔" اس نے کہا۔

"آج کے بعد گھروں کے اندر بھی محفوظ نہیں۔" چھوٹی خالہ کرسی کے اوپر ٹانگیں سمیٹے بھی ہوئی بیٹھی تھیں۔ "آج کی رات اس علاقے کا محاصرہ ہونے کی خبر گرم ہے۔ پھر تو گھروں میں گھس گھس کر ماریں گے...."

اچھے خالو صوفے پر نیم دراز تھے اور وہ بالکل خاموش تھے۔

"سب تفصیلات ورک آؤٹ کر لی گئی ہیں۔ پہلے علاقے کا بجلی پانی اور گیس بند ہو گا۔ چاروں طرف سے ناکہ بندی ہو گی اور محلے کے اطراف گھیرا ڈال دیا جائے گا۔ پھر وہ ایک ایک گھر میں آئیں گے.... بس عاشورے کے دن کا انتظار تھا، آج عاشورہ ہو گیا۔ اب فائنل راؤنڈ ہو گا۔ پتہ نہیں کتنے لوگ موت کے گھاٹ اتارے جائیں گے.... فاروق دیوار کی طرف دیکھ کر بڑبڑا رہا تھا۔

اس کے الفاظ کمرے میں بوچھار کی طرح گر رہے تھے اور وہاں بیٹھے ہوئے سب لوگوں کے چہرے سُتے ہوئے تھے۔

"ضمیر کہاں ہے؟" میں نے اس کمرے میں بیٹھے ہوئے سارے لوگوں کو دیکھ کر سوال کیا۔

"ضمیر غائب۔ یہ قواعد کا مسئلہ ہے سیاسی بیان نہیں۔" فاروق نے جواب دیا جو میرے سوال کا جواب نہیں تھا۔ اس کا مذاق مجھے بہت بے تکا لگا لیکن میں پی گیا۔ باہر وقفے وقفے سے فائرنگ کی آواز آرہی تھی۔

"بھیا تاش ہو جائے؟" مجھے خالی بیٹھا دیکھ کر فاروق کو بے چینی ہو رہی تھی۔

"ترپ چال کے لیے تو پورے آدمی نہیں ہیں۔ اس دن شاہ کٹ کھیلا تھا۔ آج بلیک کوئن کھیلتے ہیں...." میں نے اس احتیاط کے ساتھ جواب دیا کہ وہ میرے جملے کو غلط رنگ میں نہ لے۔

"رہنے دیں، پچھلی بار آپ کے پاس آئی تھی بلیک کوئن۔ آپ نے لے کے پاس کر دی۔ آپ تو ڈرتے اتنا ہیں، بلیک کوئن کیا کھیلیں گے؟ خود رکھ کر دوسرے پر ڈالتے ہیں۔ مائنس تھرٹین پوائنٹ یوں ہی تو نہیں ملنے کے...." مجھے لگا کہ وہ نہ کھیلنے کے بہانے ڈھونڈ رہا ہے۔

تاش کی گڈی یوں ہی رکھی رہی۔ فاروق نے اسے پھینٹا نہیں۔

گولی کی آواز بہت پاس سے آئی ۔ اچھے خالو چونک کر کندھے کے اوپر سے دیکھنے لگے جیسے وہاں کچھ ہو گا ۔

باہر کے رخ سے کمرے کے اندر دھواں آنے لگا ۔ گولی چلنے کی آواز آتی تو جیسے کمرے کی دیواریں لرز اٹھتیں، کھڑکیوں کے شیشے کھڑکھڑا رہے تھے ۔ بیچ بیچ میں ایک دم سناٹا، اتنا گہرا سناٹا جو لگتا کہ بھاری بوٹوں کی چاپ سے ہی ٹوٹے گا جب گلی میں اڑتے پھرتے سوکھے پتے اور بجری ان کے نیچے آکر چرچر بولیں گے....

کہیں نہ کہیں پاؤں میں چڑھائے جا رہے ہیں وہ بوٹ جنھیں اس گلی میں گونجنا ہے....

گولیوں کی آواز پھر آرہی ہے.... تڑاتڑ گولیوں کی بوچھار، پھر خاموشی....

پاس آتے جا رہے ہوں گے وہ بوٹ.... پاس اور پاس.... بندوق کی بٹ سے دروازہ توڑنے کی آواز ابھرے گی اور اندر کے کمرے میں چھپے چھپے ہم کانپ اٹھیں گے.... گولی پھر چلی ۔

سب اپنی اپنی جگہ بیٹھے ہیں ۔ میں ان کے سانس لینے کی آواز بھی سن سکتا ہوں ۔ کوئی کچھ نہیں بول رہا ۔

کیا یہ گزر جائے گا یا یوں ہی انجام ہونا تھا؟ ہم میں سے کسی کو نہیں معلوم ۔ ہمارے کان ایک ایک آواز پر لگے ہوئے ہیں ۔

ہم سب ایک ساتھ ہی سنتے ہیں اس آواز کو ۔ گولیوں کی گونج میں الگ سے سنائی دیتی ہے اور پہلے پہل سمجھ میں نہیں آتی ۔ پھر اس کا ایک ایک لفظ الگ اور واضح ہونے لگتا ہے ۔

اشہد ان لا الہ.... اشہد ان لا الہ.... پڑوس میں کوئی اذان دے رہا ہے ۔

اذان رکتی ہے تو پھر خاموشی.... جو گلے پر خنجر کی طرح تنی ہوئی ہے اور ایک دم سے ٹوٹتی ہے جب چھوٹی خالہ بول اٹھتی ہیں:

"مرنا ہی ہے تو ایک ساتھ، ہم سب مر جائیں ۔ یوں سسکا سسکا کر تو نہ ماریں...." وہ کہتی ہیں اور ان کی آواز آنسوؤں میں ڈوب جاتی ہے ۔

کوئی کچھ نہیں کہتا ۔ لمحہ لمحہ موت ہمارے سامنے ہے ۔

ایسے میں فاروق سیٹی بجانے لگتا ہے ۔

"آج کی رات بچیں گے تو سحر دیکھیں گے ۔" وہ سیٹی پر دھن بجا کر گنگناہٹ پوری کرتا ہے ۔ "لائیے، یے، کا...." وہ میری طرف دیکھ کر کہتا ہے ۔

میں بہت کوشش کرتا ہوں لیکن مجھے "یے" سے شروع ہونے والا کوئی گانا یاد آکر نہیں دیتا ۔ میرے کان گولیوں کی آواز پر لگے ہوئے ہیں اور نظریں کلائی کی گھڑی پر.... اب کتنی دیر رہ گئی ہے رات، اور کہاں تک لے جائے گی ہمیں یہ رات؟

آصف فرخی

خواجہ اجمیر نگری

بڑی تلاش کے بعد اتنی سی جگہ ملی تھی۔

وہ بھی خواجہ اجمیر نگری میں۔ ورنہ اس سے پہلے میں کبھی وہاں نہیں گئی تھی۔

دیکھنا کیا ہے، میں نے تو اس کا نام بھی نہیں سنا تھا۔

اس سے پہلے کئی علاقوں میں گھوم پھر کر دیکھ چکی تھی۔ گنجائش یا محل وقوع کے لحاظ سے تو بہتیری جگہیں تھیں جہاں میں اپنا کام چلا سکتی تھی۔ لیکن میں سوچتی تھی کہ جگہ ہو تو ایسی جہاں لوگوں کو بھی میری ضرورت ہو، میرا بھی کچھ ان سے تعلق سا بن جائے۔ یہ نہ ہو کہ بورڈ لگا کر دکان داروں کی طرح بیٹھ جائیں۔ جبھی تو یہ حال ہو گیا ہے کہ شہر کی کوئی بستی بھی ہو، پتھر بھی اٹھاؤ تو وہاں سے ڈاکٹر کا کلینک نکلتا ہے۔

ڈاکٹروں کی کمی تو یہاں بھی نہیں تھی۔ آس پاس کی گلیوں کا جائزہ لیا تو اتنے رقبے میں کتنے ہی بورڈ نظر آئے اور میں بے دھیانی میں ان پر لکھے ناموں اور ان ناموں کے آگے حروف کی تعداد پڑھتی گئی: ایم بی بی ایس، آر ایم پی.... پی ایم ڈی سی رجسٹریشن نمبر فلاں فلاں.... "مجھے ڈر لگا کہ میں بھی ان میں کھو نہ جاؤں۔ لیکن وہ گلیاں ایک عجیب طریقے سے اطمینان بخش لگ رہی تھیں۔ اسی، ایک سو بیس گز کے مکان، سڑک پر کھیلتے ہوئے بچے، ادھر ادھر دانہ ٹونگتی ہوئی مرغیاں، آسمان پر چیلیں اور پتنگیں.... پان کی دکان پر ادھیڑ عمر کی ایک عورت بنگالی پان والے سے پان لگوا رہی تھی۔ "چونا کم لگانا، میرا منھ نہ کٹ جائے" عورت کی آواز کراری تھی۔ پان کلے میں دبا کر اوڑھنی سر پر ٹھیک کرتی ہوئی وہ اس چھوٹے سے مکان میں چلی گئی جس کے گیٹ کے ساتھ کچی کیاری میں موتیا کا پودا لگا ہوا تھا۔ میں وہیں کھڑے کھڑے بندھ گئی۔ ایسا لگا جیسے برسوں پرانی بات ہے.... اماں جان زندہ ہیں، میں ان کے گھٹنے سے لگی بیٹھی ہوں اور وہ میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے باتیں کر رہی ہیں.... "وہاں ہمارا اپنا گھر تھا شام سے پہلے آنگن میں چھڑکاؤ ہو جاتا تھا اور وہیں چار پائیاں بچھا لیتے تھے۔ بوا موتیا کے پھول چن کر بچھونوں میں رکھتی جاتیں۔ گیلی مٹی کی سوندھی سوندھی خوش بو اور موتیا کی مہک.... ائے بچی، تیرے بالوں میں خشکی کتنی بڑھ گئی ہے۔ پیڑ کے پیڑ جم رہے ہیں۔ نگوڑ ماری پڑھائی نے یہ حال کر دیا ہے۔ شیشی اٹھا لا، میں چنبیلی کا تیل لگا دوں...."

سر میں خشکی تو اب بھی بہت ہے۔ لیکن چنبیلی کا تیل لگانے والا کوئی نہیں۔ یوں بھی مجھے اس تیل سے بساندھ آتی ہے۔ بہر حال جگہ میں نے وہیں لے لی۔

اور وہیں ایک دن سعیدہ بیگم مل گئی تھیں۔
مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ کلینک کھولے ہوئے دوسرا یا تیسرا دن ہوگا۔ مریض تو کیا آتے۔ ہاتھ پر ہاتھ دھرے مجھ سے بیٹھا نہیں جاتا۔ الماری پر دواؤں کی شیشیوں کو کپڑے سے پونچھ کر ترتیب سے رکھتی جارہی تھی۔ وہ دروازے پر ذرا دیر کے لیے ٹھٹھکی، پھر لپک کر اندر داخل ہوگئی۔ ایک مرگھلا سا بچہ اس کی گود میں تھا جو اس نے کچھ کہے سنے بغیر میرے سامنے رکھ دیا۔ میں نے حیرت سے اس عورت کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ مجھے اپنے بچوں کی بیماری کا منظر یاد آگیا۔ میں نے اس بچے کا معائنہ کیا تو اس کا تالو اندر کو دھنسا ہوا تھا اور رونے پر آنکھ سے آنسو نہیں نکل رہا تھا۔ "دستوں نے نڈھال کر دیا ہے میرے ندیم کو" اس نے مجھے بتایا۔ میں نے اسی وقت نمک چینی کا پانی ایک پیالی میں اس کے آگے رکھ دیا اور کہا کہ چمچہ چمچہ کرکے بچے کو پلاتی جائے۔ بچے کے پیٹ پر ایسی جھریاں پڑی ہوئی تھیں جیسے کسی بوڑھے آدمی کی کھال ہو۔ پانی حلق میں گیا تو بچے کے ساتھ ساتھ ماں کا چہرہ بھی بحال ہوتا گیا۔

"اتنے سے بچے کو اوپر کا دودھ کیوں لگا دیا؟" میں اس کو بچے کے لیے نرم اور پتلی غذائیں شروع کرنے کا طریقہ سمجھانے لگی۔

"کیا کروں ڈاکٹرنی صاحبہ۔ اپنا دودھ پورا اترتا نہیں۔ نگوڑمارے کا پیٹ نہیں بھرتا ہوگا۔ ہر وقت روئے جاتا ہے۔ سوچ رہی ہوں کچھ کام دھندہ بھی تلاش کروں.... " وہ نظریں نیچے جھکا کر بات کر رہی تھی اور پیر کے انگوٹھے سے زمین کرید رہی تھی۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

بچے کو گود میں سمیٹ کر وہ جانے کے لیے مڑی۔ پھر پلٹ کر میری طرف آئی اور بہت آہستہ سے کہا، آپ خود کیوں تکلیف کرتی ہیں۔ یہ جھاڑ پونچھ اور صفائی مجھ سے کروا لیجیے۔ میرے پاس آپ کو دینے کے لیے دوائی کے پیسے بھی نہیں ہیں۔"

اس وقت تو میں نے اسے یوں ہی جانے دیا۔

اگلی صبح وہ خود آگئی۔ اور روز آنے لگی۔

کام تو کچھ تھا بھی نہیں۔ یوں ہی بیٹھی باتیں کرتی رہی۔

اکا دکا مریض آنے لگے تو وہ مجھ سے پوچھ پوچھ کر شیشی میں سے دوا نکال کر دینے اور دوا کے ساتھ ساتھ پرہیز کی تاکید بھی کرنے لگی۔ کئی بار وہ خود محلے کی عورتوں اور بچوں کو دکھانے کے لیے لے کر بھی آئی۔ وہ ان کے ہاتھوں سے مڑے تڑے اور پسینے میں بھیگے ہوئے نوٹ وصول کرکے میری میز کی اوپر والی دراز میں بھی رکھتی جاتی۔

میری پریکٹس چل پڑی تو وہ باضابطہ میری اسسٹنٹ بن چکی تھی۔

اتنے عرصے میں ایک روٹین سا بن گیا۔ دوسری چابی اس کے پاس رہتی تھی۔ میرے

آنے سے پہلے وہ کلینک کھول کر جھاڑ پونچھ کر لیتی تھی۔ میں آتی تو میری میز پر قلم اور اسٹیتھو سکوپ ایک طرف قرینے سے لگے ہوتے۔ نسخہ لکھنے کے لیے پرچیاں سامنے پیپر ویٹ سے دبی ہوتیں۔ ان سب کے درمیان موتیا کے دو چار پھول بھیگے ہوئے کپڑے میں لپٹے ہوتے اور میں مریضوں کی یلغار کے دوران ان کی طرف سر اٹھا کر دیکھ لیتی تو ایک نرم، مانوس خوش بو میری ساری تھکن غائب کر دیتی.... وہ مریضوں کو قطار میں بیٹھنے کے لیے کہتی، ایک ایک کر کے میرے پاس بھیجتی اور جاتے وقت فیس وصول کرنا نہ بھولتی.... میں اس سے کہتی، سعیدہ تم ملٹی پرپز ورکر ہو۔ وہ سرنج ابال کر اسٹریلائز کر لیتی۔ معائنے کے دستانے دھو کر ان میں پاؤڈر لگا دیتی اور انجکشن کے بعد لگانے والے روئی پر اسپرٹ لگا کر پھاہا بنا دیتی۔ اس کا ہاتھ پکا تھا۔ وہ بلکتے ہوئے بچوں اور گھبراتی ہوئی عورتوں کو بھی پکڑ لیتی تھی کہ انجکشن لگانے میں میرا ہاتھ نہ ہل جائے۔ اور واقعی وہ اس کی پکڑ ایسی تھی کہ پھر میرا ہاتھ نہ ہلتا۔

کلینک کا روٹین بنا تو محلے والوں کے دکھ سکھ اس میں شامل ہونے لگے۔ مہینے کی آخری تاریخوں میں سروری بار بار سردرد کی ٹکیاں لینے کیوں آتی ہے۔ زیبن کا میاں نشئی ہے، پیسے نہیں ملتے تو اسے مارتا ہے۔ تین مکان چھوڑ کر جن صاحب کے زور سے زور سے تھوکنے اور کھانسنے کی آواز آتی ہے، وہ دمے کے مریض ہیں۔ قیصر اس لیے پریشان ہے کہ اب کی بار مہینے کے دن اوپر ہوگئے.... شادیاں، بیماریاں، موتیں، جھگڑے، قرضے، روز روز کی چھوٹی بڑی خوشیاں اور غم.... کچھ سعیدہ کے ذریعے سے اور کچھ دوسری عورتوں کے حوالے سے مجھے اپنے ساتھ وقت کی طرح شریک کرنے لگے۔ پھر جو عورتیں حمل کے دوران تشنج سے بچاؤ کے ٹیکے لگوانے آتی تھیں، وہ ان ہی بچوں کی انگلی تھامے پولیو کے حفاظتی قطرے پلوانے آئیں اور جن لڑکیوں کو ان کی مائیں یہ کہہ کر لاتی تھیں کہ "آنٹی کا لیپ تو میں نے کر دیا ہے لیکن اب کی ماہواری میں اسے خون بہت آرہا ہے اور درد بھی ہے" وہ زچگی کے لیے آنے لگیں اور محلے کے جن لڑکوں کو سائیکل سے گرنے کی چوٹوں کے لیے فرسٹ ایڈ دی تھی، وہ ہارٹ اٹیک کا شکار ہونے لگے۔ میں خود ان گلیوں میں اپنا سفید کوٹ پہن کر ہوم وزٹ کرتے کرتے، گھٹنے کے درد کے مارے تھوڑی دور کے بعد کراہنے لگتی۔ اتنی دور کا کلینک بند کرنے کا بھی سوچتی تھی۔ لیکن جیسے یہ سارے لوگ اب میرے اپنے تھے۔ خاص طور پر سعیدہ کا گھرانا.... تھوڑا تھوڑا کر کے اس نے مجھے سب بتایا تھا.... غریبا مو بچپن نوعمری کی شادی.... چوتھے دن سے گھونگھٹ الٹا کر شوہر کا بلغم صاف کرنا اور ساس نندوں، دیورانیوں جٹھانیوں کے طعنے سننا۔ چولھا ایک ہونے کی وجہ سے باہر ساکھ بنی ہوئی تھی ورنہ اس کا شوہر کسی کام کا نہ تھا۔ لشتم پشتم دن گزر رہے تھے۔ ہاتھ تنگ رہنے کی وجہ سے ایسا کام چاہتی تھی کہ سسرال والوں کو باتیں بنانے کا موقع نہ ملے اور عزت کے ساتھ چار پیسے بھی مل جائیں۔ پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس کے بچے صاف ستھرے یونیفارم پہن کر اسکول جانے لگے اور اس کا

بیٹا ندیم، وہی جس کو پہلے دن دکھانے لائی تھی تو میرے سامنے ہی اس کی ٹانگیں سن گئی تھیں، اب اتنا بڑا ہو گیا تھا کہ محلے کے پی سی او سے مجھے فون کر دیتا: "ڈاکٹر صاحبہ، السلام علیکم میں ندیم بول رہا ہوں۔ امی نے کہلوایا ہے آج کلینک مت کھیے رات بھر فائرنگ ہوئی ہے۔" اور میں اس کی گونج دار آواز میں سنائے ہوئے فیصلے کا احترام کر کے گھر میں دبک جاتی۔

خودداری اور گھر کی حالت بدلنے کے عزم نے ایک چمک سی پیدا کر دی تھی اس لڑکے کی آنکھوں میں۔ پہلے چھوٹے بہن بھائیوں کو سنبھالتا، خود پڑھتا، انھیں پڑھاتا، اس کے بعد محلے میں ٹیوشن کرتا اور جانے کیا کیا۔ آنکھیں اور آواز چھلکی پڑ رہی تھیں جب سعیدہ نے مجھے بتایا تھا کہ ندیم کی کمائی سے آج گھر میں دری کی جگہ دو کرسیاں آگئی ہیں۔ میرے بچوں سے تو چھوٹا تھا وہ۔ جس دن میرے بیٹوں میں سے کسی ایک کا فون آتا تھا تو سعیدہ میری صورت دیکھ کر سمجھ جاتی تھی منی سوٹا سے فون کر کے خیریت پوچھتے تھے اور کہتے تھے، امی آپ اب بھی وہیں جا رہی ہیں، کیا نام ہے اس جگہ کا؟ ہاں ہاں وہی۔ حالات خراب ہیں وہاں جانا چھوڑ دیں۔ ان کو میں نے کتنی بار بتایا تھا کہ میں چھوٹی تھی تو میں نے دیکھا تھا میرے ابا ہر سال اجمیر جا رہے ہیں۔ وہ مجھے بتاتے تھے کہ میں سلطان الہند کو سلام کرنے جا رہا ہوں۔ اس نام کی وجہ سے مجھے پہلے ہی دن یہ جگہ مانوس لگی تھی لیکن ان بچوں کو یہ نام کیا یاد رہے گا۔ میرے پردیسی بچے اور یہی نام دھیان میں رکھتے ہیں۔ سعیدہ نہ دیکھ لے، میں سفید کوٹ سے ٹشو نکال کر آنکھیں پونچھ لیتی۔ اپنے بچوں کو پال پوس کر ان میں جی رہی ہیں ہم عورتیں۔

منی سوٹا سے فون آئے ہوئے کتنے دن ہو گئے۔ بہت اپنے آپ کو سمجھایا کہ سسٹر چل رہا ہو گا، لائن نہیں مل رہی ہو گی۔

پھر بھی اس دن صبح سے دل بیٹھا جا رہا تھا۔ میری ہمت نہیں پڑی کہ اٹھ کر تیار ہوں اور کلینک جاؤں۔ میں یوں ہی تکیہ منھ پر اوندھائے لیٹی رہی۔

ٹیلی فون کی گھنٹی کافی دیر سے بج جا رہی تھی۔ میں نے سنا ہی نہیں تھا۔

دوسری طرف جو آواز تھی اسے پہچاننے میں کچھ وقت لگا۔

"ڈاکٹر صاحبہ، السلام علیکم۔ جلدی آئیے، اماں کو پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے..." یہ سعیدہ کے دوسرے بیٹے سلیم کی آواز تھی۔

"خیریت تو ہے، کیا ہو گیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا کیا کریں۔ اس لیے آپ کو بلا رہے ہیں۔ کتنی دیر سے یوں ہی ..." وہ بہت گھبرایا ہوا تھا۔

"فوری طور پر اسپتال کیوں نہیں لے گئے؟" میں نے پوچھا۔

"اسپتال کیا کرنا تھا؟ کل رات سے اتنی فائرنگ.... اور رینجرز والے گھروں میں گھس

گھس کر.... آپ تو ڈاکٹر ہیں، آپ کو آنے دیں گے.... " ایسا لگتا تھا وہ ٹیلی فون پر رو پڑے گا۔

"اچھا۔ آنے کی کوشش کرتی ہوں۔ ندیم کہاں ہے؟" مجھے اچانک خیال آیا۔

"بھیا.... بھیا گھر پر نہیں ہیں.... " اس نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔

کس جتن سے میں وہاں تک پہنچی ہوں، میرا ہی دل جانتا ہے۔ میرے گھر والے ہی نہ نکلنے دیتے تھے۔ " خبروں میں اس علاقے کا نام آرہا ہے، وہی خواجہ اجمیر نگری۔ وہاں غدر برپا ہے۔ کیوں جارہی ہو؟ وہاں تمہارا کون بیٹھا ہے؟ "۔ اب میں اس کا کیا جواب دیتی؟ آنسو پیتی ہوئی گھر سے نکلی، وہاں پہنچی تو رینجرز راستہ روکے کھڑے تھے۔ سفید کوٹ اور انگریزی میں لڑنے مرنے پر تلی ہونے کی وجہ سے انھوں نے آخر جانے دیا۔ اس محلے کی گلیاں سڑکیں میرے لیے کتنی مانوس تھیں، لیکن آج کا یہ سناٹا اجنبی تھا، بالکل اجنبی۔ گلیوں پر ہو کا عالم اور دروازے کھڑکیاں بند۔ مجھے آتا دیکھ کر کھڑکیوں کے نیم باز پٹ بند ہونے لگے اور ان کے پیچھے سے جھانکتی ہوئی آنکھیں غائب۔ میرے قدم آج بہت سست تھے۔ گلی کے کونے پر پان کا کھوکھا بند تھا مگر دو چار لڑکے وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ "اس طرف لاش ملی ہے" ان میں سے ایک نے مجھے آتے ہوئے دیکھ کر اور میری سمت کا اندازہ لگا کر کہا۔ "اوندھے منھ پڑی ہوئی ہے۔ کسی کی ہمت نہیں ہورہی ہے کہ اٹھالے۔ پولیس والے تو آئے نہیں، ایدھی والوں کو فون کیا ہے۔"

پھر کسی کا گھر اجڑا۔ مجھے آج یہاں نہیں آنا چاہیے تھا، ایک عجیب سے احساس نے میرے تھکے ہوئے قدموں کو اور سست کر دیا۔

ساری گلی کا سناٹا جیسے سعیدہ کے گھر میں آن کر منجمد ہو گیا تھا۔ وہ فرش پر بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے پلک تک نہ جھپکی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور سر پر چادر نہ تھی۔ ارے کہیں اس کا شوہر.... میں نے گھبرا کر گھر کے اس کونے کی طرف دیکھا۔ اس کا مجہول شوہر چارپائی پر پڑا خالی دیدوں سے میری طرف گھور رہا تھا۔ "سلیم کہاں ہے؟ تمہاری اماں نے یہ کیا حال بنا رکھا ہے؟" میں نے چھوٹی والی بچی سے پوچھا جو سہمی ہوئی کھڑی تھی۔

"مجھے نئیں مالوم.... امی تو بول ہی نئیں رئی.... بھیا کل رات گھر نہیں آیا" بچی نے آکر میرا کوٹ پکڑ لیا اور اس میں منھ چھپا کر رونے لگی۔

"ندیم کہاں ہے، یہ سب کیا ہو رہا ہے؟" میں نے اپنی آواز کو ٹھیک رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

اس کوشش میں آواز اونچی ہو گئی ہو گی کیوں کہ ادھ کھلے دروازے پر محلے کے دو چار لوگ نظر آنے لگے۔ ان کی آنکھیں خشک تھیں، چہرے سپاٹ۔ ان کے درمیان سلیم بھی کہیں سے نکل آیا اور سیدھا ماں کی طرف چلا گیا۔

"اماں گلی کی وہ لاش بھیا کی ہے.... میں نے اسے.... میں نے انھیں سیدھا کر کے دیکھا

ہے....."

اس سے آگے نہیں سن سکی میں۔ وہ دن اور آج کا دن، دوبارہ رخ نہیں کیا میں نے اس طرف کا۔ وہاں جانے کا خیال بھی آتا ہے تو کپکپی چڑھ جاتی ہے جیسے وہ کلینک ایک کوکھ اجڑی، کرموں جلی ماں کی طرح فریاد کر رہی ہو، "کھاجاجی!..... بڑے گریب نواج...."

○ ○ ○

"ونیلا کرمبل" کا بقیہ:

"پھر بلیک ہاؤس روڈ پہنچ گیا۔ برٹش کاؤنسل کی نیلی کانچ عمارت کے سامنے مجھے ایک بار پھر اوتھیلو یاد آگیا:

O! it comes o'er my memory,
As doth the raven o'er the infected house
Boding to all.

گھنٹی بجانے پر اس بار بھی کوئی دیر تک نہیں نکلا۔ میں نے پھاٹک کی درز میں سے جھانکا گملوں والے پودے مرجھائے ہوئے لگ رہے تھے اور پورچ میں خاک اڑ رہی تھی۔ ملازم نے پھاٹک کھولنے کے بجائے اندر سے ہی ہانک لگائی۔

"ارنواز میم صاحب نہیں ہے، امریکہ چلا گیا...."

کب، کیسے؟ میں نے اس سے پوچھنا چاہا۔ مجھے لگا کہ جیسے دھوکا دیا گیا ہو۔ کیا ان کے گھر میں ڈاکا پڑا تھا یا کوئی واردات ہوئی تھی؟ ملازم کچھ بتانے سے قاصر تھا۔

ہو سکتا ہے ان لوگوں نے جانے کا فیصلہ پہلے سے کر رکھا ہے۔ میں نے جب انھیں باورچی خانے میں جھانکا تھا تو انھیں برا تو نہیں لگا تھا، میرے دل میں احساس جرم پیدا ہونے لگا۔ کہیں وہ یہ تو نہیں سمجھنے لگیں کہ میں ان کے بغیر آستین والے لبادے کو غور سے دیکھ رہا ہوں کیوں کہ میں بھی تو ان کی نظر میں اوتھیلو کا ہم عقیدہ ہوں۔ میں نے بتایا ناں، یہ کس بادشاہ کا زمانہ تھا۔

میں خالی ہاتھ وہاں سے لوٹ آیا۔ راستے میں کسی بیکری پر مجھ سے نہیں رکا گیا۔ کلفٹن برج سے اتر کر فریئر ہال کی عمارت کے الٹے ہاتھ پر میری نظر خود بخود اٹھ گئی۔ امریکی سفارت خانے کے باہر ویزا کے خواہش مند افراد کی قطار اب دوہری ہو گئی ہے اور محافظ سپاہی کے سامنے ریت کی بوریوں کی تعداد دگنی۔ ونیلا کرمبل والی ارنواز یہیں سے گزری ہوں گی۔ لیکن ریت کی بوریوں کے پار ونیلا کرمبل، ونیلا کرمبل اب خاک نہیں۔

○ ○ ○

آصف فرخی

ناگن چورنگی

"کیا یہ سچ ہے؟"

میں دفتر میں بیٹھا ہوا تھا جب ٹیلی فون کر کے امی جان نے مجھ سے پوچھا۔

یعنی اب یہ بات گھر گھر پھیل گئی، فوری طور پر ان کو کوئی جواب دینے کے بجائے میں نے سوچا۔ پھر بھی تصدیق کرنے کے لیے میں نے ان سے پوچھ لیا۔

"کیا؟ وہ کیا ہے جسے سچ ہونا ہے؟"

"تم تو ہر بات کو یوں ہی اڑا دیتے ہو۔ میں اس خبر کے بارے میں پوچھ رہی ہوں۔ وہی حکیم صاحب والی خبر۔"

مجھ تک بھی پہنچ چکی تھی یہ خبر۔ کئی ایک لوگوں کی زبان پر یہ ذکر تھا کسی کو صحیح طرح سے اندازہ نہیں تھا کہ یہ خبر ہے یا افواہ۔

"آپ نے کہاں سے سن لی؟"

"لو اور سنو میں گھر میں بیٹھنے والی، مجھے کون بتانے آرہا ہے۔ سارے شہر میں لوگ کہہ رہے ہیں۔ فاروق جلدی گھر آگیا اس کے تو کالج میں کلاسیں بھی رکوادی گئیں۔"

"اس کا مطلب ہے کچھ نہ کچھ تو ضرور ہوا ہوگا۔" میں نے یہ کہہ کر ٹیلیفون رکھ دیا۔ فوراً ہی ایک تصویر آنکھوں میں گھوم گئی۔ سفید شیروانی پہنے ہوئے، شہر کی مختلف سماجی تقریبات کی صدارت کرتے ہوئے حکیم صاحب جنھیں میں نے ٹی وی پر اور بڑی بڑی تقریبات میں دیکھا تھا جس طرح شہر کا کوئی بھی عام شخص ان لوگوں کو دیکھ سکتا ہے جنھیں "بڑے آدمی" کہا جاتا ہے۔ میں نے کبھی ان سے ذاتی قربت کی مس نہیں محسوس کی تھی لیکن دفعتہً مجھے احساس ہوا کہ ان کی سناؤنی مجھے سہما کر رکھ دینے کے لیے کافی ہے۔

میری سمجھ میں اور تو کچھ نہیں آیا، میں نے خالو میاں کو فون کیا۔

"ہاں بھئی، سنا تو میں نے بھی ہے۔" وہ کہنے لگے۔ "لیکن یہ اڑادی گئی ہے۔ میں نے تصدیق کرنے کے لیے نظامی صاحب کے ہاں فون کیا تھا۔ تم جانو، وہ تو شہر خبر ہیں۔ وہ کہنے لگے کہ دو بجے تک، ہم اسی پنج ستارہ ہوٹل میں تھے جہاں حکیم صاحب ایک تقریب کے مہمان خصوصی تھے۔ ہم نے خود انھیں لنچ کرتے ہوئے دیکھا ہے۔" خالو میاں بتانے لگے۔ وہ بول رہے تھے اور میں یوں ہی بال پوائنٹ سے کاغذ پر الٹی سیدھی لکیریں کھینچ رہا تھا۔

"چلیے، یہ تو اطمینان ہو گیا۔" وہ بولتے بولتے رکے تو میں چونک گیا۔ پھر اتنا کہہ کر میں

نے کاغذ کی طرف دیکھا جس پر میری لکیروں سے ایک کٹی پھٹی شکل بن گئی تھی۔

"ہاں ان کی طرف سے تو اطمینان ہو گیا۔ لیکن سنا ہے کہ ان کا نام ہٹ لسٹ پر ہے۔ اور بھی کئی نام ہیں۔ لوگ کہہ رہے ہیں کہ ایسے آدمی کو قتل کیا جائے گا کہ شہر بھر میں دہشت پھیل جائے۔ کسی وقت بھی دھماکا ہو سکتا ہے۔"

"ہاں، یہ کسی وقت بھی ہو سکتا ہے۔ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ پھر کیا کریں؟"

"میری مانو اب چل پڑو۔ میاں، گھر جاؤ۔ لیکن کس طرف سے نکلو گے؟" میں ان کے سوال پر تھوڑا سا حیران ہوا۔

"اسی طرف سے۔ راستہ ہی ایک ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"تین تلوار والے چوک کی طرف مت جانا۔ صفو میاں اس طرف سے ابھی آئے ہیں۔ کہہ رہے تھے کہ وہاں کچھ گڑبڑ ہے۔"

"اچھا، کلفٹن کی طرف؟ مجھے تو پتہ ہی نہیں چلا۔ دفتر سے نکلا بھی تو لنچ پیروں آنا پڑا۔ میں تو ساری صبح ان میں پھنسا رہا۔" میں نے اپنے سامنے پڑے ہوئے فائلوں کے ڈھیر کی طرف دیکھا۔

میں اپنے کمرے سے نکل کر دوسرے سیکشن میں آ گیا۔ وہاں کوئی بھی اپنی ڈیسک پر نہیں بیٹھا تھا۔ دو دو، چار چار کی ٹکڑیوں میں کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ سلطان صاحب اپنے ڈیسک کے سامنے کھڑے سفید بالوں میں کنگھی پھیر رہے تھے۔

"آپ لوگوں نے بنا موت ہی حکیم صاحب کو مار دیا۔" انھوں نے مجھے دیکھ کر کہا۔

ان کا یہ مذاق مجھے اکھر گیا۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے انھیں روک دیا۔ "یہ خبر جھوٹی نکلی۔ دو بجے تک تو حکیم صاحب ایک جگہ لنچ کرتے دیکھے گئے ہیں۔"

"دو بجے؟ یہ تو خبر ہی تین بجے کی ہے۔"

میں وہیں رک گیا۔

"نہیں، نہیں، یہ یوں ہی اڑ گئی ہے۔" اختر صاحب اپنی ڈیسک کی طرف سے آتے ہوئے بولے۔ "لیکن کلفٹن والی بات سو فی صد صحیح ہے۔ کام بند کیجیے اور گھر نکل چلیے۔"

میرے چہرے پر سیکڑوں سوالیہ نشان ابھر آئے ہوں گے۔ اختر صاحب اپنا منہ میرے کان کے قریب لا کر کہنے لگے۔ "کلفٹن برج پر بم پھٹا ہے۔"

واقعی؟ میں نے ان کی طرف تعجب سے دیکھا۔ پھر مجھے یاد آیا کہ ایک کلائنٹ سے میٹنگ کے لیے ڈھائی بجے دو تلوار سے زمزمہ کی طرف نکلا تھا تو وہاں ساری دکانیں بند تھیں۔ اس سے پہلے کہ میں اس پر غور کرتا یا حیران ہوتا، پیجر پر میسج مل گیا تھا کہ میٹنگ، ارجنٹ طور پر ملتوی کر دی گئی ہے اور میں نے گاڑی واپس گھمائی تھی۔

ایک طرف کا بازار ہی نہیں، سارا شہر بند ہوتا ہوا لگ رہا تھا جب میں گھر کے لیے نکلا۔ ٹریفک کے سگنل پر بھیک مانگنے والے اور پھول بیچنے والے نہیں تھے۔ ان کی جگہ شام کا دو ورقی اخبار زور زور سے چیخ رہا تھا۔

گاڑی کے ڈیش بورڈ میں پڑے ہوئے کھلے پیسے دے کر اخبار کی سرخی پر نظر ہی ڈال پایا تھا کہ سگنل کھل گیا اور میں نے گیئر بدل کر گاڑی بڑھا دی۔

گھر پہنچا تو امی جان برآمدے ہی میں ٹہل رہی تھیں۔

"آگئے بیٹا ساتھ خیریت کے" انھوں نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ "جب تک تم دفتر سے واپس نہیں آجاتے۔ دل ڈرتا رہتا ہے۔"

میں گاڑی سے اترنے لگا۔

"آج کی کیا خبر ہے؟" امی جان نے مجھ سے اترتے میں پوچھا۔

"خبر تو وہی روز کی ہے۔ دو ایک دن رکا رہا، پھر وہی سلسلہ شروع ہو گیا......" میں گاڑی کے دروازے بند کر کے دیکھنے لگا کہ وہ لاک ہو گئے ہیں کہ نہیں۔

"کیا ہوا؟" امی جان نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

"فائرنگ ہوئی ہے ناگن چورنگی پر۔ تین آدمی ہلاک ہو گئے ہیں۔" میں نے اخبار کی خبر انھیں سنائی۔

"ناگن چورنگی پر فائرنگ ہوئی ہے؟" انھوں نے میری بات دہرا کر تصدیق کی۔ پھر زور سے سانس لیتے ہوئے کہا "خدایا، تیرا شکر ہے!"

"امی جان، کیا کہہ رہی ہیں آپ" میں حیران رہ گیا۔

"ہاں بیٹے، ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہوں۔ فائرنگ کے واقعات تو روز ہی ہوتے رہتے ہیں۔ میں تو ڈر رہی تھی کہ آج کچھ اور نہ ہو جائے۔"

میں نے ان کی طرف دیکھا اور ان کا ہاتھ پکڑ کر گھر کے اندر آنے لگا۔ چلتے چلتے وہ رک گئیں اور مجھ سے پوچھنے لگیں "ویسے یہ ناگن چورنگی ہے کس طرف؟"

چاروں طرف۔ میں نے کہنا چاہا لیکن الفاظ میرے حلق میں گھٹ کر رہ گئے۔

○ ○ ○

آصف فرخی

کون

خوف نے اسے سکھا دیا تھا کہ چھپکلی سے براہ راست بات کرے۔

چھپکلی میں جو ہے، اسے بتادے کہ پہچان کر لی گئی ہے۔ اس لیے اب اسے چلے جانا چاہیے۔

وہ جو کوئی بھی ہے اور چاہے جہاں سے بھی آیا ہے۔

جب تک چھپکلی سامنے والی دیوار پر ہے، وہ پلیٹ پر سے نوالہ اٹھا کر منہہ میں نہیں رکھ سکتی تھی۔ کیا پتہ اس چھپکلی میں کون ہے اور کھانے پر نظر لگا رہا ہو۔

چھپکلی کی نظر لگ سکتی ہے، اسے اندازہ تھا۔

لیکن چھپکلی کو مارتے نہیں ہے۔

اسے بچپن سے یہ بھی بتادیا گیا تھا۔ اس لیے کہ چھپکلی کو حکم نہیں ہے۔ وہ بوڑھی آواز اب بھی اس کے کانوں میں رہ رہ کر گونجتی تھی جو حکم کو حکم کہتی تھی اور جس نے بتایا تھا کہ ایک چھپکلی کو حکم نہیں ہے اور ایک مینڈک کو۔ اس لیے یہ اوپر بھی گر پڑیں تو کاٹتے نہیں ہیں۔ اس لیے انھیں مارنا نہیں چاہیے۔

بس اس کی نظر سے بچنا چاہیے۔

"اصل میں چھپکلی بھیس میں ہوتی ہے۔" وہ آواز اب بھی آتی تھی، کمرے کی دیواروں اور چھت کے کونوں میں اس کی نظر کا پیچھا کرتی تھی۔

وہ اسے بتادینا چاہتی تھی کہ وہ جو کوئی بھی ہے، اسے پہچان لیا گیا ہے۔

"چھپکلی آپ کون ہیں" وہ پھر چھپکلی کی طرف منہہ کرکے اس طرح کہتی کہ اس کی آواز چھپکلی تک پہنچ جائے۔ اسی طرح جیسے چھپکلی کی نظر اس تک پہنچ رہی ہوگی۔

بلکہ اس کے آر پار اور شاید اندر بھی۔

"آپ کون ہیں" وہ پکار کر کہتی۔ "چھپکلی آپ کن میں سے ہیں۔ آپ یہاں سے چلی جائیں۔ اللہ نور بلا دور، چھو چھو چھو......"

جیسے سانس کا باریک سفوف چھپکلی پر کیڑے مار دوا کے اسپرے کی طرح اثر کر رہا ہے اور وہ دیوار پر رینگتی ہوئی کسی ایسے کونے میں جارہی ہے جہاں سے وہ نظر نہیں آئے گی اور گھر والوں کو شک میں مبتلا نہیں کرے گی۔

نئی جگہ ہے، یہاں کی چھپکلیوں کا کیا پتہ۔ شام ہی سے اس نے اسپرے کر دیا تھا کہ

دیواریں چھپکلیوں سے صاف رہیں۔ ورنہ سب مہمانوں کے سامنے چھپکلی سے زور سے تھوڑی کہہ سکتی ہے کہ اسے پہچان لیا ہے، یہاں بھی پہچان لیا ہے اور وہ چلی ہی جائے تو اچھا۔

چھپکلی کے روپ میں کوئی بھی ہو، لوگ کیا سوچیں گے۔

"آج کی دعوت میں ذرا ڈھنگ سے اہتمام کر لینا۔" اس کے شوہر نے پہلے ہی سے باور کرادیا تھا۔ "اپنا بے تکا پھوہڑ پن پہلی ہی ملاقات میں سب پر ظاہر نہ کر دینا۔ نیا شہر ہے، نئے ملاقاتی بنا کر رکھنے ہیں۔" وہ ناشتے کی میز کے سامنے بیٹھی تھی کہ یہ دفتر چلے جائیں تو پھر اپنے اطمینان سے دو توں اور سینکنے کرا اور چائے دوبارہ گرم کر کے ناشتہ پورا کرے پھر گھنٹے آدھ گھنٹے بستر پر لیٹی رہے، یوں ہی خالی، کچھ کیے بغیر۔

ان کی آواز رہ رہ کر اس کے انتظار کو وسعت دیے جا رہی تھی۔ "نیا دفتر ہے نئے لوگ ہیں۔ پھر سب دل ہی دل میں اندازہ لگانے کی کوشش کر رہے ہوں گے کہ یہ جو نیا آدمی ٹرانسفر ہو کر آیا ہے، دیکھیں تو سہی۔ یہ کتنے پانی میں ہے۔ اور پھر ان کو یہ بات ضرور چبھ رہی ہوگی کہ اوہو، یہ تو کراچی آفس سے آیا ہے۔ اس لیے ان پر پہلا ہی تاثر اچھا پڑنا چاہیے۔" اس کی آواز تنبیہ کے بجائے ایک محتاط درخواست بنتی جا رہی تھی۔

اس نے جواب میں سر ہلا دیا۔ وہ سمجھ رہی تھی۔

سمجھ جاتی تھی وہ حکم ہونے نہ ہونے کو۔

معلوم تھا اسے بھی کہ یہ تاثر اچھا قائم کرنا کتنا ضروری ہے۔ ان کے نئے دفتر کے لیے ہی نہیں، گھر بار اور رہنے سہنے کے لیے بھی۔ اس نے تو خود ان سے کہا تھا کہ دفتر میں جو دوسرے ساتھی افسر ہیں، ان کو اور ان کی بیگمات کو ایک وقت رات کے کھانے پر گھر بلائے تاکہ آنا جانا ہو میل جول بڑھے، اب تو اچھے برے وقت کے ساتھ یہی لوگ ہیں۔ بڑی کوشش سے تو یہ ٹرانسفر ہوا تھا۔ اور وہاں کراچی میں بھی گھر آنے جانے والوں کا جو تانتا بندھ گیا تھا ان کو بتاتے بتاتے تھک گئے تھے۔ کتنے کا نقصان ہوا، وہ لوگ کس طرح اطلاعی گھنٹی بجا کر آئے، پستول دکھا کر کیسے چابیاں لیں، کس طرح دھمکایا اور کس کس طرح لوٹا اور پھر ہر سننے والا کا وہی جملہ کہ "مال کا تو سمجھیے صدقہ گیا، شکر کیجیے کہ جان بچ گئی۔ کسی کے چوٹ نہیں لگی۔"

تنگ آگئی تھی وہ ایک جیسی باتیں کرتے کرتے اور ایک جیسی باتیں سنتے سنتے۔ اور پھر وہ خوف جو بچپن کے بھولے بسرے دنوں کی یاد سے نکل کر مستقل ساتھی بنا جا رہا تھا۔ ہر آہٹ پر چونک پڑتی، دروازے کی گھنٹی بجتی تو دل زور زور سے دھڑکنے لگتا، ٹیلی فون کے ریسیور میں سے آنے والی آواز نامانوس اور دھمکاتی ہوئی محسوس ہوتی: "خبردار جو کسی سے کچھ کہا۔" "کون ہیں، کون ہیں آپ" وہ زور زور سے پکارتی مگر ریسیور جیسے ہمیشہ سے خاموش چلا آ رہا ہو۔

"بہتر ہوگا ہم لوگ یہاں سے چلے ہی جائیں۔" اس نے اپنے شوہر کے سامنے یہ تجویز رکھی

تھی۔ اور اب وہ یہاں تھے۔

جو پوچھنے کی بات تھی، وہ تو بھول ہی گئی تھی۔

ان کے دفتر جانے کے بعد یاد آیا۔

دفتر کا فون نمبر ملانے ہی والی تھی کہ یاد آیا، یہ تو کراچی کا نمبر ہے۔ اسے ڈائری ڈھونڈ کر لانا پڑی جس میں یہاں کا نمبر لکھا ہوا تھا۔

"ہیلو، جی۔ کون؟" اس کے شوہر کی آواز سپاٹ اور کاروباری تھی۔ وہ جیسے کبھی فون پر اس کی آواز پہچانتے ہی نہیں تھے۔

"وہ میں..... "اسے تعارف کروانا پڑتا تھا۔

"اچھا، ہاں....." پھر آواز میں ایک دھیما گھریلو پن آجاتا۔

"وہ میں یہ کہہ رہی تھی کہ مٹر چاول کرلوں اور گلاوٹ کے کباب۔ واپس آتے ہوئے روٹی آپ لیتے آئیے گا۔"

"اچھا۔"

"ٹھیک رہے گا یہ کھانا؟ ٹھیک تو رہے گا ناں؟" وہ جیسے بار بار پوچھ کر اپنی تسلی کرلینا چاہتی ہو۔

"نہ رہنے کا کیا سوال ہے؟" وہ الٹا اسی سے پوچھنے لگے۔

"آپ کے نئے دفتر والے جو ہیں۔ اچھا، تو پھر کون کون ہوں گے؟" وہ جیسے بات مکمل کرنا چاہتی ہو۔

"بھئی ایک دفعہ بتا تو دیا کہ دفتر والے ہیں۔ یہ کون کون کا سوال کیوں بار بار پوچھے جاتی ہو؟" وہ بے صبری سے بول رہے تھے۔

اس نے فرماں برداری سے فون رکھ دیا۔ واقعی، جب پتہ چل گیا کہ دفتر کے لوگ ہیں تو پھر یہ کون کون کا کیا سوال۔

کون کا یہ سوال تو اٹھے ہی اٹھے۔ اور وہی ہوا جس کا اسے اندیشہ تھا۔

کھانا کھالیا گیا تھا۔ سب کا ایک دوسرے سے، بلکہ سب کا ان دونوں سے تعارف کرادیا گیا تھا۔ جلد ہی دوبارہ ملنے اور ملتے رہنے کی خواہش کا ایک بار پھر اظہار کیا جاچکا تھا اور کھانے کی تعریف بھی ہوچکی تھی۔ سگریٹ پینے والے حضرات ڈرائنگ روم کے ایک کونے میں کھڑے ہوئے زور و شور سے کسی بات پر بحث کررہے تھے۔ اس نے ایک لمحے کے لیے غور کیا: "امریکا .... فوج......... صدر........ آمین........ "ان الفاظ سے زیادہ اس کو سنائی نہیں دیا۔

"آپ کون ہیں؟" وہ چونک پڑی۔ ایک عورت اس سے پوچھ رہی تھی۔

کون؟

کون ہیں آپ ؟ یہ سوال اس وقت بھی اٹھتا تھا جب دروازے کی گھنٹی بجتی تھی ۔ اس کے شوہر نے نوکر کو ہدایت کر رکھی تھی کہ پہلے پوچھ لو کون ہے ۔ پھر دروازہ کھولنا ۔

کون صیب ؟ نوکر حلق سے بھاری آواز نکال کر پوچھتا تھا جس کو سن کر بہت ہنسی آتی تھی محلے کے بچے اس کی بھاری آواز کی نقل اتار کر اس کے غیر مقامی لہجے میں کہتے پھرتے تھے : کون صیب ؟ کون صیب ؟

شاید نہیں بلکہ یقیناً اس سے بھی پہلے سے اٹھتا تھا کون کا یہ سوال ۔

کون ؟ پلنگ پر پڑی اونگھتی رہنے والی نانی اس کے قدموں کی آہٹ پر چونک اٹھتی تھیں اور اسی بوڑھی آواز میں پوچھتی تھیں جس میں بتایا کرتی تھیں کہ چھپکلی بن کر کوئی آیا کرتا ہے ۔

" کون بچہ ادھر آیا ہے ؟ کون میرا کام کرے گا ؟ " امی سلائی سے سر اٹھائے بغیر یہ سوال دہرایا کرتیں ۔ پھر اس کے بعد دوسرا سوال ہوتا ۔ کون مجھے پانی پلائے گا ، یا کون میری ٹانگیں دبائے گا ۔ اور اگر اپنے کسی کھیل میں مگن ، وہ جواب دیتی کہ کوئی اور ، میں نہیں ، تو اس کے بعد امی اسی سوال کو دوسرے ڈھنگ سے پوچھتی تھیں : " آنکھیں میچیں ، آنکھیں میچیں کون آئے گا ؟ " ۔ اب اس سوال میں ایک ہمک ہوتی ۔ " راجہ آئے رانی آئے ، طوطا آئے مینا آئے ... کون آئے ؟ ارے یہ تو کوئی پری آگئی ..... " اور جیسے اس کون کے جواب سے اپنے آپ کو ملانے کے لیے ، اس کے اندر سے کوئی اٹھ کر بھاگتا اور امی کے سوال کی کھلی آغوش میں بھر جاتا ۔ " میں ہوں ، یہ تو میں آئی ہوں ..... "

" کون ؟ ارے ، یہ تو میری بیٹیا آگئی .... " امی کے لہجے میں کچھ کھو کر مل جانے کی تسلی ہوتی ۔ اور اس کون کے بعد سے جیسے وہ پھر سے پہچان لی جاتی ۔ کسی اور کا دھوکا ہونے کے بجائے صحیح پہچان لی جاتی ۔

کون کون کون .... یہ آواز اب بھی رہ رہ کر پوچھتی تھی ۔

" آپ کون ہیں ؟ " وہ عورت اس سے پھر پوچھ رہی تھی ۔ وہ چونک گئی ۔ جیسے گہری نیند سے ہڑبڑا کر اٹھنے والا ادھر ادھر دیکھتا کہ وہ کہاں ہے ، اس نے اپنے چاروں طرف دیکھا : میں کہاں ہوں ، کن میں ہوں ؟ پھر یہ اندازہ کر کے ڈھارس ہوئی کہ تکلف والی دعوتوں میں خوب پیٹ بھر کر کھانا چکنے کے بعد کا وہ لمحہ آگیا جب عورتیں ایک دوسرے سے ، بچوں کی تعداد ، شوہر کا مزاج اور اسی طرح کی ذاتی ، نجی باتوں کا کرید کرید کر تبادلہ شروع کر دیتی ہیں ۔ " آپ کون ہیں ؟ " وہ عورت اس سے پوچھ رہی تھی ۔

اس نے غور سے اس عورت کی طرف دیکھا ۔ اب یاد نہیں آیا کہ دفتر کے کن صاحب کی بیگم ہیں یہ ، جنھوں نے اس بوتیک سے جوڑا خریدنے کا ذکر کیا تھا اور جن کے دانتوں پر بھی لپ

اسٹک کا ہلکا سا رنگ اتر آیا تھا۔

"جی میرے شوہر بھی میریس ہیں اور میں کیپری کورن....." اس نے بہت سنجیدگی سے جواب دیا۔

"ہوں گے جی۔ میں یہ نہیں پوچھ رہی۔ میں یہ پوچھ رہی ہوں کہ آپ لوگ ہیں کون؟"

"جی..... میں سمجھی نہیں؟" اس نے گڑبڑا کر کہا۔ اور ساتھ ہی دل میں دھکڑ پکڑ سی ہونے لگی کہ اس سوال کا وہی مطلب نہ ہو جس کا اسے اندیشہ ہو رہا ہے۔

"میں تو جی یہ پوچھ رہی ہوں کہ آپ لوگ ہیں کون؟" عورت نے سوال کو پھر زور دے کر پوچھا۔

وہ اس عورت کا منہہ تکے جا رہی تھی۔

"میں یہ پوچھ رہی ہوں کہ آپ لوگ ہندوستانی ہیں ناں؟" عورت نے جیسے سوال کا حل بھی بتا دیا۔

اب کی اس نے تیزی سے جواب دیا۔ "بالکل نہیں۔ میں تو پیدا بھی پاکستان میں ہوئی تھی۔" پھر اسے یاد آیا کہ سہارن پور میں جو خالہ رہ گئی تھیں، ان کے بیٹے ایک دفعہ آئے تھے تو انھوں نے کہا تھا کہ جو لوگ ہمیں کہتے ہیں کہ یہاں رہ کر ادھر کے گن گاتے ہو تو میں ان کو بتاؤں گا کہ ہندوستانی کہلانے کا شوق ہے تو وہیں چلے جاؤ، واہگہ پار کرتے ہی تمھیں ہر ایک ہندوستانی کہے گا، پھر کہتا ہی رہے گا۔ مگر اس نے کچھ نہیں کہا۔

"پیدا ہوئی ہوں گی، لیکن میرا مطلب ہے کہ آپ لوگ مہاجر ہیں؟" عورت نے سوال کے الفاظ بدل کر پوچھا۔

اس نے ایک بار پھر جواب دیا۔ "جی نہیں۔ مہاجر کیسے ہو گئے؟ ہم نے تو کوئی ہجرت نہیں کی۔"

"وہی مطلب ہے ناں جی۔ میرا مطلب ہے آپ اردو اسپیکنگ ہیں؟" اس عورت نے پھر پوچھا۔

"لیکن اردو تو اس وقت آپ بھی بول رہی ہیں" اس نے تیزی سے جواب دیا۔

"آپ تو برا مان رہی ہیں، آپ سے یہی تو پوچھا کہ آپ لوگ کون ہیں۔ آخر بندے بشر کا پتہ ہوتا ہی ہے..... ناراض نہ ہوں۔ آپ تو میری بات ہی نہیں سن رہی ہیں....."

وہ بوڑھی آواز بہت قریب سے آ رہی تھی۔ "بس رہ رہ کر ایک ہوک اٹھے جاتی اور ایک آواز سنائی جاتی: کون جائے کنگن کی نگری، کون چلے کنگن کے دیس....."

وہ ایک دم بیٹھے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور ایسے چلنے لگی جیسے نیند میں کسی خواب کی سمت چل رہی ہو۔

"کیا ہوا؟" اس عورت نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "میری بات آپ کو اتنی بری لگ گئی.."

"کون؟" اس نے زور سے کہا۔ جیسے کسی کا سوال دہرا رہی ہو۔ پھر خود ہی جواب دیا:
"میں اور کون؟"
"جی کیا مطلب؟ کہاں ہے چھپکلی؟" وہ عورت حیران ہو کر پوچھ رہی تھی۔
جواب دینے کے بجائے وہ خلاؤں میں گھورے جا رہی تھی جہاں سیکڑوں چھپکلیاں رینگ رہی تھیں۔

"ایک شادی شہر میں" کا بقیہ:-

کہیں وہ ایسے ہی نہ کاٹ لیں.... یہ بھی تمھاری ضد تھی کہ فرشی غرارہ ہو اور چٹا پٹی کا بنے.... میں تو پریشان ہو کر رہ گئی شہر کے ان مسئلوں سے.... "اماں جان اپنے آپ کو پیٹے ڈال رہی تھیں۔
"ہاں میاں درزی نے تمھارے سوٹ کا کیا کہا؟ ٹرائل کب کا ہو چکا ہے، اب تو ڈلیوری دینی ہے.... "اچھے خالو نے فاروق سے پوچھا۔
"ٹیلر کے ہاں جانے کے لیے تو گاڑی پارک کر رہا تھا.... "فاروق نے کہتے کہتے لہجہ دھیما کر لیا۔ "دکان کے سامنے بڑا رش تھا۔ پیلی ٹیکسی بیچ میں رکی ہوئی تھی اور ٹیکسی والا چیخ رہا تھا "لوٹ لو، لوٹ لو مجھے۔ کراچی والا ہوں ناں میں.... ایک بار گلا ہی کاٹ ڈالو.... "میں نے چاہا کہ رک کر پتہ کروں کیا ہوا ہے، پولیس والوں نے چیکنگ کے نام پر کچھ کیا تو نہیں ہے لیکن فرزانہ نے کھینچ لیا کہ یہاں رکیے، گڑ بڑ بڑھ نہ جائے.... ہم فوراً نکل آئے.... "
میں کرسی پر آگے ہو کر غور سے سن رہا تھا۔ اس ڈر سے کہ کہیں میں اس کی بات نہ کرنے لگوں، اچھے خالو بول پڑے۔ یوں ہی سوال پوچھنے کی خاطر۔ "شادی کا سوفتہ نہ ہو جائے.... اور میاں فاروق، تیاری تو چل رہی ہے؟"
فاروق نے چبھتی ہوئی نظروں سے ان کی طرف دیکھا، اور ہونٹ بھینچ کر مسکراہٹ دبانے لگا۔ "جی ہاں، اچھے خالو۔ پوری تیاری ہے۔ لڑکی بھی تیار ہے اور لڑکا بھی راضی ہے.... "
فرزانہ نے کامدانی والا پلو اماں جان کے سامنے پھیلاتے پھیلاتے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا تو فلمی ہیرو کی نقل کرتے ہوئے فاروق نے وہیں سے گنگنا کر تان ماری۔ "بول رادھا بول۔ سنگم ہو گا کہ نہیں۔ ارے بول رادھا بول...."
میں نے کرسی کے دونوں ہتھے مضبوطی سے پکڑ لیے اور سوچ میں پڑ گیا۔ اب رادھا کیا بولے گی؟

○ ○ ○

آصف فرخی

ایک شادی شہر میں

"کریں تو کیا کریں؟ ہماری تو سمجھ میں نہیں آرہا۔"

ایک بے تاب آواز میرے کمرے کے باہر گونج رہی تھی۔ میں اندر رضائی اوڑھے لیٹا تھا۔ بڑی مشکل میں ہیں اچھے خالو بے چارے، میں نے لیٹے لیٹے اندازہ لگالیا تھا کہ باہر کون بول رہا ہے اور اس کا مسئلہ کیا ہے۔

ہوگی وہی شادی کی بات، مجھے بوجھنے کی ضرورت نہیں تھی۔

میں بھلا اس میں کیا کر سکتا ہوں، میں اپنے طور فیصلے پر پہنچ چکا تھا۔

"کوئی ان کو دیکھے۔ گھوڑے بیچ کر سو رہے ہیں۔ سر پر قیامت آکر گزر جائے، انھیں خبر نہ ہوگی...... دنیا ادھر کی ادھر ہو جائے، ان کا دس دس بجے تک سونا نہیں چھوٹتا۔" اچھے خالو کی آواز میں مشکل کے بجائے شکایت بھری ہوئی تھی۔

"اے بیٹے، چین سے سونا کہاں ملتا ہے غریب کو۔" اماں جان کی آواز دالان سے میرے دفاع میں آئی۔ "وہ تو کہو آج کل کالج میں چھٹی ہو گئی ہے۔ ہنگاموں کی وجہ سے تو یہ گھر میں دکھائی دے بھی رہے ہیں...."

لے دے کر پھر تان اسی پر ٹوٹی کہ میں کیا کرتا ہوں اور کیا نہیں، میں نے کوفت کے ساتھ سوچا۔ "میں سو نہیں رہا۔" میں نے اندر سے آواز لگا کر انھیں مطلع کیا۔ "سب خبر ہے مجھے۔ آپ لوگ میرے بارے میں یہ کیوں سمجھ لیتے ہیں کہ سویا مرا برابر؟"

"اے بیٹے۔ خدا سے ڈرو۔ شہر میں مار اکاٹی ہو رہی ہے اور تم صبح صبح ایسی بدفالیں منہہ سے نکال رہے ہو....." اماں جان کا رخ میری جانب ہو گیا۔ "کچھ یہی خیال کر لو کہ شادی کا گھر ہے۔"

ان کی اتنی شہہ پا کر اچھے خالو چل نکلے۔ "میاں، سو نہیں رہے تو پلنگ پر اینڈ تو رہے ہو۔ ہمارے لیے فرق کیا پڑا؟ اب اٹھ بھی جاؤ۔ کام دھام میں ہاتھ بٹانے کے تو تم روادار ہوتے نہیں۔ ہاتھ پیروں سے مدد نہیں کرتے تو زبان ہلا کر ہمیں مشورہ ہی دے دو۔ کچھ تم ہی بتاؤ کہ اب کیا کریں۔"

مدد کی درخواست سے اب میں روگردانی نہیں کر سکتا تھا۔ "آتا ہوں۔" میں نے پکار کر کہا اور ہاتھ منہ دھو کر اچھے خالو کے پاس جا بیٹھا۔ صبح کا اخبار چائے کی پیالی سے دبا ہوا تھا۔ پیالی خالی تھی۔ اخبار بھرا ہوا تھا۔

"بیٹا آدھی آستین کا سوئٹر ہی پہن لو۔ کل رات سے خاصی سردی ہو رہی ہے۔ اور کیوں نہ ہوتی، سال بھی ختم ہونے کو ہے۔ اور تم ایسے ہی بند کمرے اور رضائی میں سے اٹھ آئے.... " اماں جان نے شاید غیر اختیاری طور پر وہی انداز اختیار کر لیا جو اب سے تھوڑی دیر پہلے اچھے خالو کا تھا۔

"ادھر دھوپ کے رخ پر کرسی کر لو.... " اچھے خالو نے ہاتھ سے کرسی کی طرف اشارہ کیا جس کے آدھے حصے پر دھوپ آ رہی تھی۔

اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں، یہی کرنا ہوگا۔ میں نے اپنے نندا سے اور آلکسی مارے بدن کو کرسی پر گرا دیا اور اچھے خالو کی طرف دیکھنے لگا کہ اب یہ شادی کا مسئلہ پھر اٹھائیں گے۔

شادی.... شادی.... صبح ہوتے ہی گھر میں گھنٹی سی بجنے لگتی تھی۔

"ہمیں تو ہول چڑھنے لگا ہے۔ دن تاریخ سر پر چلے آ رہے ہیں اور گھر میں شادی کا کوئی ہنگامہ نہیں۔ ہو بھی کیسے، حالات میں اس قدر بے یقینی چلی آ رہی ہے..... " اچھے خالو نے پھر شروع سے قصہ چھیڑنے کی نیت باندھی۔

ان کو ہمیں ٹوک دینا ضروری ہے، میں نے دل میں سوچا۔

"وہ تو چچا غالب بھی فرما گئے ہیں کہ ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق۔ " میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بس بس، دوسرا مصرع نہ پڑھ دینا۔ پھر وہی بد شگونی کی باتیں؟ میاں، کس سے لڑ کر بیٹھے ہو؟ " اچھے خالو کی توجہ پھر بٹ گئی۔

دھوپ کرسی پر سرکتی رہی۔ ہم خاموش بیٹھے رہے۔

"اب تو کارڈ بھی چھپ گئے اور ادھر شہر کا یہ حال ہے۔ " اچھے خالو کو پھر یاد آیا۔ "سوچ سوچ کر ہمارا تو دماغ ماؤف ہوا جا رہا ہے۔ تقریب کریں تو کس دل سے کریں اور ملتوی کر دیں تو پھر سارے انتظامات کا کیا ہوگا۔ ملتوی کرتے ہیں تو اتنا سارا روپیہ جو ایڈوانس میں دیا ہے، ڈوب جائے گا۔ اور طے شدہ پروگرام پر چلتے ہیں تو اس کی کیا گارنٹی ہے کہ بارات اور دلھا، شادی گھر پہنچ پاتے ہیں کہ نہیں؟ "

بارات کے لفظ پر اس دولھا کی اخباری تصویر میری نگاہوں میں پھر گئی جو فائرنگ کی زد میں آکر ہلاک ہو گیا تھا۔ اس تصویر کو ذہن سے جھٹکنا ہوگا، میں نے اپنے آپ کو باور کرایا۔

"ایسا کرتے ہیں کہ ہم آپ یہ طے کر لیں کہ تقریب کب اور کہاں ہوگی، کھانے اور کپڑے کی تفصیلات اس وقت کے لیے اٹھا رکھتے ہیں جب چھوٹی خالہ بھی یہاں ہوں " میں نے تیزی سے کہا جیسے اپنے ذہن میں ہونے والی بوچھار سے بچ رہا ہوں۔

"چلو، تم نے سیدھے سبھاؤ کام کی بات تو کی۔ " اچھے خالو میری اس اچانک توجہ پر اچنبھے میں آ گئے۔ " تمھیں خیال تو آیا کہ لڑکی والے ہو، ہمن بیامنی ہے۔ " انھوں نے ایک ایک لفظ پر

زور دیتے ہوئے کہا۔

میں نے اپنا چہرہ سرخ ہوتے ہوئے محسوس کیا، جیسے انھوں نے مجھے بہن کی گالی دی ہو جس کا میں جواب نہیں دے سکتا۔

"جگہ تو پکی ہے ناں؟" میں نے اپنے آپ کو نارمل اور پر سکون ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"اب کسی بھی بات کو پکی کہاں کہہ سکتے ہیں؟ ایڈوانس دے کر ہم نے بکنگ تو اسی وقت کرادی تھی....." وہ کہنے لگے۔

"آپ نے آخری فیصلہ کون سے میرج گارڈن کا کیا تھا، سبزہ زار کہ سدا بہار؟" میں چاہتا تھا کہ ایک ایک تفصیل ٹھیک ہو۔

"ارے میاں، کس زمانے کی بات کر رہے ہو، کچھ بسنت کی خبر بھی ہے؟" اچھے خالو مجھ پر برس پڑنے کو تھے۔ "اب تو کارڈ بھی چھپ گئے اور تم اسی سوال پر اٹکے ہوئے ہو۔ یہ فیصلہ تو اسی وقت ہو گیا تھا کہ ان کے لان میں گنجائش تو بہت ہے مگر بلدیہ والوں نے تالے بندی کر دی تھی، اس کے بعد سے ان کا بھروسا نہیں رہا۔ دولھا والوں نے کہلوادیا تھا کہ یہ ادھر ادھر شادی ہال جو بن گئے ہیں وہ ان کے اسٹیٹس کے نہیں۔ فائیو اسٹار ہوٹل اتنی جلدی کوئی مل نہیں سکتا۔ اس لیے اب ایک ہی صورت رہ گئی ہے۔"

"اچھا اچھا، ٹھیک ہے۔" انھوں نے یاد دلایا تو مجھے یاد آگیا۔ "دیکھیے اصل چیز تو نکاح ہے باقی سب رسمیں فروعی ہیں۔ ایسا کریں کہ صبح کے وقت چند بزرگوں کی موجودگی میں گھر پر نکاح رکھ لیں۔ بعد میں ریسپشن ہوتا رہے گا۔" میں نے عملی تجویز پیش کی۔

اس کا ردعمل کس طور ہو گا، مجھے اس کا اندازہ لگالے ناچاہیے تھا۔ بہتر تو یہی تھا کہ میں چپ ہی رہتا۔

"بس تمھیں تو ساری تقریبات ہی فضول لگتی ہیں۔" اس سے پہلے کہ اچھے خالو کچھ کہتے، اماں جان بول پڑیں۔ "دنیا تمھارے قاعدے پر تو چلتی نہیں ہے۔ لوگ کیا کہیں گے؟ اور پھر ہم اپنے ارمان کیسے نکالیں گے؟ خدا نہ کرے، کوئی بیوہ کی شادی تو ہے نہیں۔"

"تو بس پھر آپ کیے جائیے دنیا بھر کے الللے تللے...." مجھے غصہ آنے لگا۔ "آپ کو حالات کی سنگینی کا ذرا سا بھی اندازہ ہے؟ آج کا جو تقاضا ہے، اس کے حساب سے چلیے...."

"ایلو، صاحب زادے اماں کو پڑھانے چلے ہیں۔ اب شادی بیاہ پر بھی رسمیں نہ ہوں تو ایسی سونی شادی کس کام کی؟" اماں جان میری بات سے بالکل متفق نہیں تھیں۔

ان کے جواب پر میں بھی جھلا گیا۔ "آپ بھی تو شادی بیاہ کوٹی۔ وی۔ کا قسط وار ڈرامہ سمجھنے لگی ہیں۔ آپ نے اخبار میں پڑھا تھا کہ مہمانوں سے بھرا شادی ہال لوٹ لیا گیا؟ کوئی ایک

دفعہ کی بات تو ہے نہیں ۔ آئے دن یہی خبریں سننے میں آتی ہیں ۔ اور پھر بارات تو دونوں ہی کے لیے مارگٹ ہے..... ڈاکو بھی اور دہشت گرد بھی ۔"

شاید میرا لہجہ زیادہ سخت ہو گیا تھا ۔ اماں جان کچھ نہ بولیں ، لیکن اچھے خالو نے مجھے اطمینان دلانا چاہا ۔

" ٹھیک کہہ رہے ہو بیٹا ۔ بری گھڑی بتا کر نہیں آتی ۔ ان دنوں تو پھر بھی ذرا اطمینان ہے ۔ حکومت کے اور ادھر والوں کے مذاکرات چل رہے ہیں ۔ خدا کرے یہ بیل منڈھے چڑھ جائے اور ان دونوں میں آپس میں بات بن جائے ۔ ہم تو اس آسرے میں بیٹھے ہیں ۔ پھر بھی میں نے سکیورٹی کا بندوبست کیا ہے ۔ دو گن مین شادی ہال کے دروازے پر رہیں گے اور دو گن مین دلھن کی گاڑی کے ساتھ ساتھ چلیں گے ۔ تمھاری خالہ کہہ رہی تھیں کہ جس گاڑی میں دلھن کی رخصتی ہو ، وہ بھی نہ سجواؤ.... "

" یہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ اس طرح کی سجاوٹ اور یہ سب ٹیم ٹماق نہ کریں ۔.. " ان کی بات سے جیسے میری دلیل کو وزن مل گیا ۔

اماں جان نے ماننے سے انکار کر دیا ۔ " اب سجاوٹ بھی نہ ہو اور گھر پر رونق بھی نہ ہو تو کیا نگوڑماری چوروں کی بارات ہے ؟ "

" آپ کو دھوم دھڑکے کے علاوہ کچھ اور سوجھتا ہی نہیں ہے ۔ " میرے لہجے میں بھی ناگواری آگئی ۔ " اصل میں آپ لوگ بس روزانہ اخبار پڑھ کر ایک طرف رکھ دیتے ہیں کہ آج شہر میں یہ واقعات ہوئے ۔ ہونہہ ، کراچی کے واقعات.... " اچھے خالو نے پانی کا گلاس میرے سامنے رکھ دیا ۔ میں نے پانی کی طرف دیکھا اور چپ ہو گیا ۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد پھر بولنے لگا ۔ " افوہ ، یہ بھی روز کی بحث بن گئی ہے ۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ لوگوں کو ٹیلی فون پر اطلاع دے دیں اور چھ بجے کا وقت کر دیں.... "

اماں جان تنک کر بولیں ۔ " اے یہ شادی ہے یا نگوڑماری ٹی پارٹی ؟ "

اچھے خالو نے دھیمے سے کہا ۔ " چائے کا ذرا معقول انتظام کر لیں تو کیسا رہے ؟ "

اماں جان نے فوراً جواب دیا ۔ " رہے گی وہ پھر بھی چائے ۔ اعظم میاں کی شادی کا بھول گئے ؟ ایوب خاں والا مارشل لا لگا تھا اور منادی تھی کہ شادی میں کھانا نہ کیا جائے ۔ اباجی نے بادام پستے گھٹوا کر نہایت عمدہ حریرے کا شربت دیا ۔ لیکن کہنے والوں نے یہی کہا کہ شدو بھائی نے شربت کے پیالے پر بیٹی کا نکاح پڑھوا دیا.... "

" خیر ، مارنے والوں کا ہاتھ پکڑا جا سکتا ہے لیکن کہنے والوں کی زبان تو کوئی پکڑ نہیں سکتا .... " اچھے خالو ایک بار پھر بول اٹھے ۔

" اے بس رہنے بھی دو ۔ ہوتے ہوتے کام میں تم لوگ اس قدر مین میخ نکال رہے ہو کہ

توبہ بھلی ۔ یوں نہیں ہو سکتا اور دوں نہیں ہو سکتا ۔ شادی کے معاملے میں نیاں پڑ گئی ۔ تقریب کی تیاری کا یہ حال ہے تو پھر اللہ ہی ہے جو آگے بیڑا پار کرائے گا.... " اماں جان کی تیوری پر بل پڑ گئے ۔

" اس سے تو بہتر ہے کہ ملتوی کر دیں ۔ " اچھے خالو نے لقمہ دیا ۔

" ایسی بات منہہ سے بھی نہ نکالنا ۔ دشمن کے کان بہرے ۔ ملتوی ہونے سے کیسی بدشگونی ہوگی ۔ دنیا تو یہی کہے گی کہ ضرور لڑکی میں کوئی عیب ہے ۔ " انھوں نے اچھے خالو کو لتاڑ کے چھوڑ دیا ۔

اچھے خالو ہکلاتے ہوئے اپنی بات کی وضاحت کرنے لگے ۔ " میں تو چند دن ٹھہرنے کو کہہ رہا ہوں ۔ ذرا امی جی تو ہولے.... "

" اس کا انتظار کب تک کریں، قیامت تک ؟ پہلے آپا رضیہ کی اب تب لگی ہوئی تھی ۔ ان کی طرف سے ذرا اطمینان ہوا تو یہ گڑبڑ..... اب تو کئی برس ہو گئے، یہی رنگ محفل دیکھ رہے ہیں ۔ ایک ذرا کے ذرا شہر نے سنبھالا لیا، تھوڑے دن بعد پھر وہی فائرنگ، ہلاکت، دہشت گرد، خفیہ ہاتھ.... " اماں جان جوش میں آکر بولے چلی جا رہی تھیں ۔ "لیکن لوگوں نے شادی بیاہ کرنے بند تو نہیں کر دیے ۔ "

" بلکہ اس کے برخلاف ۔ " میں نے زیر لب کہا ۔

" کیا کہہ رہے ہو ؟ " اچھے خالو نے میری طرف دیکھا ۔

" کچھ نہیں، یوں ہی.... " میں نے چاہا کہ بات ٹال دوں ۔

" یوں ہی کیا ؟ " اماں جان نے بات پکڑ لی ۔ " کوئی تو رائے دو ۔ گھر کے فرد ہو، اس معاملے میں تو بولو ۔ تم نے یہ طریقہ بنالیا ہے کہ سامنے تو منہہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھے رہتے ہو، پھر پیٹھ پیچھے بھن بھن کرتے ہو..... "

اب تو کچھ نہ کچھ بولنا ہی پڑے گا، میں نے اندازہ لگالیا ۔ " دسمبر کا مہینہ یہی سوچ کر رکھا تھا کہ فاروق بھی چھٹی لے کر آسکے گا ۔ ورنہ بعد میں اسے چھٹی نہیں ملے گی، اس کی ریذیڈنسی کا پہلا سال ہے ۔ اتنے مرحلوں سے گزر کر تو امریکہ گیا ہے، اب روز روز تو آنے سے رہا.... "

" لیکن دسمبر تو یوں ہی نکلا جارہا ہے.... " اچھے خالو بیچ میں بول اٹھے ۔

ممکن ہے اپنی بات جاری رکھی ہوتی میں نے، یا ان کی بات کا جواب دیا ہوتا اگر دروازے پر آہٹ نہ ہوئی ہوتی ۔

" آگئے بیٹا ؟ بڑی عمر ہے تمھاری ۔ ابھی تمھارا ہی ذکر ہو رہا تھا " اماں جان فاروق کو دیکھ کر کھل اٹھیں ۔ پھر فرزانہ کی طرف رخ کر کے پوچھنے لگیں، " بازار کا کام ہوا ؟ "

" لیجیے، آپ یہاں آئے بیٹھے ہیں اور ہم چھوٹی خالہ کو گھر ڈراپ کر کے آرہے ہیں ۔ "

فاروق نے آگے بڑھ کر اچھے خالو سے ہاتھ ملایا۔

"ہاں، میں نے سوچا صبح صبح ہی ادھر سے ہوتا جاؤں۔ شادی کے گھر میں بہتیرے کام ہوتے ہیں۔" اچھے خالو کچھ جھینپ سے گئے کہ انھیں یہاں بیٹھے ہوئے دیکھ لیا گیا ہے، جہاں وہ نہ بھی ہوتے تب بھی کوئی خاص فرق نہیں پڑتا تھا۔

"زیور کی طرف تو میں گئی ہی نہیں۔ ابھی اس کی دی ہوئی مدت پوری کہاں ہوئی ہے؟ باقی کے کچھ کام ہوئے اور کچھ نہیں ہوئے۔ یہ کام والے بازار کے پھیرے پر پھیرے کروائے جارہے ہیں اور کام ہے کہ پورا ہی نہیں ہورہا" فرزانہ نے پلاسٹک کی تھیلیوں میں لپٹے ہوئے کپڑے اماں جان کے سامنے ڈھیر کر دیے۔

اماں جان نے تھیلیاں اپنے سامنے گھسیٹ لیں، اور ایک ایک کر کے ٹٹولنے، کھول کر دیکھنے اور پوچھنے لگیں۔ فرزانہ ان کے بالکل سامنے جاکر بیٹھ گئی اور ایک ایک جوڑے کا حساب دینے لگی۔

"وہ جو شیفون کی ساڑھی تھی، کامدانی والی۔ اس کی کنی پر کام بن گیا، پلے پر نہیں بنا۔ تنچوئی کا جوڑا بھی تیار نہیں ہوا۔ اور وہ جو کام والا جوڑا تھا، اس کا ناس مار دیا۔ دبکا کہا تھا، اس جگہ نرا سلمٰی لگا دیا اور وہ بھی گھا ہوا نہیں بنایا، سارے میں پھیلا دیا۔ بھاری جوڑے کی جگہ ہلکا ہو گیا۔ نہ کوئی کام وقت پر کر کے دے رہے ہیں نہ مرضی کا.... اور یہ دیکھیے اس کا کیا حال کیا ہے۔ کپڑا بھی مسک گیا اور چیل کے سے پنجے بنا کر رکھ دیے.... نرے گنوارو...... ہاں ہاں، میں نے اسے دکھایا تھا۔ اور یہ بھی کہا تھا کہ اس کے پیسے میں نہیں دوں گی۔ ہر بات کا اس کے پاس ایک ہی جواب ہے کہ کاری گر نہیں ہیں۔ دکان والا کہہ رہا تھا کہ آپ لوگ پرانے گاہک ہیں ورنہ اوروں کے تو پورے پورے آرڈر واپس کر رہا ہوں۔ زردوزی کے کاری گر رہتے ہی سارے ایسے علاقے میں ہیں۔ ہنگاموں کی وجہ سے آ نہیں رہے....."

"ایک تو تم لوگوں کو کام بنوانے کا خبط ہو گیا ہے۔ اطلس کا جوڑا بھی ہو گا تو اس پر دبکا لگنے کو دے دوں گی۔" اماں جان نے بے زاری سے ہاتھ چلایا۔

"اب جہیز میں بھی کام کے جوڑے نہیں ہوں گے تو بعد میں کہاں بنیں گے۔ میں نے تو آپ سے کہا تھا کہ بعد میں یہ کام والے جوڑے روزمرہ کے استعمال میں نہیں آتے، ارگنڈی کا سوٹ دے دیں تو آپ ہی راضی نہیں ہوئیں کہ جہیز میں سوتی جوڑا کیسے دے دوں..... " فرزانہ نے ایک بار ریشمی کے بجائے سوتی جوڑوں کی بحث چھیڑ دی جس پر وہ بہت دن سے دلیلیں دے رہی تھی۔

اماں جان اس بحث کو چھیڑنا نہیں چاہتی تھیں۔ "تم بازار گئی تھیں، وہیں سے دلھن ممانی کے ہاں ہو آتیں۔ چوتھی کا غرارہ وہ تیار کر رہی ہیں، ان سے پوچھ لینا تھا کہ کپڑا کم تو نہیں پڑ گیا۔

(بقیہ صفحہ ۴۵۷ پر)

آصف فرخی

ونیلا کرمبل

بعض ذائقے لمحوں میں یوں گھل مل جاتے ہیں کہ اس وقت کو یاد کرنا ایک مخصوص ذائقے کو حافظے میں دوبارہ محسوس کرنا بن جاتا ہے۔

جیسے بچپن، سال گرہ کا دن اور ارنواز کا کیک۔

ایک کو یاد کرنے کا مطلب ہے تینوں کو محسوس کرنا۔ مجھے کیا پتہ یہ کہاں سے الگ ہوتے ہیں۔

بڑھتی ہوئی عمر کا حساب رکھنے کا مطلب ہے سال گرہ کے دن کا شمار رکھنا اور سال گرہ کا دن (ظاہر ہے کہ یہ دن بچپن میں آیا ہے ورنہ ڈھلتی ہوئی عمر میں ایک اور سال... اتنی خوشی اور جوش کا سبب کسی اور منزل میں کہاں بن سکتا ہے؟) اپنے ساتھ غبارے، جھنڈیاں، کاغذ کی ٹوپیاں، ہم عمر دوستوں اور رشتہ داروں کا اکٹھا ہونا اور سب کے سامنے موم بتیوں سے سجا ہوا وہ کیک جو ارنواز کے علاوہ کوئی اور تیار کر ہی نہیں سکتا تھا۔

ارنواز سے ہمارا تعارف اپنے بچوں کی سال گرہوں کے سلسلے میں ہوا اور ان موقعوں کے لیے برتھ ڈے کیک آرڈر دینے تک ہی محدود رہا۔ اس لیے مجھے ان کے چلے جانے کو اس شہر کی مسلسل تباہی میں ایک چھوٹا سا غم ہی سمجھنا چاہیے۔

میں نے کہا ناں، یہ سال گرہ کے کیکز کے مخصوص ذائقے تک محدود ہے۔

ارنواز اور ان کے تیار کیے ہوئے کیک تک ہم اتنی آسانی سے نہیں پہنچے۔ اس سے پہلے کتنی بیکریوں کی تلاش اور مختلف رنگوں، شکلوں اور ذائقوں کے کیکز کا تلخ تجربہ آتا ہے۔ اب یہ بھی نہیں کہ نتاشا اور انوشا کے لیے، ہم ایسا کوئی اہتمام کرتے ہوں۔ ورنہ قدوائی صاحب کے ہاں بچوں کی ایسی تقریبوں میں میجک شو (جس میں میجیشین سیاہ کوٹ پہنتا ہے اور اس کی ہم رنگ ٹوپی میں سے سچ مچ کا خرگوش نکال کر بچوں کے درمیان اچھال دیتا ہے)، پنی لگی ہوئی فراک، بھالو اور بندر کا تماشا او اس قسم کے محیرالعقل عجائبات موجود ہوتے ہیں۔ پہلی دوسری سال گرہوں پر تو پھر بھی یہ کیا کہ بڑے پیمانے پر تقریب کر ڈالی۔ (لیکن اس وقت گھر میں ابا میاں کا انتظام تھا اور انھوں نے سارے کنبے کو جمع کر کے دلی کالی مسلم ہوٹل کا شیرمال اور قورمہ کروایا۔ وہ شیرمال قورمے والے کھانے ہی کو تقریب سمجھتے تھے)۔ اس کے بعد پھر بچوں ہی بچوں میں تقریب ہو جاتی۔ لیکن بات یہ ہے سال گرہ جتنے بھی چھوٹے پیمانے پر ہو، کیک تو مناسب ہو ---- نہ بہت میٹھا نہ پھیکا، نہ بہت گلابی نہ بالکل سونا، نہ بہت چھوٹا اور نہ بدمذاقی کی حد تک بڑا۔ صحیح اور مناسب کیک

کوئی آسان کام نہیں! اب یوں تو بیکریاں ہمارے محلے میں درجنوں کے حساب سے تھیں اور ان میں کیک بھی سینکڑوں پڑے رہتے ہوں گے۔ دھندلے شیشوں والے شیلف پر دھرے دھرے باسی اور گرد آلود ہوتے ہوئے کیک جن کی کچی اور آٹے کے سے مزے کی آئسنگ پر مکھیاں ٹہلتی رہتی ہیں۔ "ان کے کھانے سے شرطیہ ہیضہ ہو جائے گا!" بچپن سے امی نے مجھ میں بازار کی چیزیں لے کر کھانے کا خوف بٹھادیا تھا۔ شروع میں ایک آدھ سال ہم نے بالی وڈ بیکری سے کیک خریدے، جو تھی تو ایک ایرانی کی مگر اس کی دیواروں پر سفید ٹائل لگے ہوئے تھے اور الماریوں پر جالی تھی۔ لیکن ایک آدھ دفعہ ہی کے بعد ان کیکز کا مزہ یوں لگا جیسے چینی مڑھا ہو چمڑا چبار ہے ہوں۔ ایک دفعہ جس کی دکان چل جائے، وہ فوراً ڈنڈی مارنے پر آجاتا ہے، تبسم اس بیکری والے کا نام سن کر ناراض ہونے لگی۔ ایک مرتبہ جے جے بیکری سے کیک لیا جہاں کے دام اس پورے علاقے میں سب سے زیادہ تھے اور جہاں فاروق کے بقول، گورے گورے اور تمیز دار لڑکے ملازم تھے۔ ایک دفعہ بڑا سا کھایا تو اس پنج ستارہ ہوٹل سے بھی کیک خریدا جس کا نام بدل گیا ہے لیکن معیار نہیں۔ یہ سارے کیک اپنی اپنی جگہ بس ٹھیک ہی تھے اور یہ بھی نہیں کہ ہمیں خوب سے خوب تر کی ایسی تلاش ہو جو پوری نہ ہو رہی ہو۔ ہم ان کیکز سے مطمئن نہیں تھے تو شاکی بھی نہیں تھے۔ ہوتے بھی کیسے؟ ہمیں اندازہ نہیں تھا کہ ہم کس چیز سے محروم ہیں۔

ایسے میں کسی نے ارنواز کا پتہ دیا۔ اب سوچتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ یہ پتہ یقیناً بیگم خالد نے دیا تھا۔ انھوں نے کہا تھا، یہ ہر ایک کا آرڈر نہیں لیتیں۔ گھر پر کیٹرنگ کرتی ہیں۔ میرا ریفرنس دے کر فون کرنا۔ میں نوٹی، روجی کی سال گرہوں پر ان سے ہی کیک بنواتی ہوں۔ یہ ٹیلی فون پر ہی آرڈر لیتی ہیں گھر پر کسی کلائنٹ کو انٹرٹین نہیں کرتیں۔

ٹیلی فون کرکے میں ان کے ہاں گیا تھا۔ مجھے یاد ہے۔ پہلی دفعہ میں ہی گیا تھا اور پھر اتفاق سے برسوں بعد بھی اس دن بھی جب وہ کیک یاد آیا....

اب یہ یاد نہیں کہ نتاشا کی سال گرہ تھی یا انوشا کی اور کون سی۔ لیکن اتنا یاد ہے کہ ہم کیرامل کرنچ کا آرڈر دینا چاہتے تھے اور جس بچی کی سال گرہ تھی اس کو کیک کے کناروں پر شکر کے "گلابی رنگ کے گلاب" چاہیے تھے۔ یہی ہم نے ٹیلی فون پر کہا۔

"کیرامل کرنچ پر پنک روز ز کرنے نہیں سکتا۔ براؤن پر پنک ایک دم اسٹوپڈ کے مافک لگیں گا۔" جس آواز کا نام ہمیں ارنواز بتایا گیا تھا، اس کا انداز اس قسم کا تھا کہ ہم اس کی بات نان گئے۔

"ونیلا کر مبل ٹرائی کرو۔ پھر میرے کو بولنا ارنواز نے ہم کو ایڈوائس ائی سا دیا....

سو ہم نے ائی ساہی کیا۔

اس کا ذائقہ کیسا تھا؟ میں نے کہا ناں، بعض لمحے ذائقے کی صورت میں یاد رہ جاتے

ہیں......

کیرامل کرنچ اور ونیلا کر مبل کا فرق زندگی کے ان نازک اور نفیس رازوں میں سے ایک ہے، جس کا جب تک پتہ نہ چل جائے آپ کو اندازہ نہیں ہوتا کہ آپ کس سے محروم چلے آ رہے ہیں....

لیکن میں اس وزٹ کو بھی ناقابل فراموش سمجھتا ہوں۔

"تم کس ترف سے آئیں گا؟" میں نے ٹیلی فون پر پتہ سمجھنا شروع کیا تو الٹا اسی آواز نے مجھ سے سوال داغ دیا۔ میں نے یوں ہی کہہ دیا تھا کہ صدر کی طرف سے (اس زمانے میں شہر کے سارے راستے صدر سے ہو کر گزرتے تھے)۔ اس آواز نے جس سڑک کا پتہ بتایا تھا اس پر بورڈ تو کسی کرنل، جنرل کے نام کا لگا تھا۔ لیکن مکانوں کی تختیوں پر لکھا ہوا تھا: Bleak House Road اس نام سے ہی میرے سارے بدن میں سنسنی دوڑ گئی۔ جیسے میں اپنے شہر کے ایام گذشتہ میں چل رہا ہوں.... بلیک ہاؤس روڈ!.... کیا وہ چارلز ڈکنز کے ناول والا مکان اسی سڑک پر ہے؟ اور کیا کراچی، ڈکنز کے لندن کا کوئی جڑواں شہر ہے؟ ایک دن میں اس افسانوی شہر کی ان سڑکوں کو ڈھونڈنے نکلوں گا.... لورزلین، لیٹو جیٹی، میک نیل روڈ، بونس اسٹریٹ، سناگوگ اسٹریٹ.... یہ سڑکیں اس شہر میں کہیں کھو گئی ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ کینٹ اسٹیشن کی بے ہنگم مسافرت اس سڑک پر، جہاں اب برٹش کاؤنسل کی لائبریری ہے، حاوی نہ ہو جائے۔ ڈرتا اس لیے ہوں کہ اب میں اتنا بوڑھا ہو گیا ہوں کہ مجھے وہ وقت بھی کل کی بات کی طرح یاد ہے جب برٹش کاؤنسل کی لائبریری پاکستان چوک سے آگے سیر نگیٹی بلڈنگ میں تھی (جہاں اب ہومیوپیتھک کی دوائیں تھوک کے بھاؤ ملتی ہیں) اور یہیں میں نے سر لارنس اولیویر کو اوتھیلو کے کردار میں دیکھا تھا تو کئی دن تک میرے خون میں تموج رہا تھا....

My heart is turnes to stone ; I strike it, and it hurts my hand O! the world hath not a sweeter creature; she might lie by an emperor's side and command him tasks.

مگر میں اس مکان کے باہر پہنچ کر رک گیا تھا۔ وہ بھوسلے، مٹیالے سینڈ اسٹون کا دو منزلہ بنگلہ تھا جیسے اب بھی شہر میں کہیں کہیں کھڑے ہوئے نظر آتے ہیں، کسی اور وقت کی یاد دلاتے ہوئے۔ کھوئے ہوئے، اپنے ہی وقت میں رکے ہوئے، اپنی ہی آوازوں کے زیر اثر چپ چاپ.... وکٹورین گاتھک.... شاید انھیں یہی کہا جاتا ہے۔ یا پھر ایڈورڈین پتہ نہیں دونوں میں سے کون سے۔ دراصل انگلستان کے بادشاہ مجھے بہت تنگ کرتے ہیں۔ لیکن وہ مکان.... پھاٹک پر نام کی تختی لگی تھی جس کو میں نے کیک والے کام سے متعلق نہیں سمجھا کیوں کہ یہ شہر کے مشہور بزنس

میگنیٹ کا نام تھا اور ان دنوں اخباروں میں تفتیشی صحافت اور "انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کی نشان دہی" کے حوالے سے اکثر نظر آتا تھا۔ میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا، پھر گھنٹی بجادی۔

بہت دیر تک کوئی جواب نہیں آیا تو میں نے پھاٹک کی درز میں سے جھانکا۔ پورچ میں گاڑی کھڑی تھی، جس کو لگتا تھا، بہت احتیاط سے رکھا گیا ہے۔ لان میں ڈیک چیئرز تھیں اور قد آدم ربر پلانٹ کے گملے.... میں نے دوبارہ گھنٹی بجادی۔

جو ملازم چھوکرا بڑبڑاتا ہوا نکلا اس نے قدرے خفگی سے میرے "کیک، برتھ ڈے کیک" کہنے پر پچھلے دروازے کی طرف اشارہ کر دیا کہ وہاں سے آؤ۔ یعنی سامنے والا دروازہ ان لوگوں کے لیے نہیں کھل سکتا جو سوشل کال پر نہیں، بزنس ڈیل کے لیے آئے ہیں۔ گلی والا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے اندر جھانکا۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ پچھلی طرف سرونٹ کوارٹر تھے، پرانے بنگلوں کے اسٹائل کے، نیچے گیراج اور اوپر نوکروں کے کمرے۔ دوسری طرف گول زینہ تھا۔ میں اس پر چڑھ گیا ہوتا اگر اس سے آگے کے دروازے پر کاغذ کی پٹی چپکی ہوئی نظر نہ آجاتی، جس پر ہاتھ سے لکھا تھا: ارنواز۔ میں اس دروازے کے اندر داخل ہو گیا تو وہاں بھی کوئی نہیں تھا۔ ایک زنگ خوردہ بائیسکل جانے کب سے کھڑی تھی، پودوں کے گملے تھے اور زینہ.... اس کی سیڑھیاں بہت چوڑی تھیں اور ان پر موزائک کا کام تھا۔ لینڈنگ پر ایک اور دروازہ، ایک اور گھنٹی۔ دوہرے دروازے کا ایک پٹ کھلا اور ایک دبلی پتلی عورت نے مجھ سے اشارے سے اندر آنے کے لیے کہا۔ میں اس کے پیچھے اندر گیا تو میں نے دیکھا اس نے ساڑھی کا پلو الٹا کر اکر سامنے باندھا ہوا ہے۔ "کیا چاہیئے؟" میں اس کے سوال کا جواب دینے والا تھا کہ اندر سے آواز آئی "کاشتا بائی!" لہجہ میمنی یا گجراتی تھا۔ لیکن بے حد مانوس۔

"جی بائی!" اس عورت نے جواب دیا اور میرے آرڈر کا نمبر لے کر اندر چلی گئی۔ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ڈبا تھا جس پر گفٹ پیکنگ کی ہوئی تھی اور سرخ ربن بندھا ہوا تھا۔

"ونیلا کرمبل" اس نے کہا اور اس کے مجسے نما چہرے پر مسکراہٹ کا شائبہ آیا۔ صرف ایک لمحے کے لیے۔

بید کی کرسیاں ڈال کر انتظار کرنے کی جگہ سی بنادی گئی تھی۔ جو پیسیج گھر کی طرف جاتا ہوگا، اس میں گملوں کے اسٹینڈ سے روک لگادی گئی تھی۔ گھر کے اندر کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ کمرے کے اندر کوئی کارپینٹرز کا وہی نغمہ سن رہا تھا: It.s Yesterday Once More نو اینٹری، باہر لکھا ہوا تھا لیکن دھکا دینے والے دروازے میں سے باورچی خانے کی جھلک دکھائی دی۔ پرانے ڈھپوڈھکیل فریج اور لیبل لگے ہوئے ڈبوں سے بھری ہوئی الماریاں۔ دودھ کڑھائے جانے کی خوش بو آرہی تھی اور لمبا ڈھیلا لبادہ پہنے کوئی عورت سٹرپٹر کرتی دکھائی دی۔ میں واپس جانے کے لیے مڑا۔ سامنے رکھی ہوئی آرام کرسی دیکھ کر اچانک میری سمجھ میں آیا کہ

زینے کے اوپر جس آدمی کی تصویر لگی ہوئی ہے، جس کے داڑھی والے چہرے کے گرد روشنی کی تشتری سی ہے، وہ کون ہو سکتا ہے۔

ارنواز کے نام سے ہی سمجھ جانا چاہیے تھا، میں نے واپس جاتے ہوئے سوچا اور پھر کتنے ہی نام اسکول اور کالج کی پرانی یادوں سے پھڑپھڑاتے ہوئے نکل آئے، ان چمگادڑوں کی طرح جو مدت سے بند کمرے میں اچانک روشنی سے چونک اٹھی ہوں.... سیاسپ، ہراسپ، کیراسپ، عاڈل، سائرس، فریڈون، زیرکسس، جمشید، نوشیرواں، زینیا، ہواوی، آرمین.... بپسی سدھوا کے ناول پڑھنے سے برسوں پہلے اسکول میں ہم انھیں "کاگڑا کھاگا" کہتے تھے۔ کتنی باتیں کرتے تھے وہ.... زرد رو، دبلے پتلے، لم ڈھینگ.... سب کہاں بکھر گئے؟ اس وقت کوئی سوچ سکتا تھا کہ یہ سب کووں کی طرح بھرا مار کر اڑ جائیں گے؟ کیراسپ جس کی دوسری منگنی پر میں نے پہلی مرتبہ ڈانس کیا تھا.... سائرس جس کو باڈی بلڈنگ اور "رنگ اترے ہوئے" لطیفوں کا شوق تھا.... اور عاڈل جو ہاف ٹائم میں مجھے کوک پینے کی دعوت دیتے ہوئے کہتا تھا "چل باس، جگر ٹھنڈا کریں...." اور مجھے اس لڑکے کا چہرہ یاد آرہا ہے، نام بھول گیا ہے.... ہم چھٹی ساتویں میں ہوں گے اور اس کی پتلون میں "سموسہ" بننے لگا تھا اسکول کے کسی اور لڑکے سے پہلے۔ ان سب کی پتلونوں کا سامنے والا حصہ، جسے ہم پوسٹ آفس کہتے تھے، سپاٹ تھا۔ صبح کی اسمبلی میں ہم اس کی طرف دیکھ کر آستینوں میں منہ چھپا چھپا کر ہنستے تھے۔ پھر ایرل فون سیکا نے مجھے بتایا تھا (وہی ایرل جو این کی اس بڑی بہن سے جو بچوں کو اسکول میں پیانو سکھاتی تھی، شادی کرنے کے بجائے آسٹریلیا چلا گیا۔ ضیاء الحق کی حکومت کا زمانہ تھا اور میرے اسکول کے گوانی ساتھی جوق در جوق آسٹریلیا کا رخ کرنے لگے تھے).... دودھ کے پچاس قطروں سے ایک قطرہ گھی بنتا ہے اور گھی کے پچاس قطروں سے اک قطرہ خون، پھر خون کے پچاس قطروں سے اس کا ایک قطرہ، اس لیے تم کبھی اپنے آپ سے مت کھیلنا۔ میں ہکا بکا رہ گیا تھا۔ ایرل نے اپنی تازہ معلومات کا رعب اس لڑکے پر بھی گانٹھا ہوگا، اسی لیے کہ اگلے ہی لمحے ہم سب نے اس کو روتے ہوئے اور بھاگتے ہوئے دیکھا۔ "نہیں نہیں، ممی ڈیڈی نے ائی سائنٹیں کیا ہو ئیں گا...."

کئی سا.... تراب علی نے اس کے پیچھے پکار کر کہا تھا۔ اس کے پکارنے کی گونج مجھے اب تک سنائی دیتی ہے جس طرح اس لڑکے کا پلٹ کر زخمی نظروں سے دیکھنا....

اور عاڈل جو فرسٹ ایئر میں میں لیکچر اٹینڈ کرنے کے بجائے زرینہ کو گھورا کرتا تھا۔ (کلاس کی سلور جوبلی ری یونین پر جمیل نے اسی زرینہ کو دیکھ کر کہا تھا، ارے یار یہ تو عورت ہو گئی ہے عورت۔ پھر ماتھے پر ہاتھ مار کر کہنے لگا مجھے کیٹریکٹ کا آپریشن کرا لینا چاہیے، پوری بھینس کو عورت کہہ رہا ہوں۔) اور اسی کے بڑے بھائی کا ویڈنگ رسیپشن جو بیچ لگژری ہوٹل میں ہوا تھا (جس کا لان اب بھی سمندر پر کھلتا ہے) اور اپنے نام کے انوٹیشن کارڈ وصول کرکے اپنی

نوخیز اہمیت کے احساس سے مغلوب ہم سوٹ پہن کر گئے تھے۔ ہال کے سامنے "کاسباہ" سے موسیقی کی تیز دھن سمندر کی دھند کی طرح رہی اٹھ رہی تھی۔ بدر نے مجھے کہنی مار کر کہا تھا، چلو یہ لائف بھی تو دیکھیں۔ دروازے پر ہی ایک موٹی عورت نے ہمیں روک دیا تھا۔ "یو کانٹ کم ان دس از اے پرائیویٹ پارٹی۔" اس نے ساڑھی کا پلو سامنے گرایا ہوا تھا جس پر سنہری بروچ تھا پھر بھی اس کا سینہ اتنا بھاری لگ رہا تھا کہ مجھے اب تک یاد ہے۔ پھر وہ وقت آنے والا تھا جب ایسی پرائیویٹ پارٹیز بھی عنقا ہو گئیں۔ جن ناموں کو میں یاد کر رہا ہوں ان میں سے کتنے ہیوسٹن چلے گئے۔ ان میں وہ بھی تھا۔ برسوں بعد جب وہ ہیوسٹن سے (جہاں یہ جوق در جوق چلے گئے اور میں سوچتا ہوں کیا وہاں ٹاور آف سائلنس بن گیا ہے؟ اور کیا وہاں کے لیے گدھ بھی یہاں سے لے جائے گئے ہیں؟) اپنے باپ کے اٹھمنا سیریمنی کے لیے کراچی آیا تھا تو مجھ سے کہا تھا کہ میں بھابی اور بچوں کے دیکھنے آؤں گا، تمہاری شادی میں شریک نہیں ہو سکا تھا۔ میں نے کلاس کے باقی ماندہ ساتھیوں کو بھی بلا لیا تھا۔ ڈرائنگ روم میں گھستے ہی زرینہ کو سامنے بیٹھا دیکھ کر اس نے نعرہ مارا تھا: یو لکی سن آف اے گن۔ زرینہ تو نہیں سمجھی مگر میں جھینپ گیا تھا کیوں کہ سامنے تبسم کھڑی تھی....

اور مسز کانڈ والا جن کی ہر سال ایک نظم سیاہ حاشیے میں اخبار کے سٹی پیج پر چھپتی تھی: "ان میموریم مائی سوئیٹ ہوبی.... "ہر سال یہ نظم چھپتی ہے اور جب چھپتی ہے تو خیال آتا ہے، اوہو ایک سال اور بیت گیا۔

اس کے علاوہ میں ان کی مستقل مزاجی پر بھی حیران ہوتا ہوں۔ کیا ان لوگوں کے لیے وقت اسی جگہ رک جاتا ہے؟ یا زندگی کے تار و پود میں شامل ہو کر ساتھ ساتھ چلتا رہتا ہے؟ اور جب دل کی گلیاں سونی ہوں تو کیا شہر بھی پھاڑ کھانے کو آتا ہے؟ زندگی یوں بیت جاتی ہے جیسے دہلیز کے سامنے چاک اور رنگ سے بنے ہوئے رنگوں کے نشان، صبح تازہ اور شام تک مٹی میں مل کر مٹی....

لیکن میں فنا اور اور وقت اور شہر کی نہیں، کیک کی بات کر رہا تھا۔ ونیلا کرمبل جو ارنواز کی طرح کوئی نہیں بناتا تھا۔

تھا، یعنی فعل ماضی۔ اس پورے عرصے میں کیک کا آرڈر دینے سے پک اپ کرنے تک اس طرح کے سارے کام تبسم کرتی آرہی تھی۔ اس سال اس کی داڑھ میں درد تھا تو یہ ذمہ میں نے لے لیا۔

سکوت تو اس پورے علاقے کا خاصہ ہے، لیکن اب کی بار کچھ گھنا معلوم ہو رہا تھا۔ میں ٹیلی فون کیے بغیر ہی پہنچ گیا تھا۔ کیوں کہ سالگرہ کا دن سر پر آن پہنچا تھا اور ارنواز کے ہاں کوئی فون اٹھا نہیں رہا تھا۔ کراچی کے فون کا یہی حال ہے، خراب ہو گیا ہوگا، میں نے سوچا اور ایک بار

(بقیہ صفحہ ۴۴۸ پر)

آصف فرخی

سلحشور

پانی کے اوپر سے پانی کے بہہ کر گزرنے کی آواز آئی اور اس میں اندر تک اترا ہوا، جس پر سے بوندیں ٹپک رہی تھیں، وہ ہاتھ باہر آنے لگا۔

توجہ اس آواز نے مبذول کرائی تھی اور بڑھتے ہوئے قدم اس ہاتھ نے روک لیے۔ وہ چلتے چلتے رک گیا اور دیکھنے لگا کہ اس ہاتھ پر پانی چمک رہا ہے۔ جیسے نظروں کی حدت سے وہ پانی بھاپ بن کر اڑ گیا اور سنولایا ہوا، دھوپ میں نہایا ہوا ہاتھ باہر آکر اپنے آپ کو سیدھا کرنے لگا۔ انگلیوں سے لے کر کندھے کے جوڑ تک، ایک بارگی وہ ہاتھ نظروں میں اتر گیا، پورا ہاتھ.... ستواں لمبائی، بھرا بھرا بازو اور اس پر اتنی دور سے نظر آنے والا نرم رواں۔ وہ ہاتھ اپنے آپ میں پورا الگ رہا تھا۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹا کہ اس ہاتھ کے سڈول پورے پن کو نگاہوں میں بھر لے تو نظر چوک گئی۔ وہ آدمی نظر آیا جس سے ہاتھ جڑا ہوا تھا۔ وہ آدمی اگر اس قدر معمولی نہ ہوتا تو روزمرہ کے اس عام سے منظر کی تفصیلات گراں نہ گزرتیں۔ پانی سے بھرے ہوئے فلٹر میں ہاتھ ڈبو کر دھولینے کے بعد وہ مکا بنا کر آٹے کی پرت پر دبا رہا تھا اور گندھے ہوئے آٹے کے پیڑے دوسرا آدمی بنا تا جا رہا تھا کیوں کہ تندور پر روٹی خریدنے والوں کی قطار لمبی تھی۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ سب غیر ضروری تھا، قطعی غیر ضروری، اس ہاتھ کے پورے پن کے آگے۔ اور اس بھرپور ہاتھ کو استعمال میں لاتا ہوا وہ معمولی سا آدمی جو تندور کی گرمی سے ماتھے پر آنے والا پسینہ دوسرے ہاتھ سے پونچھ رہا تھا۔ اس آدمی نے ایک بار پھر پسینہ پونچھنے کے لیے ہاتھ اٹھایا تو اس سے نہ رہا گیا۔ اس نے تیغ نگہ کو آب دی اور نظر کے بھرپور وار سے اس ہاتھ سے غیر ضروری جسم کو کاٹ کر الگ کر دیا۔ اب وہ ہاتھ اپنے آپ میں پورا تھا۔

اس نے دروازہ کھولا اور اندر قدم رکھنے سے پہلے اپنی ہی نظروں میں چور ہو گیا۔

جہاں کے تہاں تھے اور جو کچھ کر رہے تھے، اس کے کرتے کرتے میں وہ سب رک گئے۔ دروازہ کھلنے کی آواز نے انھیں دم بخود کر دیا تھا اور وہ بھری بھری آنکھوں میں شرمندگی لیے، سب کے سب ایک ساتھ اس کی طرف دیکھنے لگے جیسے بے جا مداخلت اس نے کی ہو۔

نظر بھر کر اس نے دیکھ لیا کہ پورے کا پورا کمرہ الٹا پڑا ہے۔ کام والی ماسی جہاں صفائی کر کے گئی تھی، وہاں سے ہٹائی جانے والی چیزوں کو ابھی تک سیدھا نہیں کیا گیا۔ بستر پر تکیے بیچوں بیچ پڑے تھے اور پلنگ کی چادر ایک طرف کو جھول رہی تھی۔ دن میں کسی وقت اتارے جانے

والے کپڑے کھونٹیوں پر ٹانگے جانے کے بجائے، گول گول مروڑ کر قالین پر ایک طرف ڈال دیے گئے تھے۔ چپلیں بھی اسی میں اچھال دی گئی تھیں اور وہ ایک آدھ رسالہ بھی، جسے وہ کل رات سونے سے پہلے پڑھ رہا تھا۔

پورا نہ کھلنے والے دروازے پر اس کے قدم ٹھٹک گئے۔ اس کی بیوی اور دونوں بچے جو اس کے آنے سے پہلے اچھل اچھل کر ہنس رہے تھے، کھیل رہے تھے، اس کی طرف دیکھنے لگے جیسے اس نے انھیں بے تکلف آزادی کے ایسے ایک لمحے میں پکڑ لیا ہے جو دوسروں کے سامنے بے پردہ ہونے سے جھٹک کر ٹوٹ جاتا ہے۔

"آج جلدی آ گئے آپ دفتر سے.... " اس کی بیوی نے کہنا شروع کیا جیسے وہ کوئی معذرت پیش کرنے کی کوشش شروع کر رہی ہو۔ لیکن اس نے اسے بات کو پورا کرنے کی مہلت نہ دی۔ اس نے ہاتھ اٹھایا اور وقت کے دورانیے سے اس ساری کی ساری بے تکی سہ پہر کو مٹا دیا۔

شام پڑے سے سنسان ہو جانے والی گلیوں سڑکوں کے لیے اپنے اندر امڈنے والی تشویش کو اب کی بار اس نے فوراً ہی پہچان لیا۔ سڑک پر سے گزرنے والی گاڑیوں کی تعداد کم ہوتے ہوتے نہ ہونے کے برابر رہ گئی اور اس کو اپنا دل ڈوبتا ہوا لگا۔ "آج پھر شہر ویسا ہی رہا.... " اس نے اندازہ لگایا۔ محلے کے اجاڑ پن میں آسودہ مکانوں میں ایک ایک کر کے بتیاں روشن ہوتے ہوئے دیکھ کر اس کے اندر جو تھوڑا بہت رحم باقی تھا، وہ بھی ختم ہو گیا۔ آدھے شہر میں اندھا دھند فائرنگ ہو گی اور آدھا شہر نیند بھر سوئے گا۔ شہر ایک آنکھ سے جاگے گا، ایک سے سوئے گا اور جو جاگے گا وہ لہو روئے گا۔ ایسا آخر کب تک چلتا رہے گا؟ اس شہر کا اب کیا فیصلہ کرے کوئی۔ یہ وہ شہر نہیں رہا تھا جو اسے اپنی گھورا دانی اور کلیجہ مسوستی ہوئی تنہائی سے لاپروا جشن میں مصروف نظر آتا تھا۔ اس کی خاموش گلیوں میں ایسی کشیدگی تھی کہ اس نے اپنے اندر تسلی بھرے سکون کو کروٹیں لیتے ہوئے محسوس کیا جیسے وہ فیصلے پر پہنچ چکا ہو۔ اس نے نگاہ غلط انداز شہر پر ڈالی، اور اس کو جلا کر راکھ کر دیا۔ اور اس راکھ کی خاک کو مٹھیاں بھر بھر کے اڑانے لگا۔

آصف فرخی

فریکچر

صبح اخبار دیکھنے کے بعد ہی دفتر کے لیے نکلوں گا۔ میں نے رات سے اپنے طور پر طے کر لیا تھا۔

نیند پھر بھی نہ جانے کیوں اچٹ گئی۔

گھڑی دیکھ کر بستر سے اٹھنے والا تھا کہ پھر یاد آیا۔

اخبار والا، اخبار ڈال جائے تبھی اٹھوں۔ یہ سوچ کر میں کچھ دیر اور لیٹا رہا۔ یوں بھی نیند تو ٹوٹ ہی چکی تھی۔ سر کے نیچے رات بھر دب دبا کر شکل سے بے شکل ہو جانے والے تکیے کو تھپ تھپا کر برابر کیا اور چت لیٹ گیا۔ پھر گھٹنوں کو موڑے بغیر پیر سیدھے کرنے کی وہ مشق کرنے لگا جو پیٹ کم کرنے کے لیے ڈاکٹر نے بتائی تھی لیکن صبح وقت پر تیار ہونے کی ہڑبڑاہٹ میں جس کی نوبت روز نہیں آنے پاتی تھی۔ گھٹنے کی ہڈی سے ویسی آواز آئی جیسے انگلیاں چٹخانے پر آتی ہے۔ میں نے لمبا سانس لے کر پیٹ ڈھیلا چھوڑ دیا۔ جمعرات کی رات کو وی سی آر پر فلم دیکھنے اور کچھ اسی طرح دل بہلاوے کی باتیں کرنے کے بعد دیر سے سونے اور جمعہ کی صبح دیر سے اٹھ کر بستر پر کچھ دیر آلکسی سے لیٹے رہنے کا موقع ملتا تھا۔ گیٹ کے اوپر سے اخبار والے کے اخبار پھینکنے کی آواز آئی تو میں نے اپنے آپ کو باور کرایا کہ آج اور بات ہے۔ میں سیدھا اخبار کی طرف لپکا کہ ایک نظر سرخیوں پر ڈال لوں۔

میں ان سرخیوں کو ڈھونڈنے لگا جو گزرے ہوئے کل کی سرخیوں سے مختلف ہوں۔ ان ہی کو دیکھ کر اندازہ لگا سکوں گا کہ گھر سے نکلوں نہ نکلوں۔ گھر سے دفتر آدھا شہر پار ہے۔ آج پھر گڑبڑ ہو تو پھنس کر نہ رہ جاؤں۔ راستے اور سواریاں پہلے کی طرح بند ہونے لگیں اور میں بیچ میں لٹکتا رہ جاؤں۔

اخبار کا ورق جھٹکا تو جیسے کالموں میں ترتیب سے جے الفاظ پھسلنے لگے۔ بقیہ صفحہ ۸ کالم ۶، پہلے صفحے پر شروع ہو کر ادھوری رہ جانے والی خبر کو اندر کے صفحوں میں ڈھونڈ رہا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے کی آواز آئی اور اخبار وہیں چھوڑ کر اندر کے کمرے میں جانا پڑا۔ اس کمرے میں ابھی تک رات کا باسی اندھیرا بھرا ہوا تھا۔ میں دھوپ سے آیا تھا اس لیے میری آنکھیں کچھ دیر کے لیے چندھیا گئی ہوں گی۔ بتی جلا کر میں نے ٹیلی فون کا رسیور اٹھایا۔

دفتر سے فون ہو گا کہ گاڑی بھیج رہے ہیں آپ کے لیے، ارجنٹ کام ہے۔ میں نے گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے اندازہ لگانے کی کوشش کی۔ اور چوں کہ گھر سے نکلنے نہ نکلنے کے بارے میں فیصلہ

نہیں کر پایا تھا، اس لیے گھنٹی کی آواز اور متوقع بلاوے کے خیال سے کوفت ہونے لگی ۔ اب بلایا ہے تو جانا پڑے گا ۔ لیکن "ہیلو، سلام علیکم" کے جواب میں جو آواز آئی وہ تازہ دم، کاروباری اور دفتری نہیں تھی ۔ بلکہ کچھ عمر رسیدہ، غیر رسمی اور جانی پہچانی سی آواز تھی جو شام کو دفتر سے آنے کے بعد، فرصت کے وقتوں کے علاوہ بے موقع سی معلوم ہو رہی تھی: "ہاں میاں، اٹھ گئے ؟"

"جی ہاں" میں نے جواب دیتے دیتے پہچان لیا کہ یہ آواز اچھے خالو کی تھی ۔ "خیریت تو ہے آپ نے اتنی صبح صبح فون کیسے کر لیا ؟"

"آپا رضیہ کی خبر ہے تم کو ؟" انھوں نے پوچھا ۔ مگر ان کا لہجہ پوری طرح سوالی نہیں تھا ۔ جیسے وہ صرف تصدیق کر رہے ہوں ۔

"کون سی خبر ؟" میں نے گھبرا کر پوچھا ۔ "کیا ہو گیا خالہ رضیہ کو ؟" کسی ناگہانی کا احساس میرے دل کو مٹھی میں دبا کر بھینچنے لگا ۔ کیا ایسی کوئی بات ہو چکی تھی جس کی خبر مجھے بہت پہلے ہو جانا چاہیے تھی ؟

"فریکچر کی خبر ۔" انھوں نے مختصر جواب دیا ۔

"فریکچر ؟ مجھے تو نہیں معلوم" میں نے جلدی سے کہا، اس امید پر کہ وہ مزید تفصیل بتائیں گے ۔

"وہ تو سوچ کچھ بیٹھی تھیں ۔ تکلیف بڑھتی گئی ۔ ایکس رے کرایا تو اس میں فریکچر نکلا ۔ ٹخنے کے پاس سے بڑی چٹخی ہے ۔"

"خدا خیر کرے ۔ ہوا کیسے ؟" میں نے لہجے میں حسب ضرورت، تشویش پیدا کرتے ہوئے کہا ۔ پھر بھی جانے کیوں یہ شک سا ہونے لگا کہ شاید یہ سوال زیادہ مناسب نہیں تھا ۔ اس کے بجائے کچھ اور پوچھنا چاہیے تھا ۔ لیکن وہ کچھ اور کیا ہو ؟

"اب بھئی کیسے کی تو ہم کو بھی خبر نہیں ہے ۔" انھوں نے کہا اور میں سمجھ گیا کہ اچھے خالو اپنے حسب معمول شروع ہو گئے ۔ وہ کہتے رہے: "ہم تو خود تین دن سے گھر میں بند بیٹھے ہیں ۔ نہ کوئی آیا نہ ہم کہیں نکلے ۔ کل رات منو کا فون آیا تھا، وہ اپنے ڈیوٹی اسٹیشن سے فون کر کے ایسے موقعوں پر سب کی خیریت پوچھ لیتا ہے، تو اس نے بتایا ۔ اس کے بعد ہم نے کئی بار کوشش کی، مگر ان لوگوں کا فون ہی نہیں مل رہا ۔ بلکہ چھ، آٹھ والا کوئی نمبر ہی نہیں لگ رہا ۔ شہر میں کوئی آفت آئے نہ آئے، اس کم بخت فون کو پہلے سانپ سونگھ جاتا ہے ۔ پھر ہم نے سوچا کہ لاؤ تمھارا نمبر ملا کر دیکھیں، شاید تم نے کچھ سن رکھا ہو..... "

"آپ نے اچھا کیا جو مجھے اطلاع دے دی ۔ دفتر کے لیے اگر نکلا تو ان کی طرف بھی ہوتا آؤں گا اور دیکھ لوں گا کہ کیا ہوا ہے، کیا کرنا ہے ۔" میں نے جواب دیا ۔

"جیتے رہو میاں ۔ لیکن بھئی ذرا سنبھل کے نکلنا ۔ آج پتہ نہیں حالات کیسے رہتے ہیں ۔

تمھاری طرف کیا کیفیت ہے ؟"

"کیفیت تو وہی کل جیسی معلوم ہو رہی ہے۔" میں نے باہر کی طرف کھلنے والی کھڑکی میں سے دیکھا۔ "مین روڈ پر ٹریفک برائے نام ہے۔ پرائیویٹ گاڑیاں تو پھر بھی اکاد کا نظر آرہی ہیں لیکن بسیں کوئی نہیں ہیں اور رکشہ ٹیکسیاں آج بھی غائب ہیں۔" میں سامنے سڑک کی طرف دیکھتا رہا۔ "آپ کے ہاں کیا حال ہے ؟" میں نے ان سے پوچھا۔

"عابد میاں نے بچوں کو اسکول نہیں بھیجا۔ خود تو نکلے تھے کام پر جانے کے لیے۔ الٹے پیروں لوٹ آئے۔ کہہ رہے تھے کہ حیدری کی طرف سناٹا پڑا تھا۔ لیکن عائشہ منزل پر بس جلائی جارہی تھی۔ انھوں نے گاڑی واپس موڑ لی کہ کہیں راستہ بند نہ ہو جائے۔ خیر، میں تو کہتا ہوں عقل مندی کی....."

"ٹائر وائر تو ہماری طرف بھی روز جلائے جاتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"ہاں میاں، اب تو یہی معمول بن گیا ہے۔" انہوں نے کہا، پھر چپ ہو گئے۔

"اچھا، کوئی خاص بات ہوئی یا کوئی اور اطلاع ملی تو آپ کو فون کر دوں گا۔" میں نے بات ختم کرنے کے لیے پوچھا۔ "اور سب خیریت ؟"

"خیریت کیا۔ تم لوگوں میں دل پڑا رہتا ہے۔" یہ کہہ کر انھوں نے خود ہی فون بند کر دیا میں نے بھی فون رکھ دیا اور کھڑکی کے پاس سے ہٹ آیا۔ کھانے کی میز پر ناشتے کے برتن رکھے ہوئے تھے۔ چائے ابھی تک ٹھنڈی نہیں ہوئی ہو گی۔ لیکن خالی چائے کیا پیوں، خیال آیا کہ ابھی تو وقت ہے، اور کچھ ہو نہیں رہا، دو توس ہی سینک کر کھالوں۔ ورنہ باقی دنوں میں تو اتنا وقت نہیں ملتا۔

توس میں نے ٹوسٹر میں ڈال دیے اور اس کی جالی گرم ہو کر سرخ ہوتے ہوئے دیکھنے لگا تو پھر خیال آیا کہ صبح کی نشریات شروع ہو گئی ہوں گی، ٹی وی پر خبریں دیکھ لوں۔ لیکن ان سے کیا پتہ چلے گا۔ اس سے تو بہتر ہے چچا انوار کے ہاں فون کر لوں۔

توس پر مکھن لگاتے ہوئے میں نے فون گھمایا اور ڈائل کے واپس گھوم کر آنے کی کھو کھلی آواز سنتا رہا۔ کچھ دیر گھنٹی بجتی رہی، اس کے بعد صبیحہ چچی نے فون اٹھایا۔

"آج بھولے بسرے کیسے یاد کر لیا ؟" ان کی آواز کی بشاشت بھی کھو کھلی معلوم ہوئی۔ مشین سے پلٹ کر آتی ہوئی کھو کھلی اور خالی آواز۔

"بس یوں ہی۔ آج دفتر نہیں گیا تو سوچا کہ آپ کا حال چال پوچھ لوں۔ اور سنائیے۔ آپ مصروف تو نہیں تھیں ؟" میں نے گفتگو کا آغاز کرنا چاہا۔

"مصروفیت کی تو نہ پوچھو۔ آج تیسرا دن ہے ماسی نہیں آئی اور گھر باسی پڑا ہوا ہے۔ ابھی جھاڑو دینے جارہی تھی۔ گھر بھی جان کو آ گیا ہے۔ صفائی کرتے کرتے مر بھی جاؤ، تب بھی گھر

گندے کا گندہ پڑا رہتا ہے ۔ اتنی مٹی کوڑا دیکھا بھی تو نہیں جاتا ۔ جھاڑو دیتے دیتے کمر میں تکلیف ہونے لگتی ہے ۔ پاس پڑوس والوں سے بھی پوچھ لیا ۔ کسی کے گھر کام والی نہیں آئی ۔ رات کے جھوٹے برتن الگ پڑے ہیں......"

یہ سلسلہ شروع ہو گیا تو رکنے کا نام نہیں لے گا ۔ میں نے ان کی بات کاٹ کر پوچھا، "چچا انوار کہیں گئے ہوئے ہیں ؟"

"جائیں گے کہاں ۔ " ان کی آواز میں اچانک جیسے جان پڑ گئی ۔ "آواز نہیں سن رہے ؟"

میں نے غور کیا ۔ فون پر پیچھے سے آواز آرہی تھی: "جھوٹے ، کمینے ، مردود ، ملعون......!"

"کیا کسی سے جھگڑا ہو رہا ہے ؟" میں نے پوچھا ۔

"جھگڑا کس سے کریں گے ؟ ٹی وی پر خبریں سن رہے ہیں ۔ تم ٹھہرو ، میں بلا دیتی ہوں ۔ ان کے قدموں کے جانے کی آواز آئی ۔ خاموشی کے اس وقفے میں ٹیلی ویژن کی آواز تیز ہو گئی ۔ نیوز ریڈر سپاٹ لہجے میں پڑھ رہی تھی: "قانون نافذ کرنے والے اداروں کے اعلامیے کے مطابق کراچی میں حالات معمول پر رہے ۔ رات گئے چند شرپسندوں نے....."

وہ آواز دب گئی اور چچا انوار کی آواز ابھر آئی ۔

"سلام علیکم ۔ کیا ہو رہا ہے ؟" میں نے سرسری انداز میں پوچھا ۔

"بیٹھے ہیں" انھوں نے جیسے ٹکڑا سا توڑ کر ہاتھ پر رکھ دیا ۔

"کیا بات ہے ، آج آپ کچھ اکھڑے اکھڑے سے ہیں ۔ " میں نے پوچھا ۔ شاید وہ اسی بات پر چل نکلیں ۔ "آپ کی طرف کیا حال ہے ؟"

"حال کیا ہونا ہے ؟ وہی ہے جو سب کا حال ہے ۔ دکانیں کل بھی نہیں کھلی تھیں ۔ آج بھی ویسے ہی آثار ہیں ۔ کل بھی گھر میں نہ دودھ تھا ، نہ انڈے ڈبل روٹی ۔ گوشت تو تمھاری چچی نے پہلے منگوا کر فریزر میں رکھا ہوا تھا ، لیکن آج بھر کا اور ہے......" وہ کہتے کہتے رکے ۔ میں نے بھی کچھ نہیں کہا ۔

اتنی دیر ٹیلی فون پر مکمل خاموشی رہی ۔ اور جتنی دیر خاموشی رہی ، مجھے خلش ہوتی رہی کہ یہ سناٹا ٹوٹنا چاہیے ورنہ یہ بھنور کی طرح مجھے اپنے اندر گھسیٹ لے گا اور کہیں دور اس کی گہرائیوں میں جا کر میں پاش پاش ہو جاؤں گا ۔

لیکن مجھے اپنے اندر یہ خاموشی توڑنے کی طاقت ہی نہیں محسوس ہو رہی تھی ۔ کہوں تو کیا کہوں ۔

جیسے دیوار کے سامنے کھڑا کر دیا گیا ہے اور سامنے کوئی راستہ باقی نہیں رہا ۔

پھر انوار چچا کی آواز آئی ۔ جیسے کنویں کی تہہ میں سے بول رہے ہوں ۔

"ہیلو...... ہیلو...... کہیں فون ڈیڈ تو نہیں ہو گیا ؟ ہاں میاں ، آواز آرہی ہے ؟ کل برجیس

باجی کو بھی فون کیا تھا۔ کہہ رہی تھیں کہ گلی میں کوئی پنچھی تک نظر نہیں آرہا۔ بالکل سناٹا ہے۔ انھوں نے بھی لڑکوں کو بھائی قدیر کے ہاں بھجوا دیا تھا۔ پرسوں اس طرف پتھراؤ ہوا تھا اس کے بعد سادے کپڑوں والے آکر گلی میں جتنے لڑکے تھے، گاڑی میں بند کر کے لے گئے۔ تین دن سے بجلی پانی بھی بند ہے..... "وہ ایک بار پھر خاموش ہو گئے۔

"تم اختر کی طرف تو نہیں گئے؟" انھوں نے خود ہی پوچھا۔

"وہ تو سب پرسوں شام ہی سے بڑے بھیا کے ہاں ہیں۔" میں تفصیل سے بتانے لگا۔ "جلوس کا راستہ جب روکا گیا اس کے بعد سے وہاں فائرنگ ہونے لگی۔ قریب ہی کوئی عورت فلیٹ کی بالکونی میں کھڑی ہوئی تھی، اس کے گولی لگی اور وہ مر گئی۔ پھر یہ پکڑ دھکڑ کا سلسلہ شروع ہوا تو سعید کی طرف سے فکر ہونے لگی۔ وہ بھی تو ادھر ادھر جاکر باتیں کرنے سے باز نہیں آتا۔ بس اسی کی وجہ سے وہ گھر بند کر کے بڑے بھیا کی طرف چلے گئے....."

"ہاں میرے بھی دل میں وہم آیا تھا جب میں نے شام کے اخبار میں تصویر دیکھی تھی کہ وہ عورت زار و قطار رو رہی ہے اور اوپر پنجابی میں کچھ لکھا ہوا ہے۔ خدا معلوم کیا لکھا ہوا تھا....."

"اوہتر نہ جمن ماواں ہووے عمر جنہاں دی تھوڑی۔" میں نے وہ سرخی دہرائی جو دفعتہً میری نظروں کے سامنے گھوم گئی۔

مجھے معلوم تھا اس کے بعد وہ خاموش ہو جائیں گے۔ اب کی خاموشی مجھ سے برداشت نہ ہو گی۔ اس لیے میں نے اگلی بات چھیڑ دی۔ "آپ کو پتہ چلا خالہ رضیہ کا فریکچر ہو گیا؟" میں نے پوچھا

"ارے، کیا ہوا؟" وہ چونک پڑے۔

"گھر میں چلتے ہوئے گر پڑی تھیں۔ پتہ چلا کہ ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ مجھے تو آج صبح ہی پتہ چلا ہے۔ ان حالات میں تو دیکھنے کے لیے بھی نہیں جا سکتے۔" میں نے کہا۔

"ہم بھی گھر میں بیٹھے بیٹھے دعا کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ تو بتاؤ کہ کیا ان کی کچھ پٹی وغیرہ ہوئی ہے؟" انھوں نے پوچھا۔

میں بتاتے بتاتے رک گیا۔ ایک دم سے میری سمجھ میں آگیا کہ ٹیلی فون کرتے وقت اپنا سوال جو ٹھیک نہیں لگا تھا، اس کے بجائے مجھے یہی پوچھنا چاہیے تھا کہ جہاں فریکچر ہوا ہے، اس پر پلاسٹر چڑھایا گیا ہے کہ نہیں۔

میں نے یہ سوال تو پوچھا ہی نہیں تھا۔

"ہیلو..... ہیلو..... لائن ڈیڈ تو نہیں ہو گئی؟" دوسری طرف انوار چچا کی آواز آرہی تھی۔ میں ایک بار پھر اتھاہ سناٹے میں ڈوب گیا تھا جہاں سوال ہی سوال تھے اور جواب کوئی نہیں۔

○ ○ ○

آصف فرخی

حشیشین

گرتے گرتے اس نے زخموں سے چھلنی اپنے بدن کی طرف دیکھا اور آہستہ سے دہرایا، یکسروہ استخواں شکستوں سے چور تھا۔

اس سے پہلے کہ عینی شاہدین یہ فیصلہ کرسکتے وہ مسکرا رہا ہے یا جاں کنی کی تکلیف سے اس کی باچھیں کھل اٹھی ہیں، وہ مر چکا تھا۔

اس کو جس طرح مارا گیا، وہ اس کے قاتلوں کے دستخط تھے۔

شہر میں ایک اور قتل۔ سر ہنری شارپ نے کوفت کے ساتھ دہرایا، انہیں اس قتل کی اطلاع فوراً ہی مل گئی تھی۔ کون قتل ہوا ہے اور یہ کس کا لہو بہا ہے، اس بار بھی ان سوالوں پر زیادہ وقت برباد کرنے کے بجائے اس بات سے زیادہ دل چسپی تھی کہ قتل کس طرح کیا گیا ہے۔ انھوں نے قتل کی مختلف اطلاعات کے پلندے کی طرف دیکھا۔ ان کے مندرجات اب ان کے لیے جانے پہچانے تھے اور اس بار قتل کی اطلاع کی تمام تر تفصیلات اتنی مانوس تھیں کہ انھیں اس اجنبی ملک کی زبان جاننے والی ترجمان، مسز محمد سعید کا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔ انھوں نے ورڈ پروسیسر کا سوئچ کھولا اور کی بورڈ کے سامنے بیٹھ گئے۔ ذرا دیر میں اسکرین چمکنے لگے گی۔ پھر وہ اس پر الفاظ کو نمایاں ہوتے ہوئے دیکھیں گے۔۔۔ "دی اساسینز اسٹرائک اگین۔ اس اطلاع کو آگے تک پہنچنا تھا۔

"سورج ڈھل کر ڈوبنے کو ہوا۔ ریت کے ٹیلوں پر شام کی تاریکی پھیلنے لگی۔ قاسم نے قیام کا حکم دیا۔ نوکروں نے اونٹوں پر سے پانی کی مشکیزے اور خریطے اتارے۔ خریطوں میں سے خشک کھجوریں اور پنیر نکال کر کھا رہے تھے کہ یکایک قاسم نے ایک اڑتی سی آواز اذان کی سنی۔ (وہ یہ آواز سن کر) حیرت سے دنگ رہ گیا۔ کیوں کہ اس صحرائے لق و دق میں نہ کسی قافلے کا نشان تھا۔ نہ کسی شہر اور آدمی کا۔ مسجد اور خانقاہ کا تو کیا ذکر ہے۔ قاسم کے نوکروں نے جب اذان کی آواز سنی تو وہ ڈر کے مارے منہ کے بل زمین پر دراز ہوگئے۔ کچھ دیر تک خوف کی وجہ سے سب کی بری حالت رہی۔ پھر اندھیرا بڑھنے لگا۔ قاسم اور اس کے نوکر سونے کے لیے لیٹ گئے۔ زمین پر پڑے پڑے قاسم نے آسمان کی طرف دیکھا۔ مطلع بالکل صاف تھا۔ تارے خوب چمک رہے تھے۔ ہر طرف ایک ہو کا عالم تھا۔ مگر اس فضا کا اثر قاسم پر الٹا ہوا۔ تصور بندھا کہ یہ صحرا ایک زنداں ہے۔ اور اس زنداں میں وہ ایک ایسا قیدی ہے جس کی رہائی کی امید نہیں اور

آسمان کے یہ چمکتے تارے اس پر پہرا دے رہے ہیں کہ کہیں یہ اسیر بھاگ نہ جائے۔ قاسم بہت دیر تک جاگتا اور دن میں جو کیفیتیں دل پر گزرتی تھیں ان کو یاد کرتا رہا۔ لیکن جب زیادہ رات ہوئی تو سو گیا۔

جب آنکھ کھلی تو بھی اندھیرا تھا۔ صبح کا ستارہ طلوع ہو چکا تھا اور تارے جھلملا کر اپنی روشنیاں گل کرنے کو تھے۔ صبح کے ستارے کی چمک میں قاسم کو دم خنجر کی سی آب داری معلوم ہوتی تھی۔ گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ دائیں طرف اس کا خدمت گار اور بائیں طرف دونوں ساربان غافل سو رہے تھے۔ دونوں اونٹ اور گھوڑے کچھ دور گردنیں جھکائے ادھر ادھر ریت کو سونگھتے تھے اور افسوس کرتے تھے کہ ہائے یہ گھاس نہ ہوئی۔ قاسم کی طبیعت پھر بے چین و بے قرار ہوئی اور خیال ہوا کہ رات کے اندھیرے میں کسی غیر کا گزر اس کے قریب ضرور ہوا ہے۔ جب کچھ اجالا ہوا تو اپنے سرہانے کوئی چھوٹی سی چیز گڑی ہوئی دیکھی۔ سمجھا کہ شاید صلیب ہے جو کسی عیسائی نے نشان کے طور پر یہاں نصب کی ہے۔ اٹھ کر اس کو ریت سے اکھاڑا۔ دیکھا تو خنجر تھا۔ قبضہ اس کا سفید رنگ کا ہے مگر قبضے اور مشت پناہ کے لٹو سرخ رنگ کے ہیں اور پھل پر ایک جگہ خون لگا ہوا ہے....."

مقامی لوگوں نے ان کو اس سفر کا خطرہ مول لینے سے باز رکھنے کی کوشش بھی کی، لیکن ہنری شارپ کے پاس ہر دلیل کا وزنی جواب تھا کہ غیر ملکی نامہ نگار ہونے کے ناتے ان کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہیں پہنچیں جہاں "ایکشن" ہے۔ ان کی خبر رساں ایجنسی جس سیٹلائٹ نیٹ ورک سے وابستہ تھی، اس میں تاخیر افورڈ نہیں کی جا سکتی تھی۔ آخر ان کا ملک اب اطلاعات کی اسی طاقت کے ذریعے تو بڑا تھا۔ ورنہ سلطنت کا سورج کب کا غروب ہو چکا تھا۔ مقامی ڈرائیور اور چند نوکروں کو ساتھ لے کر وہ پجیرو میں نکل کھڑے ہوئے تھے۔ گاڑی کا انجن اس وقت خراب ہوا جب سپرہائی وے پر ٹول پلازا کا محراب در اپھاٹک ابھی نظر آنا نہیں شروع ہوا تھا۔

گاڑی کا بونیٹ کھلا ہوا تھا اور ڈرائیور اس میں جھکا ہوا کچھ سڑپڑ کر رہا تھا۔ سر ہنری شارپ دروازہ کھول کر اتر پڑے کہ اپنے پیروں کو اس مٹی پر رکھ کر دیکھیں۔ انھوں نے پہلا ہی قدم رکھا تھا کہ معاً انھیں ایسا لگا کہ وہ لق و دق صحرا میں بھٹک رہے ہیں اور شہر پناہ کا نشان دور دور تک نہیں ہے، بلکہ جس سمت ٹول پلازا کا دروازہ نظر آنا چاہیے وہاں ریت کے ٹیلے دھوپ میں چمک رہے ہیں اور اس چمک کے پیچھے جہاں اندھیرا ہے، وہاں زمین سے کچھ اوپر کو غبار میں ملفوف کسی شہر کے مینار اور گنبد نظر آتے اور انھیں لگا کہ یہ باغ ارم ہے جس کے متعلق مشہور ہے کہ جب آدمی مرنے کو ہوتا ہے تو نظر آیا کرتا ہے۔

ان کا بڑھا ہوا قدم رک گیا۔ ان کو معلوم تھا کہ یہ باغ ارم نہیں ہو سکتا۔ پھر بھی وہ زمین

پر اترنے کا ارادہ منسوخ کر کے پجیرو میں آبیٹھے اور دروازہ بند کر کے رنگین شیشہ پورا چڑھالیا۔

راستہ کھلا ہوا ہے یا نہیں، یہ اس کو اندازہ نہیں تھا۔
پھر بھی کچھ نہ کچھ گڑبڑ تو ہوگی، قاسم نے دل میں سوچا۔ وقت سے ہی گھر نکل جانا چاہیے۔
اسے یاد آیا کہ کل دفتر کے کام نمٹاتے نمٹاتے دیر ہو گئی تھی۔ وہی روز روز کا دیکھا بھالا راستہ کس قدر سنسان لگ رہا تھا۔ اکا دکا گاڑیاں گزر رہی تھیں اور وہ بھی آہستہ آہستہ، جیسے ان کے ڈرائیور پھونک پھونک کر قدم اٹھا رہے ہوں اور انھیں ڈر ہو کہ اگلے ہی لمحے گولیاں برساتی ہوئی وہ سفید گاڑی گزرے گی جس سے شہر میں کتنے ہی لوگ ہلاک ہو چکے ہیں۔ اس راستے سے وہ بچ کر نکلنا بھی نہیں چاہ رہا تھا۔ متبادل راستہ شہر کے ایک نسبتاً نامانوس علاقے کے وسط سے گزرتا تھا اور پھر اس راستے پر ٹریفک کا اژدہام تھا۔ گاڑیاں کچھوے کی رفتار سے رینگ رہی تھیں۔ قاسم نے گاڑی اسی جانے پہچانے راستے پر ڈال دی

وہ اگلے موڑ تک بھی پہنچنے نہیں پایا تھا کہ اس نے چوک کے قریب سپاہیوں کو کھڑے دیکھا۔ قریب ہی رینجرز کی مسلح گاڑی کھڑی تھی اور کئی سپاہی اس میں موجود تھے۔ باقی سپاہی سامنے کھڑے ہوئے تھے اور گزرتی ہوئی گاڑیوں کو ہاتھ دے کر روک رہے تھے۔
"شِٹ" قاسم نے دل ہی دل میں گالی دی۔ "اب یہ خاصا تنگ کریں گے۔ ساری گاڑی کھلوا کر دیکھیں گے، اور کچھ نہیں نکلے گا، تب بھی سو، دو سو لیے بغیر جان نہیں چھوڑیں گے۔ مگر یہ ڈھونڈ کیا رہے ہیں؟ ہم ایسے عام شہریوں کے پاس سے انھیں کیا نکلنے کی توقع ہے؟ ہتھیار؟ حشیش اور ہیروئن؟ ان کو نہیں معلوم جن کے پاس یہ سب ہوتا ہے، وہ اس طرح نہیں گھومتے؟

سپاہی نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ قاسم کو گاڑی کی رفتار دھیمی کرنا پڑی۔
قاسم اس وقت گاڑی ہی میں تھا۔ گاڑی چلاتے ہوئے اس نے گولیاں چلنے کی آواز سنی۔
اس کا پہلا ردعمل تو یہ تھا کہ پیچھے مڑ کر دیکھے کہ گولیاں کس طرف سے آرہی ہیں۔ اس نے گاڑی کے ریئر ویو مرر میں جھانک کر دیکھا۔ کیا کوئی گاڑی اس کا پیچھا کر رہی ہے اور گولی چلا کر اسے دھمکا رہی ہے کہ وہ رک جائے اور اپنے آپ کو ان کے حوالے کر دے۔ اسے کچھ نظر نہیں آیا۔
یا وہ سپاہی جنھوں نے اسے ہاتھ دکھایا تھا، ہوائی فائر کر کے اسے خطرے سے خبردار کر رہے ہیں۔
وہ صحیح اندازہ بھی نہیں لگانے پایا تھا کہ اس نے گاڑی کے ونڈ اسکرین کو گولی سے کرچی کرچی ٹوٹتے ہوئے دیکھا۔

میں تیزی سے یہاں سے نکل جاؤں، اس نے ارادہ کیا کہ ایک گولی اس کے ہاتھ پر لگی، دوسری سینے پر۔ جب قاسم کی گاڑی ٹکرا کر رکی ہے تو اس کا جسم بے حس و حرکت تھا اور خون

بھل بھل بہہ رہا تھا۔

"دی لٹرل ٹروتھ" سرہنری شارپ نے دل ہی دل میں کہا اور اپنی "اسٹوری" کے لیے تمام تفصیلات اکٹھا کرنے لگے۔ پھر انھوں نے الفاظ کو ترتیب دینا شروع کیا۔

جاں بحق۔ عینی شاہدین کے مطابق وہ اتوار کی رات پونے آٹھ بجے اپنے حجرے سے گھر جانے کے لیے نکلے۔ڈرائیور نے ہائی روف سوزوکی اسٹارٹ کی تو عمارت کے باہر پہلے سے موجود دو نامعلوم موٹر سائیکل سواروں نے ان پر وار کر دیا۔ گاڑی بے قابو ہو کر ایک ٹھیلے سے ٹکرا گئی اور حملہ آور واپس آکر یقینی ہلاکت تک فائرنگ کرتے رہے۔ ڈرائیور گاڑی لے کر کیژوپلٹی وارڈ پہنچا جہاں موجود ڈاکٹروں نے تصدیق کر دی کہ زیادہ خون بہہ جانے کے سبب وہ ہلاک ہو چکے ہیں۔ موقع واردات کے پاس سے پولیس کو پستول کی گولیوں کے خول ملے ہیں جن کی مخصوص ساخت ہے۔

یہ سطور فیکس سے روانہ کرنے کے بعد سرہنری نے ان کی ایک فوٹو کاپی فائل میں لگائی تھی تاکہ جب اگلا قتل ہو تو انھیں تفصیلات کے موازنے میں آسانی ہو۔

انھوں نے اپنی پتلون پر سے خیالی گرد جھاڑی اور سیاہ بیگ میں رکھا ہوا لیپ ٹوپ (Laptop) نکال کر اپنے سامنے رکھ لیا۔ انھوں نے اوپری حصہ کھول کر کی بورڈ پر کمانڈ دی۔ اسکرین دمکنے لگا اور اس کے اوپری کونے میں حروف کا ایک سلسلہ گزرنے لگا۔ حروف کسی ایک نقطے پر رکے اور کمپیوٹر نے ہلکی سی سیٹی دی۔ انھوں نے مقررہ کوڈ کے مطابق کمانڈ دی تاکہ نیا ڈاکومنٹ کری ایٹ ہو جائے۔ وہ جس پریس کانفرنس کو اٹینڈ کر کے آرہے تھے، اس کی رپورٹ تیار کرنا تھی۔ انھوں نے کی بورڈ کو ہلکے سے ہاتھ لگایا اور ٹائپنگ شروع کرنے کے لیے انگلیاں تیار کیں۔ منور اسکرین پر الفاظ خود بخود ابھرتے چلے آنے لگے۔ کیا یہ سب الفاظ میں نے ہی لکھ دیے ہیں، انھوں نے ایک لمحے کے لیے تعجب کیا۔ شاید کوئی پرانا ڈاکومنٹ کھل گیا جو کمپیوٹر کی میموری میں نہ جانے کب سے محفوظ تھا۔ لکھنے والی انگلیوں کی بجائے پڑھنے والی آنکھیں ان پر حاوی ہو گئیں۔

"ارکان اعلیٰ قلعہ الموت کے جماعت خانے میں حاضر ہیں۔ سیاہ دیواروں پر پنج شاخوں میں فتیلے اور مشعلیں روشن ہیں اور ان کی سرخ روشنی ہر طرف حرکت میں ہے۔ جانب صدر فرش سے کچھ اونچا ایک چبوترہ ہے اور اس پر تین اونچی نشستیں اسی سیاہ پتھر میں کٹی ہوئی جس کی دیواریں ہیں، بنی ہیں۔ بیچ کی نشست پر طبقہ حشیشین کا شیخ الجبل سفید لباس پہنے اور اس کے دونوں پہلوؤں پر صوبہ جبال اور صوبہ کوہستان کے دعات الکبیر نشست رکھتے ہیں۔ ان کا لباس سفید

کپڑے پر سیاہ دھاریوں کا ہے ۔ پہلو کی دونوں دیواروں سے ملی ہوئی، دعات کی دوہری صفیں کھڑی ہیں ۔ ان کے سفید لباسوں کے حاشیے سرخ ہیں ۔ ایوان کے بیچ میں تابوت جس کے اوپر کے تختے پر نشان صلیب نہایت تیز سرخ میں نقش ہے، رکھا ہے ۔ اور تابوت کے اندر قاسم موت کا منتظر پڑا ہے ۔

ملت باطنیہ کے تین اعلیٰ درجوں کے لوگ اس جلسے میں شریک ہونے کے مجاز تھے ۔ پانچویں درجے کے لوگ جن کو فدائی کہا جاتا ہے، یہ تعداد میں اور سب لوگوں سے بہت زیادہ ہیں اور راز و رموز سے ناواقف ۔ ایوان کا دروازہ بند تھا ۔ یہ دروازہ دراصل ایک زینے کا تھا جس سے اتر کر ایوان میں پہنچتے تھے ۔ یہاں چند داعی، جو اس کام پر مقرر ہوئے تھے، برہنہ تلواریں ہاتھ میں لیے دروازے کی حفاظت کرتے تھے اور صرف مخصوص لوگوں کو اندر جانے کی اجازت دیتے تھے جہاں ملت کی راز و رموز ان لوگوں پر ظاہر کیے جاسکتے تھے جن کی قسمت میں ترقی پاکر ان سے مستفیض ہونا لکھا تھا ۔

ہر طرف خاموشی تھی ۔ شیخ الجبل اپنی کرسی سے اٹھا اور حاضرین سے اس طرح خطاب کیا ۔ " دعات الکبیر اور داعیان ملت باطنیہ، جن کی ہیبت نے ربع مسکون کو ہلا ڈالا ہے، سنو! اس جلسے کے انعقاد کی کیا غرضیں ہیں ۔ ہمارے طبقہ، ناجیہ کا ستارہ، اقبال اس وقت اوج کمال پر ہے ۔ ہمارے دعات میں سے بالخصوص اس داعی خاص نے جو وزیر موت کا لقب رکھتا ہے، ولایت شام میں بڑے بڑے کارہائے نمایاں کیے ہیں ۔ اور وزیر موت کے اطاعت کے لیے ہم کو تمام داعیان اور فدائیان سے نئے طرز کا حلف لینا مقصود ہے.... "

*

جہاں تک نظر جاتی تھی، اکتا دینے والی بے رنگی تھی ۔ چٹیل زمین اور اس پر کانٹے دار جھاڑیاں اگی ہوئی جن کو زمین کی نمی کی ضرورت کم سے کم ہوتی ہے ۔ ہوا کا کوئی تیز جھونکا آتا تو افق پر غبار سا اڑتا دکھائی دیتا اور ہر ایک چیز پر گرد کی ایک اور تہہ جم جاتی ۔ اس نے گردن گھماکر دوسری طرف دیکھا ۔ اکا دکا گاڑیوں کے علاوہ زیادہ تر ٹرک تھے جن پر سامان لدا ہوا تھا ۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ٹرکنگ اسٹیشن وہ دیکھتا آیا تھا جن کی اکتاہٹ ماری، بھدی، پستہ قد عمارتوں کے سامنے تیل کے دھبے اور بان کی چارپائیاں تھیں ۔ اس کا جی چاہا تھا کہ ان میں سے کسی ایک میں رک کر خوب کاڑھی ہوئی دودھ پتی پیے لیکن اسے اپنی مترجمہ کے بغیر زبان کی مشکل ہوتی تھی، اور پھر سرہنری کو متنبہ کر دیا گیا تھا کہ ایسے اڈوں کے آس پاس " ڈاڑھیل " ہو سکتے ہیں جو ایسے حالات میں کسی اکیلے دکیلے اور ناواقف غیر ملکی کو اغوا کر کے بھنگ کے لیے لمبی رقم مانگنے سے دریغ نہیں کریں گے ۔ اس طرح میری شہ سرخی ان نشریاتی اداروں پر بھی پہنچ جائے گی جو میرے مراسلوں کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے، سرہنری نے اپنے اس مخصوص زہر خند کے ساتھ سوچا،

جس کو ان کے مراسلوں کے مستقل قاری بطور خاص سراہتے تھے۔ ڈاڑھیل کو دل چسپی اس رقم سے ہوگی جو وہ اس کے بدلے میں حاصل کر سکتے ہیں، مگر اسے زیادہ خبردار ان لوگوں سے رہنے کے لیے کہا گیا تھا جن کا مقصد رقم کا حصول نہیں ہوگا۔ "وہ جان لیے بغیر نہیں چھوڑتے" اسے بتایا گیا تھا۔

"آخران لوگوں کی شناخت کیا ہے؟" اس نے اس وقت بھی یہی سوال کیا تھا۔

"خدا جانے" اس وقت بھی اس قسم کا جواب ملا تھا۔

ایک غیر ملکی نامہ نگار خدا سے اس کے ذرائع کے بارے میں سوال نہیں کر سکتا، اس نے مسکرائے بغیر، خشک لہجے میں کہا تھا۔

"تمھیں اس قسم کے سوالوں کی کیا ضرورت ہے؟" اس شخص نے کہا تھا جو سفارت خانے کے استقبالیوں میں خیر خواہ کے طور پر سامنے آتا تھا۔ "ان لوگوں سے پنگامت لو۔" "اور نہیں تو کیا۔ آپ کو پھڈے میں ٹانگ اڑانے کی کیا ضرورت ہے؟" ایک اور خیر خواہ نے کہا جس کی بول چال کا اندازہ اور تلفظ دوسرے لسانی گروہ کا تھا۔ اور اس نے یہ طے کر لیا کہ فرصت کے وقت ان محاوروں کا مطلب اپنی مترجمہ سے ضرور دریافت کرے گا۔

اس نے سیٹ پر رکھے ہوئے اخباروں کو دیکھا جو بہت سلیقے سے، پہلے آدھوں آدھ، پھر چوتھائی تہہ کر کے رکھے گئے تھے۔ نیچے کی تہہ ان اخباروں کی تھی جو مقامی زبانوں میں تھے اور ان میں شائع ہونے والی متعلقہ خبروں کے وہ حصے جو اہم تھے یا مختلف تھے، خلاصہ کر کے، زرد رنگ کے اسٹک آن نوٹس پر درج کر کے اخباروں کے حاشیے پر چپکا دیے تھے۔ قتل کی خبروں اور ان پر قیاس آرائیوں کو اس نے علاحدہ کیا۔ اسے ان کے بارے میں بھی لکھنا تھا۔ قتل کا ذمہ دار باری باری ان تمام لوگوں کو ٹھہرایا گیا تھا جو اس سلسلے وار قتل سے فائدہ اٹھا سکتے تھے ـــــ حکامِ اعلیٰ، حزبِ اختلاف، قانون نافذ کرنے والے ادارے، مسلح افواج، لسانی گروہ، فرقہ وارانہ شناخت کے حامل گروہ، غیر ملکی ایجنٹ، لینڈ مافیا، ڈرگ مافیا کوئی اور، کوئی اور، خدا جانے...... پھر بھی کسی کو کیا معلوم؟ ایک لمحے کے لیے اس نے توقف کیا کہ اسے کیا لکھنا چاہیے، اور لیپ ٹوپ کی اسکرین پھر منور ہو گئی۔

دعوت میں تکلفات زیادہ نہ تھے۔ کیوں کہ زمانہ ماہ رجب کا تھا کہ جس ماہ مبارک میں لہو و لعب اور رقص و سرود کے جلسوں سے پرہیز کیا جاتا ہے۔ بلکہ اس زمانے میں امیر المومنین کا کسی کو شرفِ حضوری بخشنا بھی ایک غیر معمولی واقعہ سمجھا جاتا تھا۔ دعوت کی خاص وجہ یہ ہوئی تھی کہ قزوین کا حاکم کسی ضروری کام کے لیے اپنی ولایت چھوڑ کر بارگاہ خلافت میں حاضر ہوا تھا۔ اور

اب جلد اپنے دار الامارت کو واپس جانا چاہتا تھا۔ چوں کہ حاکم موصوف سلطنت کا وفادار خادم اور امیر المومنین کا قوتِ بازو تھا، اور فتنہ پردازوں کی سر کوبی میں کمال رکھتا تھا، اس وجہ سے خلافت مآب اس کے حسن خدمات کے صلے میں اظہار خوش نودی فرمانا قرین مصلحت سمجھتے تھے۔ جلسۂ ضیافت میں حاکم موصوف کو خود امیر المومنین نے اپنے دست مبارک سے خلعت پہنایا اور انعام واکرام سے مالا مال کیا۔ شاعروں نے وفا کیشان اسلام اور بالخصوص خلافت پناہ اور امیر قزوین کے شان میں قصیدے پڑھے۔

جلسہ جب ختم ہونے کو ہوا تو امیرِ قزوین مکارم و مراحم خسروانہ سے شاد اور خلعتِ فاخرہ سے ملبوس، آداب و کورنشات بجالا کر سر جھکائے خلافت پناہ کی حضور میں حاضر عنایات شاہی کے شکریے میں دعائے دولت و اقبال عرض کر کے رخصت کا طالب ہوا۔ امیر المومنین مسند سے اٹھے اور حاکم قزوین کو فی امان اللہ کہہ کر رخصت فرمایا اور خود پہلو کے دروازے سے آرام گاہ کی جانب چلے۔ حاضرین دربار نظریں نیچی کیے، سروقد تعظیم کے لیے کھڑے ہوئے۔ خلافت پناہ کے اٹھتے ہی یہ لوگ بھی دربار سے چلنے لگے۔ سب سے پہلے حاکم قزوین امراء سلطنت کی مبارک باد دیں (جن کی تہہ میں رشک پنہاں تھا) سنتا اور سر کو خم کرتا دروازے کی طرف چلا جس کی دہلیز سنگ سیاہ کی تھی اور جس پر سیاہ مخمل کا پردہ لٹک رہا تھا۔ ابھی اس نے دروازے میں قدم بھی نہ رکھا تھا کہ دوڑتے ہوئے قدموں کا کچھ شور سا ہوا اور ایک زور کی چیخ سنائی دی۔ خلافت پناہ یہ شور سنتے ہی ایوان میں واپس آئے۔ اور بڑی دلیری سے دروازے کی طرف گئے۔ اتناد یکھتے ہی اہل دربار کے بدن پر رعشہ پڑ گیا۔ خلافت پناہ کے لیے راستہ چھوڑنے لگے۔ امیر المومنین نے جس جگہ توقف فرمایا، وہاں امراء سلطنت ایک حلقہ باندھ کر عجیب سکوت اور دہشت کے عالم میں کھڑے ہوگئے۔ اس حلقے کے عین وسط میں دروازے سے ادھر ہی کو سیاہ مخمل کے پردے کے سامنے امیرِ قزوین فرش پر پڑا تھا۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں پھر چکی تھیں اور ان بے نور دیدوں پر ہیبت طاری تھی۔ سینے میں خنجر پیوست تھا۔ ہونٹوں پر لہو اور لباس خون میں تر بہ تر تھا۔ مشعل بردار زمین پر گھٹنے ٹیکے مشعلیں اس کی طرف جھکائے ہوئے تھے۔ ان کی سرخ روشنی میں یہ منظر اور بھی خونیں رنگ معلوم ہوتا تھا۔

حاضرین میں سے ایک رئیس جو اوروں سے زیادہ دلیر تھا، آگے بڑھا اور جھک کر لاش کے سینے سے خنجر نکال لیا۔ اب سب نے دیکھا کہ خنجر کے قبضے اور مشت پناہ کا رنگ سفید ہے۔ لیکن ان تینوں کے سروں پر جو لٹو ہیں وہ سرخ رنگ کے ہیں۔ جس رئیس نے لاش کے سینے سے خنجر نکالا تھا، اس نے خنجر کو اونچا کر کے لوگوں سے کہا۔ "یہ وہی خنجر ہے جس نے نظام الملک کو ہلاک اور کئی صوبوں کے حاکموں کا خاتمہ کیا ہے۔ بلکہ سریر خلافت کے دو تاجداروں کی بھی جان لے چکا ہے۔ یہ حشیشین کا خنجر ہے۔"

امیر المومنین نے سر ہلا کر چاروں طرف دیکھا۔ ان کا چہرہ سرخ ہو کر انگارہ ہو گیا تھا اور آواز میں بادل کی سی گرج تھی۔ ایک دفعہ ہی کڑک کر بولے۔ "یہ حرکت کس کی ہے۔ قاتل کہاں ہے؟"

حاضرین میں اس آواز کو سن کر سہم گئے۔ کسی میں طاقت نہ تھی کہ کچھ کہتا۔

ڈرائیور ہاتھ جھاڑتا ہوا پجیرو کے برابر جاکر کھڑا ہو گیا۔ اور ٹوٹی پھوٹی زبان میں سمجھانے لگا کہ اس خرابی کو ٹھیک کرنا بڑے شہر میں ہی ممکن ہے۔

اس کی بات سر ہنری شارپ نے کچھ سمجھی اور کچھ نہیں سمجھی۔ انھوں نے ایک بار پھر اس سمت دیکھا جہاں ٹول پلازا کا محراب دار پھاٹک نظر آنا چاہیے۔ انھیں ایک بار پھر ایسا لگا کہ سرمگیں غبار میں مینار اور گنبد جھلک رہے ہیں۔ جس کے متعلق انھیں تھوڑی دیر پہلے شبہ ہوا تھا کہ یہ وہی ہیں جن کے متعلق مشہور ہے کہ آدمی جب مرنے کو ہوتا ہے تو یہی شہر نظر آیا کرتا ہے۔

انھوں نے اس خیال کو جھٹک دینا چاہا۔ وہ شہر یہاں کہاں؟ وہ تو کہیں نجد کے جنوب میں یا حضر الموت میں تھا، اور یہ وادی حضر الموت نہیں۔ انھوں نے اتنا جغرافیہ تو پڑھ رکھا تھا۔ لیکن وہ خیال پہلے سے زیادہ طاقت کے ساتھ پھر آن موجود ہوا۔

ان کی نظریں سامنے کی طرف اٹھ گئیں۔ وہ سامنے افق پر دکھائی دینے والا ٹیلا، کہیں وہی تو سربہ فلک پہاڑ آشیانہ عقاب نہیں جس پر قلعہ الموت فخر کے ساتھ سر اٹھائے کھڑا ہے، جس کے دامن میں شداد کی جنت ہے جس کے حصول کی لالچ خنجروں کو لہو چٹاتی ہے۔

نہیں، نہیں، ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ مصنوعی جنّت محض سراب ہے۔ یہ قلعہ الموت نہیں، آج کا شہر ہے۔

اور پھر ایک لمحے کے لیے انھیں اپنے ہی آپ پر یقین نہیں آیا کہ یہ ہے یا وہ۔

[(ا) اس تحریر کا حوالہ سرہنری شارپ کے The Assasians کے اردو ترجمے از بیگم محمد سعید دہلوی سے قائم کیا گیا ہے۔ا]

آصف فرخی

میں اب بھی اس شہر میں خواب دیکھتا ہوں

خاک نظر آتی ہے مجھے ۔ پروجیکٹر سے نکلنے والی روشنی کی لکیر میں سینکڑوں ہزاروں ذرے ۔۔۔۔

پھر اچانک وہی عمل شروع ہو جاتا ہے، کسی اطلاع کے بغیر اور یہ وہی منظر ہے جو پورے کا پورا اسی طرح دہرایا جارہا ہے ۔ بڑی تیزی کے ساتھ، جس طرح شروع میں ہوا تھا ۔

اس وقت بھی مجھے معلوم ہے کہ اس میں گڑ بڑ ہے ۔ جس طرح ہو رہا ہے، اس طرح ہونا نہیں چاہیے تھا ۔

پہلا منظر بڑی تیزی سے گزر جاتا ہے، اس کا کہنا غلط ہے ۔

ایسا تو اب لگتا ہے کہ سرعت سے گزر گیا ہوگا ۔ آناً فاناً بدل گیا ہوگا ۔ اس وقت وہ لمحہ لمحہ گزرا ہے ۔

یہ پہلا منظر ہے، یہ بھی اس وقت پتہ چلا جب جو کچھ اس میں شروع ہوا تھا، آگے بڑھ کے مزید گہرا ہونے لگا ۔ اپنے اپنے کردار کا ابھی اندازہ لگا رہے ہیں، متعدد بار کی مشق کے بعد بھی یہ محسوس ہوتا تھا ۔

ابھی تک لگتا نہیں ہے کہ گزر گیا ہے وہ منظر ۔ پھر ایک وقفہ آتا ہے، اس کے بعد خلا، ایسا دورانیہ جس کی طوالت کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا اور جس کی مدت میں کچھ نہیں ہوتا، یہ اندیشہ بھی نہیں کہ کیا ہونے والا ہے ۔

اور پھر اچانک عمل شروع ہو جاتا ہے، کسی اطلاع کے بغیر اور وہی منظر دہرایا جاتا ہے ۔۔۔۔

پروجیکشن روم میں بیٹھے بیٹھے میں اپنے ذہن سے یہ خیال نہیں جھٹک سکتا کہ یہ خواب نہیں ہے، یہ میں نے کہیں پڑھا ہے ۔

یہ کل رات کی بات ہے ۔ وہ مجھ سے کہتی ہے ۔ ایسا لگا کوئی چیز چل رہی ہے اور سر کے بالوں سے چلتی ہوئی میری گردن تک آگئی ۔ میں نے اسے پکڑنا چاہا ۔ میرا ہاتھ یوں ہی گھومتا رہا ۔ وہ اس طرف نکل جاتی تھی جہاں ہاتھ مڑ کر نہیں جاسکتا تھا ۔ اور پھر وہ میرے کندھے پر آگئی ۔ تب میں نے اسے پکڑ لیا ۔ میری چٹکی میں آگئی ۔ خدایا، وہ جوں تھی! اور ایک نہیں تھی ۔ میرے سر میں بھری ہوئی تھیں جوئیں ہی جوئیں.... میں نے دیکھا، میں نے دیکھا.... میں رو بھی تو نہیں سکی ۔

اور جہاں پتھر آ کر لگا تھا وہاں سے دانت ٹوٹا ہوا تھا۔ وہ سامنے کا دانت تھا۔ میرے سر میں جوئیں پڑ گئیں، میرے دانت ٹوٹ گئے.... صبح کافی دیر تک میں سمجھتی رہی کہ میرے ساتھ یہ ہو گیا ہے اور دل ہی دل میں اپنے حال پر روتی رہی.... پھر خود ہی اندازہ ہوا کہ جس کو سچ سمجھ رہی ہوں وہ خواب تھا۔

وہ کہہ رہی تھی تو میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے، کپڑے مسل گئے تھے۔ میں نے چاہا کہ پھر سے سو جاؤں۔ میں پھر رات بھر لکھتا رہا تھا اور پچھلی، پھیکی صبح میری انگلیاں اکڑ رہی تھیں اور آنکھوں میں جلن ہو رہی تھی۔

عین اسی جگہ پر۔ اصل میں تو وہ مقام تھا جو اتنا واضح تھا۔
اور شہر کا کوئی کونا اتنا واضح اور صاف نظر آئے، اس سے مجھے سمجھ لینا چاہیے تھا کہ وہ خواب ہے۔ اس شہر کا خواب۔
میں اس شہر میں اب بھی خواب دیکھتا ہوں۔
اس وقت مجھے کون چونکا سکتا ہے؟ اپنی رفتار کے علاوہ اب کسی کا اعتبار نہیں رہا.... جن کو کسی پر اعتبار نہیں رہے وہ لوگ ایسے ہی خواب دیکھا کرتے ہیں۔
اس خواب میں بھی میں نے شہر دیکھا۔
شہر کا ایک ٹکڑا جو اپنی پوری تفصیلات کے ساتھ زندہ تھا، میرے چاروں طرف زندہ تھا.... اس لیے بھی کہ وہاں ہر وقت رش رہتا ہے۔ ریگل چوک سے مڑ کر پٹڑی کا اتنا ٹکڑا جو آنے والی سڑک اور جانے والی سڑک کے درمیان اس طرح آگیا ہے جیسے دانتوں کے بیچ میں زبان کی نوک آجاتی ہے۔ جہاں بسیں اپنی رفتار دھیمی کرنے لگتی ہیں اور مسافر اترنے کی تیاری کرنے لگتے ہیں۔ اور ایک بس سے اتر کر دوسری بس میں سوار ہونے والوں کی توجہ حاصل کرنے کے لیے مختلف قسم کی چیزیں فٹ پاتھ پر بکتی ہوئی نظر آتی ہیں اور اس بڑے سے پیڑ کے نیچے، جس کی شاخوں میں بجلی کے تار الجھ گئے ہیں، روز کی طرح کتابوں رسالوں کا ڈھیر لگا ہوا ہے.... متواتر وہاں سے گزرتے ہوئے اس جگہ رکنا، تازہ رسالوں کے ورق الٹ کر دیکھنا اور نئی چھپ کر آنے والی کتابوں کو ٹٹولنا میرا معمول تھا.... لیکن میں اس اسٹال پر کتابوں کے ڈھیر کے ایک طرف نہیں کھڑا ہوں بلکہ بیچ میں کھڑا ہوا ہوں۔ میں ہنس رہا ہوں۔ وہ لوگ جو سامنے سے آرہے ہیں وہ بھی بہت ہنس رہے ہیں۔ میری انگلیاں جو لکھتے لکھتے اکڑ گئی تھیں ابھی سیدھی نہیں ہوئی ہیں۔ سامنے چھوٹی بڑی ڈھیریاں رکھی ہیں۔ وہ میری کتابیں ہیں۔ ڈھیریاں ضرورت سے بہت زیادہ ہیں۔ میں ان کے اوپر ورق جمانے لگتا ہوں، شہر بیتی اور شہر ماجرا۔ وہاں سے تیز تیز گزرنے والے اور رکنے والے لوگوں کی توجہ حاصل کرنے کے لیے میں گا رہا ہوں: جگ سے ناتا ٹوٹا ہو، کون ٹھگوا نگریا

لوٹ مل ہو، کون ٹھگوا.... اور وہ تین جو وکٹوریہ روڈ کے موڑ سے بھاگتے ہوئے آ رہے ہیں، وہ وہیں سے پکار رہے ہیں، کہاں ہیں وہ کراچی والے افسانے؟ ہم قاری ہیں، ہم انھیں پڑھنے آئے ہیں، ہم ناقد ہیں انھیں پرکھنے آئے ہیں، ہم ناشر ہیں انھیں چھاپنے آئے ہیں۔

میں انکسار کے ساتھ شہر کی دیواروں کی طرف دیکھتا ہوں۔ دوبارہ نظر اٹھاتا ہوں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان تینوں میں جو سب سے آگے ہے، وہ ایک عورت ہے۔

ایسی باتوں پر جتنی ہنسی آنا چاہیے، اس سے کہیں زیادہ ہنس رہا ہوں میں.... خوشی سے قہقہے لگا رہا ہوں۔

میں بہت خوش ہو کر ان پیالوں میں اپنا خون بھرنے لگتا ہوں اور پیالے ان کی طرف بڑھا دینا چاہتا ہوں، میں بہت دہشت زدہ ہو کر ان کو روک دینا چاہتا ہوں لیکن وہ تیزی سے بھاگتے ہوئے آ رہے ہیں۔

اور میری نظر اس طرف جاتی ہے جدھر وہ دیکھ رہے ہیں۔

وہ سنیما کا قد آدم پوسٹر نہیں۔ کھلی چھت کی گاڑی پر بیٹھا ہوا نوجوان ہے جس نے دونوں ہاتھوں میں بندوق اٹھائی ہوئی ہے۔ وہ میری طرف نشانہ باندھ کر بندوق چلاتا ہے تو اس کے خدوخال کچھ مانوس سے لگتے ہیں۔ میں فیصلہ نہیں کر پاتا کہ میں نے اسے کہاں دیکھا ہے اور بندوق کی گولی میرے سر پر سے گزر جاتی ہے۔

ڈرے ہوئے آدمی کی ہنسی میرے ہونٹوں پر اٹک رہی ہے۔ میں اس نوجوان کی طرف دیکھتا ہوں۔ کیوں مار رہا ہے یہ مجھے؟ یہ میری جان بھی لے سکتا ہے اور کیا میں اتنا بے سہارا اور زد پر آیا ہوا ہوں؟

"ہم س س ساب کو مار رہے ہیں!" میری ان نظروں کے جواب میں وہیں سے پکار کر کہتا ہے جہاں وہ گاڑی کے اوپر پوزیشن لیے ہوئے ہے۔

ساب کو؟ سب کو؟ صاب کو؟ کس کس کو؟ میرے ہاتھوں سے کتاب کا مسودہ گر جاتا ہے اور ورق ورق سوال ہوا میں بکھر کر ریگل چوک تک اڑتے چلے جاتے ہیں۔

"ہم آپ کو نہیں" وہ ناک میں بول رہا ہے "ہم آپ کو نہیں، سانپ کو مار رہے ہیں.... وہ میری جانب اشارہ کر رہا ہے۔

میں مڑ کر پیچھے دیکھتا ہوں ہزاروں فٹ لمبا سیاہ سانپ پھن پھیلائے میرے پیچھے کھڑا ہوا ہے۔

سانپ زبان نکالتا ہے۔ اس کی زبان دو شاخہ ہے۔ کاٹو تو میرے منہ میں زبان نہیں۔ میری آنکھ کھل جاتی ہے۔

آرٹس کاؤنسل میں تقریب رونمائی ہورہی ہے میری اس کتاب کی۔
اس مرتبہ جگہ بھی واضح ہے، وقت بھی اور مقصد بھی۔
نیچے دہلی دبی کھلی جگہ ہے جہاں تقریروں کے دوران ٹریفک کا شور خلل ڈالتا رہتا ہے۔ بیچ میں چلنے کا راستہ بنا کر دونوں طرف کرائے کی وہی کرسیاں رکھی ہیں۔ ڈائس خالی ہے اور میں کوفت کے ساتھ دیکھتا ہوں کہ بینر پر میرے نام کے اگلے حصے پر تشدید نہیں لگی، جس کی وجہ سے وہ معمول سے زیادہ بے تکا نظر آرہا ہے جیسے چھپکلی کی کٹی ہوئی دم.... "تشدید رہ گئی ہے" میں ایک صاحب سے کہتا ہوں۔
"ہاں بھئی کیا کیجیے، تشدد بڑھ گیا ہے" وہ جواب دیتے ہیں۔
سامنے قطاروں میں وہ سب لوگ بیٹھے ہوئے ہیں جنھیں اتنے برسوں سے میں جانتا اور جمع کرتا چلا آیا ہوں۔ ان کے درمیان میں بھی بیٹھا ہوا ہوں اور ڈائس پر اپنے آنے کا انتظار بھی کر رہا ہوں۔
بالکل ان ہی کی آوازوں میں سن رہا ہوں، جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں اور سوچ رہا ہوں کہ بہت دیر ہو گئی، اب تک مجھے آجانا چاہیے تھا۔
"ایک اور کتاب" سامنے کی قطار میں بیٹھا ہوا، دہرے بدن کا ایک آدمی کہہ رہا ہے۔ اس لمحے اس کا نام میرے ذہن میں بلینک ہو گیا ہے۔ "ایک الگ الماری بنوانی پڑ رہی ہے ان کی کتابوں کے لیے...."
"جلسے میں بلا تو لیتے ہیں لیکن ان کو کیا پتہ ہمیں کتنی مشکل ہوتی ہے۔" ایک خوش لباس خاتون، بالکل اسی قسم کی جس کی تصویریں اخباروں کے سوشل راؤنڈ اپ میں چھپتی ہیں، دوسری خاتون سے کہہ رہی تھیں۔ "گھر سے نکلنے سے پہلے بچوں کا اور کھانے کا بندوبست کرنا پڑتا ہے۔ آج کل بچوں کو گھر میں اکیلے بھی نہیں چھوڑ سکتے۔" دوسری خاتون اس قسم کی تھیں جن کی تصویریں کسی بھی اخبار میں نہیں چھپتیں۔
کتنی دیر سے لوگ باتیں کر رہے تھے لوگوں اور باتوں کی باتیں۔ کتنی دیر سے بیٹھے ہوئے لوگ اٹھ کر کھڑے ہونے لگے۔ اٹھ کر کھڑے ہونے لگے کتنی دیر سے بیٹھے ہوئے لوگ۔ ادھر ادھر دو دو چار چار کی ٹکڑیوں میں بٹ کر باتیں کرنے لگے۔ اسٹیج خالی ہے، ڈائس منتظر ہے۔ سامنے کی دیوار پر لگے ہوئے بینر کا ایک کونا ہوا چلی تو گر پڑا۔ نام چھپ گیا نام رہ گیا۔
مجمع میں بے چینی پھیلتی جارہی ہے۔ "ارے صاحب، ایسی بھی کیا دیر؟ نہ جلسے کے مقررین ہیں نہ صاحب کتاب! پھر ہمیں کیوں بلوایا گیا ہے یہاں؟" لوگوں میں چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں۔ وہاں ہیٹ اور چھڑی والا وہ آدمی بھی ہے جسے میں نے جلسوں میں بار بار دیکھا ہے اور جس کے بارے میں آج تک کوئی نہیں بتا سکا کہ وہ کون ہے، اسے کس نے "! [illegible] ہ لوگوں سے کچھ کہہ

رہا ہے اور بار بار مختلف لوگ اس کے سامنے آکر تصدیق کر رہے ہیں۔

"جلسہ نہیں ہوگا۔ پر امن طریقے سے اپنے گھر چلے جائیے۔ کتاب پر پابندی لگ گئی ہے"

"وہ سب سے یہی کہہ رہا ہے۔

مائکروفون پر کوئی اعلان نہیں ہے۔ جن معروف ادیبوں کو مقالے پڑھنے تھے ان میں سے کوئی بھی وہاں نہیں ہے۔ فہمیدہ ریاض، سحر انصاری، انور پیرزادہ: ان کے نام بینر پر ہوا سے ہل رہے ہیں۔ خالی اسٹیج پر سفید ہوا چل رہی ہے۔ میں بھی وہاں نہیں پہنچا۔ میں سامعین میں بھی بیٹھا ہوا، اپنے آپ کو اپنے سے الگ دیکھ رہا ہوں۔ اٹھ اٹھ کر جاتے ہوئے لوگ باتیں کر رہے ہیں

"شروع دن سے ترقی پسندوں کو برا کہتے آئے تھے موصوف، لیکن خود ہی آگئے لائن پر۔ یہ کرشن چندر اور "ہم وحشی ہیں" کا فیض نہیں ہے تو اور کیا ہے؟"

"اجی چھوڑیے! مظلوموں کی آہ نہیں دیکھی ہے انھوں نے۔ عورتوں کی زبان میں افسانے نگھارتے ہیں۔"

میں جاتے ہوئے لوگوں کو دیکھ رہا ہوں۔ اتنے میں میری نظر دوسری طرف پڑتی ہے۔ میں اٹھ کر وہاں جاتا ہوں۔ وہ آدمی جو پہلی قطار سے چلتا ہوا یہاں آیا تھا، اس طرح سرگوشی کرتا ہے کہ سب سن سکیں۔ "پابندی کی تو بس افواہ ہے! محض افسانہ! انھوں نے ادھر والوں پر جو فقرے لگائے دہیں اب اس کا مزہ چکھیں! لندن سے فیکس آگیا ہے۔ جلسہ گاہ میں ٹائم بم رکھ دیا گیا ہے!"

اجڑتی ہوئی محفل کے بیچ میں ہوں میں۔ شاہدہ حسن، فاطمہ حسن سے کہہ رہی ہیں واپسی میں مجھے گھر ڈراپ کر دینا۔ افضال سید اخبار پڑھ رہے ہیں۔ عذرا عباس سگریٹ پی رہی ہیں۔ ذیشان ساحل، ستون سے ٹیک لگائے بیٹھا کاپی پر نظم لکھ رہا ہے۔

میں اٹھ کر کھڑکی کے پاس آجاتا ہوں۔ اچانک وہاں کھڑکی نظر آئی جہاں پہلے دیوار تھی۔ میں اس سے شہر دیکھنا چاہتا ہوں کہ سڑک پر کیا کیفیت ہے۔ باہر نکلنا محفوظ بھی ہے یا نہیں۔ کھڑکی سے باہر اندھیرا ہے۔ کیا شہر پر رات چھا گئی؟ میں یہ دیکھ کر ذرا بھی حیران نہیں ہوتا کہ میں شہر میں نہیں، اپنے اندر جھانک رہا ہوں۔

جیسے اینڈ واسکوپی میں دیکھتے ہیں.... وہ کھڑکی نہیں میوب ہے.... اور السر فیلڈ آف وژن میں نہیں آرہا تو میں پریشان ہو رہا ہوں کہ اگر السر نہیں ہے تو پھر اتنی بلیڈنگ کس لیے ہے؟

میں نیند میں اس لڑکی کا نام لے رہا ہوں دن میں جس کا نام سن کر ایسا لگا تھا کسی نے میرے سینے پر خنجر سے وار کیا ہے۔

ایک بار اس کا نام لیتا ہوں اور کانپ اٹھتا ہوں۔

لیکن مجھے اس کا نام نہیں لینا چاہیے۔ ثمینہ نے مجھ سے کہا تھا، اس کی سہیلی کی بہن کی بیٹی ہے، اس نے رو رو کر بتایا ہے اور جناب زہرہ کی قسم دی ہے کسی سے نہ کہنا۔

میں کس سے کہوں گا؟ اس نے خواب دیکھنے سے تو منع نہیں کیا ہے۔

اس لڑکی کے نام کی نوک سناں پر میں ہوں۔

وہ اسے لینے اس کے اسکول آئے۔ دوپہر کا وقت تھا اور اسکول کی چھٹی ہونے کو تھی (خواب میں تمام انتظامات مکمل ہونا چاہئیں) وہ تھوڑا پہلے نکل آئی تو اس سے کسی نے کہا، تمہارا بھائی باہر بلا رہا ہے۔ میرا بھائی؟ وہ حیران رہ گئی۔ وہ یہاں کیسے آگیا؟ پھر باہر چلی گئی جہاں گاڑی کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔

اس کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹ لیا گاڑی کے اندر۔ وہاں چار تھے اور چاروں (یہ اندازہ اس نے بعد میں لگایا ہوگا لیکن خواب میں اسی وقت آنا لازمی ہے) نوجوان تھے۔ وہ اس سے سوال پوچھتے رہے، بہت سے سوال، بے سروپا سوال ابو اور بھیا اور چاچو کے بارے میں ڈھیر سارے سوال جن کا جواب دیتے دیتے وہ گڑبڑانے لگی تھی تو اس کے منہ میں میں کچھ ٹھونسنے کا احساس اور بھیگا ہوا کپڑا ....

اس کا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا اور سفید یونیفارم پر دھبے لگ گئے تھے۔ نہ جانے کتنی دیر ہو گئی تھی۔ گاڑی کے شیشے سیاہ تھے۔ وہ سو نہیں رہی تھی لیکن پوری طرح جاگی بھی نہیں تھی.... اس نے ہاتھ پاؤں مارے۔ اس کا جی چاہا کہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے، گلا پھاڑ کر چلائے، ان کے بڑھتے ہوئے ہاتھوں پر دانت گاڑ دے.... لیکن اس سے کچھ بھی نہیں ہو پا رہا تھا۔ سوال بھی نہیں .... کہاں لے جا رہے ہو مجھے، کیوں پکڑ لیا ہے، کیا پوچھنا چاہتے ہو، کون ہو تم، اب تو چھوڑ دو مجھے!

خود ہی گاڑی روکی انھوں نے اور ان میں سے جو اس کی بغل میں بیٹھا ہوا تھا، اس کو باہر دھکیلتے ہوئے بولا: عیش کرو، جاؤ، کماؤ!

وہ لڑکھڑاتی ہوئی اٹھی تو دور جاتی ہوئی وہ تیز رفتار گاڑی.... جس میں کیسٹ پلیئر بج رہا تھا اور ایک لڑکے کے گلے میں سونے کی زنجیر تھی.... اس حصار کی طرح لگی جو ٹوٹ گیا۔ اس نے چاروں طرف دیکھا۔ اندھیرا پھیل رہا تھا۔ پتلی پتلی گلیوں اور تنگ مکانوں والی جو بستی ذرا آگے نظر آرہی تھی، یقیناً ان محلوں میں سے ایک تھی، جہاں امی اسے بھیجنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھیں اور وہ بھی اکیلے۔ توبہ!

کتنی دیر وہ اس سڑک کے کنارے بیٹھی رہی ہوگی، میلی کچیلی، بھوکی پیاسی، تھک کر چور نیند سے بے حال اور دماغ جیسے ماؤف۔

جس آدمی نے اس کا کندھا پکڑ کر جھنجھوڑا تھا اور پوچھا تھا بے بی یہاں کس لیے بیٹھی ہو،

اس کے ہاتھوں کا لمس کھردرا تھا اور کپڑوں سے پسینے کی بو اٹھ رہی تھی۔

"کمائی کرنے کے لیے" اس نے وہی جواب دیا تھا جو گاڑی سے باہر دھکیلنے والے لڑکے نے اس سے کرنے کو کہا تھا۔

وہ آدمی اسے اپنے گھر لے گیا تھا اور اس سے ٹیلی فون نمبر بھی لیا تھا۔ اس کے بعد کیا ہوا، وہ نہیں بتا سکتی اس لیے کہ وہ سو گئی اور یہاں خواب میں سفید خلا چھوڑنا پڑے گا۔

گھر واپس آکر دو دن تک وہ اسی طرح نڈھال اور غشی کے سے عالم میں پڑی رہی لیکن اس کے بعد بھی بتا نہیں سکی کہ وہ کون لوگ تھے، اس کے ساتھ ہوا کیا ہے۔

کوئی اگر کچھ پوچھنا چاہے تو اس سے زیادہ اس کے ماں باپ رونے لگتے ہیں۔ میں بھی کوئی سوال نہیں کرتا۔ ان کے گھر سے واپس آنے کے بعد خواب میں بھی نہیں۔

اس لڑکے کے بارے میں بھی نہیں جو بعد میں غلط لڑکا نکلا۔

اسے نام سے پکارا گیا تھا اور جب اس نے نام پر جواب دے کر تصدیق کی تو اسے گاڑی میں گھسیٹ لیا گیا۔ اس کے کپڑے گاڑی میں ہی اتار دیے تھے۔ سوال اس کے بعد پوچھنے شروع کیے تھے۔ سوالوں کے ساتھ ساتھ بلیڈ سے اس کے بازو، اس کی باہیں، اس کی گردن، اس کا سینہ اس کا پیٹ، اس کی رانیں، اس کی ٹانگیں....

"کسے پکڑ لائے؟ یہ تو کوئی اور ہے!" اس نے واضح طور پر اس لڑکے کی آواز سنی جو اس کے برابر میں بیٹھا ہوا تھا، جس کی ٹانگوں سے اس کی ٹانگیں ٹکرا رہی تھیں۔ جس کے ہاتھ سخت اور مضبوط تھے....

گاڑی کی رفتار چند لمحوں کے لیے کم ہوئی اور اسے باہر دھکیل دیا گیا... میں چیخ مار کر اٹھ بیٹھتا ہوں۔ میں اپنے بازوؤں کی طرف دیکھتا ہوں۔ ان پر سرخ لکیر ہے میں اس کو چھو کر دیکھتا ہوں۔ میں نے گرمی دانوں کو سوتے میں کھجالیا ہے....

اور پھر اچانک عمل شروع ہوجاتا ہے، کسی اطلاع کے بغیر اور وہی منظر اپنے آپ دہرانے لگتا ہے.... دروازے کے دوسری طرف سے اتنی کم روشنی آرہی ہے کہ کچھ نظر نہیں آتا، اندر کیا ہے اور کیا نہیں۔

کھڑکی کے چوکھٹے کی لکڑی پر بھورا روغن کیا گیا ہے جس میں پتلی پتلی نسبتاً ہلکے رنگ کی لکیریں، ان خیالی رگوں کی نقل میں جو زیادہ آرائشی سمجھ جانے والے مال میں ہوا کرتی ہیں، اس طرح پڑی ہوئی ہیں کہ لوزاتیں اور جال یا صرف جال کی جھریوں کے ابھار سے تاریک گچھے نمایاں ہوجاتے ہیں، گول یا بیضوی یا تکون، بدلتی ہوئی نشانیوں کا ڈھیر، جس میں ایک عرصے سے انسانی جسم کے خطوط جھلک رہے ہیں: ایک نوجوان عورت بائیں جانب کروٹ لیے ہوئے اور میری طرف منہ کیے ہوئے، ظاہری طور پر ننگی کیوں کہ اس کی چھاتیوں کے ابھار ناف کے نیچے کے بال

نمایاں ہیں ۔ اس کی ٹانگیں مڑی ہوئی ہیں ، الٹی والی سیدھی سے زیادہ ، اور گھٹنا آگے کی طرف نکلا ہوا ہے ، فرش پر نظر آرہا ہے ۔ سیدھا پاؤں لہٰذا الٹے پاؤں کے اوپر رکھا ہوا ہے ، ٹخنے یقینی طور پر ایک دوسرے سے بندھے ہوئے ہیں ، بالکل اسی طرح جیسے دونوں کلائیاں اس کی پیٹھ کے پیچھے بندھی ہوئی ہیں معمول کے مطابق ، ایسا لگتا ہے ، اس لیے کہ دونوں بانہیں جسم کے اوپری حصے کے پیچھے کہیں غائب ہو کر پھر نظر نہیں آتیں : الٹا ہاتھ کہنی کے آگے سے اور سیدھا ہاتھ اس سے تھوڑا اوپر سے ۔

چہرہ ، تھوڑی سے اٹھا کر پیچھے جھکایا گیا ہے اور اس کے چاروں طرف بے حد گہرے گھنے کھلے بالوں کا حاشیہ ہے جو فرش کے ٹائلز پر بکھرے ہوئے ہیں ۔ چہرے کے خدوخال کا اندازہ لگانا مشکل ہے ، کچھ تو چہرے کے رخ کی وجہ سے اور کچھ بالوں کی اس موٹی لٹ کی وجہ سے جو ماتھے سے گرتی ہوئی ایک آنکھ اور ایک گال کی سیدھ میں ہے ۔ جو واحد خط صاف نظر آرہا ہے وہ اس کا دہانہ ہے ، دونوں ہونٹ ناقابل برداشت تکلیف یا دہشت کی طویل چیخ کے لیے کھلے ہوئے ۔ چبھنے والی روشنی کا تکون اس فریم کے دائیں جانب پھیلا ہوا ہے جو پیچ دار بازو والی اس بتی سے نکل رہی ہے جس کا پیندا دھات کی میز کے ایک کونے سے چسپاں ہے ۔ روشنی کے تکون کا زاویہ احتیاط کے ساتھ متعین کیا گیا ہے ، جس طرح تفتیش میں ہوتا ہے ، کہ فرش پر ڈھیر پڑے گلابی گوشت کے خطوط کو اجاگر کر سکے ۔

مگر تفتیش نہیں ہو سکتی : منہہ جو زیادہ دیر سے پورا کھلا ہوا ہے ، کسی نہ کسی کپڑے کی مدد سے کھولا گیا ہوگا ، مثلاً سیاہ زیر جامے کا کوئی حصہ ٹھونس کر ۔ اس کے علاوہ یہ کہ کوئی چیخ ، اگر وہ لڑکی چیختی ، تو لوہے کی جالی والی اس مستطیل کھڑکی کے موٹے شیشے میں سے بھی سنائی دے جاتی

لیکن اب چاندی کے سے بالوں والا ایک آدمی ڈاکٹروں کا سفید کوٹ پہنے ہوئے دائیں جانب سے سامنے آتا ہے ۔ اس کی پشت ہے ، اس لیے اس کے چہرے کی جھلک آکر رہ جاتی ہے اور وہ بھی ایک رخ سے ۔ وہ بندھی ہوئی لڑکی کی طرف آتا ہے اور چند لمحوں کے لیے اس کی طرف دیکھتا ہے ، اس کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے ، اس کے جسم سے لڑکی کی ٹانگوں کا ایک حصہ چھپ جاتا ہے ۔ قیدی لڑکی بے ہوش ہوگی کیوں کہ وہ اس کی آمد پر کوئی رد عمل ظاہر نہیں کرتی ۔ علاوہ ازیں لڑکی کے منہہ میں ٹھنسے ہوئے کپڑے کے کلوز اپ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ایتھر میں ڈوبا ہوا کپڑا ہے جو لڑکی کی اس مزاحمت کو ختم کرنے کے لیے ضروری تھا جس کی گواہی اس کے بکھرے ہوئے بال دے رہے ہیں ۔

ڈاکٹر آگے جھک جاتا ہے ، ایک گھٹنا فرش پر ٹیک کر اور اس کے ٹخنوں پر بندھی ہوئی رسی کھولنے لگتا ہے ۔ لڑکی کا جسم جواب بالکل ڈھیلا پڑا ہوا ہے ، چت ہے جب کہ دو متجسس ہاتھ اس

کے گھٹنے چیر کر، ہموار، بھوری رانوں کو الگ کرتے ہیں جو بتی کی روشنی میں چمک رہی ہیں۔ لیکن جسم کا اوپری حصہ سیدھا نہیں ہے ان بازوؤں کی وجہ سے جو پیٹھ کے پیچھے ابھی تک بندھے ہوئے ہیں۔ اس رخ سے چھاتیاں آسانی سے دکھائی دے رہی ہیں: فوم ربر کی طرح گدیلی اور شاندار طور پر متناسب، وہ باقی سارے جسم سے ہلکے رنگ کی ہیں اور ان کی دل کش بھوسلی نوکیں (جو دوغلی نسل کی لڑکی کے لحاظ سے زیادہ بڑی نہیں ہیں) ذرا سی اٹھی ہوئی ہیں۔

ایک لمحے کے لیے اٹھ کر دھات کی میز سے کوئی ایک فٹ لمبا نوکیلا اوزار سنبھالنے کے بعد ڈاکٹر دوبارہ دو زانو ہو گیا ہے، لیکن دائیں جانب تھوڑا سا آگے، جس کی وجہ سے اس کا سفید کوٹ لڑکی کی رانوں کا اوپری حصہ چھپا رہا ہے۔ اس آدمی کے ہاتھ، جو اس وقت دکھائی نہیں دے رہے، لڑکی کے پیڑو میں جراحی کا کوئی عمل سرانجام دے رہے ہیں، گو کہ اس کی نوعیت کے بارے میں حتمی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے۔ مانا کہ مریضہ کو بے ہوشی سنگھائی گئی ہے، پھر بھی یہ سوال تو نہیں اٹھتا کہ وہ کسی طرح کی اذیت رسانی ہے جو ایک جنونی اس قیدی پر کر رہا ہے جس کو اس کے حسن کی وجہ سے چنا گیا ہے۔ پھر مصنوعی تولید کا امکان رہ جاتا ہے جسے بالجبر کیا جا رہا ہے (جس صورت میں ڈاکٹر کا ہاتھ کا اوزار کیتھیٹر ہوگا) یا پھر کوئی طبی تجربہ بھیانک قسم کا، جو ظاہر ہے کہ قیدی کی مرضی کے بغیر کیا جا رہا ہے۔

سفید کوٹ والا شخص اپنی قیدی کے ساتھ جو کچھ کرنے والا تھا کبھی بھی معلوم نہیں ہو سکے گا کیوں کہ پچھلا دروازہ تیزی سے کھلتا ہے اور ایک تیسرا شخص نمودار ہوتا ہے: وہ طویل قامت شخص ہے جو دروازے پر ساکت کھڑا ہے۔ وہ اعلا لباس پہنے ہوئے ہے اور اس کا چہرہ اور سر پوری طرح سے چھپے ہوئے ہیں کیوں کہ وہ راکھ کے رنگ کا چمڑے کا نقاب اوڑھے ہوئے ہیں جس میں صرف پانچ سوراخ ہیں: ایک منہ کے لیے، دو چھوٹے چھوٹے سوراخ نتھنوں کے لیے اور تھوڑے سے بڑے دو بیضوی سوراخ آنکھوں کے لیے۔ یہ آنکھیں ڈاکٹر پر مرکوز رہتی ہیں جو سیدھا کھڑا ہو جاتا ہے اور الٹے قدموں چلتا ہوا دوسرے دروازے کی جانب ہٹنے لگتا ہے، جب کہ نقاب دار شخص کے پیچھے ایک اور آدمی نظر آتا ہے: ٹھگنے قد کا گنجا جو مزدوروں کے کپڑے پہنے ہوئے کندھے پر اوزاروں کی پیٹی لٹکائے ہوئے ہے، غالباً نل والا یا بجلی والا یا تالے والا ہے۔ پورا منظر تیزی سے گزر جاتا ہے اور کسی تفصیل میں بال برابر تبدیلی نہیں ہوتی۔

اور پھر اچانک وہ اندھیرا جس پر ذرہ برابر تعجب نہیں ہوتا۔

میرے سامنے بس وہی گرد آلود کھڑکی کا شیشہ باقی رہ گیا ہے جس میں میرے چہرے کا دھندلا عکس جھلک رہا ہے اور اس کے پیچھے عمارت کا سامنے والا رخ جس میں لکڑی پر بھورا روغن پھیرا گیا ہے جس میں پتلی لکیریں بلوط کی نقل میں بنائی گئی ہیں....

کس کتاب میں ہے یہ منظر؟ میں یاد کرنا چاہتا ہوں۔ یہ یقیناً Topology of

A Phantom City میں ہے ہوگا۔ "اس سے پہلے کہ میں سو جاؤں، شہر، دوبارہ...." نہیں، نہیں، یہ اس میں سے نہیں ہے بلکہ Project for a Revolution in New York اس طرح شروع ہوتا ہے۔ مجھے یاد آگیا، وہی منظر کسی تبدیلی کے بغیر.... سفید رنگ کی اور کاغذی پشتے والی کتاب تھی جس کے سرورق پر سرخ رنگ سے کتاب کا نام لکھا تھا اور مجھے یاد ہے کہ سیاہ ٹائپ کے حروف سے شہر کی فلک شگاف عمارتوں کا خاکہ بنایا گیا تھا.... منفی ناول کی ایک مثال، آلیں روب گرییے کے بارے میں ممتاز شیریں کے مضمون کا نام اچٹتا ہوا یاد آتا ہے پھر ذہن بالکل خالی ہو جاتا ہے، یکسر خالی.... اس سے آگے کا خلا سفید ہے.... چٹا سفید جو کچھ نہ ہونے کا رنگ ہے۔

لوہے کے آنکڑوں میں جس نے مجھے جکڑا ہوا ہے، تھوڑی دیر کے لیے مجھے کھول دیتا ہے کیوں کہ اپنی خواہش کے مطابق میں ڈبو کھیلنے جانا چاہتا ہوں۔

میں اپنے گھر کی گلی سے مڑتا ہوں اور کوڑے کے ڈھیر سے آگے، فوٹو اسٹیٹ والی دکان، گاڑیوں کے مرمت کے گیراج اور افغان روٹی کے تندور سے آگے ڈبو کی میز بچھی ہوئی ہے۔ میں دستہ گھماتا ہوں، پہلے آہستہ، پھر تیز.... دستے سے لگی سلاخ میں پانچ شبیہیں ہیں۔ انسان نہیں، انسانوں کی بھدی اور سستی نقلیں۔ ان کو گھما کر گیند پر چوٹ لگانی ہے اور اسکور کرنا ہے۔ دستہ میرے ہاتھ میں ہے۔ لیکن گیند حرکت نہیں کرتی۔ میرے آتے ہی ایک شبیہہ ٹوٹ جاتی ہے۔ پلاسٹک کے بدرنگ ہاتھ پاؤں جھڑ گئے ہیں۔ صرف منہ رہ گیا ہے۔ بار بار دستہ گھمانے پر بھی وہ اسکور نہیں کر سکتا۔ دستہ گھومتا ہے تو میں اس کی طرف دیکھتا ہوں اور ایک سنسناتے ہوئے لمحے میں پہچان جاتا ہوں....

یہ خواب ہے، خواب ہے۔ یہ افسانہ ہے، افسانہ.... تم باور کراتے ہو۔ اگر یہ خواب ہے تو اس شہر کو اٹھا کر اپنی بیاض خواب میں رکھ لیتا ہوں اور اگر، جس طرح مجھے بتایا گیا ہے، یہ افسانہ ہے تو میں اس کے انجام کا منتظر۔

حمید نسیم - انتظار حسین

کلام میرا جی - ایک مباحثہ

[پاکستان میں حمید نسیم کی کتاب "پانچ جدید شاعر" پر انتظار حسین کا تبصرہ "ڈان" کے ۷ / جولائی کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ اس پر تبصرہ نگار اور حمید نسیم کے درمیان کچھ تبادلہ ، خطوط و خیالات ہوا۔ ماہنامہ "علامت" کے شکریے کے ساتھ ان مضامین کے وہ حصے یہاں شائع کیے جا رہے ہیں جن کا تعلق اردو بولنے والوں کی اکثریت کے Ethos اور Sensibility سے ہے۔ (ادارہ)]

انتظار حسین : - "حمید نسیم بلاشک و شبہ ایک اعلیٰ پائے کے نقاد ہیں۔ انھوں نے ادبی روایت کے عظیم سرچشموں سے سیر حاصل تمتع کیا ہے جس سے انھیں شعر کی ماہیت کے متعلق ایک خاص بصیرت اور شعور حاصل ہوئے ہیں۔ مگر یہاں ایک مشکل بھی آپڑتی ہے۔ انھیں خود اعتراف ہے کہ وہ راسخ العقیدہ مسلمان ہیں۔ یہاں مشکل یہ ہے کہ مسلمانوں کا باہم یکجا ہو جانا ایک میان میں دو تلواروں والی بات ہے۔

حمید نسیم کی تنقیدی تحریروں کے لیے سراپا تحسین ہونے کے باوصف مجھے یوں لگتا ہے کہ ان کے اندر کا پکا مسلمان بعض اوقات روشن خیال پڑھے لکھے حمید نسیم پر غالب آجاتا ہے۔ اسی بنا پر تو ن - م - راشد نے بھی جل کر انھیں مولوی حمید نسیم کا خطاب دے ڈالا تھا۔

میرا جی کا جو کلام انھیں طبعاً ناگوار گزرتا ہے طوعاً و کرہاً اس کا تجزیہ کر چکنے کے بعد وہ ہمیں بتاتے ہیں کہ اس دوران انھوں نے اپنے اندر کے روحانی شخص کو پورے طور پر دبوچ رکھا تھا۔ تاہم بحث و تمحیص کے دوران ان کے بعض تبصرے اس امر کی تکذیب کرتے نظر آتے ہیں۔ مثلاً رواداری میں وہ الف لیلیٰ کو فحش کتاب قرار دے دیتے ہیں۔ جو اس وقت وجود میں آئی جب ان کے خیال میں مسلمانوں کا اجتماعی شعور متعفن ہو چکا تھا۔ اپنے اسی معاشرتی رجحان کی بنا پر جو ایک مسلمان کی حیثیت سے ان کے اندر راسخ ہو چکا ہے۔ وہ میرا جی کی ان نظموں کو رد کر دیتے ہیں جن کا مزاج "ہندوانہ" ہے۔ وہ انھیں بالاصرار "کویتا" کہتے ہیں۔ اور اس کی توجیہ یوں کرتے ہیں کہ وہ نظمیں اس معاشرتی روایت میں رچی بسی ہوئی ہیں جسے اردو کی ادبی روایت نے کبھی قبول نہیں کیا۔ ساتھ ہی وہ بہت کاوش سے ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ کویتائیں مقدار کے اعتبار سے ان کے محبوب شاعر کے کلام کا ایک بہت معمولی سا حصہ ہیں۔ اور اس کے شاعرانہ مزاج کی صحیح عکاس بھی نہیں ہیں کہ اس کا خاص اسلوب تو راشد کے مقابلے میں بھی زیادہ مفرس تھا۔

یہاں انھوں نے کمال سہولت سے میراجی کے اس اعتراف کو بھی نظر انداز کر دیا ہے کہ وشوامتر نے اس کے دل ودماغ کو اس حد تک متاثر کیا تھا کہ وہ عملاً برہمن بن گیا تھا۔

تاہم ان مواقع کو نظر انداز کرتے ہوئے جہاں حمید نسیم اپنے اندر کے کٹر مسلمان کو اپنے بس میں نہیں رکھ سکے ان کا تجزیہ بہت بصیرت افروز ہے۔ شاعری سے اپنے گہرے شغف اور شعری نزاکتوں سے کماحقہ وشناسائی کے باعث وہ ایسے بھرپور استدلال سے کام لیتے ہیں کہ ہمیں بھی ساتھ بہالے جاتے ہیں۔" (روزنامہ ڈان۔ ۷/ جولائی ۹۵ء ترجمہ: ادارہ علامت)

حمید نسیم:۔ "میں سمجھتا ہوں ہمارے ہاں ایک تو وہ اردو نمو پذیر رہے گی جو میر و مرزا۔ آتش و مومن۔ حالی اور محمد حسین آزاد کی ہے۔ اسے میں اردوئے معلی کہتا ہوں اور دوسری سرائیکی اور موجودہ اردو کے آمیزے سے صورت پذیر ہوگی اور فروغ پائے گی۔ اردو زبان نے ابتدا میں پرتگالی اور دوسری یورپی زبانوں سے لفظ لیے: کمیرہ۔ نیلام وغیرہ۔ انگریزی سے تو ان گنت الفاظ لیے جیسے ریلوے اسٹیشن۔ ریفریجریٹر۔ ٹائپ۔ انجن۔ مشین۔ آٹوگراف۔ یہ تو اب خالص اردو کا حصہ بن چکے ہیں۔ آنے والے دنوں میں۔ ابتدا اس عمل کی ہو چکی ہے۔ نئی اردو ہماری دھرتی کی باس والے تصوف کے آہنگ کو اپنے اندر جذب کرلے گی اور خالص اردو اور یہ نئی اردو ایک دوسرے کو مسلسل نئی توانائی نیا تنوع اور جمال عطا کرتی رہیں گی۔ اسی بات سے خیال آیا کہ میں نے میراجی پر اپنے مقالے میں شاید کچھ باتیں ایسی لکھ دی ہیں جو صریح اور واضح نہیں سو ان کے بارے میں کچھ توضیحات یہاں پیش کر دوں۔ میں نے لکھا ہے کہ مسلمان برصغیر میں بارہ سو برس سے آباد ہیں۔ متحدہ ہند میں ہندوؤں سے سیاسی اختلافات رونما ہونے سے پہلے ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی تعلقات بہت اچھے تھے۔ دوست دار، ملنسار، ہمسایوں جیسے۔ وہ ہمارے اور ہم ان کے تہواروں میں شادی بیاہ کی تقریبوں میں شریک ہوتے تھے۔ مگر ہماری اردو زبان ہی نے نہیں کسی علاقائی زبان بھی ہندوؤں کے اساطیر کو اپنایا نہ ان کی روحانی روایت کی علامتوں اور تلمیحوں اور ان کی مذہبی رسوم اور عبادات کے اسما کو قبول کیا۔ آپ خود دیکھیے۔ آپ میرٹھ ضلع کے ایک ہندو اکثریت والے قصبے میں پل بڑھ کر جوان ہوئے۔ آپ کو ہندو روحانی روایت سے شنکر کی ادویتا۔ میرابائی۔ کالی داس۔ اور بھرتری ہری کی برتر شاعری سے اتنی محبت ہے جتنی مجھے ہے۔ لیکن آپ کی تحریر میں پوجا۔ پرارتھنا۔ ارتھی۔ وایو۔ اندرا۔ برہما۔ وشنو۔ شو مہاراج جیسے لفظ اور نام کہیں نظر نہیں آتے۔ اردو کے نامور ہندو شاعروں اور نثرنگاروں نے بھی کبھی ہندو مذہبی رسوم میں مستعمل الفاظ اور اصطلاحیں اپنی نظم ونثر میں شامل نہیں کیں۔ رتن ناتھ سرشار کا "فسانۂ آزاد" اور دیاشنکر نسیم کا "قصہ گل بکاؤلی" میرے اس ادعا کی تصدیق کرتے ہیں۔ اسی حقیقت کے پیش نظر میں نے میراجی کے خالص ہندی اساطیر والے کلام کے بارے

میں کہا تھا جس کا آپ نے ذکر فرمایا۔ اس ادعا کی توضیح کچھ یوں ہوگی:

۱۔ اس مضمون میں میں نے کہا ہے کہ ایک حصہ میراجی کے کلام کا وہ ہے جس کا وہ اپنی میرا سین کی روحانی۔ معاشرتی اور اسطوری دنیا میں چلا ہے۔ اور پھر انھوں نے اس دنیا کو جو اپنے مقام پر سراسر حسن و جمال ہے نئے زاویہ، نظر اور نئے تخلیقی جمال کے ساتھ پیش کیا۔

۲۔ دوسرا حصہ میراجی کے کلام کا وہ ہے جس میں انھوں نے مولانا چراغ حسن حسرت اور مولانا سالک جیسے معترضین کو راست جواب دینے کے بجائے متعدد نظمیں ایسی تخلیق کیں جن میں انھوں نے فارسی آمیز اردو ہماری زبان کی مشکل بحروں پر اپنی قدرت کاملہ کا ثبوت دیا۔

۳۔ تیسرا اسلوب میراجی کا وہ ہے جس میں انھوں نے وہ زبان استعمال کی ہے جو میر و مرزا کے سہل ممتنع والے کلام کی زبان ہے۔ بس اس میں کہیں کہیں کوئی سہل اور خوش صوت ہندی لفظ استعمال کیا ہے۔ یہی اسلوب میراجی کا اصل اسلوب ہے۔ اور میراجی کی بیش تر شاعری اسی زبان میں ہے۔

میں نے ہندی اساطیر پر مبنی میراجی کی نظموں کو کویتا کہا تو طنز سے نہیں محبت سے کہا ہے۔ کہ وہ نظمیں میراجی نے میرا سین کی جانی پہچانی دنیا اور اس کی ریت کے بارے میں کہی ہیں۔ اپنی محبوبہ کی خدمت میں بھینٹ چڑھانے کے لیے۔ میرا سین ان کو سنتی تو گویا ہی کہتی۔ میں نے کٹھک پر میراجی کی نظم کی جس انس اور تپاک سے جس دلی لگاؤ سے توضیح کی ہے اگر آپ اسے ایک بارے میری عاشقانہ نظر سے پھر پڑھیں تو آپ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ میرے اندر ہمہ وقت چوکس "دین کا امین" اس نظم اور اس جیسی دوسری نظموں کے آہنگ ان کی سچائی اور صناعی کا دل دادہ ہے۔ "مولوی" میں صرف "لب جوبارے" جیسی نظموں کے معاملے میں ہوں۔ آج کل مغربی نظم و نثر میں جو حیا باختگی ہے اس کو آپ بھی پسند فرمائیں گے۔ اور آپ بھی یہ نہیں کہیں گے کہ نوجوان دوشیزہ کی پیشاب کی دھار پر میراجی کی نظم جمالیاتی سطح پر یعنی شعری جمالیات کی سطح پر قابل قبول ہے۔

This is not the stuff of Poetry

زمین شور سنبل بر نہ آید

میراجی کے ہاں جو ہندی اساطیر کی اچھی کویتائیں ہیں۔ اور کویتا بڑا جمیل بڑی خوش صوت لفظ ہے۔ ان کے بارے میں چند اقتباسات اپنے مقالے سے آپ کی خدمات میں پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔

اقتباسات از "پانچ جدید شاعر"

۱۔ صفحہ ۱۶۲۔ "میراجی کا سراپا۔ جب کبھی میری آنکھوں کے سامنے آتا ہے تو میں اسے

۱۹۳۸ء کے لاہور یا ۱۹۴۴ء کی دلی میں نہیں دیکھتا۔ مجھے وہ ہمیشہ تین ساڑھے تین ہزار برس پہلے کے وسطی ہند کے جنگلوں میں یا کوہ ہمالہ کے سلسلے میں کسی دامن کوہ میں تن پر بھبوت ملے دھیان میں مگن دکھائی دیتا۔ شاید میرے لاشعور میں چھپا جبلی آلائشوں سے منزہ۔ ظاہر و باطن میں سچا۔ پاک اور صاف میراجی۔ جسے میری روح نے دیکھا تھا۔ میں سمجھتا ہوں یہی اصل روپ تھا میراجی کا۔ میں دیکھتا ہوں کہ اس کی آنکھوں سے تیز روشنی کی ایک لہر رات کی تاریکی میں بجلی کی تیزی سے آسمان کی طرف اٹھتی ہے اور بہت دور اوپر جاکر تاروں کی جھلمل میں جذب ہو جتی ہے۔" (وشوامتر سے میراجی کا برندا بن ؟؟)

۲۔ صفحہ ۱۶۴۔ "یہ نئی آگہی جبلی خواہش میں مخفی گن اوگن کی کی تلاش اور ان کا سچا کھر بیان۔ یہ ہماری ادبی روایت کے لیے اچنبھے کی بات تھی۔ اس کے لیے الفاظ کا مطلوبہ ذخیرہ تھا نہ کوئی سلجھا ہوا پیرایہ۔ بیان موجود تھا۔ دنیا میں صرف دو زبانیں ایسی ہوئی ہیں جو انسانی تجربے کی تمام جہتوں کا احاطہ اب سے تین ہزار برس پہلے کرنے کے لیے لفظ اور لہجہ رکھتی تھیں۔ یونانی زبان اور سنسکرت۔ اب سے ڈھائی ہزار برس پہلے یونان میں یکایک مابعد الطبیعیاتی تحقیق و تفکر کا آغاز ہوا۔ ایک سے ایک بڑا فلسفی یکے بعد دیگرے سامنے آیا۔ کسی کو اپنے ادق سے ادق مجرد سے مجرد خیال کے اظہار میں کوئی مشکل نہ آتی۔ سنسکرت میں اپنشد مسیح علیہ السلام کی پیدائش سے نو برس پہلے رشیوں نے لکھنا شروع کیے۔ پھر ویشنو اور بھگوت پر انٹر لکھے گئے۔ چارواکا دہریتی مکتب فلسفہ پورے ولولے کے ساتھ آیا۔ مہاویر جین نے کائنات کا میکانکی تصور پیش کیا۔ مہاتما بدھ نے جیون دکھ کے دارو اور نروان پانے کی بات کی۔ یونانی منطق سے کہیں وسیع تر منطق کا نظام مرتب کیا گیا۔ چھ بڑے فلسفیانہ مکتب مرتب ہوئے۔ مجرد افکار کے لیے ایک نہایت بلیغ زبان اور مفردات کی حامل فرہنگ ان سب خیالات کی ترسیل کے لیے موجود تھی۔ لیکن شرق اوسط کی سب زبانیں۔ عربی۔ عبرانی۔ ایرانی۔ ترکی۔ فارسی۔ وہ ساری زبانیں اور ہماری مقامی بھاشائیں بیش تر بیانیہ زبانیں ہیں۔ (یہاں آپ دیکھیے۔ یہ بات کتنی صراحت سے سامنے آتی ہے کہ میں سنسکرت اور یونانی زبان میں لکھے گئے فلسفہ و حکمت اور شعر و ادب کا ادنیٰ مداح ہوں۔ ان زبانوں کے ادب میں ان کی اساطیر سے مجھے کوئی الجھن پیش نہیں آتی) ۔"

۳۔ صفحہ ۱۶۵۔ "ان (میراجی) کے سارے کلام کی قدر متعین کرنے سے پہلے میں ایک بات میراجی کے اسالیب کے بارے کہنا چاہتا ہوں۔ مجھے ان میں تین بڑے اور ایک دوسرے سے الگ اسلوب ملے ایک اسلوب پر ہندی زبان اور اساطیر کا غلبہ ہے۔ اور مزاج اردو کی روایت Mainstream سے دور کا تعلق بھی نہیں رکھتا۔ دوسری انتہا پر وہ اسلوب ہے جہاں ان کے کلام میں (رقص غزالیں) فارسی راشد اور فیض کے اسلوب سے بھی زیادہ وافر نظر آئی۔ بیچ میں دونوں نہایتوں کے ایک معتدل نرم خیز اسلوب ہے ہندی بھی ہے فارسی بھی ہے۔ اور اس

Category میں دو تین Sub-strems ہیں ہندی اور فارسی کے باہمی تناسب کی بنا پر۔

پہلے میں اس اسلوب کا ذکر کروں گا۔ جس میں علامتیں استعارے۔ کردار تلمیحات ایک ایسی تہذیبی اور روحانی روایت سے لی گئی ہیں جس سے اردو بولنے والے شناسا نہیں۔ اور جو برصغیر میں بارہ سو برس غیر مسلم آبادی کے ساتھ رہ کر بھی ہماری ادبی۔ روحانی اور معاشرتی روایت سے دور رہے ہیں۔ ہم نے یہاں کے پھل اور ترکاریاں اپنالیں۔ یہاں کی بھجیا۔ اور دال ساگ اور ہنڈیا۔ چائی اور چوکا بھی ہمارے ہاں آگئے۔ مگر ہم نے نماز کو پوجا۔ دعا کو پرارتھنا نہیں کہا۔ صبح کو اوشا بھی کسی مسلم روایت میں نہیں دیکھا۔ مسلم بنگلہ زبان پر سنسکرت کا اثر نمایاں ہے مگر وہاں بھی پانی کو پانی کہا جاتا ہے۔ جل یا جول نہیں کہا جاتا۔ آسمان کو آسمان ہی کہا جاتا ہے۔ آکاش یا انبر نہیں۔ جنازے کو ارتھی بھی ہمارے کسی علاقائی زبان میں نہیں کہا جاتا۔ اور مجھے یقین ہے یہ اساطیر یہ الفاظ اردو زبان کا حصہ کبھی نہیں بن پائیں گے۔ جب ایک ملک تھا تو نہ بن پائے (اس مقام پر میں نے مختار صدیقی مرحوم کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ جو نظمیں انھوں نے میراجی کی اتباع میں کہیں۔ ہندی اور اردو کے آمیزے سے۔ ان کو کوئی معتبر مقام ہماری عصری شاعری میں نہیں مل سکا۔ مختار صدیقی جتنا معتبر ہے وہ اپنی سہ حرفی کی وجہ سے ہے اور بس!)"

رہی کویتا کی بات تو ان نظموں کا مزاج نصف صدی گزر جانے کے بعد بھی ہماری جدید اردو نظم کے عام مزاج سے بہت دور ہے۔ میراجی کے بعد کے دور میں کئی شعرا نے ان کی نفسیاتی شاعری کی روایت کو آگے بڑھایا مگر کسی اردو شاعر نے ہندی اساطیر کو اپنی شعری علامتیں اور کردار نہیں بنایا۔ آیندہ بھی کوئی شاعر نہیں بنائے گا۔ کہ وہ اساطیر ہمارے تہذیبی مزاج Ethos اور اجتماعی Psyche میں نہ کبھی شامل ہوئے ہیں نہ ہوں گے۔ لیکن میں نے ان کو برتر کویتاؤں کی آفاقیت کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔ میرا اسلامی روحانی مزاج کائنات گیر محبت ہے۔ ملائیت نہیں ہے۔ آپ نے میراجی پر میرے مضمون کے ابتدائی جملے دیکھے۔ میں نے اس مضمون میں جو لہجہ اختیار کیا وہ اس جوگی شاعر اس بڑے Genius کے اس حیلہ۔ وجدان کا آئینہ دار ہے جو میرا سین کے عشق میں میرا سین کے کلچر اس کے دھرم اس کی دیومالا میں کھو گیا۔ یہ حصہ بھی بڑا عظیم ہے اور میں نے اس کی شاعری پر بھی میراجی کو نذرانہ۔ سپاس پیش کیا ہے۔ مگر حقیقت الامری یہ ہے کہ میراجی بھی راشد کی طرح کبھی اپنے موروثی کلچر اور روحانی روایت اور اس کی زبان کو اپنے اندر سے نکال نہیں سکے۔ وہ ہمہ وقت غالب قوت کی طرح ان کے اندر کار فرما اسی قوت نے " سمندر کا بلاوا " جیسی شاہکار نظم کہلوائی۔ دنیا کا کوئی تخلیقی عمل اپنی Environment سے مطلقاً آزاد نہیں ہوسکتا۔ حقیقت مطلق سے وصال کے بعد آدمی پھر اپنی معاشرتی Environment میں آجاتا ہے۔ ہر قوم کا ایک تہذیبی اور معاشرتی مزاج ہوتا

ہے۔ خوب و ناخوب کے معیار ہوتے ہیں۔ ان سب کے مجموعے کے لیے انگریزی میں ایک جامع Ethos ۔ ہمارے Ethos کے مطابق عمل تخلیق کے معنوی حصے کے خوب و ناخوب کا معیار میراجی پر مقالے کے آخری صفحات میں بیان ہوا ہے۔"

اور اے بہت پیارے بھائی، فرزند کتنا زیادہ صحیح ہے، مدنی پر آپ نے ایک فقرہ بھی نہیں لکھا۔ آپ تو نیک دل اور دیانت دار ادیب ہیں ایک بار اس کے کلام کو پھر میری نظر سے پڑھ لیجیے۔ اسے پنجاب میں ایسا اجنبی نہیں رہنا چاہیے۔

حمید نسیم۔ کراچی ۷/ جولائی ۹۵ء

انتظار حسین:۔ حمید نسیم صاحب نے اپنے خط میں بعض ایسی باتیں چھیڑی ہیں جو ہمارے لیے ثقافتی سطح پر ایک مسئلہ چلی آتی ہیں۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ انھوں نے جو کچھ کہا ہے اسے مختصر بیان کر دینا چاہیے۔

حمید نسیم صاحب نے اس خط میں میراجی کی شاعری کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا حصہ اس شاعری پر مشتمل ہے جہاں شاعر ایک دیومالائی دنیا میں گم نظر آتا ہے، دنیا جس کا رشتہ اس کی خیالی / واقعی محبوبہ میرا سین سے ہے۔ یہ دنیا کیا ہے، بس شاعر کا تخلیق کردہ ایک عالم جہاں ہے۔

دوسرے حصے میں وہ نظمیں شامل ہیں جن میں شاعر نے "فارسی آمیز اور کلاسیک شاعری کی فرہنگ اور اردو کی مشکل سے مشکل بحروں پر اپنی قدرت کاملہ کا ثبوت دیا ہے۔"

تیسرے حصے میں وہ کلام آتا ہے جس میں سہل ممتنع والی زبان استعمال ہوئی ہے۔ "یہی اسلوب میراجی کا اصل اسلوب ہے۔ اور میراجی کی بیش تر شاعری اس زبان میں ہے۔"

پہلے حصے والی شاعری میں جو ہندی آمیز زبان استعمال ہوئی ہے وہ حمید نسیم صاحب کی دانست میں میراجی کا میرا سین کو ایک ہدیہ عقیدت ہے۔ انھیں اس بات سے اتفاق ہے کہ ان نظموں میں بہت جادو ہے لیکن وہ ان نظموں کو میراجی کی شاعری میں کوئی وقیع مقام دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ پھر یہ کہ یہ نظمیں ان کے خیال میں اردو کی ادبی روایت سے بھی میل نہیں کھاتیں۔ سو وہ اس سارے کلام کو اردو شاعری کا حصہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ پس وہ ان نظموں کو نظمیں نہیں، کویتائیں کہیں گے۔

اپنے اس رویّے کے جواز کی تلاش میں وہ شاعری کے دائرے سے نکلتے ہیں اور اس برِصغیر میں مسلمانوں کی بارہ سو سالہ تاریخ پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہیں اور نتیجہ نکالتے ہیں کہ اس سارے عرصے میں ہندو دیومالا اور ریت رسموں کے خلاف مسلمانوں کی طرف سے مستقل مزاحمت ہوتی رہی۔ اس خیال سے انھیں کتنی تسکین ہوتی ہے۔ ان کا استدلال کچھ اس طرح کا ہے کہ مسلمانوں نے ہندو ہمسایوں کے ساتھ بہت امن و آشتی کے ساتھ گزر بسر کی۔ ان کے تہواروں اور

تقریبوں میں بھی خوشی خوشی شریک ہوتے رہے۔ لیکن انھوں نے نماز کو کبھی پوجا نہیں کہا اور دعا کے لیے پرارتھنا کا لفظ استعمال نہیں کیا۔

حمید نسیم صاحب کا خیال ہے کہ صرف مذہبی لغت پہ موقوف نہیں، وہ ساری زبان وہ سارا محاورہ جو ہندو ثقافت کے رنگ میں رنگا ہوا ہے نہ صرف اردو کے لیے بلکہ ان علاقائی زبانوں کے لیے بھی کبھی قابل قبول نہیں ہوا جو مسلمانوں کے اثر میں پروان چڑھی ہیں۔ چناں چہ ان سب زبانوں میں آسمان کو آسمان ہی کہا جاتا ہے اور پانی کو پانی۔ مسلمانوں والی بنگلہ تک میں پانی پانی ہی رہتا ہے۔ کوئی اسے جل یا جول نہیں کہتا۔ حمید نسیم صاحب دعوے کے ساتھ کہتے ہیں کہ اس قسم کے الفاظ اور دیومالائی تصورات اردو میں کبھی بار نہیں پاسکیں گے اس لیے کہ ہمارا اجتماعی طرزِ احساس انھیں قبول کرنے سے انکاری ہے۔

حمید نسیم صاحب نے اس سلسلے میں مختار صدیقی کی مثال پیش کی ہے جنھوں نے ایک زمانے میں ایک ایسی زبان میں نظمیں کہی تھیں جو اردو ہندی کا آمیزہ تھی، لیکن ان کے خیال میں ان نظموں کو نئی اردو شاعری میں کوئی مقام حاصل نہیں ہوسکا۔ مگر خیر انھوں نے مختار صدیقی کے ساتھ ان کی "سی حرفی" کا لحاظ کرتے ہوئے تھوڑی رعایت برتی ہے۔ اور اس حوالے سے ہم اس بزرگ کو شاعر مان لیں تو حمید نسیم صاحب زیادہ برا نہیں مانیں گے۔

ویسے حمید نسیم صاحب دیومالا کے ذوق سے عاری نہیں ہیں۔ سنسکرت اور یونانی میں اس حوالے سے جو کچھ لکھا گیا ہے اسے وہ پڑھتے ہیں اور لطف لیتے ہیں۔

مگر ان کی دانست میں اردو ادیبوں کے پڑھنے کی یہ چیزیں نہیں ہیں۔ ہاں اگر کوئی ادیب اپنی ادبی روایت سے اخراج کا خطرہ مول لینے کے لیے تیار ہے تو پھر بے شک وہ اس ممنوعہ پھل کا ذائقہ چکھ لے۔ میراجی پر حمید نسیم کا یہ مضمون سوغات شمارہ میں شائع ہوا ہے اس میں کہیں بھی ایسی کوئی بات نہیں کہی گئی ہے (م۔ا)

حمید نسیم صاحب نے ہماری ادبی روایت کا تعین درست کیا ہے۔ ہماری ادبی روایت غالب حد تک عجمی روایت ہے۔ اس میں تو کوئی شک ہے ہی نہیں۔ لیکن میں اپنے قبلہ حمید نسیم صاحب کی خدمت بابرکت میں ایک گزارش کرنے کی جسارت ضرور کروں گا۔ اس فاضل اجل سے میں یہ عرض کروں گا کہ ہماری ادبی روایت عجمی روایت بے شک ہے مگر اس کی عجمیت کے خلاف بغاوتیں بھی ہوتی رہی ہیں۔ اور یہ بغاوتیں بھی ہماری روایت کا حصہ ہیں۔ آخر ہم نظیر اکبر آبادی کو اپنی ادبی روایت سے دیس نکالا تو نہیں دے سکتے۔

حمید نسیم صاحب اردو کے کسی لکھنے والے سے یہ توقع نہیں رکھتے کہ وہ دیوتاؤں اور اوتاروں کا ذکر کرے گا۔ غالباً یہاں انھوں نے یہ فرض کرلیا ہے کہ اردو کا ہر ادیب مسلمان ہے،

لیکن قبلہ گستاخی معاف نظیر اکبر آبادی نے دیوتاؤں اور اوتاروں کا ذکر بڑی فراخ دلی سے کیا ہے اور ایسی زبان میں جو معیاری مفرس اردو سے لگا نہیں کھاتی۔

یہ لیلا ہے اس نند للن من موہن چھپا کی
رکھ دھیان سنو ، ڈنڈوت کرو ، جے بولو کشن کنھیا کی

اس کے باوجود ان نظموں کو اردو والے نظمیں ہی کہتے ہیں۔ کویتائیں نہیں کہتے۔

مگر اس سے بھی بڑھ کر یہ واقعہ ہے کہ ایک نامی گرامی نعت گو شاعر بھی اس راہ پر چل نکلا۔ نعت اس طرح لکھی کہ اس میں ہندو تہواروں اور اوتاروں کے ذکر کو بھی شامل کر لیا۔ محسن کاکوروی کی جس نعت کو بہت شہرت حاصل ہوئی یوں شروع ہوتی ہے۔

سمتِ کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل
برق کے کاندھے پہ لاتی ہے صبا گنگا جل

یہ بادل جو گرجتا برستا متھرا کی طرف دوڑ رہا ہے وہ اس لیے کہ وہاں جا کر اسے سری کرشن جی کو برکھا کا نذرانہ پیش کرنا چاہے۔

دیکھیے ہوگا سری کرشن کا کیوں کر درشن
سینۂ تنگ میں دل گوپیوں کا ہے بیکل
راکھیاں لے کے سلونوں کی برہمن نکلیں
تار بارش کا تو ٹوٹے کوئی ساعت کوئی پل

مگر یہ اس کی آخری منزل نہیں ہے۔ منزل مقصود بہت آگے ہیں۔

کیا جھکا کعبے کی جانب کہ ہے قبلہ بادل
سجدے کرتا ہے سوئے یثرب و بطحا بادل
چھوڑ کے بتکدۂ ہند و صنم خانۂ برج
آج کعبے میں بچھائے ہے مصلہ بادل
بحرِ امکاں میں رسول عربی دُرِّ یتیم
رحمت خاص خداوند تعالیٰ بادل

اچھا آخر میں مجھے حمید نسیم صاحب سے ایک معذرت بھی کرنا ہے۔ انھیں شکایت ہے کہ میں نے کتاب کے چار مقالوں کا تذکرہ کیا۔ مگر پانچویں میں مقالے کو جس میں حامد عزیز مدنی کی شاعری سے بحث کی گئی تھی گول کر دیا۔ ان کی دانست میں یہ اس شاعر کے ساتھ ناانصافی ہے۔ نیز ان کا خیال ہے کہ پنجاب کے ادبی حلقوں نے بالعموم حامد عزیز مدنی سے بے اعتنائی برتی ہے۔ مگر اب تو حامد عزیز مدنی کو حمید نسیم صاحب کے منتخب پانچ شاعروں کے بیچ جگہ مل گئی ہے۔ اب لاہور میں کون مائی کالال اس شاعر کو نظرانداز کرنے کی جرأت کر سکتا ہے۔"

حمید نسیم:۔ "انتظار صاحب کو میرے مضمون کے یہاں وہاں سے سرسری مطالعے سے یہ گمان گزرا ہے کہ مجھے ہندوانہ اساطیر اور زبان اور علامتوں سے کد ہے چناں چہ جو ادیب یا شاعر انھیں اپنی نظم و نثر میں استعمال کرے میں اسے اردو کی ادبی روایت mainstream سے خارج قرار دیتا ہوں۔ میں نے میراجی پر اپنے مضمون میں یہ تعارفی فقرے لکھے ہیں۔

"یہ شاید میرے لاشعور میں چھپا جبلی آلائشوں سے منزہ ظاہر و باطن میں سچا۔ پاک اور صاف میراجی ہے وہ میراجی جسے میری روح نے دیکھا۔ میں سمجھتا ہوں یہی اصلی روپ تھا میراجی کا۔ میں دیکھتا ہوں کہ اس کی آنکھوں سے تیز روشنی کی ایک لہر رات کی تاریکی میں بجلی کی تیزی سے آسمان کی طرف اٹھتی ہے اور بہت اوپر جاکر تاروں کی جھلمل میں جذب ہو جاتی ہے پھر میری زبان پر میراجی کا وہ بہت سجل بہت ارفع سطح کا گیت آجاتا ہے۔"

ایک ہی نام پکارے مورکھ ۔ جگ میں لاکھ سہارے
گھوم رہے ہیں ستارے سارے۔ سندر سندر پیارے پیارے
ان کے بھید نہ پائے کوئی ان کے بھید ہیں نیارے
ایک ہی رنگ ہے ان میں تمھارا۔ باقی رنگ ہمارے

"میں اب کیا کہوں۔ میں تو ایک بے توفیق آدمی ہوں۔ مگر مجھے اس گیت سے بو باس اس رت اس رفعت کی آتی ہے جہاں آریا قوم کے رشیوں نے اپنے نئے جنت نظیر وطن میں رگ وید کی مناجاتیں گائیں۔ وہ بھی اوپر کے بھید جاننا چاہتے تھے جیسے ہمارا میراجی دیکھنا چاہتا ہے۔ ان کے سینے بھی کویتا سے معمور ہو جاتے تھے اور پھر یہ سجل سروں کی ندی بہنے لگتی تھی۔ کبھی نرم خرام۔ کبھی تیز رو۔ بالکل ویسے ہی جیسے میراجی اپنی اوپر والی دنیا سے یا اس دنیا کے مالک سے کہتا ہے کہ ان ستاروں میں تمھارا تو بس ایک رنگ ہے۔ ان کی روشنی! باقی تو ان کی ساری باتیں ہمارے جیسی ہیں۔ وہی تنہائی۔ وہی دائمی جدائی۔ وہی بے کراں خلاؤں میں آوارگی۔ وہی نارسائی۔

اس اقتباس میں ہندومت سے یا رگ وید سے چلنے والی عظیم جذبہ و فکر کی روایت کے خلاف کوئی کینہ کوئی تعصب نظر آتا ہے؟

میں نے میراجی کی alien ثقافتی روایت اور ہندی آمیز شعری زبان والی برتر نظموں کی کمال صراحت سے تعریف کی ہے۔ تفصیلی سطح پر۔ اس کی دو ایک مثالیں یہاں پیش کرتا ہوں۔

میرا مسلم قوم کے چودہ سو سالہ نفسی اجتماعی کا مطالعہ اور تجزیہ مجھے بتاتا ہے کہ مسلمان قوم جہاں جہاں گئی اس نے مقامی آبادی کا لباس۔ اس کے موسمی تہوار۔ اس کی بول چال کی زبان۔ اس کا رہن سہن کا اسلوب اپنالیا۔ لیکن مقامی غیر اسلامی رسوم عبادات اور اصطلاحات سے مکمل اجتناب کیا۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ اپنا الگ روحانی وجود اور اپنی تہذیبی اور جمالیاتی شناخت برقرار رکھنے کے لیے یہ ضروری تھا۔ ہندوستان میں سینکڑوں فاتح اقوام آئیں۔ مگر سب ایک دو

سو برس کے عرصے میں ہندو قوم میں یوں ضم ہو گئیں کہ اب ان کا نام و نشان تک کہیں نظر نہیں آتا۔ صرف مسلمان قوم یہاں ہندوؤں سے ہمسایوں کے سے تعلقات کے باوجود دینی۔ روحانی۔ اخلاقی۔ معاشرتی اساسی اصولوں میں ہندو کلچر سے دور رہی۔ اور میں سمجھتا ہوں ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ ہر قوم کو اپنے نفس اجتماعی کی منفرد شناخت کو زندہ اور فعال رکھنا چاہیے۔ میراجی پر مضمون کے دوران میں میں نے اس نکتے کی توضیح کرتے ہوئے یہ بھی کہا ہے۔

"میں کالی داس کی "شکنتلا" اور "میگھ دوت" کا ترجمہ پڑھتا ہوں تو وہ مجھے خود میں جذب کر لیتا ہے۔ میں اس کی دنیا میں ایک سراپا شوق زائر کی طرح کھو کر رہ جاتا ہوں۔ جیسے سوفو کلیز کی المیہ تمثیل پڑھ کر میں اب بھی رو دیتا ہوں۔ مگر فارسی نظم و نثر میں بے محل بے جواز عربی کلمات آنے لگیں تو میں اس نظم و نثر کو خلاف طبع اور بے رنگ پا کر اس سے دور ہٹ جاؤں گا۔ کہ وہ تحریر مجھے فارسی زبان کی اہانت نظر آئے گی۔ شاد عظیم آبادی مرحوم کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے میں نے لکھا تھا کہ جب وہ اپنی علمیت کے اظہار کے لیے اردو اشعار میں عربی کے جناتی کلمات لاتے ہیں تو مجھے بہت الجھن ہوتی ہے۔ اگر آج کوئی لکھنے والا ایسا کرنے لگے تو میں اردو زبان کے ادیبوں شاعروں، دانش وروں سے گزارش کروں گا کہ اس سے ترک موالات کا اعلان کرو۔ کہ وہ اردو زبان کی توہین کر رہا ہے۔ اور اسے بگاڑ رہا ہے۔ میراجی نے اہانت نہیں کی ہرگز نہیں۔ کیوں کہ وہ عمیق اچھوتے خیالات کے لیے اپنی ان سنی باطنی کیفیات کے لیے ایک موزوں پیرایہ اظہار ایجاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور یہ (ہندی آمیز) اسلوب اس کی مختلف النوع کوششوں کا ایک رخ ہے۔ یہ نظمیں اگر ہماری ادبی Sensibility میں نہ بھی رچ بس سکیں تو بھی تاریخی سطح پر لائق تکریم ہیں۔ اگر میرے عزیز دوست انتظار حسین نے یہ فقرے پڑھے ہوتے تو وہ مجھ پر ہندوانہ زبان و بیان اور اسالیب کے خلاف تعصب برتنے کا الزام نہ دھرتے۔ کہ میں نے تو اردو میں بے جواز عربی فارسی کے نفوذ کو بھی اردو کی توہین قرار دیا ہے۔ اب میں اجنبی اساطیر اور اردو زبان والی دو ایک نظموں پر اپنی رائے نقل کرتا ہوں جو میری کتاب کا ہر متوجہ قاری میراجی والے مضمون میں جابجا دیکھے گا۔

ایک نظم ہے "زمانہ تسلسل ہے" ۔۔ فقط اک تسلسل کا جھولا رواں ہے۔ میں نے اس پر بڑی تفصیل سے بحث کی ہے وہ بھی اپنشد کے ایک اشلوک سے متاثر ہو کر کہی گئی ہے۔ خداوند برہمن تنہا تھا۔ اس نے کہا میں کئی ہو جاؤں۔ سو اس نے سنسار بنا دیا۔ پوچھا کیسے۔ کہا جیسے مکڑی جالا اپنے اندر سے نکالتی ہے۔ اب اقتباس دیکھیے۔ "تو یہ تھا وہ تنہا ہے۔ جو کئی ہو گیا۔ جس کا کئی ہونا سنسار میں ظاہر ہوا۔ وہ سنسار جس کے مناظر اس نظم میں پیش کیے جائیں گے۔ شاعر کو شاید معلوم نہ ہو۔ لیکن نظم اس توضیح کا امکان رکھتی ہے۔ قرآن حکیم میں آیا اللہ بدیع السمٰوات والارض۔ اللہ باقی وہ ہے جس نے آسمان بنائے سارے کے سارے اور زمین۔ عدم کو ہست

کر کے۔

میں نے "کتھک" پر جو میراجی کی عظیم نظموں میں شامل ہے۔ مفصل اظہار خیال کیا ہے۔ اور آخر میں کہا ہے۔" یہ کتھک ناچ شاعر کے ذہن میں شوشنکر کا ناچ ہے۔ ناچ کی یہ جو راس رچائی گئی تھی۔ اس کے پردے میں سنسار کو نشٹ کرنے کا آغاز کر دیا ہے۔ یہ میرا قیاس ہے۔ کہ اور عمیق تر قریب تر معانی جن تک مجھ سے بہتر علم و وجدان والے "چھلاوا" اور "جہان تیرا ہے" کی مدد سے پہنچ سکتے ہیں۔ میری رسائی سے دور ہیں کہ میرے علم کی نظر تو ناچ کے حوالے سے شوشنکر تک ہی پہنچتی ہے جو ترمورتی کے تیسرے خداوند ہیں۔ ناچ سے سنسار کو نیست و نابود کرنے والے۔

" بہرحال یہ بہت گھمبیر مفاہیم والی سوجھ بوجھ اور مہارت سے کہی ہوئی کویتا ہے۔ ("کویتا" سے عصبیت کی بو نہیں آتی۔ اس میں محبت اور تپاک ہے ایک عظیم مابعد الطبیعاتی روایت سے) اس کی ساخت میں بڑا تخلیقی جوہر ہے لفظ کے بعد سچا لفظ لاتا رہا ہے۔ اور یوں وہ آخری مصرعے تک پہنچ گیا۔ یہ کویتا (میں اسے نظم نہیں کہوں گا کہ اس کا لہجہ اردو نظم کا نہیں اور خیال ایک جداگانہ دیومالائی اور تہذیبی روایت سے وابستہ ہے۔ جو اردو بولنے والوں کی Sensibility کا کبھی حصہ نہیں تھی) ہر اعتبار سے برتر تخلیقی سطح رکھتی ہے۔ میں نے کئی اردو نظموں کے بعد "کتھک" کو یہاں دانستہ رکھا ہے۔ کہ قاری دوسرے میراجی کو جو ہمارا شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی میراسین کے کلچر کا نمایندہ بھی ہے۔ اپنی فکر کے سامنے رکھے۔ اور ساتھ ہی اس حقیقت سے بھی باخبر رہے کہ اس اجنبی روایت اور دیومالا کا حصہ اصل میراجی کے اصل لہجے سے بہت کم ہے۔ اس کم حصے والے اسلوب۔ اس کی لفظیات اس کی اساطیر میں بھی میراجی اتنا ہی آسودہ اور at home ہے جتنا اردو روایت سے متعلق نظموں میں نظر آتا ہے۔"

میں نے میراجی کے alien ماحول والی برتر نظموں کو جس سطح پر خراج تحسین ادا کیا ہے اس کا ایک نمونہ قاری نے اوپر درج کیے گئے اقتباس میں دیکھ لیا ہے۔ میں نے قاری کو اس دوسرے میراجی کے اجنبی اساطیر والے کلام کو بھی پورے دھیان اور شوق سے پڑھنے کی دعوت دی ہے تاکہ وہ میراجی کے جوہر کا اس کی کلیت میں مشاہدہ کر کے اس کی شاعری کی قدر (value) کا تعین کرے۔ یہ بات بھی قاری پر آشکار ہو گئی ہوگی کہ میں ہندی مابعد الطبیعات کا ایک ادنیٰ مگر ہمہ شوق طالب علم ہوں۔ ہندو لاہوت کی برتر سطح نے میرے روحانی آفاق کو تابندگی عطا کی۔ ادب کے طالب علم کو دنیا جہان کے سارے شاہکاروں کا مطالعہ کرنا ہوتا ہے تاکہ وہ سارے انسانی جمالیاتی سفر سے آگاہ ہوسکے۔ کوئی انسان صرف اپنی ثقافت کے حدود میں مقید رہ کر وہ وسعت نظر، دل کی وہ کشادگی حاصل نہیں کر سکتا جو ایک سچے طالب علم کا مقصود ہوتی ہے۔

میں نے تو اپنے مقالے میں صرف اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ (اور یہ برحق اور

برملا حقیقت ہے) ۔ کہ اردو زبان اور اردو شاعری نے غیر اسلامی روحانی اور مذہبی اساطیر کو کبھی قبول نہیں کیا اور نہ آیندہ کریں گی۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ میراجی کے اس کلام کو میراجی کے دیوان سے خارج کرا دینا چاہتا ہوں۔ میں تو عالمی ادب کے شاہکاروں کا سارے کے سارے جواہر پاروں کا عاشق ہوں۔ لیکن میں یہ نہیں چاہتا کہ کوئی میراجی کوئی شاد عظیم آبادی غیر مروج الفاظ قصص علامتیں اردو پر مسلط کرے۔

یہ بھگت کبیر، تلسی داس اور خان خاناں کی ہندی نہیں۔ آج کل کے بھارتی ریڈیو کی سنسکرت سے لبریز ہندی ہے میں نے صرف اتنی سی بات کی تھی۔ مجھے یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس مضمون کے کس حصے سے انتظار صاحب کو یہ تاثر ملا جو یوں بیان کیا گیا ہے۔ "ویسے حمید نسیم صاحب دیومالا کے ذوق سے عاری نہیں ہیں۔ سنسکرت اور یونانی میں اس حوالے سے جو کچھ لکھا گیا ہے وہ پڑھتے ہیں اور لطف لیتے ہیں۔ مگر ان کی دانست میں اردو کے ادیبوں کے پڑھنے کی یہ چیزیں نہیں ہیں ہاں اگر کوئی ادیب اپنی ادبی روایت سے اخراج کا خطرہ مول لینے کے لیے تیار ہے تو پھر بے شک وہ اس ممنوعہ پھل کا ذائقہ چکھ لے۔"

یہ جو کڑی فرد جرم انتظار صاحب نے مجھ پر عاید کر دی ہے اوپر دیے گئے میراجی پر میرے مضمون کے اقتباسات اس فرد جرم کو Lie Direct (یہ ایک منطقی قانونی اصطلاح ہے) دینے کے لیے کافی ہے۔ میں نے خود ساری عمر تمام غیر زبانوں کے دست یاب شاہکار۔ علم الانسان۔ عمرانیات۔ عالمی فلسفہ۔ بابل۔ مصر۔ یونان اور ہند کی دیومالائیں۔ زندہ مذاہب۔ تمام مذاہب کی مقدس کتابیں۔ جن میں ہندو مت کے چاروں وید۔ سارے بڑے اپنشد۔ بھگوت گیتا۔ مہابھارت۔ رامائن۔ وشنو اور بھگوت پرانڑ۔ شنکر کی ادویتا۔ اور ہندو رشیوں کی دویتا ادویتا سب کچھ اپنی استطاعت کی حد تک پڑھا ہے۔ اور سب سے فیض حاصل کیا ہے۔ کوئی مذہب جھوٹا نہیں۔ کوئی نظام اقدار بے کار نہیں۔ سب دیومالائیں قاری کے تخیل کو وسعت اور ذہن کو توانائی اور اختراعی ہنر عطا کرتی ہیں۔ تو کیا میں ان پڑھ مسجد کا ملا ہوں کہ کٹر پنتھی ہندو برہمن کی طرح فتوے دوں گا کہ alien علم کو پڑھنا بھرشٹ ہو جانے کا راستہ ہے۔ استغفراللہ۔ یہ نتیجہ یا تو اس لیے اخذ کیا گیا کہ کالم نگار نے میری کتاب جستہ جستہ پڑھی ہے۔ چار سطریں یہاں سے چھ آٹھ سطریں وہاں سے جسے انگریزی میں Browsing کہتے ہیں۔ یا جیسا کہ ایک خط میں یا ملاقات کے دوران گفتگو میں مجھے بتایا تھا کالم نگار کی کچھ ضروریات کالم نگار کی حیثیت سے ہوتی ہیں۔ چناں چہ ایک آدھ angle ان کو حقائق سے ہٹ کر بھی اکثر لگانا پڑتا ہے۔

اب میں مختصراً سید صاحب کے اس اہم نکتے کا جواب عرض کروں گا جو انھوں نے اردو کی عربی / ترکمان / عجمی روایت سے بغاوتوں کے بارے میں اٹھایا ہے۔

سید صاحب نے نظیر اکبر آبادی کا ذکر فرمایا ہے۔ اگر انھوں نے "ناممکن کی جستجو" "شاد

عظیم آبادی" پر میرا مضمون اور یہ کتاب "پانچ جدید شاعر" بالاستیعاب پڑھی ہوتی تو انھیں معلوم ہوتا کہ میں نے جہاں ممکن ہوا نظیر اکبر آبادی کا ذکر کیا ہے اور اعلانیہ کہا ہے کہ وہ عوامی شاعر ہمارا عظیم شاعر تھا۔ اس کی زبان، کا تجربے کا سواد Span of Experience ، اس کا وجدان عالمی سطح کے عظیم شاعر کا ہے۔ اردو نے صرف ایک شاعر پیدا کیا ہے جو عوام سے عوام ہی کی زبان میں بات کرتا تھا۔ نظیر اکبر آبادی کا دیوان ہمارے ہاں چھپ گیا ہے اس میں ہندو دیوتاؤں، مقدس بزرگوں اور تہواروں پر نظمیں ہیں۔ کہ وہ سب میلوں ٹھیلوں میں شریک ہوتا تھا۔ مگر ادب کے طالب علم کی حیثیت سے دیکھو تو ہمارا ادبی Ethos گواہی دے گا کہ نظیر اکبر آبادی نے جو کرشن مہاراج۔ گوپیوں۔ مہاراج رام۔ ہنومان جی۔ سیتاجی کے بارے میں اشعار کہے وہ ہمارے عام قاری تو کیا شاعروں کو بھی متاثر نہ کرسکے۔ ہماری ادبی روایت میں صرف آدمی نامہ۔ بنجارہ نامہ اور وہ نظم "جب آدمی کے پیٹ میں ہوتی ہیں روٹیاں" شامل ہیں۔ پشاور سے کراچی تک کے تمام ادیبوں کو سوال نامہ بھیجیے۔ اور پوچھیے نظیر اکبر آبادی کے کلام میں کیا کچھ اچھا لگا تو آپ کو خود ہی اپنے دعاوی کا کھلا پن نظر آجائے گا۔ یہاں مقطع میں سخن گسترانہ بات نہیں۔ ایک بدیہی امر کی طرف آپ کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔

محسن کاکوروی کی عظیم نعت یقیناً ہماری ادبی روایت کا حصہ ہے۔ اور ہمارے اجتماعی ادبی شعور میں شامل ہے۔ لیکن اس نظم کی Thrust وہ نہیں جو آپ نے پیش کی ہے۔ بلکہ اس کا مقصود آپ کی تفہیم کے عین برعکس ہے۔

بادل کاشی سے متھرا کی جانب چلا۔ ہوا کے دوش پر جس کی بالائی سطح نے گنگا جل بھی اس بادل میں شامل کر دیا۔ گنگا جل جس سے ہندو اپنے گناہ دھوتے ہیں اور پوتر ہو جاتے ہیں۔ برہمن سلونوں کی راکھیاں لے کر نکلنے کے لیے تیار بیٹھے ہیں مگر بارش کا تار تو پل بھر کے لیے ٹوٹے۔ اب بادل یہ ساری فضا ہندو دھرم کے Cultural rites اور اس کی معاشرتی روحانی روایت کی متاع لیے گنگا جمنا دوآبے سے آگے بڑھتا ہے اب بادل کا قبلہ کعبہ ہے۔ اور اس سے پہلے وہ یثرب و بطحا کی جانب سجدہ گزار رواں ہے۔ بادل نے آج ہندو صنم خانے کو میکدہ، برج کو چھوڑ دیا ان سے آگے نکل گیا۔ اور اس نے کعبہ میں جاکر مصلے بچھالیا ہے۔ اب شاعر کہتا ہے کہ "اے دل اللہ تبارک و تعالیٰ کی بے کراں رحمت کا حامل بادل تو رسول عربی کی ذات بابرکت ہے۔" اے اردو زبان اور اردو روایت ادب کے نگہبانو اور وارثو محسن کاکوروی نے میرے دعوے کی تائید اور ہندو اساطیر کی گرویدگی کا رد کامل پیش کر دیا۔ اسلام آیا تو اس نے پرانی صنم کدے کی روایت کی جگہ الہ واحد کی پرستش اور حضور رسالت مآب کی غلامی کا نوع انسانی کی ہند میں بسنے والی شاخ کو چتر رحمت جاوداں عطا کر دیا۔

یہ مبتدا اور خبر کی بات ہے۔ کاشی متھرا۔ راکھیوں۔ سلونوں برہمنوں اور گنگا جل کی

علامتیں سب بتدا ہیں۔ خبر حضور رسالت مآب پر اتری ہوئی کتاب اور دین اسلام ہے۔ ایسا خارجی تناظر قائم کر کے اسلام پر بات کرنا تو شاعرانہ ہنرمندی کا ثبوت ہے۔

کاشی اور متھرا کا استعمال محسن کاکوروی نے جس Context میں کیا وہ بھی یہ بات ثابت کرتا ہے کہ ہم ان مقامات پر ٹھہر جانے والے نہیں کہ ہمارا مصلا کعبے میں بچھتا ہے۔ alien اسطور یا Symbols اردو نظم کو معنوی عمق اور وسعت دینے کے لیے استعمال کو میں نے میراجی پر اپنے مضمون میں بہ صراحت مستحسن قرار دیا ہے۔ اس خط کے آخر میں وہ چند فقرے نقل کر رہا ہوں۔ تاکہ سید صاحب کو یقین آجائے کہ میں بے علم ملائیت کا نمایندہ نہیں ایک دیانت دار طالب علم ہوں اور اردو ادبی روایت میں تنوع اور توسیع کی کوششوں کی بھرپور حمایت کرتا ہوں۔ مگر اس روایت کو مسخ ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ میرے لیے شاد صاحب کی معرب مثنویاں ابو الکلام آزاد اور ظفر علی خان کی مفرس اور معرب نثر بھی اتنی ہی قابل اجتناب ہے جتنا نامانوس ہندی تراکیب الفاظ اور اساطیر سے بوجھل شعری لہجہ۔ میں وہ اردو دیکھنا چاہتا ہوں جو نثر میں قرۃ العین حیدر لکھتی ہیں۔ آپ لکھتے ہیں اور جو شاعری میں فیض، راشد، میراجی (سادہ زبان والا کلام) ضیا، مدنی، ناصر کاظمی اور شکیب جلالی اور قاسمی صاحب کی زبان ہے۔

ہم نے ۱۲ سو برس غیر مسلم آبادی کے ساتھ رہ کر نماز کو کبھی پوجا دعا کو پرارتھنا نہیں کہا۔ صبح کو اوشا بھی کسی مسلم ادبی روایت میں نہیں دیکھا۔۔۔۔

میں سمجھتا ہوں کہ ان توضیحات سے جو بدگمانی سید انتظار حسین صاحب کے دل میں میری مفروضہ راسخ مسلمانی Fanatical literary Isolationism کے رجحان کے بارے میں پیدا ہوئی تھی دور ہو جائے گی۔ میں میراجی کی برتر نظموں کو جو ہندی اساطیر پر مبنی ہوں کہ ہماری بڑی روایت سے وابستہ ہوں محفوظ کرنا اپنے ادبی سرمائے کے لیے نہایت اہم فریضہ سمجھتا ہوں۔ لیکن وہ نظمیں جو کاماسوترا کی پروردہ ہیں جو "جپڑا بندر کا کبھی دیکھا ہے" والی نظم کے موضوع یعنی بدنما اور کریہہ جنسی عمل کے بارے میں ہیں میں سمجھتا ہوں کہ ہر ہوش مند قاری کو ان سے صرف نظر کرنا چاہیے۔ اور میراجی کے صحت مند نہیں بیمار حصہ وجدان کی تخلیق ہیں۔ صحت مند لوگ تو ایسے کام کو Monkey Business کہتے ہیں۔ وہ نظم پڑھ کر دیکھ لیجیے۔ "جپڑا بندر کا کبھی دیکھا ہے؟"

اور پھر میں پھر نہایت اصرار سے کہتا ہوں کہ ملا عبد الحمید کی "بہار دانش" ہو کہ الف لیلہ و لیلہ ہو جو تحریر پرانی یا نئی، عورت کو جو ہر سطح پر لائق تعظیم اور مقدس ہستی ہے عیاری اور شہوت کی پوٹ کی سطح Portray کرے وہ مجھے ہی نہیں ہر مہذب انسان کو ماں اور بیٹی کی گالی دیتی محسوس ہوتی ہے۔

میں انتظار حسین سے عمر میں بڑا ہوں۔ اور ان کو فرزند کی طرح عزیز جانتا ہوں۔ یہ باتیں

(بقیہ صفحہ ۲۷۴ پر)

بازگشت

○ آل احمد سرور ○ نیر مسعود ○ رشید حسن خاں ○ ڈاکٹر آفتاب احمد ○ شان الحق حقی ○ حمید نسیم ○ جیلانی بانو ○ شمیم حنفی ○ عرفان صدیقی ○ النور خاں ○ شفیق فاطمہ شعریٰ ○ شمس الحق عثمانی ○ سید محمد اشرف ○ امتیاز احمد ○ منصور عالم ○ مسعود الحق ○ سلیم شہزاد ○ حبیب حق ○ صدف جعفری ○ سید مجاھد علی

"چودھری محمد علی کا گوشہ بہت اچھا رہا۔ اس کی ضرورت تھی۔ یہ خوب ہوا۔ انورمعظم نے "دانشورِ اقبال" کے موضوعات پر تفصیل سے لکھا اور مرکزی تصورات پر توجہ کی، یہ بڑی بات ہے۔ میراجی پر حمید نسیم کا مضمون واقعی خاصے کی چیز ہے۔ انھوں نے میراجی کو ان کی جنسی میلان کی نظموں سے علیحدہ کر کے دیکھنے کی جو کوشش کی ہے اس کی وجہ سے میراجی کے ساتھ آئندہ زیادہ انصاف ہو سکے گا۔

آپ نے اداریے میں اچھی باتیں کہی ہیں۔ خاص طور پر یہ بات کہ خصوصی مطالعہ کا مقصد یہ بھی ہے کہ نئے لکھنے والے اپنے ورثے کو پہچانیں۔ چودھری محمد علی سے میں واقف تھا۔ بڑے باغ و بہار آدمی تھے اور اُن کی نثر بڑی جاندار ہے۔" آل احمد سرور۔ علی گڑھ

۱۱/ اکتوبر ۱۹۹۵ء

"سوغات کا حصۂ نثر پڑھ لیا۔ اس بار تو آپ بھی اس سے مطمئن ہوں گے۔

چودھری محمد علی کا مطالعہ بہت عمدہ ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ آپ نے اتنی چیزیں کس طرح فراہم کر لیں۔ اب اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کیسی اہم ادبی شخصیت تھی۔ جنسی موضوعات پر بھی وہ کس ٹھاٹھ سے قلم اٹھاتے تھے۔ احتیاط کا نام نہیں لیکن بے احتیاطی کا بھی شائبہ تک نہیں۔ یہ کمال ہمارے یہاں شاید انھیں کے حصے میں آیا تھا۔ یہ آپ بڑا کام کر رہے ہیں لیکن معلوم نہیں ہمارے نوجوان لکھنے والوں کا ان مطالعوں کے بارے میں کیا تاثر ہے۔ یہ سب کچھ تو انھیں کی خاطر ہے۔ فاروقی صاحب کا یہ کہنا صحیح ہے کہ اپنے ادبی ورثے کے ساتھ تحقیری رویے اور تغافل کے لحاظ سے اردو والوں کی سی "بدبخت اور منحوس قوم" کوئی نہیں۔" نیر مسعود۔ لکھنؤ

"رسالہ اس قدر اچھا ہے کہ کیا کہوں! میراجی کی شاعری پر مضمون خاص کر پسند آیا۔ یہ روشِ عام سے ہٹ کر لکھا گیا ہے۔ سب سے اچھا تاثر اسے پڑھ کر یہ ہوتا ہے کہ ہم کسی نقاد کی تحریر نہیں پڑھ رہے ہیں، ایسے شخص کی تحریر ہے جو شاعر کے اندازِ فکر اور طرزِ اظہار کا رازداں ہے اور شاید یہ شخص شاعر کے ساتھ برسوں تک رہا ہے، اُس سے باتیں کرتا رہا ہے، اُسے سمجھتا رہا ہے اور اُس کے احساسات کو خود بھی محسوس کرتا رہا ہے۔ ایسی اچھی تحریریں کبھی کبھار ہی پڑھنے کو ملتی ہیں۔ ضخیم رسالوں کو دیکھ کر اکثر یہ محسوس ہوتا ہے کہ ایڈیٹر مجبور تھا رسالے کی ضخامت کے سامنے کہ ہر طرح کی تحریریں جمع کر دے۔ سوغات کو دیکھ کر اس کے برعکس احساس پیدا ہوتا ہے۔ اور یہ بڑی بات ہے۔ اب میں محسوس کرتا ہوں کہ اب تک میں کس قدر گھاٹے میں رہا ہوں، اس کے سارے شماروں کو نہ پڑھ کر۔

اور ہاں! جی خوش ہو گیا گوشۂ چودھری محمد علی دیکھ کر۔ یہ آپ نے بڑا کام کیا۔ ہم نے اُن کو بھلا سا دیا تھا۔ آپ نے یاد تازہ کر دی۔ اور اس طرح کہ اب کچھ دنوں تک اُن کی یاد ذہنوں میں محفوظ رہ سکے گی۔ اگر یہ انداز ایک طرزِ مستقل کی حیثیت اختیار کر لے تو خوب ہو، کہ اس طرح بہت سے "قصہ ہائے پارینہ" تازہ ہو جائیں گے، اور بڑی خدمت ہو گی زبان کی بھی اور ادب کی بھی۔

میں خاص کر حوالہ دینا چاہتا ہوں ایک مختصر تحریر کا۔ یہ انیس اشفاق کا مختصر سا مضمون ہے۔ یوں کہ آجکل اس موضوع پر

ہر طرف بہت کچھ لکھا جا رہا ہے مگر اکثر تحریریں پڑھتے وقت محسوس ہوتا ہے جیسے کسی اچھی تحریر کا بُرا ترجمہ سامنے آگیا ہو۔ سب دوسروں کی باتیں، اپنا کچھ نہیں، اور زبان ایسی کھردری اور بیان ایسا بے رنگ کہ پوری تحریر پڑھنا چکّی کی مشقت سے کم نہیں معلوم ہوتا۔ حوالے اِس قدر زیادہ اور جملے ایسے طویل کہ بیان کا حسن جیسے اِس دنیا سے اٹھ گیا ہو اور ذہانت بانجھ ہو چکی ہو۔ انیس اشفاق نے سادہ سی زبان میں جو کچھ کہا ہے، وہ دل کو لگتا ہے اور ذہن پر اثر کرتا ہے۔ انھوں نے بقراطیت چھانٹنے کے بجائے اپنی زبان میں اپنے خیالات بلکہ یوں کہوں کہ اپنے تاثرات پیش کئے ہیں۔ اور یہ انداز خوب ہے۔

ساختیات کے متعلق بحثوں میں مصنّف کو بنیایت باہر کر دینے کا رجحان غالب نظر آتا ہے، یہ انتہا پسندی ہے۔ یہاں میں ایک اصطلاح "منشائے مصنّف" کے متعلق یہ عرض کروں گا کہ تحقیق میں اس اصطلاح کو مفہوم مصنّف کے معنی میں استعمال نہیں کیا جاتا اسے الفاظِ مصنّف کے معنوں میں لکھا جاتا ہے۔ یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ ایک لفظ کے معنی متعدد ہوتے ہیں اور مفاہیم بہت سے ہو سکتے ہیں۔ معنی اور مفہوم میں فرق کرنا ضروری ہے۔ شاید اس طرف توجہ کم کی گئی ہے۔ ہمارے یہاں شرح نویسی کی روایت بہت پُرانی ہے۔ اُس کی بنیاد اِسی تصوّر پر تھی کہ مفہوم میں نئے پہلو نکل سکتے ہیں، مگر اُس میں ایک بات کو ملحوظ رکھنا لازم سمجھا جاتا تھا کہ مفہوم الفاظ سے بے تعلق نہ ہونے پائے اور ایسا نہ ہو کہ اُسے مصنّف سے بالجبر منسوب کرنا پڑے۔ قاری بہت کچھ ہے مگر سب کچھ نہیں، اور اصل چیز ہے مصنّف اور اُس کے منتخب کردہ الفاظ اور اُس کا اختیار کردہ بیان۔ آپ کو ضرور یاد ہوگا سیّد محمود کا وہ مقدمہ جو انھوں نے دیوانِ غالب نسخۂ نظامی بدایونی پر لکھا تھا اور جس میں غالب کے معروف اشعار کے مطلب یہ نکالے گئے تھے کہ مرزا صاحب ملکی آزادی کے پرستار تھے۔ مولوی عبدالحق مرحوم نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "ایسی بھونڈی باتیں لکھنا، شاعر کا مضحکہ اڑانا ہے۔" ڈاکٹر عبداللطیف نے لکھا تھا: "اس طرز کی تنقیدوں سے اردو داں طبقے میں ایک قسم کی بد ذوقی پیدا ہو چلی ہے۔" اور شیخ اکرام نے کہا تھا:

"یہ خیال نہ صرف مرزا کے حالاتِ زندگی اور اُن کے فارسی کلام سے ناواقفیت کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔"

اور وہ کتاب تو آپ کی نظر سے ضرور گزری ہوگی، خواجہ منظور حسن کی: اردو غزل کا روپ بہروپ، جس میں خواجہ صاحب نے اردو کے اکثر شاعروں کے اشعار سے وہ مطالب اخذ کئے تھے جن کو ماننے کے لئے آدمی کا بد ذوق اور کم علم ہونا ضروری قرار پاتا ہے۔ اُس کتاب کے متعلق بھی ایسی ہی رائیں ظاہر کی گئی تھیں۔ مقصد میرا یہ ہے کہ قاری کو اگر سب کچھ مان لیا جائے اور اُسے تعبیرات کی چھوٹ دے دی جائے تو نتیجہ کیا ہوگا۔ جو شخص غالب کے پورے کلام اور پورے احوال سے واقف نہیں، وہ یقیناً غالب کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتا یعنی مصنّف کو، اُس کے افکار کو اور اُس کے طرزِ بیان کو نظر در سامنے رکھنا ہوگا۔ مثلاً ہمیں معلوم ہے کہ مومن عدمِ تقلید کے قائل تھے (جیوان ہیں حقیقت میں یہ اہلِ تقلید) اور شاہ اسماعیل کے معتقد تھے۔ اب آپ اُن کے اشعار سے ایسے مفاہیم نکالیں جو اُن کے خیالات سے مختلف یا متضاد ہوں تو اُسے خیال آرائی کے سوا اور کیا کہا جائے گا۔ خیال آرائی کا حق سب کو حاصل

ہے، مگر اپنی خیال آرائی کو دوسروں کے سر منڈھنا نا زیبا ہے ۔ اس پہلو پر، میری رائے ہیں، پوری طرح بحث ہونا چاہئے ۔ خود ہمارے شاعر مفاہیم کی کثرت سے بے خبر نہیں تھے ۔ مثلاً ؎

معنی نہ آئیں در رگ میں جُز از وجودِ لفظ   آرے دلیلِ راہِ حقیقت مجاز ہے

مگر حقیقت اور مجاز میں جو باطنی ربط ہوتا ہے (جیسے استعارے میں وجہ جامع) اُس سے بے خبری اور بے تعلقی مناسب نہیں ہو سکتی ۔"

رشید حسن خان ۔ دلّی

"سوغات" (۹) کے کالم "بازگشت" میں حمید نسیم صاحب کا خط دیکھا، جس میں انھوں نے مجھے بھی میرے ذکر سے نوازا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے تو صرف یہ عرض کیا تھا کہ راشد کی نظم "میرے بھی ہیں کچھ خواب" ۱۹۶۱ء میں لکھی گئی ہے اور مارٹن لوتھر کنگ نے اپنی I HAVE A DREAM والی تقریر ۱۹۶۳ء میں کی تھی۔ لہٰذا اس تقریر کو، حمید نسیم صاحب کے ارشاد کے مطابق، اس نظم کا ماخذ قرار دینا درست نہیں ۔ حمید نسیم صاحب نے اپنے خط میں میری اس گزارش کے بارے میں تو کچھ فرمایا نہیں، البتہ مجھے بیچاران کو مختلف قسم کے طعن و طنز اور تعریض کا نشانہ بنایا ہے ۔ مجھے افسوس ہے کہ خالص علمی سطح پر میری ایک جسارت نے انھیں اتنا برہم کر دیا ۔ میں جواب میں کچھ نہیں کہوں گا ۔ وہ میرے بڑے ہیں، میں اُن سے اس قسم کی گفتگو میں الجھنا نہیں چاہتا ۔

رہا گاندھی جی پر ریڈیو پاکستان کے تعزیتی پروگرام کا قصہ! تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ یہ پروگرام دراصل "پاکستان ہمارا ہے" کی سیریز میں، جو عام طور پر امتیاز علی تاج صاحب لکھا کرتے تھے، گاندھی جی کے قتل کی شام نشر ہوا تھا ۔ میں نے ضمنی طور پر اس کا ذکر، محمد حسن عسکری پر اپنے خاکے میں، کرتے ہوئے اُسے بھی روا روی میں تاج صاحب ہی سے منسوب کر دیا ۔ حمید نسیم صاحب کو سہو ہوا ہے ۔ میرا یہ خاکہ امتیاز علی تاج صاحب پر نہیں تھا بلکہ محمد حسن عسکری پر تھا ۔ تاج صاحب پر تو میں نے کوئی خاکہ لکھا ہی نہیں بلکہ کبھی کچھ نہیں لکھا ۔ حمید نسیم صاحب فرماتے ہیں کہ انھوں نے اس کی شکایت نہیں کی ۔ یہاں بھی ان کو سہو ہوا ہے ۔ "نیا دور" میں عسکری پر میرا خاکہ چھپنے کے بعد حمید نسیم صاحب نے ایک شکایت نامہ مدیر "نیا دور" ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب کو ارسال کیا ۔ جس کی فوٹو کاپی جالبی صاحب نے مجھے بھجوا دی ۔ میں نے اس کے جواب میں جالبی صاحب کو ایک خط لکھا جس میں اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے حمید نسیم صاحب سے معذرت طلب کی ۔ جالبی صاحب کا کہنا تھا کہ وہ حمید نسیم صاحب کا خط اور میرا خط "نیا دور" کے اگلے شمارے میں شائع کر دیں گے ۔ اتفاق کی بات ہے کہ وہ شمارہ شاید ابھی شائع ہی نہیں ہوا ۔ جمیل جالبی صاحب کراچی ہی میں ہیں ۔ حمید نسیم صاحب چاہیں تو اُن سے میرے کہے کی تصدیق کر سکتے ہیں ۔ یہ کوئی ڈھائی تین برس کی بات ہے ۔ مگر چونکہ حمید نسیم صاحب کے دل میں ابھی تک اس کی خلش باقی ہے لہٰذا میں یہاں پھر ایک بار اپنی غلطی کا اعتراف اور اُن سے معذرت کا اظہار کئے لیتا ہوں ۔ حیرت ہے کہ انھیں میرا "قصور" تو یاد رہا مگر جمیل جالبی صاحب کے نام اپنا شکایت نامہ ارسال کرنا، یاد نہ رہا ۔"

(ڈاکٹر) آفتاب احمد ۔ اسلام آباد

"آپ نے احمد علی کے ناول کے ترجمے کی بابت شک کیا ہے کہ یہ شاید احمد علی نے خود ہی کیا ہوگا۔ اور چالیس کی دہائی میں کیا ہوگا۔ میں اس سلسلے میں اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ غالباً پچاس کی دہائی کے آخر تک نہیں کیا گیا تھا۔ کیونکہ احمد علی مجھ سے اس کی فرمائش کرتے رہے مگر مجھے انھیں دنوں عینی کے بقول اردو بورڈ لاحق ہوگیا تھا اور ۱۷ برس رہا۔ یہ ایک اعزازی خدمت تھی، روزگار کہیں اور سے وابستہ تھا۔ اپنے لئے کوئی وقت نہ بچا تھا۔

دوسری بات یہ کہ بلقیس جہاں بیگم احمد علی بڑی ذہین، شگفتہ مزاج اور باصلاحیت خاتون تھیں۔ اور بڑی اچھی زبان داں۔ میرا خیال ہے وہ ترجمے کی اہل تھیں۔ پھر اس پر احمد علی نے کتنا قلم چلایا ہو یہ نہیں کہہ سکتا۔ کلکتے میں بھی احمد علی سے میرا ملنا رہا مگر میں نے انھیں ترجمہ یا اس کا ذکر کرتے نہیں دیکھا۔

میں نے اس سلسلے میں عسکری (ابن سعید) سے بھی بات کی جن کے وہ ہم زلف تھے۔ وہ بھی عینی شاہد کے طور پر کہتے ہیں کہ انھوں نے بلقیس کو ترجمے میں معروف دیکھا ہے۔ ظُنُّوا الْمُؤْمِنِیْنَ (وَالْمُؤْمِنَاتِ) خَیْرًا۔ وہ بے چاری بیمار بہت رہیں۔ اور زیادہ عمر نہ پائی۔ کچھ ان کے اپنے بھی لکھنے لکھانے کے منصوبے تھے۔ کچھ جستہ جستہ یادداشتیں اور ادھورے سے مسودے چھوڑ گئی ہیں۔ شاید ترجمے کا مسودہ بھی کہیں ہو۔ کوئی بات علم میں آئی تو آپ کو بتاؤں گا۔

تیر مسعود صاحب کا افسانہ ایک اعلیٰ ادبی شاہکار ہے۔ نہایت دلچسپ اور پر معنیٰ۔ اس میں داستان کا سا لطف بھی ہے، جدید افسانے کی خصوصیات بھی۔ انھوں نے خوب کیا کہ واحد متکلم کی تکنیک اختیار کی اور بولنے والا اپنے معاشرے کا ایک بہت معمولی کردار ہے۔ مصنف اپنی زبان سے کہتے تو بہت سا کمنٹ لازم آتا اور افسانہ INSIGHT ہو جاتا یعنی اس میں جھکاؤ یا امالہ پیدا ہو جاتا۔ اب واقعات خود منھ سے بولتے ہیں۔ یہی ایک جملہ کہ "ملازمت سے برطرف مگر تنخواہ جاری رہے گی" ہر کمنٹ سے بے نیاز ہے۔ نہ تحسین کی ضرورت نہ طنز کی۔ ہم ان کرداروں سے پیار بھی کرتے ہیں اور انتزاع سلطنت کے اسباب بھی خود بخود کھل جاتے ہیں۔

اس پر مجھے لامحالہ اپنے افسانے کا خیال آیا۔ "ننھی کا توتا" جو "نیا دور" میں چھپا تھا (۱۹۴۹ء) اور ممتاز شیریں نے اسے بہت سراہا تھا۔ اس کا ذکر ان کی کتاب میں بھی موجود ہے جو اسلم فرخی نے مرتب کی ہے۔ دونوں افسانے ایک عبوری، انقلابی دور سے تعلق رکھتے ہیں اور اصل کردار مشترک یا مماثل ہیں۔ یعنی ایک مزدور پیشہ آدمی، اس کی چہیتی بیٹی، اس کا چہیتا پرندہ اور پس منظر میں مٹتی ہوئی یا مٹی ہوئی بادشاہی اور ایک نئے دور کی آمد۔"

شان الحق حقی۔ کراچی

"آپ میرے نام اعزازی نسخہ نہ بھیجا کیجئے۔ ڈاک پر بہت پیسے لگ جاتے ہیں۔ کاش میں آپ کے اس جہاد جاریہ میں پورے وجود کے ساتھ شامل ہو سکتا۔ "سوغات" کا ہر شمارہ پہلے شمارے سے برتر ہوتا ہے، مواد کے اعتبار سے۔ اللہ آپ کو سلامت رکھے۔

محترمہ شفیق فاطمہ شعریٰ کی طویل نظم پڑھی۔ میں ان کی نثر تو گزشتہ شماروں میں دیکھ چکا تھا اور یہ بات جان چکا تھا کہ انھیں اساسی علوم اور فارسی ادب پر عبور کلی حاصل ہے، مگر میں نے ان کا کلام پہلی مرتبہ دیکھا ہے۔ اس دور میں آج تک کوئی خاتون شاعر اس سطح معارف پر نہیں پہنچ سکی ہیں۔ وہ ہر سپاس و تحسین کی مستحق ہیں۔ حصۂ غزل میں بیشتر نام میرے لئے نئے تھے۔ کلام پڑھ کر نہایت مسرت حاصل ہوئی۔ بیشتر غزلیں نئے فکر و احساس، نئے لسانی جمال کی حامل تھیں۔ یہ اصحاب سرحد کے اس پار کے ہیں تو انشاء اللہ اردو غزل کا آپ کے ہاں مستقبل بہت روشن و درخشاں ہے۔

ڈاکٹر انور معظم کا مقالہ اُن کے علمی تبحر کا آئینہ دار ہے۔ فکر انگیز بھی ہے دل افروز بھی۔ پروفیسر آل احمد سرور کا تو میں نصف صدی سے مداح ہوں۔ اقبال کی دانش ان کے اپنے الفاظ میں "دانش نورانی" ہے۔ وہ نثر میں اپنے جوہر کی سطح عظمت پر کم ہی کبھی پہونچے ہیں۔ قومی شاعری میں ان کی سطح ایک باشعور قومی قائد کی ہے، جو کلام موزوں کی وساطت سے قوم کے لئے نئے اہداف معین کرتا ہے۔ اپنی آفاقی عظمت کی شاعری (پیام مشرق، زبور عجم اور بال جبریل کی دس۱۰ بارہ۱۲ غزلوں اور بڑی نظموں — مسجد قرطبہ ذوق و شوق، ساقی نامہ) میں وہ نورانی سطح کی دانش پر ہیں۔ ایسی شاعری کرنے والے کو ہماری روایت میں عارف شاعر کہا جاتا ہے۔ کہ اس تناظر میں عرفان دانش کی انتہائی رفعت کا مقام ہے۔

اور ہاں! محمد علی ردولوی مرحوم پر آپ نے بہت جامع مواد اس شمارے میں شامل کیا ہے۔ یہ ایک اہم فریضہ تھا۔ افسانوی ادب کی ایک کرشمہ ساز شخصیت کی بازیافت نژاد نو کے لئے۔ اس کام میں بھی اولیت آپ کے نام لکھی ہوئی تھی۔"

(۲)

"میں نے پوری دیانت سے مجید امجد پر لکھا ہے۔ زبان و بیان کی کوتاہیاں اور وجدان کی نارسی کی نشان دہی بھی صراحت سے کر دی ہے اور جہاں وہ اپنے فن کی سطح کمال پر پہونچے ہیں اس کی بھی پوری دل بستگی اور محبت سے وضاحت کی ہے۔ میرا مجموعی تاثر یہ ہے کہ وہ اپنے AGE GROUP میں برصغیر میں جدید اردو شاعری (دوسری نسل) کے سب سے اہم اور برتر شاعر ہیں۔

اہل پنجاب اب اردو کے ہر پنجابی شاعر کو آفاقی، عہد ساز، روایت ساز کہنے لگے ہیں۔ دھڑے بندیوں کے باعث مجید امجد نے آٹھ۸، دس۱۰ نظمیں اچھی کہی ہیں۔ ایک بہت بڑی نظم (نسبتاً) کہی۔ بس بات اس سے آگے نہیں جانی چاہئے، کہ وہ دروغ گوئی ہوگی۔ اور ایسی باتوں سے بالآخر ممدوح ہی کو گزند پہونچتا ہے۔

مجید امجد پر میں کوئی برتر بات رومانی سطح پر یا جمالیاتی سطح پر نہیں کر سکتا تھا۔ جیسے مدنی والے مضمون میں "حسن ناصر کی عقوبت کدے میں موت" کو "چاک در چاک گریبان کو سنوارے ہوئے لوگ" کی توضیح میں بطور مثال پیش کر کے حسین بن منصور

حلاج کے دو رکعت نماز دار پر کھنچنے سے پہلے ادا کرنے کا مسئلہ بیان کیا۔ درآشوب صاحب پر مضمون میں اُن سات فقیر نوجوانوں کی کھال کھینچنے کا واقعہ بیان کیا جن کی ماں اُن کا حوصلہ بڑھاتی رہی۔ مجید امجد کے کلام میں میں سے پانی کو شراب کیسے بناتا؟ گنجائش ہی نہیں تھی۔ ویسے میں نے کوشش کی کہ ادب کا صحیح پرکھ کے طالب قاری کو مجید امجد کا وہ مقام وجدان دکھا دوں جو دراصل ہے۔

جو بات میں نے ان کے بارے میں آپ سے گفتگو میں کی تھی ("سوغات" جدید نظم نمبر: مذاکرہ) بیشتر کلام پر اب بھی صادق آتی ہے مگر اب کلیات میں چند اچھی اور ایک ALMOST عظیم نظم بھی نظر آئی۔ ایمان کو سلامت رکھتے ہوئے جو کہہ سکتا تھا وہ میں نے نہایت ادب سے کہہ دیا۔ کڑی تنقید بھی کی، سپاس و ادب بھی نذر کیا۔"

(۳)

"سوغات" کی وجہ سے میں شفیق فاطمہ شعری جیسی صاحب اسلوب شاعرہ کے کلام سے متعارف ہوا۔ "سوغات" (۹) آیا تو میں نے ضیا (جالندھری) کو لکھا تھا کہ تازہ "سوغات" مل جائے تو وہ شفیق فاطمہ کی طویل نظم "حضارت جدید" ضرور دیکھیں۔ میں نے یہ نظم چار مرتبہ، رک رک کر، ٹھہر ٹھہر کر، مصرع مصرع پڑھی۔ پھر کہیں اس کے مفاہیم مجھ پر آشکار ہوئے اور میں اس نظم میں ڈوب گیا۔

طاہرہ قرۃ العین کا کلام مختصر ہے مگر اس کا آہنگ رکھتا تھا۔ وہ عشق آتشیں اس سے پہلے کہیں نہیں دیکھا تھا سو میں ساٹھ (۶۰) برس سے طاہرہ قرۃ العین کو سلام ادب کرتا چلا آرہا ہوں۔ شفیق فاطمہ کا جہانِ وجدان کہیں وسیع تر ہے۔ ان کی لغت ان کے بلند مفاہیم کا پوری طرح ساتھ دیتی ہے اور اُن کا اسلوب خالصتاً اُن کا اپنا ہے۔ میں نے مشفق خواجہ صاحب سے ذکر کیا تو انھوں نے کہا کہ ان کے پاس اس بڑی شاعرہ کا مجموعہ موجود ہے۔ وہ یہ مجموعہ مجھے عاریتاً عنایت فرمائیں گے۔ میں کوشش کروں گا کہ مہینہ لگے، چھ (۶) مہینے لگیں (بشرطِ زندگی) ان کی تہ بہ تہ سطح تک پہونچوں اور جب دل گواہی دے کہ اب میں ان کی معنوی اور وجدانی دنیا میں رس بس گیا ہوں تو اُن پر ایک مقالہ لکھوں گا۔ جو نظمیں میں نے اُن کی دیکھی ہیں اُن سے مجھے محسوس ہوا کہ ہماری چودہ سو (۱۴۰۰) سالہ روایت (جمالیاتی اور روحانی) ان کے وجدان کی اساس ہے۔ اور وہ اپنی تین ہزار (۳۰۰۰) برس کی روایت سے بھی کاملاً آگاہ ہیں۔ جدید حسیات کی لو بھی ان کے دل میں شعلہ فگن ہے۔ اُن پر لکھنا میرے ذوقِ شعر کی یقیناً کڑی آزمائش ہوگا۔ اگر اُن کے جہاں کی زیارت سے کچھ روشنی مجھ تک پہونچی تو میں نظم بہ نظم ان کی ہم نفسی کی کیفیت کو قلم بند کر کے انھیں ہدیۂ سپاس پیش کروں گا۔"

حمید نسیم۔ کراچی

"اس بار بڑے اہم اور اچھے مضامین شائع ہوئے ہیں۔ بیدی کے ہاں لفظ کی بڑی اہمیت ہے۔ عام نقادوں کا خیال ہے کہ بیدی کی زبان ناہموار اور بقول ایک معروف نقاد "کھردری" زبان ہے۔ لیکن میں اسے بیدی کا بڑا وصف

سمجھتی ہوں۔ جزئیات نگاری اور الفاظ کا سحر بیدی کے افسانے میں ایک گہرا، شدید اور خوبصورت تاثر ابھارتا ہے۔ "ایک چادر میلی سی" کے بارے میں بیدی صاحب سے میری بات ہوئی تھی۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ کہانی کی ابتدا میں، صرف فضا کی عکاسی میں، انھوں نے کہانی کی پوری ٹریجیڈی کو سمو دیا ہے۔ ابوالکلام قاسمی صاحب نے بیدی کے فن پر بہت اچھا مضمون لکھا ہے۔ حمید نسیم صاحب تنقید کا ایک انفرادی انداز رکھتے ہیں۔ وہ نہ صرف کئی زبانوں کے ادب کے عالم ہیں بلکہ فنون لطیفہ، خاص طور سے موسیقی کا بھی بڑا اچھا ذوق رکھتے ہیں۔ ہم سے پہلے والے ادیبوں اور شاعروں کی جو نسل تھی وہ تمام فنون لطیفہ سے گہری وابستگی رکھتی تھی۔ میرا جی پر حمید نسیم صاحب کا مضمون یقیناً بہت پسند کیا جائے گا۔ شمیم حنفی صاحب نے غالب کی نثر پر اتنا اچھا مضمون لکھ کر اس شکایت کا ازالہ کر دیا کہ غالب کی نثر پر توجہ کم دی گئی ہے۔

آپ "سوغات" کو ایک خاص انداز سے ترتیب دیتے ہیں — اپنی پسند کے مطابق — اور اس رسالے کی یہی انفرادیت اچھی لگتی ہے"۔

جیلانی بانو۔ حیدر آباد

"ابھی حمید نسیم کا مضمون اور چودھری محمد علی ردولوی کا گوشہ دیکھا ہے۔ اعجاز احمد کے مضمون کے بعد حمید نسیم کا یہ مضمون میرا جی کے عرفان کو عام کرنے کی دوسری اہم کوشش ہے۔ ایسی ہی تنقید ذوق کی تربیت کر سکتی ہے اور ادب کے مطالعے کا شوق پیدا کرتی ہے۔

ہاں صاحب! اسی یا "اداریے" کی وجہ سے رسالہ مکمل لگتا ہے۔ آپ چونکہ رسمی باتیں نہیں کرتے اس لئے اداریے سے رسالے کے مجموعی موقف کی وضاحت بھی ہو جاتی ہے۔ مجھے سب سے زیادہ خوشی اس بات کی ہے کہ آپ "سوغات" کے ذریعے بھولے ہوئے سبق بھی یاد دلاتے رہتے ہیں۔ مختار صدیقی، عزیز حامد مدنی، بلونت سنگھ، چودھری محمد علی ردولوی کی تحریریں ایک نئی توجہ کا مرکز بن گئی ہیں۔

یہ اچھی بات ہے کہ "سوغات" میں نئے لکھنے والوں کے مسائل اور مقدمات کو بھی آپ مناسب جگہ دیتے ہیں، اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کے ساتھ"۔

شمیم حنفی۔ دلّی

"چودھری محمد علی ردولوی کا خصوصی گوشہ واقعی حاصل مطالعہ ہے۔ اور یہ بازیافت قند مکرر کا مزہ دے گئی۔ کسی بھی زبان کو ایسے صاحب اسلوب لکھنے والے کم کم ہی نصیب ہوتے ہیں۔ چودھری صاحب پر مولانا صلاح الدین احمد کا مضمون بڑی بصیرت فراہم کرتا ہے اور خود مولانا کی اعلیٰ تنقیدی نظر کا شاہد ہے۔ ہماری ہم عصر تحقیق و تنقید دونوں اس نوع کے لکھنے والوں سے ترک تعلق کر چکی ہیں اور انھوں نے خود کو اپنی عجیب و غریب ترجیحات میں قید کر لیا ہے۔ قرۃ العین حیدر کا مضمون اچھا ہے، اگرچہ ایک دو جگہ گنجائش کلام ہے مثلاً "میرا مذہب" کی تاریخ اشاعت (جس کا معلوم کر لینا کوئی دشوار کام نہیں تھا کہ خود اس طویل مضمون/رسالے میں چودھری صاحب نے تقسیم ہند کے بعد کی صورت حال کا ذکر کیا ہے۔ سو اُسے ۱۹۳۸ء کی تصنیف بتانا عجیب قسم کا سہو ہے)

غالب کی نثر پر شمیم حنفی صاحب کا مضمون کون سی نئی اِفراہم کرتا ہے ؟

نیّر صاحب کا انتخابِ انیس اور تعارف و تذکرہ حسبِ معمول بہت خوب ہے۔ یوں انتخاب تو بہرحال موضوعی ہوتا ہے پھر بھی ایک بند (حضرت حُرؒ کی شہادت والے مرثیے کا آخری بند) اس میں ضرور شامل ہونا تھا کہ خود نیّر صاحب نے نجی گفتگو میں اس بند کی حیرت خیز توسیعِ خیال کو تسلیم اور اس پر اظہارِ ستائش و تحسین کیا ہے۔ اس جادوگر نے نام جس کا انیس ہے عجب ہُنر دکھایا ہے کہ آخری بند کے آخری تینوں مصرعوں میں سے ہر ایک پر یقین ہو جاتا ہے کہ یہاں مضمون مکمل ہو گیا اور خیال اس سے آگے نہیں جا سکتا مگر وہ ساحر ہر کلائمکس کے بعد ایک اور کلائمکس پیدا کرتا چلا جاتا ہے۔ آپ بھی دیکھیں۔

مر گئے حُرؒ جری پھر نہ کچھ آواز آئی

طائرِ روح نے پرواز کی طوبیٰ کی طرف

پتلیاں رہ گئیں پھر کر شہِ والا کی طرف

"رولنگ چیر" بہت پسند آیا۔ گھر ہی کے باوجود اپنی انا اور آزادیٔ روح پر اصرار کرنے والے اس نسوانی کردار نے بہت متاثر کیا۔ اس افسانے کو پڑھ کر یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ عورت کی روح نے ہمارے فکشن میں راشد الخیری اور نذیر احمد سے لے کر حسن منظر تک کتنا لمبا سفر طے کیا ہے۔

انتظار حسین برابر اپنے آپ کو دہراتے چلے جا رہے ہیں۔ یہ کہانی تو "تخت مارنے" سے بھی کمزور ہے۔ "جاپیں" کے اختتام نے اسے ایک بہت اچھی کہانی بننے سے محروم کر دیا۔

ضیاء جالندھری صاحب کی غزلوں کو تبرّکات میں سمجھنا چاہئے۔ حمید نسیم صاحب کی غزلوں میں کوئی چیز اگر غیر معمولی ہے تو ان کی ہر غزل کے آخری شعر کا مطلع ہونا۔ لیکن اس سے حاصل ؟

"حضارت جدید" دل کو چھونے والی نظم ہے۔ عرفان صدیقی۔ لکھنؤ

"سوغات" پہلے بھی میں بہت شوق سے پڑھتا تھا اور آج بھی بڑے اطمینان اور پوری توجہ سے پڑھتا ہوں۔ حمید نسیم کا میراجی پر مضمون ان کے سابق مضامین کی طرح دلچسپ بھی ہے اور ان کی گہری بصیرت کا پتہ دیتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اعلیٰ تخلیقی ذہن ہی اعلیٰ درجے کی تخلیقات کے ساتھ انصاف کر پاتے ہیں۔ انھوں نے جدید شاعری کو جس توجہ اور ذمہ داری سے پڑھا ہے اُس کی تعریف کرنی ہوگی۔ بجائے اپنا سکّہ جمانے کے وہ واقعی متن کی تفہیم اور اس کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہیں۔ شمیم حنفی اور ابو الکلام قاسمی کے مضامین بھی پسند آئے۔

خوشی ہوتی ہے کہ آپ نے اس بار چار نئے افسانے شائع کئے۔ خالد جاوید اور خورشید اکرم کے افسانے بڑے سہم

اور اچھے ڈھنگ سے لکھے گئے ہیں، جیسا کہ ہونا چاہئے۔ دونوں ہی افسانے عمدہ ہیں۔ خورشید اکرم نے کلکتہ کے ماحول کو جس دلچسپ انداز میں اُجاگر کیا ہے، اُس سے افسانے کا تاثر مزید گہرا ہو جاتا ہے۔

اس بار آپ نے چودھری محمد علی ردولوی کا گوشہ پیش کیا۔ ایسے لوگ بھلانے کے لئے نہیں ہوتے۔ ان کا مضمون "میرا مذہب" آج بھی کشادہ دلی کی ایسی مثال ہے جس کی فی زمانہ بہت ضرورت ہے۔ شگفتہ، پیاری نثر دل میں اتر جاتی ہے۔ جی چاہتا ہے پڑھتے ہی چلے جائیں۔ یہ "سوغات" کا اہم کنٹری بیوشن ہے۔"

انور خان۔ بمبئی

"اداریے میں حمید نسیم کے مضمون کا جائزہ خوب ہے۔ تنقیدی بصیرت، مشکل سے ایسی رصد گاہ بن پاتی ہے، جہاں سے گم گشتہ ستاروں کا اس طرح سراغ لگایا جائے جس طرح حمید نسیم نے لگایا اور ان کے اندر اس طرح معانی کے دھندلکے دریافت کئے جائیں جس طرح حمید نسیم نے دریافت کئے —— ہم اس نقاد کو ادب کے ساتھ سراہتے ہیں۔

اس شمارے کی عمارت، نظم، غزل، مضمون، افسانہ، خودنوشت، تبصرہ، غرض ہر لحاظ سے تناسب کا حسن اور معیار کی شان رکھتی ہے۔

چودھری محمد علی ردولوی کا گوشہ زیرِ مطالعہ ہے۔ ممکن ہے "میرا مذہب" کی وجہ سے آپ کو دو طرفہ اعتراضات کا ہدف بننا پڑے۔

تاریخ کے زخموں کا علاج فریقین دو طریقوں سے کرتے ہیں۔ یا تو پٹیوں سے انھیں اس طرح چھپا دیا جائے کہ کسی کو دکھائی نہ دیں یا اس طرح کھلا چھوڑ دیا جائے کہ تعفن ہر متنفس تک پہنچے۔

تاریخ رومی، سنائی اور عطار کی نگاہ میں ہے۔ وہ تاریخ کو سرچشمے سے کٹنے نہیں دیتے اور جب کبھی ایسا نازک موڑ آئے کہ اجتماعی زندگی کا دھارا نہروں میں بٹ کر بہنے لگے تو وہ دانشور شعراء "پس چہ باید کرد" کا جواب تلاش کرنا اپنی ذمے داری سمجھتے ہیں۔ ان کے بعض اشعار و امثال کی تعبیر، فقیہانہ اور صوفیانہ دونوں سطحوں پر کی جا سکتی ہے اور مختلف معانی برآمد ہو سکتے ہیں۔ رومی کو اس کا احساس ہے۔ ایک مقام پر وہ حسام الدین چلپی کے روپ میں آنے والے دور کو مخاطب کرتے ہیں:۔

بو کہ فیما بعد دستورے رسد　　رازہائے گفتنی گفتہ شود

با بیانے کہ بُوَد نزدیک تر　　زیں کنایات خفی و مستتر

مثنوی را مشرحِ مشروح دہ　　صورت امثال او را روح دہ

تا خروش جملہ عقل و جاں شوند　　سوئے خلدستانِ جاں پرّاں شوند

اس آبشار در آبشار بہتے دریا کو بھی جس کا نام رومی ہے، سنائی اور عطار کے ساتھ اس سرزمین نے بعد از مرگ جلاوطن کر دیا، جو

ان کی جنم بھومی تھی۔ وجۂ ناراضگی ؟ بعض اشعار و امثال ـــــ

دراصل ایران میں اجنبی، سنائیؔ، عطارؔ اور رومیؔ ہیں ـــ راشدؔ نہیں ـــ راشدؔ کا ایران تو برطانوی ملٹری کیمپ کے اطراف کے علاقے پر مشتمل ہے۔ حقیقی ایران اُن کی نگاہ سے اوجھل ہے۔ اسی طرح حاجی بابا اصفہانی کا ایران، استعماری طاقتوں کی ترجمانی کرنے والے اہلِ قلم کے ذہن میں جما ہوا نقشہ ہے۔ تاہم ایک طویل عرصے پر محیط اور بزوال، ایران کا مقدر بن گیا ؎

بیں کہ از تقطیعِ ما یک تار ماند　　　مصر بودیم و یکے دیوار ماند

حضرت ابوذر غفاریؓ کی مثال کو سامنے رکھنے کے بعد یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے اختلافات کتنے بے بنیاد ہیں۔ معاشرے کے ایک طبقے کے ہاتھ میں سرمایے کی طاقت، آگے چل کر معاشرتی زندگی کو دینی مقاصد سے بے گانہ کر سکتی ہے، یہ پیش بینی اپنی جگہ درست، مگر اس کے زیرِ اثر چلائی جانے والی مہم، اور اس کے طریقۂ کار کا، دستوری نقطۂ نظر سے جائزہ لینا بھی ضروری تھا۔ حقِ ملکیت شہری کا بنیادی حق ہے اور اس تحریکِ اصلاح کی ضرب اس حق پر پڑ رہی تھی ـــ ایک طرف حضرت ابوذرؓ اپنے صدق و اخلاص میں کامل ہیں تو دوسری طرف بارگاہ خلافت دستور کے تحفظ میں حق بجانب۔ ان میں سے کسی کو ظالم اور کسی کو مظلوم کہنا مشکل ہے۔ یہ تو اپنے اپنے اجتہاد میں ثابت قدم سابقین اوّلین ہیں۔

آگے چل کر اسلام کو، دستوری تحفظات کو پامال کرنے والے بہت سے ادوار سے نبرد آزما ہونا تھا۔ جن میں سے ایک دور کا عنوان اشتراکیت ہے۔ اسلام کو اپنے اولوالعزم اور حوصلہ مند پیروؤں کی آزادیٔ کسبِ معاش پر کوئی اعتراض نہیں۔ بشرطیکہ وہ دینی واجبات ادا کرنے کے پابند ہوں۔ بس کچھ تحدیدات ہیں جو ناجائز ذرائعِ آمدنی پر عائد کی گئی ہیں۔

اسی طرح حضرت عمرؓ اور حضرت خالدؓ بن ولید کے درمیان جو اختلاف تھا، اس کی وجہ سے ان دونوں میں سے کسی ایک کی عظمت کم نہیں ہوتی۔ ان میں سے ایک حضرت عمرؓ قابلِ احترام آمر ہیں تو دوسرے قابلِ تعریف مأمور ـــ اور ہر دو اپنی اپنی جگہ قدرت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ـــ بہرحال تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ الخ ـــ اب ہر امتی کا یہ ارمان ہے کہ جب وہ خاکِ لحد میں آسودہ ہو تو اس کے دل میں خدا کے کسی برگزیدہ بندے کے خلاف کوئی جذبہ نہ ہو۔

شفیق فاطمہ شعریٰ ۔ حیدرآباد

”آپ“ سوغات“ (۹) پڑھنے کا موقع ہی نہیں دے رہے ہیں ـــ پھر بھی بھاگتے دوڑتے حسنؔ منظر، انتظار حسین اور خورشید اکرم و خالد جاوید کے افسانے پڑھے۔ اچھے لگے اور محسوس ہوا کہ آپ اور آپ کے ساتھی وہ چنگاری خاکستر سے نکال لائیں گے جو موجود تو ہے مگر اس کی اہمیت کو کچھ لوگ جان بوجھ کر نظر انداز کر رہے تھے۔“

شمس الحق عثمانی ۔ دلّی

"حمید نسیم صاحب بہت درد مندی کے ساتھ مضامین لکھتے ہیں۔ وہ موضوع میں ڈوب کر بات آگے بڑھاتے ہیں۔ ان کے تنقیدی رویّے میں ایک خاص طرح کی شرافتِ نفس کا بھی دخل ہے، جسے بآسانی محسوس کیا جا سکتا ہے، اور یہی وہ مقام ہے جہاں وہ پیشہ ور نقّادوں سے الگ نظر آتے ہیں۔ اچھی اور صالح تنقید کے لئے شرافت نفس اور شرافت نظر دونوں بڑی لازمی شرطیں ہیں۔ پیشہ ور نقّادوں کو چاہئے کہ وہ حمید نسیم صاحب کے مضامین اس نقطۂ نظر سے بھی پڑھیں۔

میرا جی پر گفتگو کرتے وقت انھوں نے میرا جی کے اسلوب کو تین بڑے خانوں میں تقسیم کیا ہے:

(۱) ہندی الفاظ، علایم، اساطیر سے مملو اسلوب۔

(۲) فارسی زدہ اسلوب۔

(۳) وہ اسلوب جس میں ہندی اور فارسی کی کم یا زیادہ آمیزش ہے۔

پہلے اسلوب پر گفتگو کرتے وقت انھوں نے کچھ عجیب باتیں بیان کی ہیں جن کا جواب ضروری ہے۔ یہ ایک طرح سے فرضِ کفایہ بھی ہوگا کہ حمید نسیم صاحب نے تمام اردو بولنے والوں کی SENSIBILITY اور ETHOS کو ایک ہی لکڑی سے ہانک دیا ہے۔ اردو بولنے والوں کی SENSIBILITY اور ETHOS کے بارے میں ان کے خیالات جس جگہ بیان ہوئے ہیں ان میں کا ایک پیراگراف مکمل نقل کر رہا ہوں تاکہ قارئین کو پچھلا شمارہ دیکھنے کی زحمت نہ اٹھانی پڑے:

"پہلے میں اس اسلوب کا ذکر کروں گا جس میں علامتیں، استعارے، کردار، تلمیحات ایک ایسی تہذیبی اور روحانی روایت سے لی گئی ہیں جس سے اردو زبان بولنے والے شناسا نہیں اور جو برصغیر میں بارہ سو سال (۱۷۰۰) غیر مسلم آبادی کے ساتھ رہ کر بھی ہماری ادبی، روحانی اور معاشرتی روایت سے دور رہے ہیں۔ ہم نے یہاں کے پھل اور ترکاریاں، یہاں کی بھجیا اور دال ساگ تو اپنا لئے۔ ہنڈیا اور رچوکا بھی جانے یہاں آگئے۔ مگر ہم نے نماز کو کبھی پوجا، دعا کو پرارتھنا نہیں کہا۔ صبح کو اوشا بھی کسی مسلم روایت میں نہیں دیکھا۔ مسلم بنگلہ زبان پر سنسکرت کا اثر نمایاں ہے مگر وہاں بھی پانی کو پانی کہا جاتا ہے، جل یا جول نہیں کہا جاتا۔ آسمان کو آسمان ہی کہا جاتا ہے، آکاش یا انبر نہیں۔ جنازے کو ارتھی بھی ہماری کسی علاقائی زبان میں نہیں کہا جاتا۔ اور مجھے یقین ہے کہ یہ اساطیر اور یہ الفاظ اردو زبان کا حصّہ کبھی نہیں بن پائیں گے ــــ جب ایک ملک تھا تو نہ بن سکے، اب تو تین ملک ہیں۔ اب انھیں اپنی میں کون سمو رما لا سکے گا۔"

میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ فاضل مضمون نگار نے تمام اردو بولنے والوں کے بارے میں بیک جنبشِ قلم یہ فیصلہ

کیسے کردیا کہ وہ ہندوستان کی تہذیبی اور روحانی روایت کی علامتوں، استعاروں، کرداروں، تلمیحات اور اساطیر کے شناسا نہیں ہیں۔ اردو بولنے والی اکثریت سے ان کی کیا مراد ہے؟ ہندوستانی اردو داں یا پاکستانی اردو داں یا دونوں؟ ویسے ان دو ملکوں کے علاوہ بھی ایک بڑی تعداد دوسرے ممالک میں زندگی بسر کر رہی ہے جیسے عرب امارت لندن اور کنیڈا وغیرہ۔ ممکن ہے پاکستان کے اردو بولنے والے ہندی الفاظ و اساطیر کو کسی خاص نقطۂ نظر سے دیکھتے ہوں، جہاں تک ہندوستان کی اردو داں اکثریت کا تعلق ہے (اور یہ بڑی اکثریت ہے) تو اس کے لئے تو ہندی الفاظ، علائم استعارے اور اساطیر کا معاملہ یہ ہے کہ بقول فاضل بریلوی مولانا احمد رضا خان علیہ الرحمۃ:

ع ہمارا تو یہ روزمرّہ ہے صاحب

میں ہندوستان کی اردو داں اکثریت کے بارے مکمل یقین کے ساتھ عرض کر رہا ہوں کہ وہ مہابھارت اور رامائن ہی کی روایت سے واقف نہیں، وید اور اپنشد کی روایت کی بھی شناسا ہے۔ شنکر کا نام تباہی کی علامت کے طور پر استعمال ہوتا ہے جو اپنا تانڈو رقص کر کے سب کچھ نابود کر سکتا ہے۔ برہما خلاقی کی علامت ہے اور وشنو کو جود وکرم کی علامت بتایا گیا ہے۔ آج کا اردو داں امیر حمزہ، افراسیاب، کوکب روشن ضمیر، اسد بن کرب غازی، عمرو عیار، ملکہ بہار، ملکہ مہ رخ، شہنشاہ نورافشاں کے ناموں اور کرداروں سے اتنا آشنا نہیں ہے جتنا رام، کرشن، سیتا، لچھمن، بھرت، ہنومان، کیکئی، دشرتھ، یدھشٹر، ارجن اور دھرت راشٹر کے ناموں اور کرداروں سے واقف ہے بلکہ ان کرداروں میں درشائی گئی انسانی خصلتوں سے بھی واقف ہے۔ اس تہذیبی اور روحانی روایت کی تلمیحات بھلا ہمارے لئے اجنبی نہیں ہیں۔ جب ہم اپنی روزمرّہ کی زندگی میں کسی کو زیادہ دیر تک سوتے رہنے کا طعنہ دیتے ہیں تو کمبھ کرن کا ہی حوالہ دیتے ہیں اصحاب کہف کا نہیں۔ جبکہ عقیدے کے اعتبار سے اصحاب کہف اور اُن کی نیند پر یقین ایمان کا ایک حصّہ ہے کہ یہ قرآن عظیم میں بیان ہوا ہے۔ جب کوئی کسی جگہ جم کر رہ جائے تو "زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد" سے زیادہ انگد کا پیر ہی کام آتا ہے۔ ٹیلی وژن کے پھیلاؤ سے پہلے بھی ہندوستان کی اردو آبادی مہابھارت اور رامائن کے قصّوں سے واقف تھی۔ ہندوستان میں صدیوں سے "رام لیلا" شہروں، قصبوں اور دیہات کا ایک جانا پہچانا منظر ہے جن میں اکثر کردار خود مسلمان ادا کرتے آئے ہیں۔ میرے خیال میں علامتوں، استعاروں تلمیحات، اساطیر اور کرداروں وغیرہ پر اتنے حوالے کافی ہوں گے۔

حمید نسیم صاحب کا یہ اعتراض بھی بالکل بے جا ہے کہ مسلمان بارہ سو برس غیر مسلم آبادی کے ساتھ رہنے کے باوجود [ہماری] ادبی، روحانی اور تہذیبی روایت سے دور رہے۔ حمید نسیم صاحب کا لفظ "ہماری" کا استعمال ہی اس بات کا غمّاز ہے کہ اردو والے اس روایت کو ادبی، روحانی اور معاشرتی سطح پر اپنا ہی سمجھتے آئے ہیں۔ حجاب صرف اس قدر ہے

کہ مسلمان ان روایتوں کو معاشرتی اور تہذیبی سطحوں پر قبول کرتے ہیں، مذہبی سطح پر نہیں۔ اور یہ کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں ہے۔

فاضل مضمون نگار کا یہ اعتراض بھی عجیب و غریب ہے کہ ہم نے یہاں کے پھل اور ترکاریاں، یہاں کی بھجیا اور دال ساگ تو اپنا لیے "مگر نماز کو کبھی پوجا اور دعا کو پرارتھنا نہیں کہا" — یہاں کے پھلوں اور ترکاریوں کو اپنانے سے ان کی کیا مراد ہے، یہ متن سے ظاہر نہیں ہوتا۔ کیا وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہم نے یہاں کے پھلوں اور ترکاریوں کو اپنے خورد و نوش کا حصہ بنا لیا اگر ایسا ہم لوگوں نے کیا — اور یقیناً کیا — تو بہت اچھا کیا۔ کفرانِ نعمت کیوں کرتے۔ طرح طرح کے میوہ ہائے خشک و تر ہندوستان میں پائے تو دل بھر کے کھائے اور خدا کا شکر بجا لائے کہ وہ رزّاقِ اکبر دھرتی کے ہر حصے پر اپنے بندوں کے واسطے نعمتوں کا انتظام فرماتا ہے۔

اگر مضمون نگار کا مقصد یہ ہے کہ ہم نے ان پھلوں اور ترکاریوں کے نام قبول کر لئے — تو آخر اس میں بُرا ہی کیا ہے اور اس کے بغیر چارہ بھی کیا تھا۔ یہاں اتنے انواع و اقسام کے پھل اور ترکاریاں دستیاب ہیں اور اُن کے اسم معرفہ بھی دستیاب ہیں کہ ہر پھل اور ترکاری کو اس کے نام کے ساتھ قبول کرنے کا لطف ہی کچھ اور ہے۔ آم، انار، انگور، شریفہ، سنگترہ، موسمبی، شفتالو، آلو بخارا، لیچی، تربوز، خربوزہ، بیر، امرود، چیکو اور رس بھری وغیرہ وغیرہ کو کیا ہم ان کے ناموں کے بغیر شناخت کر سکتے ہیں یا انھیں کسی ایسے نام سے پکار سکتے ہیں جو عرب اور ایران میں کسی اور پھل کے لئے رائج ہیں۔ بابر نے ہندوستان میں خربوزہ پسند کیا اور اس کو اسی نام سے پکارا تھا۔ ترکاریوں کا بھی یہی حال ہے۔ آپ بھنڈی کہہ کر ترئی نہیں خرید سکتے یا صرف ترکاری کہہ کر اپنے ملازم سے من چاہی سبزی نہیں منگا سکتے۔ میں بمبئی میں مقیم ہوں۔ یہاں کے مقامی مراٹھی بازاروں میں پیاز کا لفظ کم رائج ہے۔ اسے کاندہ کہتے ہیں۔ ہم بھی دوکاندار سے کاندہ ہی کہہ کر طلب کرتے ہیں، پیاز نہیں۔ مراد یہ ہے کہ مقامی طور پر جو چیز رائج ہے اسے قبول کرنا ہی ہوتا ہے کہ اس سے زندگی میں آسانی پیدا ہوتی ہے۔ قبول کرنے کا یہ عمل ساری قومیں اختیار کرتی ہیں کہ چیزوں کی مخصوص پہچان اُن کے مقامی ناموں سے ہی ہوتی ہے۔ باقی معاملات میں قبول کرنے کا عمل اس وقت تک دل خوش کن ہوتا ہے جب تک وہ عقائد کے مسلّمات اور مخصوص تہذیبی شناخت پر حملہ آور نہ ہو۔

فاضل مضمون نگار کا یہ اعتراض :— "مگر ہم نے نماز کو پوجا اور دعا کو پرارتھنا نہیں کہا" — یقیناً نہیں کہا، اور بہت اچھا کیا جو نہیں کہا۔ لسانی نقطۂ نظر سے بھی یہ بہت اچھا ہوا۔ ہر لفظ کے پیچھے ایک مخصوص تہذیب کی پرچھائیں ہوتی ہے۔ ہندوستانی اردو آبادی کی اکثریت ہند ایرانی تہذیب کی نمائندہ ہے۔ نماز فارسی لفظ ہے۔ عربی میں اسے صلوٰۃ کہتے ہیں۔ ایک مخصوص عقیدے والے گروہ کے کچھ مخصوص مذہبی ارکان کو ترتیب سے عمل دینے کا نام نماز ہے۔ نماز کا لفظ سنتے ہی اس کے دیگر متعلقات کا خاکہ ذہن میں روشن ہو جاتا ہے۔ وضو، مسجد، امام، قیام، رکوع، سجود، سلام اور پھر دعا — پوجا کا لفظ

اس کے مقابلے میں مجرّد محسوس ہوتا ہے، وہ اتنے وسیع مظاہر و مناظر اپنے اندر نہیں سمو سکتا — ماہرینِ لسانیات کا دعویٰ ہے کہ کوئی بھی لفظ کسی دوسرے لفظ کا مترادف نہیں ہوتا۔ پوجا کا لفظ تو نماز کے مترادف کے آس پاس بھی نہیں ہے۔ پوجا کے لفظ کو اگر کسی لفظ کا مترادف کہا جا سکتا ہے تو وہ ہے عبادت۔ یہ بات کہتے ہوئے مجھے خوشی کا احساس ہوتا ہے کہ قرآن عظیم کا ترجمہ کرنے والے بعض راسخ العقیدہ علماء نے بھی کہیں کہیں عبادت کا ترجمہ پوجا ہی کیا ہے اور کرتے ہیں۔ اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ کا ترجمہ "ہم تیری ہی پوجا کرتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں"، اکثر دیکھنے میں آیا ہے۔ دعا اور پرارتھنا کا بھی وہی معاملہ ہے کہ دونوں لفظوں سے دو مختلف پیکر سامنے آتے ہیں۔ دعا میں عجز و طلب کے عناصر حاوی ہیں، جبکہ پرارتھنا میں تعریف، یکسوئی اور دھیان کا تصور ابھرتا ہے۔ حمیدؔ نسیم صاحب زندگی کے مختلف النوع مظاہر کو کسی خاص لفظ کے ذریعے ادا کرنے پر اصرار کریں گے تو لفظ اور ان کی اظہاری صلاحیت اور پیکری معنویت پر بُرا اثر پڑے گا۔ لفظ بھی رفتہ رفتہ کم ہو جائیں گے اور ان کے بصری مظاہر بھی محدود تر ہوتے جائیں گے۔

حمیدؔ نسیم صاحب کا کہنا ہے کہ انھوں نے صبح کو اوشا بھی کسی مسلم روایت میں نہیں دیکھا۔ اوشا بھی خوبصورت لفظ ہے لیکن ذرا غور فرمائیے کہ صبح کا لفظ اپنے اندر کتنے مختلف الجہت بصری پیکر سمیٹے ہوئے ہے — اندھیرے کے بطن سے پھوٹتا اجالا، فجر کی اذان کی نورانی لہریں، پرندوں کی غنودہ چہکار، دیواروں پر اترتی روشنی — اور ایسے نہ جانے کتنے بصری پیکر ہیں جو اوشا کہنے میں ضائع ہو جاتے ہیں۔ صبح کا لفظ تو اتنا پیارا اور وسیع معنی کو سمیٹے ہوئے ہے کہ اب اوشا کہنے والوں کی اکثریت بھی صبح ہی کہتی ہے، اوشا نہیں۔ اوشا کا لفظ نظموں میں ایک خاص طرح کا مفہوم ادا کرنے کی حد تک سجتا ہے، ویسے نہیں۔

فاضل مضمون نگار کا اعتراض:۔ "آسمان کو آسمان ہی کہا جاتا ہے امبر نہیں" — اردو آبادی شعوری یا لاشعوری طور پر اپنے لفظوں کی حرمت، کیفیت اور محلِ استعمال سے واقف ہے۔ اسے علم ہے کہ کہاں سپہر، کہاں فلک، کہاں آسمان اور کہاں آکاش استعمال کرنا ہے۔ میرؔ کہتے ہیں ؎

(۱) مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں   تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

(۲) ہم خاک میں ملے تو ملے لیکن اے سپہر   اس شوخ کو بھی راہ پہ لانا ضرور تھا

ایک عام اردو داں بھی اس بات سے خوب واقف ہوگا کہ اگر ان اشعار میں فلک اور سپہر ایک دوسرے سے بدل دیے جائیں یا ان کے مقام پر ان کا ہم وزن اور بظاہر ہم معنی لفظ گگن استعمال کیا جائے تو ان اشعار کی جمالیات کا کتنی بری طرح خون ہوگا۔ زمانے کا شکوہ کرنے کا ایک مخصوص محاورہ ہے کہ آسمان کو دشمن آسمان کہہ دیا یا فلک کو فلکِ ناہنجار

— آ کاشن اور انبر کے ساتھ کیا یہ سابقے اور لاحقے وہ مفہوم ادا کر سکتے ہیں؟ — ہرگز نہیں۔

فاضل مضمون نگار کا اعتراض: ۔"جنازے کو ارتھی بھی ہماری کسی علاقائی زبان میں نہیں کہا جاتا۔"

جنازہ اور ارتھی دونوں لفظ اردو میں رائج ہیں۔ البتہ فرق یہ ہے کہ جنازہ مسلمان کے لئے استعمال ہوتا ہے اور ارتھی ہندو کے لئے۔ یہاں میں پھر یہ بات دہراؤں گا کہ کوئی لفظ دوسرے لفظ کا بدل نہیں ہو سکتا۔ جنازہ صرف میت کو نہیں کہتے۔ میت کو غسل دینے کے بعد جب اسے کفن پہنا دیتے ہیں اور پلنگ یا تابوت میں لٹا دیتے ہیں تب اسے جنازہ کہتے ہیں۔ جنازے کے تصوّر کے ساتھ نماز جنازہ، قبرستان، قبر، کفن، کافور وغیرہ کا دھیان آتا ہے۔ جبکہ ارتھی کے تصوّر کے ساتھ دوسرے معاملات ہیں۔ ارتھی دو بانسوں کو رسّی اور ریشوں کی مدد سے باندھ کر تیار کی جاتی ہے اور چوڑائی میں بہت کم ہوتی ہے۔ ارتھی کا جلوس تیز تیز چلتا ہے جب کہ جنازے کا جلوس متوازن رفتار سے چلتا ہے۔ ارتھی کے ساتھ شمشان، چتا، لکڑی اور اونچے اونچے شعلوں کا تصوّر ذہن میں آتا ہے۔ ان دونوں لفظوں سے دو مختلف پیکر اُبھرتے ہیں۔ ان کو ایک کرنے پر اصرار قومی یکجہتی جیسے معاملات پر گفتگو کرنے کے لئے تو شاید ٹھیک ہو لیکن لسانی حرمتوں کے دربار میں یہ اصرار راندۂ درگاہ ہی ٹھہرے گا۔

اردو بولنے والوں کی SENSIBILITY اور ETHOS پر اس قدر بے جا اعتراضات صرف اس تمہید میں تھے کہ حمید نسیم صاحب کو میرا جی کی ایک نظم "یہودی" کا ذکر کرنا تھا۔ آٹھ مصرعوں کی اس نظم کو میں نے بہت توجّہ کے ساتھ پڑھا اور آٹھ دفعہ پڑھ گیا۔ مجھے اس میں ہندوستان کی تہذیبی یا رومانی روایت کی کوئی علامت، استعارہ، اساطیر، کردار یا تلمیح نہیں ملے۔ اس نظم میں نہ تو اس تہذیب کا کوئی کردار ہے نہ علامت ہے نہ استعارہ ہے نہ ہی اساطیر یا کوئی تلمیح ہے۔ سچ پوچھئے تو اس نظم کی معنویت بھی شاعرانہ سطح پر کوئی ارفع چیز نہیں پیش کرتی۔ روزمرّہ کی بول چال کے عام ہندی لفظوں کو آزاد نظم کے آٹھ مصرعوں میں ایک خاص آہنگ کے ساتھ پرو دینا [آخری مصرع: ہندی پینگل سے بھی کتنا لڑ رہا ہے] کوئی شاعرانہ کمال نہیں ہے۔ اتنی طویل تمہید اور اردو بولنے والوں کے ETHOS اور SENSIBILITY پر اتنے بے محابہ حملے کرنے کی وجہ تمہید یعنی "یہودی" نام کی جو نظم پیش کی گئی ہے وہ کسی لحاظ سے بھی، لفظی اور معنوی کسی سطح پر بھی کوئی بہت اعلیٰ شاعری کا نمونہ پیش نہیں کرتی۔ ذرا آگے بڑھ کر فاضل مضمون نگار کے دو مزید ارشادات قابلِ توجہ ہیں:۔

"میں بہ صراحت قاری کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ میرا جی کا ہندی اساطیر اور دیو مالائی عناصر والا لہجہ اور شعری اسلوب اردو بولنے والوں کی اکثریت کے سے میل نہیں کھاتا۔" اور

"یہ اسلوب اردو کی شعری روایت اور لسانی روایت کے وارثوں میں کبھی رواج نہیں پا سکتا۔"

پہلی بات تو یہ ہے کہ ان کی پیش کردہ دونوں نظمیں یعنی "یہودی" اور "اجالا" اساطیر اور دیومالائی عناصر دونوں سے پاک ہیں۔ اس لئے مضمون نگار نے دعوے کی عمارت کی پہلی اینٹ ہی ٹیڑھی رکھی ہے۔ اس لئے اس مخصوص نقطے پر گفتگو کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ان نظموں کا ایک ہی وصف ہے کہ ان میں ہندی الفاظ کو استعمال کیا گیا ہے ["اجالا" میں ہندی لفظوں کا استعمال نسبتاً زیادہ تخلیقی ہے] اس کے باوجود یہ نظمیں شاعری کا کوئی اعلیٰ معیار پیش نہیں کرتیں۔

جہاں تک میراجی کی ان نظموں کے اسلوب کا اردو شعری روایت اور لسانی روایت کے وارثوں میں رواج نہ پانے کا تعلق ہے تو میں بہت ادب کے ساتھ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ خالی اسلوب کبھی روایت کا حصہ نہیں بنتا — نظم ہو یا غزل، کہانی ہو یا ناول — یہ اپنی مکمل شکل میں روایت میں داخل ہوتے ہیں۔ میں یہاں یہ بات بھی واضح کرنا چاہتا ہوں کہ میراجی ہندی الفاظ و اساطیر والے اسلوب کے نہ موجد تھے نہ خاتم اور نہ ہی ان کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس طرح کے اسلوب کو سب سے بہتر انداز میں انھوں نے ہی استعمال کیا ہے۔ یہ اسلوب اردو بولنے والی آبادی کی شاعری میں صدیوں پہلے سے استعمال ہوتا رہا ہے اور میراجی کے بعد بھی اردو شاعری نے ہندی الفاظ و اساطیر اور دیومالائی عناصر کو اپنے دامن میں جگہ دی ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ حمید تسیم صاحب نے میراجی کے اس اسلوب پر گفتگو کرتے وقت سہواً یا عمداً نظیر اکبرآبادی کو کیسے فراموش کر دیا۔ نظیر ہندی الفاظ، ہندوستان کی تہذیبی اور رومانی روایت کے علائم، کردار، اساطیر اور ہندوستانی تہذیبی روایت کے مظاہر سے متعلق معاملات کے سب سے بڑے امین تھے ؎

ٹک حرص و ہوا کو چھوڑ میاں مت دیس بدیس پھرے مارا
قزاق اجل کا لوٹے ہے دن رات بجا کر نقّارا
کیا بدھیا بھینسا بیل شتر کیا گوین پلاّ سر بھارا
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

اس پوری نظم کو ایک پلڑے میں رکھئے اور میراجی کے ہندی اسالیب والی پوری شاعری کو دوسرے پلڑے میں۔ پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے۔

ہندوستان کی اردو داں اکثریت خسرو، رحیم، کبیر، میرا، رس کھان، جائسی، سورداس اور تلسی کے ہندی بولوں کو نہ صرف یہ کہ سمجھتی ہے بلکہ ان بولوں میں چھپے اساطیر، علائم، تلمیحات اور کرداروں کو بھی ادب کی سطح پر صدیوں سے پسند کرتی آرہی ہے۔ میراجی نے تو ہندی کے وہ الفاظ استعمال کئے ہیں جو کھڑی بولی کے ضمن میں

آتے ہیں اور جو نسبتاً اردو داں افراد کے ذہنوں سے قریب ہیں، ہم تو اودھی اور برج سے ملو ہندی بھی خوب سمجھتے ہیں اور اس سے لطف بھی لیتے ہیں اور مسرت اور بصیرت بھی حاصل کرتے ہیں۔ جنوبی ہندوستان اور شمال مشرقی ریاستوں کے اسکول کے نصاب کے بارے میں میری معلومات محدود ہیں لیکن باقی ہندوستان میں بچوں کو نصاب میں مندرجہ بالا شاعروں کو پڑھایا جاتا ہے اور اسکولوں میں پڑھنے والے اردو آبادی کے بچے بیت بازی کے مقابلوں میں ان شاعروں کے دوہے کو بتائیں بڑے جوش و خروش کے ساتھ پڑھتے ہیں ؎

کاگا سب تن کھائیو چن چن کھیو ماس | دو نینا مت کھائیو پیا ملن کی آس
سونا لینے پی گئے سونا کر گئے دیس | سونا ملا نہ پی ملے روپا ہو گئے کیس
گوری سووے سیج پر مکھ پر ڈارے کیس | چل خسرو گھر آپنے سانجھ بھئی چو دیس
رحیمن نین پر کا رسے بہت ان بہت پہچان | پر بس پڑے، پڑوس بس پڑے ما ملا آن
کبیرا کھڑا بجار میں سب کی مانگے کھیر | ناکا ہو سے دوستی ناکا ہو سے بیر

قادریہ سلسلے کے بہت بڑے صوفی و بزرگ شاعر حضرت سید شاہ برکت اللہ پیمی کی شاعری کے مندرجہ ذیل نمونے ملاحظہ کریں۔ یہ اب سے تین سو برس پہلے کہا تھا ؎

رہوں اکیلی مو ہنا گئے چھوڑ سکھ سات | بھلو ہو جیو برہ کو سنگ رہے دن رات
بیکنٹھا ہے سنتن کو، ترک استے جا نہہ | ہم کو موہن چاہیں ملے جو بھر بھر باتہہ
اُت ساون اِت نین ہیں اُت گرجن اِت آہ | اُتہہ کو کِ اِتہہ ہوک ہے سکو تو لیہو تباہ
تم سورج ہم دیپ ہنس اجگت کہے سنائے | بن دیکھے نہیں رہ سکوں، دیکھوں رہا نہ جائے
پیمی من کے نگر میں جو من پھرا دیہہ | سو وے سدا انند سوں چور نہ ما یا لیہہ
پیمی ہندو ترک میں ہری کا رنگ سمائے | دیول اور مسیت میں دیپ ایک ہی بھائے

ماضی قریب میں فراق اور سو آمی مارہروی بھی اپنے ہندی بولوں اور ہندوستانی تہذیب کی روایات سے اپنی شاعری مالا مال کر چکے ہیں ؎

یہ رس کی سیج، یہ سکمار یہ سکومل گات
نین کمل کی جھپک کام روپ کا جادو
رسمساتی پلک کی گھنی گھنی پرچھائیں (فراق — نظم آدھی رات)

حال کے شاعروں میں بھیکی اُتساہی نے ہندوستانی تہذیبی اور رومانی روایت کو ہندی بولوں میں اپنی شاعری کا حصّہ بنایا ہے۔ اساطیر اور دیو مالائی عناصر کو آج کا نوجوان شاعر عنبر بہرائچی اس انداز سے استعمال کرتا ہے۔

بدھشٹر

ابھی چیڑ کے جنگلوں سے گزرنا بہت جانفزا ہے

کئی میل کے بعد برفیلے تودوں کا صحرا ملے گا

جہاں سرد پروائیوں کے تھپیڑے تھرکتے ملیں گے

عمودی ڈھلانوں کا اک سلسلہ بھی ملے گا اچانک

جسے پار کرنے کی دھن میں تمہیں اپنے سب ساتھیوں کو گلانا پڑے گا

حسین دروپدی اور تمہارے جری بھائیوں کی جماعت

انھیں برف زاروں کا حصّہ بنے گی

مگر یہ بھی ہوگا بدھشٹر! تمہارا وفادار کتّا

تمہارے عقب میں بصد شوق ہر وقت چلتا رہے گا

مخالف فضا میں تمہاری ہی دھڑکن کا حصّہ رہے گا

اسے یخ جہنم نہیں چھو سکے گا

تمہارے جری بھائیوں کی وجاہت تمہاری حسین دروپدی کی ملاحت

تمہارے وفادار کتّے کے آگے پشیماں رہے گی!!!

میں نے جو گفتگو کی وہ ہندوستانی اردو آبادی کو مدّنظر رکھ کر کی ہے۔ پاکستانی اردو آبادی ہندوستان کی تہذیبی اور رومانی روایت سے کس قدر واقف یا ناواقف ہے، بہتر ہوگا کہ پاکستان کا کوئی ادیب اس کا جواب دے۔

اس شمارے کی جان چودھری محمد علی ردولوی کا گوشہ ہے۔ آپ جس طرح اگلوں کے کارناموں سے "سوغات" کے قارئین کو واقف کرا رہے ہیں وہ آپ ہی کا حصّہ ہے ـــ زبان کا تخلیقی استعمال، ذات کا بے جھجک اظہار، زندگی کو بازیچۂ اطفال سمجھ کر زندہ رہنے کا فن ـــ کیا ہے جو محمد علی شاہ فقیر کے کشکول میں نہیں ہے۔ ان کے خطوط نفسِ موضوع کے اعتبار سے حقائق کا اظہار ہیں لیکن پیرایۂ بیان نے انھیں فکشن کی طرح دلچسپ بنا دیا ہے۔ اردو میں کم لوگ ہوں گے

جنھوں نے ایسے خط لکھے ہوں گے۔

حسن منظر نے بہت معنیٰ خیز افسانہ دیا ہے۔ حیرت ہے کہ اتنے طویل بیانیے میں کہیں اکتاہٹ کا احساس تک نہیں ہوتا۔ اور قابلِ تعریف بات یہ ہے کہ افسانہ اپنے مرکزی نقطے سے ایک لمحے کے لئے بھی اِدھر اُدھر نہیں ہٹتا۔ جاوید خالد اور خورشید اکرم نے ایک بار پھر اچھے افسانے لکھے ہیں۔ شمیم حنفی نے غالب کی نثر کے بارے میں چند نئے نکات کا اظہار کیا ہے۔ غالب کی نثر میں واقعہ نگاری اور مکالماتی انداز پر پہلے بھی بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن شمیم حنفی نے واقعہ نگاری اور مکالمے کو جس طرح غالب کی زندگی کے ڈرامے سے مربوط کر کے دکھایا ہے، وہ نئی چیز ہے۔ بیدی کے کرداروں اور بیانیے پر ابوالکلام قاسمی کا مضمون بہت اچھا لگا۔

شفیق فاطمہ شعریٰ کی نظم بھی بہت اچھی لگی۔ احمد جاوید سے پھر غزلیں منگوائیے۔" سید محمد اشرف۔ بمبئی

"تازہ شمارہ خوب ہے۔ خاص طور پر ردولوی والے گوشے کا جواب نہیں۔ ایک ایک سطر پڑھ ڈالی۔ "دیوجالس یا ابی قورس"، "دوا"، خطوط کے اقتباسات بھرپور ہیں۔ پھر "میر باقر"، "مرزا منش"، "دھوکہ" کس کس کی تعریف کروں؟ جو کچھ تعریف کرنی تھی ریڈیو پر کر آیا، اب لکھنے کا کیا فائدہ۔ افسانوں میں "جابین" بہت پسند آیا۔ اس طرح کے بہت سے افسانے لکھے گئے ہیں۔ لیکن اس افسانے کا جواب نظر نہیں آتا۔ اس مصنف کا بھی اس سے قبل اتنا اچھا کوئی اور افسانہ میری نظر سے نہیں گزرا۔

انور خان کے جائزے اور تین ناولوں کے بارے میں آپ کا مختصر سا تبصرہ مزہ دے گیا۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ الیاس احمد گدی اور رگیان سنگھ شاطر کے ناول جان رکھتے ہیں۔ انور خان نے ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے۔ "فائر ایریا"، "آخرِ شب کے ہم سفر" کی روایت کو آگے بڑھاتا ہے۔ ریحان الدین احمد اور دیپالی سرکار کی طرح یہاں بھی سُکھ دیو اسٹیبلشمنٹ کا حصہ بن جاتا ہے لیکن فتو رینا اور اُس کا بیٹا، ناصرہ نجم السحر کی طرح یہاں بھی اس روایت کو آگے بڑھاتے رہتے ہیں۔ خاص بات یہ ہے کہ ریحان اور دیپالی کی طرح سُکھ دیو بالکل ہی اسٹیبلشمنٹ کا حصہ نہیں بن جاتا بلکہ آخر میں فتو رینا اور اس کے بیٹے کی صف میں شامل ہو جاتا ہے۔ یہ شمولیت اہم ہے۔ "آخرِ شب کے ہم سفر" کے برخلاف یہ ایک اجتماعی ناول ہے۔ یہ اس کا دوسرا پہلو اور آگ کا استعارہ تیسرا پہلو۔ کارخانے کے مزدوروں کی زندگی کے مطالعے کے نقطۂ نظر سے دیکھیں تو ایک چوتھا پہلو بھی سامنے آتا ہے۔" امتیاز احمد۔ علی گڑھ

"سوغات (۹) میں عبدالصمد کے ناول "خوابوں کا سویرا" پر انور خان کا تبصرہ نظر سے گزرا۔ ان کے خطوط اور تبصرے کے مطالب میں مطابقت نہیں ہے۔ تینوں تحریروں کو پڑھنے کے بعد متضاد تاثر قائم ہوتا ہے۔ انور خان نے جس طرح

سرسری گفتگو کی ہے، اس کے پیشِ نظر کسی تاثر کا اعتبار نہیں ہو سکتا۔ البتہ انھوں نے "ماہرین" والی جو بات کہی ہے، وہ اہم اور سنجیدہ ہے۔ مگر آپ نے اسی کو مذاق میں اڑا دیا۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ اوروں کی طرح آپ بھی کسی عصبیت کے اسیر ہیں۔

میں نے "دو گز زمین" اور "خوابوں کا سویرا" دونوں کو پڑھا ہے۔ چند تکنیکی خرابیوں کے ساتھ سہو اسلوب کے بھی کچھ نمونے دونوں میں ہیں۔ لیکن عبد الصمد بری نثر نہیں لکھتے۔ جو لوگ اردو بولتے، لکھتے اور پڑھتے ہیں ان کو کچھ اندازہ ہے کہ غلطیاں کیسے راہ پا جاتی ہیں اور پوری احتیاط و توجہ کے باوجود کوئی ادیب کس طرح اظہارِ خام کا شکار ہو جاتا ہے۔ کچھ لوگ اردو کو "مصنوعات" میں سے سمجھتے ہیں۔ وہ عوامی بول چال کے رجحانات کو روکتے ہیں۔ میں اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ تخلیقی نثر میں ظاہری اور باطنی آرائشیں ہوتی ہیں۔ لیکن دریا جب آگے بڑھتا ہے تو کچھ آلائشوں کو سمیٹ لیتا ہے، اس سے دریا کی صحت متاثر نہیں ہوتی۔ عبد الصمد اُس اردو کے آدمی نہیں ہیں جو "ٹکسالی اردو" کہلاتی رہی ہے۔ وہ عوامی اردو کے آدمی ہیں۔ ان کے دونوں ناولوں کا بنیادی موضوع "سیاسی معاشرہ" ہے۔ سیاست پڑھانے والا، سیاست کو مرکزی توجہ بنانے والا، جمہوری اردو لکھنے والا ادیب خواہ مخواہ نام نہاد اہلِ زبان کے اشرافیہ مزاج کی نمائندگی اور عکاسی نہیں کر سکتا۔ عبد الصمد کی نثر میں جو عوامی بے تکلفی اور خلوص ہے، ناول کے تانے بانے میں واقعات کی جو سادہ اور راست تفصیل ہے، اس پر مرقع سازوں اور ایما کاروں کو رشک ہونا چاہیے!

انور خان کبھی کبھی بے خیالی میں لکھتے ہیں: "خوابوں کا سویرا" کو انھوں نے متعدد بار "خواب خواب سویرا" لکھا ہے۔ اور آپ جناب تو ہر مصنف کا اتنا احترام کرتے ہیں کہ تصحیح کی طرف سے آنکھیں موند لیتے ہیں۔ لیکن مجھ جیسا قاری آنکھ بند کر کے نہیں پڑھتا۔ البتہ سہو امرِ دیگر ہے۔"

محمد منصور عالم۔ گیا

"یہ شمارہ میں شمیم حنفی صاحب سے لے کر پہلے ہی پڑھ چکا تھا۔ پہلے صفحے سے آخری صفحے تک۔ چودھری محمد علی سے متعلق گوشہ آپ نے بہت اچھا نکالا ہے، پڑھ کر جی خوش ہو گیا۔ میں نے جو کاپیاں خریدی ہیں ان میں سے ایک چودھری صاحب کے بیوی اور بیٹے کو دوں گا۔ امید ہے کہ ان کو بھی بہت پسند آئے گا۔ مجھے احساس ہے کہ چودھری صاحب جس توجہ کے مستحق تھے وہ انھیں کبھی نہیں ملی۔ اس میں اردو والوں کا دوش تو ہے ہی مگر ہم جیسے ان کے متعلقین نے بھی اس سلسلے میں اپنی ذمے داریوں کو کبھی نہیں نبھایا، صرف ان کی بیٹی ہما اخلاق حسین نے ان کی اکثر چیزیں کسی نہ کسی طرح محفوظ کر دیں، ورنہ ہم لوگ شاید ان کا نام تک نہ جانتے۔

آپ کا رسالہ میں نے کبھی پہلے دیکھا ہو تو مجھے یاد نہیں ہے۔ نام سن رکھا تھا۔ اردو ادب کا آدمی نہ ہونے کی وجہ سے اس میدان میں میری واقفیت بہت محدود ہے۔ مگر آپ جب یہ شمارہ دیکھا تو مزہ آ گیا۔ رسالہ مجھے بے پناہ اچھا لگا۔

بڑا معیاری اور دیدہ زیب۔ ناسازگار حالات اور "ساختیات و پس ساختیات" کے مصنوعی عالمانہ ماحول میں اتنے اچھّے رسالے کے لئے اتنا معیاری مواد فراہم کر لینا بڑی ہمّت اور محنت کا کام ہے۔ نثر اور شعر دونوں ہی بہت اچھے ہیں۔ عام طور پر ادبی رسالوں میں شعری حصّہ بڑا گیا گزرا ہوتا ہے۔ "سوغات" کے اس شمارے میں مجھے یہ بھی بہت پسند آیا۔ مبارک ہو۔"

مسعود الحق۔ دلّی

"سوغات" عـ۹ پر کچھ معروضات پیشِ خدمت ہیں :۔

"ہمارا جوگی شاعر" کے آغاز میں حمید نسیم صاحب میرؔاجی کے تعلق سے خاصے تاثراتی یعنی جذباتی نظر آتے ہیں اور مضمون میں جگہ جگہ ان کی جذباتیت عود کرتی رہتی ہے لیکن جس شعوری تسلّط سے انھوں نے میرؔاجی کی شاعری اور اس کی زبان کا تجزیہ کیا ہے اس کی وجہ سے، میرؔاجی سے جذباتی وابستگی کے باوجود، میرؔاجی کے اسلوب و فن کی افہام و تفہیم کو تفوّق حاصل رہتا ہے۔ میرؔاجی پر یہ تاثراتی، تجزیاتی اور تقابلی تنقید کی عمدہ مثال ہے۔ "سوغات" عـ۷ میں راشد پر لکھتے ہوئے، مضمون نگار نے جو موقف اختیار کیا تھا، میرؔاجی پر اپنے زیرِ نظر مضمون میں اس کا معیار انھوں نے برقرار رکھّا ہے۔

"غالب کی اردو نثر" میں شمیم حنفی صاحب نے نامہ نگاری میں جہاں غالب کے ایک الگ راہ نکالنے والی بات دہرائی وہیں مکتوبی تخاطب کو مکالمہ، اور اس کے آگے ڈرامے اور افسانے کا تخلیقی مکالمہ بنا دینے کی بات کہہ کر غالب کے نثری اسلوب کی تخلیقیت پر حرفِ آخر لکھ دیا ہے۔ اس تعلق سے مضمون میں ان کا شش نکاتی جائزہ غالب کے خطوط کے مطالعے میں معاونت کرتا رہے گا۔

میر انیسؔ کے اخلاق و عادات پر جیسی تحریر "سوغات" کے اس شمارے میں شائع کی گئی ہے، وہ نیّر مسعود صاحب ہی کا حصّہ ہو سکتی تھی، خصوصًا اس کا دوسرا حصّہ جو "احوال" کے تحت لکھا گیا ہے۔

ابو الکلام قاسمی نے بیدؔی کے افسانوں میں کردار کی اہمیت پر بحث کرتے ہوئے آغاز میں کہا ہے کہ منٹوؔ کا افسانہ پلاٹ سے، عصمتؔ کا افسانہ زبان سے اور کرشن چندر کا افسانہ فضا آفرینی سے اپنی شناخت بناتا ہے۔ ایک حد تک یہ خیال درست معلوم ہوتا ہے لیکن افسانے کی شعریات میں پلاٹ، کردار، زبان اور فضا یا ماحول ایسے لوازم ہیں جن کے بغیر افسانہ نمو دہی نہیں کر سکتا (جدید تجریدی افسانے سے یہاں بحث نہیں) ان میں سے ایک بھی عنصر افسانے میں نہ ہو تو تخلیق ناپختہ محسوس ہوگی۔ کیا منٹوؔ کا افسانہ زبان سے ماورا اور فضا آفرینی سے عاری ہے؟ کیا عصمتؔ کے افسانے میں پلاٹ، کردار اور فضا آفرینی نہیں؟ کیا بیدؔی کے افسانے میں یہ لوازم مفقود ہیں؟ اور کیا کرشن چندر فضا آفرینی کے ساتھ ہی زبان و بیان اور واقعات و کردار سے اپنی شناخت نہیں بناتے؟ قاسمی تسلیم کرتے ہیں کہ فنی نقطۂ نظر سے اس طرح کسی

خالق کو اپنی تخلیق کے کسی ایک پہلو سے مختص کرنا مناسب نہیں، پھر صرف زورِ نقد کے اظہار کے لئے کیا یہ ضروری ہے کہ آپ منٹو کو پلاٹ سے اور بیدی کو کردار سے پہچاننے پر اصرار کریں؟ (مشکل یہ ہے کہ اس مفروضے کے بغیر آپ کا قضیہ آگے بھی نہیں بڑھتا)

انیس اشفاق لکھتے ہیں کہ ہمارے شارحین متن ہی کو اہم جانتے اور تشریحِ شعر میں متن سے باہر قدم نہیں نکالتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تو قطعی نہ تھی کہ ان تک جناب ژاک دریدا کا قول زرین "متن ہی متن کا حوالہ ہے" پہنچ چکا تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ متن کی اہمیت کا شعور مغرب کے لسانی فلسفے نے ہمارے یعنی مشرق کے شارحین سے حاصل کیا ہے اور جب اس "مغربی" کا لیبل لگ کر آیا تو ہمارے نئے لسانیاتی ماہرین اسے لے اڑے اور آج بھی بالتوفیق متن و معنیٰ کے تصورات پر لفظوں کے طوطا مینا بنائے جا رہے ہیں۔ ایک شعر کے متعدد معنیٰ کے تعلق سے شمس الرحمن فاروقی نے "شعر شور انگیز" میں جو کچھ لکھا اور جس جس زاویے سے شعر کے امکانی اور احتمالی معنیٰ بیان کئے ہیں، اس طریق کار کا سکہ اب خاصا گھس چکا ہے اور مغرب میں تو بہت پہلے ہی، بقول محمد حسن عسکری، اسلوبیات، معنیات اور ساختیات کے سکے بالکل بے قیمت ہو چکے تھے مگر جدید بدیت کا ہوا ہمیں چھوڑتا نہیں۔ انیس اشفاق میر و غالب کے چند مصرعے دے کر پوچھتے ہیں کہ کیا ان سے متن کے بنیادی معنیٰ کا انکار اور منشائے مصنف کو مسترد کرنے کا اشارہ نہیں ملتا؟ میں کہتا ہوں "بالکل نہیں ملتا"۔ میر کے مطابق جب ان کا ایک سخن چار چار طرفیں رکھتا ہو تو اس سے میر کا بھی منشاء اجاگر ہے کہ میری ایک بات میں چار باتیں (چار مفاہیم) ہوتی ہیں۔ بلکہ میر انیس تو ایک پھول کے مضمون کو سو رنگ سے باندھنے کا دعویٰ کرتے ہیں (جس کا حوالہ یہاں انیس اشفاق نے نہیں دیا) جیسا کہ قائم کا بھی خیال ہے کہ "میں اپنے سخن میں سو رنگ سے گل کترتا ہوں"۔ غالب اپنے ہر لفظ کو گنجینۂ معنیٰ کا طلسم بھی اسی لئے قرار دیتے ہیں کہ ان کے شعر کا متن محدود نہیں، نہ اس کے بنیادی معنیٰ مسترد کرنے کے لائق ہیں۔ یہاں "بنیادی معنیٰ کا انکار" فاضل نقاد کے سہو فکر کا نتیجہ ہے، کیوں کہ جب متن ہی سب کچھ ہو تو یقیناً اس کے کسی معنیٰ سے انکار ممکن نہیں اور بنیادی معنیٰ سے انکار تو بے معنیٰ ہی سمجھا جائے گا۔ میر کے جس سخن میں چار چار مفاہیم ہوں، اس میں معنیاتی ابعاد سے قطع نظر کچھ معنیٰ ایسے ضرور ہوں گے جو اس کے بنیادی اور اولین معنیٰ ہیں اور جو یقیناً کسی منشاء کے تحت متن میں لائے گئے ہیں۔ اب یہ قاری پر منحصر ہے کہ سخن کے ظاہری معنیٰ کو قبول کرے یا ان کے علاوہ چار معنیٰ اور ڈھونڈ نکالے۔ کثیر معنویت کا یہ مطلب نہیں کہ آپ معنویت پیدا کرنے والے فاعل کے وجود ہی سے انکار کر دیں۔ متن کوئی خود رو چیز نہیں، ذہنی پیداوار ہے جو کسی نہ کسی مقصد سے (بلکہ بے مقصدیت کے اظہار کے مقصد سے بھی) ظاہر ہوتی ہے۔ انیس صاحب "ہماری شاعری" کے حوالے سے کہتے ہیں کہ مسعود حسن رضوی کے بیانات میں شعر میں کثرتِ معنیٰ کا ہونا مصنف کے مدعا کی تردید کے مترادف ہے۔ یہ بیان قابلِ قبول نہیں۔ کیوں کہ ایک بیان، سخن یا کلام یا متن اگر کثیر معنویت کا حامل ہے تو یہ وصف اسے مصنف کے مدعا سے حاصل ہوا ہے۔

متن یا معنیٰ بالذات کچھ نہیں۔ عرفی کے مطابق لفظ اگر بالذات علامت بھی ہے تو علامت معنویت بالذات نہیں۔ یہ مفہم کا عمل ہے جو علامت کو معنیٰ دیتا ہے (نہ کہ علامت مفہم کو اپنے معنیٰ بتاتی ہے) یعنی از خود کوئی متن وجود ہی میں نہیں آتا۔

سب سے اہم سوال میرے نزدیک یہ بھی ہے کہ کیا ساختیاتی اور معنیاتی تنقید میں متن کا مقام صرف غزل کے منفرد اشعار ہی کو حاصل ہے؟ نظم، افسانہ، ڈرامہ وغیرہ کے متن کے متعلق فاضل نقاد کا کیا خیال ہے؟ جب کہ مغرب میں ایسی تنقیدیں عموماً نظم اور فکشن کے متون پر لکھی گئی ہیں (غزل کا تو وہاں سوال ہی نہیں)

دریدا کے بموجب انیس صاحب خود کو اگر متن تک محدود کرتے ہیں (یعنی اگر متن غزل کا شعر ہے تو وہ صرف دو مصرعوں میں بندھ جاتے ہیں) تو انھیں متن سے باہر لفظی مناسبتیں بھی نہیں تلاش کرنی چاہئیں جیسا کہ سید سکندر کی معنویت انھوں نے جبل الطارق پر کھڑے کیے گئے[۲۶] کو لوسس پر منطبق کی اور متن سے دور نکل گئے[۲۶]۔

نظم "حضارت جدید" (شفیق فاطمہ شعریٰ) کی پہلی پانچ سطروں سے نظم کی نحویات کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ کہتی ہیں:

کسی ربیع کا کبھی گزر ہوا،

نہ اس کے ریگ زار میں

سموم بخت

رائیگانیِ حیات ہی کے

دورلائی پے بہ پے

شاعرہ نے انھیں اس طرح لکھا ہے کہ پہلی سطر کا ناہیہ دوسری سطر میں چلے جانے سے جو وقفہ پیدا ہو گیا ہے اس سے دو واقعات کی نفی ہوتی ہے۔ یعنی "اس کے ریگ زار میں کبھی کسی ربیع کا گزر نہ ہوا" اور "سموم بخت پے بہ پے رائیگانیِ حیات کے دور نہ لائی" (یہاں ابہام کے اور بھی امکانات موجود ہیں۔ بحوالۂ تعبیرِ متن) اگر نظم کی سطور اس طرح لکھی جاتیں (اور انھیں ایسے ہی لکھنا چاہیے تھا)

کبھی کسی ربیع کا گزر ہوا نہ اس کے ریگ زار میں

سموم بخت رائیگانیِ حیات ہی کے دور لائی پے بہ پے

تو شاعرہ کا عندیہ مبہم نہ ہوتا، بھلے ہی پانچ کی بجائے یہاں دو سطروں میں متن لکھا جاتا، جس سے نظم کی طوالت کم ہو جاتی لیکن اظہار تو اپنے لسانی سیاق میں آجاتا۔ مذکورہ نظم میں ایسے کئی مقامات آئے ہیں جہاں دو دو تین تین الفاظ لکھ کر بلا وجہ طوالت پیدا کی گئی ہے۔ ضرورتِ شعری کی بات اور ہے، کہ اگر ایک لفظ بھی لکھنا پڑے تو نامناسب نہیں معلوم ہوتا لیکن "حضارتِ جدید آکھڑی ہوئی" کو دو سطروں میں لکھنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ نظم کی چھٹی سطر سے اس طرح متن لکھا جاتا تو صحیح ہوتا:

ذرا سا وقفۂ سکون و آشتی کبھی جو مل سکا

تو اس لیے کہ فصل ایک اور

یہ تو ہوئیں نظم کی خارجی ہیئت کی باتیں، اس کی داخلی ہیئت اور معنویت (یا بے معنویت) پر کچھ لکھنے کے لئے طول طویل بحث ناگزیر ہوگی۔ بلکہ انیس اشفاق صاحب سے میری گزارش ہے کہ وہ تعبیرِ متن اور منشائے مصنف وغیرہ کے حوالے سے اس نظم کا جائزہ ضرور لیں۔

عتیق اللہ کی غزل کا مطلع

دریا سا بہتا ہے مجھ میں — سا نہیں اک دریا ہے مجھ میں

"سا نہیں" میں کتابت کی غلطی کے سبب بے معنیٰ ہوگیا لیکن ساتھ ہی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر کتابت کی یہ غلطی نہ بھی ہوتی تو مطلع اسی خصوصیت کا حامل ہوتا۔

محمد علوی کی نظمیں کراچی کے رسالے "بادبان" میں بھی شائع ہوئی ہیں اور یہ نظمیں ایسی نہیں کہ "سوغات" میں انھیں پھر پڑھ کر قندِ مکرر کا مزہ آتا۔

خصوصی مطالعے کا حصہ ہمیشہ کی طرح "سوغات" (۹) میں بھی انفرادیت کا حامل ہے اور ادبی روایت سے جڑے رہنے کا اشاریہ بھی۔

انور خان نے اپنے خط میں لکھا ہے کہ تیزی سے بدلتی دنیا میں اکیڈمک بحث کی گنجائش نہیں بلکہ سیدھے تخلیقات کے بیش و کم پر گفتگو کرنی چاہیئے۔ اس خیال میں تخلیق کی اہمیت پر زور ضرور ہے لیکن ادبی رجحانات و میلانات وغیرہ کے پس منظر سے الگ صرف ناول کے مواد و متن پر گفتگو ہو تو وہ "سوغات" میں شامل ان کے تین ناولوں کے جائزے کی طرح کی گفتگو ہوگی جس میں آپ ناول کے کرداروں کے نام، واقعات کی تلخیص اور زیادہ سے زیادہ سماجی صورت حال کی پیش کش کا ذکر کر سکیں گے جس سے یوں بھی قاری ناول کے مطالعے کے دوران واقفیت حاصل کر سکتا ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ کسی بھی ناول پر، اس کے متن تک محدود رہ کر گفتگو کرنے سے آپ صرف متن کی تکرار کرتے ہیں جو صنفی اور اکیڈمک تقاضوں سے قطع نظر کے سبب نہ درسگاہوں کے کام کی ہوتی ہے اور نہ درسگاہوں کے باہر۔

اسلامی جدیدیت پر ہر دانشورانہ بحث مجھے ہمیشہ "معروضی" نظر آتی ہے اور جسے میں منطق و فلسفہ اور وقتی سیاست کے زیرِ اثر اسلام کو جدیدیت پر یا جدیدیت کو اسلام پر کسی نہ کسی طرح منطبق کرنے کے مترادف سمجھتا ہوں ممکن ہے زاویۂ نظر بدلنے سے اس قسم کے مباحث کا کچھ اور (یا اصل) رنگ نظر آئے اِلّا ماشاءَ اللہ۔

انتظار حسین کا افسانہ "صبح ہونے تک" انھیں کے دوسرے کئی افسانوں کی یاد دلاتا ہے۔ سلیم شہزاد - مالیگاؤں

"حمید نسیم صاحب کے مقالے پر چند باتیں بعد میں کہوں گا۔ اس سے پہلے ذرا مختصر طور پر مرحوم چودھری محمد علی ردولوی کے گوشے پر آپ کو مبارک باد دے دوں، جنھیں ہم جیسے نالائقوں نے بہت کم پڑھا ہے۔ ہاں! اُن کی کتاب "میرا مذہب" مجھے متاثر کر گئی تھی۔ کیا باغ و بہار شخصیت تھی چودھری مرحوم کی۔ کیا زبان کی سلاست، کیسی کیسی باتیں وہ چند سادہ جملوں میں کہہ جاتے ہیں۔ اب ایسے اردو لکھنے والے کم رہ گئے ہیں۔ اس تہذیب کا رونا میں بھی روتا ہوں جس پر قرۃ العین صاحبہ آنسو بہاتی ہیں۔ اس تہذیب کو سمجھنے کے لئے چودھری صاحب کی تحریریں لازمی ہیں۔ ان کے "دھوکا" جیسے افسانوں پر نہ جانے کتنے انتظار حسین وغیرہ قربان کر دئے جاسکتے ہیں۔

اب آپ عظیم بیگ چغتائی پر ایک گوشہ تیار کرائیں۔ اور اگر ممکن ہو تو احمد ندیم قاسمی صاحب پر بھی۔

اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ حمید نسیم صاحب نے جوگی شاعر پر اچھا مقالہ لکھا ہے لیکن راشد پر اُن کی تحریر کمال کی تھی جیسی کہ عزیز حامد مدنی پر تھی (کیا آپ فانی بدایونی پر کام نہیں کر سکتے؟ غالباً وہ اس صدی کے سب سے بہتر غزل گو ہیں۔ اقبال غزل گو نہیں) میرا جی بہت ہی دشوار شاعر ہیں۔ راشد صاحب فکر کو کئی موڑ دے کر پیش کرتے ہیں لیکن جب ان کی لغت سمجھ میں آنے لگتی ہے تو پھر وہ نسبتاً آسان لگنے لگتے ہیں، کچھ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ یا براؤننگ کی طرح۔ میرا جی، بودیلئر کی طرح، بنیادی طور پر علامتی شاعر ہیں، اور دشوار ترین امر اُن کی شاعری کو سمجھنے میں یہ ہے کہ ان کی ہر ایک نظم علامات کو اپنے طور پر، اپنے مخصوص دائرے میں، اپنے نجی معانی کے تحت، استعمال کرتی ہے۔ کسی نظم کو آپ لیں، چاہے وہ بدنام "تب جو بیادرے" ہو یا "جہالت"، ہر ایک نظم میں میرا جی علامتوں کو مخصوص طور پر استعمال میں لاتے ہیں۔ جنسیت ان کے ہاں بھر پور ہے، اور اکثر سادگیت کی طرف جاتی ہوئی۔ پھر یہ کہ میرا جی کی شعریت عام اردو شاعروں سے بہت مختلف ہے۔ انھوں نے جان بوجھ کر اس ہندی طرز کو اپنایا ہے جو سماًلا ہندی کی بھگتی شاعری نے بھی بخشا ہے، غالباً میرا سین کی وجہ سے (یوں میرا خیال ہے کہ میرا سین کو سولہ ١٦ سترہ ١٧ برس کے رتن بو جیسے شاعر نے غالباً ایجاد کر لیا تھا) اُن کا طرز، جسے آپ ڈکشن کہہ لیں یا آہنگ، کم از کم راشد کے مقابلے میں آسان ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ راشد INNOVATIVE زیادہ ہیں۔ کبھی کبھی مجھے ایسا لگتا ہے کہ اختر الایمان میرا جی کے (محض چند معاملات میں) صحیح جانشین ہیں۔ گو وہ اُن جیسے عظیم شاعر نہیں ہو سکے، اور نہ آزاد شاعری پر اُن کو اتنی دسترس ہے۔

انتظار حسین صاحب کا افسانہ زیادہ پسند نہ آسکا۔ "روکنگ چیئر" البتہ خاصے کی چیز ہے۔" حبیب حق - پوسا

"سوغات" (۹) اس لحاظ سے بہت قیمتی ہے کہ اس کے صفحات پر چودھری محمد علی ردولوی ایک بار پھر زندہ ہو گئے۔ اردو کی نئی نسل کو ان سے اچھی طرح واقف ہو جانے کا سنہرا موقع ملا۔ میرا جی پر کئی مضامین پہلے بھی پڑھ چکی ہوں، جن کے ذریعہ

وہ شاعر سے زیادہ ایک آبنارمل شخص نظر آئے۔ لیکن حمید نسیم صاحب نے جس میراجی سے متعارف کرایا ہے وہ اپنی مختصر اور بے ترتیب زندگی میں بھی اردو کے ایک بہت عظیم شاعر نظر آتے ہیں۔"

صدف جعفری۔ کلکتہ

"پروفیسر عزیز احمد کا شمار جامعہ عثمانیہ کے چند ہونہار طالب علموں اور قابل اساتذہ میں ہوتا ہے۔ انھوں نے ۱۹۳۴ء میں عثمانیہ یونیورسٹی سے بی۔ اے۔ کیا تھا۔ ۱۹۳۸ء میں لندن یونیورسٹی سے بی۔ اے (آنرز) کیا۔ لکھنے کی ابتداء طالب علمی کے دور سے ہی کر دی تھی۔ قلمی نام عزیز احمد عثمان آبادی اور بعد میں صرف عزیز احمد (اصلی نام) سے ہی لکھتے رہے۔ ابتداء میں تراجم کئے جو "نیرنگ خیال" اور دیگر رسائل میں شائع ہوئے۔ ۱۹۴۶ء تا ۱۹۴۷ء وہ عثمانیہ یونیورسٹی میں بحیثیت ریڈر شعبۂ انگریزی اور ۱۹۴۷ء تا ۱۹۴۹ء بحیثیت پروفیسر رہے۔ ۱۹۴۹ء میں پروفیسر عزیز احمد پاکستان چلے گئے۔ بعد میں ٹورنٹو یونیورسٹی میں ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبۂ اسلامیات کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ۱۶ دسمبر ۱۹۷۸ء کو ٹورنٹو (کینیڈا) میں اُن کا انتقال ہوا۔

"عزیز احمد عزیز اور اردو ادب" اس موضوع پر میں مراٹھواڑہ یونیورسٹی، اورنگ آباد سے تحقیقی کام کر رہا ہوں۔ "عزیز احمد کی ناول نگاری"، "عزیز احمد کے افسانے"، "عزیز احمد کی شاعری"، "عزیز احمد کے ڈرامے"، "عزیز احمد کے تراجم"، "عزیز احمد اور ترقی پسند ادب"، "عزیز احمد کی تنقید نگاری" اور "عزیز احمد اور اسلامیات"، اس طرح سے عزیز احمد کے فن کا مکمل جائزہ پیش نظر ہے۔

عزیز احمد کی شاعری اور تراجم کا مطالعہ کرتے وقت میری نظر سے ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کی کتاب "اردو افسانے کی روایت ۱۹۰۳ء تا ۱۹۹۰ء" (جسے اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد نے شائع کیا ہے) گزری۔ اس کتاب میں ص ۳۳۳ پر عزیز احمد کے تعلق سے جو اشاریہ ہے، اُس میں "چار نغمے" — مرتّب کردہ عزیز احمد لکھا ہوا ہے۔ لیکن یہ چار نغمے پروفیسر عزیز احمد نے مرتب نہیں کئے ہیں۔ یہ چار نغمے دراصل "چار سہرے" ہیں، جنھیں عزیز احمد جلیلی نے بتقریب عقدِ جناب حسن الدین احمد صاحب مصنّفِ "سازِ مغرب" اور "سازِ مشرق" ویلا اکیڈمی حیدرآباد، مرتب کیا تھا۔ عزیز احمد جلیلی نے بعنوان "نغمۂ طرب" سہرا لکھا تھا۔ باقی تین سہرے بھی دیگر ناموں سے ہیں لیکن انھیں بھی عزیز احمد جلیلی صاحب نے لکھا ہے۔ پروفیسر عزیز احمد، جناب عزیز احمد جلیلی اور جناب حسن الدین احمد کے استاذ رہ چکے ہیں۔

عزیز احمد جلیلی بھی عثمانیہ یونیورسٹی کے طالب علم رہ چکے ہیں۔ انھوں نے بھی انگریزی نظموں کے کئی تراجم شائع کئے ہیں۔

ابھی حال ہی میں انھوں نے سروجنی نائیڈو کی انگریزی نظموں کا منظوم ترجمہ اردو میں شائع کیا ہے۔

"سازِ مغرب" جلد ہفتم — مرتب: جناب حسن الدین احمد۔ ویلا اکیڈمی نے اس کتاب میں عزیز احمد کے نام سے انگریزی نظموں کے تراجم شائع کئے ہیں۔ صفحہ ۶۵، ۸۹، ۹۷، —، — پر عزیز احمد کا نام لکھا ہوا ہے۔ یہ تراجم بھی عزیز احمد جلیلی کے ہی ہیں۔ جن میں "کھوئی ہوئی جیت"، "حیات"، "ایک عرض"، "آخری التجا"، "حسین خواب"، "شکوۂ تقدیر"، "بیتے ہوئے دن"، "الفت"، "رونقِ حیات"، "تمنا"، "موجِ الفت"، "قوسِ قزح"، "ہم سفر" وغیرہ ہیں۔ جلد ہفتم میں پروفیسر عزیز احمد کا ایک ہی نظم کا

ترجمہ ہے، جس کا عنوان ہے "فردوس آزادی کی"۔ جناب حسن الدین احمد صاحب کے گھر پر جناب عزیز احمد جلیلی نے خود اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ یہ تمام تراجم خود اُن کے ہی ہیں۔ جہاں تک عزیز احمد جلیلی صاحب کے تراجم کی بات ہے تو اُن کے تراجم میں اور پروفیسر عزیز احمد کے کئے ہوئے تراجم میں زمین آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔ پروفیسر عزیز احمد کے تراجم عام طور پر اصل سے بالکل قریب تر ہیں۔ انگریزی نظموں کا بھرپور تاثر پروفیسر عزیز احمد کے تراجم میں اُبھر کر آتا ہے، جب کہ عزیز احمد جلیلی کے تراجم تاثر سے بالکل خالی ہیں۔ وہ بعض مرتبہ صرف لفظی ترجمہ کرتے ہیں اور بعض تراجم میں بنیادی خیالوں کو ہی اہمیت دیتے ہیں، جس کی وجہ سے ان کے تراجم اکثر اصل سے بہت دور ہو جاتے ہیں۔ ایک اور صاحب عزیز احمد عزیز تھے جو شاید عزیز یار جنگ تھے، جن کی نظمیں اور غزلیں انجمن کے شائع کردہ رسالے "اردو" میں نظر آتی ہیں۔ یہ عزیز احمد عزیز صاحب بھی عثمانیہ کے طالب علم تھے۔" سید مجاہد علی۔ اورنگ آباد

"سوغات" کا شمارہ ۹ موصول ہوا۔ "نقشِ اوّل" میں اس بار بطورِ خاص مزہ آیا۔ انورخان کے جا گزنے پر آپ کا چار سطروں کا مختصر اور عمدہ تبصرہ پڑھ کر میرا تو جی خوش ہو گیا مگر اُن قلم کاروں پر کیا گزری ہو گی جن کی طرف روئے سخن تھا؟

اس شمارے میں افسانے کے بریڈ میں حضرت انتظار حسین بھی شامل ہیں مگر وہ، رن بنانا تو دور، کھاتا بھی نہ کھول سکے۔ بھلا ہو حسن منظر اور خالد جاوید کا جنھوں نے شاندار بلّے بازی کر کے نہ صرف شرمناک ہار سے بچایا بلکہ ختم سے بھی ہمکنار کیا۔ حسن منظر اور خالد جاوید کے افسانے اپنا جواب نہیں رکھتے۔ ان دونوں افسانوں کی بازگشت دیر اور دور تک سنائی دے گی۔

چودھری محمد علی ردولوی پر گوشہ خاصے کی چیز ہے۔ چودھری صاحب جیسی خوبصورت زبان کم سے کم زندہ لوگوں میں تو کوئی لکھنے والا نہیں۔ ہر بار ایک نیا لطف، ایک الگ نشہ۔ ایسا نادر اور کم یاب ادب ہم طالب علموں تک پہنچانے کے لئے ہم آپ کے بے حد ممنون ہیں۔

نیّر مسعود صاحب کا میر انیس پر تحقیقی مضمون ہمیشہ کی طرح سیر حاصل ہے۔ اتنے کم صفحات پر اتنا وقیع، بھرپور اور معلوماتی مضمون، مجھے یقین ہے، اردو میں کم ملے گا۔"

ایگری کلچر پروڈیوس مارکیٹنگ کمیٹی، یشونت پور، بنگلور

فون : ۳۳۷۱۶۹۵

پیارے کسانو!

اگر آپ زراعتی پیداوار ریگولیٹڈ مارکٹ کے اندر فروخت کرتے ہیں تو آپ کو مندرجۂ ذیل سہولتیں فراہم ہوں گی :

- کسان جو پیداوار فروخت کے لیے لاتے ہیں اس پر بہترین قیمت ملے گی۔
- فروخت کے بعد کسی طرح کا کمیشن یا کسی دلال کو کوئی رقم دینی نہیں پڑے گی۔
- اجناس کی فروخت کے فوراً بعد کاشتکاروں کو قیمتیں ادا کردی جاتی ہیں۔
- کاشتکار جب اپنی پیداوار فروخت کرنے کے لیے آتے ہیں تو ان کے قیام کے لیے سہولتیں فراہم کی گئی ہیں۔
- جب تک اجناس کے لیے اچھی قیمت نہیں مل جاتی انھیں گوداموں میں پورے تحفظ کے ساتھ رکھا جاسکتا ہے۔
- مارکٹ یارڈ میں پینے کے پانی، راستوں میں بجلی کی روشنی، حمّام اور اچھے راستوں کی سہولتیں فراہم کی گئی ہیں۔
- کمیٹی نے مزید سہولتیں فراہم کرنے کے لیے ایک ترقیاتی پروگرام تیار کیا ہے۔
- اجناس کی فروخت کے وقت پیدا ہونے والے سارے جھگڑے کمیٹی سے ربط پیدا کرکے فوراً نپٹائے جاسکتے ہیں۔
- کسانوں کے لائے جانے والے مال کو تولنے کے لیے ناپ تول کی مشینوں کا انتظام ہے۔ اس کا کوئی معاوضہ وصول نہیں کیا جاتا۔

ڈی۔ وی۔ بمبلگی
سکریٹری

بی۔ یم۔ پاٹل
انتظامی افسر

H.D. Deve Gowda
Chief Minister

B.B. Ningaiah
Minister of State for Agricultural Marketing